تحفۃ الالمعی

شرح

سنن الترمذی

جلد دوم

افادات

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ

محدث دارالعلوم دیوبند

ترتیب

جناب مولانا حسین احمد صاحب پالن پوری

فاضل دارالعلوم دیوبند

زمزم پبلشرز

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ

تحفۃ الالمعی

شرح

سنن الترمذی

جلد دوم

افادات

حضرت اقدس مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری مدظلہ
محدث دار العلوم دیوبند

ترتیب

جناب مولانا حسین احمد صاحب پالن پوری
فاضل دار العلوم دیوبند

ناشر
زمزم پبلشرز
نزد مقدس مسجد اردو بازار کراچی

کتاب کا نام ـــــــ تحفۃ الالمعی سنن الترمذی جلد دوم

تاریخ اشاعت ـــــــ جنوری ۲۰۱۰ء

باہتمام ـــــــ احباب زمزم پبلشرز

ناشر ـــــــ زمزم پبلشرز کراچی

شاہ زیب سینٹر نزد مقدس مسجد، اُردو بازار کراچی

فون: 021-32760374

فیکس: 021-32725673

ای میل: zamzam01@cyber.net.pk

ویب سائٹ: http://www.zamzampub.com

ملنے کے دیگر پتے

- مکتبہ بیت العلم، اردو بازار کراچی۔ فون: 32726509
- دارالاشاعت، اُردو بازار کراچی
- قدیمی کتب خانہ بالمقابل آرام باغ کراچی
- مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار لاہور
- مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ
- مکتبہ علمیہ، علوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

AL FAROOQ INTERNATIONAL
68, Asfordby Street Leicester LE5-3QG
Tel : 0044-116-2537640

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 Little Ilford Lane
Manor Park London E12 5QA
Phone: 020-8911-9797

ISLAMIC BOOK CENTRE
119-121 Halliwell Road, Bolton Bl1 3NE
U.S.A
Tel/Fax : 01204-389080

MADRASSAH ARABIA ISLAMIA
1 Azaad Avenue P.O Box 9786-1750
Azaadville South Africa
Tel : 00(27)114132786

فہرست مضامین

أبواب الزكوٰة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

عربی ابواب کی فہرست

أبواب الوتر

أبواب الجمعة

أبواب العید ین

أبوابُ السفر:

أبواب الزكاة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابُ رَفعِ الیَدَینِ عند الرُّکُوعِ

رکوع میں جاتے (اور رکوع سے اٹھتے) وقت رفع یدین کا بیان

تمام ائمہ متفق ہیں کہ تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع یدین سنت ہے۔ اسی طرح تین جگہوں کو چھوڑ کر پوری امت متفق ہے کہ باقی تکبیرات کے ساتھ رفع یدین نہیں کیا جائے گا۔ البتہ تین جگہوں میں یعنی رکوع میں جھکتے وقت، رکوع سے اٹھتے وقت اور تیسری رکعت کے شروع میں رفع یدین کیا جائے گا یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ صرف دو جگہوں میں یعنی رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع یدین سنت ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام (۱۲۶:۱) میں بقلم خود اس کی صراحت کی ہے۔ اور علامہ جزیری رحمہ اللہ نے کتاب الفقہ (۲۵۰:۱) میں امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی قول بیان کیا ہے۔ مگر شوافع تیسری رکعت کے شروع میں بھی رفع یدین کو سنت کہتے ہیں۔

اور امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ پوری نماز میں کسی جگہ رفع یدین سنت نہیں، بلکہ صاحب منیۃ المصلی نے اس کو مکروہ لکھا ہے اور ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں مکروہ نہ ہونے کی صراحت کی ہے۔ اور علامہ بنوری رحمہ اللہ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے (معارف السنن ۲: ۴۵۸)

قائلین رفع یدین کی سب سے مضبوط اور قوی دلیل حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔

حدیث: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپؐ نے نماز شروع کی تو اپنے ہاتھوں کو اٹھایا یہاں تک کہ وہ آپؐ کے مونڈھوں کے مقابل ہوگئے (۱) اور جب رکوع کیا اور رکوع سے سر

(۱) تکبیر تحریمہ میں ہاتھ کہاں تک اٹھائے جائیں؟ اس میں روایتیں مختلف ہیں۔ حضرت ابوحمید ساعدی کی روایت میں اور ابن عمرؓ کی مذکورہ روایت میں مونڈھوں تک ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے۔ اور حضرت مالک بن الحویرثؓ کی روایت میں دونوں کانوں کی محاذات تک اٹھانے کا تذکرہ ہے۔ اور انہی کی ایک دوسری روایت میں کانوں کے اوپر کے کناروں تک اٹھانے کا بیان ہے۔ یہ سب روایات مشکوٰۃ شریف: باب صفۃ الصلاۃ میں ہیں اور ان کے درمیان دو طرح سے تطبیق دی گئی ہے: (۱) تخییر: یعنی ہر طرح رفع یدین کرنے کی گنجائش ہے (۲) سب روایات کو جمع کیا جائے یعنی ہاتھ اس طرح اٹھائے جائیں کہ گٹے مونڈھوں کے مقابل، انگوٹھے کان کی لو کے مقابل، اور انگلیوں کے سرے کانوں کے اوپر کے کناروں کے مقابل ہو جائیں۔

اٹھایا (تو بھی ایسا ہی کیا) امام ترمذی رحمہ اللہ کے دواستاذوں میں سے ابن ابی عُمر کی حدیث میں و کان لایرفع بین السجدتین کی زیادتی ہے۔یعنی رسول اللہ ﷺ دوسجدوں کے درمیان یعنی جلسہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

تشریح: اس حدیث کوابن عمر رضی اللہ عنہما کے دونوں راوی یعنی سالم اور نافع روایت کرتے ہیں۔اور دونوں کے درمیان جن چار روایتوں میں اختلاف ہے ان میں سے یہ ایک حدیث ہے۔سالم نے اس کومرفوع کیا ہے یعنی اس کو رسول اللہ ﷺ کا فعل بتایا ہے اور نافع نے موقوف بیان کیا ہے یعنی انھوں نے اس کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا فعل بتایا ہے۔

علاوہ ازیں اس حدیث کا متن چھ طرح سے مروی ہے:

(۱) امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کی کتاب المُدوّنۃ الکبری (۱:۷۱) میں اس حدیث میں صرف تحریمہ کے ساتھ رفع یدین کا ذکر ہے۔

(۲) موطا مالک (ص:۲۵) میں دوجگہ رفع کا تذکرہ ہے۔تحریمہ کے ساتھ اور رکوع سے اٹھتے وقت۔

(۳) باب کی حدیث میں تحریمہ کے ساتھ اور رکوع میں جاتے ہوئے اور اس سے اٹھتے وقت رفع یدین کا تذکرہ ہے۔اور یہ حدیث بخاری (حدیث ۷۳۵) میں بھی ہے۔

(۴) بخاری ہی میں (حدیث ۷۳۹ میں) تیسری رکعت کے شروع میں بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔اور اس کو شوافع نے لیا ہے۔

(۵) امام بخاری رحمہ اللہ کی کتاب جزءُ رفعِ الیدین میں پانچ جگہ رفع یدین کا تذکرہ ہے۔اور پانچویں جگہ سجدہ میں جاتے وقت ہے۔یعنی ایک رفع تو رکوع سے اٹھتے وقت ہے اور دوسرا رفع سجدہ میں جاتے وقت الگ ہے۔

(۶) ہر اونچ نیچ میں رفع یدین کا تذکرہ ہے۔یہ حدیث طحاوی کی مشکل الآثار میں ہے پھر وہاں سے فتح الباری (۲:۱۸۵) میں نقل ہوئی ہے۔غرض رفع کے قائلین کی دلیل کا یہ حال ہے،اس میں شدید اضطراب ہے۔

فائدہ(۱): کوفہ میں جو عساکر اسلامی کی چھاؤنی تھی اور جس میں پانچ سو صحابہ کرام کا فروکش ہونا ثابت ہے کوئی بھی رفع یدین نہیں کرتا تھا۔امام محمد بن نصر مروزیؒ فرماتے ہیں:''ہم کسی شہر کے بارے میں نہیں جانتے کہ وہاں کے تمام باشندوں نے رکوع میں جھکتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین ترک کردیا ہو،سوائے کوفہ والوں کے (التعلیق الممجد ص:۹۱) اور باقی بلاد اسلامیہ میں رفع کرنے والے بھی تھے اور رفع نہ کرنے والے بھی۔مدینہ کی اکثریت رفع یدین نہیں کرتی تھی۔اور امام مالک رحمہ اللہ کے زمانہ میں بھی رفع نہ کرنے والے غالب تھے۔علامہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وقد کان فی سائر البلاد تارکون، وکثیر من التارکین فی عہد مالکؒ، وعلیہ بَنی مختارَہ (نیل الفرقدین ص:۲۲، رحمۃ اللہ الواسعہ ۳:۴۳۳)

فائدہ(۲): علامہ عراقی رحمہ اللہ نے یہ دعوی کیا ہے کہ رفع کی روایات پچاس صحابہ سے مروی ہیں۔ مگر علامہ بنوری قدس اللہ سرہٗ نے معارف السنن (۲: ۴۶۳) میں لکھا ہے کہ عراقی رحمہ اللہ نے اس میں ان صحابہ کو بھی شامل کرلیا ہے جن سے صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین مروی ہے۔ صحیح تعداد شوکانی رحمہ اللہ کی تصریح کے مطابق بیس ہے اور اس میں بھی نقد کی گنجائش ہے۔ اور علامہ کشمیری رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق پندرہ یا اس سے بھی کم تعداد رہ جاتی ہے۔ اور ترک رفع کی صریح روایات پانچ ہیں، البتہ اگر وہ روایات جن میں نماز کا پورا طریقہ مروی ہے اور رفع یدین کے بارے میں سکوت ہے شامل کرلی جائیں تو ترک رفع کی روایات بہت ہوجائیں گی ـــــ اور امام ترمذیؒ نے وفی الباب کی جو فہرست لکھی ہے وہ بھی بھرتی کی فہرست ہے۔ اس میں سے صرف چھ یا سات روایات قابل استدلال ہیں۔ تفصیل کے لئے کتب متداولہ کی مراجعت کیجئے۔ ہم بطور مُشتے نمونہ از خروارے شروع اور آخر کی روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلے نمبر پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کا حوالہ ہے۔ یہ حدیث محفوظ نہیں۔ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے نصب الرایہ (۱: ۴۱۵) میں امام احمد رحمہ اللہ کا یہ قول لکھا ہے کہ اس حدیث کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت ہی صحیح نہیں یہ حدیث درحقیقت ابن عمر کی ہے ـــــ اور آخری حدیث عُمیر لیثی رضی اللہ عنہ کی ہے جو ابن ماجہ (ص: ۶۲) میں ہے اس میں رفدۃ بن قضاعہ منکر راوی ہے۔ اور بعض حضرات نے اس کو واضعین (حدیثیں گھڑنے والوں) میں شمار کیا ہے اور اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس حدیث میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع کرنا مروی ہے۔ اس لئے وہ مبحث سے خارج ہے۔

فائدہ(۳): امام ترمذی رحمہ اللہ نے باب میں جن صحابہ کا تذکرہ کیا ہے وہ سب صغار صحابہ ہیں۔ معلوم ہوا کہ کبار صحابہ کے دور میں رفع یدین نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا نام نہیں لیا حالانکہ وفی الباب میں ان کی روایات کا حوالہ ہے۔ یہ قرینہ ہے کہ وہ فہرست بھرتی کی ہے۔ علاوہ ازیں مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع نہیں کرتے تھے (معارف السنن ۲: ۴۷۰) ـــــ اور صغار صحابہ نے اپنے دور میں رفع یدین اس لئے شروع کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ عمل جو مرور زمانہ سے لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونے لگا تھا لوگوں کے سامنے آجائے اور اس سلسلہ کی جو روایات ہیں وہ محفوظ ہوجائیں۔ تفصیل بسم اللہ کے مسئلہ میں گذر چکی ہے۔

[۷۷] باب رفع الیدین عند الرکوع

[۲۵۵-] حدثنا قُتَیْبَةُ وابنُ أبی عُمَرَ، قالا: ثنا سُفیانُ بنُ عُیَیْنَةَ، عن الزُّهْرِیِّ، عن سالِمٍ، عن أبیهِ، قال: رَأَیْتُ رسولَ الله صلی الله علیه وسلم إذا افْتَتَحَ الصَّلاَةَ یَرْفَعُ یَدَیْهِ حَتّٰی یُحَاذِیَ مَنْکِبَیْهِ، وإذا

رَكَعَ، وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوعِ؛ وَزَادَ ابنُ أبی عُمَرَ فی حَدِيْثِهِ: وَكَانَ لاَ يَرْفَعُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ.
قال أبو عيسى: ثنا الفَضْلُ بنُ الصَّبَّاحِ البَغْدَادِيُّ، ثنا سُفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ، ثنا الزُّهْرِيُّ: بِهٰذَا الإِسْنَادِ نَحْوَ حَدِيثِ ابنِ أبی عُمَرَ.
قال: وفی الباب عن عُمَرَ، وعَلِیٍّ، ووائِلِ بنِ حُجْرٍ، ومالِكِ بنِ الحُوَيْرِثِ، وأنسٍ، وأبی هريرةَ، وأبی حُمَيْدٍ، وأبی أُسَيْدٍ، وسَهْلِ بنِ سَعْدٍ، ومُحمدِ بنِ مَسْلَمَةَ، وأبی قَتَادَةَ، وأبی مُوسَى الأَشْعَرِيِّ، وجَابِرٍ، وعُمَيْرٍ اللَّيْثِيِّ.
قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وبِهٰذَا يَقُولُ بَعضُ أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم، مِنهُمْ ابنُ عُمَرَ، وجابرُ بنُ عبدِ اللّٰهِ، وأبو هُرَيرةَ، وأنسٌ، وابنُ عباسٍ، وعبدُ اللّٰهِ بنُ الزُّبَيْرِ وغَيْرُهُمْ، وَمِنَ التَّابعينَ الحَسَنُ البَصْرِیُّ، وعَطَاءٌ، وطَاوُسٌ، ومُجَاهِدٌ، ونَافِعٌ، وسَالِمُ بنُ عبدِ اللّٰهِ، وسَعِيدُ بنُ جُبَيْرٍ وغَيْرُهُمْ؛ وبه يقولُ عَبدُ اللّٰهِ بنُ المبارَكِ، والشافعیُّ، وأحمدُ، وإسحاقُ.
وقال عبدُ اللّٰهِ بنُ المبارَكِ: قد ثَبَتَ حَدِيْثُ مَن يَرْفَعُ، وَذَكَرَ حَدِيثَ الزُّهْرِيِّ، عن سَالِمٍ، عن أبيهِ؛ ولم يَثْبُتْ حَدِيثُ ابنِ مَسعودٍ أَنَّ النبیَّ صلی اللہ علیه وسلم لَمْ يَرْفَعْ إِلَّا فِی أَوَّلِ مَرَّةٍ:
حدثنا بذلك أَحْمَدُ بنُ عَبْدَةَ الآمُلِیُّ، ثنا وَهْبُ بنُ زَمْعَةَ، عن سُفيانَ بنِ عبدِ المَلِكِ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ المبارَكِ.

وضاحت: حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں وكان لا يرفع بين السجدتين والا جملہ ابن ابی عُمر کے علاوہ فضل بن الصَّبَّاح بھی بڑھاتے ہیں۔اسی کی سند امام ترمذی رحمہ اللہ نے لکھی ——— عبداللہ بن المبارک نے ابن عمرؓ کی حدیث کو جس کو ابن شہاب زُہری: سالم سے روایت کرتے ہیں صحیح قرار دیا ہے۔اور انھوں نے ابن مسعود کی اس حدیث کے بارے میں جس میں وہ رسول اللہ ﷺ کا صرف پہلی مرتبہ یعنی صرف تکبیر تحریمہ میں رفع یدین کرنا بیان کرتے ہیں: یہ بات کہی ہے کہ وہ ثابت نہیں۔پھر امام ترمذیؒ نے ابن المبارک کے اس قول کی سند لکھی ہے۔
ملحوظہ: جاننا چاہئے کہ اس عبارت کے بعد یہ باب ہے: بابُ مَن لَم يَرْفَعْ يَدَيْهِ إِلَّا فی أَوَّلِ مَرَّةٍ مگر کسی کی کارستانی سے وہ باب یہاں سے اڑ گیا ہے، تاکہ طالب علم کو یہ دھوکا دیا جاسکے کہ ابن المبارک نے ابن مسعودؓ کی جس حدیث کو لم يَثْبُتْ کہا ہے وہ یہی حدیث ہے جو اگلے باب میں آرہی ہے، حالانکہ ابن المبارک نے ابن مسعودؓ کی جس حدیث کو سنداً غیر صحیح کہا ہے وہ وہ حدیث ہے جس کو وہ مرفوع روایت کرتے ہیں۔اور آئندہ باب کی حدیث جس میں ابن مسعودؓ نے تلامذہ کو نماز پڑھ کر دکھائی ہے اس کو خود امام ترمذیؒ نے حسنؒ کہا ہے اور ابن حزم ظاہری (غیر مقلد)

نے المُحَلّٰی (۴:۸۸) میں صحیح کہا ہے۔

اور اس بات پر کہ یہاں باب ہے خارجی قرائن بھی ہیں اور داخلی بھی۔ خارجی قرائن یہ ہیں:

(۱) شیخ محمد عابد سندی رحمہ اللہ کا ترمذی کا قلمی نسخہ جو مدینہ کے ایک کتب خانہ میں آج تک محفوظ ہے اس میں یہاں باب ہے۔

(۲) شیخ سالم بن عبد اللہ بصری کا ترمذی کا ایک نسخہ کراچی کے قریب پیر جھنڈا نامی جگہ کے ایک کتب خانہ میں محفوظ ہے اس میں بھی یہاں باب ہے۔

(۳) علامہ یعقوب فیروز آبادی صاحب قاموس کی سِفر السعادۃ کی شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے شرح لکھی ہے جو فارسی میں ہے "شرح سفر السعادۃ" میں شیخ نے ترمذی کے دونوں باب بعینہ نقل کئے ہیں اس میں بھی یہاں باب ہے۔

اور داخلی قرائن یہ ہیں:

(۱) امام ترمذیؒ کی عادت معرکۃ الآراء مسائل میں حجازی اور عراقی مکاتیب فکر کے لئے الگ الگ باب قائم کرنے کی ہے اور یہ مسئلہ معرکۃ الآراء ہے۔ پس عدم رفع کے لئے بھی باب ہونا چاہئے کیونکہ یہی مصنف کی عادت ہے۔

(۲) امام ترمذیؒ ایک باب میں دو مرتبہ وفی الباب نہیں لکھتے، پس آگے جو وفی الباب آرہا ہے وہ قرینہ ہے کہ یہاں دوسرا باب ہے۔

(۳) امام ترمذیؒ کی عادت جانبین کے دلائل الگ الگ بابوں میں بیان کرنے کے بعد ان کے مذاہب ذکر کرنے کی ہے۔ اور یہاں ایسا ہی ہے پس یہ تیسرا قرینہ ہے کہ یہاں باب ہے۔

[باب من لم یَرْفَعْ یَدَیْہِ إلّا فی أول مرۃ]

رفع یدین صرف تکبیر تحریمہ کے ساتھ ہے

حدیث: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنے تلامذہ سے فرمایا: کیا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں؟ پھر آپ نے نماز پڑھی تو پہلی مرتبہ یعنی تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کیا۔

تشریح: جب ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھنے سے پہلے فرمایا کہ کیا میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھ کر نہ دکھاؤں؟ تو اب آپ کی پڑھی ہوئی نماز حکماً مرفوع ہوگئی۔ اور حدیث مرفوع میں قیاس کا دخل نہیں ہوتا۔ آنحضرت ﷺ کی طرف کسی بات کی نسبت علم ومشاہدہ ہی پر مبنی ہوسکتی ہے، خیال پر مبنی نہیں ہوسکتی۔

[۷۸] [باب من لم یَرْفَعْ یَدَیْہِ إلّا فی أول مرۃ]

[۲۵۶-] حدثنا ھناد، نا وَکیعٌ، عن سُفیانَ، عن عَاصِمِ بنِ کُلَیْبٍ، عن عبدِ الرحمنِ بنِ الأسْوَدِ،

عن عَلْقَمَةَ، قال: قال عبدُ اللهِ بنُ مسعودٍ: أَلاَ أُصَلِّيْ بِكُمْ صَلاَةَ رسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم؟ فَصَلّٰى، فَلَمْ يَرْفَعْ إِلاَّ فِيْ أَوَّلِ مَرَّةٍ.

قال: وفي الباب عن البَرَاءِ بنِ عَازِبٍ؛ قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ مسعودٍ حديثٌ حسنٌ، وبه يَقولُ غيرُ واحدٍ مِن أهلِ العلمِ من أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم والتابعينَ، وهو قَوْلُ سُفيانَ، وأَهْلِ الْكُوْفَةِ.

اب دوباتیں جان لینی چاہئیں:

پہلی بات: دونوں بابوں کا خلاصہ یہ ہے کہ رفع کا ثبوت تسلیم کرنا بھی ضروری ہے اور عدم رفع کا ثبوت تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ دور صحابہ سے دونوں کا تعامل چلا آرہا ہے۔ لہٰذا کسی ایک کا انکار درست نہیں۔ اور رفع کے سلسلہ کی روایات زیادہ ہیں اگرچہ قابل استدلال ان میں سے صرف چھ یا سات ہیں۔ اور ترکِ رفع کی روایات کم ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امت میں اسی کا تعامل رہا ہے۔ اور جب کوئی چیز تعامل میں آجاتی ہے تو اس سلسلہ کی روایات کم ہوجاتی ہیں بلکہ جوں جوں تعامل بڑھتا ہے روایات سرے سے ختم ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ اب روایات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تعامل ہی سب سے بڑی دلیل بن جاتی ہے۔ مثلاً: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے شرقاً غرباً پوری دنیا تراویح کی بیس رکعت پڑھتی آرہی ہے۔ پس بیس رکعت کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ تعامل ہی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اسی طرح کلمۂ اسلام لا إله إلا الله، محمد رسول الله کی اور قرآن کریم کی کوئی مخصوص سند نہیں کیونکہ اس کی قطعاً حاجت نہیں۔ یہ دونوں باتیں طبقۃً عن طبقۃٍ روایت ہوتی ہوئی آرہی ہیں، پس اب فلان عن فلان کی کیا حاجت ہے؟

دوسری بات: تمام ائمہ فی الجملہ رفع یدین میں نسخ تسلیم کرتے ہیں کیونکہ صحیح احادیث سے سجدہ میں جاتے وقت (نسائی ۱:۱۶۵) اور دونوں سجدوں کے درمیان (ابوداؤد ۱:۱۰۸) اور دوسری رکعت کے شروع میں (ابوداؤد ۱:۱۰۵) اور تیسری رکعت کے شروع میں (بخاری ۱:۱۰۲) اور ہر اونچ نیچ میں (ابن ماجہ ۶۲) رفع کرنا ثابت ہے۔ مگر محل نزاع رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین ہے۔ باقی تمام جگہوں میں تمام ائمہ نسخ تسلیم کرتے ہیں۔ اب اختلاف صرف یہ باقی ہے کہ عند الرکوع اور عند الرفع بھی رفع یدین منسوخ ہوگیا ہے یا باقی ہے؟ دو امام یہاں بھی نسخ کے قائل ہیں اور دو امام ان دو جگہوں میں نسخ کے قائل نہیں۔

بالفاظ دیگر: اس میں اختلاف ہے کہ رفع نماز میں بڑھا ہے یا گھٹا ہے؟ چھوٹے دو امام کہتے ہیں: بڑھا ہے اور بڑے دو امام کہتے ہیں: گھٹا ہے۔ اور گھٹتے گھٹتے تکبیر تحریمہ تک چلا گیا ہے۔ کیونکہ رفع ایک حرکت ہے جو نماز کے منافی ہے۔ مسلم شریف میں حدیث ہے کہ پہلے نماز میں ہر جگہ رفع تھا حتی کہ سلام پھیرتے وقت بھی لوگ رفع یدین کرتے

تھے۔ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور آپ نے لوگوں کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا تو فرمایا: ''کیا بات ہے؟ میں آپ لوگوں کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھتا ہوں بدکے ہوئے گھوڑوں کی دموں کی طرح؟! نماز میں سکون اختیار کرو!'' (مسلم شریف ۱: ۱۸۲، باب الأمر بالسکون) ——— اور تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع کرنے میں مضائقہ نہیں کیونکہ وہ نماز کے باہر اور اس کے باڈر پر ہے، نماز تکبیر مکمل ہونے پر شروع ہوتی ہے، پس یہ رفع نماز سے باہر ہے۔

علاوہ ازیں اس مسئلہ کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ بڑے دواماموں کے نزدیک رفع محض ایک حرکت ہے جو نماز کے منافی ہے اور چھوٹے دواماموں کے نزدیک رفع نماز کی زینت ہے یعنی رفع کے ذریعہ نماز مزین ہوتی ہے۔ نیل الفرقدین (ص: ۴و۵) میں سعید بن جبیر اور امام شافعی کے اقوال موجود ہیں کہ رفع نماز کی زینت ہے (مگر اس کا تقاضا یہ ہے کہ پھر ہر تکبیر کے ساتھ رفع ہونا چاہئے)

مثال سے مسئلہ کی وضاحت: دارالعلوم کے بارے میں مختلف رپورٹیں ہیں ایک رپورٹ یہ ہے کہ اس میں صرف دارالاہتمام میں بجلی ہے۔دوسری یہ ہے کہ شعبۂ تعلیمات میں بھی بجلی ہے، تیسری یہ ہے کہ درسگاہوں میں بھی بجلی ہے، چوتھی یہ ہے کہ طالب علموں کے کمروں میں بھی بجلی ہے اور پانچویں یہ ہے کہ ہر جگہ بجلی ہے حتی کہ راستوں میں بھی ہے ——— رپورٹوں کے اس اختلاف کو ختم کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔اگر بجلی کا تدریجاً لگنا فرض کیا جائے تو آخری رپورٹ لینی ہوگی کہ تمام جگہوں میں بجلی ہے حتی کہ راستوں میں بھی روشنی کا خوب انتظام ہے۔اور باقی رپورٹوں کو ابتدائی رپورٹیں قرار دینا ہوگا کہ اس وقت اتنی ہی جگہ میں بجلی رہی ہوگی۔اور اگر بجلی کا تدریجاً ختم کیا جانا فرض کیا جائے تو پھر پہلی رپورٹ لینی ہوگی کہ صرف دارالاہتمام میں بجلی ہے اور باقی رپورٹوں کو سابقہ زمانوں پر محمول کرنا ہوگا کہ ان جگہوں پر بھی بجلی تھی۔

رفع یدین میں بھی یہی دو نقطۂ نظر ہو سکتے ہیں: یا تو صرف تحریمہ کے ساتھ رفع مانا جائے اور باقی روایتوں کے بارے میں کہا جائے کہ وہ روایات صحیح ہیں مگر پہلے زمانہ کی ہیں، جو بعد میں منسوخ ہوگئی ہیں۔یا پھر ہر اونچ نیچ میں رفع مانا جائے اور باقی روایتوں کے بارے میں کہا جائے کہ وہ پہلے زمانہ کی ہیں جبکہ صرف انہی مواقع میں رفع یدین تھا۔

بڑے دواماموں کے پیش نظر یہ بات ہے کہ رفع یدین تدریجاً ختم کیا گیا ہے اور آخر میں صرف ایک جگہ باقی رہ گیا ہے۔اور ان کی یہ بات بایں وجہ راجح ہے کہ باقی دوامام بھی فی الجملہ نسخ مانتے ہیں اور چھوٹے دواماموں نے اضافہ فرض کیا ہے اس لئے وہ رفع یدین کی سنیت کے قائل ہیں۔مگر ان کا درمیانی مرحلہ کی روایت کو لینا کسی طرح معقول نہیں۔ان کو چاہئے تھا کہ آخری مرحلہ کی روایت لیتے اور ہر خفض ورفع میں رفع یدین کو سنت کہتے۔علاوہ ازیں جب رفع یدین کے ذریعہ نماز مزین ہوتی ہے تو بھی ہر جگہ رفع یدین باقی رکھنا چاہئے۔زیور جتنا زیادہ ہوگا خوبصورتی بڑھے گی۔

بابُ مَاجَاءَ فِی وَضْعِ الیَدَیْنِ عَلَی الرُّکْبَتَیْنِ فِی الرُّکُوعِ

رکوع میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے کا بیان

حدیث: ابوعبدالرحمٰن سُلَمی کہتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہم سے فرمایا: ''بیشک تمہارے لئے گھٹنے پکڑنا مسنون کیا گیا ہے، لہٰذا رکوع میں گھٹنوں کو پکڑو'' ــــــ اس حدیث میں مجاز بالحذف ہے تقدیر عبارت ہے: إنَّ أَخذَ الرُّکَب اور قرینہ وہ خُذُوا ہے جو بعد میں آرہا ہے۔

تشریح: تمام ائمہ کے نزدیک رکوع کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر گھٹنوں پر اس طرح رکھی جائیں کہ گویا ان کو پکڑ رکھا ہے۔ اور تطبیق منسوخ ہے۔ اور وہ دونوں ہاتھوں کو ملا کر گھٹنوں کے بیچ میں داخل کرنے کا نام ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ تلامذہ کو نماز پڑھائی اور تطبیق کی۔ کسی نے یہ بات حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ذکر کی تو انھوں نے فرمایا: ہم پہلے ایسا کیا کرتے تھے مگر بعد میں اس سے روک دیئے گئے اور ہم حکم دیئے گئے کہ ہتھیلیوں کو گھٹنوں پر رکھیں۔ یعنی یہ حکم منسوخ ہوگیا ہے ــــــ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے تطبیق کر کے اس لئے دکھائی تاکہ تلامذہ رسول اللہ ﷺ کے اس عمل سے واقف ہو جائیں۔ اور اس کی حفاظت کریں۔ کیونکہ تمام احادیث کی حفاظت ضروری ہے اگرچہ وہ منسوخ ہوں اور اس زمانہ میں یاد رکھنے کا طریقہ عمل کر کے دکھانا ہی تھا۔ وہ اوقع فی النفس ہوتا ہے۔

[۷۹] باب ماجاء فی وضع الیدین علی الرکبتین فی الرکوع

[۲۵۷-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِیعٍ، نا أبوبکرِ بنِ عَیَّاشٍ، نا أبو حَصِینٍ، عن أبی عَبدِ الرحمنِ السُلَمِیِّ، قال: قال لَنَا عُمَرُ بنُ الخَطَّابِ: إِنَّ الرُّکَبَ سُنَّتَ لَکُمْ، فَخُذُوْا بِالرُّکَبِ.

قال: وفی الباب: عن سَعْدٍ، وأنسٍ، وأبی حُمیدٍ، وأبی أُسَیْدٍ، وسَهْلِ بنِ سَعْدٍ، ومُحمدِ بنِ مَسْلَمَةَ، وأبی مَسْعودٍ.

قال أبو عیسی: حدیثُ عُمَرَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ. والعَمَلُ عَلٰی هٰذا عند أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم وَالتَّابعینَ ومَن بَعْدَهُمْ، لَا اخْتِلَافَ بَیْنَهُمْ فِیْ ذٰلِکَ، إِلَّا مَا رُوِیَ عن ابنِ مَسْعُوْدٍ وبَعْضِ أصحابِهِ: أَنَّهُمْ کَانُوْا یُطَبِّقُوْنَ؛ والتَّطْبِیْقُ مَنْسُوْخٌ عند أهلِ العلمِ.

[۲۵۸-] قال سَعدُ بنُ أبی وَقَّاصٍ: کُنَّا نَفْعَلُ ذٰلِکَ، فَنُهِیْنَا عَنْهُ، وأُمِرْنَا أَنْ نَضَعَ الْأَکُفَّ عَلَی الرُّکَبِ: حدثنا قُتیبةُ، نا أبو عَوانةَ، عن أبی یَعْفورٍ، عن مُصعبِ بنِ سَعْدٍ، عن أبیه سَعْدٍ بِهٰذَا.

بابُ مَاجَاءَ أَنَّهُ يُجَافِي يَدَيْهِ عَنْ جَنْبَيْهِ فِي الرُّكُوْعِ

رکوع میں دونوں ہاتھ پہلوؤں سے علحدہ رکھے

رکوع کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہتھلیاں دونوں گھٹنوں پر رکھے۔ انگلیاں پھیلا کر گھٹنوں کو دونوں پنجوں میں لیلے۔ گویا پکڑ رکھا ہے مگر پکڑے نہیں، اور کہنیاں پہلوؤں سے علحدہ رکھے، سر کو پیٹھ کے لیول پر رکھے، نہ اونچا رکھے نہ نیچا، پیر سیدھے رکھے، گھٹنے موڑے نہیں۔ اور ہاتھ بھی بالکل سیدھے رکھے، کہنیاں موڑے نہیں، بالکل مثلث متساوی الاضلاع بن جائے۔

حدیث: عباس بن سہل کہتے ہیں: ایک مجلس میں ابوحمید ساعدی، سہل بن سعد، ابواُسید اور محمد بن مسلمہ اکٹھا ہوئے۔ مجلس میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کا تذکرہ چل پڑا۔ ابوحمید ساعدیؓ نے کہا: مجھے نبی ﷺ کی نماز سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ لوگوں نے کہا: یہ بات کیسے ممکن ہے؟ آپ نہ تو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں نہ ہم سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضر رہتے تھے۔ ابوحمید نے کہا: اس کے باوجود میرا دعوی یہی ہے۔ پھر انھوں نے چار رکعت نماز پڑھ کر دکھائی۔ ان کے سلام پھیرنے کے بعد سب نے اقرار کیا کہ واقعی آپ کو رسول اللہ ﷺ کی نماز ہم سے زیادہ محفوظ ہے —— روایت کی صحیح صورت یہی ہے۔ پھر جو نماز پڑھ کر ابوحمید نے دکھائی تھی راوی نے اس کے خاص خاص اجزاء کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے ٹکڑے کئے ہیں اور اس کو مختلف ابواب میں ذکر کیا ہے۔ پوری حدیث باب ماجاء فی وصف الصلاۃ میں آئے گی۔ مگر وہ حدیث محمد بن عمرو بن عطاء کی ہے اس راوی نے یہ بیان کیا ہے کہ اس مجلس میں دس صحابہ تھے اور ان میں حضرت ابوقتادہؓ بھی تھے مگر یہ بات غلط ہے۔ صحیح بات وہ ہے جو عباس بن سہل بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر صرف چار صحابہ موجود تھے اور وہ بھی سب صغار صحابہ تھے۔

یہاں حدیث کا جو ٹکڑا لایا گیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے: رسول اللہ ﷺ نے رکوع کیا اور دونوں ہتھیلیاں دونوں گھٹنوں پر رکھیں۔ گویا آپ ان کو پکڑنے والے ہیں۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں کو تانت بنایا۔ یعنی ہاتھوں کو بالکل سیدھا کمان کی تانت کی طرح کیا اور ان کو اپنے دونوں پہلوؤں سے جدا رکھا۔ یہی رکوع کرنے کا مسنون طریقہ ہے۔ لوگ عجیب عجیب طرح سے رکوع کرتے ہیں۔ کوئی انگلیاں پھیلائے بغیر گھٹنوں پر رکھتا ہے، کوئی گھٹنے کس کر پکڑ لیتا ہے، کوئی ہاتھ کہنوں سے موڑ لیتا ہے، کوئی بازو پہلوؤں سے چپکا لیتا ہے، کوئی گھٹنے آگے نکال دیتا ہے۔ یہ سب غلط طریقے ہیں، لوگوں کو چاہئے کہ اس حدیث کی روشنی میں اپنے رکوع صحیح کریں۔

[۸۰] باب ماجاء أنه يُجَافِيْ يَدَيْه عن جَنْبَيْهِ في الركوع

[۲۵۹-] حدثنا بُندارٌ، نا أبو عامرٍ العَقَدِيُّ، نا فُلَيْحُ بنُ سُلَيْمَانَ، نا عَبَّاسُ بنُ سَهْلٍ، قال: اجْتَمَعَ

أبو حُمَيْدٍ، وأبو أُسَيْدٍ، وسَهْلُ بنُ سَعْدٍ، ومُحمدُ بنُ مَسْلَمَةَ، فَذَكَرُوا صَلَاةَ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، فَقَالَ أبو حُمَيْدٍ: أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِصَلَاةِ رَسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: إِنَّ رَسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم رَكَعَ، فَوَضَعَ يَدَيْهِ عَلَى رُكْبَتَيْهِ، كَأَنَّهُ قَابِضٌ عَلَيْهِمَا، وَوَتَّرَ يَدَيْهِ، فَنَحَّاهُمَا عَنْ جَنْبَيْهِ.

قال: وفي الباب عن أنسٍ؛ قال أبو عيسى: حديثُ أبي حُمَيْدٍ حسنٌ صحيحٌ؛ وهُوَ الَّذِیْ اخْتَارَهُ أهلُ العِلْمِ: أَن يُجَافِيَ الرَّجُلُ بِيَدَيْهِ عَنْ جَنْبَيْهِ فِي الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ.

وضاحت: رکوع وسجود دونوں ہی میں دونوں بازو پہلوؤں سے علحدہ رکھنے چاہئیں اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

بابُ مَاجَاءَ فِي التَّسْبِيْحِ فِى الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ

رکوع وسجود کی تسبیحات کا بیان

رکوع میں تسبیحِ تعظیم اور سجدہ میں تسبیحِ اعلی پڑھنا مسنون ہے۔ اگر کوئی برعکس کرے یعنی رکوع میں تسبیحِ اعلی اور سجدہ میں تسبیحِ عظیم پڑھے تو یہ بھی جائز ہے۔ بلکہ ان کے علاوہ دیگر تسبیحات پڑھنے کی بھی گنجائش ہے۔

حدیث (۱): حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کوئی بندہ رکوع کرے اور وہ رکوع میں سبحان ربی العظیم تین مرتبہ کہے تو اس کا رکوع مکمل ہوگیا اور یہ کم سے کم مقدار ہے (زیادہ کہنا بہتر ہے) اور جب وہ سجدہ کرے اور سجدہ میں سبحان ربی الأعلی تین مرتبہ کہے تو اس کا سجدہ مکمل ہوگیا اور یہ کم سے کم مقدار ہے (زیادہ کہنا بہتر ہے)

فائدہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک بار مدینہ تشریف لائے۔ اس وقت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مدینہ کے گورنر تھے اور عنفوانِ شباب میں تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان کی اقتداء میں کوئی نماز پڑھی پھر نماز کے بعد فرمایا: اس نوجوان کی نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز سے جتنی مشابہ ہے اتنی مشابہ میں نے کسی کی نماز نہیں دیکھی۔ لوگوں نے بعد میں اندازہ کیا تو ان کے رکوع وسجود دس تسبیحات کے بقدر تھے۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ رکوع وسجود میں دس بار یا اس کے لگ بھگ تسبیحات کہتے تھے۔ (مشکوۃ حدیث ۸۸۳)

فائدہ: آج کل سعودیہ کے اماموں نے رکوع وسجود اتنے مختصر کردیئے ہیں کہ دو مرتبہ ہی اطمینان سے تسبیح کہی جاسکتی ہے۔ اور یہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس کا تذکرہ آگے ایک حدیث (باب ۹۴) کے ضمن میں آئے گا۔ عربوں کا خیال یہ ہے رکوع وسجود اور قومہ جلسہ برابر ہونے چاہئیں۔ اب اگر رکوع وسجود میں تین مرتبہ سے زیادہ تسبیح کہتے ہیں تو اس کے بقدر قومہ وجلسہ کرنا پڑتا ہے اور یہ بات دشوار ہے، اس لئے انھوں نے سنت کے خلاف رکوع وسجود ہی مختصر کرلئے اور

ہمارے ملک میں بعض ائمہ نے ان کی اندھی تقلید شروع کردی۔

حدیث (۲): حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے (تہجد میں) رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کی۔ آپ رکوع میں تسبیحِ عظیم اور سجدہ میں تسبیحِ اعلی پڑھتے تھے۔ اور دورانِ تلاوت جب کسی ایسی آیت سے گذرتے جس میں رحمت کا مضمون ہوتا تو ٹھہر کر رحمتِ خداوندی کی دعا مانگتے۔ اور جب عذاب والے مضمون کی آیت سے گذرتے تو بھی ٹھہرتے اور پناہ طلب کرتے۔

فائدہ: حضرت الاستاذ علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی رحمہ اللہ نے فرمایا: فرائض اللہ کے دربار کی خاص ملاقات ہے اور نوافل گھر کی پرائیویٹ ملاقات ہے، جیسے وزیر اعظم سے ملاقات کرنے جاتے ہیں تو پہلے وقت لیتے ہیں اور آداب دربار کی رعایت کرکے حاضر ہوتے ہیں۔ اور وقت مقررہ میں اپنی بات پوری کرتے ہیں اور جب وزیر اعظم سے دوستانہ ملاقات ان کے گھر میں کرتے ہیں تو کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ جب تک چاہیں باتیں کریں اور جتنا چاہیں بیٹھیں، کیونکہ یہ پرائیویٹ ملاقات ہے۔ یہی حال فرائض ونوافل کا ہے۔ فرائض میں اللہ کے دربار میں باقاعدہ حاضری ہوتی ہے پس فرائض کے لئے جو اصول وضوابط ہیں ان کی رعایت کرنا اور متعین اذکار پر اکتفا کرنا ضروری ہے۔ اور نوافل میں آزادی ہے جس طرح چاہے پڑھے اور جہاں چاہے مانگے، اس لئے آنحضور ﷺ تہجد میں دورانِ تلاوت ٹھہر کر دعا مانگتے تھے۔

[۸۱] باب ماجاء فی التسبیح فی الرکوع والسجود

[۲۶۰-] حدثنا عَلِیُّ بنُ حُجْرٍ، أنا عیسیٰ بنُ یُونُسَ، عن ابنِ أبی ذِئْبٍ، عن إسحاقَ بنِ یَزِیْدَ الهُذَلِیِّ، عن عَوْنِ بنِ عبدِ اللّٰهِ بنِ عُتْبَةَ، عن ابنِ مَسعودٍ، أَنَّ النبیَّ صلی اللہ علیه وسلم قال:" إِذَا رَکَعَ أَحَدُکُمْ، فَقَالَ فی رُکُوعِهِ: سُبحانَ ربی العظیم ثَلاَثَ مَرَّاتٍ فَقَدْتَمَّ رَکُوْعُهُ، وذٰلِكَ أَدْنَاهُ، وإِذَا سَجَدَ فقال فی سُجودِهِ: سُبحان ربی الأعلی ثَلاَثَ مَرَّاتٍ فَقَدْ تَمَّ سُجُوْدُهُ وَذٰلِكَ أَدْنَاهُ"

قال: وفی الباب عن حُذَیْفَةَ، وعُقْبَةَ بنِ عَامِرٍ؛ قال أبو عیسی: حدیثُ ابنِ مَسعودٍ لَیْسَ إِسْنَادُهُ بِمُتَّصِلٍ؛ عَوْنُ بنُ عبدِ اللّٰهِ بنِ عُتْبَةَ لَمْ یَلْقَ ابنَ مَسْعُوْدٍ.

والعَمَلَ عَلَی هٰذَا عند أهلِ العلمِ یَسْتَحِبُّوْنَ أن لاَّ یَنْقُصَ الرَّجُلُ فی الرُّکوعِ والسُّجوْدِ مِن ثَلاَثِ تَسْبِیْحَاتٍ.

ورُوِیَ عن ابنِ المبارکِ أَنَّهُ قَالَ: أَسْتَحِبُّ لِلإِمَامِ أَنْ یُسَبِّحَ خَمْسَ تَسْبِیْحَاتٍ لِکَیْ یُدْرِكَ مَنْ خَلْفَهُ ثَلاَثَ تَسْبِیْحَاتٍ، وهٰکَذَا قال إسحاقُ بنُ إبراهیمَ.

[۲۶۱-] حدثنا مَحمودُ بنُ غَیْلاَنَ، نا أبوداوُدَ، قال: أَنْبَأنا شُعْبَةُ، عنِ الأَعْمَشِ، قال: سمِعْتُ

سَعدَ بنَ عُبَيْدَةَ، يُحَدِّثُ عنِ المُسْتَوْرِدِ، عن صِلَةَ بنِ زُفَرَ، عن حُذَيْفَةَ: أَنَّهُ صَلّٰى مَعَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم فَكَانَ يَقولُ فى رُكوعِهِ: سُبحان ربى العظيم، وفى سُجودِهِ: سُبحان ربى الأعلى، وَمَا أَتَى عَلَى آيَةِ رَحْمَةٍ إِلَّا وَقَفَ وَسَأَلَ، وما أَتَى عَلَى آيَةِ عَذَابٍ إِلَّا وَقَفَ وَتَعَوَّذَ.

قال أبو عيسى: وهٰذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وثنا مُحمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا عبدُ الرحمنِ بنُ مَهْدِيٍّ، عن شُعْبَةَ نَحْوَهُ.

وضاحت: ابن مسعودؓ کی حدیث منقطع ہے کیونکہ عون بن عبداللہ کا ابن مسعود سے لقاء نہیں ——— اور علماء اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ رکوع وسجود میں تین مرتبہ سے کم تسبیحات نہ پڑھی جائیں۔ ابن المبارکؒ فرماتے ہیں: مجھے امام کے تعلق سے یہ بات پسند ہے کہ وہ پانچ مرتبہ تسبیح پڑھے۔ تا کہ جولوگ پیچھے ہیں وہ بآسانی تین مرتبہ پڑھ لیں۔ یہی بات حضرت اسحاق رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔

بابُ مَاجَاءَ فى النَّهْيِ عَنِ القِرَاءَةِ فى الرُّكُوْعِ والسُّجُوْدِ

رکوع سجدے اور قعدے میں قرآن پڑھنا مکروہ ہے

نماز کی چار حالتوں میں سے یعنی قیام، رکوع، سجدہ اور قعدہ میں سے صرف قیام میں قرآن پڑھا جائے گا۔ اور یہ بات قرآن کریم کی تعظیم کے لئے ہے۔ کیونکہ انسان کی سب سے بہتر حالت قیام کی حالت ہے۔ قیام کے علاوہ دیگر حالتوں میں قرآن پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور یہ بات واجباتِ تلاوت میں سے ہے، واجباتِ نماز میں سے نہیں ہے۔ جیسے نماز میں اترتی ہوئی سورتیں پڑھنا واجب تلاوت میں سے ہے۔ پس جو شخص خلاف ترتیب پڑھے یعنی چڑھتی ہوئی سورتیں پڑھے یا رکوع، سجدہ اور قعدہ میں قراءت کرے اس کی نماز تو صحیح ہو جائے گی اور سجدۂ سہو بھی واجب نہ ہوگا مگر جان بوجھ کر ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

حدیث: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں چار باتوں سے منع فرمایا: قَسّی کپڑے سے، گیروے رنگ کے کپڑے سے، سونے کی انگوٹھی سے اور رکوع میں قرآن پڑھنے سے۔

تشریح:

(۱): بعض حضرات کہتے ہیں کہ قَسّ مصر کے ایک گاؤں کا نام ہے وہاں جو کپڑا تیار ہوتا تھا اس کو قَسّی کہتے تھے۔ اور وہ کپڑا سرخ ہوتا تھا۔ پس ممانعت کی وجہ اس کا سرخ ہونا ہے۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ یہ خَزّ کا معرب ہے جس کے معنی ہیں: ریشم پس ممانعت کی وجہ اس کا ریشم ہونا ہے، ریشم مردوں کے لئے حرام ہے۔

(۲) مُعَصْفَر: گیروے رنگ کے کپڑے کو کہتے ہیں، جس کو سادھوسنت پہنتے ہیں۔ اور ممانعت کی وجہ غیروں کی مشابہت ہے۔

(۳) سونے کی انگوٹھی مردوں کے لئے حرام ہے، البتہ چاندی کی انگوٹھی ایک مثقال سے کم (چار گرام کے بقدر) پہن سکتے ہیں۔

(۴) رکوع میں قرآن پڑھنے کی دوصورتیں ہیں:

پہلی صورت: حالتِ قیام میں جو قرآن پڑھ رہا تھا اس کو پورا کرنے سے پہلے رکوع میں چلا جائے اور رکوع میں جا کر قراءت مکمل کرے۔

دوسری صورت: رکوع ہی میں قراءت کرے۔ یہ دونوں صورتیں ممنوع ہیں، مگر ان سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اور یہی حکم سجدے اور قعدے میں قراءت کرنے کا ہے۔

[۸۲] باب ماجاء فی النهی عن القراء ة فی الركوع والسجود

[۲۶۲-] حدثنا إسحاقُ بنُ مُوسَى الأنصارِيُّ، نا مَعْنٌ، نا مالِكٌ، ح: وثنا قُتَيْبَةُ، عن مالِكٍ، عن نافِعٍ، عن إبراهيمَ بنِ عبدِ اللهِ بنِ حُنَيْنٍ، عن أبيه، عن عَلِيِّ بنِ أبي طالِبٍ: أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم نَهَى عن لُبْسِ القَسِّيِّ، وَالمُعَصْفَرِ، وعَن تَخَتُّمِ الذَّهَبِ، وعن قِرَاءَةِ القُرآنِ فِي الركوعِ.

وفي الباب: عن ابن عباسٍ، قال أبو عيسى: حديثُ عليٍّ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وهُوَ قَوْلُ أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم ومَن بَعْدَهُمْ: كَرِهُوْا القِرَاءَ ةَ فِي الرُّكُوْعِ والسُّجُوْدِ.

بابُ مَاجَاءَ فِي مَنْ لَايُقِيْمُ صُلْبَهُ فِي الركوعِ والسُّجوْدِ

رکوع وسجود میں پیٹھ سیدھی نہ کرنے کا بیان

ارکانِ اربعہ یعنی رکوع، قومہ، سجدہ اور جلسہ میں تعدیل حنفیہ کے نزدیک واجب ہے اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فرض ہے۔ جب آدمی اتنا جھکے کہ ہاتھ گھٹنوں تک پہنچ جائیں تو رکوع ہوگیا۔ پھر پیٹھ سیدھی کرنا یعنی باطمنان رکوع کرنا تعدیل ہے۔ اسی طرح جب کھڑے ہونے کے قریب ہوگیا تو قومہ ہوگیا اور پیٹھ سیدھی کرنا یعنی باطمینان کھڑا ہونا قومہ کی تعدیل ہے۔ اور زمین پر پیشانی رکھنے سے سجدہ ہوگیا اور اس میں ٹھہرنا تعدیل ہے۔ اور جب بیٹھنے سے قریب ہوگیا تو جلسہ ہوگیا اور باطمینان بیٹھنا جلسہ کی تعدیل ہے۔ غرض ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ارکانِ اربعہ میں تعدیل فرض ہے پس ان کے نزدیک اگر ارکانِ اربعہ باطمینان ادا نہیں کرے گا تو نماز نہیں ہوگی۔ اور حنفیہ کے نزدیک تعدیل

واجب ہے اور یہ ایسا واجب ہے جس کی سجدۂ سہو سے تلافی نہیں ہوسکتی۔ پس تعدیل کے تارک کی نماز کراہت تحریمی کے ساتھ صحیح ہوگی، یعنی ذمہ فارغ ہوجائے گا مگر وقت کے اندر اس کا اعادہ واجب ہے اور وقت کے بعد مستحب۔ یہ مسئلہ باب ماجاء فی وصف الصلاۃ (باب ۱۱۳) میں دوبارہ آئے گا ——— اور اس باب کی حدیث سے دونوں فریقوں نے استدلال کیا ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کافی نہیں کوئی نماز جس میں آدمی سیدھا نہ کرے یعنی رکوع وسجود میں اپنی پیٹھ سیدھی نہ کرے، یعنی جو شخص باطمینان رکوع وسجود نہ کرے اس کی نماز کافی نہیں یعنی اگر چہ دال دلیا ہوجاتا ہے مگر نماز کامل نہیں ہوتی۔

ائمہ ثلاثہ لا تُجزِئُ کا ترجمہ لاتَجوز کرتے ہیں۔ یعنی پیٹھ سیدھی نہ کرنے والے کی نماز صحیح نہیں ہوتی اور وہ حضرات اعلی درجہ کی خبر واحد سے فرضیت ثابت کرتے ہیں اس لئے انھوں نے تعدیل کو فرض کہا ہے۔ مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ لا تُجزِئُ کا ترجمہ لاتجوز کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا ترجمہ تو کافی نہ ہونا ہی ہے۔ پس حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ تعدیل نہ کرنے کی صورت میں نماز تو ہوجاتی ہے مگر کامل نہیں ہوتی، ناقص ہوتی ہے۔

[۸۳] باب ماجاء فی مَنْ لَایُقِیْمُ صُلْبَهُ فی الرکوعِ والسُّجُوْدِ

[۲۶۳-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِیعٍ، نا أبو معاویةَ، عن الأعمشِ، عن عُمَارَةَ بنِ عُمَیْرٍ، عن أبی مَعْمَرٍ، عن أبی مَسعودٍ الأنصارِیِّ، قال: قال رسولُ اللهِ صلی الله علیه وسلم: "لا تُجزِئُ صَلَاةٌ لَایُقِیْمُ الرَّجُلُ فِیْهَا – یَعنی صُلْبَهُ – فی الرکوعِ وفی السجودِ.

قال: وفی الباب عن عَلیِّ بنِ شَیْبَانَ، وأنسٍ، وأبی هریرةَ، ورِفَاعَةَ الزُّرَقِیِّ.

قال أبو عیسی: حدیثُ أبی مسعودٍ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ، والعَمَلُ عَلَی هٰذا عند أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم ومَنْ بَعْدَهُمْ: یَرَوْنَ أنْ یُقِیْمَ الرَّجُلُ صُلْبَهُ فی الرکوعِ والسجودِ.

وقال الشافعیُّ وأحمدُ وإسحاقُ: مَن لَایُقِیْمُ صُلْبَهُ فی الرکوعِ والسجودِ فَصَلَاتُهُ فَاسِدَةٌ، لِحَدیثِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم: " لَاتُجزِئُ صَلَاةٌ لَایُقِیْمُ الرَّجُلُ فیها صُلْبَهُ فی الرکوعِ والسجودِ"

وأبو مَعْمَرٍ: اسْمُهُ عَبْدُ اللّٰهِ بنُ سَخْبَرَةَ؛ وأبو مَسعودٍ الأنصارِیُّ البَدْرِیُّ: اسْمُه عُقْبَةُ بنُ عَمْرٍو.

ترجمہ: اور اس پر صحابہ اور بعد کے اہل علم کا عمل ہے، وہ آدمی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں رکوع وسجود میں پیٹھ سیدھی کرنے کو، اور شافعی احمد اور اسحاق رحمہم اللہ نے فرمایا: جو رکوع وسجدہ میں پیٹھ سیدھی نہ کرے اس کی نماز فاسد ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: لاتجزئ صلاۃ إلخ ——— اور حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ بدر

نامی گاؤں کے باشندے تھے اس لئے بدری کہلاتے تھے۔ جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے۔

بابُ مَايَقُوْلُ الرجلُ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ عَنِ الرکُوْعِ

رکوع سے اٹھتے وقت کیا ذکر کرے؟

رکوع سے کھڑے ہوتے وقت امام صرف تسمیع کہے گا اور مقتدی صرف تحمید۔ یہ رائے امام اعظم، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جب امام سمع الله لمن حمده کہے تو آپ لوگ ربنا لك الحمد کہیں یعنی امام اور مقتدی کے درمیان ذکر تقسیم کردیا ہے۔ اور صاحبین کے نزدیک امام تسمیع وتحمید دونوں کو جمع کرے گا اور مقتدی صرف تحمید کرے گا۔ اس لئے کہ مذکورہ حدیث کا ماسیق لاجلہ الکلام صرف مقتدیوں کو تحمید کا حکم دینا ہے۔ اور امام کے تعلق سے حدیث ساکت ہے اور عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ امام کو بھی تحمید کرنی چاہئے کیونکہ اس نے تحمید کرنے کا اعلان کیا ہے پس خود اس کو بھی اس پر عمل کرنا چاہئے۔ میرا صاحبین کے قول پر عمل ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ امام ومقتدی دونوں کے لئے دونوں کو جمع کرنے کی بات کہتے ہیں —— اور اختلاف جماعت کی نماز میں ہے۔ تنہا نماز پڑھنے والا دونوں کو جمع کرے گا خواہ وہ فرض پڑھ رہا ہو یا نفل، اور یہ مسئلہ اجماعی ہے۔

حدیث: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع سے سر اٹھاتے تھے تو سمع الله لمن حمده الخ کہتے تھے۔ ترجمہ: ''اے ہمارے پروردگار! آپ کے لئے تعریف ہے آسمانوں اور زمین کو بھر کر اور جو چیز ان کے درمیان ہے یعنی فضا کو بھر کر۔ اور ان چیزوں کو بھر کر جن کو آپ ان کے علاوہ چاہیں'' —— یہ حدیث نفلوں کے بارے میں ہے۔

تشریح: ربنا ولك الحمد چار طرح سے مروی ہے: (۱) صرف واو کے ساتھ یعنی ربنا ولك الحمد (۲) واو کے بغیر یعنی ربنا لك الحمد (۳) صرف اللّٰهم کے ساتھ یعنی اللّٰهم ربنا لك الحمد (۴) دونوں کے ساتھ یعنی اللّٰهم ربنا ولك الحمد۔ مگر ابن القیم رحمہ اللہ اللّٰهم اور واو کے اجتماع کو تسلیم نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ احادیث سے دونوں کو جمع کرنے کا ثبوت نہیں ہے (زاد المعاد ۱: ۲۲۰)[۱]

فائدہ: رکوع وسجود اور دیگر مواقع میں جو طویل اذکار مروی ہیں ان میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ فرائض ونوافل میں فرق کرتے ہیں، کیونکہ فرائض باقاعدہ اللہ کے دربار کی حاضری ہے۔ اس لئے ان میں صرف متعین اذکار پڑھنے چاہئیں اور نفل پرائیویٹ ملاقات ہے پس طویل اذکار کی ان میں گنجائش ہے اور دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ

---

(۱) ربنا لك الحمد اور ربنا ولك الحمد اور اللّٰهم ربنا ولك الحمد کے صیغے بخاری میں بالترتیب حدیث نمبر ۷۸۹، ۸۰۳ اور ۷۹۵ میں مذکور ہیں۔ اور اللّٰهم ربنا لك الحمد مسلم (۱: ۱۹۰) میں مروی ہے۔

نے فرض ونفل میں فرق کیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ فرض نماز میں دائیں بائیں دیکھ رہے تھے، آپؐ نے ان کو ٹوکا اور فرمایا: فرض نماز میں التفات ہلاکت ہے، ہاں نفلوں میں اس کی گنجائش ہے۔ یہ حدیث آگے آرہی ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے جماعت اور غیر جماعت میں فرق کیا ہے۔ جماعت کی نماز میں اجازت نہیں، تنہا نماز پڑھ رہا ہو تو طویل اذکار کرسکتا ہے اگرچہ وہ فرض نماز ہو۔ کیونکہ جماعت میں تخفیف مطلوب ہے، پس لمبے اذکار اس میں نہیں پڑھنے چاہئیں۔ اور غیر جماعت میں جب تک جی چاہے اذکار پڑھ سکتا ہے۔ وہ ذاتی معاملہ ہے۔ نقطۂ نظر کا یہ اختلاف یاد رکھنا چاہئے، آئندہ بھی اس کی ضرورت پیش آئے گی۔

[۸۴] باب مايقول الرجلُ إذا رفع رأسه عن الركوع؟

[۲۶۴-] حدثنا مَحمودُ بنُ غَيْلاَنَ، نا أبو داودَ الطَّيَالِسِيُّ، نا عبدُ العزيزِ بنُ عبدِ اللّٰهِ بنِ أبى سَلَمَةَ المَاجِشُوْنَ، نا عَمِّى، عن عَبدِ الرحمنِ الْأعْرَجِ، عن عُبَيْدِ اللّٰهِ بنِ أبى رَافِعٍ، عن عَلِىِّ بنِ أبى طَالِبٍ قال: كان رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّكُوْعِ قال: " سَمِعَ اللّٰهُ لمن حَمِدَهُ، ربنا ولك الحمدُ، مِلْأَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ، ومِلْأَ مَا بَيْنَهُمَا، ومِلْأَ مَاشِئْتَ مِنْ شَيْئٍ بَعْدُ"

قال: وفى الباب: عن ابنِ عُمَرَ، وابنِ عباسٍ، وابن أبى أَوْفٰى، وأبى جُحَيْفَةَ، وأبى سَعيدٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ علىٍّ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ والعَمَلُ عَلَى هٰذا عند بَعْضِ أهلِ العلمِ، وبه يقولُ الشافعىُّ: قال: يَقولُ هٰذا فى المَكْتُوْبَةِ والتَّطَوُّعِ؛ وقال بَعْضُ أهلِ الكوفةِ: يَقُولُ هٰذا فى صَلاَةِ التَّطَوُّعِ، ولاَيَقُوْلُهُ فى صَلاَةِ المَكْتُوْبَةِ.

ترجمہ: اور عمل اس حدیث پر ہے بعض علماء کے نزدیک اور اسی کے امام شافعیؒ قائل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ تسمیع اور (طویل) تحمید فرض اور نفل نماز میں کرسکتا ہے اور کوفہ کے بعض حضرات کہتے ہیں: یہ ذکر نفل نماز میں کرے فرض نماز میں نہ کرے۔

بابٌ مِنْهُ آخَرُ

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب امام تسمیع کرے تو تم تحمید کرو۔ اس لئے کہ جس کی تحمید فرشتوں کی تحمید کے ساتھ موافق ہوجائے گی اس کے سابقہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

تشریح: موافقت کی دو تفسیریں ہیں: ایک: موافقت فی الزمان، دوسری: موافقت فی الاخلاص۔ تفصیل آمین کے بیان میں گذر چکی ہے (دیکھیں تحفۃ الالمعی ۱:۵۹۱)

[٨٥] باب منه آخر

[٢٦٥-] حدثنا الأَنْصَارِیُّ، نا مَعْنٌ، نا مالِكٌ، عن سُمَیٍّ، عن أبی صَالِحٍ، عن أبی هريرةَ، أنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم قال:" إِذَا قَالَ الإِمَامُ: سمع الله لمن حمده فَقُوْلُوْا: ربنا لك الحمد، فَإِنَّهُ مَن وَافَقَ قَوْلُهُ قَوْلَ المَلاَئِكَةِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ"

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ والعَمَلُ عَلَيْهِ عِنْدَ بَعْضِ أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم ومَنْ بَعْدَهُمْ: أنْ يَقُوْلَ الإِمَامُ: سَمع الله لمن حمده، ويَقولُ مَن خَلْفَ الإِمَامِ: ربنا ولك الحمد؛ وبه يقول أحمدُ؛ قال ابنُ سِيرينَ وغَيْرُه: يَقولُ مَنْ خَلْفَ الإِمَامِ: سمع الله لمن حمده، ربنا ولك الحمد، مِثْلَ مَایَقولُ الإِمَامُ، وبه يَقولُ الشافعیُّ وإسحاقُ.

ترجمہ: اس حدیث پر صحابہ اور بعد کے بعض اہل علم کا عمل ہے۔ وہ کہتے ہیں: امام تسمیع کہے گا اور جو لوگ پیچھے ہیں وہ تحمید کہیں گے۔ اور یہ قول امام احمد رحمہ اللہ کا ہے (یہی قول امام اعظم کا ہے) ابن سیرین رحمہ اللہ وغیرہ کہتے ہیں: جو لوگ امام کے پیچھے ہیں وہ تسمیع وتحمید دونوں کہیں گے، امام کے دونوں کو کہنے کی طرح، اور یہ شافعی اور اسحاق رحمہما اللہ کا قول ہے۔

بابُ مَاجَاءَ فی وَضْعِ اليَدَيْنِ قَبْلَ الرُّكْبَتَيْنِ فِیْ السُّجُوْدِ

سجدہ میں جاتے ہوئے پہلے گھٹنے پھر ہاتھ رکھے

یہاں دو نسخے ہیں۔ حوض میں جو نسخہ ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ سجدہ میں جاتے ہوئے زمین پر پہلے ہاتھ پھر گھٹنے رکھنے چاہئیں۔ اور حاشیہ والے نسخہ کا مفہوم اس کے برعکس ہے، یعنی پہلے گھٹنے پھر ہاتھ رکھنے چاہئیں اور اسی کا ترجمہ کیا ہے کیونکہ یہی نسخہ صحیح ہے باب میں جو حدیث ہے وہ اسی نسخہ پر منطبق ہوتی ہے۔ حوض والے نسخہ پر منطبق نہیں ہوتی۔

حدیث: حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا جب آپ نے سجدہ کیا تو گھٹنوں کو اپنے ہاتھوں سے پہلے زمین پر رکھا۔ اور جب سجدہ سے سر اٹھایا تو ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں سے پہلے اٹھایا۔

تشریح: جمہور کے نزدیک سجدہ میں جاتے وقت جو اعضاء زمین سے قریب ہیں ان کو پہلے رکھنا چاہئے۔ اور سجدہ سے اٹھتے وقت جو اعضاء آسمان سے قریب ہیں ان کو پہلے اٹھانا چاہئے۔ اور ان کا مستدل باب کی حدیث ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک پہلے ہاتھ رکھنا پھر گھٹنے رکھنا مسنون ہے۔ ان کی دلیل اگلے باب کی حدیث ہے۔

[٨٦] باب ماجاء فی وضع الیدین قبل الرکبتین فی السجود

[٢٦٦-] حدثنا سَلَمَةُ بنُ شَبِيْبٍ، وعبدُ اللّٰهِ بنُ مُنِيْرٍ، وأحمدُ بنُ إبراهيمَ الدَّوْرَقِيُّ، والحَسَنُ بنُ عَلِيِّ الحُلْوَانِيُّ، وغَيْرُ وَاحِدٍ، قالوا: نا يَزِيْدُ بنُ هَارُوْنَ، نا شريكٌ، عن عَاصِمِ بنِ كُلَيْبٍ، عن أبيه، عن وائلِ بنِ حُجْرٍ، قال: رَأَيْتُ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا سَجَدَ يَضَعُ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ، وَإِذَا نَهَضَ رَفَعَ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ.

وَزَادَ الحَسَنُ بنُ عَلِيٍّ فی حَدِيْثِهِ: قال يَزِيْدُ بنُ هَارُوْنَ: وَ لَمْ يَرْوِ شَرِيْكٌ عن عاصمِ بنِ كُلَيْبٍ إِلاَّ هٰذا الحَدِيثَ.

قال: هٰذا حديثٌ غريبٌ حسنٌ لاَنَعْرِفُ أَحَدًا رَوَاهُ غَيْرُ شَرِيْكٍ.

والعَمَلُ عليهِ عند أكثرِ أهلِ العلمِ: يَرَوْنَ أَنْ يَّضَعَ الرجُلُ رُكْبَتَيْهِ قَبْلَ يَدَيْهِ، وإِذَا نَهَضَ رَفَعَ يَدَيْهِ قَبْلَ رُكْبَتَيْهِ.

وروَى هَمَّامٌ عن عَاصِمٍ هٰذا مُرْسَلاً، ولم يَذْكُرْ فِيْهِ وَائِلَ بنَ حُجْرٍ.

وضاحت: امام ترمذی رحمہ اللہ کے متعدد اساتذہ میں سے حسن بن علی نے باب کی حدیث میں یزید بن ہارون کا یہ قول بیان کیا ہے کہ شریک نے عاصم بن کلیب سے صرف یہی ایک حدیث روایت کی ہے۔ اور یہ حدیث غریب بھی ہے کیونکہ تنہا شریک اس کو روایت کرتے ہیں ——— اور امام ترمذیؒ کی یہ بات کہ وائلؓ کی حدیث کے موافق اکثر علماء کا عمل ہے: قرینہ ہے کہ حاشیہ والا نسخہ ہی صحیح ہے ——— اور اس حدیث کو عاصم سے ہمام نے بھی روایت کیا ہے مگر وہ حدیث مرسل ہے کیونکہ ہمام وائل بن حجر کا تذکرہ نہیں کرتے۔

بابٌ آخَرُ مِنْهُ

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا قصد کرتا ہے تم میں سے ایک آدمی پس وہ نماز میں اونٹ کے بیٹھنے کی طرح بیٹھتا ہے؟!'' ——— يَعْمِدُ سے پہلے ہمزۂ استفہام انکاری پوشیدہ ہے۔ یعنی نماز میں اونٹ کی طرح مت بیٹھو۔

تشریح: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ابو داؤد میں بھی ہے جس کو عبدالعزیز بن محمد دَراوَردی نے روایت کیا ہے اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو اونٹ کی طرح نہ بیٹھے۔ اور چاہئے کہ اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں گھٹنوں سے پہلے رکھے'' (۱:۲۲۲، مصری کیف یضع رکبتیہ؟) مگر یہ زیادتی

محفوظ نہیں، کیونکہ محمد بن عبداللہ بن الحسن کے دوسرے شاگرد عبداللہ بن نافع سے یہ ٹکڑا مروی نہیں۔ اور وہ دراوردی سے زیادہ معتبر ہیں۔ حافظ رحمہ اللہ نے تقریب میں بیان کیا ہے کہ دراوردی دوسروں کی کتابوں سے حدیث بیان کرتے تھے جس کی وجہ سے ان سے غلطی ہوجایا کرتی تھی (ص:۳۵۸) اور عبداللہ کی کتاب صحیح تھی (ص:۳۲٦) لہٰذا آخری جملہ دراوردی کا وہم ہے۔ اور وہ پہلے جملہ کے معارض بھی ہے کیونکہ اونٹ پہلے اگلے پیر ٹیکتا ہے اور جانوروں کے اگلے پیر انسانوں کے ہاتھوں کے بمنزلہ ہیں۔ پس جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہی طریقہ سجدہ میں جانے کا بتلایا جائے یہ بات کیسے ممکن ہے؟ اور صحیح بات یہ ہے کہ وَلْیَضَعْ عطف تفسیری ہے۔ پس یہ اونٹ کی طرح بیٹھنے کی صورت ہے۔ اور یہی صورت ممنوع ہے ـــــ اور مستدرک حاکم (۲۲٦:۱) میں ابن عمرؓ کی روایت ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مانند ہے۔ وہ بھی دراوردی عن عبید اللہ العمری کی سند سے ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حدیثه عن عبید الله العمری منکر: دراوردی کی جو روایتیں عبید اللہ عمری سے ہیں وہ قطعاً ناقابل اعتبار ہیں (تقریب ۳۵۸)

اور حدیثِ وائل جو اوپر والے باب میں گذری ہے اس پر یہ کلام کیا گیا ہے کہ اس میں شریک بن عبداللہ نخعی ہیں اور وہ حدیث کی روایت میں متفرد ہیں اور ان سے چوک بہت ہوتی تھی اس لئے جس روایت میں وہ متفرد ہوتے ہیں وہ قابل قبول نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں صحیح ابن خزیمہ (۳۱۹:۱) میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سجدہ میں جاتے وقت ہاتھوں کو پہلے رکھنے کا حکم منسوخ ہے، مگر وہ حدیث اسماعیل اور یحییٰ کی وجہ سے ضعیف ہے۔

[۸۷] باب آخر منه

[۲٦۷-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا عبدُ اللهِ بنُ نَافِعٍ، عن مُحمدِ بنِ عبدِ اللهِ بنِ الحَسَنِ، عن أبی الزِّنَادِ، عن الأَعْرَجِ، عن أبی هريرةَ، أنَّ النبیَّ صلى الله عليه وسلم قال: "يَعْمِدُ أحدُكُمْ فَيَبْرُكُ فی صَلَاتِهِ بَرْكَ الجَمَلِ؟!"

قال أبو عيسى: حديثُ أبی هُريرةَ حديثٌ غريبٌ لَانَعْرِفُهُ مِن حَديثِ أبی الزِّنَادِ إلَّا مِن هٰذا الوَجْهِ؛ وقد رُوِیَ هٰذا الحديثُ عن عبدِ اللهِ بنِ سَعيدٍ المَقْبُرِیِّ، عن أبيهِ، عن أبی هُريرةَ، عن النبیِّ صلى الله عليه وسلم.

وعبدُ اللهِ بنُ سَعيدٍ المَقْبُرِیُّ: ضَعَّفَهُ يَحيىَ بنُ سَعيدٍ القَطَّانُ وَغيرُهُ.

وضاحت: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث غریب ہے کیونکہ ابو الزناد سے اوپر اس کی یہی ایک سند ہے اور اس کی ایک دوسری سند بھی ہے عبداللہ اپنے والد سعید مقبری سے اور وہ ابو ہریرہؓ سے اور وہ نبی ﷺ سے روایت

کرتے ہیں، مگر عبداللہ ضعیف راوی ہے یحیٰ قطان وغیرہ نے اس کی تضعیف کی ہے۔

بابُ مَاجَاءَ فی السُّجُوْدِ عَلَی الجَبْهَةِ وَالْأنفِ

ماتھے اور ناک پر سجدہ کرنے کا بیان

تمام ائمہ متفق ہیں کہ سجدہ میں ماتھا (سر کا اگلا حصہ، جبیں، جبہہ) اور ناک دونوں کو جما کر زمین پر لگانا چاہئے۔ اگر کوئی شخص صرف ماتھا لگائے تو امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اس کی نماز صحیح نہیں۔ اور جمہور کے نزدیک کراہت تحریمی کے ساتھ نماز صحیح ہے۔ اور صرف ناک لگانے والے کی نماز کو امام اعظم رحمہ اللہ کے علاوہ تمام ائمہ بشمول صاحبین درست قرار نہیں دیتے۔ مگر امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک یہ نماز بھی صحیح ہے البتہ بلا عذر ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

حدیث: ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تھے تو اپنی ناک اور ماتھا زمین پر جما کر لگاتے تھے اور دونوں بازو پہلوؤں سے علحدہ رکھتے تھے اور اپنی ہتھیلیاں مونڈھوں کے مقابل رکھتے تھے۔

فائدہ: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بحالت سجدہ دونوں ہاتھ مونڈھوں کے مقابل رکھنا مسنون ہے۔ اور مذکورہ حدیث ان کا مستدل ہے۔ اور احناف کے نزدیک کانوں کے مقابل رکھنا مسنون ہے یعنی چہرہ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھنا چاہئے۔ اور دلیل حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں: **فَلَمَّا سَجَدَ سَجَدَ بین کفَّیْه** رسول اللہ ﷺ نے جب سجدہ کیا تو دونوں ہتھیلیوں کے درمیان سجدہ کیا (مسلم شریف (۱۷۳:۱)، باب وضع یدہ إلخ) علاوہ ازیں اس صورت میں دونوں بازو پہلوؤں سے بھی علحدہ رہیں گے جو کہ مامور بہ ہے اور ہاتھ مونڈھوں کے مقابل رکھنے کی صورت میں دونوں بازوں پہلوؤں سے مل جائیں گے۔

[۸۸] باب ماجاء فی السجودِ علی الجَبْهَةِ والأنفِ

[۲٦۸-] حدثنا بُندارٌ، ثنا أبو عامرٍ، نا فُلَيْحُ بنُ سُلَيْمَانَ، قال: حَدَّثَنی عباسُ بنُ سَهْلٍ، عن أبی حُمَيْدٍ السَّاعِدِیِّ: أَنَّ النبیَّ صلی اللہ علیه وسلم کَانَ إِذَا سَجَدَ أَمْکَنَ أَنْفَهُ وَجَبْهَتَهُ الْأَرْضَ، ونَحَّا يَدَيْهِ عَنْ جَنْبَيْهِ، وَوَضَعَ کَفَّيْهِ حَذْوَ مَنْکِبَيْهِ.

قال: وفی الباب عن ابنِ عباسٍ، ووائلِ بنِ حُجْرٍ، وأبی سعیدٍ.

قال أبو عیسی: حدیثُ أبی حُمَيْدٍ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ؛ والعَمَلُ عَلَيْهِ عِنْدَ أهلِ العلمِ أَنْ يَسْجُدَ الرَّجُلُ عَلَی جَبْهَتِهِ وَأَنْفِهِ؛ فَإِنْ سَجَدَ عَلَی جَبْهَتِهِ دُوْنَ أَنْفِهِ: فقال قَوْمٌ مِن أهلِ العِلْمِ: يُجْزِئُهُ؛ وقال غَيْرُهُمْ: لايُجْزِئُه حَتّٰی يَسْجُدَ عَلَی الجَبْهَةِ وَالْأَنفِ.

ترجمہ: اور علماء کا اس حدیث پر عمل ہے کہ آدمی ماتھا اور ناک دونوں پر سجدہ کرے پس اگر ماتھے پر سجدہ کیا نہ کہ ناک پر تو بعض علماء اس کی نماز کو درست قرار دیتے ہیں۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ اس کی نماز صحیح نہ ہوگی جب تک وہ ماتھا اور ناک دونوں پر سجدہ نہ کرے۔

بابُ مَاجَاءَ أَيْنَ يَضَعُ الرَّجُلُ وَجْهَهُ إِذَا سَجَدَ؟

سجدے میں چہرہ کہاں رکھے؟

حدیث: حضرت ابواسحاق ہمدانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تھے تو چہرہ کہاں رکھتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان۔

تشریح: یہ مسئلہ اوپر والے باب میں گذر چکا ہے۔ اور حدیثِ مذکور احناف کے موافق ہے مگر وہ اس حدیث سے استدلال نہیں کرتے، بلکہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ یہ حدیث حجاج بن ارطاۃ کی وجہ سے ضعیف ہے۔

[٨٩] باب ماجاء أين يَضَعُ الرجلُ وَجْهَهُ إذا سجد؟

[٢٦٩-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا حَفصُ بنُ غِيَاثٍ، عن الحَجّاجِ، عن أبي إسحاق، قال: قُلتُ لِلْبَرَاءِ بنِ عَازِبٍ: أَيْنَ كَانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم يَضَعُ وَجْهَهُ إِذَا سَجَدَ؟ فقال: بَيْنَ كَفَّيْهِ.

وفي الباب عن وائِلِ بنِ حُجْرٍ، وأبي حُمَيْدٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ البَرَاءِ حديثٌ حسنٌ غريبٌ؛ وهُوَ الَّذِيْ اخْتَارَهُ بَعْضُ أهلِ العلمِ أن تكُوْنَ يَدَاهُ قَرِيبًا مِنْ أُذُنَيْهِ.

ترجمہ: اس حدیث کو بعض اہل علم (احناف) نے اختیار کیا ہے (وہ کہتے ہیں) کہ آدمی کے دونوں ہاتھ اس کے دونوں کانوں کے نزدیک (مقابل) ہونے چاہئیں۔

بابُ مَاجَاءَ في السُّجودِ على سَبْعَةِ أَعْضَاءٍ

سات اعضاء پر سجدہ کرنے کا بیان

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ سات اعضاء سجدہ کرتے ہیں: چہرہ، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے اور دونوں قدم ——— اور ابن عباسؓ کی

دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حکم دیئے گئے کہ سات اعضاء پر سجدہ کریں اور بالوں کواور کپڑوں کو نہ روکیں۔

تشریح: لفظ اُمِرَ کی وجہ سے امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سجدہ میں ساتوں اعضاء زمین پر لگنے ضروری ہیں اگر ایک عضو بھی زمین پر نہیں لگے گا تو سجدہ نہیں ہوگا اور نماز باطل ہوگی۔ دوسرے فقہاء کہتے ہیں: سجدہ غایت تذلّل یعنی آخری درجہ کی عاجزی ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ طرف اعلی یعنی سر کو طرف اسفل یعنی پاؤں کے لیول پر لے آئے۔ حالتِ قیام میں پاؤں کا جو حصہ زمین سے لگا ہوا ہوتا ہے اس کے لیول پر سر لے آنا تو محال ہے اس لئے مجازاً پیروں کی انگلیاں مراد لی ہیں۔ اسی طرح طرف اعلی یعنی سر کے بالکل اوپر کا حصہ بھی زمین پر لگانا ناممکن ہے ورنہ آدمی اوندھا ہو جائے گا۔ پس یہاں بھی مجاز مراد لیا جائے گا اور ماتھا اور ناک لگانا کافی ہے۔ اور دیگر اعضاء یعنی گھٹنوں اور ہاتھوں کی حیثیت صرف مددگار اعضاء کی ہے تاکہ دھڑام سے زمین پر نہ گرے۔ سجدہ کی ماہیت میں ان اعضاء کا دخل نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص پورے سجدہ میں دونوں گھٹنے اور دونوں ہاتھ زمین سے نہ لگائے تو بھی سجدہ صحیح ہوگا مگر نماز مکروہ تحریمی ہوگی۔ اور قدمین اور ماتھے اور ناک میں سے کسی ایک کا کم از کم ایک رکن کے بقدر زمین سے لگانا ضروری ہے۔ ورنہ سجدہ نہ ہوگا اور نماز باطل ہو جائے گی۔ اور قدمین اور ماتھے اور ناک میں سے کسی ایک پر اکتفا کرنا مکروہ ہے۔

اور امام احمد رحمہ اللہ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ حدیث میں لفظ اُمِرَ وجوب کے لئے نہیں ہے، ہر امر وجوب کے لئے نہیں ہوتا، امر مختلف مراتب کے لئے مستعمل ہے۔ کہاں وجوب کے لئے ہے اس کی تعیین دیگر قرائن سے کی جائے گی۔ تمام کالے باپ کے سالے نہیں ہوتے۔

فائدہ (۱): اور فقہ میں جو سجدہ کی تعریف کی گئی ہے کہ سجدہ سر کو زمین پر رکھنے کا نام ہے تو یہ تعریف عوام کی سہولت کے لئے ہے۔ اصل تعریف وہ ہے جو اوپر بیان کی گئی، پس ہوائی جہاز میں، چاند پر، یہاں تک کہ آسمان و زمین کے درمیان فضا میں بھی سجدہ کا تحقق ہو جائے گا۔

فائدہ (۲): اور یہ جو مشہور ہے کہ سجدہ میں دونوں پیر زمین سے اٹھ جائیں تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اگر پورے سجدہ میں دونوں پیر زمین سے اٹھے رہے ایک رکن کے بقدر بھی دونوں پیر یا ایک پیر زمین پر نہ لگا تو سجدہ نہیں ہوا اور نماز باطل ہوگئی۔ اور اگر ایک رکن کے بقدر لگنے کے بعد دونوں پیر اٹھا دیئے تو نماز ہو جائے گی مگر مکروہ تحریمی ہوگی۔ اور ایک رکن کی مقدار تین مرتبہ سبحان اللہ کہنے کا زمانہ ہے۔

[۹۰] باب ماجاء فی السجود علی سبعة أعضاءٍ

[۲۷۰-] حدثنا قُتيبةُ، نا بَكْرُ بنُ مُضَرٍ، عن ابنِ الْهَادِ، عن مُحمدِ بنِ إبراهيمَ، عن عَامِرِ بنِ سَعْدٍ

بنِ أبی وَقَّاصٍ، عن العباسِ بنِ عَبدِ المُطلبِ، أَنَّهُ سَمِعَ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يقولُ: "إِذَا سَجَدَ العَبْدُ سَجَدَ مَعَهُ سَبْعَةُ أَرَابٍ: وَجْهُهُ، وكَفَّاهُ، ورُكْبَتَاهُ، وقَدَمَاهُ"

قال: وفی الباب عن ابنِ عباسٍ، وأبی هريرةَ، وجابرٍ، وأبی سعيدٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ العباسِ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وعَلَيْهِ العَمَلُ عِند أهلِ العلمِ.

[٢٧١-] حدثنا قُتيبةُ، نا حَمَّادُ بنُ زَيْدٍ، عن عَمْرِو بنِ دِينَارٍ، عن طَاوسٍ، عن ابنِ عباسٍ قال: أُمِرَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم أن يَسْجُدَ عَلَى سَبْعَةِ أَعْضَاءٍ، وَلاَ يَكُفَّ شَعْرَهُ وَلاَثِيَابَهُ.

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: واضح ہے اور نماز میں بالوں اور کپڑوں کو نہ روکنے کا مسئلہ آگے آئے گا۔

بابُ مَاجَاءَ فی التَّجَافِیْ فِی السُّجُوْدِ

سجدے میں اعضاء ایک دوسرے سے علحدہ رہنے چاہئیں

سجدہ میں ران کو پیٹ سے، دونوں بازؤں کو پہلوؤں سے اور کلائیوں کو زمین سے علحدہ رکھنا مسنون ہے اور اس کا نام تجافی ہے۔

حدیث: عبداللہ بن اقرم خزاعی (باپ بیٹے دونوں صحابی ہیں۔ اور عبداللہ حجۃ الوداع میں اپنے والد اقرم خزاعی کے ساتھ تھے) نے میدانِ نمرۃ میں رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا جب ان کا قافلہ قریب سے گذر رہا تھا۔ فرماتے ہیں: میں نے آنحضور ﷺ کو دیکھا جب آپ سجدہ میں تھے تو آپؐ دونوں بازو پہلوؤں سے علحدہ کئے ہوئے تھے، میں نے آپؐ کے بغل کا بھوراپن دیکھا اور اس کی سفیدی دیکھی۔

قولہ: أَرَى بیاضہ عطف تفسیری ہے چونکہ عام طور پر لوگوں کے بغل میں بھوراپن ہوتا ہے (بھورے پن کے مفہوم میں ہلکی سیاہی شامل ہے) اس لئے کوئی خیال کرسکتا تھا کہ آپؐ کے بغل میں بھی سیاہی ہوگی اس لئے تفسیر کی کہ آپؐ کے بغل آپؐ کے بدن کی طرح صاف وشفاف اور سفید تھے۔ اور یہ جملہ اگر شروع ہی میں لایا جاتا تو کسی کو دوسری غلط فہمی ہوسکتی تھی کہ بغل مبارک کسی بیماری کی وجہ سے سفید ہوگئے ہونگے اس لئے یہ جملہ پہلے نہیں لائے۔ غرض ہر جملہ نے دوسرے جملہ سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کو دور کیا ہے۔

[٩١] باب ماجاء فِی التَّجَافِیْ فی السجود

[٢٧٢-] حدثنا أبو كُرَيْبٍ، ثنا أبو خالدٍ الأَحْمَرُ، عن دَاوُدَ بنِ قَيْسٍ، عن عُبَيْدِ اللهِ بنِ عَبدِ اللهِ بنِ

أَقْرَمَ الخُزَاعِيِّ، عن أبيه، قال: كُنتُ مَعَ أبي بِالْقَاعِ مِنْ نَمِرَة، فَمَرَّتْ رَكْبَةٌ، فَإِذَا رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم قَائِمٌ يُصَلِّي، قال: فَكُنْتُ أَنْظُرُ إِلَى عُفْرَتَيْ إِبْطَيْهِ إِذَا سَجَدَ، وَأَرَى بَيَاضَهُ.

قال: وفي الباب عن ابنِ عباسٍ، وابنِ بُحَيْنَةَ، وجابرٍ، وأحْمَرَ بنِ جَزْءٍ، ومَيْمُوْنَةَ، وأبي حُمَيْدٍ، وأبي أُسَيْدٍ، وأبي مَسعودٍ، وسَهْلِ بنِ سَعْدٍ، ومُحمدِ بنِ مَسْلَمَةَ، والبَرَاءِ بنِ عَازِبٍ، وعَدِيِّ بنِ عَمِيْرَةَ، وعائشةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ عبدِ اللهِ بنِ أَقْرَمَ حديثٌ حسنٌ لانَعْرِفُهُ إِلَّا مِن حَديثِ دَاوُدَ بنِ قَيْسٍ؛ وَلَا يُعْرَفُ لِعبدِ اللهِ بنِ أَقْرَمَ عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم غَيْرُ هذا الحديثِ؛ والعَمَلُ عَليه عند أهلِ العلمِ.

وأَحْمَرُ بنُ جَزْءٍ هذا: رَجُلٌ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، لَهُ حَديثٌ واحِدٌ، وعبدُ اللهِ بنُ أَرْقَمَ الزُّهْرِيُّ كَاتِبُ أبي بَكْرٍ الصِّدِيْقِ؛ وعبدُ اللهِ بنُ أَقْرَمَ الخُزَاعِيُّ: إِنَّمَا يُعْرَفُ لَهُ هذا الحديثُ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

ترجمہ: عبداللہ بن اقرم کہتے ہیں: میں اپنے والد کے ساتھ نمرۃ کے ہموار میدان میں تھا، پس ایک قافلہ گذرا (جس میں وہ خود تھے) پس اچانک رسول اللہ ﷺ کھڑے ہیں اور نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں آپؐ کے دونوں بغلوں کے بھوراپن کو دیکھ رہا تھا جب آپؐ نے سجدہ کیا اور میں بغل کی سفیدی کو دیکھتا تھا ـــــــ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عبداللہ بن اقرم کی حدیث حسن ہے ہم اس کو داؤد بن قیس کے علاوہ کسی سند سے نہیں جانتے۔ اور عبداللہ کی رسول اللہ ﷺ سے اس کے علاوہ کوئی حدیث نہیں جانی گئی، یعنی وہ صرف اسی ایک حدیث کے راوی ہیں اور اس پر علماء کا عمل ہے یعنی بحالتِ سجدہ بازو کو پہلوؤں سے علحدہ رکھنے کو تمام علماء مسنون کہتے ہیں۔

اور فی الباب میں احمر بن جزء کی جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے وہ صحابی ہیں اور ان کی بھی صرف ایک حدیث ہے۔

(رواۃ کے درمیان تمیز) اور عبداللہ بن ارقم زُہری تابعی ہیں وہ حضرت ابوبکر کے سکریٹری تھے۔ اور عبداللہ بن اقرم خزاعی صحابی ہیں اور ان سے صرف ایک ہی حدیث معروف ہے۔

بابُ مَاجَاءَ فی الاعْتِدَالِ فی السُّجودِ

اعتدال یعنی ٹھیک سے سجدہ کرنے کا بیان

اعتدال کا ایک مطلب یہ ہے کہ سجدہ ڈھنگ سے کیا جائے۔ ڈھنگ سے سجدہ کرنے کی کیا صورت ہے یہ الگ مضمون ہے جو اپنی جگہ آئے گا۔ اور اعتدال کا دوسرا مفہوم تعدیلِ ارکان ہے۔ یعنی ارکانِ اربعہ باطمینان ادا کئے جائیں۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تعدیل ارکان فرض ہے اور حنفیہ کے نزدیک واجب یا سنت مؤکدہ اشد تاکید ہے۔

تفصیل گذر چکی ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص سجدہ کرے تو چاہئے کہ وہ ٹھیک سے سجدہ کرے۔ دوسرا ترجمہ: چاہئے کہ تعدیلِ ارکان کرے (مگر یہ ترجمہ مرجوح ہے) اور اپنی کلائیاں کتے کی طرح نہ بچھائے۔ کتا اور دیگر درندے اگلے پیر زمین پر بچھا کر بیٹھتے ہیں۔ سجدے میں اس طرح ہاتھوں کو بچھانے سے منع کیا گیا —— ولایفترش إلخ عطف تفسیری ہے۔ یعنی ڈھنگ سے سجدہ کرنے کے مفہوم میں ہاتھوں کو نہ بچھانا بھی شامل ہے۔

تشریح: احادیثِ شریفہ میں نماز میں آٹھ ہیئتیں اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے: (۱) کتے کی طرح ہاتھوں کو بچھانے سے (۲) کتے کی طرح بیٹھنے سے (۳) لومڑی کی طرح جھانکنے سے (۴) اونٹ کی طرح بیٹھنے سے (۵) مرغ کی طرح ٹھونگیں مارنے سے (۶) گدھے کی طرح سر جھکانے سے یعنی سر کو پیٹھ کے لیول سے نیچا کرنے سے (۷) جلسہ میں سرین کے بل بیٹھنے سے (۸) بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح دم ہلانے سے یعنی ہاتھ ہلانے سے —— اور جانوروں کے ساتھ تشبیہ دینے سے مقصود تنفیر ہے۔ یعنی ان ہیئتوں کی نفرت دل میں پیدا کرنے کی غرض سے جانوروں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے (مزید تفصیل کے لئے معارف السنن (۳:۴۵-۴۷) دیکھیں)

[۹۲] باب ماجاء في الإعتدال في السجود

[۲۷۳-] حدثنا هَنَّادٌ، ثنا أبو مُعاويةَ، عن الأعْمَشِ، عن أبي سُفيانَ، عن جابرٍ، أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال: " إِذَا سَجَدَ أَحَدُكُمْ فَلْيَعْتَدِلْ، وَلاَ يَفْتَرِشْ ذِرَاعَيْهِ افْتِرَاشَ الْكَلْبِ "

قال: وفي الباب عن عبدِ الرحمنِ بنِ شِبْلٍ، والبَرَاءِ، وأنسٍ، وأبي حُمَيدٍ، وعائِشَةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ جابرٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، والعَمَلُ عَلَيْهِ عِند أهلِ العِلْمِ: يَخْتَارُوْنَ الإعْتِدَالَ في السُّجودِ، ويَكْرَهُوْنَ الإفْتِرَاشَ كَافْتِرَاشِ السَّبُعِ.

[۲۷۴-] حدثنا مَحمودُ بنُ غَيْلاَنَ، نا أبو داوُدَ، نا شُعْبَةُ، عن قَتَادَةَ، قال: سَمِعتُ أَنَسًا يقولُ: إِنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قال: " اعْتَدِلُوْا في السُّجُوْدِ، وَلاَ يَبْسُطَنَّ أَحَدُكُمْ ذِرَاعَيْهِ فِي الصَّلاَةِ بَسْطَ الْكَلْبِ "

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: اس پر علماء کے نزدیک عمل ہے وہ سجدہ میں اعتدال کو پسند کرتے ہیں۔ اور درندوں کی طرح ہاتھوں کے بچھانے کو ناپسند کرتے ہیں (حدیث ۲۷۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سجدہ ٹھیک سے کیا کرو، اور ہرگز نہ بچھائے تم میں سے کوئی اپنی کلائیاں نماز میں کتے کے بچھانے کی طرح۔

بابُ مَاجَاءَ فی وَضْعِ الیَدَیْنِ وَنَصْبِ القَدَمَیْنِ فِی السُّجودِ

سجدے میں ہاتھوں کو رکھنے اور پیروں کو کھڑا کرنے کا بیان

سجدہ میں دونوں ہاتھ اور دونوں پیر زمین پر جما کر رکھنے چاہئیں۔ ہاتھوں کو رکھنے میں تو لوگ غلطی نہیں کرتے مگر پیروں میں اکثر غفلت برتتے ہیں۔ بعض لوگ تو سرے سے پیروں کو زمین پر رکھتے ہی نہیں۔ ان کی تو نماز ہی صحیح نہیں ہوتی۔ اور بعض تھوڑی دیر رکھ کر دونوں پاؤں اٹھالیتے ہیں۔ اور بعض صرف ایک پاؤں رکھتے ہیں ان صورتوں میں نماز مکروہ تحریمی ہوتی ہے۔ اور بعض لوگ اگرچہ دونوں پاؤں رکھتے ہیں مگر وہ صرف انگلیوں کے سرے زمین پر ٹیکتے ہیں یہ غیر مسنون طریقہ ہے۔ مسنون طریقہ یہ ہے کہ پورے سجدے میں دونوں پاؤں اس طرح دبا کر رکھے جائیں کہ انگلیاں مڑ کر قبلہ کی طرف ہو جائیں۔

حدیث: حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (سجدہ میں) دونوں ہاتھ اور دونوں قدم زمین پر رکھنے کا حکم دیا۔

تشریح: یہ حدیث مسند اور مرسل دونوں طرح مروی ہے۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی عادت کے مطابق مرسل کو اصح کہا ہے۔ حالانکہ مسند حدیث کو غیر اصح قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ وہیب نے اس کو متصل کیا ہے اور وہ ثقہ ہیں۔ اور ثقہ کی زیادتی معتبر ہے۔ یہ اصولِ حدیث کا طے شدہ ضابطہ ہے۔

[۹۳] باب ماجاء فی وضع الیدین ونَصْبِ القدمین فی السجود

[۲۷۵-] حدثنا عبدُ اللّٰهِ بنُ عبدِ الرحمنِ، أنا المُعَلَّی بنُ أَسَدٍ، ناوُهَیْبٌ، عن مُحمدِ بنِ عَجْلَانَ، عن مُحمدِ بنِ إبراهیمَ، عن عامِرِ بنِ سَعْدٍ، عن أبیهِ، أنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم أَمَرَ بِوَضْعِ الیَدَیْنِ وَنَصْبِ القَدَمَیْنِ.

قَالَ عبدُ اللّٰهِ: وقالَ المُعَلَّی: حدثنا حَمَّادُ بنُ مَسْعَدَةَ، عن محمدِ بنِ عَجْلَانَ، عن مُحمدِ بنِ إبراهیمَ، عن عَامِرِ بنِ سَعْدٍ، أنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم أَمَرَ بِوَضْعِ الْیَدَیْنِ، فَذَكَرَ نَحْوَهُ، وَلَمْ یَذْكُرْ فِیهِ عَنْ أَبِیهِ.

قال أبو عیسی: وَرَوَی یَحْیَی بنُ سَعیدٍ القَطَّانُ وَغَیْرُ وَاحِدٍ، عن مُحمدِ بنِ عَجْلَانَ، عن مُحمدِ بنِ إبراهیمَ، عن عَامِرِ بنِ سَعْدٍ، أنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم أَمَرَ بِوَضْعِ الیَدَیْنِ ونَصْبِ القَدَمَیْنِ، مُرْسَلٌ؛ وهٰذا أَصَحُّ مِن حَدیثِ وُهَیْبٍ.

وهُوَ الَّذِیْ أَجْمَعَ علیه أهلُ العلمِ، واختَارُوْهُ.

وضاحت: مرسل حدیث کی دوسندیں ہیں: (۱) عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی نے کہا: معلّٰی بن اسد نے حماد بن مسعدۃ سے، انھوں نے محمد بن عجلان سے، انھوں نے محمد بن ابراہیم سے، انھوں نے عامر بن سعد سے، اور انھوں نے نبی ﷺ سے روایت کیا وہیب کی حدیث کی طرح۔ یعنی بیچ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا واسطہ ذکر نہیں کیا۔ اور عامر تابعی ہیں۔ پس یہ حدیث مرسل ہے۔ (۲) یحیٰ قطان وغیرہ بھی محمد بن عجلان سے، وہ محمد بن ابراہیم سے، وہ عامر بن سعد سے، وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں یہ سند بھی مرسل ہے ـــــ اور یہ مسئلہ اجماعی ہے۔

بابُ مَاجَاءَ فِي إِقَامَةِ الصُّلْبِ إِذَارَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُوْدِ وَالرُّكُوْعِ

جب سجدوں سے اور رکوع سے سر اٹھائے تو پیٹھ سیدھی کرے

إقامۃ الصُّلب کے معنی ہیں: پیٹھ سیدھی کرنا۔ یعنی رکوع اور سجدہ سے اٹھ کر باطمینان کھڑا رہنا اور بیٹھنا اور بدن کو ڈھیلا چھوڑ دینا تاکہ ہر ہڈی اس کی جگہ میں سیٹ ہوجائے۔ یہ قومہ اور جلسہ کی تعدیل ہے۔ اور رکوع وسجود میں ٹھہرنا رکوع وسجود کی تعدیل ہے۔ اور ان میں ٹھہرانے کے مقصد ہی سے اذکار مسنون کیے ہیں۔

حدیث: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز جب وہ رکوع کرتے تھے اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تھے، اور جب سجدہ کرتے تھے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تھے تقریباً یکساں ہوتی تھی۔

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کے ارکان اربعہ میں باہم تناسب ہوتا تھا۔ اور وہ قراءت کے اعتبار سے ہوتا تھا۔ فجر میں قراءت طویل ہوتی ہے اس لئے ارکان اربعہ بھی طویل ہوتے تھے۔ اور مغرب میں قراءت مختصر ہوتی ہے اس لئے ارکانِ اربعہ بھی مختصر ہوتے تھے۔ اور تہجد میں قراءت بہت طویل کرتے تھے۔ ایک رکعت میں سورۂ بقرۃ دوسری رکعت میں سورۂ آل عمران پڑھتے تھے اس لئے ارکانِ اربعہ بھی بہت لمبے کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ کے رکوع وسجود پچاس آیتوں کے بقدر ہوتے تھے۔

(متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۱۱۸۸)

اور امام ترمذیؒ نے یہ حدیث اس باب میں لاکر اشارہ کیا ہے کہ قومہ اور جلسہ میں پیٹھ سیدھی کردینے سے اور رکوع وسجود میں ٹھہرے رہنے سے اگرچہ تعدیل ہوجاتی ہے مگر قراءت کے تناسب سے ارکان اربعہ میں طول واختصار ہونا چاہئے۔

فائدہ: سعودیہ والے اس حدیث کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا رکوع اور سجدہ اور قومہ اور جلسہ برابر ہوتے تھے یعنی رکوع اور سجدہ میں اگر آپ دس سکنڈ ٹھہرتے تھے تو قومہ اور جلسہ میں بھی دس سکنڈ ٹھہرتے تھے۔ اور اسی کو یعنی ارکانِ اربعہ میں زمانہ کے اعتبار سے برابری کو وہ تعدیل کہتے ہیں۔ مگر ان کا یہ خیال صحیح نہیں، کیونکہ اگر حدیث کا یہ مطلب ہوتا تو رکوع وسجود کی طرح قومہ اور جلسہ میں بھی اذکار مسنون کیے جاتے۔ اور ان کو مکرر سہ کرر پڑھنے کی ہدایت

کی جاتی۔ حالانکہ شریعت نے ان دوجگہوں کے لئے اذکار مسنون نہیں کئے۔ اور رسول اللہ ﷺ سے ان جگہوں میں جوطویل اذکار مروی ہیں وہ نوافل کے لئے ہیں۔ فرائض کے لئے شریعت نے ہلکے اور آسان اذکار ہی تجویز فرمائے ہیں۔ تاکہ ہر مسلمان بآسانی ان کو یاد کر سکے اور پڑھ سکے۔ اور جہاں ٹھہرانا مقصود ہے وہاں ان ہی کو مکرر سہ کرر کہنے کی ہدایت دی ہے۔ شریعت کا یہ مزاج دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے قومہ اور جلسہ میں جوطویل اذکار مروی ہیں وہ فرائض کے لئے نہیں ہیں۔ وہ اذکار نفل نماز کے لئے ہیں اور خواص امت کے لئے ہیں۔

سوال: بخاری (حدیث ۷۹۲ باب حد إتمام الركوع إلخ) میں اسی حدیث میں مَا خَلاَ القيامَ والقُعودَ بھی آیا ہے۔ اس استثناء سے معلوم ہوا کہ عرب علماء نے حدیث کا جو مطلب سمجھا ہے وہ صحیح ہے۔

جواب: یہ زیادتی محفوظ نہیں اس لئے کہ اس حدیث کو شعبۃ سے بَدَلُ بن المُحَبَّر کے علاوہ ابوالولید محمد بن جعفر، معاذ العنبری، ابن المبارک، ابن علیہ، یحییٰ قطان اور حفص بن عمرو وغیرہ ائمہ حدیث نے روایت کیا ہے اور سوائے بدل بن المُحَبَّر کے کوئی راوی یہ ٹکڑا نہیں بڑھاتا۔ اور ابن المُحَبَّر کی دارقطنی نے تضعیف کی ہے۔ تفصیل کے لئے معارف السنن (۳:۵۳) دیکھیں۔

[۹٤] باب ماجاء في إقامة الصلب إذا رفع رأسه من السجود والركوع

[۲۷٦-] حدثنا أحمد بنُ محمد بن موسى، نا ابن المبارك، عن شعبة، عن الحكم، عن عبد الرحمن بن أبي ليلى، عن البراء بن عازب، قال: كانت صلاةُ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم إذا رَكَعَ، وَإِذَا رَفَعَ رأسَه من الركوع، وإذَا سَجَدَ، وإذا رفع رأسه من السجود: قريباً من السَّوَاءِ.

قال: وفي الباب: عن أنس.

حدثنا محمد بن بشار، نا محمدُ بنُ جعفر، نا شعبةُ، عن الحكم نحوه.

قال أبو عيسى: حديث البراء حديث حسن صحيح.

وضاحت: حَكَمْ سے نیچے حدیث کی ایک اور سند بھی ہے جو امام ترمذی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے۔

بابُ مَاجَاءَ في كَرَاهِيَةِ أَنْ يُبَادَرَ الإمَامُ في الرُّكُوْعِ والسُّجُوْدِ

امام سے پہلے رکوع وسجود میں پہنچ جانا مکروہ تحریمی ہے

تمام ائمہ متفق ہیں کہ افعال میں امام کی متابعت لازم ہے یعنی اس کے پیچھے پیچھے رہنا ضروری ہے۔ اور مُبادرت یعنی امام سے پہلے اگلے رکن میں پہنچ جانا جائز نہیں۔ البتہ اقوال میں متابعت ضروری نہیں، چنانچہ امام رکوع سے اٹھتے

وقت تسمیع کہتا ہے اور مقتدی تحمید۔ اور امام قراءت کرتا ہے اور مقتدی خاموش رہتے ہیں اور قراءت سنتے ہیں، اس کی متابعت نہیں کرتے، کیونکہ اقوال میں متابعت ضروری نہیں۔

حدیث: عبداللہ بن یزید نے دورانِ خطاب لوگوں کو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث سنائی اور پہلے وھو غیرُ کَذُوْبٍ (وہ جھوٹے نہیں تھے) کہہ کر بات مؤکد کی۔ حضرت براءؓ کہتے ہیں: جب ہم رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھتے تھے تو رکوع کے بعد کوئی بھی سجدہ میں نہیں جاتا تھا، یہاں تک کہ آنحضور ﷺ سجدہ میں سر رکھ دیتے تھے پھر ہم جھکنا شروع کرتے تھے۔

تشریح:

۱- اس حدیث میں جو طریقہ بیان کیا گیا ہے وہ ایک عارضی بات ہے یعنی اگر امام بوڑھا ہو یا بہت موٹا ہو اور اس کو اٹھنے بیٹھنے میں دشواری ہوتی ہو اور مقتدی نوجوان ہوں تو ان کو امام کے اگلے رکن میں منتقل ہوجانے کے بعد انتقال شروع کرنا چاہئے۔ اور اگر امام تندرست ہو تو پھر امام ومقتدی ساتھ ساتھ انتقال شروع کریں گے البتہ امام ذرا آگے رہے گا اور مقتدی اس سے پیچھے۔ اس کی تفصیل باب ماجاء فی التکبیر عند الرکوع (۵۹۶:۱) کے تحت گذر چکی ہے۔

۲- عبداللہ بن یزید نے حدیث سنانے سے پہلے وھو غیر کذوب کہہ کر جو تمہید قائم کی ہے وہ بات پر زور دینے کے لئے اور لوگوں کی توجہ طلب کرنے کے لئے ہے ورنہ تمام صحابہ دین منتقل کرنے میں بالاتفاق عدول (قابل اعتماد) ہیں ان میں جھوٹ کا ادنی احتمال نہیں۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسا بعض مواقع میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے: قال الصادق المصدوق حالانکہ آنحضور ﷺ میں جھوٹ کا احتمال ہی نہیں، بلکہ مقصود لوگوں کی توجہ طلب کرنا اور حکم کی اہمیت ذہن نشین کرنا ہے۔

[۹۵] باب ماجاء فی کراهیة أن یُبَادَرَ الإمَامُ فی الرکوع والسجود

[۲۷۷-] حدثنا بُنْدَارٌ، ثنا عبدُ الرحمنِ بنُ مَهْدِیٍّ، نا سُفیانُ، عن أبی إسحاق، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ یَزِیْدَ، قال: ثنا البَرَاءُ — وهُوَ غیرُ کَذُوْبٍ — قال: کُنَّا إذَا صَلَّیْنَا خَلْفَ رسولِ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم فَرَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ الرُّکُوْعِ، لَمْ یَحْنِ رَجُلٌ مِنَّا ظَهْرَهُ حَتّٰی یَسْجُدَ رسولُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم، فَنَسْجُدُ.

قال: وفی الباب عن أنسٍ، ومُعاویةَ، وابنِ مَسْعَدَةَ: صاحبِ الجُیُوْشِ، وأبی هُریرةَ.

قال أبو عیسی: حدیثُ البَرَاءِ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ؛ وبه یقولُ أهلُ العلمِ: إنَّ مَن خَلْفَ الإمَامِ إنَّمَا یَتْبَعُوْنَ الإمَامَ فِیمَا یَصْنَعُ، وَلاَ یَرْکَعُوْنَ إلاَّ بَعْدَ رُکُوْعِهِ، وَلاَ یَرْفَعُوْنَ إلاَّ بَعْدَ رَفْعِهِ، وَلاَ نَعْلَمُ بَیْنَهُمْ فِیْ ذٰلِكَ اخْتِلاَفًا.

ترجمہ: حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اور آپ اپنا سر رکوع سے اٹھاتے تھے تو ہم میں سے کوئی اپنی پیٹھ کو نہیں جھکاتا تھا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ سجدہ کر لیتے تھے پس ہم سجدہ کیا کرتے تھے ــــــ اور اسی کے مطابق علماء کا عمل ہے کہ جو لوگ امام کے پیچھے ہیں وہ امام کی اتباع افعال میں کریں۔ اور امام کے رکوع کے بعد ہی رکوع کریں اور اس کے سر اٹھانے کے بعد ہی سر اٹھائیں۔ اور ہم اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں جانتے۔

فائدہ: یہاں بعدیت سے بعدیتِ مطلقہ اور بعدیتِ کاملہ مراد نہیں جو سعودیہ کے اماموں نے سمجھی ہے بلکہ بعدیت مع الوصل مراد ہے یعنی مقتدی امام سے ذرا پیچھے رہیں کیونکہ حدیث إنما جُعل الإمام میں فتعقیب مع الوصل کے لئے ہے یعنی امام اور مقتدی دونوں ساتھ ساتھ انتقال کریں مگر امام ذرا آگے رہے اور مقتدی ذرا پیچھے رہیں۔

بَابُ مَاجَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ الإِقْعَاءِ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ

سجدوں کے درمیان ایڑیوں پر بیٹھنے کی کراہیت

إقعاء: کی دو تفسیریں کی گئی ہیں۔ اول: پنڈلیاں کھڑی کر کے اور دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر سرین کے بل کتے کے بیٹھنے کی طرح بیٹھنا۔ اقعاء بایں معنی بالاتفاق مکروہ تحریمی ہے۔ دوم: جلسہ میں دونوں پاؤں کھڑے کر کے ایڑیوں پر بیٹھنا۔ بعض حضرات مثلاً عبداللہ بن الزبیر وغیرہ اس کو جائز کہتے تھے، مگر ائمہ اربعہ کے نزدیک یہ بھی مکروہ تنزیہی ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے علی! میں آپ کے لئے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں اور جو اپنے لئے ناپسند کرتا ہوں وہی آپ کے لئے ناپسند کرتا ہوں (یہ تمہید قائم کر کے آپؐ نے فرمایا:) دو سجدوں کے درمیان اقعاء کے طور پر مت بیٹھو۔ ــــــ یہاں سے یہ اصول ہاتھ آیا کہ نصیحت کرنے سے پہلے زمین ہموار کرنی چاہئے، ایسی صورت میں آدمی خوش دلی سے نصیحت قبول کرتا ہے۔

تشریح: بلا عذر جلسہ میں ایڑیوں پر بیٹھنا خلاف اولی ہے مگر عذر کی وجہ سے جائز ہے، اور معذور کو بھی قعدہ میں اقعاء نہیں کرنا چاہئے کیونکہ معذور کے لئے شریعت نے متبادل (تَوَرُّك) تجویز کیا ہے۔ تفصیل آگے (باب ۱۱۳ حدیث ۳۰۰ کے ذیل میں) آئے گی۔

[۹۶] باب ماجاء فی کراهیة الإِقْعَاءِ بین السجدتین

[۲۷۸-] حدثنا عبدُ اللهِ بنُ عبدِ الرحمنِ، نا عُبَيْدُ اللهِ بنُ مُوسَى، نا إسرائيلُ، عن أبي إسحاق، عن الحَارِثِ، عن عَلِيٍّ، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "يَا عَلِيُّ! أُحِبُّ لَكَ مَا أُحِبُّ لِنَفْسِيْ، وأَكْرَهُ لَكَ مَا أَكْرَهُ لِنَفْسِيْ: لاَ تُقْعِ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ"

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ لاَ نَعْرِفُهُ مِن حَديثِ عَلِيٍّ إلاَّ مِن حَديثِ أبي إسحاقَ، عن الحارثِ، عن عليٍّ؛ وقد ضَعَّفَ بعضُ أهلِ العلمِ الحارثَ الأَعْوَرَ؛ والعَمَلُ عَلَى هٰذا الحديثِ عند أكثر أهلِ العلمِ يَكْرَهُوْنَ الإِقْعَاءَ.

وفي الباب: عن عائشةَ، وأنسٍ، وأبي هريرةَ.

وضاحت: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث غریب بایں معنی ہے کہ ابواسحاق سے اوپر اس کی صرف ایک سند ہے اور بایں معنی بھی کہ وہ حارث اعور کی وجہ سے ضعیف ہے۔

بابٌ في الرُّخصَة فِي الإِقْعَاءِ

سجدوں کے درمیان ایڑیوں پر بیٹھنے کا جواز

اس باب میں جو حدیث ہے اس سے اقعاء کی اجازت مستفاد ہوتی ہے۔ اور مصنف رحمہ اللہ نے لفظ رخصت کے ذریعہ اس کے خلاف اولیٰ ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ لفظ رخصت میں کراہیت تنزیہی کا مفہوم شامل ہوتا ہے۔ یعنی دوسجدوں کے درمیان ایڑیوں پر بیٹھنا اگرچہ جائز ہے مگر خلاف اولیٰ ہے۔

حدیث: طاؤس رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جلسہ میں ایڑیوں پر بیٹھنے کا حکم دریافت کیا۔ آپؓ فرمایا: ''وہ سنت ہے'' ہم نے عرض کیا: ہمارے خیال میں تو یہ آدمی کا گنوار پن ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا: ''بلکہ وہ تمہارے نبی کی سنت ہے''

تشریح: اصولِ حدیث میں یہ ضابطہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر صحابی من السنة كذا کہے تو وہ حدیث حکماً مرفوع ہوجاتی ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ صحابہ کرام کے احوال کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے مجتہدات کے لئے بھی من السنة كذا کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا اصولِ حدیث کا مذکورہ ضابطہ ہر جگہ جاری نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس قاعدہ کو جاری کرنے سے پہلے سابقہ اور لاحقہ مضمون میں غور کرنا ضروری ہے۔ یہ بات عَرف الشَّذِیْ میں علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ نے بیان فرمائی ہے۔

یہاں هي السنة کہہ کر حضرت ابن عباسؓ نے اپنی رائے بیان کی ہے اور بل سنة نبيكم کا صرف اتنا مطلب ہے کہ اقعاء جائز ہے۔ اور دلیل گذشتہ باب کی حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کام سے روکا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ نبی ﷺ کی سنت نہیں ہے۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر هي السنة کہنے سے حدیث مرفوع ہوجاتی تو تلامذہ إِنَّا لَنَرَاهُ جَفَاءً بالرجل نہ کہتے، کیونکہ حدیث کا معارضہ جائز نہیں۔ علاوہ ازیں آنحضور ﷺ کی پوری زندگی میں ایک واقعہ بھی اقعاء کا مروی نہیں اگر یہ سنت ہوتا اور حدیث ابن عباس مرفوع ہوتی تو نبی

ﷺ سے یہ عمل ضرور مروی ہوتا۔ اس لئے اس حدیث کو عذر پر محمول کریں گے، یعنی ابن عباسؓ نے ھی السنۃ کہہ کر معذور کے لئے اس کا جواز بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم

[۹۷] باب فی الرخصة فی الإقعاء

[۲۷۹-] حدثنا يَحيىَ بنُ مُوسَى، نا عبدُ الرَّزَّاقِ، نا ابنُ جُرَيْجٍ، قال: أَخْبَرَنِى أبو الزُّبَيْرِ، أنّه سَمِعَ طَاوُسًا يقولُ: قُلْنَا لِابْنِ عَبَّاسٍ فى الإِقْعَاءِ عَلَى الْقَدَمَيْنِ؟ قال: هِيَ السُّنَّةُ، فَقُلْنَا: إِنَّا لَنَرَاهُ جَفَاءً بِالرَّجُلِ! قال: بَلْ هِيَ سُنَّةُ نَبِيِّكُمْ.

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ حسنٌ؛ وقَدْ ذَهَبَ بَعْضُ أهلِ العلمِ إلى هٰذا الحديثِ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: لَايَرَوْنَ بِالإِقْعَاءِ بأسًا؛ وهو قَوْلُ بَعْضِ أهلِ مَكَّةَ مِنْ أهلِ الفِقْهِ وَالعِلْمِ؛ وأكثرُ أهلِ العلمِ يَكْرَهُوْنَ الإِقْعَاءَ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ.

ترجمہ: صحابہ میں سے بعض اہل علم اس حدیث کی طرف گئے ہیں، وہ ایڑیوں پر بیٹھنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے اور وہ فقہ وعلم رکھنے والے بعض اہل مکہ (حضرت عبداللہ بن الزبیر) کا قول ہے۔ اور اکثر اہل علم سجدوں کے درمیان ایڑیوں پر بیٹھنے کو ناپسند کرتے ہیں۔

بابُ مَايَقُوْلُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ

جلسہ میں کیا ذکر کرے؟

فرائض میں جلسہ اور قومہ میں کسی ذکر کی شریعت نے تعلیم نہیں دی۔ البتہ نوافل میں ان دونوں جگہوں کے لئے طویل اذکار مروی ہیں۔ ان کو یاد کرنا چاہئے اور نوافل میں پڑھنا چاہئے، سنن مؤکدہ بھی نوافل ہیں۔ اور اگر امام موقع دے تو فرائض میں بھی پڑھ سکتے ہیں کیونکہ خاموش رہنے سے ان کو پڑھنا بہتر ہے۔

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سجدوں کے درمیان یہ دعا پڑھتے تھے: ''اے اللہ! میری بخشش فرما، مجھ پر رحم فرما، میری شکستگی دور فرما، میری راہنمائی فرما اور مجھے رزق عطا فرما''

[۹۸] باب مايقول بين السجدتين؟

[۲۸۰-] حدثنا سَلَمَةُ بنُ شَبِيبٍ، نا زَيْدُ بنُ حُبَابٍ، عن كَامِلٍ أبى الْعَلَاءِ، عن حَبِيبِ بنِ أبى ثَابِتٍ، عن سَعيدِ بنِ جُبَيْرٍ، عنْ ابنِ عباسٍ، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كَانَ يَقُوْلُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ، وَارْحَمْنِیْ، وَاجْبُرْنِیْ، واهْدِنِیْ، وارْزُقْنِیْ"
حدثنا الحَسَنُ بنُ عَلِيٍّ الخَلَّالُ، نا يَزِيدُ بنُ هَارُوْنَ، عن زَيْدِ بنِ حُبَابٍ، عن كامِلٍ أبى العَلاَءِ نَحْوَهُ.
قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ غريبٌ؛ وهٰكذا رُوِىَ عن عليٍّ؛وبه يقولُ الشافعيُّ وأحمدُ وإسحاقُ: يَرَوْنَ هٰذا جائِزًا فى المَكْتُوْبَةِ وَالتَّطَوُّعِ.وَرَوَى بَعْضُهُمْ هٰذا الحديثَ عن كامِلٍ أبى العَلاَءِ مُرْسَلاً.

وضاحت: یہ حدیث غریب بایں وجہ ہے کہ اس کو تنہا کامل ابوالعلاء روایت کرتے ہیں۔ ان سے نیچے متعدد سندیں ہیں، مگر ان سے اوپر ایک ہی سند ہے۔ اور اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ ذکر مروی ہے اخرجہ الشافعی فی مسندہ (۱:۹۳) وعبدالرزاق والبیہقی (کشف النقاب) اور قومہ اور جلسہ میں پڑھنے کے لئے جواز کا مروی ہیں: امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ (جماعت کے علاوہ میں) ان کو پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں، اور امام اعظم رحمہ اللہ (غیر فرض میں) اجازت دیتے ہیں۔ اور یہ حدیث کامل ابوالعلاء کی سند سے مرسل بھی مروی ہے یعنی آخر میں حضرت ابن عباس کا تذکرہ نہیں۔

بابُ مَاجَاءَ فی الإعْتِمَادِ فی السُّجودِ

سجدہ میں کہنیاں ٹیکنے کی روایت

اگر کوئی شخص لمبا سجدہ کرے اور وہ مسنون طریقہ پر سجدہ کرنے کی وجہ سے یعنی بازوؤں کو پہلوؤں سے علحدہ رکھنے کی وجہ سے تھک جائے تو اس کے لئے گھٹنوں سے مدد لینا یعنی کہنیوں کو گھٹنوں پر ٹیک دینا جائز ہے۔ مگر کلائیاں بچھانے کی اجازت نہیں، کیونکہ اس میں کتے کی مشابہت ہے۔

حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ صحابہ کرام نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: سجدوں میں ہاتھ پھیلا کر رکھنے کی وجہ سے ہم تھک جاتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "گھٹنوں سے مدد لیا کرو" (یہ حدیث تہجد سے متعلق ہے فرضوں سے متعلق نہیں، کیونکہ فرضوں میں اتنے طویل سجدے نہیں کئے جاتے)

تشریح: محمد بن عجلان نے اس حدیث کو مرفوعاً بیان کیا ہے اور ابن عیینہ وغیرہ نے مرسل بیان کیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ابن عیینہ والی حدیث کو اصح قرار دیا ہے، کیونکہ محمد بن عجلان اگرچہ ثقہ ہیں اور مسلم شریف کے راوی ہیں مگر حضرت ابو ہریرہ کی حدیثیں ان کے مسودہ میں گڑبڑ ہوگئی تھیں (تہذیب ۹:۳۴۲)

[۹۹] باب ماجاء فى الإعتمادِ فى السجود

[۲۸۱-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ، عن ابنِ عَجْلاَنَ، عن سُمَيٍّ، عن أبِي صالحٍ، عن أبى هريرةَ،

قال: اشْتَكَى أَصْحَابُ النبيِّ صلى الله عليه وسلم إِلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم مَشَقَّةَ السُّجُوْدِ عَلَيْهِمْ إِذَا تَفَرَّجُوْا، فقال: "اسْتَعِيْنُوْا بِالرُّكَبِ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ لا نَعْرِفُهُ مِن حَدِيثِ أبي صالحٍ، عن أبي هريرةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم إلَّا مِن هذا الوَجْهِ مِن حَدِيثِ اللَّيْثِ، عن ابنِ عَجْلَانَ؛ وقد رَوَى هذا الحَدِيثَ سُفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ وغَيْرُ وَاحِدٍ، عن سُمَيٍّ، عن النُّعْمَانِ بنِ أبي عَيَّاشٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم نَحْوَ هذا؛ وَكَأَنَّ رِوَايَةَ هؤُلَاءِ أَصَحُّ مِن رِوَايَةِ اللَّيْثِ.

ترجمہ: صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے سجدوں کی دشواری کی فریاد کی جبکہ وہ ہاتھوں کو کھولتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "گھٹنوں سے مدد حاصل کرو" ہم نہیں جانتے ابوصالح کی حدیث کو جو وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، مگر اس طریق سے یعنی لیث کی سند سے جو ابن عجلان سے ہے۔ اور اس حدیث کو ابن عیینہ وغیرہ نے سُمی سے، وہ نعمان بن ابی عیاش (تابعی) سے وہ نبی ﷺ سے اسی طرح روایت کرتے ہیں۔ اور گویا ان حضرات کی روایت لیث کی روایت سے اصح ہے۔

بابُ كَيْفَ النُّهوضُ مِنَ السُّجُوْدِ؟

سجدے سے اگلی رکعت کے لئے اٹھنے کا طریقہ

مذاہبِ فقہاء: امام شافعی رحمہ اللہ جلسۂ استراحت کی سنیت کے قائل ہیں۔ باقی ائمہ اس کو سنت نہیں کہتے۔ اور جن احادیث میں رسول اللہ ﷺ سے جلسۂ استراحت کرنا مروی ہے، جمہور نے ان کو عذر پر محمول کیا ہے۔ یعنی اگر آدمی کے لئے بڑھاپے کی وجہ سے یا موٹاپے کی وجہ سے یا دیگر اعذار کی وجہ سے پہلی اور تیسری رکعت کے دوسرے سجدہ سے اگلی رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہونا مشکل ہو تو پہلے بیٹھ جائے پھر ستا کر کھڑا ہو، یہی جلسۂ استراحت ہے۔ مگر تندرست کو سیدھا کھڑا ہونا چاہئے۔ کیونکہ آنحضور ﷺ کی سنتِ مستمرہ سیدھے کھڑے ہونے کی تھی۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: أكثر الأحاديث على هذا اکثر احادیث میں یہی بات مروی ہے۔ اور خود امام احمد رحمہ اللہ بھی جلسۂ استراحت نہیں کرتے تھے (مغنی ۱:۵۲۹) اور صحابہ کا بھی یہی عمل تھا، حضرت عمر، ابن مسعود، ابن عمر، ابن عباس، ابن زبیر اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم سے جلسۂ استراحت نہ کرنا مروی ہے (نصب الرایہ ۱:۳۸۹) بلکہ نوادر الفقہاء میں اور مجد بن تیمیہ نے جلسہ استراحت کے ترک پر صحابہ کے اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ علاوہ ازیں نماز میں تمام جگہوں میں (دو جگہوں کے علاوہ) ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف انتقال کے وقت تکبیر رکھی گئی ہے۔ اگر جلسہ

استراحت مسنون ہوتا تو اس کے بعد بھی تکبیر یا تسمیع وتحمید یا تسلیم کے مانند کوئی ذکر ضرور رکھا جاتا حالانکہ یہاں امام شافعیؒ بھی کسی ذکر کے قائل نہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جلسہ استراحت ایک عارضی چیز اور عذر کی بنا پر ہے۔

[١٠٠] باب كيف النُّهُوْضُ من السجودِ؟

[٢٨٢-] حدثنا عَلِيُّ بنُ حُجْرٍ، نا هُشَيْمٌ، عن خالِدٍ الحَذَّاءِ، عن أبى قِلَابَةَ، عن مالكِ بنِ الحُوَيْرِثِ اللَّيْثِيِّ: أَنَّهُ رَأَى رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّى، فَكَانَ إِذَا كَانَ فى وِتْرٍ مِنْ صَلَاتِهِ لَمْ يَنْهَضْ حَتّٰى يَسْتَوِىَ جَالِسًا.

قال أبو عيسى: حديثُ مالكِ بنِ الحُوَيْرِثِ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ والعَمَلُ عَلَيْهِ عندَ بَعْضِ أهلِ العلمِ، وبه يَقولُ أَصْحَابُنَا.

ترجمہ: مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا، پس جب رسول اللہ ﷺ نماز کی طاق رکعت میں ہوتے تو (اگلی رکعت کے لئے) کھڑے نہیں ہوا کرتے تھے یہاں تک کہ سیدھے بیٹھ جایا کرتے تھے (پھر کھڑے ہوتے تھے) (مالک بن الحویرث خدمت نبوی میں بیس روز رہے ہیں ان دنوں میں آپؐ نے کسی عذر کی بناء پر جلسہ استراحت کیا ہے یہ اس موقع کے عمل کا تذکرہ ہے ورنہ جلسۂ استراحت کرنا آپ کا دائمی معمول نہیں تھا)

بابٌ مِنه أيضاً

پہلے مسئلہ ہی سے متعلق دوسرا باب

حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز کی طاق رکعت کے سجدوں کے بعد اگلی رکعت کے لئے اپنے قدموں کے سروں پر کھڑے ہوتے تھے۔

تشریح: یہ حدیث اگرچہ خالد بن ایاس کی وجہ سے ضعیف ہے مگر اس سے فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اکثر صحابہ کا جلسۂ استراحت نہ کرنا اس کے سنت نہ ہونے کی واضح دلیل ہے۔

[١٠١] باب منه أيضا

[٢٨٣-] حدثنا يَحيى بنُ مُوْسَى، نا أبو مُعَاوِيَةَ، نا خَالِدُ بنُ إِيَاسٍ — ويُقَالُ خَالِدُ بنُ إِلْيَاسَ — عن صَالِحٍ مَوْلَى التَّوْأَمَةِ، عن أبى هريرةَ، قال: كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يَنْهَضُ فى الصَّلَاةِ

عَلٰى صُدُوْرِ قَدَمَيْهِ.

قال أبو عيسى: حديثُ أبي هُريرةَ عَلَيْهِ العَمَلُ عند أهلِ العلمِ: يَخْتَارُوْنَ أن يَنْهَضَ الرَّجُلُ فِي الصَّلَاةِ عَلٰى صُدُوْرِ قَدَمَيْهِ.

وخالدُ بنُ إِيَاسٍ ضَعيفٌ عِند أهلِ الحَديثِ، ويُقَالُ خالدُ بنُ إِلْيَاسَ.

وصَالِحٌ مَوْلَى التَّوْأَمَةِ: هُوَ صَالِحُ بنُ أَبي صَالِحٍ: اسْمُهُ نَبْهَانُ مَدَنِيٌّ.

وضاحت: حدیثِ ابی ہریرہ پرعلماء کا عمل ہے وہ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ آدمی نماز میں اپنے قدموں کے سروں پر کھڑا ہو ـــــ اور توأمہ ایک عورت کا نام ہے اس نے صالح کو آزاد کیا تھا اس لئے وہ مولی التوأمہ کہلاتے ہیں۔

بابُ مَاجَاءَ فِي التَّشَهُّدِ

تشہد کا بیان

تشہد: حضرت عمر، ابن مسعود، ابن عباس، ابن عمر، عائشہ رضی اللہ عنہم اور دیگر متعدد صحابہ سے بیس سے زائد طرح سے مروی ہے۔ اور ان کی روایات میں ایک دو لفظوں کا معمولی سا فرق ہے۔ اور تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ سند کے لحاظ سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد کو بقیہ روایات پر ترجیح حاصل ہے۔ اسی لئے احناف نے اس تشہد کو پسند کیا ہے۔ اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس سے مروی تشہد کو لیا ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تشہد کو پسند کیا ہے اور تمام علماء کے نزدیک احادیث میں وارد تمام تشہد پڑھنا جائز ہے۔

حدیث: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں قعدہ میں پڑھنے کے لئے جو تشہد سکھلایا ہے وہ یہ ہے:

(۱) التحیات: یعنی ادب و تعظیم اور اظہار نیاز مندی کے تمام کلمات اللہ کے لئے ہیں ـــــ تَحیات: تَحِیَّۃٌ کی جمع ہے جس کے معنی بندوں کے تعلق سے "سلام" کے ہیں اور اللہ کے تعلق سے نماز پڑھ کر اللہ کے لئے نیاز مندی کا اقرار کرنے کے ہیں۔ تحیۃ المسجد اور تحیۃ الوضوء اسی سے ماخوذ ہیں۔ اور یہاں تمام قولی عبادتیں مراد ہیں۔

(۲) الصلوات: یعنی نمازیں اللہ کے لئے ہیں۔ مراد تمام فعلی عبادتیں ہیں۔

(۳) والطیّباتُ: یعنی پاکیزہ چیزیں یعنی تمام صدقات اللہ کے لئے ہیں ـــــ مراد تمام مالی عبادتیں ہیں یعنی بندہ تمام قولی، فعلی اور مالی عبادتیں اور نذرانے اللہ کے حضور میں پیش کرتا ہے۔

(۴) السلام علیك: یعنی آپ پر سلام ہو اے نبی! اور اللہ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں ــــــ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد بجائے السلام علیك کے السلام علی النبی کہنے لگے تھے (بخاری حدیث ۶۲۶۵ باب الأخذ بالیدین) مگر جمہور امت نے اس تبدیلی کو قبول نہیں کیا۔ اب بھی امت السلام علیك أیها النبی کہتی ہے۔ کیونکہ یہ جملے شب معراج کی یادگار ہیں اور یہ جملے پڑھے جاتے ہیں کہے نہیں جاتے۔ جیسے قل: هو الله أحد میں قُلْ کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، کہا نہیں جاتا، ورنہ قل کی ضرورت نہیں تھی۔

(۵) السلام علینا: یعنی سلام ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر ــــــ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: جب کوئی بندہ اس کلمہ کو کہتا ہے تو آسمان وزمین میں موجود تمام نیک بندوں تک اللہ کا سلام پہنچ جاتا ہے (بخاری حدیث ۸۳۱ باب التشهد إلخ)

(۶) أشهد: یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آنحضور ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں ــــــ ایمان کی تجدید کے طور پر بندہ ہر نماز میں یہ گواہی دیتا ہے۔

فائدہ: فقہ کی کتابوں میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ تشہد شب معراج کا مکالمہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب بارگاہِ مقدس میں شرفِ حضوری نصیب ہوا تو آپ نے اس طرح نذرانۂ عبودیت پیش کیا: التحیات لله والصلوات والطیبات، اللہ کی طرف سے جواب ملا: السلام علیك أیها النبی ورحمة الله وبرکاته۔ آپؐ نے خیال فرمایا: مجھ پر تو سلام آیا مگر میری امت محروم رہی۔ چنانچہ عرض کیا: السلام علینا وعلی عباد الله الصالحین: یعنی مجھ پر بھی سلامتی نازل ہو اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر بھی۔ بعد میں شب معراج کے اس یادگاری جملوں میں شہادتین کا اضافہ کیا گیا اور اسی کی مناسبت سے اس ذکر کا نام ''تشہد'' تجویز ہوا۔

[۱۰۲] باب ماجاء فی التشهد

[۲۸۴-] حدثنا یَعقوبُ بنُ إبراهیمَ الدَّوْرَقِیُّ، نا عُبَیْدُ اللّٰهِ الأَشْجَعِیُّ، عن سُفیانَ الثوریِّ، عن أبی إسحاقَ، عن الأَسْوَدِ بنِ یَزِیْدَ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ مَسْعُوْدٍ، قال: عَلَّمَنَا رسولُ اللّٰهِ صلی الله علیه وسلم إِذَا قَعَدْنَا فِی الرَّکْعَتَیْنِ أَنْ نَّقُوْلَ: التَّحِیَّاتُ لِلّٰهِ والصلواتُ والطیباتُ، السلامُ علیكَ أَیُّهَا النبیُّ ورحمةُ اللّٰهِ وبرکاتُه، السَّلامُ علینا وعلی عباد الله الصالحینَ، أَشْهَدُ أن لا إلٰه إلا الله، وأَشْهَدُ أَنَّ محمداً عبدهُ ورسولُه.

قال: وفی الباب عن ابنِ عُمَرَ، وجابرٍ، وأبی موسیٰ، وعائشةَ.

قال أبو عیسی: حدیثُ ابنِ مسعودٍ قَدْ رُوِیَ عَنْهُ مِنْ غَیْرِ وَجْهٍ؛ وهو أَصَحُّ حدیثٍ عن النبیِّ

صلى الله عليه وسلم في التَّشَهُّدِ؛ والعَمَلُ عليهِ عند أكثرِ أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم ومَنْ بَعْدَهُمْ مِنَ التَّابعينَ، وهو قولُ سُفيانَ الثوريِّ، وابنِ المباركِ، وأحمدَ، وإسحاق.

ترجمہ: ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہ بات سکھائی کہ جب ہم دو رکعت پر بیٹھیں تو کہیں ـــــ حدیث ابن مسعود متعدد طرق سے مروی ہے، اور تشہد کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے جو روایات ہیں ان میں سب سے اصح ابن مسعود کی روایت ہے۔

باب منه أيضا

تشہد ابن عباس رضی اللہ عنہما

حدیث: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ ہمیں قرآن کی طرح یہ تشہد سکھلایا کرتے تھے۔ اس تشہد میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے تشہد سے چار فرق ہیں: (۱) اس تشہد میں المبارکات کی زیادتی ہے۔ اور اس سے مراد بھی قولی عبادتیں ہیں، پس یہ تکرار ہے (۲) اس تشہد میں ابتدائی جملوں کے درمیان واو نہیں ہے (۳) اور دونوں جگہ ''سلام'' نکرہ ہے (۴) اس میں رسول اللہ ﷺ کی عبدیت کا تذکرہ نہیں ہے۔ پس مضمون کے لحاظ سے ابن مسعودؓ کا تشہد جامع ہے۔

فائدہ: شوافع کے یہاں لفظ ''سلام'' نکرہ پڑھنے کا معمول ہے، مگر مسلم شریف میں یہ لفظ معرفہ بھی آیا ہے۔
(مسلم ۱: ۱۸۰ باب التشہد)

[۱۰۳] باب منه أيضا

[۲۸۵-] حدثنا قُتيبةُ، نا اللَّيثُ، عن أبي الزُّبَيْرِ، عن سَعيدِ بنِ جُبَيْرٍ، وطاوُسٍ، عن ابنِ عباسٍ، قال: كان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يُعَلِّمُنَا التَّشَهُّدَ كَمَا يُعَلِّمُنَا القُرآنَ، فَكَانَ يَقولُ: التَّحِيَّاتُ المُبارَكَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ لِلّهِ، سَلَامٌ عليك أيُّها النبيُّ ورحمةُ الله وبركاتُه، سلامٌ علينا وعلى عبادِ اللّهِ الصالحين، أشهدُ أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمداً رسول الله.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عباسٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ غريبٌ؛ وقد رَوَى عبدُ الرحمنِ بنُ حُمَيْدٍ الرُّؤَاسِيُّ هٰذَا الحديثَ عن أبي الزُّبَيْرِ نَحْوَ حَديثِ اللَّيْثِ بنِ سَعْدٍ؛ ورَوَى أَيْمَنُ بنُ نَابِلٍ المَكِّيُّ هٰذَا الحَديثَ عن أبي الزُّبَيْرِ، عن جابرٍ، وهو غَيْرُ محفوظٍ؛ وذَهَبَ الشافعيُّ إلى حَدِيث ابنِ عباسٍ في التَّشَهُّدِ.

ترجمہ: اس حدیث کو ابو الزبیر سے عبد الرحمٰن بن حمید رُؤاسی بھی لیث بن سعد کی حدیث کی طرح روایت کرتے ہیں یعنی عبد الرحمٰن امام لیث کے متابع ہیں، پس یہ سند صحیح ہے اور ایمن مکی اس کی سند حضرت جابر رضی اللہ عنہ تک پہنچاتے ہیں۔ یہ سند محفوظ نہیں یعنی صحیح نہیں، کیونکہ ان کا کوئی متابع نہیں۔ اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے ابن عباسؓ کے تشہد کو اختیار کیا ہے۔

بابُ مَاجَاءَ أَنَّهُ يُخفِي التَّشَهُّدَ

تشہد آہستہ پڑھنا مسنون ہے

قعدہ میں جواذ کار ہیں: تشہد، درود اور دعا وہ سب سراً پڑھنا مسنون ہیں۔ اور اس پر اجماع ہے۔

حدیث: ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ تشہد میں اخفاء سنت ہے ـــــ اس حدیث کو غریب بھی کہا ہے مگر غرابت کی کوئی وجہ بیان نہیں کی۔ شاید ہمارے نسخوں میں یہ لفظ محفوظ نہیں۔ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے نصب الرایہ (۱:۴۲۲) میں اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے: قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ۔

[۱۰٤] باب ماجاء أنه يخفي التشهد

[۲۸٦-] حدثنا أبو سعيدٍ الأَشَجُّ، نا يُونسُ بنُ بُكَيْرٍ، عن مُحمدِ بنِ إسحاقَ، عن عبدِ الرحمنِ بنِ الأَسْوَدِ، عن أبيهِ، عن ابنِ مَسعودٍ قال: مِنَ السُّنَّةِ أن يُخْفِيَ التشهدُ.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ مَسعودٍ حديثٌ حسنٌ غريبٌ؛ والعَمَلُ عليه عند أهل العلمِ.

ترجمہ: تمام علماء کے نزدیک اس حدیث پر عمل ہے۔

بابٌ كَيْفَ الجُلُوسُ فى التَشَهُّدِ

قعدہ میں بیٹھنے کا طریقہ: افتراش

مذاہبِ فقہاء: حنفیہ کے نزدیک دونوں قعدوں میں بیٹھنے کا مسنون طریقہ افتراش ہے یعنی بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھے۔ اور دایاں پاؤں کھڑا رکھے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں قعدوں میں تورک مسنون ہے۔ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک قعدۂ اولیٰ میں افتراش اور قعدۂ ثانیہ میں تورک مسنون ہے۔ پھر امام شافعی رحمہ اللہ مطلقاً قعدۂ اولیٰ میں افتراش کو سنت کہتے ہیں اور امام احمد رحمہ اللہ کے یہاں ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ قعدہ جس کے بعد سلام ہے اس میں تورک ہے۔ ثمرۂ اختلاف نماز فجر میں ظاہر ہوگا۔ اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کے

نزدیک افتراش کرنا اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک تورک کرنا سنت ہوگا۔

تورک کی دو صورتیں ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا رکھے اور بایاں پاؤں اس کے نیچے سے دائیں جانب نکال دے اور سرین پر بیٹھے۔ یہ کیفیت ابوحمید ساعدی کی حدیث میں مروی ہے (حدیث ۲۸۸) جو آگے آرہی ہے اس کو امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ نے اختیار کیا ہے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں پاؤں دائیں جانب نکال دے اس کو امام مالک نے لیا ہے اور یہ طریقہ عبداللہ بن الزبیر کی حدیث میں آیا ہے (مسلم ۵:۷۹ صفة الجلوس مصری)

دلائل: حنفیہ نے باب کی حدیث سے اور ابن عمرؓ (بخاری حدیث ۸۲۷ سنة الجلوس) اور حضرت عائشہؓ کی حدیث (مسلم، مشکوۃ حدیث ۷۹۱ صفة الجلوس) سے استدلال کیا ہے ان میں بلاتفریق رسول اللہ ﷺ سے افتراش کرنا مروی ہے۔ بلکہ حضرت سمرۃ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی روایات میں تورک کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت سمرۃ کی حدیث بیہقی اور متدرک حاکم میں ہے (اعلاء السنن ۳:۸۲) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح ابن السکن اور سنن بیہقی میں ہے (بدائع الصنائع ۱:۴۹۶) ـــــ اور امام مالک رحمہ اللہ نے عبداللہ بن الزبیر کی روایت سے تمسک کیا ہے اس میں بلاتفریق تورک مروی ہے۔ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا استدلال ابوحمید ساعدی کی حدیث سے ہے اس میں صرف آخری قعدہ میں تورک کرنے کا ذکر ہے۔

اور احناف نے ابن الزبیر اور ابوحمید ساعدی کی روایات کو عذر پر محمول کیا ہے۔ یعنی جو شخص بڑھاپے، موٹاپے یا کسی اور عذر کی بنا پر افتراش نہ کرسکتا ہو وہ تورک کرے، اس کے لئے یہی مسنون ہے۔

[۱۰۵] باب كيف الجلوسُ في التشهد؟

[۲۸۷-] حدثنا أبو كُرَيْبٍ، نا عبد الله بن إدريس، عن عاصم بن كليب، عن أبيه، عن وائل بن حجر، قال: قَدِمْتُ المدينةَ، قلت: لَأَنْظُرَنَّ إِلىٰ صلاةِ رسول الله صلى الله عليه وسلم، فلما جَلَسَ - يعني للتشهد - افْتَرَشَ رِجْلَهُ الْيُسْرىٰ، وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُسْرىٰ - يعني على فَخِذِهِ الْيُسْرىٰ - ونَصَبَ رجلَه اليمنى.

قال أبوعيسى: هذا حديث حسن صحيح؛ والعمل عليه عند أكثر أهل العلم، وهو قول سفيان الثورى، وابن المبارك، وأهل الكوفة.

ترجمہ: حضرت وائل کہتے ہیں: میں مدینہ آیا اور میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کو ضرور دیکھوں گا۔ پس جب آپ بیٹھے ـــــ یعنی تشہد کے لئے ـــــ تو آپؐ نے اپنا بایاں پاؤں بچھایا، اور اپنا بایاں ہاتھ رکھا ـــــ یعنی اپنی بائیں ران پر ـــــ اور اپنے دائیں پاؤں کو کھڑا کیا۔

بابٌ مِنْهُ أيضًا

تشہد میں بیٹھنے کا دوسرا طریقہ: تورک

اس باب میں ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو پہلے بھی گذری ہے جس میں انھوں نے چار صغار صحابہ کی موجودگی میں نماز پڑھ کر دکھائی ہے اور سب نے ان کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ تمہیں رسول اللہ ﷺ کی نماز ہم سے زیادہ محفوظ ہے۔ اس میں یہ مضمون بھی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ تشہد کے لئے بیٹھے تو آپؐ نے اپنا بایاں پاؤں بچھالیا۔ اور دائیں پاؤں کے سر کو قبلہ کی جانب کیا یعنی دایاں پاؤں کھڑا کر کے اس کی انگلیاں جانب قبلہ کیں۔ اور دائیں ہتھیلی دائیں گھٹنے پر اور بائیں ہتھیلی بائیں گھٹنے پر رکھی۔ اور سبابہ سے اشارہ کیا —— یہ حدیث یہاں مختصر بیان ہوئی ہے۔ اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے تورک کا تذکرہ نہیں ہے ورنہ امام ترمذی رحمہ اللہ اس ٹکڑے کو ضرور ذکر کرتے۔ کیونکہ باب قائم کرنے کا یہی مقصد ہے۔ البتہ یہی حدیث محمد بن عمرو بن عطاء کی سند سے آگے باب ماجاء في وصف الصلاة میں آرہی ہے۔ اور اس میں نبی ﷺ کا قعدۂ اخیرہ میں تورک کرنا مروی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا مستدل وہی حدیث ہے مگر وہ حدیث منقطع ہے۔

[۱۰۶] بابٌ منه أيضاً

[۲۸۸-] حدثنا بُندارٌ، نا أبو عامرٍ العَقَدِيُّ، نا فُلَيْحُ بنُ سُلَيْمَانَ المَدَنِيُّ، نا عَبَّاسُ بنُ سَهْلٍ السَّاعِدِيُّ، قال: اجْتَمَعَ أبو حُمَيدٍ، وأبو أُسَيْدٍ، وَسَهْلُ بنُ سَعْدٍ، ومُحمدُ بنُ مَسْلَمَةَ، فَذَكَرُوْا صَلَاةَ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، فَقَالَ أبو حُمَيْدٍ: أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِصَلَاةِ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم: إِنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم جَلَسَ - يَعني للتَّشَهُّدِ - فَافْتَرَشَ رِجْلَهُ اليُسرىٰ، وَأَقْبَلَ بِصَدْرِ اليُمْنىٰ عَلَى قِبْلَتِهِ، وَوَضَعَ كَفَّهُ اليُمْنىٰ عَلَى رُكْبَتِهِ اليُمْنىٰ، وكَفَّهُ اليُسرىٰ عَلَى رُكْبَتِهِ اليُسرىٰ، وأَشَارَ بأُصْبُعِهِ، يَعنى السَّبَّابَةَ.

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وبه يَقولُ بَعضُ أهلِ العلمِ، وهُوَ قَولُ الشافعيِّ وأحمدَ وإسحاقَ، قالوا: يَقْعُدُ في التَّشَهُّدِ الآخِرِ عَلَى وَرِكِهِ، وَاحْتَجُّوا بِحَدِيثِ أبي حُمَيْدٍ؛ وقالُوا: يَقعُدُ في التشهُّدِ الأَوَّلِ عَلَى رِجْلِهِ اليُسرىٰ، ويَنْصِبُ اليُمنَى.

ترجمہ: امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ دوسرے تشہد میں سرین پر بیٹھے۔ اور انھوں نے ابوحمید کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اور ان حضرات نے یہ بات بھی کہی ہے کہ پہلے تشہد میں بائیں پاؤں پر بیٹھے

اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھے (مگر اس حدیث میں صرف پہلے قعدہ میں بیٹھنے کا ذکر ہے اور دوسرے طریق سے اس میں قاعدہ اخیرہ میں تورک کا بھی ذکر ہے)

فائدہ: قعدہ میں دونوں ہاتھ گھٹنوں پر اس طرح رکھنے چاہئیں کہ انگلیاں گھٹنوں تک پہنچ جائیں۔ اور حضرت عبد اللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی بائیں ہتھیلی اپنے گھٹنہ کو لقمہ بنا کر کھلاتے تھے۔ یعنی انگلیاں گھٹنے پر لٹکا لیتے تھے۔ پس یہ بھی درست ہے (مسلم ۵:۹۰ مصری)

بابُ مَاجَاءَ فی الإِشَارَةِ

تشہد میں اشارہ کرنے کا بیان

تشہد میں انگشتِ شہادت سے اشارہ کرنا مسنون ہے اور اس پر چاروں فقہاء کا اتفاق ہے۔ اگرچہ احناف کے یہاں پہلے اس مسئلہ میں شدید اختلاف تھا۔ فقہاء عراق جو حدیث سے مزاولت رکھتے تھے اشارہ کے قائل تھے اور فقہاء ماوراء النہر انکار کرتے تھے۔ اور یہ اختلاف برصغیر کے علماء احناف کے درمیان بھی طویل عرصہ تک رہا اور جانبین سے ایک دوسرے کے رد میں رسائل بھی تصنیف ہوئے، مجدد الف ثانی رحمہ اللہ بھی اشارہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور ان کے مکتوبات میں ایک طویل خط موجود ہے جس میں حضرت نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے اور اشارہ کو غیر مسنون ثابت کیا ہے (دیکھیں دفتر اول مکتوب ۳۱۲) مگر بعد میں یہ اختلاف ختم ہو گیا۔ اب سب احناف اشارہ کے قائل ہیں۔

اور اشارہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر ترپن کا عقد بنا کر رکھے۔ ترپن کا عقد اس طرح بنتا ہے کہ چھوٹی اور بیچ کی اور ان کے درمیان کی: تین انگلیاں بند کرلے، اور شہادت کی انگلی سیدھی رکھے۔ اور انگوٹھا اس کی جڑ میں لگائے۔ اس کے علاوہ دو طریقے اور بھی مروی ہیں۔ ایک: چھوٹی اور اس کے پاس والی: دو انگلیاں بند کرے۔ اور درمیانی انگلی اور انگوٹھے کا حلقہ بنائے۔ اور جب اشارہ کا وقت آئے تو انگشت شہادت سے اشارہ کرے۔ دوسرا: تمام انگلیوں کی مٹھی بنالے اور بوقت اشارہ شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے۔ یہ تینوں صورتیں درست ہیں۔ اور شروع ہی سے یہ ہیئت بنائے یا جب اشارہ کا وقت آئے اس وقت بنائے یہ دونوں باتیں درست ہیں۔ پھر اشارہ کے بعد ہیئت آخر تک باقی رکھے، اور اشارہ باقی رکھے یا ختم کردے؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اشارہ ختم کردے، فقہ کی کتابوں میں لفظ یَضَعُ آیا ہے یعنی انگلی رکھ دے۔ اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جو فتوی دیا تھا کہ آخر تک انگلی جھکا کر اشارہ باقی رکھے اس فتوی سے آپ نے رجوع کرلیا ہے۔ اور وہ رجوع بھی امداد الفتاوی میں ہے (۱:۲۰۷) اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آخر تک اشارہ باقی رکھے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک انگشت شہادت کو یمیناً و شمالاً ہلکا ہلکا حرکت دیتا رہے۔

اور اشارہ کب کرے؟ اس میں بھی اختلاف ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ جب تشہد پڑھتا ہوا لا إلٰہ پر پہنچے تو نفی کے ساتھ شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے اور اثبات کے ساتھ اشارہ ختم کردے۔ حنفیہ کے نزدیک اس اشارہ کی حکمت یہ ہے کہ لا إلٰہ سے مطلق نفی ہوتی ہے اور ایک انگلی کے اشارہ سے اللہ کی الوہیت کا استثناء ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے دو انگلیوں سے اشارہ کیا تو آنحضور ﷺ نے اس کو ٹو کا اور فرمایا: أَحِّدْ أَحِّدْ ایک انگلی سے اشارہ کر، ایک انگلی سے اشارہ کر (مشکوۃ حدیث ۹۱۳) اور جب إلا اللہ کہے تو اشارہ ختم کردے کیونکہ اب فعلی اثبات کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ درمختار میں ہے: ویَضَعُهَا عند الإثبات اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اثبات کے ساتھ اشارہ ہے تا کہ قول وفعل میں مطابقت ہوجائے اور ایک معنوی حقیقت (توحید) نگاہوں کے سامنے پیکر محسوس بن کر آجائے۔

[۱۰۷] باب ماجاء فی الإشارة

[۲۸۹-] حدثنا مَحمودُ بنُ غَيْلاَنَ، ويَحيىَ بنُ مُوسَى، قالا: نا عبدُ الرَّزَّاقِ، عن مَعْمَرٍ، عن عُبَيْدِ اللّٰهِ بنِ عُمَرَ، عن نافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كان إِذَا جَلَسَ فی الصَّلاَةِ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنىٰ عَلَى رُكْبَتِهِ، وَرَفَعَ أُصْبُعَهُ الَّتِیْ تَلِی الإِبْهَامَ، يَدْعُوْ بِهَا، وَيَدَهُ الْيُسْرَى على رُكْبَتِهِ بَاسِطَهَا عَلَيْهِ.

قال: وفی الباب عن عبدِ اللّٰهِ بنِ الزُّبيرِ، ونُمَيْرٍ الخُزَاعِیِّ، وأبی هريرةَ، وأبی حُميدٍ، ووائلِ بنِ حُجْرٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ حديثٌ حسنٌ غريبٌ، لاَنَعْرِفُهُ مِن حَدِيثِ عُبَيْدِ اللّٰهِ بنِ عُمَرَ إِلاَّ مِن هٰذا الوَجْهِ؛ والعَمَلُ عليه عند بعضِ أهلِ العلمِ من أصحابِ النبیِّ صلى الله عليه وسلم والتابعينَ: يَخْتَارُوْنَ الإِشَارَةَ فی التَّشَهُّدِ، وهو قولُ أَصْحَابِنَا.

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز میں بیٹھتے تھے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنے گھٹنے پر رکھ لیتے تھے اور جو انگلی انگوٹھے سے متصل ہے اُسے اٹھاتے تھے اور اس کے ذریعہ اشارہ کرتے تھے۔ اور اپنا باؤں ہاتھ بائیں گھٹنے پر پھیلا کر رکھتے تھے۔ اور ابن عمرؓ کی حدیث حسن ہے مگر غریب ہے کیونکہ عبید اللہ عمری سے اس کی یہی ایک سند ہے (یہ حدیث مسلم شریف میں ہے) اور اس پر صحابہ وتابعین میں سے بعض اہل علم کا عمل ہے، وہ تشہد میں اشارہ کرنے کو اختیار کرتے ہیں اور وہ ہمارے اکابر کا قول ہے۔

بابُ مَاجَاء فی التَّسْلِيْمِ فی الصَّلاَةِ

نماز میں سلام پھیرنے کا طریقہ

حدیث: ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ دائیں اور بائیں سلام پھیرا کرتے تھے۔ اور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا کرتے تھے ——— یہاں یقول پوشیدہ ہے۔ اور سلام کے اصل صیغے یہی ہیں۔ اور اس میں سے ورحمۃ اللہ کو حذف کرنے کی اور وبرکاتہ کا اضافہ کرنے کی گنجائش ہے۔

[۱۰۸] باب ماجاء في التسليم في الصلاة

[۲۹۰-] حدثنا بُندَارٌ، نا عبدُ الرحمنِ بنُ مَهْدِيٍّ، نا سُفيانُ، عن أبي إسحاق، عن أبي الأَحْوَصِ، عن عبدِ اللّٰهِ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم: أَنَّهُ كَانَ يُسَلِّمُ عن يَمِينِهِ وعن يَسَارِهِ: السَّلَامُ عليكم ورحمةُ اللهِ، السَّلَامُ عليكم ورحمةُ اللّٰهِ.

وفي الباب: عن سَعدِ بنِ أبي وقاصٍ، وابنِ عُمرَ، وجابرِ بنِ سَمُرَةَ، والبَرَاءِ، وعَمَّارٍ، ووائِلِ بنِ حُجْرٍ، وعَدِيِّ بنِ عَمِيْرَةَ، وجابرِ بنِ عَبدِ اللّٰهِ.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ مَسعودٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ والعَمَلُ عَلَيْهِ عند أكثرِ أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم ومَن بَعْدَهُمْ، وهو قولُ سُفيان الثوريِّ وابنِ المباركِ وأحمدَ وإسحاق.

بابٌ منه أيضاً

ایک سلام پھیرے یا دو؟

حدیث: صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں ایک سلام پھیرا کرتے تھے سامنے چہرہ کی جانب میں۔ یعنی سلام پھیرتے وقت رُخ مبارک جانب قبلہ ہوتا تھا۔ پھر آپ دائیں جانب تھوڑا چہرہ پھیرا کرتے تھے۔

تشریح: امام مالک رحمہ اللہ نے اس حدیث کی بناء پر یہ بات کہی ہے کہ امام صرف ایک سلام پھیرے گا اور اس میں قبلہ کی جانب منہ رکھے گا۔ دائیں یا بائیں التفات نہیں کرے گا۔ اور مقتدی تین سلام پھیریں گے، دائیں جانب، سامنے اور بائیں جانب۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث میں اور گذشتہ حدیث میں تطبیق دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ چھوٹی مسجد میں امام ایک سلام پھیرے اور بڑی مسجد میں دو۔ اور آپ کا دوسرا قول تخییر کا بھی ہے یعنی ایک پر اکتفا کرنا بھی درست ہے اور دو سلام پھیرنا بھی جائز ہے۔ اور احناف کہتے ہیں کہ امام، مقتدی اور منفرد سب دو سلام پھیریں گے۔ اور یہ حدیث اولاً تو قابل استدلال نہیں، کیونکہ زُہیر بن محمد کا تلمیذ عَمرو شامی ہے۔ پس یہ روایت معتبر نہیں۔ ثانیاً اس حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ آپ ایک سلام یعنی پہلا سلام قبلہ کی جانب منہ رکھ کر پھیرتے تھے، پھر جب وہ سلام ختم ہونے کے قریب آتا تو دائیں جانب رُخ کرتے۔ یعنی دائیں طرف التفات پہلے سلام کے بالکل آخر میں کرتے تھے۔ ایک ہی سلام پھیرتے تھے حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے ——— چنانچہ مسئلہ بھی یہی ہے کہ

پہلے سلام میں السلام کی میم پر پہنچنے تک آدمی نماز ہی میں ہوتا ہے پس اس سے پہلے منہ پھیر لینا نماز میں التفات ہے جس کی وجہ سے نماز مکروہ ہوجاتی ہے۔ لہٰذا اس سے پہلے تک منہ قبلہ کی جانب ہی رہنا چاہئے۔ البتہ دوسرے سلام کے لئے کوئی قید نہیں۔ دائیں جانب سے دوسرا سلام شروع کرے، سامنے سے شروع کرے یا بائیں جانب رخ پھیر کر سلام کرے، سب صورتیں درست ہیں۔ مگر یہ اختلاف اب مضمحل ہوگیا ہے اب سب مسلمان دو ہی سلام پھیرتے ہیں۔

فائدہ: زہیر بن محمد نے شام میں قیام کے دوران حافظہ سے روایتیں بیان کی تھیں، کیونکہ وہاں حدیث روایت کرنے کا یہی طریقہ تھا اس لئے ان سے غلطی صادر ہوجاتی تھی۔ پھر جب وہ عراق آئے تو وہاں کے رواج کے مطابق کاپیوں سے روایات بیان کرنا شروع کیں، اس لئے ان میں اغلاط نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ زہیر بن محمد کی جو روایتیں شامی تلامذہ بیان کرتے ہیں وہ غیر معتبر ہیں۔ اور عراقی تلامذہ کی روایتیں معتبر ہیں۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ زہیر بن محمد دو ہیں: ایک شامی، دوسرا عراقی۔ اور وہ زہیر بن محمد جن کو شامی تلامذہ کی روایتوں میں غیر معتبر سمجھا گیا ہے اس زُہیر بن محمد سے الگ ہیں جو عراقی تلامذہ کی روایتوں میں آئے ہیں۔ یعنی یہ دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ ناموں میں اشتباہ سے ان کو ایک سمجھ لیا گیا ہے ——— کتاب میں امام احمد رحمہ اللہ کے قول کی عبارت ذرا پیچیدہ ہے اس کا مفہوم وہ ہے جو بیان کیا گیا۔

[۱۰۹] بابٌ منه أيضاً

[۲۹۱-] حدثنا مُحمدُ بنُ يَحيَى النَّيسَابُورِيُّ، نا عَمرُو بنُ أبى سَلَمَةَ، عن زُهَيرِ بنِ مُحمدٍ، عن هِشَامِ بنِ عُروةَ، عن أبيهِ، عن عائِشَةَ: أَنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم كَانَ يُسَلِّمُ فِي الصَّلَاةِ تَسلِيمَةً وَاحِدَةً تِلْقَاءَ وَجْهِهِ، ثُمَّ يَمِيلُ إِلَى الشِّقِّ الأَيمَنِ شَيئًا.

قال: وفى الباب عن سَهْلِ بنِ سَعْدٍ. قال أبو عيسى: وحديثُ عائِشَةَ لاَنَعرِفُهُ مَرفُوعًا إِلاَّ مِن هٰذا الوَجْهِ.

قال محمدُ بنُ إسماعيلَ: زُهَيرُ بنُ مُحمدٍ: أَهلُ الشَّامِ يَرْوُوْنَ عَنهُ مَنَاكِيرَ، ورِوَايَةُ أهلِ العِراقِ عَنهُ أَشبَهُ.

قال محمدٌ: وقال أحمدُ بنُ حَنبَلٍ: كَأَنَّ زُهَيرَ بنَ مُحمدٍ الَّذِىْ كَانَ وَقَعَ عِندَهُم لَيسَ هُوَ هٰذَا الَّذِىْ يُرْوَى عَنهُ بِالعِراقِ، كَأَنَّهُ رَجُلٌ آخَرُ، قَلَبُوْا اسْمَهُ.

وقد قالَ به بعضُ أهلِ العلمِ فى التَّسليمِ فى الصَّلَاةِ؛ وأَصَحُّ الرِّوَايَاتِ عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم تَسلِيمَتَانِ؛ وعليه أَكثَرُ أهلِ العلمِ من أصحابِ النبىِّ صلى الله عليه وسلم والتابعينَ وَمَن بَعْدَهُم.

وَرَأَی قَوْمٌ مِن أصحابِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم والتابعینَ وغَیرِهِمْ تَسْلِیْمَةً وَاحِدَةً فی الْمَکْتُوْبَةِ؛ وقال الشافعیُّ: إِنْ شَاءَ سَلَّمَ تَسْلِیْمَةً وَاحِدَةً،وَإِنْ شَاءَ سَلَّمَ تَسْلِیْمَتَیْنِ.

ترجمہ: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حدیثِ عائشہ صرف اسی سند سے مرفوع ہے اور حفاظ حدیث اس کو موقوف یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول بیان کرتے ہیں قاله ابن معین۔ نصب الرایہ (۱:۴۳۳) امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں: زہیر بن محمد سے شام کے تلامذہ نے نہایت ضعیف حدیثیں روایت کی ہیں۔ اور عراق کے تلامذہ کی ان سے کی ہوئی روایتیں درستگی سے زیادہ مشابہ ہیں (أشبهَ: أی بالصواب) پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ کی رائے ذکر کی: وہ فرماتے ہیں: گویا وہ زہیر بن محمد جو اہل شام کی روایتوں میں آئے ہیں وہ وہ زہیر بن محمد نہیں ہیں جن سے عراق میں روایت کی جاتی ہے۔ گویا وہ دوسرا شخص ہے، راویوں نے اس کے نام کو پلٹ دیا ہے یعنی اشتباہ پیدا کردیا ہے۔ اور بعض علماء نے نماز میں سلام کے سلسلہ میں یہی بات کہی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ سے مروی روایات میں اصح دو سلام والی روایتیں ہیں۔ اور اس پر اکثر صحابہ وتابعین اور بعد کے اہل علم کا عمل ہے۔ اور بعض صحابہ وتابعین اور بعد کے لوگوں کی رائے یہ ہے کہ فرضوں میں ایک سلام ہے (اور نفلوں میں دو) اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر چاہے تو ایک سلام پھیرے اور اگر چاہے تو دو سلام پھیرے۔

بابُ مَاجَاءَ أَنَّ حَذْفَ السَّلَامِ سُنَّةٌ

سلام کا حذف سنت ہے

حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سلام میں حذف سنت ہے —— حذف کی تفسیر ابن المبارک رحمہ اللہ نے یہ کی ہے کہ سلام کو بہت زیادہ کھینچنا نہیں چاہئے۔ بلکہ جس طرح نماز سے باہر سلام کیا جاتا ہے نماز کے اندر بھی سلام کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ بعض امام سلام اتنا لمبا کھینچتے ہیں کہ مقتدی کا سلام پہلے پورا ہوجاتا ہے یہ غلط طریقہ ہے۔ اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ سلام کے آخر میں جزم ہونا چاہئے۔ جس طرح تکبیر میں: اگر ایک سانس میں دو یا چار کلمے ادا کئے جائیں تو ہر کلمہ مجزوم ہوتا ہے اسی طرح سلام کے آخر میں بھی حرکت ظاہر نہیں کرنی چاہئے۔ اور یاد رکھنا چاہئے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے سنةٌ کہنے کے بعد یہ حدیث مرفوع ہوگئی ہے۔

ایک واقعہ: مرحوم حضرت مولانا .... صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند ایک سال دارالعلوم کی مسجد میں تراویح پڑھا رہے تھے۔ وہ دونوں سلام ملا کر ایک ہی سانس میں اس طرح پھیرتے تھے: السلام علیکم ورحمةُ اللهِ السَّلَامُ علیکم ورحمة الله۔ حضرت علامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہ (صدر المدرسین

دارالعلوم دیوبند) کو شکایت پہنچی کہ وہ اس طرح سلام پھیرتے ہیں۔ علامہ نے مولانا......... صاحب کو بلایا، میں اس وقت موجود تھا۔ فرمایا: مولوی صاحب السلامُ جزمٌ یاد نہیں۔ اس کے بعد مولانا......... صاحب نے دو سانسوں میں سلام پھیرنا شروع کیا۔ اسی طرح بہت سے اقامہ (تکبیر) کہنے والے دو کلمات ملا کر کہتے ہیں اور پہلے کلمہ کے آخر کا اعراب ظاہر کرتے ہیں یہ غلط طریقہ ہے۔

[۱۱۰] باب ماجاء أن حَذْفَ السلامِ سنةٌ

[۲۹۲-] حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نا عبدُ اللهِ بنُ المباركِ، والهِقْلُ بنُ زِيَادٍ، عن الأَوْزَاعِيِّ، عن قُرَّةَ بنِ عَبدِ الرحمنِ، عن الزُّهْرِيِّ، عن أبي سَلَمَةَ، عن أبي هريرةَ، قال: حَذْفُ السَّلَامِ سُنَّةٌ.

قال عليُّ بنُ حُجْرٍ: وقال ابنُ المباركِ: يَعني أن لاَ تَمُدَّهُ مَدًّا.

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وَهُوَ الذي يَسْتَحِبُّهُ أهلُ العلمِ.

ورُوِيَ عن إبراهيمَ النَّخعِيِّ أَنَّهُ قَالَ: التَّكْبِيْرُ جَزْمٌ، والسَّلَامُ جَزْمٌ.

وهِقْلٌ: يُقَالُ كَانَ كَاتِبَ الأَوْزَاعِيِّ.

قوله: وهو الذي يستحبه میں ضمیر ھو کا مرجع ابن المبارک کی بیان کردہ تفسیر ہے، یعنی علماء نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ نماز کے سلام میں آواز نہ کھینچی جائے (حدیث کی تفسیر میں راجح قول یہی ہے) اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: تکبیر جزم ہے اور سلام جزم ہے یعنی اقامہ میں بھی کلمات کے آخر میں جزم ہونا چاہئے اور سلام کے آخر میں بھی جزم ہونا چاہئے۔

بابُ مَايَقُوْلُ إِذَاسَلَّمَ

نماز کے بعد کے اذکار

باب میں نماز کے بعد متعدد اذکار مروی ہیں۔ ان کو یاد کرنا چاہئے اور فرضوں کے بعد ان کو پڑھنا چاہئے، ہاتھ اٹھا کر دعا کی طرح پڑھنا ضروری نہیں۔ ہاتھ اٹھائے بغیر عام اذکار کی طرح پڑھنے کی بھی گنجائش ہے۔

پہلا ذکر: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ سلام پھیرنے کے بعد صرف اتنی دیر بیٹھتے تھے جس میں یہ ذکر پڑھا جا سکے۔ اللّٰهُمَّ أنتَ السلام إلخ: ترجمہ: اے اللہ! آپ سلامتی دینے والے ہیں۔ دوسرا ترجمہ: اے اللہ! آپ عیوب سے محفوظ وسالم ہیں۔ اور آپ ہی کی طرف سے سلامتی حاصل ہوتی ہے (پہلا السلام اللہ کی صفت ہے اور دوسرا لغوی معنی میں ہے) آپ کی ذات بڑی بابرکت ہے یعنی آپ عالی مرتبہ

ہیں۔اے ذوالجلال والاکرام: اے جلال وعظمت اور عزت واکرام والے! ایک حدیث میں ذوالجلال سے پہلے حرف ندایا محذوف ہے۔اور دوسری حدیث میں مذکور ہے ——— اور اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ فرضوں کے بعد دعا نہیں کرتے تھے۔صرف یہ ذکر یا اس کے مانند کوئی اور ذکر کر کے سنت میں مشغول ہو جاتے تھے یا گھر میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں سنت پڑھتے تھے۔

فائدہ: یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ بعض حضرات اس دعا میں چند کلمات (ربنا حَيِّنَا بالسلام إلخ) بڑھاتے ہیں وہ کلمات نبی ﷺ سے مروی نہیں، مگر ان کا اضافہ جائز ہے کیونکہ ماثورہ اذکار میں تبدیلی کرنے کی تو گنجائش نہیں مگر اضافہ کرنے کی گنجائش ہے۔آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو کوئی دعا سکھلائی تھی انھوں نے وہ دعا یاد کر کے سنائی اور بنبیِّك الذی أرسلتَ کی جگہ برسولك الذی أرسلتَ پڑھ دیا تو آپؐ نے ٹوکا۔معلوم ہوا کہ منقولہ دعاؤں میں تبدیلی کرنے کی اجازت نہیں۔اور کتاب الحج میں یہ حدیث آئے گی کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی ﷺ کا تلبیہ یہ تھا، پھر انھوں نے ماثورہ تلبیہ کے آخر میں اضافہ کیا۔معلوم ہوا کہ شروع میں یا درمیان میں یا آخر میں اضافہ کی گنجائش ہے۔

دوسرا ذکر: لا إله إلا الله وحده لاشريك له إلخ: ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یگانہ ہیں ان کا کوئی شریک نہیں۔حکومت اور تعریف انہی کے لئے ہے۔وہی جلاتے ہیں اور مارتے ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہیں۔اے اللہ! کوئی اس چیز کو روکنے والا نہیں جو آپ عنایت فرمائیں۔اور کوئی اس چیز کو دینے والا نہیں جس کو آپ روک دیں۔اور مالدار کو مالداری نفع نہیں پہنچاتی آپ کے سوا (جَدّ کے معنی ہیں: غِنیٰ (مالداری) ——— یہ حدیث متفق علیہ ہے مگر اس میں يُحيِي ويُمِيتُ نہیں ہے اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی یہی حدیث دوسری سند سے معجم طبرانی میں ہے وہاں یہ لفظ ہیں (فتح الباری)

تیسرا ذکر: سبحان ربك: ترجمہ: آپ کے رب کی ذات پاک ہے جو عزت والے ہیں ان باتوں سے جو مشرکین بیان کرتے ہیں اور سلامتی ہو رسولوں پر اور سب تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہاں کے پروردگار ہیں۔(یہ سورۃ الصافات کی آخری آیات ہیں) رواہ الطیالسی (۹:۲۹۲) وابن السنّی عن ابی سعید الخدری (کشف النقاب ۵:۲۳)

چوتھا ذکر: حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہو کر جب گھر کی طرف لوٹنے کا ارادہ فرماتے تو پہلے تین مرتبہ أستغفر الله، أستغفر الله، أستغفر الله کہتے۔پھر اللّٰهم أنت السلام پڑھتے پھر تشریف لے جاتے (رواہ مسلم عن ثوبانؓ ۱:۲۱۸ وابوداؤد ۱:۲۱۲ وابن ماجہ ص:۶۶ کشف النقاب ۵:۲۲)

اس کے بعد دعا کے تعلق سے ایک اہم اور ضروری بات سمجھ لینی چاہئے: دعا عبادت کا مغز ہے۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: الدعاءُ مُخُّ العبادة، اور نماز سب سے اہم عبادت ہے پس وہ دعا سے خالی نہیں رہنی چاہئے۔ورنہ وہ

بے مغز چھلکے کی طرح ہوکر رہ جائے گی اور فرضوں میں دعا کا محل قعدہ اخیرہ ہے۔اور غیر فرائض میں دوسری جگہیں بھی ہیں مثلاً وتر میں تیسری رکعت میں قراءت سے فارغ ہوکر دعا مانگی جاتی ہے۔اور رسول اللہ ﷺ سے نوافل میں سجدوں میں دعا مانگنا بھی ثابت ہے ــــــ اور آنحضرت ﷺ کا عام معمول فرضوں کے بعد اجتماعی دعا مانگنے کا نہیں تھا مگر گاہے ماہے آپؐ نے فرضوں کے بعد اجتماعی دعا مانگی بھی ہے اور جہری مانگی ہے۔اور فرضوں کے علاوہ دیگر مواقع میں بھی آپؐ نے اجتماعی دعا مانگی ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے فرضوں کے بعد دعا مانگنے کی ترغیب دی ہے۔ یہ تمام باتیں اپنی جگہ ثابت ہیں اور ان کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں (تفصیل کے لئے شاطبی رحمہ اللہ کی الاعتصام اور مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ کی معارف الحدیث دیکھیں)

اور دورِ اول کے تمام مسلمان نماز کے اندر دعا مانگتے تھے، وہ اس پر پوری طرح قادر تھے، عربی ان کی مادری زبان تھی اور وہ صحیح عربی بولتے تھے۔اور آج بھی بہت سے عرب علماء کو اس پر دسترس حاصل ہے۔مگر جب اسلام عجمیوں میں پہنچا اور عربوں کا حال بھی یہ ہوگیا کہ وہ اگرچہ عربی بولتے ہیں مگر صحیح عربی نہیں جانتے، بگڑی ہوئی زبان بولتے ہیں اس لئے اب عام مسلمان دعائے ماثورہ پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں۔اور عجمیوں کے لئے تو وہ محض اذکار بن گئے ہیں، دعا کی شان ان میں باقی نہیں رہی اس لئے علماء نے اس کا متبادل یہ تجویز کیا کہ دُبُر الصلوات میں یعنی نمازوں کے بعد دعا مانگی جائے۔ ہر شخص اپنی زبان میں خوب عاجزی اور انکساری کے ساتھ سمجھ کر دعا کرے۔ اسی لئے کتابوں میں نمازوں کے بعد دعا کرنے کو سنت یا ثابت نہیں کہا، بلکہ مستحب لکھا ہے۔اور اس نئے طریقہ کو بدعت نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کی اصل ثابت ہے۔ نبی ﷺ نے فرضوں کے بعد کبھی اجتماعی دعا کی ہے۔اور آپؐ نے فرضوں کے بعد دعا کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔نمازوں کے بعد دعا مانگنے کے استحبابِ پر حضرت تھانوی قدس سرہ کا ایک رسالہ استحباب الدعوات عقیب الصلوات ہے جو امداد الفتاوی جلد اول میں مندرج ہے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

مگر بعد میں اس سلسلہ میں چند خرابیاں پیدا ہوگئیں۔لوگوں نے ایک اور دعا کا اضافہ کر دیا جس کو دعائے ثانیہ کہتے ہیں۔یعنی ایک مرتبہ دعا فرضوں کے بعد متصلاً مانگی جائے اور دوسری دعا سنن ونوافل کے بعد ہیئت اجتماعی کے ساتھ بالالتزام مانگی جائے۔ علماء دیوبند اس کو بدعت کہتے ہیں۔ اسی طرح دعا کو اتنا لازم اور ضروری سمجھ لیا گیا کہ گویا اس کے بغیر نماز ادھوری ہے۔ حالانکہ مستحب کو لازم کر لینے سے وہ ناجائز ہو جاتا ہے۔اسی طرح جہری دعا کا سلسلہ شروع ہوگیا۔امام نے چند ماثورہ دعائیں یاد کرلیں وہ انہی کو پڑھتا ہے اور نہ لوگ سمجھتے نہ امام۔

دوسری طرف اس کے ردِ عمل میں چند لوگوں نے فرضوں کے بعد دعا کرنے کو بدعت کہنا شروع کر دیا۔ حالانکہ اس کی اصل موجود ہے۔خود رسول اللہ ﷺ نے کبھی فرضوں کے بعد اجتماعی دعا کی ہے اور فرضوں کے بعد دعا

کرنے کی ترغیب دی ہے۔ پس یہ بدعت کیسے ہوسکتی ہے؟ وہ لوگ کہتے ہیں: اب دعا کا التزام شروع ہوگیا ہے، لہٰذا دعا چھوڑ دینی چاہئے۔ مگر غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ غلطی کی اصلاح نہیں دعا بند کرنے سے تو بندوں کا رب العالمین سے دعا کا تعلق منقطع ہوجائے گا۔ اس لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ جن فرضوں کے بعد سنن ہیں ان میں سلام کے بعد صرف مختصر اذکار پڑھے جائیں پھر سنن ونوافل سے فارغ ہوکر الباقیات الصالحات یعنی ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھے پھر عاجزی اور انکساری کے ساتھ خوب جم کر انفراداً دعا مانگے۔ اور جن نمازوں کے بعد سنتیں نہیں ہیں ان میں سلام کے بعد متصلاً الباقیات الصالحات پڑھے، پھر دعا مانگے اور لوگوں کو دعا سراً مانگنی چاہئے تاکہ ہر آدمی اپنی مراد اللہ سے مانگ سکے۔ اور اس بات کا خیال رکھا جائے کہ التزام نہ ہونے پائے، کبھی چھوڑ بھی دی جائے اور ہیئت اجتماعی کو ضروری نہ سمجھا جائے، جس کا جی چاہے امام سے پہلے دعا شروع کردے، جس کو کوئی ضرورت ہو اور وہ چلا جائے تو اس پر نکیر نہ کی جائے، اور جس کی دعا امام کے ساتھ پوری نہ ہو وہ بعد تک مانگتا رہے البتہ اگر سارے مجمع کی مراد مشترک ہو یا امام کے پیش نظر لوگوں کو دعا مانگنے کا طریقہ سکھلانا ہو تو پھر جہراً بھی دعا مانگی جاسکتی ہے، نبی ﷺ نے جہراً دعائیں مانگی ہیں جبھی وہ منقول ہوکر ہم تک پہنچی ہیں۔

خلاصہ: یہ ہے کہ دو باتیں بے شک قابلِ اصلاح ہیں: ایک: ہیئتِ اجتماعی۔ دوسری دعا کا التزام یعنی اس کو ضروری سمجھنا۔ ان دونوں کی اصلاح کا جو طریقہ تجویز کیا جاتا ہے کہ دعا بدعت ہے، اس کو بند کردیا جائے، یہ طریقہ صحیح نہیں۔ یہ تو مزید غلطی ہوگئی کہ جس چیز کی اصل ثابت تھی اس کو بدعت قرار دے دیا اور بندوں کا اپنے خالق ومالک سے دعا کا رابطہ منقطع کردیا۔ اصلاح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ عام احوال میں جہری دعا نہ کی جائے، بلکہ ہر شخص اپنی زبان میں اپنی حاجتیں مانگے تو ہیئتِ اجتماعی خود بخود ختم ہوجائے گی۔ تین نمازوں میں تو لوگ نوافل کے بعد دعا کریں گے اور ظاہر ہے نوافل سے سب ایک ساتھ فارغ نہیں ہوتے اس لئے ہیئتِ اجتماعی خود بخود ختم ہوجائے گی اور دو نمازوں میں جب جس کی تسبیحات پوری ہوں دعا شروع کردے اور جب اس کی دعا پوری ہو دعا ختم کردے خواہ امام سے پہلے یا امام کے بعد، پس اجتماعی ہیئت باقی نہ رہے گی —— اور التزام کو ختم کرنے کی یہ صورت ہے کہ امام صاحب لوگوں کو مختلف اوقات میں یہ بات سمجھاتے رہیں کہ امام اور مقتدیوں کا رابطہ سلام پر ختم ہوجاتا ہے، نماز سلام پر پوری ہوجاتی ہے۔ پس جس کو کوئی حاجت ہو وہ جاسکتا ہے۔ بلکہ خود امام کو کوئی ضرورت ہو تو وہ بھی جاسکتا ہے، دوسرے لوگ اپنی تسبیحات پوری کریں اور اپنی دعا مانگیں۔ امام کا ان کے ساتھ ہونا ضروری نہیں۔

نوٹ: بعض امام اس طرح دعا شروع کرتے ہیں کہ لوگوں کو نہ دعا شروع کرنے کا احساس ہوتا ہے نہ ختم کرنے کا۔ وہ دعا کے شروع اور آخر میں ایک جملہ بھی جہراً نہیں کہتے یہ طریقہ بھی ٹھیک نہیں۔ اگر دعا شروع کرتے وقت اور ختم کرتے وقت ایک آدھ جملہ جہراً کہہ دیا جائے تو یہ جہری دعا نہیں ہے۔

[۱۱۱] باب مايقول إذا سَلَّمَ

[۲۹۳-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا أبو مُعَاوِيَةَ، عن عَاصِمٍ الأَحْوَلِ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ الحارثِ، عن عائشةَ، قالتْ: كان رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم إِذَا سَلَّمَ لَا يَقْعُدُ إِلَّا مِقْدَارَ مَايَقُوْلُ: اللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ، ومِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ ذَا الجَلَالِ وَالإِكْرَامِ.

حدثنا هَنَّادٌ، نا مَرْوَانُ بنُ مُعاويةَ، وأبو مُعاويةَ، عن عاصمٍ الأَحْوَلِ بِهٰذَا الإِسْنَادِ نَحْوَهُ، وقال: تَبَارَكْتَ يَا ذَالجَلَالِ والإِكْرَامِ.

قال: وفى الباب عن ثَوْبَانَ، وابنِ عُمَرَ، وابنِ عباسٍ، وأبى سعيدٍ، وأبى هريرةَ، والمَغِيْرَةِ بنِ شُعْبَةَ. قال أبو عيسى: حديثُ عائشةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[۲۹۴-] وقد رُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَنَّهُ كَانَ يَقولُ بَعْدَ التَّسْلِيْمِ: لا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحدَهُ لَاشَرِيْكَ لَهُ، له المُلْكُ وله الحمدُ، يُحيِي ويُمِيتُ، وهو على كل شيءٍ قديرٌ، اللّٰهُمَّ لَامَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنعتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ.

[۲۹۵-] ورُوِيَ أَنَّهُ كَانَ يَقولُ: ﴿سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ، وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِيْنَ﴾

[۲۹۶-] حدثنا أحمدُ بنُ مُحمدِ بنِ مُوسَى، قال: أَخْبَرَنِيْ ابنُ المباركِ، نا الأَوْزَاعِيُّ، نا شَدَّادٌ أبو عَمَّارٍ، قال: حدثنى أَبُو أَسْمَاءَ الرَّحَبِيُّ، قال حدثنى ثَوْبَانُ مَوْلَى رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، قال: كان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم إِذَا أَرَادَ أَن يَّنْصَرِفَ مِنْ صَلَاتِهِ اسْتَغْفَرَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثم قال: أَنْتَ السَّلَامُ، ومِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ يَا ذَا الجلالِ والإكرامِ.

قال: هٰذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وأبو عَمَّارٍ: اسْمُهُ شَدَّادُ بنُ عبدِ اللّٰهِ.

ملحوظہ: اس باب کا مقصد صرف نماز کے بعد کے اذکار کا بیان ہے۔ دعا کا مسئلہ تقریر میں بڑھایا گیا ہے۔

بابُ مَاجَاءَ فِي الانْصرافِ عَن يَمِينِهِ وعن يَسَارِهِ

نماز کے بعد دائیں بائیں گھومنے کا بیان

فرضوں سے یا سنن ونوافل سے فارغ ہونے کے بعد گھومنے کے لئے کسی ایک جہت کا التزام جائز نہیں یہ نماز میں شیطان کا حصہ گردانا ہے۔ متفق علیہ حدیث میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: لایجعلن أحدکم

للشیطان من صلاتہ جزء اً، یری أن حقا علیہ أن لا ینفتل إلا عن یمینہ۔ بلکہ جدھر حاجت ہو پھرنے کے لئے اسی جانب کو اختیار کرنا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ سے نماز کے بعد دونوں جانب انصراف ثابت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر رسول اللہ ﷺ کی حاجت دائیں طرف ہوتی تو آپ پھرنے کے لئے دائیں جانب اختیار کرتے۔ اور بائیں طرف حاجت ہوتی تو ادھر پھرتے۔ اور چونکہ اکثر ازواج مطہرات کے حجرے محراب سے دائیں جانب تھے اس لئے آپ کا انصراف اکثر دائیں جانب ہوتا تھا۔

[۱۱۲] باب ماجاء فی الإنصرافِ عن یمینہ وعن یسارہ

[۲۹۷-] حدثنا قُتیبۃُ، نا أبو الأحْوَصِ، عن سِماكِ بنِ حَرْبٍ، عن قَبِیْصَۃَ بنِ هُلْبٍ، عن أبیہ، قال: کان رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یَؤُمُّنَا فَیَنْصَرِفُ عَلَی جَانِبَیْہِ جمِیْعًا: عَلَی یَمِیْنِہِ وَعَلَی شِمَالِہِ.

وفی الباب: عن عبدِ اللّٰہِ بنِ مَسْعُوْدٍ، وأنسٍ، وعبدِ اللّٰہِ بنِ عَمْرٍو، وأبی هُرَیرۃَ.

قال أبو عیسی: حدیثُ هُلْبٍ حدیثٌ حسنٌ؛ والعَمَلُ عَلَیْہِ عند أهلِ العلمِ: أَنَّہُ یَنْصَرِفُ عَلَی أَیِّ جَانِبَیْہِ شَاءَ: إِنْ شَاءَ عَنْ یَمِیْنِہِ، وَإِنْ شَاءَ عَنْ یَسَارِہِ؛ وقد صَحَّ الأَمْرَانِ عن رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم.

[۲۹۸-] ویُرْوَی عن علیِّ بنِ أبی طالبٍ أَنَّہُ قَالَ: إِنْ کَانَتْ حَاجَتُہ عن یَمِیْنِہِ أَخَذَ عَنْ یَمِیْنِہِ، وإِنْ کَانَتْ حَاجَتُہُ عن یَسَارِہِ أَخَذَ عَنْ یَسَارِہِ.

ترجمہ: حضرت ہلب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ ہماری امامت کیا کرتے تھے۔ پس دونوں ہی جانب پھرتے تھے: دائیں بھی اور بائیں بھی ——— اور اس پر علماء کا عمل ہے کہ دونوں جانبوں میں سے جس جانب چاہے پھرے، اگر چاہے تو دائیں جانب اور اگر چاہے تو بائیں جانب۔ اور رسول اللہ ﷺ سے دونوں طرف پھرنا صحیح سند سے ثابت ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کو دائیں جانب حاجت ہوتی تو آپ دائیں جانب پھرتے۔ اور اگر بائیں جانب حاجت ہوتی تو اسی جانب کو اختیار کرتے۔

بابُ مَاجَاءَ فِیْ وَصْفِ الصَّلاَۃِ

پوری نماز کی ترکیب

وَصَفَ یصِفُ وَصْفًا وصِفَۃً کے معنی ہیں: بیان کرنا۔ اور صِفَۃُ الصلاۃ کا ترجمہ ہے پوری نماز کی ترکیب۔ باب میں جو حدیثیں ہیں ان میں پوری نماز کی ترکیب کا بیان ہے۔ اور یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ کسی ایک حدیث میں نماز کے سب اجزاء بیان نہیں کئے گئے، کیونکہ حدیثیں کسی بات کو موضوع بنا کر نہیں ارشاد فرمائی گئیں۔ بلکہ ان میں وقتاً

فوقتاً پیش آنے والی صورتوں کے بارے میں احکام ہیں۔ اور ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تمام اجزاء کا بیان اس لئے ہے کہ وہ حقیقتاً مرفوع حدیث نہیں بلکہ حکماً مرفوع ہے اس میں حضرت ابوحمید نے نماز پڑھ کر دکھائی ہے، اس لئے سب اجزاء ایک ساتھ مذکور ہیں ——— اس باب میں دو حدیثیں ہیں: پہلی حدیث کا نام حدیثُ المُسِیْئِ صَلاَتَہُ ہے یعنی اپنی نماز کو بری کرنے والے کا واقعہ۔ یہ واقعہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے دو سندوں سے ذکر کیا ہے۔ حضرت رِفاعہ کی سند سے اور حضرت ابو ہریرہ کی سند سے۔ دوسری روایت حضرت ابوحمیدؓ کی ہے جس کے بعض اجزاء پہلے بھی گذر چکے ہیں۔

پہلی حدیث: میں حضرت خلاد بن رافع کا واقعہ ہے۔ حضرت خلاد: حضرت رفاعہ کے بھائی ہیں اور دونوں بدری صحابی ہیں۔ حضرت رفاعہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے اور ہم آپؐ کے ساتھ تھے یعنی آنحضرت ﷺ کی مجلس ہو رہی تھی کہ ایک بدوی شخص آیا (یہ حضرت خلادؓ ہیں، بدو نہیں ہیں بلکہ مدینہ ہی کے باشندے ہیں مگر انھوں نے بدوٴں جیسا کام کیا ہے اس لئے مجازاً کالبدوی کہہ دیا ہے) اس نے تحیۃ المسجد پڑھی (نسائی میں اس کی صراحت ہے) اور انھوں نے نماز کو ہلکا کیا (یعنی ارکان اربعہ جلدی جلدی ادا کئے ان میں تعدیل نہ کی) پھر وہ آنحضور ﷺ کی مجلس میں شرکت کے لئے آئے۔ اور سلام کیا، آپؐ نے جواب دیا وعلیك (یہاں سے معلوم ہوا کہ سلام کے جواب میں صرف وعلیك کہنا بھی کافی ہے) اور فرمایا: ”واپس جاوٴ، نماز پھر پڑھو، تم نے نماز نہیں پڑھی“ یعنی تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ وہ واپس گئے اور دوبارہ نماز پڑھ کر آئے۔ اور سلام کیا آپ نے جواب مرحمت فرمایا اور دوبارہ نماز پڑھنے کے لئے کہا۔ غرض آپؐ نے دو یا تین مرتبہ ان کو لوٹایا اور وہ ہر بار نماز پڑھ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے تھے اور سلام کرتے تھے آپؐ جواب دینے کے بعد یہی فرماتے تھے کہ واپس جاوٴ پھر نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی (اگر حضرت خلادؓ دو بار لوٹائے گئے تو انھوں نے نماز تین مرتبہ پڑھی اور تین مرتبہ لوٹائے گئے تو چار مرتبہ نماز پڑھی)

حضرت رفاعہؓ کہتے ہیں: اس واقعہ سے صحابہ سہم گئے اور یہ بات ان پر شاق گذری یعنی یہ بات کہ جو تعدیل ارکان نہ کرے اس کی نماز نہیں ہوتی۔ غرض دو یا تین مرتبہ لوٹانے کے بعد انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے دکھلایئے اور مجھے نماز سکھلایئے (کیونکہ میں جیسی جانتا ہوں ویسی پڑھتا ہوں) اور میں انسان ہی ہوں میرا عمل درست بھی ہوسکتا ہے اور اس میں چوک بھی ہوسکتی ہے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ہاں یعنی تم نے ٹھیک کہا۔ آپؐ نے جن جگہوں پر انھوں نے غلطی کی تھی اس کو خاص طور پر بیان کیا۔ فرمایا: جب آپ نماز پڑھنے کا ارادہ کریں تو پہلے ایسی وضو کریں جیسی وضو کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے (سورۂ مائدۃ آیت ۶) پھر گواہی دیں (یعنی وضو کے بعد کلمۂ شہادت پڑھیں یا اذان دیں) پس نماز شروع کریں (یا اقامت کہیں اور ابوداوٴد میں لفظ أیضاً نہیں ہے) پس اگر تیرے پاس قرآن میں سے کچھ ہو (

یعنی قرآن یاد ہو) تو اسے پڑھ۔ ورنہ اس کی جگہ الحمدللہ، اللہ اکبر اور لا إلٰہ إلا اللہ کہہ۔ پھر رکوع کر اور اس میں ٹھہر یعنی باطمینان رکوع کر۔ پھر سیدھا کھڑا ہو (تا آنکہ ہر ہڈی اپنی جگہ میں سیٹ ہو جائے) پھر سجدہ کر اور اس میں ٹھہر، پھر بیٹھ اور اطمینان سے بیٹھ، پھر دوسری رکعت کے لئے کھڑا ہو (آنحضور ﷺ نے صرف ایک رکعت پڑھنے کا طریقہ سکھلایا ہے کیونکہ اصل نماز ایک ہی رکعت ہے اور چونکہ اس کو کما حقہ پڑھنا مشکل ہے اس لئے اس کے ساتھ ایک اور رکعت ملائی گئی ہے اور شفعہ بنایا گیا ہے تاکہ دو مل کر کمی کی تلافی ہو جائے۔ اور دوسری رکعت پہلی رکعت کے مانند ہے پس اس کو اسی طرح پڑھا جائے گا پھر آپ نے فرمایا: ''جب آپ نے اس طرح نماز پڑھی تو آپ کی نماز مکمل ہو گئی۔ اور اگر آپ نے اس میں کمی کی تو آپ نے اپنی نماز میں کمی کی'' حضرت رفاعہ کہتے ہیں: یہ ارشاد صحابہ پر پہلے ارشاد کی بہ نسبت آسان تھا یعنی تعدیلِ ارکان میں کمی کرے گا تو نماز میں نقص پیدا ہوگا، سرے سے نماز ختم نہیں ہو جائے گی۔

تشریح:

۱- **قولہ: فعاف الناسُ**: ایک نسخہ میں فخاف الناسُ ہے یعنی لوگ ڈر گئے یہی نسخہ موزون معلوم ہوتا ہے۔ عاف (ض، ف) **عَیفا وعِیافًا الطعامَ** کا ترجمہ ہے: کراہیت کی وجہ سے کھانا چھوڑ دینا۔ یہاں یہ ترجمہ موزون نہیں کیونکہ **کبُر علیھم** عطف تفسیری ہے یعنی لوگوں پر یہ بات شاق گذری۔ پس خاف ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۲- **قولہ: ثم تشھد فاقم ایضا**: ہمارے نسخوں میں جو لفظ ایضا ہے وہ ٹھیک نہیں، کیونکہ اس صورت میں مطلب ہوگا: وضو کر کے پہلے اذان دے پھر اقامت بھی کہہ۔ درانحالیکہ تحیۃ المسجد پڑھنے والے کے لئے اذان و اقامت کو کسی نے مسنون نہیں کہا۔ اس لئے جو ابو داؤد میں ہے وہی صحیح ہے، اور مطلب یہ ہے کہ وضو سے فارغ ہو کر کلمہ شہادت پڑھو پھر نماز قائم کرو یعنی نماز شروع کرو۔

۳- **قولہ: فإن کان معك قرآن**: یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ نماز میں مطلق قراءت فرض ہے۔ بالخصوص فاتحہ فرض نہیں، ورنہ آپ فرض کو چھوڑ کر غیر فرض کی تعلیم نہ دیتے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ضم سورت سنت ہے اور وہی قراءت کا مصداق ہے۔

۴- **قولہ: وإلا فاحمد اللہ**: یعنی جو شخص قرآن پڑھنے پر قادر نہیں وہ قراءت کی جگہ تسبیح وتہلیل اور تکبیر وتحمید کہے گا اور یہ بھی نہ کہہ سکے تو صرف اللہ، اللہ کہتا رہے۔ مگر نماز میں پڑھنے کے بقدر قرآن سیکھنا اور اس کے لئے مسلسل محنت جاری رکھنا فرض ہے اور ایسے شخص کو چاہئے کہ وہ باجماعت نماز پڑھنے کا اہتمام کرے، کیونکہ باجماعت نماز پڑھنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اگر مقتدی ایک حرف بھی نہ پڑھے تو بھی ڈبہ انجن کے ساتھ لگ کر آخر تک پہنچ جائے گا اور فرض ادا ہو جائیگا۔

۵- **قولہ: وإن انتقصتَ منہ شیئاً**: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تعدیلِ ارکان فرض ہے اور احناف کے نزدیک واجب یا سنت مؤکدہ اشد تاکید۔ ائمہ ثلاثہ نے مسئلہ کا مدار اس پر رکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تعدیل ارکان نہ کرنے کی

وجہ سے حضرت خلاد کو واپس لوٹایا اور دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اور احناف نے مسئلہ کا مدار اس پر رکھا ہے جو نبی ﷺ نے آخر میں فرمایا کہ تعدیل نہ کرنے کی صورت میں نماز تو ہوجاتی ہے مگر ناقص ہوتی ہے۔ غرض تعدیل نہ کرنے کی صورت میں ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نماز باطل ہوجائے گی۔ اور احناف کے نزدیک مکروہ تحریمی ہوگی اور وقت کے اندر اس کا اعادہ واجب اور وقت گذرنے کے بعد اعادہ مستحب ہوگا اور جس جملہ سے ائمہ ثلاثہ نے تمسک کیا ہے اس کے بارے میں احناف کہتے ہیں کہ یہ تنزیل الناقص بمنزلۃ المعدوم ہے یعنی اس میں ناقص کو کالعدم فرض کرکے کلام کیا گیا ہے —— حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے فرمایا: ائمہ ثلاثہ نے رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے جس کو سن کر صحابہ ڈر گئے تھے۔ اور حنفیہ کا استدلال اس ارشاد سے ہے جس کی وجہ سے صحابہ کو اطمینان ہوا تھا۔ ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا؟ شیخ الہند رحمہ اللہ کا یہ قول فتح الملہم شرح مسلم میں ہے۔

دوسری حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اور یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اور اس کے راوی یحییٰ قطان اور ابن نمیر ہیں، اور دونوں کی روایتوں میں ایک فرق یہ ہے کہ یحییٰ قطان: سعید مقبری اور ابو ہریرہ کے درمیان ان کے والد ابو سعید کا واسطہ بڑھاتے ہیں۔ اور ابن نمیر: سعید مقبری کا براہ راست ابو ہریرہ سے روایت کرنا بیان کرتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی عادت کے مطابق یحییٰ قطان کی حدیث کو اصح کہا ہے کیونکہ ایک راوی کے بڑھنے سے سند نازل ہوجاتی ہے۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ کی عادت یہ ہے کہ وہ عموماً اس سند کو ترجیح دیتے ہیں جس میں کمزوری ہو۔ اور بزار رحمہ اللہ نے ابن نمیر کی حدیث کو اصح کہا ہے کیونکہ ان کے متابع موجود ہیں۔ اور دار قطنی نے دونوں سندوں کو صحیح کہا ہے۔ اور بخاری کے دونوں شارح: حافظ ابن حجر اور عینی رحمہما اللہ بھی دونوں سندوں کو صحیح قرار دیتے ہیں اس لئے کہ سعید مقبری اور ان کے والد ابو سعید دونوں حضرت ابو ہریرہ کے شاگرد ہیں۔ پس مقبری نے یہ حدیث اپنے والد سے اور حضرت ابو ہریرہ سے دونوں سے سنی ہو یہ بات ممکن ہے اور یحییٰ قطان کی سند مزید فی متصل الاسناد کے قبیل سے ہوگی۔

قولہ: فصلی کما کان: پس اس نے دوبارہ نماز پڑھی جیسی پہلی مرتبہ پڑھی تھی۔

قولہ: والذی بعثك: اس ذاتِ برحق کی قسم جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے میں اچھا نہیں کرتا ہوں اس کے علاوہ کو یعنی میں اس سے اچھی نماز پڑھنا نہیں جانتا۔ پس آپ مجھے سکھلایئے۔ آپ نے فرمایا: جب تو نماز کے لئے کھڑا ہو تو تکبیر کہہ، پھر قرآن میں سے جو تیرے لئے آسان ہو اُسے پڑھ۔

قولہ: وافعل ذلك: اپنی پوری نماز میں اسی طرح کر۔ یعنی تعدیل ارکان کا خیال رکھ کر پوری نماز پڑھ۔

[۱۱۳] باب ماجاء فی وَصْفِ الصلاۃ

[۲۹۹-] حدثنا عَلِيُّ بنُ حُجْرٍ، نا إسماعيلُ بنُ جَعْفَرٍ، عن يَحيىَ بنِ عَلِيِّ بنِ يَحيىَ بنِ خَلَّادِ بنِ رَافِعٍ الزُّرَقِيِّ، عن جَدِّه، عن رِفَاعَةَ بنِ رَافِعٍ: أنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بَيْنَمَا هُوَ جَالِسٌ فِي

الْمَسْجِدِ يَوْمًا، قال رِفَاعَةُ: ونَحْنُ مَعَهُ إِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ كَالْبَدَوِيِّ، فَصَلَّى، فَأَخفَّ صَلَاتَهُ، ثُمَّ انْصَرَفَ، فَسَلَّمَ عَلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم، فقال النبيُّ صلى الله عليه وسلم:" وعَلَيْكَ، فَارْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ" فَرَجَعَ فَصَلَّى، ثم جَاءَ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ، فقال:" وعَلَيْكَ، فَارْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ" مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا، كُلُّ ذٰلِكَ يَأْتِي النبيَّ صلى الله عليه وسلم، فَيُسَلِّمُ عَلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم، فيقولُ النبيُّ صلى الله عليه وسلم:" وعَلَيْكَ فَارْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ" فَخَافَ النَّاسُ، وكَبُرَ عَلَيْهِمْ: أن يَكُوْنَ مَنْ أَخفَّ صَلَاتَهُ لَمْ يُصَلِّ، فَقَالَ الرجلُ فى آخِرِ ذٰلِكَ: فَأَرِنِيْ وعَلِّمْنِيْ فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ أُصِيبُ وَأُخطِئُ، فقال:" أَجَلْ! إِذَاقُمْتَ إِلَى الصَّلَاةِ فَتَوَضَّأْ كَمَا أَمَرَكَ اللّٰهُ بِهِ، ثُمَّ تَشَهَّدْ فَأَقِمْ أَيْضًا، فَإِنْ كَانَ مَعَكَ قُرْآنٌ فَاقْرَأْ، وإلاَّ فَاحْمَدِ اللّٰهَ وكَبِّرْهُ وَهَلِّلْهُ، ثم ارْكَعْ فَاطْمَئِنَّ رَاكِعًا، ثم اعْتَدِلْ قَائِمًا، ثم اسْجُدْ فَاعْتَدِلْ سَاجِدًا، ثم اجْلِسْ فاطْمَئِنَّ جَالِسًا، ثم قُمْ، فَإِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ فَقَدْ تَمَّتْ صَلَاتُكَ،وإِنِ انْتَقَصْتَ مِنْهُ شَيْئًا انْتَقَصْتَ مِنْ صَلَاتِكَ" قال: وكان هٰذا أَهْوَنَ عَلَيْهِمْ مِنَ الْأُوْلٰى: أَنَّهُ مَنِ انْتَقَصَ من ذٰلِكَ شَيْئًا انْتَقَصَ من صَلَاتِهِ، ولَمْ تَذْهَبْ كُلُّهَا.

قال: وفى الباب عن أبى هريرةَ،وعَمَّارِ بنِ يَاسِرٍ.قال أبو عيسى: حديثُ رِفَاعَةَ بنِ رَافِعٍ حديثٌ حسنٌ؛ وقد رُوِىَ عَن رِفَاعَةَ هٰذَا الحديثُ مِن غَيْرِ وَجْهٍ.

[٣٠٠-] حدثنا مُحمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا يَحيىَ بنُ سَعيدٍ القَطَّانُ، نا عُبَيْدِ اللّٰهِ بنِ عُمَرَ، قال أَخْبَرَنِيْ سَعيدُ بنُ أبى سَعيدٍ، عن أبيهِ، عن أبى هُريرةَ: أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم دَخَلَ الْمَسْجِدَ، فَدَخَلَ رَجُلٌ فَصَلَّى ثُمَّ جَاءَ، فَسَلَّمَ عَلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم، فَرَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ، فقال: "ارْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ" فَرَجَعَ الرَّجُلُ، فَصَلّٰى كَمَا كَانَ صَلّٰى، ثُمَّ جَاءَ إِلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم، فَسَلَّمَ ، فَرَدَّ عَلَيْهِ، فقالَ لَهُ:" ارجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ" حَتّٰى فَعَلَ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَقَالَ لَهُ الرجلُ:وَالَّذِىْ بَعَثَكَ بالحَقِّ مَا أُحْسِنُ غَيْرَ هٰذا فَعَلِّمْنِيْ، فَقَالَ:" إِذَا قُمْتَ إِلَى الصَّلَاةِ فَكَبِّرْ، ثُمَّ اقْرَأْ بِمَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ القُرآنِ، ثم ارْكَعْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ رَاكِعًا، ثم ارْفَعْ حَتّٰى تَعْتَدِلَ قَائِمًا، ثم اسْجُدْ حَتّٰى تَطْمَئِنَّ سَاجِدًا، ثم ارْفَعْ حتى تَطْمَئِنَّ جَالِسًا، وافْعَلْ ذٰلِكَ فى صلاتِكَ كُلِّهَا"

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ ورَوَى ابنُ نُمَيْرٍ هٰذا الحديثَ عن عُبَيْدِ اللّٰهِ بنِ عُمَر عن سَعيدٍ المَقْبُرِىِّ عن أبى هريرةَ؛ ولم يَذْكُرْ فِيْهِ عن أبيه، عن أبى هريرةَ؛ وروايةُ يحيىَ بنِ سَعيدٍ عن عُبَيْدِ اللّٰهِ بنِ عُمَرَ أَصَحُّ؛ وسَعيدٌ المَقْبُرِىُّ قد سَمِعَ مِنْ أبى هريرةَ، ورَوَى عن أبيه عن أبى هريرةَ.

وأبو سعيدٍ المَقْبُرِىُّ: اسْمُه كَيْسَانُ، وسَعيدٌ المَقْبُرِىُّ يُكْنٰى أَبَا سَعْدٍ.

تیسری حدیث: حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اس حدیث کے راوی عباس بن سہل اور محمد بن عمرو بن عطا ہیں۔ عباس کی حدیث پہلے گذر چکی ہے اور محمد بن عمرو بن عطا کی حدیث یہ ہے حضرت ابوحمید نے صحابہ کی ایک مجلس میں دعوی کیا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی نماز سب سے زیادہ یاد ہے۔ پھر انھوں نے چار رکعت پڑھ کر دکھائی اور سب نے ان کے دعوی کی تصدیق کی۔ یہ حدیث عباس بن سہل کی سند سے پیچھے بار بار گذری ہے۔ اور ان کا بیان یہ تھا کہ اس مجلس میں بشمول حضرت ابوحمیدؓ کے چار صحابہ تھے، اور محمد بن عمرو اس مجلس میں دس صحابہ کے موجود ہونے کی بات کہتے ہیں۔ جن میں حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کا بھی تذکرہ کرتے ہیں اور وہ اپنا اس مجلس میں موجود ہونا اور واقعہ کو بچشم خود دیکھنا اور سننا بھی بیان کرتے ہیں، درانحالیکہ محمد بن عمرو کا کسی ایسی مجلس میں حاضر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس میں ابوقتادہؓ موجود ہوں، اس لئے کہ ابوقتادہ کا انتقال ۳۸ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں ہوا ہے۔ حضرت علیؓ نے خود ان کی نماز جنازہ پڑھائی ہے۔ اور محمد بن عمرو کا انتقال ۱۲۰ ہجری میں ۸۰ سال کی عمر میں ہوا ہے یعنی ان کی ولادت حضرت ابوقتادہ کے انتقال کے دو سال بعد ہوئی ہے —— مگر چونکہ شوافع نے اس حدیث پر تکیہ کیا ہے اور ان کے یہاں نماز کے اکثر مسائل کا مدار اسی حدیث پر ہے اس لئے حافظ رحمہ اللہ نے تہذیب میں اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی ہے مگر **التلخیص الحَبِیر فی تخریج أحادیث الرافعی الکبیر** میں اس اعتراض کی سنگینی کو تسلیم کرلیا ہے۔

حدیث کا ترجمہ: محمد بن عمرو بن عطاء حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے ابوحمید سے سنا درانحالیکہ وہ دس صحابہ کے درمیان تھے جن میں ابوقتادہ ربعیؓ بھی تھے، وہ کہہ رہے تھے: مجھے رسول اللہ ﷺ کی نماز سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ سب بولے: (یہ بات کیسے ممکن ہے؟) آپ ہم سے زیادہ مقدم نہیں آنحضور کی صحبت کے اعتبار سے (یعنی آپ ہم سے پہلے مسلمان نہیں ہوئے) اور نہ ہم سے زیادہ حضور ﷺ کے پاس حاضر باش تھے۔ انھوں نے کہا: کیوں نہیں! یعنی بات بیشک یہی ہے اس کے باوجود میرا دعوی یہی ہے (بَلٰی: نفی کے جواب میں آتا ہے، یہاں ما کنتَ میں نفی موجود ہے) سب نے کہا اچھا (حضور کی نماز) پیش کیجئے پھر حضرت ابوحمید ساعدی نے چار رکعت پڑھ کر دکھائی۔ راوی نے اس کو الفاظ میں اس طرح بیان کیا: ابوحمید نے کہا: جب آنحضور ﷺ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو سیدھے کھڑے ہوتے تھے پھر ہاتھوں کو اٹھاتے تھے یہاں تک کہ دونوں ہاتھوں کو مونڈھوں کے مقابل کرلیا کرتے تھے۔ پھر جب رکوع کرنے کا ارادہ کرتے تو اپنے ہاتھوں کو مونڈھوں کی محاذات تک اٹھاتے تھے۔ اور پھر اللہ اکبر کہتے تھے اور رکوع کرتے تھے۔ اور ٹھیک طرح سے رکوع کرتے تھے، نہ تو اپنے سر کو جھکاتے تھے اور نہ اس کو اٹھاتے تھے۔ یعنی سر اور پیٹھ ایک لیول میں رہتے تھے۔ اور اپنے دونوں ہاتھ دونوں گھٹنوں پر رکھتے تھے۔ پھر تسمیع کہتے تھے اور ہاتھوں کو اٹھاتے تھے اور سیدھے کھڑے ہوجاتے تھے،

یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنی جگہ لوٹ کر آجاتی تھی، پھر زمین کی طرف بغرض سجدہ جھکتے تھے پس اللہ اکبر کہتے تھے (یہاں اللہ اکبر کا تعلق ثم ھوی کے ساتھ جڑے گا۔ اور ثم قال میں ثم بمعنی ف ہے یعنی رسول اللہ ﷺ جھکتے ہوئے تکبیر کہتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہی مضمون ہے وہ فرماتے ہیں: إن رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یکبر وهو یهوی) پھر دونوں بازو دونوں پہلوؤں سے علحدہ کرلیا کرتے تھے۔ اور پاؤں کی انگلیوں کو کھول دیا کرتے تھے (اور ایک نسخہ میں خ معجمہ سے فَتَخَ ہے یعنی پیروں کی انگلیوں کو نرم کردیا کرتے تھے تاکہ وہ جانب قبلہ مڑ جائیں) پھر اپنا بایاں پاؤں بچھاتے تھے اور اس پر بیٹھتے تھے۔ اور اطمینان سے بیٹھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنی جگہ لوٹ آتی تھی (یہ جلسہ میں بیٹھنا ہے) پھر دوسرے سجدہ کے لئے جھکتے تھے پس اللہ اکبر کہتے تھے (اس کی بھی اوپر والے جملہ کے مثل توجیہ ہے) پھر اپنا پاؤں بچھاتے تھے اور باطمینان بیٹھتے تھے۔ تا آنکہ ہر ہڈی اپنی جگہ واپس لوٹ جاتی تھی (یہ جلسۂ استراحت ہے) پھر کھڑے ہوتے تھے۔ پھر دوسری رکعت بھی اسی طرح پڑھتے تھے یہاں تک کہ جب دوسری رکعت سے (تیسری رکعت کے لئے) کھڑے ہوتے تھے تو تکبیر کہتے تھے اور ہاتھوں کو مونڈھوں تک اٹھاتے تھے جیسا کہ نماز شروع کرتے وقت کیا تھا۔ پھر بقیہ رکعتیں اسی طرح پڑھتے تھے یہاں تک کہ جب آپؐ اس رکعت پر پہنچتے جس میں نماز پوری ہوتی ہے تو بایاں پاؤں آگے کی طرف نکال دیتے تھے۔ اور بائیں جانب کی سرین پر بیٹھتے تھے، پھر سلام پھیرتے تھے۔

اور ابو عاصم کی روایت میں یہ زیادتی ہے کہ ابو حمید کی نماز دیکھ کر تمام صحابہ نے کہا: صدقت واقعی آپ کو رسول اللہ ﷺ کی نماز زیادہ یاد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز اسی طرح پڑھی ہے۔

تشریح

۱- قوله: ورفع یدیه: احادیث میں مونڈھوں کے مقابل، کانوں کی لو کے مقابل اور اطراف اُذُن یعنی کانوں کے بالائی حصہ کے مقابل ہاتھوں کو اٹھانا مروی ہے۔ احناف نے تینوں حدیثوں کو جمع کیا ہے اور یہ بات کہی ہے کہ رفع یدین کے وقت ہاتھوں کو اس طرح اٹھانا چاہئے کہ گٹے مونڈھوں کے مقابل، انگوٹھے کانوں کی لو کے مقابل اور انگلیاں اطراف اذن کے مقابل ہوجائیں۔ تفصیل گذر چکی ہے۔

۲- قوله: فإذا أراد أن یرکع: چھوٹے دو امام رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کو سنت کہتے ہیں۔ اور بڑے دو امام رفع یدین کو متروک سنت بتاتے ہیں یعنی رفع یدین آنحضور ﷺ سے ثابت ضرور ہے مگر بعد میں آپؐ نے اس کو ترک کردیا تھا۔ پس یہ سنت مستمرہ نہیں —— پھر شوافع نے تیسری رکعت کے شروع میں رفع یدین بڑھایا ہے کیونکہ ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے اس جگہ بھی رفع کیا تھا۔ اگرچہ امام شافعی رحمہ اللہ نے صرف دو جگہ رفع کرنے کی کتاب الامّ میں صراحت کی ہے۔

۳-قولہ: لم یُصوِّب رأسہ: اگر رکوع میں کمر سے نیچے کے حصہ کو اور ہاتھوں کو بالکل سیدھا کرلیا جائے، ذرا خم باقی نہ رہنے دیا جائے تو پیٹھ اور سر خود بخود ایک لیول میں ہو جائیں گے۔

۴-قولہ: حتی کانت الرکعۃ التی: اس حدیث میں قعدۂ اولیٰ میں افتراش (کما فی حدیث عباس) اور قعدۂ ثانیہ میں تورک کا تذکرہ ہے۔ چھوٹے دو امام اسی کو سنت کہتے ہیں۔ مگر حنفیہ نے اس حدیث کو عذر پر محمول کیا ہے۔ یعنی اس حدیث میں معذور شخص کے لئے قعدہ میں بیٹھنے کی متبادل شکل ہے۔ علاوہ ازیں عباس بن سہل کی حدیث میں جو اس حدیث سے اصح ہے تورک نہیں ہے۔ ابوداؤد باب افتتاح الصلاۃ میں عباس بن سہل کی حدیث متعدد طرق سے مروی ہے اور کسی میں تورک کا ذکر نہیں۔ اور پیچھے امام ترمذی رحمہ اللہ نے قائلین تورک کے لئے باب قائم کیا تھا، پھر عباس بن سہل کی حدیث کا صرف وہ ٹکڑا ذکر کیا تھا جس میں افتراش کا تذکرہ ہے۔ اگر عباس بن سہل نے بھی ابوحمید سے تورک کا مضمون روایت کیا ہوتا تو وہاں وہ حصہ ضرور ذکر کرتے اور محمد بن عمرو بن عطاء کی یہ حدیث جس میں تورک مروی ہے منقطع ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ اور امام ترمذیؒ کا اس حدیث کو حسن صحیح کہنا محل نظر ہے۔

آخری بات: حدیث مذکور کو بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کا نماز پڑھنے کا جو طریقہ تھا ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف نماز پڑھ کر دکھائی ہے اور قرینہ صحابہ کا تصدیق کرنا ہے اور ابوحمید کا رسول اللہ ﷺ کی نماز کو زیادہ یاد رکھنے کا دعوی کرنا ہے۔ کیونکہ اگر سبھی مسلمان ایسی ہی نماز پڑھتے ہوتے جیسی ابوحمیدؓ نے پڑھ کر دکھائی ہے تو یہ کوئی اچنبے کی بات نہیں تھی اور ان کا دعوی لاحصل تھا اور تصدیق کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا ہے اس وقت کے مسلمانوں کی نمازوں میں نہ تو رفع یدین تھا اور نہ تورک اور جلسۂ استراحت تھا۔ مگر چونکہ رسول اللہ ﷺ نے تورک بھی کیا ہے جلسہ استراحت بھی کیا ہے اور رفع یدین بھی کیا ہے خواہ بربنائے عذر ہی کیا ہو یا بربنائے تعلیم کیا ہو یا کسی اور مصلحت سے کیا ہو اس لئے آنحضور ﷺ کے ان اعمال کی حفاظت ضروری ہے۔ اس لئے بغرض حفاظت حدیث حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے یہ اعمال کر کے دکھائے اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے تصدیق کی کہ واقعی آپ نے متروک اور عذر پر محمول اعمال کو بھی خوب یاد رکھا ہے۔

[۳۰۱-] حدثنا مُحمدُ بنُ بَشَّارٍ، ومُحمدُ بنُ المُثنَّى، قالا: نا يَحيىَ بنُ سَعيدٍ القَطّانُ، نا عَبدُ الحَميدِ بنُ جَعْفَرٍ، نا مُحمدُ بنُ عَمْرِو بنِ عَطَاءٍ، عن أبي حُمَيْدٍ السَّاعِدِيِّ، قال: سَمِعْتُهُ وَهُوَ فِي عَشْرَةٍ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، أَحَدُهُمْ أبو قَتَادَةَ بنُ رِبْعِيٍّ، يقول: أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِصَلاَةِ رسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم، قالُوا: مَا كُنْتَ أَقْدَمَنَا لَهُ صُحْبَةً، وَلاَ أَكْثَرَنَا لَهُ إِتْيَانًا؟ قال: بَلَى! قال فَاعْرِضْ، فقال: كانَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلاَةِ اعْتَدَلَ قَائِمًا، ورَفَعَ يَدَيْهِ

حَتّٰی یُحَاذِیَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ، فَإِذَا أَرَادَ أَن يَرْكَعَ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰی يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ، ثم قال: اللّٰه أكبر وَرَكَعَ، ثم اعْتَدَلَ فَلَمْ يُصَوِّبْ رَأْسَهُ وَلَمْ يُقْنِعْ، وَوَضَعَ يَدَيْهِ عَلٰی رُكْبَتَيْهِ، ثم قال سَمع اللّٰهُ لمن حمده، وَرَفَعَ يَدَيْهِ واعْتَدَلَ، حتی يَرْجِعَ كُلُّ عَظْمٍ فی مَوْضِعِهِ مُعْتَدِلاً، ثم هَوَى إلَی الأَرْضِ سَاجِدًا، ثم قال: الله أكبر، ثم جَافَی عَضُدَيْهِ عن إِبْطَيْهِ، وَفَتَحَ أَصَابِعَ رِجْلَيْهِ، ثُمَّ ثَنَی رِجْلَهُ الْيُسْرَى، وقَعَدَ عَلَيْهَا، ثُمَّ اعْتَدَلَ حتی يَرْجِعَ كُلُّ عَظْمٍ فی مَوْضِعِهِ مُعْتَدِلاً، ثم هَوَى سَاجِدً، ثُمَّ قال: الله أكبر، ثم ثَنَی رِجْلَهُ وَقَعَدَ، واعْتَدَلَ حتی يَرْجِعَ كُلُّ عَظْمٍ فی مَوْضِعِهِ، ثم نَهَضَ، ثم صَنَعَ فی الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ مِثْلَ ذٰلِكَ، حتی إِذَا قَامَ مِنْ سَجْدَتَيْنِ كَبَّرَ وَرَفَعَ يَدَيْهِ، حتی يُحَاذِيَ بِهِمَا مَنْكِبَيْهِ، كَمَا صَنَعَ حِيْنَ افْتَتَحَ الصَّلاَةَ، ثم صَنَعَ كَذٰلِكَ حَتّٰی كَانَتِ الرَّكْعَةُ الَّتِی تَنْقَضِیْ فِيْهَا صَلاَ تُهُ، أَخَّرَ رِجْلَهُ الْيُسْرَى، وَقَعَدَ علی شِقِّهِ مُتَوَرِّكًا ثم سَلَّمَ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

قال: ومَعْنَی قَوْلِهِ: إِذَا قَامَ مِنَ السَّجْدَتَيْنِ رَفَعَ يَدَيْهِ: يَعْنِیْ إِذَا قَامَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ.

حدثنا مُحمدُ بنُ بَشَّارٍ، والحَسَنُ بنُ عَلِیٍّ الحُلْوَانِیُّ وغَيْرُ وَاحِدٍ قالوا: نا أبو عاصمٍ،نا عبدُ الحميدِ بنُ جَعْفَرٍ، نا مُحمدُ بنُ عَمرِو بنِ عَطَاءٍ، قال سمِعْتُ أَبَا حُمَيْدِ السَّاعِدِیَّ فی عَشْرَةٍ مِن أصحابِ النبیِّ صلی الله عليه وسلم، فِيهِمْ أبو قَتَادَةَ بنُ رِبْعِیٍّ، فَذَكَرَ نَحْوَ حديثِ يَحيیَ بنِ سَعيدٍ بِمَعْنَاهُ؛ وزَادَ فِيهِ أبو عاصمٍ عن عَبدِ الحَميدِ بنِ جَعْفَرٍ هذا الحَرْفَ: قَالُوْا: صَدَقْتَ هٰكَذَا صَلّٰی النبیُّ صلی الله عليه وسلم.

وضاحت: ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث کے یحیٰ قطان اور ابو عاصم دونوں راوی ہیں۔ابو عاصم کی حدیث میں یہ جملہ: صدقتَ هكذا صَلّٰی النبیُّ صلی الله عليه وسلم زائد ہے۔

بابُ مَاجَاءَ فی القِرَاءَ ةِ فی الصُّبْحِ

فجر کی نماز میں مسنون قراءت کا بیان

یہاں سے ابواب القراءۃ شروع ہوتے ہیں۔پہلے تمہید میں چند باتیں جان لینی چاہئیں:

پہلی بات: قرآن کریم کو تعلیم کی سہولت کی خاطر عہد صحابہ کے بعد تیس برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے یعنی اس کے تیس پارے بنائے گئے ہیں "پارہ" فارسی لفظ ہے اس کے معنی ہیں ٹکڑا، حصہ۔پھر عجمیوں کی سہولت کے لئے مشائخ

بخارا نے رکوع بنائے ہیں۔ پورے قرآن میں پانچ سو چالیس رکوع ہیں۔ اور حاشیہ پر رکوع کی علامت ''ع'' بنائی گئی ہے۔ اور یہ تقسیم معنی کے لحاظ سے کی گئی ہے، تاکہ بے پڑھے لوگ جان سکیں کہ کہاں مضمون پورا ہوتا ہے اور کہاں سے نیا مضمون شروع ہوتا ہے (فتاوی تاتارخانیہ ۱:۴۷۹) ——— میں نے تمام رکوعوں میں غور کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ سب رکوع ٹھیک جگہ پر لگائے گئے ہیں۔ صرف سورۂ واقعہ کا پہلا رکوع صحیح جگہ نہیں لگا۔ کیونکہ آیت ﴿ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ﴾ اصحاب یمین کے تذکرہ کا آخری حصہ ہے، اس لئے رکوع ایک آیت کے بعد لگنا چاہئے تھا۔ باقی تمام رکوع ٹھیک جگہ پر لگے ہیں، ہاں بعض ایسی جگہیں ضرور ہیں جہاں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر رکوع یہاں کے بجائے وہاں لگتا تو بہتر ہوتا۔ اور پورے قرآن کو ۵۴۰ رکوع پر منقسم کرنے کی وجہ عالمگیری (۱:۹۴ فصل التراویح) میں یہ بیان کی گئی ہے کہ: ''مشائخ نے قرآن کو ۵۴۰ رکوع پر تقسیم کیا ہے۔ اور مصاحف میں اس کی علامت بنادی ہے، تاکہ تراویح میں قرآن کا ختم ستائیسویں رمضان میں ہوسکے'' یعنی اگر ہر رکعت میں ایک رکوع پڑھا جائے تو ستائیسویں رمضان کو قرآن پورا ہوجائے گا۔

دوسری بات: صحابہ اور تابعین کا معمول تھا کہ وہ ہر ہفتہ ایک قرآن ختم کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے روزانہ تلاوت کی ایک مقدار مقرر کی تھی۔ جسے حِزب اور منزلیں کہا جاتا ہے۔ جن کی شناخت کے لئے فمی بشوقٍ مجموعہ بنایا ہے۔ ف سے فاتحہ۔ م سے مائدۃ۔ ی سے یونس، ب سے بنی اسرائیل، ش سے شعراء۔ و سے والصافات اور ق سے سورۂ ق مراد ہے ——— ایک اور تقسیم بھی ہے جسے منزل فیل کہتے ہیں۔ ف سے فاتحہ۔ ی سے یونس اور ل سے لقمان مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو آنحضور ﷺ نے کم از کم تین دن میں قرآن پورا کرنے کی اجازت دی تھی اس تقسیم کی اصل غالباً یہی واقعہ ہے۔

ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری تقسیم بھی کی گئی ہے۔ طوال۔ مئین، مثانی اور مفصلات۔ شروع کی سات یا آٹھ سورتیں (فاتحہ کے علاوہ) طوال ہیں۔ سورۂ انفال اور سورۂ توبہ الگ الگ شمار کریں تو آٹھ ورنہ سات سورتیں ہیں۔ پھر گیارہ سورتیں مئین ہیں۔ یعنی وہ سورتیں جن میں سو سے زیادہ آیتیں ہیں۔ پھر بیس سورتیں مثانی ہیں یعنی جن میں سوؔ سے کم آیات ہیں پھر مفصلات ہیں۔ یعنی وہ سورتیں ہیں جن میں چھوٹی چھوٹی آیتیں ہیں۔ پھر مفصلات کی تین قسمیں کی ہیں: طوال مفصل، اوساط مفصل اور قصار مفصل۔ اور یہ طوال، اوساط اور قصار کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور کہاں ختم ہوتے ہیں اس میں بارہ قول ہیں۔ تفصیل کے لئے علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی الاتقان دیکھیں۔ ان میں مشہور قول یہ ہے کہ سورۂ ق سے سورۂ بروج تک طوال مفصل ہیں۔ پھر سورۂ زلزال تک اوساط مفصل ہیں اور آخر تک قصار مفصل ہیں۔

تیسری بات: چاروں ائمہ متفق ہیں کہ فجر وظہر میں طوال مفصل، عصر وعشاء میں اوساط مفصل اور مغرب میں قصار مفصل پڑھنا مسنون ہے۔ اور ظہر میں اوساط مفصل اور عصر میں قصار مفصل کے مسنون ہونے کا بھی ایک قول ہے۔

اور طوال، اوساط اور قصار میں سے پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنی مقدار پڑھے یعنی پورے قرآن میں سے فجر وظہر میں طوال مفصل کے بقدر اور عصر وعشاء میں اوساط مفصل کے بقدر اور مغرب میں قصار مفصل کے بقدر پڑھے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ نمازوں میں تلاوت صرف مفصلات سے کی جائے، بقیہ پچیس پارے مہجور کر دیئے جائیں۔ سارا قرآن نمازوں میں پڑھنے کے لئے ہے۔ نبی ﷺ اور خلفائے راشدین ہر جگہ سے پڑھتے تھے۔

چوتھی بات: شیخین رحمہما اللہ کے نزدیک فجر میں پہلی رکعت دوسری سے لمبی کرنا اور باقی نمازوں میں دونوں رکعتیں مساوی رکھنا مسنون ہے۔ اور امام محمد رحمہ اللہ اور باقی ائمہ کے نزدیک تمام نمازوں میں پہلی رکعت دوسری سے لمبی کرنا مسنون ہے۔ شیخین کی دلیل حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آنحضور ﷺ ظہر کی دونوں رکعتوں میں تیس تیس آیتوں کے بقدر تلاوت کرتے تھے (مسلم مصری ۴:۱۷۲ القراء ۃ فی الظھر والعصر) معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ فجر کے علاوہ نمازوں میں دونوں رکعتیں مساوی رکھتے تھے۔ اور جمہور کی دلیل حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے وہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ پہلی رکعت جتنی طویل کرتے تھے دوسری اتنی طویل نہیں کرتے تھے، ھکذا فی العصر، وھکذا فی الصبح یعنی آپؐ ایسا عصر وفجر (سب نمازوں) میں کرتے تھے (بخاری حدیث ۷۷۶ باب یقرأ فی الأخریین إلخ)

پانچویں بات: سورت ملانا یعنی فاتحہ کے بعد کم از کم بڑی ایک آیت یا چھوٹی تین آیتیں پڑھنا ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سنت ہے اور حنفیہ کے نزدیک واجب ہے۔ اور یہ حکم فرض کی پچھلی رکعتوں کے علاوہ ہر نماز کی ہر رکعت کے لئے ہے۔ اور ہر نماز کی ہر رکعت میں فاتحہ پڑھنا ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فرض ہے اور احناف کے نزدیک واجب ہے۔ البتہ احناف کے یہاں فرض کی پچھلی رکعتوں میں فاتحہ سنت ہے۔ پھر امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک فرض کی پچھلی رکعتوں میں ضم سورت سنت ہے اور احناف کے یہاں تین قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے کہ سورت ملانا جائز نہیں، ورنہ سجدۂ سہو واجب ہوگا۔ دوسرا قول کراہیت کا ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ سورت ملانا سنت بھی نہیں اور ملانے کی صورت میں نماز مکروہ بھی نہیں ہوتی اور سجدۂ سہو بھی واجب نہیں ہوتا۔ یہی قول مفتی بہ ہے —— اور ایک رکعت میں یا کم از کم دو رکعتوں میں مکمل سورت تلاوت کرنی چاہئے یا مکمل رکوع پڑھنا چاہئے تاکہ مضمون تام ہو جائے۔

حدیث: قُطبۃ بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے آنحضرت ﷺ کو فجر کی پہلی رکعت میں ﴿وَالنَّخلَ بَاسِقَاتٍ﴾ پڑھتے سنا۔

تشریح: یہ ٹکڑا سورۂ ق کے پہلے رکوع میں آیا ہے۔ اور حدیث کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ آپؐ نے فجر کی پہلی رکعت میں سورۂ ق پوری تلاوت کی۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپؐ نے یہ سورت دو رکعت میں مکمل کی اور شروع کا حصہ پہلی رکعت میں تلاوت کیا —— رسول اللہ ﷺ سے نماز فجر میں سورۂ واقعہ تلاوت کرنا بھی مروی ہے۔

اور یہ بات بھی مروی ہے کہ آپ فجر میں ساٹھ سے سو آیات تک تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ یعنی چھوٹی سو آیتیں اور بڑی ساٹھ آیتیں تلاوت فرماتے تھے۔ اور اگر آیات درمیانی ہوں تو ان کے لئے درمیانی عدد مقرر کرنا چاہئے۔ اور سورۂ تکویر تلاوت کرنا بھی مروی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گورنروں کے نام ایک گشتی فرمان روانہ کیا تھا جس میں بہت سے احکام تھے۔ اور اس خط کے اصل مخاطب کوفہ کے گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تھے۔ اس خط میں ایک نصیحت یہ بھی کی گئی تھی کہ فجر میں طوال مفصل تلاوت کئے جائیں۔

[١١٤] باب ماجاء في القراءة في الصبح

[٣٠٢-] حدثنا هنّادٌ، نا وكيعٌ، عن مِسْعَرٍ، وسُفيانَ، عن زِيادِ بنِ عِلاَقَةَ، عن عَمِّهِ قُطْبَةَ بنِ مَالِكٍ، قال: سمعتُ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَقْرَأُ في الفَجْرِ ﴿ والنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ ﴾ في الرَّكْعَةِ الأُوْلٰى.

قال: وفي الباب عن عَمْرِو بنِ حُرَيْثٍ، وجابرِ بنِ سَمُرَةَ، وعبدِ اللهِ بنِ السَّائِبِ، وأبي بَرْزَةَ، وأُمِّ سَلَمَةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ قُطْبَةَ بنِ مَالِكٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[٣٠٣-] ورُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أنَّهُ قَرَأَ في الصُّبْحِ بالْوَاقِعَةِ.

[٣٠٤-] ورُوِيَ عَنْهُ أنَّهُ كَانَ يَقْرَأُ في الفَجْرِ مِنْ سِتِّيْنَ آيَةً إِلٰى مِأةٍ.

[٣٠٥-] ورُوِيَ عَنه أنَّهُ قَرَأَ إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ.

[٣٠٦-] ورُوِيَ عن عُمَرَ أنَّه كَتَبَ إِلٰى أبي موسىَ: أَنْ اقْرَأْ في الصُّبْحِ بِطِوَالِ الْمُفَصَّلِ.

قال أبو عيسى: وعَلَى هٰذا العَمَلُ عند أهلِ العلمِ، وبه يقولُ سُفيانُ الثوريُّ وابنُ المباركِ والشافعيُّ.

وضاحت: آنحضور ﷺ کا فجر میں سورۂ واقعہ تلاوت کرنا مصنف عبدالرزاق میں مروی ہے۔ اور ساٹھ سے سو آیتیں پڑھنا متفق علیہ حدیث میں ہے۔ اور سورۂ تکویر پڑھنے کی روایت نسائی میں ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو گشتی فرمان روانہ کیا تھا وہ مصنف عبدالرزاق اور بیہقی میں ہے (نصب الرایہ ۲:۵) ——— اور مسلم میں فجر میں آنحضرت ﷺ سے اخلاص کی دو سورتیں (سورۃ الکافرون اور سورۂ اخلاص) پڑھنے کی بھی روایت ہے۔ پس مخصوص احوال میں تلاوت مختصر کرنے کی بھی گنجائش ہے۔ مگر عمومی احوال میں مسنون قراءت کرنی چاہئے۔ اور لوگوں کے احوال کی رعایت میں طوالِ مفصل میں جو چھوٹی سورتیں ہیں ان کو یا بڑی سورتوں کو دو رکعت میں پڑھے تو اس کی بھی گنجائش ہے۔

بابُ مَاجَاءَ فی الْقِرَاءَ ةِ فی الظُّهْرِ والعَصْرِ

ظہراورعصر میں مسنون قراءت کا بیان

حدیث: حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر اور عصر میں سورۂ بروج اور سورۂ طارق اوران کے مانند سورتیں پڑھتے تھے ــــــ یہ حدیث دلیل ہے کہ ظہر وعصر میں اوساط مفصل مسنون ہیں۔اور آنحضرت ﷺ سے ظہر میں آلم تنزیلُ السجدۃ اوراس کے برابر تلاوت کرنا بھی مروی ہے (یہ حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ہے جو مسلم میں ہے) اس کی دلالت ظہر میں طوال مفصل کے مسنون ہونے پر ہے۔

اور آنحضور ﷺ سے ظہر کی پہلی رکعت میں تیس آیتوں کے بقدر اور دوسری میں پندرہ آیتوں کے بقدر پڑھنا بھی مروی ہے (یہ بھی ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اور مسلم میں ہے) اور یہ حدیث ان ائمہ کی دلیل ہے جو پانچوں نمازوں میں پہلی رکعت کو لمبا کرنا مسنون کہتے ہیں۔اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گورنروں کے نام جو گشتی فرمان جاری کیا تھا اس میں یہ بات تھی کہ ظہر میں اوساط مفصل میں سے پڑھا جائے۔اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ظہر میں عصر سے چارگنی قراءت ہے اور عصر ومغرب میں قصار مفصل مسنون ہیں۔

خلاصہ: یہ ہے کہ ظہر میں دوقول ہیں: ایک طوالِ مفصل کا دوسرا: اوساطِ مفصل کا۔پس جو ائمہ ظہر میں قصارِ مفصل پڑھتے ہیں وہ خلاف سنت ہے، کم ازکم اوساطِ مفصل تو پڑھنے ہی چاہئیں۔اور عصر میں بھی دوقول ہیں: ایک: اوساطِ مفصل کا، دوسرا: قصارِ مفصل کا۔پس عصر میں مغرب جتنی قراءت کرنے کی گنجائش ہے۔

[۱۱۵] باب ماجاء فی القراء ۃ فی الظہر والعصر

[۳۰۷-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِیعٍ، نا یَزِیدُ بنُ هَارُونَ، نا حَمَّادُ بنُ سَلَمَةَ، عن سِمَاكِ بنِ حَرْبٍ، عن جابرِ بنِ سَمُرَةَ: أنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم کَانَ یَقْرَأُ فی الظُّهْرِ وَالعَصْرِ بالسَّمَاءِ ذَاتِ البُرُوْجِ، والسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ وشِبْهِهِمَا.

قال: وفی الباب عن خَبَّابٍ، وأبی سعیدٍ، وأبی قَتَادَةَ، وزَیْدِ بنِ ثابتٍ، والبَرَاءِ.

قال أبو عیسی: حدیثُ جابرِ بنِ سَمُرَةَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

[۳۰۸-] وقد رُوِیَ عن النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم أنَّهُ قَرَأَ فی الظُّهْرِ قَدْرَ تَنْزِیْلِ السَّجْدَةِ.

[۳۰۹-] ورُوِیَ عنه أنَّهُ کَانَ یَقْرَأُ فی الرَّکْعَةِ الْأُوْلٰی مِنَ الظُّهْرِ قَدْرَ ثَلاَثِیْنَ آیَةً، وفی الرَّکْعَةِ الثَّانِیَةِ قَدْرَ خَمْسَةَ عَشَرَ آیَةً.

[۳۱۰-] ورُوِیَ عن عُمَرَ أنَّهُ کَتَبَ إِلیٰ أبِی مُوْسَی: أنِ اقْرَأْ فی الظُّهْرِ بأَوْسَاطِ المُفَصَّلِ.
ورأٰی بَعضُ أهلِ العلمِ أنَّ قِراءَ ةَ صَلاَةِ العَصْرِ کَنَحْوِ القِراءَ ةِ فِی صَلاَةِ الْمَغْرِبِ، یَقْرأُ بِقِصَارِ الْمُفَصَّلِ.
ورُوِیَ عن إبراهیمَ النَّخَعِیِّ أنَّهُ قَالَ: تَعْدِلُ صَلاَةُ العَصْرِ بِصَلاَةِ الْمَغْرِبِ فی القِرَاءَ ةِ.
وقال إبراهیمُ: تُضَعَّفُ صَلاَةُ الظُّهْرِ عَلیٰ صَلاَةِ العَصْرِ فی القِرَاءَ ةِ أرْبَعَ مِرَارٍ.

ترجمہ: بعض اہل علم کا خیال ہے کہ عصر میں قراءت مغرب میں قراءت کے مانند ہے، وہ عصر میں قصار مفصل پڑھے۔اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: عصر کی نماز مغرب کی نماز کے ساتھ قراءت کے لحاظ سے مساوی ہے۔اور حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ سے یہ بھی مروی ہے کہ ظہر میں عصر کی بہ نسبت چار گنا قراءت ہے۔

فائدہ: میرا اندازہ یہ ہے کہ نوّے فیصد ائمہ: ظہر اور عصر میں قصار مفصل کے بقدر تلاوت کرتے ہیں ان کا یہ عمل عصر میں تو ایک درجہ میں معقول ہے مگر ظہر میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں۔اس میں کم از کم اوساط مفصل کے بقدر تلاوت ضرور کرنی چاہئے ورنہ ترک سنت کا گناہ لازم آئے گا۔

بابٌ فی القِرَاءَ ةِ فی المَغْرِبِ

مغرب میں قراءت کا بیان

حدیث: آنحضور ﷺ کی چچی ام الفضل رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ مرض وفات میں نبی ﷺ مغرب پڑھانے کے لئے تشریف لائے درانحالیکہ سر مبارک پر شدتِ درد کی وجہ سے پٹی بندھی ہوئی تھی۔اس روز آپؐ نے مغرب میں سورۂ مرسلات تلاوت فرمائی۔پھر وفات تک ہم نے آپ کی اقتداء میں کوئی نماز نہیں پڑھی۔یعنی چند روز کے بعد آپؐ کا وصال ہوگیا ـــــــ اور ایک حدیث میں مغرب کی دونوں رکعتوں میں سورۂ اعراف پڑھنا بھی مروی ہے اور سورۂ طور پڑھنا بھی۔احناف کا رجحان یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مرسلات واعراف اور سورۂ طور میں سے کچھ حصہ کی تلاوت فرمائی ہوگی۔راوی نے مجازاً اس کو مرسلات اور اعراف وغیرہ پڑھنا کہہ دیا ہے۔مگر امام شافعی رحمہ اللہ کا خیال یہ ہے کہ آپؐ نے یہ سورتیں مکمل تلاوت فرمائی ہیں۔اس لئے ان کے نزدیک مغرب میں اتنی لمبی قراءت بھی کی جاسکتی ہے۔

[۱۱۶] باب ماجاء فی القراءۃ فی المغرب

[۳۱۱-] حدثنا هَنَّادٌ، نا عَبْدَةُ، عن مُحمدِ بنِ إسحاقَ، عن الزُّهْرِیِّ، عن عُبَیْدِ اللّٰهِ بنِ عَبدِ اللّٰهِ،

عن ابنِ عبَّاسٍ، عن أُمِّه أُمِّ الفَضْلِ، قالتْ: خَرَجَ إِلَيْنَا رسولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وهُوَ عَاصِبٌ رَأْسَهُ فی مَرَضِهِ، فَصَلَّی المَغْرِبَ، فَقَرَأَ بِالْمُرْسَلاتِ، فَمَا صَلَّاهَا بَعْدُ حَتّٰی لَقِیَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ.

وفی الباب: عن جُبَيْرِ بنِ مُطْعِمٍ، وابنِ عُمَرَ، وأبی أيوبَ، وزَيْدِ بنِ ثَابِتٍ.

قال أبو عيسی: حديثُ أُمِّ الفَضْلِ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[۳۱۲-] ورُوِیَ عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم أَنَّهُ قَرَأَ فی المَغْرِبِ بالأَعْرَافِ، فی الرَّكْعَتَيْنِ كِلْتَيْهِمَا.

[۳۱۳-] ورُوِیَ عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم أَنَّهُ قَرَأَ فی المَغْرِبِ بالطُّوْرِ.

[۳۱۴-] ورُوِیَ عن عُمَرَ أَنَّهُ كَتَبَ إِلٰی أبی مُوسَی: أَنِ اقْرَأْ فی المَغْرِبِ بِقِصَارِ الْمُفَصَّلِ.

[۳۱۵-] ورُوِیَ عن أبی بَكْرٍ: أَنَّهُ قَرَأَ فی المغربِ بِقِصَارِ الْمُفَصَّلِ.

قال: وعَلَی هٰذا العَمَلُ عند أهلِ العلمِ، وبه يَقولُ ابنُ المباركِ وأحمدُ وإسحاقُ.

وقال الشافعیُّ ــ وَذَكَرَ عن مَالِكٍ أَنَّهُ كَانَ يَكْرَهُ أَنْ يُقْرَأَ فی صَلَاةِ المَغْرِبِ بِالسُّوَرِ الطِّوَالِ نَحْوَ الطُّوْرِ وَالْمُرْسَلَاتِ ــ قال الشافعیُّ: لَا أَكْرَهُ ذٰلِكَ، بَلْ أَسْتَحِبُّ أَنْ يُقْرَأَ بِهٰذِهِ السُّوَرِ فِی صَلَاةِ المَغْرِبِ.

وضاحت: جس حدیث میں مغرب کی دونوں رکعتوں میں سورۂ اعراف پڑھنا مروی ہے وہ حدیث ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔ اور سورۂ طور پڑھنے کی حدیث متفق علیہ ہے اور وہ حضرت جبیر بن معظم رضی اللہ عنہ کی ہے ـــــ امام شافعی رحمہ اللہ نے پہلے امام مالک رحمہ اللہ کا قول ذکر کیا ہے کہ وہ مغرب کی نماز میں طوالِ مفصل پڑھنے کو ناپسند کرتے تھے۔ پھر امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں اس کو ناپسند نہیں کرتا۔ بلکہ میں مغرب میں مذکورہ سورتوں کے پڑھنے کو پسند کرتا ہوں۔

بابُ مَاجَاءَ فی القِرَاءَةِ فِی صَلَاةِ الْعِشَاءِ

عشاء کی نماز میں قراءت کا بیان

حدیث: حضرت بریدۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ عشاء میں سورۃ الشمس اور اس کے مانند سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ اور آپؐ سے عشاء میں سورہ والتین پڑھنا بھی ثابت ہے۔

اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ عشاء میں اوساطِ مفصل میں سے کوئی سورت پڑھتے تھے۔ جیسے سورۂ منافقون اور اس کے مانند سورتیں۔ سورۂ منافقون اور اس کے مانند سورتیں اگر دو رکعت میں پڑھی جائیں تو اوساطِ مفصل کے بقدر قراءت ہوجائے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور اصحابِ رسول ﷺ سے مسنون قراءت سے کم یا زیادہ پڑھنا بھی ثابت

ہے۔پس عمومی احوال میں مسنون قراءت کے بقدر پڑھنا چاہئے۔اور خصوصی احوال میں کم وبیش کی بھی گنجائش ہے۔

[۱۱۷] باب ماجاء فی القراءة فی العشاء

[۳۱۶-] حدثنا عَبْدَةُ بنُ عبدِ اللّٰهِ الخُزَاعِيُّ، نا زَيدُ بنُ الْحُبَابِ، نا حُسَيْنُ بنُ وَاقِدٍ، عن عَبدِ اللّٰهِ بنِ بُرَيْدَةَ، عن أبيه، قال: كان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يَقْرَأُ فى العِشَاءِ الآخِرَةِ بالشَّمْسِ وَضُحٰهَا، ونَحْوِهَا مِنَ السُّوَرِ.

وفى الباب: عن البَرَاءِ بنِ عَازِبٍ، قال أبو عيسى: حديثُ بُرَيْدَةَ حديثٌ حسنٌ.

[۳۱۷-] وقد رُوِىَ عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم أَنَّهُ قَرَأَ فى العِشَاءِ الآخِرَةِ بِسُوْرَةِ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ.

[۳۱۸-] ورُوِىَ عن عُثمانَ بنِ عَفَّانَ أَنَّهُ كَانَ يَقْرَأُ فى العِشَاءِ بِسُوَرٍ مِنْ أَوْسَاطِ الْمُفَصَّلِ، نَحْوُ سُوْرَةِ الْمُنَافِقِيْنَ وَأَشْبَاهِهَا.

ورُوِىَ عن أصحابِ النبىِّ صلى الله عليه وسلم والتابعينَ: أَنَّهُمْ قَرَأُوْا بِأَكْثَرَ مِنْ هٰذَا وَأَقَلَّ؛ كَأَنَّ الْأَمْرَ عِندَهُم واسِعٌ فى هٰذا.

وأَحْسَنُ شيئٍ فى ذٰلِكَ مَا رُوِىَ عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم: أَنَّهُ قَرَأَ بالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالتِّيْنِ والزَّيْتُوْنِ.

[۳۱۹-] حدثنا هَنَّادٌ، نا أبو معاوية، عن يَحيىَ بنِ سَعيدٍ الأَنْصَارِيِّ، عن عَدِيِّ بنِ ثابتٍ، عن البَرَاءِ بنِ عَازِبٍ، أَنَّ النبىَّ صلى الله عليه وسلم قَرَأَ فى العِشَاءِ الآخِرَةِ بالتِّيْنِ والزَّيْتُوْنِ.

وهٰذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

بابُ مَاجَاءَ فى القِرَاءَةِ خَلْفَ الإمَامِ

امام کے پیچھے قراءت کرنے کا بیان

تمام ائمہ متفق ہیں کہ مقتدی سورت نہیں پڑھے گا نہ جہری نمازوں میں اور نہ سری نمازوں میں۔اور فاتحہ میں اختلاف ہے۔اور یہاں امام ترمذی رحمہ اللہ نے سری نمازوں سے تعرض نہیں کیا۔جہری نماز میں مقتدی کو فاتحہ پڑھنی چاہئے یا نہیں؟صرف یہ مسئلہ بیان کیا ہے۔

مذاہبِ فقہاء: حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کا مذہب یہ ہے کہ جہری نماز میں مقتدی نہ صرف یہ کہ فاتحہ نہیں پڑھے گا

بلکہ فاتحہ پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ احناف کا قول تو معروف ہے اور علامہ جزیری رحمہ اللہ نے کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ (۱:۲۳۰) میں مالکیہ اور حنابلہ کے یہاں بھی کراہیت کا قول ہونے کی صراحت کی ہے۔ البتہ امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ جہری نماز میں مقتدی کے لئے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں۔ خواہ مقتدی امام کی قراءت سن رہا ہو یا نہ سن رہا ہو (کتاب الفقہ ۱:۲۵۴) اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اگر مقتدی امام کی قراءت سن رہا ہے تو فاتحہ پڑھنا جائز نہیں اور اگر اتنا دور ہے کہ امام کی آواز اس تک نہیں پہنچتی تو فاتحہ پڑھنا جائز ہے۔ اسی طرح امام کے سکتوں میں بھی پڑھنا جائز ہے (مغنی ۱:۶۰۵)

اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول قدیم یہ ہے کہ مقتدی پر فاتحہ پڑھنا فرض نہیں۔ اور قول جدید یہ ہے کہ مقتدی پر فاتحہ فرض ہے، لیکن محققین کا خیال یہ ہے کہ جہری نمازوں میں آپ سے وجوب کا قول ثابت نہیں۔ چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ کے خاص الخاص شاگرد امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے کسی مسلمان سے یہ بات نہیں سنی کہ اس نے جہری نماز میں مقتدی کے لئے فاتحہ کو واجب کہا ہو۔ (مغنی ۱:۶۰۲) تاہم حضرات شوافع جہری نمازوں میں بھی مقتدی پر فاتحہ واجب کہتے ہیں۔ اور علامہ نووی رحمہ اللہ نے شرح مہذب (۳:۳۶۳) میں دعوی کیا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ سے جہری نماز میں مقتدی پر فاتحہ کا وجوب ثابت ہے اور آپ کا وہ قول کتاب الام میں موجود ہے۔ علامہ بنوری قدس سرہٗ نے معارف السنن (۳:۱۸۶) میں فرمایا ہے کہ میں نے کتاب الام میں یہ قول نہیں پایا۔

اور چونکہ سورۂ اعراف (آیت ۲۰۴) میں جب نماز میں قرآن پڑھا جائے تو اُسے سننے اور خاموش رہنے کا حکم ہے اس لئے حضرات شوافع نے استماع اور انصات کا امر ترک کرنے سے بچنے کے لئے یہ طریقہ تجویز کیا ہے کہ مقتدی امام کے ساتھ ساتھ نہ پڑھے بلکہ امام کے سکتوں میں یا سکتۂ طویلہ میں پڑھے۔ درانحالیکہ سکتۂ طویلہ کا ثبوت کسی ضعیف حدیث سے بھی نہیں۔ اور شوافع کا بیان کردہ فارمولہ صرف کاغذی ہے عملی دنیا میں سب امام کے ساتھ پڑھتے ہیں جس کی وجہ سے قرآن کی آیت کی مخالفت لازم آتی ہے۔

سرّی نمازوں کا حکم: اور سری نماز میں امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک مقتدی کے لئے فاتحہ پڑھنا مستحب ہے فرض یا واجب نہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک فرض ہے اور آپ کا یہ قول ثابت ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ سے اس سلسلہ میں کوئی صریح قول مروی نہیں۔ اور مشائخ احناف کے اس سلسلہ میں پانچ قول ہیں۔ ایک قول وجوب کا ہے یعنی مقتدی پر سری نماز میں فاتحہ پڑھنا واجب ہے، دوسرا قول ندب یعنی استحباب کا ہے، صاحب ہدایہ نے یہ قول امام محمد رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا ہے، تیسرا قول اباحت کا ہے یعنی فاتحہ پڑھنا جائز ہے، چوتھا قول کراہت تنزیہی کا ہے اور پانچواں قول کراہت تحریمی کا ہے۔ اور یہی قول مفتی بہ ہے۔ اور علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے صاحب ہدایہ کے قول کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ کی کتاب الآثار اور موطا کی عبارتیں اس کے خلاف ہیں۔

علامہ حصکفی رحمہ اللہ (صاحب درمختار) نے فرمایا ہے کہ سری نماز میں بھی مقتدی کے لئے فاتحہ کی کراہت پر ہمارے تینوں ائمہ کا اتفاق ہے۔ مزید تفصیل کے لئے فیض الباری (۲: ۲۷۱) اور درمختار (مطبع زکریا ۲: ۲۶۶) آخر صفۃ الصلاۃ کی مراجعت کیجئے —— اور دلائل کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ مقتدی کو سری نماز میں بھی فاتحہ نہیں پڑھنی چاہئے۔ آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے: مَن کان له إمامٌ فقراءۃُ الإمامِ لَهُ قراءَۃٌ۔ دوسرا ارشاد ہے: إذا قَرَأَ فأنصِتُوا۔ دونوں حدیثوں میں سری اور جہری کے درمیان تفریق کئے بغیر مقتدی کو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور یہ بات بتائی گئی ہے کہ امام کی قراءت مقتدی کے حق میں محسوب ہے پس اس کے لئے قراءت کی کیا حاجت ہے؟ بلکہ اس کے لئے قراءت کرنا لاحاصل ہے —— پہلی حدیث پانچ صحابہ سے مروی ہے۔ تخریج کے لئے نصب الرایہ (۲: ۲ تا ۱۲) دیکھیں اور دوسری حدیث ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی ہے جو مسلم شریف (۱: ۱۷۴ باب التشہد) میں ہے۔

خلاصۂ کلام: یہ ہے کہ جہری نمازوں میں صرف شوافع کے نزدیک مقتدی پر فاتحہ فرض ہے۔ اور سری نمازوں میں صرف امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک فرض ہے۔ اور کسی امام کے نزدیک فرض نہیں۔ یعنی آدھے امام ایک طرف ہیں اور ساڑھے تین امام دوسری طرف!

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ دو مسئلے علحدہ علحدہ ہیں۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ فاتحہ کا نماز سے کیا تعلق ہے؟ نمازی کون ہے اس سے قطع نظر۔ ائمہ ثلاثہ رکنیت وفرضیت کا تعلق تجویز کرتے ہیں اور احناف نے وجوب کا تعلق بیان کیا ہے۔ اور یہ مسئلہ تفصیل سے (۱: ۵۸۴) میں گذر چکا ہے۔ اور چونکہ ائمہ ثلاثہ نے فاتحہ کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اس لئے ضم سورت پر اس کا اثر پڑا ہے اور ان حضرات نے اس کے سنت ہونے کی بات کہی ہے۔ اور احناف نے توازن برقرار رکھا ہے، نفس قراءت کو فرض قرار دیا ہے اور فاتحہ اور سورت دونوں کو علی الخصوص واجب قرار دیا ہے۔

اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فاتحہ کا کس نمازی سے تعلق ہے؟ امام اور منفرد دونوں سے تعلق ہونے کی بات سبھی کہتے ہیں۔ اور مقتدی کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ اس دوسرے مسئلے میں روایات میں غت ربود ہو گیا ہے جو روایات پہلے مسئلہ سے متعلق ہیں ان کا بھی یہاں حوالہ دیا گیا ہے۔ درانحالیکہ ان حدیثوں کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ قائلین وجوب فاتحہ اور مانعین وجوب فاتحہ میں سے ہر فریق کے پاس خاص حدیث صرف ایک ایک ہے۔ اگرچہ عام احادیث جو مقتدی اور غیر مقتدی سب کو شامل ہیں یا جن میں سری اور جہری نمازوں کے درمیان فرق نہیں کیا گیا: ہر فریق کے پاس ہیں۔ مثلاً پیچھے حدیث گذری ہے: لاصلاۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب اس کے عموم میں مقتدی کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بخاری شریف میں اس حدیث سے مقتدی کے لئے فاتحہ کی فرضیت ثابت کی ہے۔ مگر ان کا استدلال صحیح نہیں، کیونکہ یہ حدیث مقتدی کے مسئلہ سے متعلق نہیں بلکہ فاتحہ کا نماز سے جو تعلق ہے اس کو بیان کرتی ہے۔ اسی طرح حدیث من کان له إمام جہری

اور سری دونوں نمازوں کے لئے ہے۔ غرض عام حدیثیں تو دونوں فریق کے پاس کئی ایک ہیں مگر خاص حدیث صرف ایک ایک ہے۔

اور پہلا باب قائلین وجوب فاتحہ کے لئے ہے اور دوسرا باب مانعین وجوب فاتحہ کے لئے۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے ائمہ کا جو گروپ بنایا ہے وہ ٹھیک نہیں۔ کیونکہ فرضیت کے قائل تو صرف شوافع اور امام شافعی رحمہ اللہ ہیں، دوسرا کوئی امام کسی نماز میں فرضیت کا قائل نہیں۔

یہ باتیں ذہن نشیں کر کے دونوں باب پڑھنے چاہئیں۔ اس کے بعد دونوں بابوں پر ایک ساتھ تبصرہ کیا جائے گا۔

حدیث: باب میں جو حدیث ہے وہ حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی ہے اور مختصر ہے۔ پورا واقعہ اس طرح ہے کہ حضرت عبادۃؓ بیت المقدس میں امام تھے۔ ایک روز نماز فجر میں بروقت نہ آسکے۔ تو ان کے مؤذن ابو نُعیم نے نماز شروع کر دی بعد میں حضرت عبادۃ بھی تشریف لائے۔ اتفاق سے وہ محمود بن الربیع کے پاس کھڑے ہوئے۔ یہ صحابی صغیر ہیں یعنی آنحضرت ﷺ کے وصال کے وقت نابالغ تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ حضرت عبادۃ کچھ پڑھ رہے ہیں۔ سلام پھیرتے ہی انھوں نے پوچھا: آپ نماز میں پڑھ رہے تھے جبکہ ابو نعیم جہراً تلاوت کر رہے تھے؟ حضرت عبادۃ نے جواب دیا: جی ہاں! پھر انھوں نے یہ حدیث سنائی کہ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ نے فجر کی نماز پڑھائی۔ جس میں آپؐ کے لئے قراءت دشوار ہوگئی۔ یعنی آپؐ کا ارادہ پڑھنے کا تھا مگر دل ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ نماز کے بعد آپؐ نے مقتدیوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: میرا خیال ہے کہ آپ لوگ امام کے پیچھے پڑھتے ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: جی ہاں ہم پڑھتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''ایسا نہ کرو، مگر سورۂ فاتحہ مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ اسے پڑھے بغیر نماز نہیں'' ——— یہ حدیث تفصیل سے ابوداؤد (مصری ۱: ۱۲۷ باب من ترك القراءة) میں ہے۔

تشریح: مذکورہ حدیث کی شرح میں چند باتیں جان لینی ضروری ہیں:

پہلی بات: یہ حدیث مضطرب ہے سنداً بھی اور متناً بھی۔ سند میں آٹھ اور متن میں پندرہ اقوال ہیں۔ یعنی یہ حدیث موصول ہے یا منقطع؟ اور اس حدیث کو حضرت عبادۃ سے محمود بن الربیع نے روایت کیا ہے یا نافع نے یا ابو نعیم نے؟ پھر یہ حدیث مرفوع ہے یا موقوف؟ یعنی مذکورہ واقعہ آنحضرت ﷺ کا ہے یا حضرت عبادۃ کا یا عبداللہ بن عمرو کا؟ نیز اس حدیث کا صحیح متن کیا ہے؟ رواۃ کے درمیان ان باتوں میں سخت اختلاف ہے اور محدثین اس اضطراب کا حل تلاش نہیں کر سکے۔ پس یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح تو بہر حال نہیں۔ خود امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو صرف حسن کہا ہے۔ اس لئے اس حدیث سے مقتدی پر فاتحہ کی فرضیت ثابت کرنا تو خود شوافع کے اصول کے خلاف ہے۔ کیونکہ فرضیت ثابت کرنے کے لئے ان کے نزدیک بھی کم از کم حدیث کا اعلیٰ درجہ کا ہونا شرط ہے۔ تفصیل معارف السنن (۳: ۲۰۳) میں ہے۔

دوسری بات: آنحضور ﷺ کے دریافت کرنے کا جو انداز ہے وہ صریح ہے کہ صحابہ امام کے پیچھے جہراً یا پھس

چپس نہیں پڑھتے تھے ورنہ آپ یہ دریافت کرتے کہ: ''میرے پیچھے کون پڑھ رہا تھا؟'' اب غور یہ کرنا ہے کہ جب امام کے پیچھے نہ تو جہراً پڑھا گیا اور نہ قریب من الجہر تو پھر آپ کے لئے پڑھنا دشوار کیوں ہوا؟ اس کا جواب یہی ہے کہ پیچھے ایک امر منکر ہو رہا ہے خواہ وہ کسی بھی درجہ کا منکر ہو اس کا قلب نبوت پر اثر پڑا جس سے آپ کے لئے تلاوت دشوار ہوگئی —— حضرت الاستاذ علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی رحمہ اللہ نے اس جگہ اپنا یہ واقعہ سنایا تھا کہ وہ روزانہ عشاء کے بعد اپنے استاذ شیخ الہند قدس سرہ کے سر میں تیل رکھنے کے لئے جاتے تھے۔ کبھی حضرت دیر تک تیل رکھواتے اور کبھی یہ کہہ کر کہ آج جی نہیں چاہ رہا جلدی سر چھڑا لیتے۔ علامہ فرماتے ہیں: میں نے غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ جس دن میں باوضو تیل لگانے جاتا ہوں حضرت دیر تک لگواتے ہیں اور جب میں بے وضو جاتا ہوں تو حضرت جلدی سر چھڑا لیتے ہیں۔ اس کے بعد میں ہمیشہ باوضو تیل رکھنے کے لئے جانے لگا۔ جب ایک امتی کا یہ حال ہے تو قلب نبوت جو مجلی و مصفی تھا اس پر پیچھے ہونے والے امر منکر کا اثر کیسے نہیں پڑے گا؟ ضرور پڑے گا اور اسی کی وجہ سے پڑھنا دشوار ہو گیا تھا۔

علاوہ ازیں سلام پھیرتے ہی صحابی صغیر محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ کا امام کے پیچھے پڑھنے کے سلسلہ میں دریافت کرنا دلالت کرتا ہے کہ حضرت عبادۃ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل انوکھا تھا۔ اگر امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی ضروری تھی تو آخر حضرت عبادۃ نے اپنے مقتدیوں کو یہ مسئلہ کیوں نہیں بتایا؟ اس اعتراض کا کوئی معقول جواب دینا ممکن نہیں۔

تیسری بات: حدیث میں لا تفعلوا فعل نہی ہے۔ اور نہی مطلق حرمت کے لئے ہوتی ہے جس طرح امر مطلق وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ پس مطلق قراءت کی نفی ہوگئی، پھر فاتحہ کا استثناء ہے۔ اور نہی سے استثناء اباحت کے لئے ہوتا ہے۔ جیسے کہا جائے کہ اس جگہ کوئی نہ بیٹھے مگر ترجمان مستثنیٰ ہے، تو ترجمان کے لئے اس جگہ بیٹھنے کا صرف جواز ثابت ہوگا وجوب ثابت نہیں ہوگا۔ پس اس حدیث سے فاتحہ کا صرف جواز ثابت ہو سکتا ہے وجوب و فرضیت ثابت نہیں ہو سکتی۔

آخری بات: حدیث شریف کا جو آخری ٹکڑا ہے: فإنه لا صلاة لمن لم يقرأ بها یہ اس حدیث کا جزء نہیں ہے، بلکہ وہ حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری مستقل حدیث ہے جس کو حضرت عبادۃ نے یا کسی نے اس حدیث کے ساتھ جوڑ دیا ہے اور وہ حدیث صحاح ستہ میں ہے اور پیچھے (۱:۵۸۶) گذر چکی ہے۔ اس حدیث کے راوی ابن شہاب زہری ہیں جس کو وہ محمود بن الربیع ہی سے روایت کرتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابن شہاب زُہری نے محمود بن الربیع سے، انھوں نے حضرت عبادۃؓ سے جو حدیث لاصلاة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب روایت کی ہے وہ اصح ہے۔ یعنی ابن شہاب زہری نے صرف آخری ٹکڑا مستقل حدیث کی شکل میں روایت کیا ہے اور وہی اصح ہے یعنی وہ ٹکڑا اس حدیث کا جز نہیں اور اس ٹکڑے کے اس حدیث کا جز نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر اس کو اس حدیث کا جز تسلیم کیا جائے تو کلام نبوت کے اول و آخر میں تعارض ہو جائے گا۔ کیونکہ إلا بأم القرآن سے فاتحہ کی اباحت ثابت ہوتی ہے اور لاصلاة سے وجوب ثابت ہوتا ہے اور دونوں باتوں میں تعارض

ظاہر ہے اور کلام نبوت تعارض سے پاک ہوتا ہے۔

[۱۱۸] باب ماجاء فی القراءة خلف الإمام

[۳۲۰-] حدثنا هَنَّادٌ، نا عَبْدَةُ بنُ سُلَيْمَانَ، عن مُحمدِ بنِ إسحاق، عن مَكحولٍ، عن مَحمودِ بنِ الرَّبِيْعِ، عن عُبَادَةَ بنِ الصَّامِتِ، قال: صَلّى رسولُ اللّهِ صلى الله عليه وسلم الصُّبْحَ، فَثَقُلَتْ عَلَيْهِ القِرَاءَةُ، فَلَمَّا انْصَرَفَ قال: "إِنِّي أَرَاكُمْ تَقْرَءُوْنَ وَرَاءَ إِمَامِكُمْ؟" قال: قُلْنَا: يَارسولَ اللّهِ! إِيْ وَاللّهِ! قال: "لاتَفْعَلُوْا إِلاَّ بِأُمِّ الْقُرْآنِ، فَإِنَّهُ لاَصَلاَةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِهَا"

قال: وفي الباب عن أبي هريرةَ، وعائشةَ، وأنسٍ، وأبي قتادةَ، وعبدِ اللّهِ بنِ عَمْرٍو.

قال أبو عيسى: حديثُ عُبادةَ حديثٌ حسنٌ؛ ورَوَى هذا الحديثَ الزُّهرِيُّ، عن مَحمودِ بنِ الرَّبِيْعِ، عن عُبَادَةَ بنِ الصَّامِتِ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: "لاَصَلاَةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ" وهذَا أَصَحُّ.

والعَمَلُ عَلَى هذا الحديث في القِرَاءَةِ خَلْفَ الإمَامِ عند أَكْثَرِ أهلِ العلمِ مِنْ أَصْحَابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم والتابعينَ، وهو قولُ مالكِ بنِ أنسٍ، وابنِ المباركِ، والشافعيِّ، وأحمدَ، وإسحاقَ: يَرَوْنَ القِرَاءَةَ خَلْفَ الإِمَامِ.

وضاحت: امام ترمذی رحمہ اللہ نے وفی الباب میں جن احادیث کا حوالہ دیا ہے ان میں سے اکثر کا قراءت خلف الامام کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ وہ احادیثِ خداج ہیں۔ یعنی ان میں فاتحہ نہ پڑھنے کی صورت میں نماز کے ناقص ہونے کا بیان ہے۔ یعنی ان احادیث کا تعلق اس مسئلہ سے ہے جو اکتالیس ابواب پہلے گذرا ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث اگلے باب میں آرہی ہے اور حضرت عائشہ اور عبداللہ بن عمرو کی حدیثیں ابن ماجہ میں ہیں۔ یہ تینوں احادیثِ خداج ہیں۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث متصل ہونے میں اور مرسل ہونے میں مضطرب ہے اور بیہقی رحمہ اللہ نے سنن کبری میں حدیث مرسل کو اصح کہا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں امام کے پیچھے دل میں یعنی تصور میں پڑھنے کا ذکر ہے۔ اور حدیث ابوقتادہ مسند احمد وغیرہ میں ہے اور اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے۔ علاوہ ازیں وہ حدیثِ عبادۃ کے مانند ہے یعنی اس سے بھی فاتحہ کی اباحت ثابت ہوتی ہے کیونکہ نہی سے استثناء اباحت کے لئے ہوتا ہے ——— اور امام ترمذی رحمہ اللہ کا یہ دعوی کہ اکثر صحابہ امام کے پیچھے قراءت کے قائل ہیں محض دعوی ہے جو واقعہ کے خلاف ہے۔ شامی رحمہ اللہ نے خزائن اور کافی کے حوالہ سے یہ بات لکھی ہے کہ اسّی اکابر صحابہ سے قراءت خلف الامام کی ممانعت وارد ہوئی ہے بلکہ متعدد صحابہ سے امام کے پیچھے پڑھنے کی صورت میں نماز کا

فاسد ہونا مروی ہے (شامی ۲:۲۶۶ باب صفۃ الصلاۃ) ـــــــ اور امام ترمذی رحمہ اللہ کا امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کو قائلینِ وجوبِ فاتحہ کی فہرست میں شمار کرنا بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ حضرات نہ صرف یہ کہ وجوب کے قائل نہیں بلکہ قراءت خلف الامام کو مکروہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ اور ابن المبارک کا قول اگلے باب میں آرہا ہے کہ اگرچہ میں خود امام کے پیچھے پڑھتا ہوں لیکن جو نہ پڑھے اس کی بھی نماز کو درست قرار دیتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ ابن المبارک بھی فاتحہ کی فرضیت کے قائل نہیں تھے۔ صرف امام شافعی رحمہ اللہ فاتحہ کو فرض کہتے ہیں اور محققین کا خیال یہ ہے کہ یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ سے ثابت نہیں، بلکہ شوافع کا قول ہے پس اس باب میں تنہا شوافع رہ گئے باقی چاروں ائمہ اور صحابہ کا مانعینِ وجوبِ فاتحہ کی فہرست میں شمار ہے۔

بابُ مَاجَاءَ فِيْ تَرْكِ الْقِرَاءَةِ خَلْفَ الإِمَامِ إِذَا جَهَرَ بِالْقِرَاءَةِ

جہری نمازوں میں مقتدی کے لئے قراءت کی ممانعت

حدیث: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک ایسی نماز سے سلام پھیرنے کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے جس میں آپؐ نے تلاوت جہراً فرمائی تھی (ابوداؤد میں یہ حدیث ہے اس میں راوی کہتا ہے: ''میرا گمان یہ ہے کہ وہ فجر کی نماز تھی'' اور لفظ انصرَف بھی اس کا قرینہ ہے۔ کیونکہ آپؐ مغرب وعشاء میں لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر نہیں بیٹھا کرتے تھے) اور دریافت کیا: ''کیا آپ لوگوں میں سے کسی نے میرے ساتھ پڑھا؟'' ایک شخص نے عرض کیا: جی ہاں اے اللہ کے رسول! میں نے پڑھا (اوپر حضرت عبادۃ کی جو حدیث گذری ہے اس میں بہت سے حضرات بولے تھے اور قسم کھا کر انھوں نے اپنا پڑھنا بیان کیا تھا۔ اور یہاں پڑھنے والا صرف ایک شخص ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ حدیث بعد کی ہے اور حضرت عبادۃ کی حدیث میں جو واقعہ مذکور ہے وہ پہلے کا ہے) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: بیشک میں سوچ رہا تھا: (آخر) کیا بات ہے کہ میں قرآن میں جھگڑا کیا جارہا ہوں (القرآن مفعول ثانی ہے۔ اور فاعل اور مفعول اول محذوف ہیں اور وہ قلب نبوت اور حضور اکرم ﷺ ہیں۔ اور امام کے پیچھے پڑھنا امر منکر ہے جو آنحضور ﷺ کے قلب مُجلّٰی ومُصَفّٰی پر اثر انداز ہوا ہے۔ بایں وجہ آپؐ کے دل ودماغ میں مناسبت باقی نہ رہی یعنی دماغ پڑھنا چاہتا تھا مگر دل ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تھا) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پس صحابہ نبی ﷺ کے ساتھ ان نمازوں میں پڑھنے سے رک گئے جن میں آپؐ جہراً تلاوت فرماتے تھے جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا ـــــــ امام بخاری رحمہ اللہ نے جزء القراءۃ میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد آخر میں یہ اضافہ کیا ہے کہ صحابہ حضور اکرم ﷺ کے پیچھے سری نمازوں میں دل میں پڑھتے رہے۔

تشریح: امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا: ابن شہاب زہری کے بعض تلامذہ قال: فانتهى الناس میں قال کا فاعل زُہری

کو بتاتے ہیں۔ یعنی ابن شہاب زہری نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد صحابہ حضور ﷺ کے پیچھے پڑھنے سے رک گئے۔ پس حدیث کا یہ آخری ٹکڑا ابن شہاب زہری کی مرسل روایت ہے۔ اور زہری کی مرسل روایتیں بالاتفاق ضعیف ہوتی ہیں۔

مگر صحیح بات یہ ہے کہ قال کا فاعل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے زُہری کی مرسل روایت نہیں ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ عبداللہ بن السرح کی حدیث میں اس کی صراحت ہے۔ ان کا بیان ہے کہ معمر نے ابن شہاب زہری کے واسطہ سے یہ بات ذکر کی کہ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا: اس واقعہ کے بعد صحابہ نے حضور اکرم ﷺ کے پیچھے پڑھنا ترک کر دیا۔ یہ حدیث ابوداؤد (مصری ۱:۲۱۹ باب من کرہ القراء ۃ) میں ہے اور اعلیٰ درجہ کی صحیح حدیث ہے۔

اور جن لوگوں نے اس آخری ٹکڑے کو ابن شہاب زہری کا قول بتایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن شہاب کے سبق میں لوگ کثرت سے حاضر ہوتے تھے۔ اور معمر: ابن شہاب کے لاؤڈ اسپیکر تھے۔ یعنی وہ ابن شہاب سے سن کر حدیث پکار کر کہتے تھے، مکبر کے پکار کر تکبیر کہنے کی طرح۔ اور طالب علم لکھتے تھے۔ پھر بعد میں جب کسی طالب علم کو کسی جگہ پر شک ہوتا تو وہ معمر سے پوچھتا کہ استاذ نے فلاں جگہ کیا کہا تھا تو معمر جواب دیتے: قال الزهری کذا پس یہ بھی اسی قسم کا جملہ ہے ——— باب کی حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے مگر ہمارے نسخوں میں کسی کی کارستانی سے لفظ صحیح اڑ گیا ہے۔ مصری نسخہ میں حسنٌ صحیحٌ موجود ہے۔ اور مصری نسخہ سے میری مراد ابن العربی کی ترمذی کی شرح عارضۃ الاحوذی کا متن ہے۔

[۱۱۹] باب ماجاء فی ترك القراء ۃ خلف الإمام إذا جهر بالقراء ۃ

[۳۲۱-] حدثنا الأنصاریُّ، نا مَعْنٌ، نا مالكٌ، عن ابنِ شِهابٍ، عن ابنِ أُكَيْمَةَ اللَّيْثِيِّ، عن أبی هريرةَ: أنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم انْصَرَفَ مِن صَلَاةٍ جَهَرَ فِيْهَا بِالْقِرَاءَ ةِ، فَقَالَ: " هَلْ قَرَأَ مَعِي أَحَدٌ مِنْكُمْ آنِفًا؟" فقال رجلٌ: نعم يارسولَ اللهِ! قال: " إِنِّي أَقُوْلُ مَالِيْ أُنَازَعُ الْقُرآنَ؟" قال: فَانْتَهَى الناسُ عن الْقِرَاءَ ةِ مَعَ رسولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم فِيْمَا يَجْهَرُ فِيْهِ رسولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم مِنَ الصَّلَوَاتِ بِالْقِرَاءَ ةِ، حِيْنَ سَمِعُوْا ذٰلِكَ مِن رَسولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم.

وفی الباب: عن ابنِ مَسعودٍ، وعمرانَ بنِ حُصَينٍ، وجابرِ بنِ عبدِ اللّٰهِ. قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ. وابنُ أُكَيْمَةَ اللَّيْثِيُّ: اسْمُهُ عُمَارَةُ، ويُقَالُ: عَمْرُو بنُ أُكَيْمَةَ.

ورَوَى بعضُ أصحابِ الزُّهْرِيِّ هذا الحديثَ، وذَكَرُوْا هذا الحَرْفَ، قال: قال الزُّهْرِيُّ: فَانْتَهَى النَّاسُ عن الْقِرَاءَ ةِ حِيْنَ سَمِعُوْا ذٰلِكَ مِن رسولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم.

وضاحت: ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث طحاوی میں اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث مسلم میں ہے

اور دونوں کا مضمون تقریباً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی طرح ہے۔ یعنی دونوں میں یہ بات ہے کہ پیچھے کسی مقتدی کے پڑھنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ پر تلاوت دشوار ہوگئی۔ اور حضرت عمران کی حدیث میں ظہر یا عصر کا واقعہ ہونے کی بھی صراحت ہے۔ اور حضرت جابر کی حدیث موطا محمد (ص:۹۸) میں علی شرط الشیخین ہے اس کے الفاظ ہیں: من صلّٰی خلف الإمام فإن قراء ۃَ الإمامِ له قراء ۃٌ: یعنی امام کی قراءت مقتدی کے حق میں محسوب ہے۔ اور فاتحہ بھی قراءت ہے پس امام کا فاتحہ مقتدی کے حق میں محسوب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد پانچ صحابہ روایت کرتے ہیں۔ حدیث کی تخریج کے لئے نصب الرایہ (۲:۶ تا ۱۲) دیکھیں۔ اس باب میں اور بھی روایتیں ہیں مثلاً حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث: إذا قَرأ فأنصِتُوا مسلم شریف (۱:۱۷۴ باب التشهد) میں ہے اور اسی مضمون کی حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور امام مسلم نے اگرچہ ابو خالد احمر میں بعض حضرات کے کلام کرنے کی وجہ سے اپنی صحیح میں اس کی تخریج نہیں کی مگر انھوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ نے بھی دونوں حدیثوں کی تصحیح کی ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ابوداؤد میں ہے۔ غرض یہ تمام حدیثیں عام ہیں جہری کی تخصیص کے ساتھ صرف حضرت ابو ہریرہ کی حدیث ہے۔

❁ ❁ ❁

اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث سے قائلین فاتحہ کے مذہب پر نقض وارد نہیں ہوتا کیونکہ ابو ہریرہؓ ہی کی دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں۔ کسی طالب علم نے پوچھا: جب میں مقتدی ہوں تو کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اس وقت فاتحہ سراً پڑھ'' اس حدیث میں اور اوپر جو حدیث گذری ہے اس میں تعارض ہے۔ اور اس کا حل صرف یہ ہے کہ اوپر کی روایت میں غیر فاتحہ مراد لیا جائے۔ یعنی آنحضرت ﷺ کا مذکورہ ارشاد سن کر صحابہ غیر فاتحہ پڑھنے سے رک گئے اور فاتحہ پڑھتے رہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ ابو ہریرہؓ نے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کے لئے فرمایا ہے۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذریعہ مدینہ میں اعلان کروایا ہے کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اگر مقتدی مستثنیٰ ہوتا تو مبہم اعلان کیسے کیا جاتا؟ مقتدی کا استثناء کرنا ضروری تھا کیونکہ بیشتر مسلمان باجماعت نماز پڑھتے تھے (امام ترمذی کی بات پوری ہوئی)

گذارش: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں لفظ خِداج کے جو معنی سمجھے گئے ہیں کہ نماز نہیں ہوئی اس معنی سے اتفاق نہیں، کیونکہ عورت یا جانور اگر مدتِ حمل پوری ہونے سے پہلے بچہ جن دے اور بچہ تام الخلق ہو تو مجرد سے خَدَجَتِ النَّاقَةُ اور خَدَجَتِ الْمَرْأةُ کہتے ہیں یعنی اونٹنی نے قبل از وقت بچہ جنا اور عورت نے مدتِ حمل پوری ہونے سے پہلے بچہ جنا۔ اور اگر بچہ ناقص الخلق ہو خواہ مدتِ حمل پوری ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو تو پھر یہ لفظ باب افعال سے

استعمال کیا جاتا ہے کہتے ہیں: أَخدَجَتِ الناقةُ: اونٹنی نے ناتمام بچہ جنا۔ بہرصورت اس لفظ کے مفہوم میں ناتمامیت کے معنی ہیں۔ پس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز اگرچہ ہوگئی مگر کامل نہیں ہوئی، ناقص ہوئی۔ اور اسی حدیث کی وجہ سے احناف نے فاتحہ کی فرضیت کی نفی کی ہے اور اس کے واجب ہونے کی بات کہی ہے۔ اور بعد میں جو لفظ غیر تمام آیا ہے وہ خداج کی تفسیر ہے۔ خواہ یہ حضور ﷺ کا ارشاد ہو جیسا کہ احناف کہتے ہیں، یا بعد میں کسی راوی نے بڑھایا ہو جیسا کہ ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں، بہرصورت اس نے خداج کے معنی کی تعیین کی ہے۔ غرض یہ حدیث گذشتہ مسئلہ سے متعلق ہے کہ نماز میں فاتحہ واجب ہے فرض نہیں۔ قراءت خلف الامام کے مسئلہ سے اس حدیث کا کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح اقرأ بها فی نفسك کا جو ترجمہ کیا گیا ہے کہ ''سراً پڑھ'' یہ بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ قرأ فی نفسه اور قال فی نفسه ایک محاورہ ہے اور اس کے معنی ہیں: دل ودماغ میں پڑھنا اور سوچنا اور یہ سر کے ادنی درجہ سے بھی نیچے کا درجہ ہے۔ جہر کا ادنی درجہ یہ ہے کہ دائیں بائیں موجود لوگ سن لیں۔ اور جہر کے اعلی درجہ کی کوئی حد نہیں ﴿إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ اور سر کا اعلی درجہ ہے إسماع نفسه اپنے آپ کو سنانا۔ اور سر کا ادنی درجہ ہے تصحیح حروف یعنی زبان حرکت کرے، مخارج پر جا کر لگے اور حروف کی ادائیگی ہو۔ اور اس سے نیچے قراءت نفسی ہے۔ یعنی ہونٹ ساکن ہوں، زبان اپنی جگہ ٹھہری ہوئی ہو اور دل ودماغ میں پڑھ رہا ہو تو یہ قراءت نفسی ہے جس کو سوچنا اور تصور میں پڑھنا کہتے ہیں۔ اور فاتحہ کو سوچنے کے لئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس لئے فرمایا ہے کہ دماغ نہ بھٹکے اور آدمی نماز میں مشغول رہے۔ علاوہ ازیں حضرت ابو ہریرہؓ جہری نماز میں امام کے پیچھے پڑھنے کو ناجائز کہتے تھے جیسا کہ علامہ بیہقی نے اپنی تصنیف کتاب القراءۃ میں حضرت عائشہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کا یہی مذہب بیان کیا ہے، پھر انھوں نے جہری نماز میں امام کے پیچھے سراً پڑھنے کے لئے فرمایا ہو یہ بات کیسے ممکن ہے؟ (معارف السنن ۳: ۲۳۹)

اور دوسری دلیل کے جواب میں یہ عرض ہے کہ حضرت ابو ہریرہ کے مدینہ میں اعلان کے بارے میں جو حدیث ذکر کی گئی ہے اس میں فَمَا زَادَ بھی ہے۔ اور امام بخاریؒ کے جزء القراءۃ میں اس حدیث کے آخر میں وما زاد ہے اور مقتدی کے لئے فاتحہ کے ساتھ سورت پڑھنے کے ائمہ ثلاثہ بھی قائل نہیں۔ غرض دلائل عقل سے مقتدی کا استثناء خود بخود ہو جاتا ہے (ابوداؤد مصری ۱: ۲۱۶ باب من ترك القراءة) غرض یہ حدیث امام اور منفرد کے لئے ہے، مقتدی اس سے مستثنیٰ ہے۔

وَلَيْسَ فِي هٰذا الحديثِ مَا يَدْخُلُ عَلَى مَنْ رَأَى القِرَاءَ ةَ خَلْفَ الإِمَامِ، لِأَنَّ أَبَا هُرَيرةَ هُوَ الَّذِىْ رَوَى عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم هٰذا الحديثَ.

[۳۲۲-] وروَى أبو هريرةَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أنّه قال: مَن صَلّٰى صَلَاةً لم يَقرَأْ فِيهَا

بِأُمِّ القُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ غَيْرُ تَمَامٍ، فَقَالَ لَهُ حَامِلُ الحَدِيْثِ: إِنِّيْ أَكُوْنُ أَحْيَانًا وَرَاءَ الإِمَامِ؟ قال: اِقْرَأْ بِهَا فِيْ نَفْسِكَ.

[۳۲۳-] ورَوَى أبو عُثمانَ النَهْدِيُّ، عن أبي هريرةَ، قال: أَمَرَنِي النبيُّ صلى الله عليه وسلم أن أُنَادِيَ أن لَاصَلَاةَ إِلَّا بِقِرَاءَ ةِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ.

ترجمہ: اوراس حدیث سے ان حضرات کے قول کا فساد لازم نہیں آتا جو امام کے پیچھے پڑھنے کے قائل ہیں (دَخَلَ یدخُل دَخَلاً مصدر سے فعل مضارع ہے دُخولاً سے نہیں ہے) اس لئے کہ ابو ہریرہؓ جو اس حدیث کے راوی ہیں وہ رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث بھی روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''جس نے کوئی نماز پڑھی اور اس میں فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز نہیں ہوئی'' ان سے کسی طالب علم نے پوچھا: بیشک میں کبھی امام کے پیچھے ہوتا ہوں (پس کیا حکم ہے؟) تو انھوں نے فرمایا: ''فاتحہ سراً پڑھو'' اور ابو عثمان نہدی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ جو شخص فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں۔

❁ ❁ ❁

اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے مذاہب بیان کئے ہیں۔ اور جن حضرات کا تذکرہ قائلین فاتحہ کے باب میں کیا تھا مانعین فاتحہ کے باب میں بھی انہی کا ذکر کیا ہے۔ درانحالیکہ اس باب میں ان حضرات کا تذکرہ کرنا چاہئے جو قراءت خلف الامام کے قائل نہیں ہیں۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ یہاں جن ائمہ کا تذکرہ کیا ہے وہ مانعین وجوب فاتحہ میں سے ہیں ان کا شمار قائلین کی فہرست میں کرنا ہی صحیح نہیں۔

الغرض امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ حجازی مکتب فکر کے محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ جہری نماز میں مقتدی کے لئے امام کے ساتھ پڑھنا جائز نہیں البتہ اس کے لئے فاتحہ پڑھنی ضروری ہے اور وہ فاتحہ امام کے سکتوں میں پڑھے یعنی جب امام کوئی آیت پوری کر کے سانس لے تو مقتدی جلدی سے ایک آیت پڑھ لے۔ پھر دوسرے سکتہ میں دوسری آیت پڑھے اور تیسرے میں تیسری۔ آخر تک اسی طرح پڑھے۔ امام کے ساتھ ساتھ نہ پڑھے تاکہ استماع اور انصات کا حکم ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ امام مالک، ابن المبارک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ نے یہی بات کہی ہے۔

مگر صحیح بات یہ ہے کہ ان حضرات کا یہ مذہب نہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک تو جہری نماز میں مطلقاً فاتحہ پڑھنا مکروہ ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک فاتحہ پڑھنا ضروری نہیں ہاں سکتاتِ امام میں پڑھ سکتا ہے یعنی مباح ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ثابت نہیں۔ تفصیل پہلے گذر چکی۔

اور ابن المبارکؒ نے فرمایا: میں امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتا ہوں اور لوگ بھی پڑھتے ہیں مگر کوفہ کے کچھ لوگ نہیں پڑھتے اور میں ان کی نماز کو بھی درست قرار دیتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ ابن المبارکؒ بھی فاتحہ کی فرضیت کے قائل نہیں تھے۔

پھر امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ پر تنقید کی ہے۔ فرماتے ہیں: بعض اہل علم نے اس مسئلہ میں سختی کی ہے، وہ ہر حال میں فاتحہ کو فرض کہتے ہیں، خواہ آدمی امام کے پیچھے ہی نماز کیوں نہ پڑھ رہا ہو۔ اور انھوں نے حضرت عبادۃ کی حدیث عام: لاصلاۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب سے استدلال کیا ہے۔ اس طرح کہ اس کے عموم میں مقتدی کو بھی شامل کیا ہے اور حدیث کو سری اور جہری تمام نمازوں کے لئے عام رکھا ہے۔ پس ہر نماز میں ہر شخص پر فاتحہ فرض ہے۔ اور انھوں نے عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ کو جو پہلے باب میں گذرا ہے اس کے لئے قرینہ بنایا ہے اس طرح کہ حدیث عام کے راوی کا عمل بحالتِ اقتداء فاتحہ پڑھنے کا تھا، پس معلوم ہوا کہ اس کے عموم میں مقتدی بھی شامل ہے اور جہری نماز بھی۔

مگر امام احمد رحمہ اللہ اس حدیث کے عموم میں مقتدی کو شامل نہیں کرتے اور اس پر فاتحہ کو فرض قرار نہیں دیتے اس لئے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مقتدی کا استثناء کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: جس شخص نے کوئی نماز پڑھی اور اس میں فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز نہیں ہوئی، مگر وہ شخص جو امام کے پیچھے پڑھ رہا ہے وہ مستثنیٰ ہے یعنی فاتحہ پڑھے بغیر بھی اس کی نماز ہو جائے گی۔ اور صحابی کا فہم واجتہاد امت کے مجتہدین کے فہم سے بالاتر ہے۔

فائدہ: اہل السنہ والجماعۃ بالاتفاق قرآن، حدیث اور اجماع امت کو حجت تسلیم کرتے ہیں۔ مگر آثار صحابہ کے بارے میں امام شافعیؒ نے اختلاف کیا ہے وہ فرماتے ہیں: ھم رجالٌ ونحن رجالٌ یعنی ان کا شمار بھی امت کے مجتہدین میں ہے اور ہم بھی امت کے مجتہد ہیں اور ایک مجتہد پر دوسرے مجتہد کی پیروی لازم نہیں۔ اس لئے آثار صحابہ یعنی صحابہ کا فہم واجتہاد حجت نہیں۔ صحابی کے اجتہاد کی موجودگی میں بھی دوسرے اجتہاد کی گنجائش ہے، مگر دیگر ائمہ آثار صحابہ کو بھی حجت مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صحابی کا فہم دیگر مجتہدین کے فہم سے برتر ہے۔ بلکہ احناف تو یہاں تک کہتے ہیں کہ صحابی کے اثر کی موجودگی میں دوسرا اجتہاد کرنا جائز ہی نہیں۔ اسی پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اور اگر کسی مسئلہ میں صحابہ کی متعدد رائیں ہوں تو غور وفکر کر کے ان میں سے کسی ایک کو اپنانا ضروری ہے، نیا اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں۔ اور قیاس کو بھی چاروں ائمہ نے حجت تسلیم کیا ہے مگر قیاس مُثبتِ حکم نہیں بلکہ مُظہرِ حکم ہے اس لئے چاروں مذاہب کے مقلدین کا نام اہل السنہ والجماعۃ ہے۔ یعنی وہ لوگ جو قرآن کریم کے بعد سنت اور اجماع امت کو بھی حجت مانتے ہیں۔ اور آثار کو اس لئے شامل نہیں کیا کہ ان میں اختلاف ہے۔ اور قیاس صرف مظہر ہے مثبت نہیں۔ اس لئے اس کو بھی شامل نہیں کیا۔

واختارَ أَصْحابُ الْحَدِیْثِ أن لاَ یَقرأَ الرجلُ إِذَا جَھَرَ الإِمَامُ بِالْقِراءَ ۃِ، وقالُوا: یَتَّبِعُ سَکَتَاتِ الإِمَامِ.
وقد اخْتَلَفَ أھلُ العلمِ فی القِرَاءَ ۃِ خَلْفَ الإِمَامِ: فَرَأَی أَکْثَرُ أھلِ العلمِ من أصحابِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم والتابعینَ ومَن بَعدَھُمُ القِراءَ ۃَ خَلْفَ الإِمَامِ، وبہ یقولُ مالكٌ، وابنُ المبارَكِ، والشافعیُّ، وأحمدُ، وإسحاقُ.

وَرُوِيَ عن عبدِ اللهِ بن المباركِ أَنَّهُ قَالَ: أَنَا أَقْرَأُ خَلْفَ الإِمَامِ، وَالنَّاسُ يَقْرَءُوْنَ إِلَّا قَوْمٌ مِنَ الكُوْفِيِّيْنَ، وَرَأَى أَنَّ مَنْ لَمْ يَقْرَأْ صَلَاتُهُ جَائِزَةٌ.

وَشَدَّدَ قَوْمٌ من أهلِ العلمِ في تَرْكِ قِرَاءَةِ فاتحةِ الكتابِ، وإن كان خَلْفَ الإمامِ، قالوا: لَاتُجْزِئُ صلاةٌ إِلَّا بِقِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الكتابِ، وَحْدَهُ كَانَ أَوْ خَلْفَ الإِمَامِ؛ وذَهَبُوْا إِلَى مَارَوَى عُبَادَةُ بن الصَّامِتِ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم؛ وقَرَأَ عُبَادَةُ بنُ الصَّامِتِ بَعْدَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم خَلْفَ الإِمَامِ، وتَأَوَّلَ قَوْلَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: " لَاصَلَاةَ إِلَّا بِقِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ "؛ وبه يقولُ الشافعيُّ، وإسحاقُ، وغَيْرُهُمَا.

وأما أحمدُ بنُ حَنْبَلٍ فقال: مَعْنَى قولِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: "لَاصَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الكتابِ" إِذَا كَانَ وَحْدَهُ؛ وَاحتجَّ بِحديثِ جابرِ بنِ عبدِ اللهِ حَيْثُ قَالَ: مَنْ صَلَّى رَكْعَةً لَمْ يَقْرَأْ فِيْهَا بِأُمِّ القُرآنِ فَلَم يُصَلِّ إِلَّا أن يَكُوْنَ وَرَاءَ الإِمَامِ؛ قال أحمدُ: فَهٰذا رَجُلٌ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم تَأَوَّلَ قَوْلَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: " لَاصَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ": أَنَّ هٰذا إِذَا كَانَ وَحْدَهُ.

وَاخْتَارَ أحمدُ مَعَ هٰذا القِرَاءَةَ خَلْفَ الإِمَامِ، وأَنْ لَا يَتْرُكَ الرجلُ فاتحةَ الكتاب، وإِنْ كَانَ خَلْفَ الإِمَامِ.

[۳۲۴-] حدثنا إسحاقُ بنُ مُوسَى الأَنْصَارِيُّ، نا معنٌ، نا مالكٌ، عن أبي نُعَيْمٍ وهبِ بنِ كَيْسَانَ، أَنَّهُ سَمِعَ جَابِرَ بنَ عبدِ اللهِ، يقولُ: من صَلَّى رَكْعَةً لَمْ يَقْرَأْ فِيْهَا بِأُمِّ القُرآنِ فَلَمْ يُصَلِّ إِلَّا أن يَكونَ وَرَاءَ الإِمَامِ؛ هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: اور اصحابِ حدیث یعنی حجازی مکتبِ فکر کے محدثین نے یہ بات پسند کی ہے کہ آدمی فاتحہ نہ پڑھے جبکہ امام جہراً تلاوت کررہا ہو، اور انھوں نے کہا کہ وہ امام کے سکتوں کی پیروی کرے۔ اور علماء کا امام کے پیچھے قراءت کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ صحابہ وتابعین اور بعد کے اکثر علماء کی رائے امام کے پیچھے پڑھنے کی ہے اور اس کے مالک، ابن المبارک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ قائل ہیں (امام ترمذی رحمہ اللہ کی یہ بات خلاف واقعہ ہے اس لئے کہ اسی اکابر صحابہ سے امام کے پیچھے نہ پڑھنا مروی ہے۔ اور ائمہ اربعہ میں سے اکثر حضرات کی بھی یہی رائے ہے تفصیل گذر چکی) اور ابن المبارک سے روایت کیا گیا کہ انھوں نے فرمایا: میں امام کے پیچھے پڑھتا ہوں اور لوگ بھی پڑھتے ہیں مگر کوفہ کے کچھ لوگ نہیں پڑھتے۔ اور میری رائے یہ ہے کہ جو شخص نہ پڑھے اس کی نماز بھی صحیح ہے۔

اور بعض اہل علم نے فاتحہ نہ پڑھنے کے سلسلہ میں سختی کی ہے، اگرچہ وہ امام کے پیچھے ہو، وہ کہتے ہیں: فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی، خواہ تنہا پڑھ رہا ہو یا امام کے پیچھے پڑھ رہا ہو۔ اور انھوں نے حضرت عبادۃ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، جس کو وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ اور حضرت عبادۃ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے بعد امام کے پیچھے

پڑھا ہے اور انھوں نے نبی ﷺ کے قول لاصلاۃ کا یہی مطلب سمجھا ہے۔ یعنی انھوں نے حدیث کے عموم میں مقتدی کو شامل کیا ہے اور یہ امام شافعی اور اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ کا قول ہے۔

اور امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے ارشاد لاصلاۃ کا محمل وہ صورت ہے جبکہ آدمی منفرد ہو۔ اور انھوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے تمسک کیا ہے، اس طرح کہ انھوں نے فرمایا: جس شخص نے کوئی رکعت پڑھی اور اس میں فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز نہیں ہوئی، مگر یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو (جس طرح لاصلاۃ میں ناقص کو معدوم فرض کیا گیا ہے اسی طرح حضرت جابر کے قول لم یُصل میں بھی ناقص کو معدوم فرض کیا گیا ہے) امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت جابر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی ہیں۔ انھوں نے لاصلاۃ کا یہ مطلب سمجھا ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ آدمی منفرد ہو۔ اور امام احمد رحمہ اللہ نے اس کے باوجود امام کے پیچھے پڑھنے کو پسند کیا اور یہ بات پسند کی کہ آدمی فاتحہ کسی حال میں نہ چھوڑے اگرچہ وہ امام کے پیچھے ہو (امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب کی صحیح ترجمانی نہیں کی) پھر حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے قول کی سند لکھی ہے۔

بحث کا تتمہ اور ہدایت المعتدی کا خلاصہ:

ہمارے اکابر میں سے حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے جو چھپ چکا ہے اور بازار میں دستیاب ہے اس رسالہ کا نام ہے: هداية المعتدى فى قراءة المقتدى۔ اس رسالہ کا حاصل یہ ہے کہ دور اول میں امام جو کچھ پڑھتا تھا مقتدی بھی ساتھ ساتھ پڑھتے تھے اور یہ قرآن یاد کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ عربوں کا مزاج سن کر اور پڑھ کر حفظ کرنے کا تھا، بلکہ آج تک ان کے یہاں حفظ کا یہی طریقہ رائج ہے۔ یہ طریقہ ایک عرصہ تک برقرار رہا۔ پھر امام کے پیچھے غیر فاتحہ پڑھنے سے روک دیا گیا۔ صرف فاتحہ کی اباحت باقی رہی۔ حضرت عبادۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث جو پچھلے باب میں گذری ہے وہ اسی دور کی ہے، یعنی پہلے صحابہ کرامؓ آنحضور ﷺ کے پیچھے فاتحہ اور غیر فاتحہ سب کچھ پڑھتے تھے پھر جب آپؐ نے لاتفعلوا إلا بِأُمّ القرآن فرمایا تو لوگ غیر فاتحہ پڑھنے سے رک گئے اور فاتحہ کی اباحت باقی رہی۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد یہ حکم بھی منسوخ ہوگیا اور مقتدی کے پڑھنے پر ہر طرح سے پابندی عائد کردی گئی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث جو دوسرے باب میں ہے اسی زمانہ کی ہے اور وہ حدیث عبادۃ کے لئے ناسخ ہے اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد: مالی أُنازَع القرآن میں امام کے پیچھے مطلقاً قراءت کی ناپسندیدگی کا اظہار ہے۔ صحابہ ہوشیار تھے، وہ اشارہ کو سمجھ گئے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس واقعہ کے بعد لوگ حضور ﷺ کے پیچھے پڑھنے سے رک گئے۔ غرض نماز کی موجودہ شکل تین مرحلوں سے گذر کر تکمیل پذیر ہوئی ہے۔ پہلے مقتدی کے لئے فاتحہ اور غیر فاتحہ سب کی تلاوت جائز تھی، پھر غیر فاتحہ کی تلاوت منسوخ کردی گئی۔ اور فاتحہ کی صرف اباحت باقی رکھی گئی۔ پھر فاتحہ کی اباحت بھی منسوخ ہوگئی، اور فاتحہ غیر فاتحہ سب سے مقتدی کو روک دیا گیا۔ جیسے

پہلے نماز میں ہر اونچ نیچ کے ساتھ رفع یدین تھا۔ پھر وہ تدریجاً منسوخ ہوتا گیا یہاں تک کہ تکبیر تحریمہ پر پہنچ کر رک گیا۔ احناف نے جس طرح یہاں آخری روایت کو لیا ہے چنانچہ وہ تحریمہ کے علاوہ کسی جگہ رفع کے قائل نہیں، اسی طرح قراءت کے مسئلہ میں بھی انھوں نے آخری روایت کو معمول بہ بنایا ہے اور سری اور جہری ہر نماز میں امام کے پیچھے پڑھنے کو مکروہ تحریمی کہا ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے وہاں بھی درمیانی روایت لی ہے اور یہاں بھی ایسا ہی کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے حضرت گنگوہی کے رسالہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

اس مسئلہ میں حضرت نانوتوی قدس سرہ کا بھی ایک رسالہ ہے۔ وہ رسالہ درحقیقت آپ کا ایک مکتوب ہے۔ اور دو ناموں سے شائع ہوا ہے، ایک نام ہے: **الدليل المُحكم على عدم قراء ة الفاتحة للمؤتم**۔ اور دوسرا نام ہے: **توثيق الكلام في الإنصات خلف الإمام**۔ یہ ایک ہی رسالہ کے دو نام ہیں، البتہ توثیق الکلام میں چند سطریں زیادہ ہیں۔ اور میں نے اس کی شرح لکھی ہے جس کا نام ہے: کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ یہ رسالہ بھی اپنے موضوع پر لاجواب ہے اس کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے۔

توثیق الکلام کا خلاصہ:

فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں اصل اختلاف احناف اور شوافع کے درمیان ہے۔ اور دونوں ہی اتنی بات بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ مقتدی نماز کے ساتھ براہِ راست متصف نہیں بلکہ وہ امام کے واسطہ سے متصف ہے۔ اور واسطہ تین قسم کا ہوتا ہے واسطہ فی العروض، واسطہ فی الثبوت اور واسطہ فی الاثبات۔ واسطہ فی الاثبات حد اوسط کو کہتے ہیں جو قیاس میں ثبوت نتیجہ کے لئے واسطہ ہوتی ہے۔ اور واسطہ فی العروض [1] میں وصف ایک ہوتا ہے اور اس کے ساتھ بالذات اور حقیقۃً صرف واسطہ متصف ہوتا ہے۔ اور ذوالواسطہ بالعرض اور مجازاً متصف ہوتا ہے جیسے مسافر انجن کے واسطہ سے بالعرض اور مجازاً حرکت کے ساتھ متصف ہے [2] حقیقۃً صرف انجن (واسطہ) حرکت کے ساتھ متصف ہے ——— اور واسطہ فی العروض میں چونکہ وصف ایک ہوتا ہے اور اس سے حقیقۃً صرف واسطہ متصف ہوتا ہے اس لئے ضروریاتِ وصف کی حاجت صرف اسی کو ہوتی ہے۔ ذوالواسطہ کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پس حرکت کی ضروریات مثلاً ڈیزل، پیٹرول یا کوئلہ پانی کی حاجت صرف انجن کو ہوگی مسافروں کو اور ڈبوں کو نہیں ہوگی۔ مسافر اگر بیمار بھی ہو اور حرکت کی طاقت نہ بھی رکھتا ہو یا سویا ہوا ہو تو بھی وہ ریل کے واسطہ سے متحرک ہوگا۔ یعنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہوگا۔

(۱) واسطہ فی العروض یہ ہے کہ وصف کے ساتھ حقیقۃً اور بالذات صرف واسطہ متصف ہو، اور ذوالواسطہ بالعرض اور مجازاً متصف ہو، جیسے مسافر انجن کے واسطہ سے بالعرض اور مجازاً حرکت کے ساتھ متصف ہوتا ہے، حقیقۃً صرف انجن (واسطہ) حرکت کے ساتھ متصف ہوتا ہے ۱۲

(۲) حرکت سے مراد محض ہلنا نہیں، بلکہ مقصد کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ مثلاً ریل کا دہلی کی طرف جانا یہ حرکت ہے۔

البتہ ذوالواسطہ کا واسطہ کے احاطہ میں ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ واسطہ کے احاطہ سے خارج ہو تو پھر متحرک نہ ہوگا۔ یعنی مسافر اگر ڈبے میں ہوگا تو دہلی پہنچے گا، ورنہ میرٹھ کے اسٹیشن پر کھڑا رہ جائے گا۔

اور واسطہ فی الثبوت[1] میں وصف متعدد ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ واسطہ اور ذوالواسطہ دونوں حقیقۃً متصف ہوتے ہیں، اس لئے ضروریات وصف کی حاجت دونوں کو رہتی ہے، جیسے تالا کھولنے میں ہاتھ اور چابی واسطہ ہیں۔ اور دونوں حرکت کے ساتھ حقیقۃً متصف ہیں پس دونوں میں حرکت کے ساتھ متصف ہونے کی صلاحیت اور قابلیت ضروری ہے۔ ہاتھ اگر شل ہو یا چابی وزنی ہو تو حرکت نہیں کر سکتی۔

اس تفصیل کے بعد یہ بات جاننی چاہئے کہ نماز کی حقیقت و ماہیت قراءت ہے۔ قراءت ہی کے لئے نماز مشروع ہوئی ہے، اور دیگر ارکان رکوع و سجود، قیام و قعدہ وغیرہ حضوری دربار کے آداب ہیں۔ اب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ امام کو واسطہ فی العروض قرار دیتے ہیں پس وصف قراءت کی حاجت صرف امام کو ہوگی مقتدیوں کو اس کی ضرورت نہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ امام کو واسطہ فی الثبوت مانتے ہیں پس وصف قراءت کی ضرورت امام و مقتدی دونوں کو ہوگی۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ نے امام کو جو واسطہ فی العروض مانا ہے تو حضرت نانوتوی قدس سرہ نے اس کی پانچ دلیلیں بیان کی ہیں۔ اور شرح میں میں نے پانچ دلیلیں اور بڑھائی ہیں ان میں سے دو تین یہ ہیں:

۱- عربی زبان کا قاعدہ ہے: جب مفرد کی اضافت جمع کی طرف کی جاتی ہے تو مضاف ایک ہوتا ہے اور مضاف الیہ متعدد ہوتے ہیں۔ مثلاً کتابھم (ان کی کتاب) أبوھم (ان کے والد) کتاب اور والد ایک ہیں۔ اور مالک اور بیٹے متعدد ہیں۔ اور جب جمع کی اضافت جمع کی طرف کی جاتی ہے تو مضاف اور مضاف الیہ دونوں متعدد ہوتے ہیں مثلاً: رَوَوْا عن آبائھم (انھوں نے اپنے باپوں سے روایت کی) أَخَذُوا أَقْلَامَهُمْ (انھوں نے اپنے قلم لئے) اس میں ہر راوی کا والد الگ ہے اور ہر شخص کا قلم جدا ہے۔

غرض اضافت کی پہلی صورت میں جمع کے تمام افراد واحد (ایک چیز) میں شریک ہوتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں تقسیم الآحاد علی الآحاد ہوتی ہے —— اب تمام احادیث پر نظر ڈال لیجئے۔ اور عرف کو بھی دیکھ لیجئے سب جگہ صلاۃ الجماعۃ جماعت کی نماز کہا جاتا ہے۔ کسی جگہ صَلَوَات الجماعۃ (جماعت کی نمازیں) نہیں کہا جاتا اس سے ثابت ہوا کہ کل جماعت کی نماز ایک ہے۔ جس کے ساتھ امام حقیقۃً اور بالذات متصف ہے اور مقتدی اسی کے واسطہ سے مجازاً اور بالعرض متصف ہیں۔

(۱) واسطہ فی الثبوت یہ ہے کہ واسطہ اور ذوالواسطہ دونوں حقیقۃً وصف کے ساتھ متصف ہوں، مگر واسطہ اولاً متصف ہو، اور ذوالواسطہ ثانیاً (بعد میں) متصف ہو، جیسے لکھنے والے کا ہاتھ اور قلم دونوں حرکت کے ساتھ متصف ہوتے ہیں، مگر ہاتھ پہلے اور قلم بعد میں متصف ہوتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھیں: کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟)

۲- آگے حدیث آرہی ہے کہ امام کا سترہ مقتدیوں کے لئے سترہ ہے انہیں علحدہ سترہ گاڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مسئلہ اس بات کی دلیل ہے کہ امام اور مقتدیوں کی نماز ایک (متحد) ہے۔

۳- پیچھے حدیث گذری ہے: الإمام ضامِنٌ۔ امام مقتدیوں کی نماز کا ذمہ دار ہے۔ جس طرح ضمانت میں ضامن کے قرضہ ادا کرنے سے ضامن اور اصل مدیون دونوں بری ہوجاتے ہیں اور ضامن قرضہ ادا نہ کرے تو اصل مدیون پر بھی بارِ دین باقی رہتا ہے اسی طرح اگر امام کی نماز صحیح ہوجائے گی تو مقتدی کی نماز بھی صحیح ہوجائے گی۔ لیکن اگر امام کی نماز فاسد ہوجائے تو مقتدی کے ذمہ بھی نماز باقی رہ جائے گی۔

اور جس طرح ضامن کے قرضہ ادا کرنے سے وہ تو بری ہوجاتا ہے مگر اصل مدیون پر ضروری ہوتا ہے کہ اب وہ قرضہ بجائے قرض خواہ کے ضامن کو ادا کرے۔ وہ بری نہیں ہوتا بلکہ اس کا ذمہ مشغول رہتا ہے۔ اسی طرح مقتدی نے جب اقتداء کی نیت کی تو اب اس پر لازم ہے کہ نماز صحیح ادا کرے۔ اگر فاسد کردے گا تو اس کا ذمہ مشغول رہے گا لیکن امام جس نے نماز صحیح ادا کرلی ہے بری ہوجائے گا۔

بہر حال امام کو جب مقتدیوں کی نماز کا ضامن قرار دیا گیا تو جس طرح ضمانت میں اصل مدیون اور ضامن پر دین (قرضہ) متحد (ایک) ہوتا ہے اسی طرح یہاں بھی امام اور مقتدی کی نماز متحد (ایک) ہوگی۔ اسی طرح امام کی نماز کے فساد سے مقتدیوں کی نماز کا فاسد ہوجانا اس بات کی دلیل ہے کہ اصل نماز امام ہی کی ہے اور جس طرح سواری کی حرکت سوار کی طرف مجازاً منسوب ہوتی ہے امام کی نماز بھی مجازاً مقتدیوں کی طرف منسوب ہوگی۔ اور جس طرح سواری کے ٹھہرنے سے سوار کا ٹھہرنا ضروری ہے مگر سوار کے ٹھہرنے سے سواری کا ٹھہرنا ضروری نہیں اسی طرح امام کی نماز کے فساد سے سب کی نماز کا فساد ضروری ہے۔ مگر مقتدیوں کی نماز کے فساد سے انہی کی نماز کا فساد ضروری ہوگا۔ امام کی نماز کا فساد لازم نہیں آئے گا ـــــ بطور مثال ہم نے تین دلیلیں ذکر کی ہیں، باقی دلیلیں: کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟ میں دیکھیں۔

اور فاتحہ کی فرضیت یا وجوب کے مسئلہ میں، یا مقتدی پر فاتحہ کی فرضیت یا جواز یا ممانعت کے مسئلہ میں اختلاف کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ قراءت: فاتحہ کو شامل ہے یا فاتحہ اس سے مستثنیٰ ہے؟ اس میں نقطۂ نظر مختلف ہیں: ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ قراءت: فاتحہ کو نہ صرف شامل ہے بلکہ اس کا اہم جزء ہے اس لئے خاص طور پر فاتحہ واجب ہے اور سورت ملانا یعنی درخواست کا جواب سننا بھی واجب ہے۔ اور دونوں کا مجموعہ یعنی علی الاطلاق قرآن پڑھنا فرض ہے۔ پس اس نقطۂ نظر سے إذا قرأ فأنصتوا کا مطلب یہ ہوگا کہ جب امام پڑھے خواہ فاتحہ پڑھے یا غیر فاتحہ جہری نماز میں پڑھے یا سری نماز میں مقتدی خاموش رہے۔ کیونکہ من کان له إمام فقراءةُ الإمام له قراءة کا مطلب ہے: امام کا پڑھنا مقتدی کے حق میں محسوب ہے فاتحہ بھی اور غیر فاتحہ بھی، پھر اس کو زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اور اس بات کو قائلینِ فاتحہ بھی فی الجملہ تسلیم کرتے ہیں۔ جو شخص رکوع میں آکر شامل ہوتا ہے اس کی نماز کو فاتحہ پڑھے بغیر بھی قائلین

فاتحہ صحیح کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کی طرف سے امام نے فاتحہ پڑھ لی۔

اور دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قراءت: فاتحہ کو شامل نہیں ۔ فاتحہ پڑھنا ایک مستقل فرض ہے۔اور قراءت کا مصداق صرف سورت ملانا ہے۔پس مذکورہ روایات فاتحہ پڑھنے کو مَس نہیں کرتیں۔لہٰذا اس نقطۂ نظر سے إذا قرأ فانصتوا کا مطلب یہ ہے کہ جب امام غیر فاتحہ پڑھے تو خاموش رہو۔اور من کان له إمام کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی کو غیر فاتحہ کی حاجت نہیں، کیونکہ امام کا پڑھنا اس کے حق میں محسوب ہے۔اور فانتهى الناس عن القراءة کا مطلب ہے: لوگ حضور کے پیچھے سورت پڑھنے سے رک گئے۔غرض یہ مسئلہ روایات کے اختلاف کی وجہ سے پیدا نہیں ہوا جو تطبیق کی راہ سوچی جائے۔ بلکہ یہ نقطۂ نظر کا اختلاف ہے۔واللہ اعلم

بابُ مَایقُوْلُ عند دُخُوْلِهِ الْمَسْجِدَ؟

مسجد میں داخل ہوتے وقت کیا دعا کرے؟

مسجد میں داخل ہوتے وقت اور مسجد سے نکلتے وقت آنحضرت ﷺ سے متعدد اذکار مروی ہیں۔امام نووی رحمہ اللہ نے کتاب الاذکار میں ان سب کو جمع کیا ہے۔یہاں معروف دعا کا ذکر ہے۔

حدیث: حضرت فاطمۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مسجد میں داخل ہوتے تو پہلے اپنے اوپر درود وسلام بھیجتے پھر یہ دعا پڑھتے: ''اے میرے رب! میرے گناہوں کو معاف فرما۔اور میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے وَا کردے'' اور جب مسجد سے نکلتے تو بھی اپنے اوپر درود وسلام بھیجتے پھر یہ دعا کرتے: ''اے میرے رب! میرے گناہوں کو معاف فرما۔اور میرے لئے اپنے فضل کے دروازے کھول دے'' ——— قرآن وحدیث میں رحمت سے اُخروی نعمت اور فضل سے دنیاوی نعمت مراد ہوتی ہے یعنی بندہ مسجد میں جاتے وقت اُخروی نعمت کا اور نکلتے وقت دنیاوی نعمت کا خواستگار ہو۔

تشریح: یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی فاطمہ کا ان کی دادی حضرت فاطمۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے لقاء وسماع نہیں۔اس لئے کہ حضرت فاطمہ کے انتقال کے وقت حضرات حسنین بالغ نہیں ہوئے تھے۔علاوہ ازیں لیث بن ابی سُلیم زیادہ اچھا راوی بھی نہیں۔اس سے احادیث میں بکثرت غت ربود ہوجاتا تھا۔مگر اس مضمون کی حضرت ابواُسید اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے صحیح سند سے حدیث مروی ہے۔اور وہ ابن ماجہ میں ہے۔اور قولی حدیث ہے اس میں نبی ﷺ نے مسجد میں داخل ہوتے وقت اور مسجد سے نکلتے وقت مذکورہ دعائیں کرنے کا اور ان سے پہلے درود پڑھنے کا حکم دیا ہے۔البتہ ان میں شروع کا ٹکڑا رب اغفرلی ذنوبی نہیں ہے۔ بلکہ ترمذی کی اس روایت کے دوسرے طریق میں بھی یہ ٹکڑا نہیں ہے۔غرض ان دعاؤں سے پہلے درود ضرور

پڑھنا چاہیے۔ عام طور پر لوگ اس سے غافل ہیں۔ جیسا کہ اذان کی دعا سے پہلے بھی درود ہے مگر لوگ وہاں بھی غفلت برتتے ہیں اور صرف دعا پڑھتے ہیں درود نہیں پڑھتے۔ پس خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔

[۱۲۰] باب مایقول عند دخوله المسجدَ؟

[۳۲۵-] حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نا إسماعيلُ بنُ إبراهيمَ، عن لَيْثٍ، عن عبدِ اللهِ بنِ الحَسَنِ، عن أُمِّهِ فاطمةَ بنتِ الحُسَيْنِ، عن جَدَّتِهَا فاطمةَ الكُبْرىٰ، قالت: كَانَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم إِذَا دَخَلَ المَسْجِدَ صَلّٰى عَلٰى مُحمدٍ وَسَلَّمَ، وقَالَ: رَبِّ اغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِي وافْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ، وَإِذَا خَرَجَ صَلّٰى على محمدٍ وَسَلَّمَ، وقَالَ: رَبِّ اغْفِرْلِيْ ذُنوبِي وافْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ فَضْلِكَ.

وقال عليُّ بنُ حُجْرٍ: قال إسماعيلُ بنُ إبراهيمَ: فَلَقِيْتُ عبدَ اللهِ بنَ الحسنِ بِمَكَّةَ، فَسَأَلْتُهُ عن هٰذا الحديثِ فَحَدَّثَنِيْ به. قال: كانَ إِذَا دَخَلَ قالَ: رَبِّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ، وإِذَا خَرَجَ قالَ: رَبِّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ فَضْلِكَ.

وفي الباب: عن أبي حُمَيْدٍ، وأبي أُسَيْدٍ، وأبي هُرَيْرَةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ فاطمةَ حديثٌ حسنٌ، وليس إِسْنَادُهُ بِمُتَّصِلٍ. وفاطِمَةُ ابْنَةُ الْحُسَيْنِ لَمْ تُدْرِكْ فاطمةَ الكُبْرىٰ، إِنَّمَا عَاشَتْ فاطِمَةُ بعد النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَشْهُراً.

وضاحت: عبداللہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں۔ اور ان کے والد کا نام بھی حسن ہے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی فاطمہ: عبداللہ کی والدہ ہیں ——— اسماعیل بن ابراہیم (ابن علیہ) کہتے ہیں: مکہ میں میری ملاقات استاذ الاستاذ عبداللہ بن الحسن سے ہوئی۔ میں نے ان سے یہ حدیث پوچھی تو انھوں نے مجھے اسی سند سے یہ حدیث سنائی۔ اس میں شروع کا ٹکڑا رب اغفرلی ذنوبی نہیں ہے امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند متصل نہیں کیونکہ فاطمہ بنت الحسین نے فاطمۃ الکبری کا زمانہ نہیں پایا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کے بعد صرف چند مہینے زندہ رہی ہیں۔

بابُ مَاجَاءَ إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ المَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ

جب کوئی مسجد میں داخل ہو تو پہلے تحیۃ المسجد پڑھے

مسجد میں داخل ہونے کے بعد اگر کوئی مانع نہ ہو تو بیٹھنے سے پہلے تحیۃ المسجد کی دو رکعت پڑھنی چاہئیں۔ یہ بندوں کا رب المسجد کو سلام کرنے کا طریقہ ہے۔ اور جو شخص مسجد میں پہنچ کر بیٹھ جائے پھر کھڑا ہو اور دو رکعت پڑھے تو یہ بھی

تحیۃ المسجد ہے، بیٹھنے کی وجہ سے تحیۃ المسجد فوت نہیں ہوتا۔ البتہ زیادہ دیر تک بیٹھے رہنے سے تحیۃ المسجد کا وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اور تھوڑے اور زیادہ وقت کی تعیین رائے مبتلی بہ پر چھوڑ دی گئی ہے۔ صحیح ابن حبان میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ہے کہ ایک مرتبہ وہ تحیۃ المسجد پڑھے بغیر بیٹھ گئے۔ آنحضور ﷺ نے دریافت فرمایا: أَرَكَعتَ ركعتين؟ کیا تم نے تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھ لیں؟ حضرت ابوذرؓ نے نفی میں جواب دیا تو آپؐ نے فرمایا: قُم فَارْكَعْهُما اٹھو اور دو رکعتیں پڑھو۔ صحیح ابن حبان میں اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے: بیٹھنے سے تحیۃ المسجد کا وقت فوت نہیں ہوتا۔

اور جو شخص عصر یا فجر کے بعد یا اوقاتِ ثلاثہ ممنوعہ میں مسجد میں پہنچے تو وہ تحیۃ المسجد نہ پڑھے، اسی طرح اگر جماعت شروع ہوگئی ہو یا شروع ہونے والی ہو تو بھی تحیۃ المسجد نہ پڑھے۔

حدیث: آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے: "جب کوئی شخص مسجد میں آئے تو چاہئے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھے"

تشریح: امام مالک رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ پر پہنچائی ہے۔ اور محمد بن عجلان وغیرہ ان کے متابع ہیں۔ یعنی وہ بھی اس کو حضرت ابوقتادہ کی حدیث بتاتے ہیں۔ اور سہیل بن ابی صالح نے بھی یہ حدیث عامر بن عبداللہ سے روایت کی ہے مگر اس نے سند حضرت جابر رضی اللہ عنہ پر پہنچائی ہے مگر یہ سہیل بن ابی صالح کا وہم ہے۔ یہ ابوقتادہ کی حدیث ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث نہیں ہے۔

[۱۲۱] باب ماجاء إذا دخل أحدُكُم المسجدَ فَلْيَرْكَعْ ركعتين

[۳۲۶-] حدثنا قُتَيْبَةُ بنُ سعيدٍ، نا مالكُ بنُ أَنسٍ، عن عَامِرِ بنِ عبدِ اللّٰهِ بنِ الزُّبَيْرِ، عَن عَمْرِو بن سُلَيْمٍ الزُّرَقِيِّ، عن أبي قَتَادةَ، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: " إذا جاءَ أَحَدُكُم الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يَّجْلِسَ"

قال: وفي البابِ عن جَابرٍ، وأَبِي أُمَامَةَ، وأبي هريرةَ، وأبي ذَرٍّ، وكَعْبِ بنِ مالكٍ.

قال أبو عيسى: وحديثُ أبي قَتَادَةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وقد رَوَى هذا الحديثَ محمدُ بنُ عَجْلَانَ وغيرُ واحِدٍ، عن عامرِ بنِ عبدِ اللّٰهِ بنِ الزُّبَيْرِ، نحوَ روايةِ مالكِ بنِ أنسٍ.

ورَوَى سُهَيْلُ بنُ أبي صالحٍ هٰذَا الحديثَ عن عامرِ بنِ عبدِ اللّٰهِ بنِ الزُّبَيْرِ، عن عَمْرِو بنِ سُلَيْمٍ، عن جابرِ بنِ عبدِ اللّٰهِ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم؛ وهذا حديث غيرُ محفوظٍ، والصحيحُ حديثُ أبي قَتَادَةَ.

والعملُ على هذا الحديثِ عندَ أصحابنا: استَحَبُّوا إِذَا دخلَ الرَّجُلُ المسجدَ أن لايَجلِسَ حتّٰى يُصَلِّيَ الرَّكعتَيْنِ، إلاّ أنْ يكُوْنَ لَهُ عُذرٌ.

قال عليُّ بنُ المَدِينِيُّ: وحديثُ سُهَيْلِ بنِ أبي صَالِحٍ خطأٌ، أخبرَني بذلك إِسْحاقُ بنُ إبراهيمَ، عن عَليِّ بنِ المَدِينِي.

بابُ مَاجاءَ أنَّ الأَرْضَ كُلَّها مَسْجِدٌ إلاَّ المَقْبُرَةَ والحَمَّامَ

قبرستان اور حمام کے علاوہ ساری زمین نماز پڑھنے کی جگہ ہے

اس باب میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پوری زمین نماز پڑھنے کی جگہ ہے علاوہ قبرستان اور حمام کے''(۱)

تشریح: اس حدیث کی سند صحیح ہے مگر مضمون صحیح نہیں۔ یعنی آنحضرت ﷺ کے جو چند امتیازات ہیں ان میں سے ایک امتیاز یہ ہے کہ آپ کے لئے ساری زمین نماز پڑھنے کی جگہ اور پاکی حاصل کرنے کی جگہ بنادی گئی ہے۔ اس میں کوئی استثناء نہیں، چنانچہ نو صحابہ آنحضور ﷺ سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں مگر کسی کی حدیث میں یہ استثناء نہیں اور ناپاک جگہ پر تیمم کرنے کی ممانعت یا آگے آنے والی حدیث میں جو سات جگہوں میں نماز پڑھنے کی ممانعت ہے جن میں حمام اور قبرستان بھی شامل ہیں وہ نہی لغیرہ ہے۔

سند پر بحث: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث مضطرب ہے۔ اس کو عمرو بن یحیٰ سے: سفیان ثوری، حماد بن سلمۃ، عبدالعزیز بن محمد دَراوَردی اور محمد بن اسحاق روایت کرتے ہیں۔ دراوردی سے یہ حدیث متصل اور مرسل دونوں طرح مروی ہے۔ اور سفیان ثوری نے اس کو مرسل روایت کیا ہے اور حماد بن سلمۃ متصل روایت کرتے ہیں یعنی وہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اور محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ عمرو بن یحیٰ عن ابیہ کی سند سے اکثر حدیثیں حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہیں مگر یہاں ان کا واسطہ نہیں یعنی یہ حدیث مرسل ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے سفیان ثوری کی مرسل روایت کو اصح قرار دیا ہے۔

[۱۲۲] باب ماجاء أنَ الأرضَ كلَّها مسجدٌ إلا المقبرةَ والحمامَ

[۳۲۷-] حدثنا ابن أبي عُمَرَ، وأبو عَمَّارٍ الحُسَيْنُ بنُ حُرَيْثٍ، قالا: نا عبدُ العزيزِ بنُ محمدٍ، عن

(۱) حمام نہانے کے ہوٹل کو کہتے ہیں، جس طرح ہمارے دیار میں کھانے اور ٹھہرنے کے لئے ہوٹل ہوتے ہیں اسی طرح جن ملکوں میں پانی کم ہے وہاں نہانے اور کپڑے وغیرہ دھونے کے لئے بھی ہوٹل ہوتے ہیں اور مرد وعورت سب وہاں جاکر نہاتے دھوتے ہیں۔

عَمْرِو بن يَحيىَ، عن أبيهِ، عن أبى سَعيدِ الخُدريِّ قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: "الأرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ إلا المَقْبُرَةَ وَالحَمَّامَ"

وفى الباب: عن عليٍّ،وعبدِ اللّٰهِ بنِ عَمْرٍو، وأبى هريرةَ، وجابرٍ، وابنِ عباسٍ، وحُذَيْفَةَ، وأنسٍ، وأبى أُمَامَةَ، وأبى ذَرٍّ، قالوا: إنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال: "جُعِلَتْ لِيَ الأَرْضُ كُلُّهَا مَسجدًا وطَهُوْرًا"

قال أبو عيسى: حديثُ أبى سعيدٍ قد رُوِيَ عن عبدِ العزيزِ بنِ محمدٍ روايتينِ: منهم مَن ذَكَرَ عن أبى سعيدٍ، ومنهم مَن لَمْ يَذْكُرْهُ؛ وهذا حديثٌ فيهِ اضْطِرَابٌ: رَوَى سفيانُ الثَّوْرِيُّ، عن عَمْرِو بنِ يَحْيىَ، عن أبيه، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم مُرْسَلاً.

وَرَوَاهُ حَمَّادُ بنُ سَلَمَةَ، عن عَمْرِو بنِ يَحيىَ، عن أبيه، عن أبى سعيدٍ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

وَرَوَاهُ مُحمدُ بنُ إسحاق، عن عَمْرِو بن يَحيىَ، عن أبيهِ، قال: وكَانَ عَامَّةُ رِوَايَتِهِ عن أبى سعيدٍ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، ولَمْ يَذْكُرْ فِيْهِ عن أبى سَعيدٍ.

وَكَأَنَّ رِوَايَةَ الثَّوْرِيِّ عن عَمْرِو بن يَحيىَ، عن أبيه، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَثْبَتُ وَأَصَحُّ.

ترجمہ: باب کی پہلی حدیث عبدالعزیز دراوردی سے مروی ہےاور موصول ہے، پھر باب میں نو صحابہ کی روایت ہے۔اس میں استثناء نہیں ہے۔ پھر امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث دراوردی سے دوطرح سے مروی ہے، ان کے بعض تلامذہ ابوسعید کا ذکر کرتے ہیں اور بعض ان کا تذکرہ نہیں کرتے۔اور یہ ایک ایسی حدیث ہے جس میں اضطراب (اختلاف) ہے پھر سفیان ثوری کی مرسل سند ذکر کی ہے۔ پھر حماد بن سلمہ کی مسند سند ذکر کی ہے، پھر محمد بن اسحاق کی مرسل سند ہےاور اس میں محمد بن اسحاق کا یہ قول بھی ہے کہ عمرو بن یحیٰی عن ابیہ سے جو روایتیں آتی ہیں ان کے آخر میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا ذکر ہوتا ہے مگر اس سند کے آخر میں ان کا تذکرہ نہیں یعنی یہ روایت مرسل ہے۔ پھر امام ترمذی رحمہ اللہ نے فیصلہ کیا ہے کہ گویا ثوری رحمہ اللہ کی مرسل روایت صحیح اور ثابت ہے (امام ترمذی رحمہ اللہ کا یہ فیصلہ صحیح ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے یعنی ضعیف ہے صحیح احادیث میں کوئی استثناء نہیں)

بَابُ مَاجَاءَ فِي فَضْلِ بُنْيَانِ الْمَسْجِدِ

مسجد بنانے کی فضیلت کا بیان

آنحضور ﷺ کے عہد مبارک میں مسجد نبوی ایک جھونپڑا تھی۔ پھر جب مسجد تنگ پڑنے لگی تو آپ ﷺ نے خود اس میں اضافہ کیا۔اور اصل مسجد کو برقرار رکھا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصل مسجد کو برقرار رکھ کر توسیع کی۔ پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں پوری مسجد کی از سر نو تعمیر کی اور پوری مسجد پکی بنائی اور اس میں توسیع بھی

کی۔ یہ تعمیر آپ نے اپنے ذاتی مال سے کی تھی، بیت المال سے کچھ خرچ نہیں کیا تھا۔ لیکن کچھ لوگوں کو اعتراض ہوا اور چہ مگوئیاں شروع ہوئیں۔ چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے خطاب کیا اور پوری صورت حال واضح کی اور فرمایا: میں نے یہ کام از راہ ثواب کیا ہے اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''جس نے اللہ کے لئے کوئی مسجد بنائی، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں حویلی بنائیں گے''

قوله: بَنَی: عام لفظ ہے۔ جو ثواب پہلی مرتبہ مسجد بنانے کا ہے وہی ثواب مسجد کو توڑ کر دوبارہ تعمیر کرنے کا ہے، نیز مسجد کے متعلقات بنانے کا بھی وہی ثواب ہے۔ مرمت کرنا اور جائز رنگ وروغن کرنا بھی اس میں شامل ہے۔

قوله: لِلّٰہِ: بخاری میں یَبْتَغِیْ بہ وجہَ اللّٰہ ہے۔ یعنی اللہ کی خوشنودی کے لئے مسجد بنائی۔ دکھاوا یا کسی اور غرض سے مسجد نہیں بنائی۔ ابن جوزی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: جس نے مسجد بنا کر اپنے نام کا کتبہ لگایا تو یہ کام اخلاص سے بہت دور ہے۔ یعنی اس کا یہ فعل اللہ کی خوشنودی کے لئے نہیں رہا۔ پس معمار اور مزدور جو دِہاڑی کے لئے کام کرتے ہیں مذکورہ ثواب کے حقدار نہیں ہونگے۔ اور علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ نے عمدۃ القاری میں فرمایا ہے کہ اگر مزدور وغیرہ ثواب کی نیت بھی کرلیں تو وہ کچھ نہ کچھ ثواب کے ضرور مستحق ہونگے۔ اور نیت کے احوال سے اللہ تعالیٰ واقف ہیں مگر اس کی ایک علامت یہ ہے کہ مزدور تندہی اور چستی سے کام کریں۔ یا وقت مقررہ سے زیادہ کام کرنے کی اجرت نہ لیں تو یہ ثواب کی نیت کا ایک قرینہ ہے۔

قوله: مسجداً: تنوین تنکیر کے لئے ہے یعنی مذکورہ ثواب ہر مسجد بنانے کا ہے خواہ بڑی مسجد بنائے یا چھوٹی۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں صغیراً کان أو کبیراً کی صراحت بھی ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حدیث کے ایک طریق میں ولَوْ کَمَفحَصِ قَطَاۃٍ بھی آیا ہے یعنی اگر قطات (بٹیر یا چھوٹا تیتر) کے انڈے دینے کی جگہ کے بقدر مسجد بنائے گا تو بھی مسجد بنانے کا ثواب ملے گا (یہ حدیث مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے) اور اس جملہ کے علماء نے دو مطلب بیان کئے ہیں: ایک یہ کہ یہ چھوٹا ہونے میں مبالغہ ہے، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ مسجد چندہ سے تعمیر کی جائے۔ پس جس کا معمولی چندہ ہوگا اس کے لئے بھی یہ ثواب ہوگا۔

قوله: بَنَی اللّٰہ: یہ اسناد مجازی ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے: بَنَی الأمیرُ المدینۃَ: امیر نے شہر بسایا، حالانکہ تعمیر کرنے والے معمار اور مزدور ہوتے ہیں مگر چونکہ تعمیر امیر کے حکم سے ہوتی ہے اس لئے اس کی طرف نسبت کردی جاتی ہے اسی طرح یہاں بھی اسناد مجازی ہے۔

قوله: مثلَہ: یہ مثلیت بنا میں ہے مَبْنی میں نہیں ہے۔ یعنی بندے نے اللہ کے لئے مسجد بنائی پس اللہ تعالیٰ بھی اس کے لئے گھر بنائیں گے۔ مگر وہ چیز جو بنائی گئی ہے اس میں مثلیت نہیں۔ بندہ اپنی گنجائش یا لوگوں کی حاجت کے مطابق مسجد بناتا ہے، اللہ اپنی شان کے مطابق اس کے لئے محل بنائیں گے۔ حضرت واثلۃ بن الاسقع رضی اللہ عنہ کی

حدیث کے الفاظ یہ ہیں: بَنَى الله له بيتًا في الجنة أَفضَلَ منه۔ معلوم ہوا کہ مَبْنی میں مثلیت نہیں صرف بناء میں مثلیت ہے اور حضرت واثلہ کی حدیث معجم طبرانی کبیر میں ہے۔

واقعہ: حاتم طائی سے کسی نے دو درہم کا سوال کیا۔ حاتم نے اس کو درہموں کی دو تھیلیاں دیں۔ ایک تھیلی میں سو درہم ہوتے ہیں۔ کسی نے حاتم سے کہا: اس نے تو دو درہم مانگے تھے؟ حاتم نے جواب دیا: اس نے اپنی حاجت کے بقدر مانگا، ہم نے اپنے حوصلے کے بقدر دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنی شانِ عالی کے مطابق محل بنائیں گے۔

[۱۲۳] باب ماجاء في فَضل بُنْيَانِ المسجدِ

[۳۲۸-] حدثنا بُنْدَارٌ، نا أبو بكرٍ الحَنَفِيُّ، نا عبدُ الحميدِ بنَ جَعْفَرٍ، عن أبيهِ، عن مَحمودِ بنِ لَبِيْدٍ، عن عثمانَ بنِ عَفَّانَ، قال: سمعتُ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يقولُ: "مَنْ بَنى لِلّٰهِ مَسْجِدًا بَنى اللّٰهُ لَهُ مِثْلَهُ فِيْ الْجَنَّةِ"

وفي الباب: عن أبي بَكْرٍ، وعُمَرَ، وعليٍّ، وعبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، وأنسٍ، وابنِ عبّاسٍ، وعائشةَ، وأُمِّ حَبِيْبَةَ، وأبي ذَرٍّ، وعَمْرِو بنِ عَبَسَةَ، ووَاثِلَةَ بنِ الأَسْقَعِ، وأبي هريرةَ، وجابرِ بنِ عبدِ اللهِ.

قال أبو عيسى: حديثُ عثمانَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[۳۲۹-] وقد رُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: "مَنْ بَنَى لِلّٰهِ مَسْجِدًا، صَغِيْرًا كَانَ أَوْ كَبِيْرًا، بَنَى اللّٰهُ لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ"؛ حدثنا بذلكَ قُتَيْبَةُ بنُ سعيدٍ، نا نوحُ بنُ قيسٍ، عن عبدِ الرحمنِ مولَى قيسٍ، عن زيادٍ النُّمَيْرِيِّ، عن أنسٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم بهذا.

ومحمودُ بنُ لَبِيْدٍ: قد أَدْرَكَ النبيَّ صلى الله عليه وسلم؛ ومحمودُ بنُ الرَّبِيْعِ: قد رَأَى النبيَّ صلى الله عليه وسلم، وهما غُلَامَانِ صَغِيْرَانِ مَدَنِيَّانِ.

وضاحت: محمود بن الربیع جن کا تذکرہ فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں گذرا ہے وہ اور محمود بن لبید دونوں صحابی صغیر ہیں یعنی رسول اللہ ﷺ کے وصال تک یہ بچے تھے اور یہ دونوں حضرات مدینہ کے رہنے والے ہیں۔

بابُ ماجاء في كَرَاهِيَةِ أن يُتَّخَذَ عَلَى القَبْرِ مَسْجِدًا

قبر پر مسجد بنانے کی ممانعت

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبر پر مسجد بنانے والوں پر اور ان پر چراغاں کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔ یعنی ان کو رب ذوالجلال کی

رحمت سے محرومی کی بددعا دی۔

اس حدیث میں تین مسئلے ہیں:

پہلا مسئلہ: عورتوں کے لئے قبرستان جانے کا حکم۔ یہ مسئلہ تفصیل سے کتاب الجنائز میں آئے گا۔ یہاں بالاجمال اتنی بات سمجھ لینی چاہئے کہ امام اعظم رحمہ اللہ سے اس مسئلہ میں حرمت کا بھی اور رخصت کا بھی دونوں قول مروی ہیں۔ حرمت والے قول کی دلیل باب کی حدیث ہے۔ ظاہر ہے لعنت حرام کام کرنے والے ہی پر کی جاتی ہے۔ اور رخصت والے قول کی دلیل یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے پہلے قبرستان جانے کی عام ممانعت فرمائی تھی، پھر بعد میں آپؐ نے اجازت دیدی اور اس میں مردوں کی تخصیص نہیں کی۔ پس جب ممانعت عام تھی تو اجازت بھی عام ہوگئی۔ مرد و زن سب کو شامل ہوگی۔ اور اس کا قرینہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی قبر پر جانا ہے۔ اور اپنے اکابر میں سے حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہما نے اس مسئلہ میں صرف اتنی بات لکھی ہے کہ عورتوں کو قبرستان نہیں جانا چاہئے۔ حلت و حرمت کے الفاظ سے ان دونوں حضرات نے اجتناب کیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ عورتیں کمزور دل اور کمزور عقیدہ ہوتی ہیں۔ پس اگر وہ کسی رشتہ دار کی قبر پر جائیں گی تو جزع فزع کریں گی۔ اور اگر کسی بزرگ کی قبر پر جائیں گی تو خرافات میں مبتلا ہونگی۔ اس لئے عورتوں کو قبرستان نہیں جانا چاہئے۔

دوسرا مسئلہ: قبر کے پاس مسجد بنانے کا حکم: قاضی بیضاوی (شافعی) رحمہ اللہ نے شرح مصابیح السنۃ میں یہ بات لکھی ہے کہ قبر کی تعظیم کی غرض سے اس کے قریب اس طرح مسجد بنانا کہ دورانِ نماز قبر کا مواجہہ ہو تو یہ شرک جلی ہے۔ اور اگر قبر ایک طرف ہو یعنی دائیں بائیں یا پیچھے ہو اور مقصد بزرگ کی تعظیم ہو تو یہ شرک خفی ہے۔ اور اگر زائرین کے قیام، نماز اور دیگر سہولتوں کے لئے مسجد بنائی جائے تو جائز ہے بشرطیکہ مسجد بنانے سے مقصود اس بزرگ کی تعظیم یا اس کی روحانیت کی طرف توجہ کرنا نہ ہو۔ اور مصابیح السنۃ کے دوسرے شارح علامہ تُورِپِشتی (حنفی) تینوں صورتوں کو ناجائز کہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: اگر مسجد بنانے کا مقصد اس بزرگ کی تعظیم ہے تو یہ شرک جلی ہے، اور اس کی روحانیت سے استفادہ ہے تو یہ شرک خفی ہے، اور اگر یہ دونوں باتیں نہیں ہیں تو بھی قبوریوں کے ساتھ اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ مشابہت ہے اس لئے جائز نہیں (معارف السنن ۳: ۳۰۵)

تیسرا مسئلہ: قبرستان میں چراغاں کرنے کا حکم: اگر کسی قبر پر رات میں بھی زائرین آتے ہیں تو ان کی سہولت کے لئے قبرستان میں روشنی کرنا جائز ہے۔ اور اگر صاحب قبر کی وحشت دور کرنے اور اس کی تعظیم کے مقصد سے چراغاں کیا گیا ہو تو جائز نہیں۔ حدیث شریف کا مصداق یہی صورت ہے۔

فائدہ: یہاں ایک چوتھا مسئلہ بھی ہے۔ اور وہ ہے کسی مسجد کے پاس کسی بزرگ کو دفن کرنا۔ آج کل اس کا رواج چل پڑا ہے۔ پس جاننا چاہئے کہ یہ تدفین بھی جائز نہیں۔ تورپشتی رحمہ اللہ نے جو تیسری صورت کو ناجائز کہا ہے اس

میں یہ چوتھی صورت بھی داخل ہے۔

[١٢٤] .باب ماجاء في كراهيةِ أن يُتَّخذَ على القبر مسجداً

[٣٣٠-] حدثنا قُتَيبَةُ، نا عبدُ الوارثِ بنُ سعيدٍ، عن محمدِ بنِ جُحَادَةَ، عن أبي صالحٍ، عن ابنِ عباسٍ، قال: لَعَنَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم زَائِرَاتِ القُبُوْرِ، والمُتَّخِذِيْنَ عليها المَسَاجِدَ والسُّرُجَ.

قال: وفي الباب عن أبي هريرةَ،وعائشةَ. قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عباس حديثٌ حسنٌ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی قبروں کی زیارت کے لئے جانے والی عورتوں پر اور قبور پر مساجد بنانے والوں پر اور چراغاں کرنے والوں پر۔

بابُ مَاجَاءَ في النَّوْمِ في الْمَسْجِدِ

مسجد میں سونے کا حکم

مذاہبِ فقہاء: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک مسجد میں علی الاطلاق سونا جائز ہے۔ خواہ سونے والا مسافر ہو یا غیر مسافر۔ دن میں سوئے یا رات میں۔ اور یہ مسئلہ امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام میں لکھا ہے۔ اور انھوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں ہم نوجوان مسجد نبوی میں سویا کرتے تھے۔

دیگر ائمہ کے نزدیک مسجد کو مَبِیت (رات میں سونے کی جگہ) اور مَقِیل (قیلولہ کرنے کی جگہ) بنانا جائز نہیں۔ البتہ معتکف اور مسافر اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے لئے مسجد میں سونا جائز ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں سو رہے تھے۔ آنحضور ﷺ کا وہاں سے گذر ہوا تو آپؐ نے ان کو پاؤں لگا کر بیدار کیا اور فرمایا: أَلاَ أَرَاكَ نَائِمًا فيه: کیا میں آپ کو مسجد میں سویا ہوا نہیں دیکھ رہا؟ یعنی مسجد میں کیوں سوئے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: غَلَبَتْنِيْ عَيْنَايَ: یارسول اللہ! میری آنکھ لگ گئی تھی، یعنی میں بالقصد نہیں سویا، بے اختیار سو گیا۔ آپؐ نے عذر قبول کیا اور کچھ نہ فرمایا۔ یہ حدیث دارمی (۳۲۵:۱) میں ہے۔ حدیث مذکور میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوذرؓ کے مسجد میں سونے کو ناپسند کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ مقامی لوگوں کے لئے مسجد میں سونا جائز نہیں۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث عذر پر محمول ہے یعنی جب مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو مہاجرین کے پاس رہنے اور سونے کے لئے معقول انتظام نہیں تھا اس لئے نوجوان مسجد میں سوتے تھے اور ان کے ماں باپ گھر میں سوتے

تھے۔ پھر جب حالات بدل گئے تو آنحضرت ﷺ نے نوجوانوں سے خطاب کیا اور فرمایا: یا معشر الشَّبَابِ تَزَوَّجُوْا: اے نوجوانو! گھر بساؤ۔ غرض نوجوانوں کا مسجد میں سونا عذر کی بناء پر تھا۔ اس کے ذریعہ مسجد میں سونے کی عام اجازت پر استدلال کرنا محل نظر ہے۔

فائدہ: عرب کی مسجدوں میں صرف جماعت خانہ ہوتا ہے اس کے ساتھ مسجد کے دیگر متعلقات نہیں ہوتے، بایں وجہ کتابوں میں مسافر کے لئے مسجد میں سونے کی اجازت دی ہے مگر ہمارے دیار کی صورت حال مختلف ہے۔ ہمارے یہاں مسجد کے ساتھ ان کے متعلقات بھی ہوتے ہیں۔ پس ایسی صورت میں مسجد میں سونے کی اجازت نہیں ہوگی۔ وہ متعلقات مسجد میں قیام کرے۔ البتہ اگر کسی مسجد میں متعلقات نہ ہوں تو پھر جماعت خانہ میں سو سکتا ہے۔ اور یہ اجازت اسی وقت ہے جبکہ کوئی دوسری جگہ میسر نہ ہو، بڑے شہروں میں قیام کے لئے ہوٹل ہوتے ہیں اگر مسافر کے پاس پیسہ ہے اور مناسب کرایہ پر قیام کی جگہ حاصل ہوسکتی ہے تو پھر مسجد میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں ——— اسی طرح بعض مدرسے مسجد میں قائم کئے جاتے ہیں اور طلبہ مسجد میں سوتے ہیں۔ اگر دوسری جگہ موجود ہو تو طلبہ کے لئے مسجد میں سونا جائز نہیں۔ اور اگر مجبوری ہو، متبادل انتظام نہ ہو تو پھر وقتی طور پر گنجائش ہے اور دلیل باب کی حدیث ہے۔ مگر ارباب مدرسہ کو چاہئے کہ پہلی فرصت میں انتظام کریں، اسی طرح تبلیغی جماعت والے بھی متعلقات مسجد میں سامان رکھیں اور وہیں قیام کریں۔ مسجد میں سامان رکھنے اور قیام کرنے کی اجازت مجبوری ہی میں ہے، مثلاً کسی مسجد کے متعلقات نہیں ہیں تو مجبوری ہے۔ ایسی صورت میں مسجد میں سامان رکھنا اور ٹھہرنا جائز ہے۔ واللہ اعلم

[۱۲۵] باب ماجاء فی النَّوْمِ فی المسجد

[۳۳۱-] حدثنا مَحمودُ بنُ غَيْلَانَ، نا عبدُ الرَّزَّاقِ، نا مَعْمَرٌ، عن الزُّهْرِيِّ، عن سالمٍ، عن ابنِ عُمَرَ، قال: كُنَّا نَنَامُ عَلٰى عَهْدِ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فى الْمَسْجِدِ، ونَحْنُ شَبَابٌ.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وقَدْ رَخَّصَ قَوْمٌ مِنْ أَهْلِ العِلْمِ فى النَّوْمِ فِى الْمَسْجِدِ؛ قال ابنُ عباسٍ: لَايَتَّخِذُهُ مَبِيْتًا ومَقِيْلًا؛ وذهبَ قومٌ مِن أهلِ العلمِ إلى قولِ ابنِ عباسٍ.

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مسجد میں سویا کرتے تھے درانحالیکہ ہم نوجوان تھے ——— بعض علماء نے مسجد میں سونے کی اجازت دی ہے (اور) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مسجد کو رات میں سونے کی جگہ اور قیلولہ کرنے کی جگہ بنانا جائز نہیں۔ اور بعض علماء نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کو اختیار کیا ہے۔

بابُ مَاجاء فی کَرَاهیةِ الْبَیْعِ و الشِّرَاءِ، وَإِنْشَادِ الضَّالَّةِ و الشِّعْرِ فی المسجدِ

مسجد میں خرید وفروخت کرنا، گم شدہ چیز تلاش کرنا اور بیت بازی کرنا ممنوع ہے

حدیث: آنحضرت ﷺ نے مسجد میں بیت بازی کرنے سے اور اس میں خرید وفروخت کرنے سے، اور جمعہ کے دن نماز سے پہلے مسجد میں حلقے بنانے سے منع فرمایا۔

اس حدیث میں تین مسئلے ہیں:

پہلا مسئلہ: مسجد میں بیت بازی کرنا منع ہے۔ اس لئے کہ بیت بازی میں یکے بعد دیگرے سبھی اشعار پڑھتے ہیں، اور ایک دوسرے کو داد دیتے ہیں۔ اور بہت شور وشغب ہوتا ہے اور اشعار اچھے برے ہر طرح کے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اس میں مسجد کی بے حرمتی ہے۔ البتہ دوران درس یا دورانِ وعظ بطور استشہاد شعر پڑھنے کی گنجائش ہے بلکہ مسجد میں حمد ونعت پڑھنے کی بھی گنجائش ہے، مگر تناشد اشعار یعنی بیت بازی منع ہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں منبر رسول پر کھڑے ہو کر کفار کی ہجو میں اور آنحضرت ﷺ کی مدح میں اشعار سناتے تھے اور سامعین میں آپؐ بھی ہوتے تھے۔

دوسرا مسئلہ: مسجد میں خرید وفروخت کرنا ممنوع ہے۔ اور علماء نے اس کی وضاحت یہ کی ہے کہ مسجد میں سامان حاضر کر کے خرید وفروخت کرنا منع ہے۔ اور سامان حاضر کئے بغیر معتکف کوئی چیز خریدے یا بیچے تو گنجائش ہے۔

تیسرا مسئلہ: جمعہ کے دن جامع مسجد میں نماز جمعہ سے پہلے سبق یا وعظ کے حلقے لگانا بھی منع ہے۔ علماء نے فرمایا: یہ ممانعت اس وقت سے ہے جب لوگ جمعہ کے لئے مسجد میں آنا شروع ہو جائیں۔ اور اس وقت حلقے لگانے کی اجازت اس لئے نہیں کہ آنے والے سنن ونوافل اور دیگر اذکار میں مشغول ہونگے۔ البتہ جب تک لوگ آنے شروع نہ ہوں وہاں تک جمعہ کے دن بھی مسجد میں حلقے لگانے کی گنجائش ہے۔ یہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مسجد دراصل نماز پڑھنے کے لئے ہے۔ پھر دیگر دینی کاموں کے لئے ہے۔ لہٰذا جب تک لوگ نماز پڑھ رہے ہیں جماعت خانہ میں دیگر دینی کام نہیں کرنے چاہئیں۔ تبلیغ والے نمازوں کے بعد خاص طور پر مغرب کے بعد جلدی جلدی دو سنتیں پڑھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اعلان کرنے لگتے ہیں: نمازیوں کا خیال کر کے آگے آجائیں۔ حالانکہ وہ خود خیال نہیں کر رہے۔ ابھی لوگ سنتوں میں مشغول ہیں اور وہ یہ اعلان شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے نمازیوں کی نماز میں خلل پڑتا ہے، لہٰذا ان کو اس سے احتراز کرنا چاہئے، جب لوگ سنتوں سے فارغ ہو جائیں تو دین کے دوسرے کام مسجد میں کرنے کی اجازت ہے۔

عمرو بن شعیب کی سند پر بحث:

ذخیرۂ حدیث میں جہاں بھی عن أبیه، عن جده آتا ہے وہاں دونوں ضمیریں پہلے نام کی طرف لوٹتی ہیں۔ مگر عمرو

بن شعیب کی سند میں دونوں ضمیریں منتشر ہیں یعنی پہلی ضمیر عمرو کی طرف لوٹتی ہے اور دوسری شعیب کی طرف۔ یعنی عمرو اپنے والد شعیب سے روایت کرتے ہیں، اور شعیب اپنے دادا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ شعیب کے والد کا نام محمد ہے اور وہ کوئی راوی نہیں ہیں۔ اس سند سے مروی روایتیں صحیح ہیں یا غیر صحیح؟ نیز متصل ہیں یا منقطع؟ اس میں اختلاف ہے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس سند سے جتنی حدیثیں مروی ہیں وہ سب ضعیف ہیں۔ ان سے احکام مستنبط کرنا درست نہیں۔ مگر یہ رائے صحیح نہیں۔ یہ رائے اس خیال پر مبنی ہے کہ اس سند میں انقطاع ہے۔ شعیب نے اپنے دادا حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے براہِ راست حدیثیں نہیں سنیں۔ بلکہ انھوں نے صحیفۂ صادقہ سے روایتیں کی ہیں [1] اور اس کی دلیل یہ ہے کہ شعیب صحیفہ صادقہ سامنے رکھ کر احادیث بیان کیا کرتے تھے۔ اگر انھوں نے دادا سے حدیثیں سنی ہوتیں تو اپنی کاپی تیار کی ہوتی جیسا کہ اس زمانہ کا دستور تھا۔

دوسری رائے یہ ہے کہ شعیب نے براہ راست اپنے دادا سے حدیثیں سنی ہیں۔ اور چونکہ دادا نے اپنی کاپی پوتے کو دیدی تھی اس لئے شعیب نے الگ سے کاپی لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ——— اکابر محدثین اسی نظریہ کو صحیح سمجھتے ہیں۔ مگر چونکہ اس سند میں کلام ہوا ہے اس لئے شیخین نے اس سند سے آنے والی روایات کو صحیحین میں نہیں لیا۔ غرض یہ سند قابل اعتبار ہے اور اس سند سے مروی احادیث کم از کم حسن کے درجہ کی ضرور ہوتی ہیں اس سے کم نہیں، اور ان سے مسائل میں استدلال درست ہے۔

[۱۲۶] باب ماجاء فی كراهية البيع والشراء، وإنْشَادِ الضَّالَّةِ والشعرِ فی المسجد

[۳۳۲-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ، عن ابنِ عَجْلَانَ، عن عَمْرِو بنِ شُعَيْبٍ، عن أبيهِ، عن جَدِّهِ، عن رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: أَنَّهُ نَهَى عَن تَنَاشُدِ الْأَشْعَارِ فی المسجِد، وعن البَيْعِ والشِّرَاءِ فيه، وأَنْ يَتَحَلَّقَ الناسُ فيهِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ قَبْلَ الصَّلَاةِ.

وفى الباب: عن بُرَيْدَةَ، وجابرٍ، وأنسٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ عبدِ اللّٰهِ بنِ عَمرِو بنِ العاصِ حديثٌ حسنٌ؛ وعَمْرُو بنُ شُعيبٍ: هو ابنُ محمدِ بنِ عبدِ اللّٰهِ بنِ عَمْرِو بن العاصِ.

قال محمدُ بنُ إسماعيلَ: رَأَيْتُ أحمدَ وإسحاقَ، وَذَكَرَ غَيْرَهُمَا، يَحْتَجُّوْنَ بحديث عَمْرِو بنِ شُعَيْبٍ؛ قال محمدٌ: وقد سَمِعَ شعيبُ بنُ محمدٍ من عبدِ اللّٰهِ بنِ عَمْرٍو.

(۱) عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی حیات میں احادیث کی ایک کاپی تیار کی تھی اور اس کا نام صحیفہ صادقہ رکھا تھا۔

قال أبو عيسى: وَمَن تكلَّم في حديثِ عَمْرِو بنِ شعيبٍ إنَّما ضَعَّفَهُ لِأَنَّهُ يُحدِّثُ عن صَحِيفةِ جَدِّهِ، كأنَّهم رأوا أنَّهُ لَمْ يَسْمَعْ هٰذِهِ الأحاديثَ مِنْ جَدِّهِ.

قال عليُّ بنُ عبدِ اللهِ: وَذَكَرَ عن يحيى بن سعيدٍ أنه قال: حديثُ عَمْرِو بنِ شعيبٍ عِنْدَنَا وَاهٍ.

وقد كَرِهَ قَوْمٌ مِنْ أهلِ العلمِ البيعَ والشِّراءَ في المسجدِ؛ وبه يقولُ أحمدُ وإسحاقُ.

وقد رُوِيَ عن بعضِ أهلِ العلمِ مِنَ التابعينَ رُخصَةٌ في البَيْعِ والشِّراءِ في المسجدِ.

وقد رُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم في غيرِ حديثٍ رُخصَةٌ في إنشادِ الشِّعْرِ في المسجد.

ترجمہ: امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: میں نے امام احمد اور امام اسحاق بن راہویہ رحمہما اللہ کو دیکھا اور آپ نے ان دونوں کے علاوہ محدثین کا بھی تذکرہ کیا مثلاً حمیدی کا۔ یہ سب حضرات عمرو بن شعیب کی حدیث سے استدلال کرتے تھے، یعنی یہ سب اکابر اس سند کو صحیح قرار دیتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ شعیب نے اپنے دادا سے حدیثیں سنی ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جن حضرات نے عمرو بن شعیب کی سند میں کلام کیا ہے: انھوں نے اس سند کو صرف اس وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے کہ شعیب اپنے دادا کی کاپی سے روایت کیا کرتے تھے، گویا ان کے خیال میں شعیب نے یہ احادیث اپنے دادا سے نہیں سنیں۔ علی بن عبداللہ المدینی نے فرمایا اور انھوں نے یہ بات یحییٰ بن سعید قطان سے روایت بھی کی کہ انھوں نے فرمایا: عمرو بن شعیب کی حدیث ہمارے نزدیک بودی ہے یعنی یہ رائے ابن المدینی اور یحییٰ قطان دونوں کی ہے اور بعض علماء نے مسجد میں خرید وفروخت کرنے کو ناپسند کیا ہے اور یہ امام احمد اور امام اسحاق رحمہما اللہ کا قول ہے —— اور بعض علمائے تابعین سے مسجد میں خرید وفروخت کرنے کی اجازت مروی ہے (ان دونوں قولوں میں تطبیق یہ ہے کہ سامان مسجد میں لاکر مکروہ ہے اور اس کے بغیر جائز ہے) اور آنحضور ﷺ سے متعدد حدیثوں میں مسجد میں شعر پڑھنے کی اجازت مروی ہے (یہ حضرت حسان کے اشعار پڑھنے کی طرف اشارہ ہے۔ مسجد میں اشعار پڑھنا جائز ہے مگر تناشد اشعار یعنی بیت بازی جائز نہیں)

بابُ مَاجَاءَ في المَسْجِدِ الَّذِيْ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ

آیت ﴿لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوىٰ﴾ کا مصداق کونسی مسجد ہے؟

سورۂ توبہ (آیت ۱۰۸) میں ہے: ﴿لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ﴾ ترجمہ: البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے ہی دن سے تقوی پر رکھی گئی ہے اس بات کی زیادہ حقدار ہے کہ آپؐ اس میں نماز پڑھیں۔ اس آیت کے مصداق کی تعیین میں قبیلۂ خُدرۃ کے ایک صحابی اور قبیلۂ بنی عمرو بن عوف کے ایک صحابی کے درمیان بحث

ہوئی۔ خدری صحابی نے آیت کا مصداق مسجد نبوی کو قرار دیا کیونکہ اس کی بنیاد آنحضرت ﷺ نے خود رکھی ہے پس بلاشبہ وہ پہلے ہی دن سے تقوی پر قائم ہے۔ اور بنو عمرو بن عوف کے صحابی نے مسجد قُبا کو آیت کا مصداق بتایا، کیونکہ آیت کا سیاق وسباق اور شانِ نزول کی دلالت اسی پر ہے۔ پھر دونوں فیصلہ کے لئے خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ اس وقت نبی ﷺ مسجد نبوی میں تشریف فرماتھے۔ آپؐ نے فرمایا: ''آیت کا مصداق یہ مسجد ہے، وفی ذلك خیر کثیر اور اس مسجد میں یعنی مسجد قبا میں خیر کثیر ہے'' یعنی وہ مسجد آیت کا شان نزول ہے۔

تشریح: تفسیر کا ایک قاعدہ ہے: العِبرَۃُ لِعُموم اللفظِ، لا لِخُصوصِ المَوْرِدِ۔ یعنی اگر نص کے الفاظ عام ہوں تو حکم شان نزول کے ساتھ خاص نہیں رہتا، بلکہ عام ہو جاتا ہے۔ پس آیت کا شانِ نزول اگرچہ مسجد قبا ہے، مگر آیت اُس مسجد کے ساتھ خاص نہیں۔ مسجد نبوی بھی آیت کا مصداق ہے، بلکہ مسجد نبوی بدرجۂ اولیٰ آیت کا مصداق ہے، کیونکہ مسجد قبا میں آنحضور ﷺ نے چودہ دن نماز پڑھی ہے اور مسجد نبوی میں دس سال تک مسلسل نمازیں پڑھی ہیں۔

اس کی نظیر: ایک دفعہ آنحضور ﷺ نے اپنی ازواج سے ناراض ہو کر ایک مہینہ کے لئے ایلاء فرمایا تھا۔ جب مہینہ پورا ہوا تو سورۂ احزاب کا ایک مکمل رکوع نازل ہوا جس میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنی بیویوں کو اختیار دیں جو چاہے تنگی ترشی کے ساتھ آپؐ کے ساتھ رہے اور جو دنیا کی آسائش چاہے وہ آپ سے علحدگی اختیار کرلے۔ تمام ازواج نے ذاتِ نبوی کو دنیا کی آسائش پر ترجیح دی اور آپؐ کے ساتھ رہنے کو پسند کیا۔ اس واقعہ کے ضمن میں یہ آیت ہے: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (آیت ۳۳) یعنی اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ اے نبی کے گھر والو! تم سے آلودگی کو دور رکھے اور تم کو پاک وصاف کرے۔ شیعہ کہتے ہیں: اس آیت کا مصداق حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم ہیں، اور وہی اہل بیت ہیں۔ ان کو یہ غلط فہمی ایک حدیث سے ہوئی ہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تھے۔ آپ نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ حضرت حسن جو بچے تھے آئے آپ نے ان کو کمبل میں لے لیا۔ پھر حضرت حسین آئے تو ان کو بھی کمبل میں لے لیا۔ پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں تو آپؐ نے ان کو بھی کمبل میں لے لیا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپؐ نے انہیں بھی کمبل اوڑھا دیا اور خود باہر نکل گئے۔ اور دعا فرمائی: ''اے اللہ! یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے گندگی کو دور فرما اور ان کو پاک صاف رکھ'' حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جب رحمت کا دریا بہتا دیکھا تو دوڑی آئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے بھی کمبل میں لے لیجئے۔ آپؐ نے ان کو کمبل کے نیچے نہیں لیا اور فرمایا: أنتِ علی خیر۔ یہ جملہ مذکورہ حدیث میں جو جملہ ہے اس کے مانند ہے اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ تم تو پہلے ہی سے اہل بیت میں شامل ہو یعنی تم تو آیت کا شان نزول ہو

کیونکہ ان آیتوں کا اصل مصداق ازواج مطہرات ہیں۔ مگر حضور ﷺ نے آیت کے عموم میں ان چاروں کو بھی شامل کرنا چاہا اور اس کے لئے دعا فرمائی اور یقیناً آپ کی دعا قبول ہوئی ہوگی (یہ حدیث آگے کتاب التفسیر میں سورۂ احزاب کی تفسیر میں آرہی ہے)

پس جس طرح اس آیت کا اصل مصداق ازواج مطہرات ہیں اور حضرات اربعہ ان کے ساتھ ملحق ہیں اسی طرح آیت ﴿لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوىٰ﴾ کا اصل مصداق مسجد قبا ہے اور مسجد نبوی اس کے ساتھ ملحق ہے مگر خارجی قرائن کی بناء پر مسجد نبوی بدرجۂ اولیٰ مصداق ہے یعنی یہاں ملحق بہ بڑھ گیا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اس میں دس سال تک مسلسل نمازیں پڑھی ہیں اور مسجد قبا میں صرف چودہ دن نمازیں پڑھی ہیں۔ اور حضرات اربعہ کی ازواج مطہرات پر افضیلت کے لئے کوئی قرینہ نہیں اس لئے اصل یعنی ازواج مطہرات اور ملحق بہ یعنی حضرات اربعہ اہل بیت کے مصداق میں یکساں ہیں۔ واللہ اعلم

[۱۲۷] باب ماجاء في المسجد الذي أُسِّسَ على التقوى

[۳۳۳-] حدثنا قُتَيْبَةُ نا حاتِمُ بنُ إسماعيلَ، عن أُنَيْسِ بنِ أبي يَحْيىَ، عن أبيهِ، عن أبي سَعيدٍ الخُدْرِيِّ، قال: امْتَرىٰ رَجُلٌ مِن بَني خُدْرَةَ وَرَجُلٌ مِن بَني عَمْرِو بنِ عَوْفٍ فِي الْمَسْجِدِ الَّذِيْ أُسِّسَ على التَّقْوىٰ، فَقَالَ الخُدْرِيُّ: هو مسجدُ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، وقال الآخَرُ: هُوَ مَسجدُ قُبَا، فَأَتَيَا رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم في ذٰلك، فقال: "هو هٰذا — يَعْنِيْ مَسْجِدَهُ — وفي ذٰلكَ خَيْرٌ كَثِيْرٌ"

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

حدثنا أبوبكرٍ، عن عليِّ بنِ عبدِ اللّٰهِ، قال: سَأَلْتُ يَحييَ بنَ سعيدٍ: عَنْ مُحمدِ بنِ أبي يَحييَ الأَسْلَمِيِّ؟ فقال: لَمْ يَكُنْ بِهِ بَأْسٌ، وأخُوْهُ أُنَيْسُ بنُ أبي يَحييَ أَثْبَتُ مِنْهُ.

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: قبیلہ خُدرۃ کے ایک شخص اور قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے ایک شخص کے درمیان لمسجد أسس کے مصداق میں بحث ہوئی۔ خدری نے کہا: رسول اللہ ﷺ کی مسجد مراد ہے اور دوسرے شخص نے کہا: مسجد قبا مراد ہے وہ دونوں اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ آپؐ نے فرمایا: "وہ یہ مسجد ہے اور اس (مسجد قبا) میں خیر کثیر ہے" —— یحییٰ قطان سے علی بن المدینی نے دریافت کیا کہ محمد بن ابی یحییٰ اسلمی کیسا راوی ہے؟ قطان رحمہ اللہ نے فرمایا: اس میں کچھ حرج نہیں یعنی ٹھیک راوی ہے۔ اور اس کا بھائی اُنیس بن ابی یحییٰ اس سے مضبوط راوی ہے (اس حدیث میں یہی انیس راوی ہے)

بَابُ مَاجَاءَ فِی الصَّلاۃِ فِی مَسْجِدِ قُبَا

مسجد قبا میں نماز پڑھنے کی فضیلت

قبا مدینہ سے تین چار میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں تھا۔اب وہ مدینہ میں شامل ہو گیا ہے ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پہلے یہاں قیام فرمایا تھا۔آپ چودہ دن یہاں ٹھہرے ہیں۔اس مدت میں ایک مسجد تعمیر کی گئی جس میں آپؐ نے خود حصہ لیا،اس کو مسجد قبا کہا جاتا ہے۔

انبیاء کی تعمیر کردہ مسجدیں:

دنیا میں صرف چار مسجدیں ایسی ہیں جو بالیقین انبیاء کی تعمیر کردہ ہیں: مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصی اور مسجد قبا۔ چنانچہ احادیث میں ان چار مساجد میں نماز پڑھنے کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے۔اور صحیح حدیث میں مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کا ثواب ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے۔اور بیت المقدس میں پانچ سو نمازوں کے برابر ہے۔اور ایک دوسری روایت میں مسجد نبوی کا ثواب پچاس ہزار اور مسجد اقصی میں نماز کا ثواب پچیس ہزار ہے۔یہ حدیث علامہ سمہودی رحمہ اللہ کی وفاء الوفاء میں ہے اور ضعیف ہے۔اور ایک روایت میں بیت المقدس میں نماز پڑھنے کا ثواب بھی پچاس ہزار نمازوں کے بقدر آیا ہے اور یہ حدیث ابن ماجہ میں ہے اور ضعیف ہے۔اور مسجد قبا کے بارے میں اس باب میں یہ حدیث ہے کہ اس میں نماز پڑھنا عمرہ کے برابر ہے۔اس حدیث کا بظاہر یہ مطلب ہے کہ عمرہ کرنے کا ثواب اور مسجد قبا میں دو رکعت پڑھنے کا ثواب برابر ہے۔مگر صحیح مطلب یہ ہے کہ مذکورہ حدیث میں نسبت کا بیان ہے یعنی ثواب کے لحاظ سے جو نسبت عمرہ کو حج کے ساتھ حاصل ہے وہی نسبت مسجد قبا کو مسجد نبوی کے ساتھ حاصل ہے۔یعنی جس طرح حج کا ثواب زیادہ ہے اور عمرہ کا کم اسی طرح مسجد قبا میں نماز پڑھنے کا ثواب مسجد نبوی میں نماز پڑھنے سے کم ہے مگر کتنا کم ہے یہ بات معلوم نہیں۔

[۱۲۸] باب ماجاء فی الصلاۃ فی مسجد قبا

[۳۲۴-] حدثنا محمدُ بنُ العَلاَءِ أبو کُرَیْبٍ، وسفیانُ بنُ وکیعٍ، قالا: نا أبو أُسامَۃَ، عن عبدِ الحمیدِ بنِ جَعْفَرٍ، نا أبو الأَبْرَدِ مَوْلٰی بَنِی خَطْمَۃَ، أنَّہٗ سَمِعَ أُسَیْدَ بنَ ظُہَیْرٍ الأَنْصارِیَّ — وکان مِن أصحابِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم — قال: " الصَّلاۃُ فِیْ مَسْجِدِ قُبَا کَعُمْرَۃٍ"

وفی الباب: عَنْ سَہْلِ بنِ حُنَیْفٍ. قال: حدیثُ أُسَیْدٍ حدیثٌ حسنٌ غریبٌ؛ ولا نَعْرِفُ لِأُسَیْدِ بنِ

ظُهَيرٍ شَيْئًا يَصِحُّ غَيْرَ هٰذَا الحَدِيثِ؛ وَلاَ نَعْرِفُهُ إِلاَّ مِن حَدِيثِ أَبِي أُسَامَةَ، عَن عبدِ الحميدِ بنِ جَعْفَرٍ.
وأبو الأَبْرَدِ: اسْمُهُ زِيَادٌ، مَدِينِيٌّ.

وضاحت: حضرت اُسید بن ظہیر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ابن ماجہ میں بھی ہے وہاں عبارت اس طرح ہے: إنه سمع أُسيدَ بن ظهير ـ وكان من أصحاب النبيِّ صلى الله عليه وسلم ـ يُحدِّث عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال إلخ۔ غرض یہ حدیث مرفوع ہے ـــــ اور حضرت اُسید تنہا اسی ایک حدیث کے راوی ہیں۔ اور یہ غریب حدیث ہے کیونکہ اس کو صرف ابواسامہ نے روایت کیا ہے۔ اور ابوالابرد کا نام امام ترمذی رحمہ اللہ نے زیاد بتایا ہے اور وہ مدینہ کے باشندے تھے۔ حافظ رحمہ اللہ کا خیال یہ ہے کہ امام ترمذی کو ایک دوسرے نام سے دھوکا ہوا ہے اور یہ راوی نام کے اعتبار سے غیر معروف ہے۔ اور حاکم نے اس راوی کا نام موسیٰ بن سلیم بتایا ہے (تہذیب ۳:۳۹۰)

بابُ مَاجَاءَ فِي أَيِّ المَسَاجِدِ أَفْضَلُ

کونسی مسجد سب سے افضل ہے؟

اس باب میں دو حدیثیں ہیں:
پہلی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری اس مسجد (مسجد نبوی) میں نماز پڑھنا دیگر مساجد میں ہزار نمازوں سے بہتر ہے، مگر مسجد حرام مستثنیٰ ہے (وہاں ایک نماز پڑھنا دیگر مساجد میں ایک لاکھ نمازوں سے بہتر ہے)

تشریح: ان مساجد میں ثواب کی زیادتی بانیوں کی برکت سے ہے۔ اور نمازیوں کی کثرت وقلت بھی تفاضل کا باعث ہے۔ مسجد حرام میں لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے۔ اور مسجد نبوی میں نمازی لاکھ دولاکھ سے کم نہیں ہوتے اور مسجد اقصی میں بھی بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ اسی طرح کس مسجد میں کس پیغمبر نے کتنا عرصہ عبادت کی ہے اس کا بھی فضیلت میں اور اس کی کمی بیشی میں دخل ہے۔ مسجد حرام میں تمام نبیوں اور رسولوں نے عبادت کی ہے اس لئے اس کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ اور مسجد نبوی میں دس سال تک مسلسل آنحضرت ﷺ نے قیام فرمایا ہے اور وہاں شب وروز عبادت کی ہے، اس لئے اس کا دوسرا نمبر ہے۔ اور مسجد اقصی میں انبیائے بنی اسرائیل نے عبادتیں کی ہیں اس لئے اس کا تیسرا نمبر ہے۔ اور قبا میں رسول اللہ ﷺ نے چودہ قیام فرمایا ہے، پھر گاہ بہ گاہ تشریف لے جاتے تھے اس لئے اس کا چوتھا نمبر ہے۔

اور علماء نے فرمایا ہے کہ یہ ثواب فرضوں کا ہے نفلوں کا نہیں ہے اور دلیل یہ ہے کہ آنحضور ﷺ خود نفلیں گھر میں ادا فرماتے تھے اور صحابۂ کرام کو بھی آپ نے اس کی ترغیب دی تھی۔ اگر یہ ثواب غیر فرض کے لئے بھی ہوتا تو آپ سنن ونوافل مسجد میں پڑھتے اور صحابہ کو بھی اس کی ترغیب دیتے۔ علاوہ ازیں نمازیوں کی جو کثرت وقلت فضیلت کا

باعث ہے وہ بھی فرض نماز ہی میں متحقق ہے۔

نیز علماء نے یہ بات بھی بیان کی ہے کہ ان مساجد میں نماز ادا کرنے کا جو ثواب مروی ہے وہ مردوں کے لئے ہے۔ عورتوں کے لئے مکہ اور مدینہ میں بھی گھر میں نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے۔ حضرت ام حمید رضی اللہ عنہا نے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا تھا کہ مجھے آپ کے ساتھ نماز پڑھنے کا شوق ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا شوق بہت اچھا ہے مگر تمہاری نماز کوٹھری کے اندر کمرے کی نماز سے بہتر ہے۔ اور کمرے کی نماز گھر کے احاطے کی نماز سے بہتر ہے اور گھر کے احاطے کی نماز محلہ کی مسجد کی نماز سے بہتر ہے اور محلہ کی مسجد کی نماز میری مسجد کی نماز سے بہتر ہے''۔ اس حدیث سے یہ بات صاف معلوم ہوئی کہ مسجد نبوی اور مسجد حرام وغیرہ کا مذکورہ ثواب مردوں کے لئے ہے عورتوں کے لئے مکہ اور مدینہ میں بھی گھر میں نماز ادا کرنے کا ثواب اس سے کہیں زیادہ ہے (الترغیب والترہیب ۱: ۱۷۸)

ملحوظہ: مگر ہم جب حج یا عمرہ کے لئے جاتے ہیں تو یہ بات عورتوں کو نہیں بتاتے، ان کو حرمین میں نماز پڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں، کیونکہ بے چاری زندگی بھر کی تمنا لے کر جاتی ہیں اور گھر میں نماز پڑھنے کو کہا جائے گا تو سست پڑی رہیں گی۔ اس لئے ان کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت حرمین میں گذارنا ہی مفید ہے۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کجاوے نہ کسے جائیں یعنی مضبوط نہ باندھے جائیں یعنی لمبا سفر نہ کیا جائے مگر تین مسجدوں کی طرف: مسجد حرام، مسجد اقصی اور میری یہ مسجد''

تشریح: کسی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے لمبا سفر کر کے جانا یا اولیاء کی قبروں کی زیارت کے لئے جانا، یا کسی ولی کے تکیہ (بزرگ کے رہنے اور عبادت کرنے کی جگہ) کی زیارت کے لئے جانا یا کسی اور متبرک مقام کی زیارت کے لئے سفر کرنا مختلف فیہ ہے۔ بعض مباح کہتے ہیں اور بعض حرام۔ قائلین اباحت کہتے ہیں کہ اس حدیث کا مقصد ان جگہوں کا مہتم بالشان ہونا بیان کرنا ہے اس لئے ان تین مساجد کی طرف سفر کر کے نماز پڑھنے کے لئے جانے کی ترغیب دی کیونکہ یہ متبرک جگہیں ہیں۔ پس اگر لوگ سفر کی زحمت اٹھائیں تو ان تین مقامات میں حاضری کے لئے اٹھائیں، ان کے علاوہ کے لئے بارِ مشقت اٹھانا بے فائدہ ہے۔ اس حدیث کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ان مقامات کے علاوہ کہیں سفر کر کے جانا جائز نہیں۔

اور دوسری رائے یہ ہے کہ خواہ مسجدیں ہوں یا اولیاء کی قبریں یا کسی ولی کا تکیہ یا کوئی اور متبرک جگہ سب کی طرف لمبا سفر کر کے جانا ممنوع ہے، اس لئے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ ایسے مقامات کی زیارت کے لئے اور برکتیں حاصل کرنے کے لئے جاتے تھے جو ان کے گمان میں معظم ومحترم ہوتی تھیں۔ اور یہ بات دین کی تحریف کا سبب تھی۔ اس لئے نبی ﷺ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ فساد کا دروازہ بند کر دیا کہ تین مساجد کے علاوہ حقیقی یا فرضی متبرک مقامات کے لئے سفر کرنا ممنوع ہے اور مقصد یہ ہے کہ غیر شعائر اللہ، شعائر کے ساتھ نہ مل جائیں اور یہ سلسلہ غیر اللہ کی عبادت کا

ذریعہ نہ بن جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہٗ کی یہی رائے ہے اور میرے نزدیک بھی یہی برحق ہے۔ کیونکہ حضرت بصرہؓ نے طور پر جانے سے منع کیا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ الواسعہ (۳:۴۴۴)

پھر ایک نیا مسئلہ قبر اطہر کی زیارت کے لئے سفر کے جواز وعدم جواز کا کھڑا ہوا۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس کے لئے بھی سفر کرنا ناجائز کہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی نیت سے سفر کرے پھر روضۂ اقدس پر بھی حاضری دے۔ مگر قبر اطہر کی نیت سے مستقل سفر نہ کرے۔ اور وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں: حدیث میں استثناء مفرغ ہے یعنی اس کا مستثنیٰ منہ مذکور نہیں اور قاعدہ ہے کہ استثنائے مفرّغ میں مستثنیٰ منہ عام مقدر مانا جاتا ہے۔ پس تقدیر عبارت ہوگی: لاتُشَدُّ الرِّحالُ إلی مکانٍ مَّا۔ یعنی کسی جگہ کا سفر نہ کیا جائے اور اس کے عموم میں قبر اطہر بھی شامل ہے، پس اس کی زیارت کے لئے بھی سفر کرنا جائز نہیں۔

اور جمہور امت کے نزدیک قبر اطہر کی زیارت کے لئے سفر کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ اہم عبادتوں میں سے ہے اور بڑا کار ثواب ہے۔ اور ابن تیمیہ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ بیشک استثنائے مفرغ میں مستثنیٰ منہ عام مقدر مانا جاتا ہے مگر وہ مستثنیٰ کی جنس سے ہوتا ہے پس تقدیر عبارت ہوگی: لا تُشَدُّ الرحالُ إلی مسجدٍ مَّا اور اس تقدیر کی دلیل ایک حدیث بھی ہے جو مسند احمد (۳:۶۴) میں ہے۔ مسند احمد میں شہر بن حوشب کی یہی حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ مروی ہے: لاَیَنْبَغِیْ للمَطِیِّ أن تُشَدَّ رحالُه إلی مسجدٍ یَبْتَغِی فیه الصلاۃَ غیرَ المسجدِ الحرامِ والمسجدِ الأقصی ومسجدی هذا۔ اور شہر بن حوشب میں اگرچہ کلام ہے مگر مجمع الزوائد (۴:۳) میں صراحت ہے کہ ان کی حدیث حسن کے درجہ کی ہوتی ہے۔ غرض اس حدیث میں مستثنیٰ منہ مصرح ہے اور إلی مکانٍ مَّا تو مقدر مانا ہی نہیں جاسکتا، ورنہ تجارت کے لئے اور مریض کے علاج کے لئے دور دراز کا سفر کرنا بھی ممنوع ہو جائے گا۔

اور جمہور امت نے اصل استدلال تعامل امت سے کیا ہے کہ دور صحابہ سے آج تک ہر حاجی مکہ کا ایک لاکھ نمازوں کا ثواب چھوڑ کر چار سو میل کا طویل سفر کر کے مدینہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حجاج صرف مسجد نبوی کی زیارت کے لئے نہیں جاتے بلکہ قبر اطہر پر حاضری مقصود ہوتی ہے۔ غرض قبر اطہر کا معاملہ ایک استثنائی صورت ہے، جیسے گھر میں تدفین حدیث کی رو سے ممنوع ہے مگر آپ کی تدفین اس سے مستثنیٰ ہے اور قبروں اور تکیوں کے لئے طویل سفر کا عدم جواز تنقیح مناط کے ذریعہ ہے، حضرت ابو بصرۃ رضی اللہ عنہ نے طور کے سفر کو حدیث کے ذیل میں لیا ہے کمافی الموطا، والتفصیل فی رحمۃ اللہ الواسعہ واللہ اعلم

فائدہ (۱): ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے زندگی بھر بدعات وخرافات سے ٹکر لی ہے اور دمشق، شام اور مصر ان کے کام کا میدان رہا ہے، اور ان کے مزاج میں تیزی تھی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اولیاء کی قبروں اور متبرک مقامات کی زیارت کے لئے طویل سفر کرتے ہیں اور وہاں پہنچ کر کردنی ناکردنی کرتے ہیں تو انھوں نے ردعمل میں قبر اطہر کی

زیارت کے لئے سفر کرنے کو بھی ناجائز کہہ دیا۔ ہندوستان بھی بدعات وخرافات سے بھرا پڑا تھا، ہمارے اکابر کی سوا سو سالہ محنت سے اس کی حالت میں کافی حد تک سدھار پیدا ہوا ہے مگر اب بھی آدھے سے زیادہ ہندوستان بدعات کی تاریکیوں میں سرگرداں ہے۔ مگر ہمارے اکابر کے مزاج میں اعتدال تھا۔ چنانچہ انھوں نے ردعمل میں کبھی کوئی مسئلہ نہیں بگاڑا، قرآن وحدیث کی رُو سے جو جائز تھا اسے جائز کہا اور اس کی پرواہ نہیں کی کہ کسی بات کو جائز کہنے کی صورت میں کن مشکلات کا سامنا کرنے پڑے گا بہر حال اپنے اکابر کے نزدیک قبر اطہر کی زیارت کے لئے طویل سفر نہ صرف جائز ہے بلکہ اعظم قربات سے ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے۔ اور یہ قبور اولیاء سے استثنائی صورت ہے۔ واللہ اعلم

فائدہ (۲): اسی طرح جب ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بدعتیوں کو قبروں سے استمداد کرتے دیکھا تو انھوں نے توسُّل کے مسئلہ کو بگاڑ دیا۔ وہ فرماتے ہیں: صرف زندوں کا توسل جائز ہے مردوں کا توسل جائز نہیں۔ اور وہ بخاری کی ایک حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں جب نماز استسقاء کے بعد دعا کرتے تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا توسل کرتے (بخاری حدیث ۱۰۱۰ باب سؤال الناس الخ) ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا: اگر مرے ہوئے بزرگوں کا توسل جائز ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کو چھوڑ کر حضرت عباس کا توسل کیوں کرتے؟ مگر ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے سامنے صحیح صورتِ حال نہیں ہے یا انھوں نے اس سے اغماض کیا ہے۔ علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ نے عمدۃ القاری (۳۲:۷) میں صحیح صورتِ حال اس طرح بیان کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز استسقاء میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے دعا کراتے تھے۔ پس اس حدیث میں توسّل کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ علامہ عینی نے یہ روایت بھی ذکر کی ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی جب کوئی لشکر روانہ کرتے تو حضرت عباسؓ سے فتح ونصرت کی دعا کراتے تھے۔ اور ہمارے اکابر کے نزدیک جس طرح اعمال صالحہ اور احیاء کا توسّل جائز ہے اموات کا توسل بھی جائز ہے۔ بلکہ احیاء کی بہ نسبت بدرجۂ اولیٰ جائز ہے۔ کیونکہ زندہ فتنوں سے محفوظ نہیں اور جس کا ایمان پر بالیقین خاتمہ ہوگیا جیسے نبی ﷺ ان کا توسّل بدرجۂ اولیٰ جائز ہے (یہ یاد رہے کہ توسّل صرف جائز ہے فرض واجب یا مستحب نہیں اس لئے عام طور پر دیوبندیوں میں توسل کرنے کا رواج نہیں)

[۱۲۹] باب ماجاء فی أیِّ المساجِد أفضلُ؟

[۳۳۵-] حدثنا الأنصارِیُّ، نا مَعْنٌ، نا مالِكٌ، ح: وحدثنا قُتَیْبَةُ، عن مالكٍ، عن زیدِ بنِ رَبَاحٍ، وعُبَیْدِ اللهِ بنِ أبی عبدِ اللهِ الأغرِّ، عن أبی عبدِ اللهِ الأغرِّ، عن أبی هریرةَ: أنَّ رسولَ الله صلی الله علیه وسلم قال: "صَلَاةٌ فی مَسْجِدِیْ هٰذَا خَیْرٌ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِیْمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ"

قال أبو عيسى: ولم يَذْكُرْ قُتَيْبَةُ في حديثه عن عبيدِالله، وإنَّما ذَكَرَ عن زَيْدِ بنِ رباحٍ، عن أبي عَبدِ الله الأغرِّ.

قال: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وأبو عبد الله الأغرُّ: اسمُه سَلْمَانُ.

وقد رُوِيَ عَن أبي هُريرةَ مِن غَيْرِ وَجْهٍ عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

وفي البابِ: عن عليٍّ، ومَيْمُونَةَ، وأبي سعيدٍ، وجُبَيْرِ بنِ مُطْعِمٍ، وعبدِاللهِ بنِ الزُّبَيْرِ، وابنِ عُمَرَ، وأبي ذَرٍّ.

[۳۳٦-] حدثنا ابنُ أبي عُمَرَ، أخبرنا سفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ، عن عبدِ الملكِ بنِ عُمَيْرٍ، عن قَزَعَةَ، عن أبي سعيدٍ الخدريِّ، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: " لاتُشَدُّ الرِّحَالُ إلاَّ إلى ثَلاثةِ مَسَاجِدَ: مَسْجِدِ الحَرَامِ، ومَسْجِدِيْ هٰذَا، ومَسْجِدِ الأقْصٰى"

قال: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وضاحت: حدیث (۳۳۵) کی سند میں امام مالکؒ کے دو استاذ ہیں: ایک: زید بن رباح، دوسرے: عبداللہ۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ دو استاذ معن کی سند میں ہیں قتیبہ کی سند میں صرف زید بن رباح ہیں جو ابوعبداللہ الاغرؒ سے روایت کرتے ہیں اور ابوعبداللہ الاغرؒ کا نام سلمان ہے اور یہ حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعدد اسانید سے مروی ہے۔

بابُ مَاجَاءَ فِي المَشْيِ إِلَى الْمَسْجِدِ

مسجد کی طرف باوقار چلنے کا بیان

جب جماعت کھڑی ہوجاتی ہے یا رکعت فوت ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو بعض لوگ دوڑتے ہوئے آتے ہیں اس میں مسجد کی بے توقیری ہے۔ اگر کسی اونچی جگہ سے اس حالت کا نظارہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوگا جیسے اصطبل سے گھوڑے چھٹے ہیں اور بے تحاشہ دوڑے چلے جارہے ہیں۔ یہ بات مسجد کی شایانِ شان نہیں۔ اس لئے نمازیوں کو اس بات کا حکم دیا گیا کہ وہ باوقار اور سنجیدگی کے ساتھ چلتے ہوئے آئیں۔ دوڑتے ہوئے نہ آئیں۔ پھر اگر وہ رکعت کو پالیں تو فبہا ورنہ جو حصہ فوت ہوگیا اس کی قضا کرلیں۔ غرض شریعت نے یہاں دفع مضرت کا یعنی مسجد کی حرمت کا لحاظ کیا ہے۔ جلب منفعت کا یعنی لوگوں کے فائدہ کا لحاظ نہیں کیا، کیونکہ جہاں جلب منفعت اور دفع مضرت میں تعارض ہوتا ہے وہاں دفع مضرت کو مقدم کیا جاتا ہے۔ البتہ بعض علماء نے لپک کر چلنے کی یعنی فطری چال سے ذرا تیز چلنے کی اجازت دی ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب نماز کھڑی کی جائے یعنی اقامت شروع ہوجائے تو آپ لوگ نماز

میں دوڑتے ہوئے نہ آئیں، بلکہ چلتے ہوئے آئیں۔ اور اطمینان کو لازم پکڑیں۔ یعنی باطمینان چلتے ہوئے آئیں۔ پس نماز کا جو حصہ پالیں اُسے پڑھ لیں۔ اور جو حصہ فوت ہوجائے اُسے بعد میں مکمل کرلیں"

تشریح: اس حدیث میں یزید بن زُریع نے ابن شہاب زہری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے درمیان ابو سلمۃ کا واسطہ ذکر کیا ہے اور عبدالرزاق نے دونوں کے درمیان سعید بن المسیب کا واسطہ بیان کیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے عبدالرزاق کی حدیث کو اصح قرار دیا ہے کیونکہ سفیان ثوری ان کے متابع ہیں۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ دونوں واسطے صحیح ہیں، یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ابوسلمۃ اور سعید بن المسیب دونوں اس حدیث کو روایت کرتے ہیں اور ابن شہاب زہری نے دونوں حضرات سے یہ حدیث سنی ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے بخاری شریف میں اس حدیث میں دونوں واسطے جمع کئے ہیں (بخاری حدیث ۹۰۸ باب المشی إلی الجمعة)

[۱۳۰] باب ماجاء في المَشْيِ إلى المسجد

[۳۳۷-] حدثنا محمدُ بنُ عبدِ الملكِ بنِ أبي الشَّوَارِبِ، نا يزيدُ بنُ زُرَيْعٍ، نا مَعْمَرٌ، عن الزُّهْرِيِّ، عن أبي سَلَمَةَ، عن أبي هريرةَ، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم:" إِذَا أُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَلَاتَأْتُوْهَا وَأَنْتُمْ تَسْعَوْنَ، ولكنِ ائْتُوْهَا وَأَنْتُمْ تَمْشُوْنَ، وعَلَيْكُمُ السَّكِيْنَةُ، فَمَاأَدْرَكْتُمْ فَصَلُّوْا، ومَا فَاتَكُمْ فَأَتِمُّوْا"

وفي الباب: عن أبي قتادةَ، وأُبَيِّ بنِ كَعْبٍ، وأبي سعيدٍ، وزيدِ بنِ ثابتٍ، وجابرٍ، وأنسٍ.

قال أبو عيسى: اختَلَفَ أهلُ العلمِ في المَشْيِ إلى المسجدِ: فَمِنْهُمْ مَنْ رَأَى الإِسْرَاعَ إِذَا خَافَ فَوْتَ التكبيرةِ الأُوْلَى، حَتّٰى ذُكِرَ عن بعضِهم أنه كانَ يُهَرْوِلُ إلى الصَّلَاةِ، ومِنْهُمْ مَنْ كَرِهَ الإِسْرَاعَ، واختَارَ أَنْ يَمْشِيَ على تُؤَدَةٍ وَوَقَارٍ؛ وبه يقولُ أحمدُ وإسحاقُ، وقالا: العَمَلُ على حديثِ أبي هريرةَ؛ وقال إسحاقُ: إِنْ خَافَ فَوْتَ التكبيرةِ الأُوْلَى فلا بأْسَ أن يُسْرِعَ في المَشْيِ.

حدثنا الحسنُ بنُ عليٍّ الخَلَّالُ، نا عبدُ الرزاقِ، نامَعْمَرٌ، عن الزُّهْرِيِّ، عن سعيدِ بنِ المُسَيِّبِ، عن أبي هريرةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم بحديثِ أبي سَلَمَةَ عن أبي هريرةَ بمعناهُ، هكذا قال عبدُ الرَّزَّاقِ عن سعيدِ بنِ المسيبِ، عن أبي هريرةَ، وهذا أَصَحُّ مِن حديثِ يَزِيْدَ بنِ زُرَيْعٍ.

حدثنا ابنُ أبي عُمَرَ، نا سفيانُ، عن الزُّهْرِيِّ، عن سعيدِ بنِ المَسَيِّبِ، عن أبي هريرةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم نَحْوَهُ.

ترجمہ: علماء نے مسجد کی طرف چلنے میں اختلاف کیا ہے: بعض نے اسراع کی یعنی لپکنے کی اجازت دی ہے جبکہ

تکبیر اولیٰ فوت ہونے کا اندیشہ ہو۔ یہاں تک کہ بعض علماء سے منقول ہے کہ وہ نماز کی طرف ہلکے دوڑ کر بھی جاتے تھے۔اور بعض علماء نے لپک کر چلنے کو ناپسند کیا ہے (پس ہرولہ تو بدرجہ اولیٰ ممنوع ہوگا) اور انھوں نے یہ بات پسند کی ہے کہ آدمی باطمینان اور وقار کے ساتھ چلے۔امام احمد واسحاق رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔اور دونوں نے کہا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر عمل ہونا چاہئے۔اور حضرت اسحاق نے فرمایا: اگر تکبیر اولیٰ فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو لپک کر چلنے میں حرج نہیں۔اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے عبد الرزاق کی سند پیش کی ہے پھر اپنا فیصلہ دیا ہے، پھر عبد الرزاق کے متابع حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کی سند پیش کی ہے۔

فائدہ: یہاں ایک ضمنی مسئلہ یہ ہے کہ مسبوق فوت شدہ نماز کو کس طرح ادا کرے؟ امام اعظم رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اس کی نماز کا شروع کا حصہ فوت ہوا ہے پس اگر ایک یا دو رکعت فوت ہوئی ہیں تو مسبوق ان کو بھری پڑھے گا اور تین فوت ہوئی ہیں تو وہ شروع کی دو بھری پڑھے گا اور تیسری میں صرف سورۂ فاتحہ پڑھے گا۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ مسبوق نے نماز کا آخری حصہ نہیں پایا۔شروع کا حصہ اس نے پڑھ لیا ہے کیونکہ اس نے تکبیر تحریمہ سے نماز شروع کی ہے پس ایک یا دو رکعت فوت ہونے کی صورت میں مسبوق کو ان میں صرف فاتحہ پڑھنی ہے اور تین فوت ہوئی ہوں تو پہلی بھری پڑھے اور آخری دو خالی پڑھے۔

اور اختلاف کی بنیاد وہ بات ہے جو پیچھے بیان کی جا چکی ہے کہ ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک امام واسطہ فی العروض ہے۔نماز کے ساتھ حقیقۃً وہی متصف ہوتا ہے اور مقتدی بالعرض اور مجازاً متصف ہوتا ہے۔پس جب امام کی نماز کا شروع کا حصہ مقتدی کے ہاتھ سے نکل گیا تو گویا مقتدی نے اس حصہ کو پڑھا ہی نہیں اس لئے سلام پھیرنے کے بعد اُسے شروع ہی کا حصہ پڑھنا ہے۔لہٰذا اگر ایک رکعت فوت ہوئی ہے تو اس میں فاتحہ اور سورت دونوں پڑھنی ضروری ہیں۔اور امام شافعی رحمہ اللہ نے امام کو واسطہ فی الثبوت مانا ہے یعنی ان کے نزدیک امام اور مقتدی دونوں نماز کے ساتھ حقیقۃً متصف ہیں اور چونکہ مقتدی نے تکبیر تحریمہ سے نماز شروع کی ہے اس لئے اس نے شروع کی رکعتیں پڑھ لی ہیں۔لہٰذا وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد جو ایک رکعت رہ گئی ہے اس کو خالی پڑھے گا کیونکہ وہ آخری رکعت ہے۔

اور امام مالک اور امام محمد رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ حقِ قول میں یعنی قراءت میں مسبوق کی شروع کی نماز فوت ہوئی ہے پس اگر ایک یا دو رکعت رہ گئی ہیں تو وہ بھری پڑھے گا۔اور حقِ فعل میں یعنی قعدہ کے حق میں اس نے آخری کی نماز نہیں پڑھی ہے لہٰذا اگر امام کے ساتھ اس نے صرف ایک رکعت پائی ہے تو وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد ایک رکعت پڑھ کر قعدہ کرے گا کیونکہ فرائض میں ہر دو رکعت پر قعدہ ہے۔اور وہ اس رکعت کو بھری پڑھے پھر قعدہ سے فارغ ہو کر پہلی رکعت بھری ہوئی اور دوسری خالی پڑھے۔اسی طرح اگر مغرب میں دو رکعت فوت ہوئی ہیں تو مسبوق امام کے سلام کے بعد پہلی رکعت کے بعد قعدہ کرے پھر دوسری پڑھے اور دونوں بھری پڑھے احناف کے یہاں فتویٰ امام

محمد رحمہ اللہ کے قول پر ہے۔

بابُ ماجاء في القُعُودِ في المسجد وانْتِظَارِ الصَّلَاةِ من الفَضْلِ

مسجد میں بیٹھنے اور نماز کا انتظار کرنے کا ثواب

جو شخص مسجد سے چمٹا رہے اور اس میں ٹھیر کر نماز کا انتظار کرے اس کے لئے فضیلت یہ ہے کہ وہ حکماً نماز میں ہے۔ اس لئے کہ منتظرِ صلاۃ بحکم صلاۃ ہے۔ یہ طے شدہ ضابطہ ہے۔ فرشتے اس کے لئے برابر بخشش ورحمت کی دعا کرتے ہیں۔ اور وہ شخص جو مسجد میں موجود تو نہیں، گھر پر یا کھیت میں یا کسی اور کام میں مشغول ہے مگر اُسے نماز کا انتظار ہے تو اس کے لئے بھی فضیلت ہے۔ متفق علیہ حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میدان حشر میں اللہ تعالیٰ سات قسم کے لوگوں کو اپنا سایہ عنایت فرمائیں گے جبکہ اللہ کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو فرض پڑھ کر مسجد سے نکلا مگر اس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہے یعنی اُسے اگلی نماز کا انتظار ہے۔

(مشکوۃ حدیث ۷۰۱)

[۱۳۱] باب ماجاء في القُعُوْدِ في المسجد وانْتِظَارِ الصلاة من الفضل

[۳۳۸-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، نا عبدُ الرَّزَّاقِ، نا مَعْمَرٌ، عن هَمَّامِ بنِ مُنَبِّهٍ، عن أبي هريرةَ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " لَايَزَالُ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاةٍ مَادَامَ يَنْتَظِرُهَا، ولا تَزَالُ الْمَلَائِكَةُ تُصَلِّي عَلَى أَحَدِكم مادامَ في المسجدِ: اللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهُ، اللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ، مَالَمْ يُحْدِثْ" فقال رَجُلٌ مِن حَضْرَ مَوْتَ: وما الحَدثُ يَا أَبَا هريرةَ؟ فقال: فُسَاءٌ أو ضُرَاطٌ.

وفي البابِ: عن عليٍّ، وأبي سعيدٍ، وأنسٍ، وعبدِ اللهِ بنِ مسعودٍ، وسهل بن سعدٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ أبي هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ایک شخص برابر نماز میں رہتا ہے جب تک کہ وہ نماز کا انتظار کرتا ہے اور ملائکہ اس کے لئے برابر دعا میں لگے رہتے ہیں جب تک کہ وہ مسجد میں رہتا ہے (وہ یہ دعا کرتے ہیں) الٰہی! اس بندہ پر رحمت خاص نازل فرما۔ الٰہی! اس پر مہربانی فرما۔ جب تک وہ کوئی نئی بات پیدا نہ کرے'' (یا جب تک وہ ہگ نہ دے) حضر موت کے ایک طالب علم نے پوچھا: نئی بات پیدا کرنا کیا ہے؟ (یا مسجد میں ہگ دینے کی صورت کیا ہے؟) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: گوز یا پاد (یعنی مسجد میں بے آواز یا آواز کے ساتھ ہوا خارج کرنا حدث (نئی بات پیدا) کرنا ہے۔ بندے کی یہ حرکت فرشتوں کی دعا سے محرومی کا سبب بن جاتی ہے)

بابُ ماجاء فی الصَّلاۃِ عَلَی الْخُمْرَۃِ

چٹائی وغیرہ پرنماز پڑھنے کابیان

یہ تین باب ہیں، تینوں میں یہ مسئلہ ہے کہ کوئی چیز بچھا کراس پرنماز پڑھنا جائز ہے یانہیں؟ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں: فرض نماز میں زمین پریازمین کی جنس پرسجدہ کرنا ضروری ہے۔ اورزمین کی جنس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو جلانے سے نہ جلیں، جیسے اینٹ اور پتھر وغیرہ، اور جوچیزیں آگ میں جل جاتی ہیں وہ زمین کی جنس سے نہیں ہیں، مثلاً چٹائی اور کپڑا وغیرہ۔ لہٰذا ان پراس طرح فرض نماز پڑھنا کہ سجدہ بھی انہی چیزوں پرکیا جائے صحیح نہیں، البتہ نفلوں میں گنجائش ہے، ان میں سجدہ زمین کی جنس پربھی ہوسکتا ہے اور غیرجنس پربھی۔ اوردیگر ائمہ کے نزدیک فرض نماز میں بھی زمین پریازمین کی جنس پرسجدہ کرنا نہ تو فرض ہے اور نہ مستحب، بلکہ ہرچیز پرسجدہ کرنا جائز ہے۔ اس لئے کہ صحیح احادیث میں فرض اور نفل میں فرق کئے بغیر رسول اللہ ﷺ سے خُمرہ یعنی چھوٹی چٹائی پر اور بساط یعنی بڑی چٹائی پر اور دیگر بچھونوں پرنماز پڑھنا ثابت ہے —— خُمرۃ: اس چھوٹی چٹائی کوکہتے ہیں جوعام طور پرگھروں میں بیٹھنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی اتنی چھوٹی چٹائی جس پرکھڑا ہونا اورسجدہ کرنا مشکل ہو۔ اگراس پرکھڑے ہوں توسجدہ زمین پرہو اوراس پرسجدہ کریں توکھڑا زمین پرہو، ایسی چھوٹی چٹائی کوخمرۃ کہتے ہیں۔

[۱۳۲] باب ماجاء فی الصلاۃِ عَلَی الْخُمْرَۃِ

[۳۳۹-] حدثنا قُتَیبةُ، نا أبو الأَحْوَصِ، عن سِمَاكِ بنِ حَرْبٍ، عن عِكْرِمَةَ، عن ابنِ عباسٍ، قال: كان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يُصَلِّی عَلَى الْخُمْرَةِ.

وفی الباب: عن أُمِّ حَبِيبَةَ، وابنِ عُمَرَ، وأُمِّ سَلَمَةَ، وعائشةَ، ومَيْمُونَةَ، وأُمِّ كُلْثُومٍ بنتِ أبی سَلَمَةَ بنِ عبدِ الأَسَدِ؛ ولَمْ تَسْمَعْ مِنَ النبیِّ صلى الله عليه وسلم.

قال أبو عيسى: حديثُ ابن عباسٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وبه يقولُ بعضُ أهلِ العلمِ؛ وقال أحمدُ وإسحاقُ: قد ثَبَتَ عن النبیِّ صلى الله عليه وسلم الصلاةُ عَلَى الْخُمْرَةِ؛ قال أبو عيسى: والخُمْرَةُ: هُوَ حَصِيرٌ صَغِيرٌ.

وضاحت: ام کلثوم بنت ابی سلمۃ آنحضور ﷺ کی ربیبہ ہیں یعنی ان کی پرورش رسول اللہ ﷺ کے گھر میں ہوئی ہے کیونکہ ان کی والدہ ازواج مطہرات میں سے ہیں اوررسول اللہ ﷺ کے انتقال کے وقت وہ اتنی چھوٹی تھیں کہ اس عمر کا سماع صحیح نہیں۔

بابُ ماجاء في الصَّلاَةِ عَلَى الحَصِيْرِ

حدیث: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چٹائی پر نماز پڑھی ——
حصیر: چٹائی کے مصلّے کو کہتے ہیں۔ یعنی جس پر کھڑا ہونا اور اس پر سجدہ کرنا ممکن ہو۔

[۱۳۳] باب ماجاء في الصلاةِ عَلَى الْحَصِيْرِ

[۳۴۰-] حدثنا نَصْرُ بْنُ عَلِيٍّ، نا عيسىَ بْنُ يُوْنسَ، عن الأَعْمَشِ، عن أَبي سفيانَ، عن جابرٍ، عن أبي سعيدٍ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم صَلَّى عَلَى حَصِيْرٍ.

وفي الباب: عن أنسٍ، والمغيرةِ بنِ شُعْبَةَ.

قال أبو عيسى: وحديثُ أبي سعيدٍ حديثٌ حسنٌ؛ والعملُ عَلَى هذا عندَ أكثر أهلِ العلمِ، إلا أن قوماً من أهل العلم اختاروا الصلاةَ عَلَى الأَرْضِ استحبابًا.

قوله: إلا أن قوماً سے امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کی طرف اشارہ ہے، ان کے یہاں نوافل میں زمین پر سجدہ کرنا مستحب ہے اور فرائض میں واجب...... اور جابر: حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ حدیث مسلم شریف میں بھی ہے۔

بابُ ماجاء في الصَّلاَةِ عَلَى البُسُطِ

البُسُط: بِساط کی جمع ہے اس کے معنی ہیں: بچھونا۔ یہ لفظ عام ہے، چٹائی یا کپڑے کا مصلّی یا رومال وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اور اس باب میں جو حدیث ہے وہ پہلے (۱:۵۶۴) گذری ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی دادی حضرت ملیکہ رضی اللہ عنہا نے آنحضور ﷺ کی دعوت کی تھی اور آپؐ نے کھانا تناول فرمانے کے بعد برکت کے لئے نفل نماز پڑھنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک پرانی چٹائی جو کثرتِ استعمال سے میلی ہوگئی تھی، اچھی طرح دھوکر صاف کی اور اس کو بچھایا۔ نبی ﷺ نے اس پر کھڑے ہوکر دو رکعت نفل پڑھائیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ کا ہمارے گھرانے کے ساتھ اتنا میل جول تھا کہ گھر کے چھوٹے بچوں کے ساتھ آپؐ دل لگی فرماتے تھے۔ میرا ایک چھوٹا بھائی تھا جو ہمیشہ اپنی چڑیا کے ساتھ مشغول رہتا تھا ایک دن نبی ﷺ نے اس کو مغموم دیکھا تو پوچھا: یہ بچہ مغموم کیوں ہے؟ گھر والوں نے بتایا کہ اس کی چڑیا مرگئی ہے۔ اس کے بعد جب بھی نبی ﷺ ہمارے گھر تشریف لاتے تو اس بچہ کو چھیڑتے اور فرماتے: ''اے ابوعُمیر! تیری بلبل کیا ہوئی؟'' بچے کو اپنی چڑیا یاد آجاتی اور وہ ہشاش بشاش ہوجاتا —— لفظوں کو ہم وزن کرنے کے لئے آپؐ

نے نُغَیر کی مناسبت سے أبو عُمیر اس کی کنیت رکھی تھی۔ یہ لفظ عُمَر کی تصغیر ہے یعنی تھوڑی زندگی والا چنانچہ وہ بچہ بچپن ہی میں مرگیا۔ بڑوں کے منہ سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

[۱۳٤] باب ماجاء في الصلاةِ عَلَى البُسُطِ

[۳٤۱-] حدثنا هَنَّادٌ، ناوكيعٌ، عن شُعْبَةَ، عن أبي التَّيَّاحِ الضُّبَعِيِّ، قال: سَمعتُ أنس بنَ مالكٍ يقول: كان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يُخَالِطُنَا حتى كان يقولُ لِأَخٍ لي صغيرٍ: "يا أبا عُمَيْرٍ ما فَعَلَ النُّغَيْرُ؟" قال: ونُضِحَ بِسَاطٌ لَنَا فَصَلَّى عليه.

وفي البابِ: عن ابنِ عباسٍ؛ قال أبو عيسى: حديثُ أنسٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

والعملُ عَلٰى هذا عند أكثرِ أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم ومَنْ بَعدَهُمْ ولم يَرَوْا بالصَّلَاةِ عَلَى البِسَاطِ والطَّنْفُسَةِ بَأسًا؛ وبه يقولُ أحمدُ وإسحاقُ.

واسمُ أبي التَّيَّاحِ: يَزِيدُ بنُ حُمَيْدٍ.

لغت: طَنْفُسَة قالین کے پتلے مصلّے کو کہتے ہیں۔

بابُ ماجاء في الصَّلَاةِ في الحِيْطَانِ

باغ میں نماز پڑھنے کا بیان

حدیث: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ باغ میں نماز پڑھنے کو پسند کرتے تھے۔

تشریح: حِیْطَان: حائط کی جمع ہے اس کے اصلی معنی ہیں: دیوار۔ عرب میں باغات کے چاروں طرف دیوار بنانے کا رواج تھا اس لئے اس لفظ کے ثانوی معنی ہیں: باغ۔ اور یہ حدیث نہایت ضعیف ہے کیونکہ حسن بن ابی جعفر انتہائی درجہ کا ضعیف راوی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو منکر الحدیث اور امام نسائی رحمہ اللہ نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔ اور یحییٰ قطان، ابن المدینی اور امام احمد رحمہم اللہ وغیرہ نے بھی اس کی تضعیف کی ہے۔ بلکہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس راوی کی وجہ سے اس حدیث کو موضوعات میں لیا ہے ——— قرون متوسطہ میں جب تصوف میں عجمی اثرات داخل ہوئے تو صوفیاء نے جنگل اور پہاڑوں میں جاکر عبادت کرنے کو اور لوگوں سے بے تعلق رہنے کو بڑا دینی کام تصور کرلیا تھا اور انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا تھا کہ جب آنحضور ﷺ باغات میں یعنی لوگوں سے دور رہ کر عبادت کرنے کو پسند فرماتے تھے تو بستی سے علحدگی اختیار کرنے اور جنگل و باغات میں رہ کر اللہ کی عبادت میں مشغول رہنے کا جواز بلکہ فضیلت نکل آئی۔ حالانکہ یہ حدیث ضعیف جداً ہے اس سے استدلال قطعاً جائز

نہیں۔علاوہ ازیں یہ سنیاس لینا ہے جو ہندوانہ رسم ہے اور رہبانیت اختیار کرنا ہے جو عیسائیوں کا طریقہ ہے۔اسلام میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں۔حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے بیویوں سے قطع تعلق کرنے کا ارادہ کیا تھا تا کہ ہر وقت اللہ کی عبادت میں مشغول رہ سکیں۔آنحضرت ﷺ نے ان کو اس کام سے روک دیا اور فرمایا:''یہ میرے طریقہ کے خلاف ہے۔اور جس نے میرے طریقہ سے اعراض کیا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں!'' خود آنحضور ﷺ نے بھی اور تمام انبیائے کرام نے بیویوں اور بچوں کے ساتھ رہ کر عبادت کی ہے۔اللہ کا بھی حق ادا کیا ہے اور لوگوں کا بھی۔پس یہی دین ہے اور جو اس کے خلاف چلے اس کا فعل مردود ہے۔

[۱۳۵] باب ماجاء فی الصلاۃِ فی الحِیْطَانِ

[۳۴۲-] حدثنا محمودُ بنُ غَیْلَانَ، ثنا أبو داوُدَ، نا الحسنُ بنُ أبی جَعْفَرٍ، عن أبی الزُّبَیْرِ، عن أبی الطُّفَیْلِ، عن مُعاذِ بنِ جَبَلٍ: أنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم کان یَسْتَحِبُّ الصلاۃَ فی الحِیْطَانِ؛ قال أبو داود: یعنی البَسَاتِیْنَ.

قال أبو عیسی: حدیثُ معاذٍ حدیثٌ غریبٌ لانَعرِفُه إلّا مِن حدیثِ الحسنِ بنِ أبی جَعْفَرٍ، والحَسَنُ بنُ أبی جَعفرٍ قد ضَعَّفَهُ یحییَ بنُ سعیدٍ وغیرُہ.

وأبو الزُّبَیْرِ: اسمُہُ محمدُ بنُ مُسْلِمِ بنِ تَدْرُسَ؛ وأبو الطُّفَیْلِ: اسمُہُ عامرُ بنُ وَاثِلَۃَ.

وضاحت: حضرت ابو الطفیل رضی اللہ عنہ صحابی ہیں۔اور ابو داؤد سے مراد ابو داؤد طیالسی ہیں جو حدیث کے راوی ہیں انھوں نے حیطان کے معنی بیان کئے ہیں اور غریب بمعنی ضعیف ہے۔

بابُ ماجاء فی سُتْرَۃِ المُصَلّی

نمازی کے سامنے سترہ کا بیان

حدیث: آنحضرت ﷺ نے فرمایا:''جب تم میں سے کوئی اپنے سامنے کجاوہ کی پچھلی لکڑی کے مانند کوئی چیز رکھ لے تو چاہئے کہ نماز پڑھے اور ان لوگوں کی کوئی پروانہ کرے جو سترہ کے پرے سے گذرتے ہیں''

تشریح: کھلے میدان میں یا جہاں لوگوں کے گذرنے کا احتمال ہو ایسی جگہ میں نماز پڑھنے والے کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ اپنے سامنے کوئی چیز کھڑی کر کے نماز پڑھے۔اور وہ چیز کم از کم ایک انگلی کے بقدر موٹی اور ایک ہاتھ کے بقدر لمبی ہونی چاہئے۔موٹائی میں یا لمبائی میں اس سے کم کو سترہ بنانا صحیح نہیں۔اور اگر کسی شخص کے پاس سترہ بنانے کے لئے کوئی چیز نہ ہو تو امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پھر لکیر کھینچ دینا بھی کافی ہے اور لکیر یا تو لمبائی میں کھینچے یا پھر

محراب کی طرح گول لکیر کھینچے۔ دیگر ائمہ لکیر کو سترہ کے قائم مقام نہیں گردانتے۔ اور اس سلسلہ کی روایت ابوداؤد میں ہے۔ تفصیل وہاں سمجھ لیں۔

[١٣٦] باب ماجاء في سُتْرَةِ المصلي

[٣٤٣-] حدثنا قُتَيْبَةُ وهَنَّادٌ، قالا: نا أبو الأَحْوَصِ، عن سِمَاكِ بنِ حَرْبٍ، عن مُوسى بنِ طَلْحَةَ، عن أبيه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" إِذَا وَضَعَ أَحَدُكُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ مِثْلَ مُؤْخِرَةِ الرَّحْلِ، فَلْيُصَلِّ ولا يُبَالِي مَنْ مَرَّ مِنْ وَرَاءِ ذلك"

وفي الباب: عن أبي هريرةَ، وسَهْلِ بنِ أبي حَثْمَةَ، وابنِ عُمَرَ، وسَبْرَةَ بنِ مَعبدٍ، وأبي جُحَيْفَةَ، وعائشةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ طلحةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، والعملُ عَلَى هٰذا عند أهلِ العلمِ، وقالوا: سُتْرَةُ الإِمَامِ سُتْرَةٌ لِمَنْ خَلْفَهُ.

مسئلہ: اگر کھلے میدان میں باجماعت نماز پڑھی جارہی ہو تو امام کا سترہ سب کے لئے کافی ہے۔ ہر شخص کے لئے اپنے سامنے سترہ رکھنا ضروری نہیں۔ اور یہ مسئلہ اجماعی ہے —— اور یہ مسئلہ دلیل ہے کہ امام واسطہ فی العروض ہے یعنی نماز کے ساتھ حقیقۃً وہی متصف ہے اور مقتدی نماز کے ساتھ بالعرض اور مجازاً متصف ہیں اگر امام اور مقتدی سب نماز کے ساتھ حقیقۃً متصف ہوتے یعنی امام واسطہ فی الثبوت ہوتا تو پھر مقتدیوں میں سے ہر ایک کے لئے الگ سترہ رکھنا کم از کم مستحب ہوتا۔

بابُ مَاجاءَ في كَرَاهِيَةِ المُرُوْرِ بَيْنَ يَدَيِ المُصَلِّي

نمازی کے سامنے سے گذرنا مکروہ ہے

حدیث: بُسر بن سعید کہتے ہیں: یزید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حضرت ابوجہیم رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا اور ان سے پوچھا کہ آپ نے رسول اللہ ﷺ سے نمازی کے سامنے سے گذرنے والے کے بارے میں کیا حدیث سنی ہے؟ ابوجہیمؓ نے جواب دیا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اگر نمازی کے سامنے سے گذرنے والا اس گناہ کو جان لے جو اس کو ہوتا ہے تو وہ چالیس (سال) تک ٹھہرا رہے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اس کے سامنے سے گذرے'' ابوالنضر کہتے ہیں: بُسر بن سعید نے چالیس سال کہا تھا یا چالیس مہینے یا چالیس دن، مجھے یاد نہیں رہا اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو ابن ماجہ میں ہے گناہ کے ڈر سے سو سال تک اپنی جگہ ٹھہرے رہنے کی

بات ہے۔ یہ قرینہ ہے کہ ابوجہیم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی چالیس سال ہوگا۔

[۱۳۷] باب ماجاء فی کراھیة المُرُوْرِ بین یَدِی المصلی

[۳٤٤-] حدثنا الأنصارِیُّ، نا مَعْنٌ، نا مالکُ بنُ انسٍ، عن أبی النَّضْرِ، عن بُسْرِ بنِ سعیدٍ: أنَّ زَیْدَ بنَ خالدِ الجُھَنِیَّ أرْسَلَ إلی أبی جُھَیْمٍ، یَسْأَلُهُ ماذا سَمِعَ من رسولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فی المَارِّ بَیْنَ یَدَیِ المُصَلِّی؟ فقال أبُو جُھَیْمٍ: قال رسولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: "لَوْ یَعْلَمُ المَارُّ بَیْنَ یَدَیِ المُصَلِّی مَاذَا عَلَیْهِ؟ لَکَانَ أنْ یَقِفَ أرْبَعِیْنَ خَیْرٌ لَهُ مِنْ أن یَمُرَّ بَیْنَ یَدَیْهِ" قال أبو النَّضْرِ: لا أدْرِیْ قال: أرْبَعِیْنَ یَوْمًا أوْ أرْبَعِیْنَ شَھْرًا أوْ أرْبَعِیْنَ سَنَةً.

وفی الباب: عن أبی سعیدِ الخُدْرِیِّ، وأبی ھریرةَ، وعبدِ اللّٰهِ بنِ عَمْرٍو؛ قال أبو عیسی: حدیثُ أبی جُھَیْمٍ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

[۳٤۵-] وقد رُوِیَ عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم انه قال: " لَأنْ یَقِفَ أحَدُکُمْ مَائَةَ عامٍ خَیْرٌ له مِن أنْ یَمُرَّ بَیْنَ یَدَیْ أخِیْهِ وَھُوَ یُصَلِّی"

والعملُ علیه عندَ أھل العلمِ، کَرِھُوْا المُرُوْرَ بَیْنَ یَدَیِ المُصَلِّی، ولَمْ یَرَوْا أنَّ ذٰلِكَ یَقْطَعُ صلاةَ الرجلِ.

ترجمہ: نبی ﷺ سے مروی ہے: یقیناً یہ بات کہ تم میں سے ایک شخص سو سال تک کھڑا رہے یہ بات بہتر ہے اس کے لئے اپنے بھائی کے سامنے سے گذرنے سے درانحالیکہ وہ نماز پڑھ رہا ہو۔ اور اکثر علماء کا اس پر عمل ہے انھوں نے نمازی کے سامنے سے گذرنے کو مکروہ (تحریمی) قرار دیا ہے۔ اور انھوں نے نہیں دیکھا کہ یہ چیز آدمی کی نماز کو کاٹے گی، یعنی ان کے نزدیک کسی کے سامنے سے گذرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

بابُ ماجاءَ لَایَقْطَعُ الصَّلَاةَ شَیْئٌ

کوئی بھی چیز نمازی کے سامنے سے گذرے تو نماز باطل نہیں ہوتی

جمہور علماء کے نزدیک نمازی کے سامنے سے کسی بھی چیز کے گذرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ البتہ امام احمد رحمہ اللہ کا اس میں اختلاف ہے۔ اور ان کے لئے اگلا باب ہے۔

حدیث: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر وہ اور ان کے بڑے بھائی فضل بن عباس رضی اللہ عنہ ایک گدھی پر سوار ہو کر منیٰ میں آئے۔ ابن عباسؓ پیچھے بیٹھے تھے۔ اور اس وقت آنحضرت

ﷺ نماز پڑھا رہے تھے، انھوں نے گدھی کو چرنے چگنے کے لئے چھوڑ دیا اور دونوں صف میں شامل ہو گئے، یعنی نماز شروع کر دی۔ اور گدھی لوگوں کے سامنے سے گذرتی رہی اور کسی کی نماز فاسد نہیں ہوئی۔

فائدہ: عرب کا گدھا ہمارے یہاں کے خچر کے برابر ہوتا ہے۔ اس پر بآسانی دو آدمی سوار ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے یہاں گدھے کی سواری معیوب بھی نہیں سمجھی جاتی بلکہ وہ شان سے اس پر سواری کرتے ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ کی سواریوں میں بھی ایک گدھا تھا۔ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ عرب میں "گدھا" نہیں ہوتا بلکہ "حمار" ہوتا ہے۔ اور میں نے مکہ مکرمہ میں کاروں کے اس دور میں ایک بدّو کو ٹھاٹھ سے گدھے پر گذرتے دیکھا ہے۔

[۱۳۸] باب ماجاء لایقطعُ الصلاةَ شیئ

[۳۴۶-] حدثنا محمدُ بنُ عبدِ الملك بنِ ابی الشَّوَارِبِ، نا یزید بنُ زُرَیْعٍ، نا مَعْمَرٌ، عن الزُّهْرِیِّ، عن عُبَیدِ اللّٰہِ بن عبد الله بنِ عُتْبَةَ، عن ابن عباسٍ، قال: کُنْتُ رَدِیْفَ الفَضْلِ علی أَتَانٍ، فَجِئْنَا وَالنبیُّ صلی الله علیه وسلم یُصَلِّی بأصحابه بمنیً، قال: فَنَزَلْنَا عنها، فَوَصَلْنَا الصَّفَّ، فَمَرَّتْ بَیْنَ أَیْدِیْهِمْ، فلم تَقْطَعْ صَلاَتَهُمْ.

وفی الباب: عن عائشة، والفضلِ بنِ عباسٍ، وابنِ عُمَرَ.

قال أبو عیسی: حدیثُ ابنِ عبَّاسٍ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ؛ والعملُ علیه عندَ أکثر أهلِ العلمِ من أصحابِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم ومَنْ بَعدَهم من التابعینَ. قالوا: لا یقطعُ الصلاةَ شیئٌ؛ وبه یقولُ سُفیانُ، والشافِعِیُّ.

بابُ ماجاء أنَّهُ لاَ یَقْطَعُ الصَّلاَةَ إِلاَّ الْكَلْبُ والحِمَارُ والْمَرْأَةُ

عورت، گدھے اور کالے کتے کے گذرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے

حدیث: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب بندہ نماز پڑھے اور اس کے سامنے کجاوہ کی پچھلی لکڑی کے مانند، یا فرمایا: کجاوہ کی درمیانی لکڑی کے مانند کوئی چیز نہ ہو تو اس کی نماز کو کالا کتا، عورت اور گدھا کاٹتا ہے۔ عبد اللہ بن الصامت نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: کالے کتے کی تخصیص کی وجہ کیا ہے؟ آپؓ نے جواب دیا: یہی بات میں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھی تھی۔ آپ نے فرمایا: "کالا کتا شیطان ہے"

تشریح: یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی ہے۔ اس حدیث کی بناء پر امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ نمازی کے سامنے سے اگر

کالا کتا گذر جائے تو اس کی نماز فاسد ہوجائے گی۔ اور عورت اور گدھے کے بارے میں انھوں نے کوئی دوٹوک بات نہیں کہی۔ کیونکہ ان دونوں کے سلسلہ میں معارض روایتیں موجود ہیں۔ اوپر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث گذری ہے کہ لوگوں کے سامنے سے ان کی گدھی گذرتی رہی اور کسی کی نماز باطل نہیں ہوئی۔ اور بخاری میں ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ حدیث سنائی گئی کہ عورت گدھے اور کتے کی وجہ سے نماز فاسد ہوجاتی ہے تو انھوں نے اس پر نقد کیا اور فرمایا: تم نے ہم عورتوں کو گدھوں اور کتوں کے برابر کردیا۔ پھر فرمایا: میں آنحضرت ﷺ کے سامنے جنازہ کی طرح لیٹی رہتی تھی۔ اور آپ تہجد میں مشغول رہتے تھے اور کمرہ میں روشنی نہ ہونے کی وجہ سے بےخبری میں میرا پاؤں آپؐ کی سجدہ کی جگہ میں چلا جاتا تھا۔ جب آپ سجدہ کرنے کا ارادہ فرماتے تو میرے پاؤں کو ٹھونکتے، میں اپنا پاؤں سکیڑ لیتی اور آپ سجدہ کرتے (حدیث نمبر ۵۱۴ باب لایقطع الصلاۃ شیئ) معلوم ہوا کہ عورت کے نمازی کے سامنے ہونے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اور کتے کے بارے میں کوئی معارض روایت نہیں اس لئے امام احمدؒ نے کتے کے گذرنے سے تو نماز کے فساد کا حکم لگایا اور عورت اور گدھے کے گذرنے میں کوئی صریح فیصلہ نہیں کیا۔

فائدہ: باب کی حدیث کے ساتھ معارض نہ تو حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے اور نہ حضرت عائشہؓ کی اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے سترہ تھا اور گدھی سترہ سے پرے گذر رہی تھی اور امام کا سترہ لوگوں کے لئے سترہ ہوتا ہے پس گدھی کے نمازیوں کے سامنے سے گذرنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اور حضرت عائشہ کی حدیث اس لئے معارض نہیں کہ وہاں نمازی کے سامنے عورت پہلے سے موجود ہے اور باب میں مسئلہ عورت کا نمازی کے سامنے سے گذرنے کا ہے اور دونوں باتوں میں فرق ہے پس وہ حدیث بھی بحث سے خارج ہے مگر باب کی حدیث میں قطعِ صلاۃ سے فسادِ صلاۃ مراد نہیں، بلکہ قطعِ وُصلہ (رابطہ) مراد ہے۔ اور عورت سے مرغوبات اور گدھے سے مُسْتَقْذِرَات (گھناؤنی چیزیں) اور کالے کتے سے مُخَوِّفَات (ڈراؤنی چیزیں) مراد ہیں۔

اس کی تفصیل: یہ ہے کہ جب نمازی کی نظر کسی مرغوب چیز پر پڑتی ہے تو اس کی توجہ بٹتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے بیل بوٹوں والی چادر اوڑھ کر نماز پڑھی دوران نماز آپؐ کی ان پر نظر پڑی۔ نماز کے بعد آپؐ نے وہ چادر ایک صاحب کو دی اور فرمایا: اس کو ابوجہم رضی اللہ عنہ کو واپس کردو اور ان کے پاس انبجانیہ چادر ہے جو سادہ ہے وہ لے آؤ (بخاری حدیث ۳۷۲) آنحضرت ﷺ نے وہ چادر اس لئے لوٹادی کہ آپ کی توجہ نماز میں بٹی تھی۔ معلوم ہوا کہ مرغوبات قطعِ وُصلہ کا سبب بنتے ہیں اور عورت مرغوبات کا اعلی فرد ہے۔ اس لئے اس کا ذکر کیا گیا ہے، اس میں عورتوں کا اعزاز ہے توہین نہیں ہے۔ اسی طرح مُسْتَقْذِرَات یعنی گھناؤنی چیزیں بھی قطعِ وُصلہ کا سبب بنتی ہیں اور اس کا ایک فرد گدھا ہے اور ایک حدیث میں خنزیر کا ذکر آیا ہے وہ بھی گھناؤنی چیز ہے (ابوداؤد ۱:۱۰۲) نیز مُخَوِّفَات یعنی ڈراؤنی چیزیں بھی اس کا سبب بنتی ہیں۔ اور کالا کتا اس کی مثال ہے۔ اور ایک حدیث

میں یہودی اور مجوسی کا ذکر آیا ہے (ابوداؤد ۱۰۲:۲) ابتدائے اسلام میں مدینہ میں یہودیوں کا ہر وقت کھٹکا لگا رہتا تھا۔ غرض اس قسم کی چیزیں جب نمازی کے سامنے آتی ہیں تو یقیناً توجہ بٹتی ہے۔ حدیث میں قطع صلاۃ سے یہی قطع وصلہ مراد ہے۔ اس توجیہ سے احادیث میں تعارض ختم ہو جاتا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نقد کا جواب بھی نکل آتا ہے کہ عورت کو گدھے اور کتے کے برابر نہیں کیا بلکہ عورت کو اس کی نوع (مرغوبات) کا اعلیٰ فرد قرار دیا ہے۔

[۱۳۹] باب ماجاء أنه لا يَقْطَعُ الصلاةَ إلا الكلبُ والحمارُ والمرأةُ

[٣٤٧-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا هُشَيْمٌ، نا يونسُ ومنصورُ بنُ زَاذَانَ، عن حُمَيْدِ بنِ هِلَالٍ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ الصَّامِتِ، قال: سمعتُ أَبَا ذَرٍّ يقولُ: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "إِذَا صَلَّى الرَّجُلُ وَلَيْسَ بَيْنَ يَدَيْهِ كَآخِرَةِ الرَّحْلِ أو: كَوَاسِطَةِ الرَّحْلِ: قَطَعَ صَلَاتَه الكَلْبُ الأَسْوَدُ والمرأةُ والحِمارُ" فقلتُ لِأَبِيْ ذَرٍّ: مَابَالُ الأَسْوَدِ مِنَ الأَحْمَرِ ومِنَ الأَبْيَضِ؟ فقال: يَا ابنَ أَخِيْ سَأَلْتَنِيْ كما سَأَلْتُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فقال: "الكلبُ الأَسْوَدُ شيطانٌ"

وفي البابِ: عن أبي سعيدٍ، والحَكَمِ الغِفَارِيِّ، وأبي هريرةَ، وأنسٍ.

قال أبو عيسى: حديث أبي ذَرٍّ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وقَدْ ذَهَبَ بَعضُ أهلِ العلمِ إليه، قالوا: يَقْطَعُ الصلاةَ الحِمَارُ والمَرْأَةُ والكَلْبُ الأَسْوَدُ، قال أحمدُ: الذى لا أَشُكُّ فيهِ: أَنَّ الكَلْبَ الأَسْوَدَ يَقْطَعُ الصلاةَ، وفي نَفْسِيْ مِنَ الْحِمَارِ وَالْمَرْأَةِ شيئٌ؛ قال إسحاقُ: لَايَقْطَعُهَا شيئٌ إلَّا الكلبُ الأَسْوَدُ.

ترجمہ: بعض اہل علم اس حدیث کی طرف گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ گدھا، عورت اور کالا کتا نماز کو باطل کر دیتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: وہ بات جس میں مجھے کوئی شک نہیں یہ ہے کہ کالا کتا نماز کو ختم کر دیتا ہے، اور گدھے اور عورت کے بارے میں میرے دل میں تذبذب ہے۔ یعنی یقینی بات کہنا مشکل ہے۔ اور حضرت اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نماز کو صرف کالا کتا باطل کرتا ہے یعنی عورت اور گدھے کی وجہ سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

بابُ ماجاء في الصَّلاةِ في الثَّوْبِ الوَاحِدِ

ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا بیان

حدیث: حضرت ام سلمۃ رضی اللہ عنہا کے لڑکے اور آنحضرت ﷺ کے ربیب عمر بن ابی سلمۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی والدہ کے گھر میں نماز پڑھتے دیکھا درانحالیکہ آپ ایک کپڑے

میں لپٹے ہوئے تھے۔

تشریح: اس حدیث کا سبق یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھے تو اُسے حتی الامکان بدن ڈھانک لینا چاہئے۔ اگرچہ نماز کی صحت کے لئے ناف سے گھٹنے تک کا حصہ چھپالینا کافی ہے۔ مگر آنحضرت ﷺ نے صرف ستر چھپانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپؐ نے چادر پورے بدن پر لپیٹ رکھی تھی۔ اور یہ نفل نماز تھی اور نوافل میں وسعت کے باوجود ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی گنجائش ہے۔ اور فرض نماز میں زینت لے کر نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ سورۃ الاعراف (آیت ۳۱) میں ارشاد پاک ہے: ﴿خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ﴾ تم اپنی آرائش ہر نماز کے وقت لے لو۔ اور کامل آرائش یہ ہے کہ سر اور ٹخنوں تک جو بھی آرائش وزینت کا لباس ہے اس کو پہن کر نماز پڑھی جائے۔ اور کام کاج کے کپڑوں کا شمار آرائش اور زینت کے لباس میں نہیں ہے۔ اس لئے علماء نے ان کو پہن کر فرض پڑھنے کو مکروہ لکھا ہے۔

ایک واقعہ: میرے استاذ شیخ محمود عبدالوہاب محمود مصری قدس سرہٗ جب فرض پڑھنے کے لئے مسجد میں آتے تو سخت گرمیوں میں بنیان پہنتے، اس پر توب (لمبا کرتہ) پہنتے، اس پر عباء پہنتے اور اوپر سے شال اوڑھتے اور دولہا بن کر آتے اور سکون کے ساتھ نمازِ پڑھتے، پسینہ بہتا رہتا مگر کبھی نہیں کھجلاتے تھے۔ ہندوستان کی گرمی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی، پورے بدن میں گرمی دانے نکل آتے تھے تاہم یہ اہتمام کرتے تھے۔ پھر جب کمرہ میں لوٹتے تو سارے کپڑے بڑی ناگواری سے اتار پھینکتے۔ ایک دن میں نے عرض کیا کہ یہ توب (لمبا کرتا) کافی ہے۔ آپ عباء کیوں پہنتے ہیں اور شال کیوں اوڑھتے ہیں؟ تو فرمایا: سعید! أنَا أَسْتَحْيِيْ مِنَ اللهِ: سعید! مجھے اللہ سے شرم آتی ہے۔ سبحان اللہ کیا ادب تھا۔

انہی کا حال یہ تھا کہ جب کمرہ میں نوافل پڑھتے تو صرف پاجامہ پہن کر پڑھتے تھے، کیونکہ کپڑا پہن ہی نہیں سکتے تھے ۲۴ گھنٹے صرف پاجامہ میں رہتے تھے، مگر فرض نماز کے وقت وہ حال ہوتا تھا جو اوپر آیا۔

لطیفہ: ایک صاحب کی بیوی کا نام ''زینت'' تھا وہ ہمیشہ اپنی بیوی کو لے کر مسجد میں نماز پڑھنے آتے تھے، اکیلے کبھی نہیں آتے۔ کسی نے اس کی وجہ معلوم کی تو فرمایا: اللہ پاک کا حکم ہے۔ لوگوں نے پوچھا: کہاں حکم ہے؟ تو انھوں نے مذکورہ آیت پڑھی کہ اپنی زینت لے کر مسجد جاؤ اکیلے مت جاؤ۔

فائدہ: کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کھلے سر نماز پڑھنا سنت یا مستحب ہے۔ کیونکہ اس میں تذلل (عاجزی اور فروتنی) ہے جو نماز میں مطلوب ہے، نیز ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا ثابت نہیں۔ ان حضرات کا یہ خیال صحیح نہیں۔ یہ قرآن کے مقابلہ میں قیاس ہے۔ مذکورہ بالا آیت سے نماز میں تزین (مزین ہونے) کا مطلوب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ عمامہ باندھنا ثابت ہے اور ٹوپی کا تذکرہ بھی آیا ہے، پھر عام حالات میں تو آپ تزئین کے لئے یہ لباس زیب تن فرماتے ہوں اور جب نماز کا وقت آئے تو ان کو اتار کر نماز پڑھتے ہوں یہ محض من گھڑت بات ہے۔ اور یہ

خیال کہ اب تو کھلے سر رہنا ہی عام رواج ہے تو جاننا چاہئے کہ یہ ایک فیشن ہے۔ اس کا اعتبار نہیں۔ اعتبار اسلامی تہذیب کا ہے۔ اور ٹوپی پہن کر نماز پڑھنا ثابت نہیں تو کھلے سر فرض نماز پڑھنا بھی تو ثابت نہیں۔

[۱۴۰] باب ماجاء فی الصلاةِ فی الثوب الواحد

[۳۴۸-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ، عن هِشامٍ: هُو ابنُ عُرْوَةَ، عن أبيهِ، عن عُمَرَ بنِ أبی سَلَمَةَ: أنَّهُ رأى رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّیْ فی بَيْتِ أُمِّ سَلَمَةَ مُشْتَمِلاً فی ثوبٍ واحدٍ.

وفی الباب: عن أبی هريرةَ، وجابرٍ، وسلَمَةَ بنِ الأكْوَعِ، وأنسٍ، وعَمْرِو بنِ أبی أُسَيْدٍ، وأبی سَعيدٍ، وكَيْسَانَ، وابنِ عباسٍ، وعائشةَ، وأُمِّ هانئٍ، وعَمَّارِ بنِ ياسرٍ، وطَلْقِ بنِ علیٍّ، وعُبادةَ بنِ الصَّامتِ الأنْصارِیِّ.

قال أبو عيسى: حديثُ عُمرَ بنِ أبی سَلَمَةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ والعملُ عَلَى هذا عند أكْثرِ أهلِ العلمِ من أصحابِ النبیِّ صلى الله عليه وسلم ومَنْ بَعدَهُمْ مِنَ التَّابعينَ وغيرِهم، قالوا: لا بأْسَ بالصلاة فی الثَّوْبِ الواحِدِ؛ وقد قال بعضُ أهلِ العلمِ: يُصَلِّی الرجلُ فی ثَوْبَيْنِ.

ترجمہ: اس پر اکثر صحابہ اور بعد کے اہل علم کا عمل ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ایک کپڑے میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، اور بعض علماء کہتے ہیں: دو کپڑوں میں نماز پڑھنی چاہئے ـــــــ یعنی ضرورت کے وقت ایک کپڑے میں یعنی صرف لنگی میں یا صرف پائجامہ میں بھی نماز ہوجاتی ہے۔ آنحضور ﷺ سے سوال کیا گیا تھا کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو کپڑے ہیں؟'' اس زمانہ میں جواب نفی میں تھا پھر دو کپڑے نماز کے لئے کیسے شرط کئے جاسکتے ہیں؟ (بخاری حدیث ۳۶۵) البتہ اگر گنجائش ہو تو پھر ایک کپڑے میں فرض نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔ پوری زینت کے ساتھ پڑھنی چاہئے، جس میں عمامہ یا ٹوپی بھی شامل ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں رحمۃ اللہ الواسعہ ۳:۳۶۲)

بابُ ماجاء فی ابتِدَاءِ الْقِبْلَةِ

تحویل قبلہ کی ابتدائی تاریخ

آنحضور ﷺ کی بعثت ملت ابراہیمی اسماعیلی پر ہوئی ہے۔ ابراہیمی یعقوبی بنی اسرائیل کہلاتے ہیں اور ان کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ اور عرب ابراہیمی اسماعیلی ہیں اور ان کا قبلہ بیت اللہ تھا۔ پس اسلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہے۔ آنحضرت ﷺ جب تک مکہ میں رہے بیت اللہ ہی قبلہ تھا۔ پھر جب آپؐ ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں فروکش

ہوئے تو بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا۔ مگر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام یہ بات جانتے تھے کہ بیت المقدس عارضی قبلہ ہے۔ دیر سویر دوبارہ کعبہ شریف کو قبلہ مقرر کیا جائے گا۔ اور مسجد اقصیٰ کو قبلہ مقرر کرنے میں ایک مصلحت یہ تھی کہ مدینہ منورہ کی بڑی آبادی یہودیوں کی تھی۔ ان کو اسلام سے قریب لانے کے لئے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا عارضی حکم دیا گیا، تا کہ وہ جان لیں کہ دینِ یہود اور دینِ اسلام کا سرچشمہ ایک ہے[1] مگر یہود بے بہبود قریب تو کیا آتے، الٹا انھوں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ محمد آہستہ آہستہ دینِ یہود کی طرف آرہے ہیں اور وہ عنقریب مذہب یہود کو قبول کرلیں گے۔

غرض تحویل قبلہ کا یہ مقصد پورا نہ ہوا تو سولہ یا سترہ مہینے کے بعد دوبارہ تحویل ہوئی۔ اس وقت آنحضور ﷺ بنوسلمۃ کے ایک نوجوان صحابی بشیر بن براء کے جنازہ میں شرکت کے لئے ان کے محلہ میں تشریف لے گئے تھے۔ اور مسجد بنی سلمۃ میں ظہر پڑھا رہے تھے، آپؐ نے دو رکعتیں پڑھائی تھیں کہ نماز کے اندر ہی وحی نازل ہوئی، اور آپؐ اور صحابہ شمال کی جانب سے جنوب کی جانب پلٹ گئے۔ اور بقیہ دو رکعتیں کعبہ شریف کی طرف پڑھیں۔ مدینہ سے بیت المقدس شمال کی جانب ہے اور بیت اللہ جنوب کی جانب۔ اسی مسجد بنی سلمۃ کو مسجد القبلتین کہتے ہیں۔ پھر آپؐ گھر تشریف لائے اور عصر کی نماز مسجد نبوی میں آپؐ نے کعبہ شریف کی طرف منہ کر کے پڑھائی۔ ایک صحابی یہاں سے عصر پڑھ کر بنو حارثہ کی مسجد کے پاس سے گذرے وہاں لوگ سابقہ قبلہ کی طرف نماز پڑھ رہے تھے انھوں نے گواہی دی کہ قبلہ بدل گیا ہے۔ چنانچہ سب نماز ہی کے اندر بیت اللہ کی طرف گھوم گئے پھر اگلے دن ایک صحابی مسجد نبوی میں فجر پڑھ کر قبا پہنچے جو مدینہ سے تین چار میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں تھا وہاں لوگ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے تھے، جب انھوں نے تحویل کی خبر دی تو وہ سب بھی نماز ہی کے اندر کعبہ شریف کی طرف پھر گئے۔

فائدہ (۱): یہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں مسجد نبوی میں تو فجر کی نماز غلس میں ہوتی تھی مگر مدینہ کی دوسری مساجد میں اسفار میں ہوتی تھی۔ کیونکہ یہ صحابی مسجد نبوی میں باجماعت فجر پڑھ کر پانچ کلومیٹر گئے ہیں، اس وقت قبا میں فجر کی نماز ہو رہی تھی۔

فائدہ (۲): آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جب کوئی حکم منسوخ ہوتا تھا اور وہ نسخ کسی کمی کی وجہ سے نہیں بلکہ حسن سے احسن کو اختیار کرنے کے لئے ہوتا تھا تو اس کا باقاعدہ اعلان نہیں کیا جاتا تھا۔ بلکہ جوں جوں لوگوں کو اطلاع ہوتی جاتی تھی عمل بدلتا جاتا تھا۔ مدینہ میں کل نو مساجد تھیں، ان کو آسانی سے تحویل کی اطلاع دی جاسکتی تھی مگر نہیں دی گئی۔ کیونکہ یہ نسخ کسی خرابی کی وجہ سے نہیں ہوا تھا بلکہ بہ سے بہتر کی طرف انتقال تھا۔ جیسے پہلے ہر اونچ نیچ کے ساتھ رفع

(۱) یہ ایک مصلحت تھی اور اصل مصلحت وہ تھی جس کا تذکرہ سورۃ البقرۃ (آیت ۱۴۳) میں آیا ہے یعنی اس امت کے مزاج میں اعتدال پیدا کرنا مقصود تھا، نیز عربوں کا امتحان بھی مقصود تھا، تفصیل تفسیروں میں دیکھیں ۱۲

یدین تھا پھر رفتہ رفتہ وہ ختم کیا گیا۔ مگر اس کا اعلان نہیں کیا گیا، لوگوں کو جوں جوں اس کی اطلاع ہوتی گئی عمل بدلتا گیا۔

فائدہ (۳): حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جو مروی ہے کہ ہجرت سے پہلے بیت المقدس قبلہ تھا (اخرجه ابن ابی شیبه والبیهقی فی سننه) یہ رائے جمہور نے قبول نہیں کی۔ ہجرت سے پہلے بھی کعبہ شریف ہی قبلہ تھا۔

[۱٤۱] باب ماجاء في ابْتِدَاءِ القبلة

[۳٤۹-] حدثنا هَنَّادٌ، نا وَكِيعٌ، عن إسرائيلَ، عن أبي إسحاق، عن البَرَاءِ بنِ عَازِبٍ، قال: لَمَّا قَدِمَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم المَدِيْنَةَ صَلَّى نَحْوَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ سِتَّةَ أَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا، وكان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يُحِبُّ أَنْ يُوَجَّهَ إلى الكعبةِ، فأَنْزَلَ اللّٰهُ تعالى: ﴿ قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا، فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ فَوُجِّهَ إلى الكعبةِ، وكان يُحِبُّ ذلكَ، فَصَلَّى رَجُلٌ مَعَهُ العصرَ ثُمَّ مَرَّ عَلَى قومٍ من الأَنْصَارِ، وهم ركوعٌ في صلاةِ العصرِ نحوَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ، فقالَ: هو يَشْهَدُ أَنَّهُ صَلَّى مَعَ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، وأَنَّهُ قد وُجِّهَ إلى الكعبةِ؛ قال: فَانْحَرَفُوْا وهم ركوعٌ.

وفي الباب: عن ابنِ عُمَرَ، وابنِ عباسٍ، وعمارَةَ بنِ أَوْسٍ، وعمرِو بنِ عوفٍ الْمُزَنِيِّ، وأنسٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ البراءِ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وقد رَوَى سفيانُ الثوريُّ عن أبي إسحاق.

[۳۵۰-] حدثنا هَنَّادٌ، نا وكيعٌ، عن سفيانَ، عن عبدِ الله بنِ دِيْنَارٍ، عن ابنِ عُمَرَ، قال: كانوا رُكُوْعًا في صلاةِ الصُّبْحِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ صحيحٌ.

ترجمہ: حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں فروکش ہوئے تو آپؐ نے سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نمازیں پڑھیں۔ اور آنحضور ﷺ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ کعبہ شریف کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا جائے۔ پس اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کی یہ آیت نازل فرمائی: ''بیشک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا آپؐ کے منہ کا آسمان کی طرف، سوالبتہ پھیرینگے ہم آپ کو جس قبلہ سے آپؐ راضی ہیں۔ اب پھیرلیں آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف'' پس آپ کعبہ شریف کی طرف منہ کرنے کا حکم دیئے گئے۔ اور آپ کو یہ بات پسند بھی تھی۔ پھر ایک شخص نے آپ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی پھر وہ انصار کے کچھ لوگوں کے پاس سے گذرا درانحالیکہ وہ بیت المقدس کی جانب رخ کرکے عصر پڑھ رہے تھے۔ تو اس نے کہا کہ وہ گواہی دیتا ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی ہے درانحالیکہ وہ کعبہ شریف کی طرف پھیر دیئے گئے تھے۔ راوی بیان کرتا ہے کہ وہ لوگ رکوع میں تھے اور رکوع

ہی میں کعبہ کی طرف متوجہ ہوگئے (اگر کوئی شخص ٹرین میں نماز پڑھ رہا ہو اور گاڑی گھوم جائے، اور نمازی قبلہ کے پھر جانے سے واقف ہو تو اس پر جس رکن میں ہو اسی رکن میں گھوم جانا ضروری ہے ورنہ نماز باطل ہو جائے گی) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ لوگ نماز فجر کے رکوع میں تھے (یہ مسجد قبا کا واقعہ ہے)

فائدہ (۱): مسجد بنی حارثہ اور مسجد قبا کے نمازیوں نے فرد واحد کی خبر کو حجت تسلیم کر کے نماز ہی کے اندر کعبہ شریف کی طرف رخ کر لیا، کیونکہ وہ اطلاع مُحتَف بالقرائن (قرائن سے گھری ہوئی) تھی۔ اور قرائن: مخبر کے صادق ہونے کے ظن غالب کے ساتھ اس کا لفظ شہادت کے ذریعہ اطلاع کرنا تھا اور لوگوں کا تحویل قبلہ کا منتظر ہونا بھی تھا۔

یہاں سے علماء نے یہ ضابطہ اخذ کیا ہے کہ اگر خبر واحد مُحتَف بالقرائن ہو تو وہ شرعاً حجت ہے، چنانچہ اخبار آحاد کے مفید ظن ہونے کے باوجود ان سے بیشتر مسائل ثابت کئے گئے ہیں کیونکہ خبر واحد کے تمام روات کا ثقہ ہونا اس حدیث کے صحیح ہونے کا قرینہ ہے۔

فائدہ (۲): اس حدیث سے دوسرا ضابطہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ قانون سازی کے وقت میں کچھ سہولت دی جاتی ہے یعنی جب پہلی بار کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو بعض باتوں سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نماز کے اندر تحویل قبلہ ہوئی ہے تو امام اور مقتدیوں کو انتقالِ مکانی کی نماز کے ضابطوں کے خلاف اجازت دی گئی یعنی یہ تشریع کے وقت کی ترخیص ہے۔

بابُ ماجاءَ أنَّ بَيْنَ المَشْرِقِ والمَغْرِبِ قِبْلَةٌ

مدینہ کا قبلہ جنوب کی جانب ہے

حدیث: آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''مشرق ومغرب کے درمیان قبلہ ہے'' —— ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس حدیث کی شرح میں یہ بات کہی ہے کہ اگر مدینہ میں اس طرح کھڑا ہوا جائے کہ مغرب اس کی دائیں جانب اور مشرق بائیں جانب ہو تو جدھر اس کا منہ ہوگا اُدھر مدینہ کا قبلہ ہوگا۔ یعنی مدینہ میں قبلہ جانب جنوب ہے۔

تشریح: علماء نے اس حدیث کے دو مطلب بیان کئے ہیں: ایک: یہ کہ مشرق سے مغرب تک جانب جنوب کا آدھا دائرہ اہل مدینہ کا قبلہ ہے۔ پس اگر کوئی شخص بالکل جنوب کی طرف منہ کرنے کے بجائے مشرق یا مغرب کی طرف کچھ منحرف ہو کر نماز پڑھے تو ربع قوس تک انحراف معاف ہے۔ البتہ پورا ربع قوس انحراف ہو جائے تو نماز باطل ہو جائے گی کیونکہ اس صورت میں اس کا رخ مغرب یا مشرق کی جانب ہو گیا، جنوب کی طرف نہ رہا۔ اور دوسرا مطلب: یہ ہے کہ مشرق ومغرب کے درمیان کی جنوبی کمان کو دو برابر حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کا بالکل بیچ مدینہ منورہ کا قبلہ ہے (حدیث کا یہ دوسرا مطلب صحیح ہے اور پہلا مسئلہ بھی صحیح ہے)

اس کے بعد یہ بات جانی چاہئے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک نماز میں عینِ قبلہ کی طرف رُخ کرنا ضروری ہے ذرا بھی انحراف معاف نہیں۔ اور دیگر ائمہ کے نزدیک جہتِ قبلہ کی طرف توجہ ضروری ہے۔ یعنی نماز تو عینِ قبلہ کی طرف منہ کرکے ہی پڑھنی چاہئے لیکن اگر کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ منحرف ہوکر کھڑا ہو تو رُبع قوس سے کم انحراف معاف ہے، اس کی نماز صحیح ہوجائے گی اور اگر پوری ربع قوس انحراف ہوگیا تو نماز باطل ہوجائے گی۔

نیز یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ باب کی حدیث ابو معشر کی وجہ سے ضعیف ہے۔ البتہ اس حدیث کی ایک دوسری سند بھی ہے امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو حسن صحیح کہا ہے مگر بیہقی رحمہ اللہ نے سنن کبری میں اس حدیث کو بھی ضعیف بتایا ہے۔ کیونکہ عثمان بن محمد کو حدیث میں وہم ہوتا تھا اور وہ متکلم فیہ راوی ہے اور وہ سعید مقبری سے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ علاوہ ازیں اس سے عبداللہ بن جعفر مخرمی نے روایت کی ہے۔ اور حافظ رحمہ اللہ نے مخرمی کی جو روایت عثمان بن محمد سے ہے اس کو غیر معتبر قرار دیا ہے (تہذیب ۷:۱۵۲)

[۱٤٢] باب ماجاء أن بين المشرقِ والمغربِ قبلةً

[۳٥١-] حدثنا محمدُ بنُ أبى مَعْشَرٍ، نا أبِى، عن محمدِ بنِ عَمْرٍو، عن أبى سَلَمَةَ، عن أبى هريرةَ، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ"

حدثنا يحيىَ بنُ مُوسىٰ، نا محمدُ بنُ أبى مَعْشَرٍ: مثلَهُ.

قال أبو عيسى: حديثُ أبى هريرةَ قد رُوِىَ عنه مِن غَيْرِ وَجْهٍ؛ وقَدْ تَكَلَّمَ بعضُ أهلِ العلمِ فى أبى مَعْشَرٍ مِنْ قِبَلِ حِفْظِهِ، واسْمُهُ نَجِيْحٌ مَوْلَى بَنِى هَاشِمٍ، قَالَ محمدٌ: لَا أَرْوِىْ عنه شَيْئًا، وقد رَوَى عَنْهُ النَّاسُ، قال محمدٌ: وحديثُ عبدِ الله بنِ جَعْفَرٍ المَخْرَمِىِّ، عن عُثمانَ بنِ محمدٍ الأَخْنَسِىِّ، عن سَعيدٍ المَقْبُرِىِّ، عن أبى هريرة. أَقْوَى وَأَصَحُّ مِن حَدِيثِ أبى مَعْشَرٍ.

[۳٥٢-] حدثنا الحَسَنُ بنُ بَكْرٍ المَرْوَزِىُّ، نا المُعَلَّى بنُ مَنْصُوْرٍ، نا عبدُ اللهِ بنُ جَعْفَرٍ المَخْرَمِىُّ، عن عُثمانَ بنِ مُحمدٍ الأَخْنَسِىِّ، عن سَعيد المَقْبُرِىِّ، عن أبى هريرةَ، عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم، قال: "مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ"

وإِنَّمَا قِيْلَ: عبدُ اللهِ بنُ جَعْفَرٍ المَخْرَمِىُّ: لِأَنَّهُ مِنْ وَلَدِ المِسْوَرِ بنِ مَخْرَمَةَ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وقَدْ رُوِىَ عن غيرِ واحدٍ من أصحابِ النبىِّ صلى الله عليه وسلم: مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ، مِنْهُمْ عمرُ بنُ الخَطَّابِ، وعلىُّ بنُ أبى طالبٍ، وابنُ عباسٍ.

قال ابنُ عُمَرَ: إِذَا جَعَلْتَ المغربَ عن يَمِيْنِكَ، والمشرق عن يَسَارِكَ، فما بَيْنَهُمَا قِبْلَةٌ إِذَا

اسْتَقْبَلْتَ القبلَةَ.

وقال ابنُ المبارك: ما بَيْنَ المشرقِ والمغربِ قبلَةٌ: هذا لِأَهْلِ المشرقِ؛ واختارَ عبدُ اللّٰهِ بنُ المباركِ التَّيَاسُرَ لِأَهْلِ مَرْوَ.

ترجمہ اور وضاحت: پہلی حدیث (۳۵۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے متعدد طرق سے مروی ہے (اس لئے وہ اعلی درجہ کی صحیح حدیث ہے) مگر اس کی جو دو سندیں امام ترمذی رحمہ اللہ نے لکھی ہیں ان دونوں میں ایک راوی ابو معشر ہے۔ بعض اہل علم نے اس پر کلام کیا ہے کہ اس کو حدیثیں صحیح یاد نہیں تھیں۔ اور اس کا نام نجیح ہے اور وہ بنو ہاشم کا آزاد کردہ ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں اس کی کوئی حدیث بیان نہیں کرتا اور دوسرے حضرات نے اس سے روایت کی ہے۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ عبداللہ کی حدیث (سند) جو آگے (نمبر ۳۵۲ پر) آرہی ہے وہ ابو معشر کی حدیث (سند) سے اقوی اور اصح ہے۔ پھر عبداللہ مخرمی کی سند بیان کی ہے اور اس کے بعد یہ بیان کیا ہے کہ اس راوی کو مَخْرَمِی اس لئے کہتے تھے کہ یہ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہے۔ اور متعدد صحابہ سے یہ مسئلہ مروی ہے کہ مدینہ والوں کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان (جانب جنوب) ہے۔ حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہ بات مروی ہے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''جب آپ مغرب کو اپنی دائیں جانب کریں اور مشرق کو بائیں جانب تو جو ان دونوں کے درمیان نقطہ ہے وہ قبلہ ہے بشرطیکہ آپ کا منہ قبلہ کی طرف ہو (یہ محض وضاحت کے لئے ہے اس کا مفاد کچھ نہیں) اور ابن المبارک نے فرمایا: مشرق و مغرب کے درمیان کا نقطہ مشرق (مدینہ) والوں کے لئے قبلہ ہے اور انھوں نے مرو کے باشندوں کے لئے تیاسر یعنی بائیں جانب کو اختیار کیا یعنی ان کو بالکل درمیانی نقطہ سے ذرا بائیں جانب مڑ کر نماز پڑھنی چاہئے (غرض حدیث کا صحیح مطلب دوسرا ہی ہے کہ ہر شخص کو عینِ کعبہ کی طرف نماز پڑھنی چاہئے)

نوٹ: ابن المبارک رحمہ اللہ مرو کے باشندے تھے، وہاں سے مدینہ منورہ مشرق جنوب میں ہے اور ہندوستان میں قبلہ جانب مغرب ہے اور شمال سے جنوب تک آدھی قوس قبلہ ہے، مگر نماز بالکل عین کعبہ کی طرف پڑھنی چاہئے، باقی ربع قوس سے کم انحراف معاف ہے یعنی نماز ہو جائے گی۔

بابُ ماجاء في الرَّجُلِ يُصَلِّي لِغَيْرِ القِبْلَةِ في الغَيْمِ

تحری کر کے نماز پڑھی پھر غلطی ظاہر ہوئی تو نماز ہو گئی

اگر قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو اور معلوم کرنے کی کوئی صورت بھی نہ ہو تو تحری کرنے کا حکم ہے۔ یعنی غور و فکر کے بعد جس جانب قبلہ ہونے کا ظن غالب ہو اس طرف نماز پڑھ لے نماز صحیح ہو جائے گی۔ پھر نماز کے بعد اگر غلطی معلوم ہو تو

مضایقہ نہیں، نماز صحیح ہوگئی۔ البتہ اگر نماز کے اندر تحری بدل جائے یا کوئی شخص دوسری جانب قبلہ ہونے کی اطلاع دے تو پھر نماز کے اندر ہی اس جانب پھر جانا ضروری ہے۔ اب سابقہ تحری پر نماز صحیح نہیں ہوگی۔ ایک اندھیری رات میں صحابہ نے تحری کرکے تہجد کی نماز پڑھی۔ صبح خطا ظاہر ہوئی تو رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا آپ نے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۵ تلاوت فرمائی: ''تم لوگ جس طرف منہ کرو ادھر ہی اللہ تعالیٰ کا رخ ہے'' یہ آیت تلاوت فرما کر فرمایا کہ پیش آمدہ صورت میں سب کی نماز ہوگئی ـــــ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ مسئلہ اجماعی ہے اور باب میں یہی ایک حدیث ہے اور وہ ضعیف ہے۔ اشعث بن سعید السمان اور عاصم بن عبید اللہ کی تضعیف کی گئی ہے، البتہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے عاصم کا ضعف ظاہر نہیں کیا۔

[۱۴۳] باب ماجاء في الرجل يُصَلّي لغير القبلةِ في الغَيْمِ

[۳۵۳-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، نا وكيعٌ، نا أَشْعَثُ بنُ سعيدِ السَّمَّانُ، عن عاصِمِ بنِ عُبيدِ اللهِ، عن عبدِ الله بنِ عامِرِ بنِ رَبِيْعَةَ، عن أبيه، قال كُنَّا مع النبيِّ صلى الله عليه وسلم فِيْ سَفَرٍ فِي لَيْلَةٍ مُظْلَمَةٍ، فَلَمْ نَدْرِ أَيْنَ الْقِبْلَةُ؟ فَصَلّى كُلُّ رجلٍ مِنَّا عَلَى حِيَالِهِ، فَلَمَّا أَصْبَحْنَا ذَكَرْنَا ذٰلِكَ للنبيِّ صلى الله عليه وسلم فَنَزَلَ ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ لَيْسَ إسنادُهُ بِذَاكَ، لَانَعْرِفُهُ إِلَّا مِن حديثِ أَشْعَثَ السَّمَّانِ، وأَشْعَثُ بنُ سعيدٍ أبو الرَّبِيْعِ السَّمَّانُ يُضَعَّفُ في الحديثِ.

وقَدْ ذَهَبَ أكثرُ أهلِ العلمِ إلى هٰذا، قالوا: إِذَا صَلّى في الغَيْمِ لِغَيْرِ الْقِبْلَةِ، ثُمَّ اسْتَبَانَ لَهُ بَعْدَ مَا صَلّى أَنَّهُ صَلّى لِغَيْرِ الْقِبْلَةِ، فإِنَّ صَلَاتَهُ جائزةٌ؛ وبِهِ يقولُ سفيانُ الثوريُّ، وابنُ المباركِ، وأحمدُ، وإسحاقُ.

ترجمہ: عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک تاریک رات میں (بادلوں کی تاریکی تھی) ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (سفر میں) تھے اور قبلہ کس جانب ہے یہ بات ہم نہیں جانتے تھے۔ پس ہم میں سے ہر شخص نے اپنے سامنے کی جانب نماز پڑھی۔ پھر جب صبح ہوئی تو ہم نے یہ بات آنحضور ﷺ سے ذکر کی۔ پس آیت: ﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ نازل ہوئی۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند قوی نہیں ہم اس کو نہیں جانتے مگر اشعث کی سند سے۔ اور اشعث حدیث میں ضعیف قرار دیا گیا ہے ـــــ اور اکثر علماء اس حدیث کی طرف گئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب کسی نے ابر آلود موسم میں غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھ لی (تحری کرکے) پھر نماز پڑھنے کے بعد ظاہر ہوا کہ اس نے قبلہ کے علاوہ کی طرف نماز پڑھی ہے تو اس کی نماز درست ہوگئی۔

بابُ مَاجاءَ فی کَرَاهیةِ ما یُصَلّٰی إلَیْهِ وَفِیْهِ

کس چیز کی طرف منہ کر کے اور کس جگہ میں نماز پڑھنا مکروہ ہے؟

اس باب میں ان جگہوں کا بیان ہے جہاں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ اور وہ سات جگہیں ہیں۔ اور وہ چیزیں جن کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا مکروہ ہے ان کا بیان آئندہ ابواب میں آئے گا۔

حدیث: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سات جگہوں میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی: گوبر وغیرہ ڈالنے کی جگہ میں، مذبح میں، قبرستان میں، راستہ کے بیچ میں، نہانے کی جگہ میں، اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ میں اور بیت اللہ کی چھت پر۔

تشریح: مذکورہ سات جگہوں میں نماز کی ممانعت کی علتیں مختلف ہیں۔ تفصیل یہ ہے:

① —— مَزْبَلَة: یہ لفظ زِبْلٌ سے بنا ہے اس کے معنی ہیں: گوبر۔ پس مَزْبَلَة کے معنی ہیں: گوبر ڈالنے کی جگہ یعنی کوڑی۔ اور گوبر وغیرہ ڈالنے کی جگہ میں نماز کی ممانعت جگہ کی ناپاکی اور گندگی کے قرب کی وجہ سے ہے اگر کپڑا وغیرہ بچھا کر نماز پڑھے تو بھی نجاست کے قرب کی وجہ سے کراہیت ہوگی۔ البتہ مجبوری میں جائز ہے —— یہاں سے ماکول اللحم جانوروں کے فضلات کا ناپاک ہونا بھی اشارۃً سمجھ میں آتا ہے۔ امام اعظم، امام شافعی اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔

② —— مَجْزَرَةٌ: جَزْر کے معنی ہیں: ذبح کرنا۔ اور مَجْزَرَة: مذبح اور کمیلا کو کہتے ہیں۔ یہاں بھی ممانعت کی وجہ جگہ کا ناپاک ہونا اور گندگی کا قرب ہے۔

③ —— مَقْبُرَة: یعنی قبرستان۔ اور اس میں نماز کی ممانعت کی وجہ حنفیہ کے نزدیک یہ ہے کہ وہاں نماز پڑھنے میں قبروں کا سامنا ہوتا ہے اور قبر کو سامنے کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت ہے۔ البتہ اگر ایسی جگہ نماز پڑھے جہاں قبریں سامنے نہ ہوں تو گنجائش ہے۔ اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک کراہیت کی وجہ جگہ کی ناپاکی ہے۔ کیونکہ قبرستان بار بار استعمال ہوتا ہے۔ اور قبر کے اندر کی مٹی اوپر آجاتی ہے اور وہ مٹی ناپاک ہوتی ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک دیگر ناپاک چیزوں کی طرح زمین بھی صرف دھونے سے پاک ہوتی ہے، جبکہ قبرستان کی زمین کو کوئی نہیں دھوتا، پس وہ جگہ ناپاک ہے اور ناپاکی کے قریب بھی نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔ کیونکہ نماز کے لئے مناسب نہایت پاکیزگی اور خوب صفائی ہے۔

④ —— قَارِعَةُ الطَّرِیْق: یہ ترکیب مقلوبی ہے اس کی اصل طریقٌ مَقْرُوعَةٌ ہے (طریق مؤنث سماعی ہے) اور بیچ راستہ میں نماز ممنوع ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں نماز میں اطمینان نصیب نہیں ہوگا۔ بار بار گذرنے والے کی

طرف توجہ جائے گی۔

⑤ ـــــ حمام: یعنی نہانے دھونے کے ہوٹل، یہاں بھی ممانعت کی وجہ بے اطمینانی ہے۔ اور وہاں کسی کا ستر بھی کھل سکتا ہے۔ اور بہت لوگ ایک ساتھ نہانے آجائیں تو بھیڑ بھی ہوسکتی ہے۔ پس یہ چیزیں نماز میں دل کی حضوری میں خلل ڈالیں گی۔

⑥ ـــــ مَعَاطِنُ الإِبِلِ: عَطَنَ (ن،ض) عَطْنًا البعیرُ کا ترجمہ ہے: اونٹ کا سیراب ہوکر بیٹھنا۔ اور معاطن الإبل اونٹ کے باڑے کو کہتے ہیں۔ وہاں نماز اس لئے ممنوع ہے کہ اس جگہ بدبو بہت ہوتی ہے۔ اور زمین ناہموار ہوتی ہے، نیز اونٹ بڑے ڈیل ڈول کا جانور ہے اس کے پریشان کرنے کا اندیشہ بھی رہتا ہے اور یہ اندیشہ جمعیت خاطر میں خلل ڈالتا ہے۔

⑦ ـــــ فوقَ ظهرِ بیت الله: بے ضرورت بیت اللہ کی چھت پر چڑھنا مکروہ ہے اس سے بیت اللہ کی عظمت پامال ہوتی ہے۔ پس وہاں بھی نماز پڑھنا منع ہے۔

نوٹ: باب میں مذکور حدیث زید بن جبیرۃ کی وجہ سے ضعیف ہے اور امام لیث بن سعد جو اس کی سند حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچاتے ہیں وہ غیر محفوظ ہے۔ درحقیقت یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔

[۱۴۴] باب ماجاء فی کراهية ما يُصَلّٰى إليه وفيه

[۳۵۴-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، حدثنا المُقْرِئُ قال: نَا يَحيىَ بنُ أيوبَ، عن زيدِ بنِ جَبِيْرَةَ، عن داوُدَ بنِ الحُصَيْنِ، عن نافعٍ، عن ابنِ عُمَرَ: أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم نَهَى أنْ يُصَلّٰى فی سَبْعَةِ مَوَاطِنَ: فی المَزْبَلَةِ، وَالْمَجْزَرَةِ، والمُقْبَرَةِ، وقَارِعَةِ الطَّرِيْقِ، وفی الحَمَّامِ، ومَعَاطِنِ الإبِلِ، وفَوْقَ ظَهرِ بَيْتِ اللهِ.

حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نا سُوَيْدُ بنُ عبدِ العزيزِ، عن زَيْدِ بنِ جَبِيْرَةَ، عن داوُدَ بنِ حُصَيْنٍ، عن نَافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، عن رسولِ الله صلى الله عليه وسلم بِمَعْنَاهُ ونَحْوَهُ.

وفی الباب: عن أبی مَرْثَدٍ، وجابرٍ، وأنسٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ إسنادُه لَيْسَ بِذَاكَ القويِّ؛ وقَد تُكُلِّمَ فی زيدِ بنِ جَبِيْرَةَ مِنْ قِبَلِ حِفْظِهِ.

وقد رَوَى اللَّيْثُ بنُ سعدٍ هذا الحديثَ عن عبدِ اللهِ بنِ عُمَرَ العُمَرِيِّ، عن نافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، عن عُمَرَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم مثلَه.

وحديثُ ابنِ عُمرَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَشْبَهُ وَأَصَحُّ مِن حديثِ اللَّيْثِ بنِ سَعْدٍ؛ وعبدُ اللهِ بنُ عُمَرَ العُمَرِيُّ ضَعَّفَهُ بعضُ أهلِ الحديثِ مِنْ قِبَلِ حِفْظِهِ، مِنْهُمْ يَحيىَ بنُ سَعيدٍ القَطَّانُ.

ترجمہ اور وضاحت: امام ترمذی رحمہ اللہ نے سب سے پہلے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث دوسندوں سے ذکر کی ہے: ایک سند: یحیٰی بن ایوب کی ہے۔ دوسری: سُوید بن عبدالعزیز کی۔ دونوں میں زید بن جَبیرۃ ہیں اور وہ یادداشت کی جانب سے ضعیف ہیں اس لئے امام ترمذیؒ نے ان دونوں پر حکم لگایا ہے کہ یہ قوی نہیں۔ پھر اسی حدیث کی ایک تیسری سند پیش کی ہے۔ یہ امام لیث بن سعد مصری رحمہ اللہ کی ہے وہ سند حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچاتے ہیں (ہندوستانی نسخوں میں عن ابن عمر کے بعد عن عمر رہ گیا ہے، مصری نسخہ سے ہم نے بڑھایا ہے) اس سند میں عبداللہ عمری ہیں، یہ بھی امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک ضعیف ہیں (مگر علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے اس راوی کو من رواۃ الحِسان کہا ہے یعنی اس راوی کی روایتیں حسن کے درجہ کی ہوتی ہیں) پھر امام ترمذیؒ نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ روایت ابن عمرؓ کی ہے حضرت عمرؓ کی نہیں یعنی لیث کی سند صحیح نہیں، عمری کو بعض محدثین نے ضعیف کہا ہے جیسے یحیٰی قطان کہتے ہیں کہ اس راوی کو حدیثیں اچھی طرح محفوظ نہیں تھیں۔

بابُ ماجاء في الصَّلاَةِ في مَرَابِضِ الغَنَمِ وَأَعْطَانِ الإِبِلِ

بکریوں اور اونٹوں کے باڑوں میں نماز پڑھنے کا بیان

حدیث: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھو، اور اونٹوں کے باڑے میں نماز مت پڑھو''

تشریح: دو مسئلے الگ الگ ہیں۔ ایک: مَرْبِضِ غنم (بکریوں کے باڑے) میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور مَعْطِنِ إبل (اونٹوں کے بٹھانے کی جگہ) میں نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔ اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ دوسرا مسئلہ: یہ ہے کہ اگر کوئی شخص معاطن ابل میں نماز پڑھ لے تو کیا حکم ہے؟ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک نماز نہیں ہوگی دوبارہ پڑھنی ہوگی۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ دیگر ائمہ کے نزدیک نماز ہوجائے گی۔ وہ فرماتے ہیں: آنحضور ﷺ نے عارضی مصلحت سے معاطن ابل میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ کیونکہ اونٹ کینہ توز جانور ہے، اور جب وہ مُخلّی بالطبع ہوتا ہے یعنی اس پر کاٹھی یا ہودج بندھا ہوا نہیں ہوتا تو وہ شرارت کرتا ہے، پس وہاں نماز پڑھنے میں اندیشہ رہے گا اور یہ بات نماز میں دل کی حضوری میں خلل ڈالے گی۔

علاوہ ازیں جہاں اونٹ بیٹھتے ہیں وہاں زمین میں کھڈے ہوتے ہیں اور اس جگہ بدبو بھی بہت ہوتی ہے اس لئے

وہاں نماز پڑھنے کی ممانعت ہے۔اور بکریوں کا حال اونٹوں سے مختلف ہے وہ مسکین جانور ہے، بیچاری کیا ستائے گی؟ پھر مرابض غنم عام طور پر صاف ہوتے ہیں اور زمین ہموار ہوتی ہے اس لئے وہاں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، اس لئے وہاں نماز کی اجازت دی گئی۔اور یہ فرق بالکل ایسا ہی ہے جیسا آنحضور ﷺ نے ان کے گوشتوں کے درمیان کیا ہے۔ چونکہ اونٹ کے گوشت میں بو ہوتی ہے اور اس میں چکناہٹ بھی ہوتی ہے اس لئے آپؐ نے اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنے کا یعنی ہاتھ منہ دھونے کا حکم دیا۔اور بکری کے گوشت میں نہ تو چکناہٹ ہوتی ہے اور نہ ہی بو، اس لئے آپ نے اس سے ہاتھ منہ دھونے کا حکم نہیں دیا۔تفصیل پہلے (۱:۳۳۱ میں) گذر چکی ہے۔

[١٤٥] باب ماجاء فی الصلاة فی مَرَابِضِ الغنم ومَعَاطِنِ الإبل

[٣٥٥-] حدثنا أبو كُرَيْبٍ، نا يحيىَ بنُ آدمَ، عن أبی بَكرِ بنِ عَيَّاشٍ، عن هِشَامٍ، عن ابنِ سِيْرِيْنَ، عن أبی هريرةَ، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "صَلُّوْا فی مَرَابِضِ الْغَنَمِ وَلَا تُصَلُّوْا فی أعْطَانِ الإِبِلِ"

حدثنا أبو كُرَيْبٍ، نا يحيىَ بنُ آدمَ، عن أبی بكرِ بنِ عَيَّاشٍ، عن أبی حَصِيْنٍ، عن أبی صالحٍ، عن أبی هريرةَ، عن النبیِّ صلى الله عليه وسلم بِمِثْلِهِ أَوْ بِنَحْوِهِ.

وفی الباب: عن جابرِ بنِ سَمُرَةَ، والبراءِ، وسَبُرَةَ بنِ مَعْبَدِ الجُهَنِیِّ، وعبدِ الله بنِ مُغَفَّلٍ، وابنِ عُمرَ، وأنس.

قال أبو عيسى: حديثُ أبی هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وعليه العملُ عند أصحابنا؛ وبه يقولُ احمدُ وإسحاقُ.

وحديثُ أبی حَصِيْنٍ عن أبی صالحٍ، عن أبی هريرةَ، عن النبیِّ صلى الله عليه وسلم حديثٌ غريبٌ؛ رواه إسرائيلُ عن أبی حَصِيْنٍ، عن أبی صالح، عن أبی هريرة موقوفاً، ولم يَرْفَعْهُ، واسمُ أبی حَصِيْنٍ: عثمانُ بنُ عَاصِمٍ الأَسَدِیُّ.

[٣٥٦-] حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا يحيىَ بنُ سعيدٍ، عن شُعْبَةَ، عن أبی التَّيَّاحِ الضُّبَعِیِّ، عن أنسِ بنِ مالكٍ: أنَّ النبیَّ صلى الله عليه وسلم كان يُصَلِّیْ فی مَرَابِضِ الغَنَمِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وأبو التَّيَّاحِ: اسْمُهُ يزيدُ بنُ حُمَيْدٍ.

ترجمہ اور وضاحت: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث (۳۵۵) کی دو سندیں ہیں: پہلی سند: ابوبکر بن عیاش: ہشام سے، وہ ابن سیرین سے، وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ دوسری سند: ابوبکر: ابوحصین

(بروزن امیر) سے وہ ابوصالح سے اور وہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ پہلی سند سے حدیث مرفوع ہے اور اعلیٰ درجہ کی ہے۔ اور امام احمد اور اسحاق رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں اور دوسری سند غریب ہے، اسرائیل نے ابو حصین سے اس کو موقوفاً روایت کیا ہے، اور اس کو مرفوع نہیں کیا۔ اور ابوحصین کا نام عثمان بن عاصم اسدی ہے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث (نمبر ۳۵۶) اعلیٰ درجہ کی ہے۔ نبی ﷺ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھا کرتے تھے (نبی ﷺ کے پاس سو بکریاں تھیں) اور ابوالتیاح کا نام: یزید بن حمید ہے۔

بابُ ماجاء فی الصَّلاۃِ عَلَی الدَّابَّۃِ حَیثُ مَا تَوَجَّھَتْ بِہِ

چوپائے پر جدھر بھی اس کا رخ ہو نماز پڑھنے کا بیان

یہاں لفظ دابۃ اگرچہ عام ہے مگر مراد اونٹ ہے۔ کیونکہ گھوڑے پر نماز نہیں پڑھ سکتے اس لئے کہ اس کو چلانا پڑتا ہے۔ اگر نماز کے اندر جانور کو چلانا پڑے تو یہ عمل کثیر ہے، نماز فاسد ہو جائے گی۔ اور اونٹ کی صورت حال مختلف ہے ان کی قطار ہوتی ہے۔ ہر اونٹ کی نکیل دوسرے اونٹ کی دم سے باندھ دی جاتی ہے اور جو اونٹ سب سے آگے ہوتا ہے اس کو ایک شخص لے کر چلتا ہے یا اس پر بیٹھ کر چلاتا ہے۔ اور باقی سب اونٹ ریل کے ڈبوں کی طرح اس کے پیچھے چلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ایک شخص کے علاوہ سب لوگ فارغ ہوتے ہیں۔ پس وہ ان پر بیٹھے ہوئے نفلیں پڑھ سکتے ہیں۔ اور اونٹ کی پیٹھ کا پاک ہونا اور استقبال قبلہ شرط نہیں۔ جانور جس جانب بھی متوجہ ہو اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں اور رکوع وسجود کی جگہ اشارہ کرنا کافی ہے۔ البتہ بغیر عذر کے فرض نماز سواری پر نہیں پڑھ سکتے کیونکہ اس میں قیام، رکوع وسجود اور استقبال قبلہ شرط ہے۔ اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ اور بس اور کار اونٹ کے حکم میں ہیں۔ ان میں بیٹھ کر نفلیں پڑھنا جائز ہے اور سنن مؤکدہ بھی نفل ہیں اور سیٹ کا پاک ہونا اور استقبال قبلہ شرط نہیں۔ البتہ ڈرائیور نہیں پڑھ سکتا کیونکہ اس کو گاڑی چلانی ہے۔ اور یہ بات بھی جان لینی چاہئے کہ ریل گاڑی میں نوافل کے لئے اگرچہ قیام ضروری نہیں مگر استقبال قبلہ اور رکوع وسجود ضروری ہیں۔ ریل میں کیف ما اتفق اور اشارہ سے نفل پڑھنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ بس اور کار میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ ہی نہیں سکتے، پس وہ دابہ کے حکم میں ہے۔ اور ٹرین میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ممکن ہے اور بھیڑ عارضی عذر ہے، اس لئے اس میں استقبال قبلہ اور رکوع وسجود کے ساتھ ہی نماز پڑھنا ضروری ہے۔

[۱٤٦] باب ماجاء فی الصلاۃ علی الدَّابَّۃِ حیثُ ما تَوَجَّھَتْ بہ

[۳۵۷-] حدثنا محمودُ بنُ غَیْلانَ، نا وکیعٌ، ویَحییَ بنُ آدمَ، قالا: نا سُفیانُ، عن أبی الزُّبَیرِ، عن جابرٍ، قال: بَعَثَنِی النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم فی حَاجَۃٍ فَجِئْتُہُ وَھُوَ یُصَلِّیْ علی رَاحِلَتِہِ نَحوَ المشرِقِ،

والسُّجُودُ أَخْفَضُ مِنَ الرُّكُوعِ.

وفي الباب: عن أنسٍ، وابنِ عمرَ، وأبي سعيدٍ، وعامرِ بنِ رَبِيْعَةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ جابرٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ ورُوِيَ من غيرِ وجهٍ عن جابرٍ.

والعَمَلُ عليه عِنْدَ عَامَّةِ أهلِ العلمِ، لا نَعْلَمُ بَيْنَهُمْ اخْتِلاَفًا: لَايَرَوْنَ بَأْسًا أَنْ يُصَلِّيَ الرَّجُلُ عَلَى رَاحِلَتِهِ تَطَوُّعًا، حَيْثُمَا كان وَجْهُهُ: إلى القبلة وغيرِهَا.

ترجمہ: اس حدیث کا بیان جو اونٹ پر نماز پڑھنے کے سلسلہ میں آئی ہے جس جانب بھی وہ متوجہ ہو ——— حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: آنحضرت ﷺ نے مجھے کسی ضرورت سے بھیجا۔ میں جب واپس آیا تو آپ اونٹ پر نماز پڑھ رہے تھے۔ اور آپ کا رخ مشرق کی طرف تھا (مدینہ میں قبلہ جنوب کی طرف ہے) اور آپ سجدہ کا اشارہ رکوع کے اشارہ سے جھکتا ہوا فرما رہے تھے ——— اور اس حدیث پر عموماً اہل علم کا عمل ہے، اس مسئلہ میں ہم کسی کے اختلاف سے واقف نہیں۔ تمام علماء اونٹ پر نماز پڑھنے میں حرج نہیں سمجھتے خواہ نماز پڑھنے والے کا رخ قبلہ کی جانب ہو یا کسی اور جانب۔

بابٌ في الصَّلاَةِ إِلَى الرَّاحِلَةِ

اونٹ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا بیان

راحلة اس اونٹ کو کہتے ہیں جس پر کاٹھی یا ہودَج بندھا ہوا ہو۔ ایسے اونٹ کو بٹھا کر سترہ بنا کر اس کے قریب نماز پڑھنا جائز ہے۔ کیونکہ جب اونٹ پر کاٹھی وغیرہ بندھی ہوئی ہوتی ہے تو وہ شریف ہو جاتا ہے اور اس سے کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔ ہاں جب وہ مُخلّی بالطبع ہوتا ہے تو شرارت کرتا ہے اس وجہ سے آنحضور ﷺ نے معاطن ابل میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔

[۱٤٧] باب ماجاء في الصلاة إلى الراحلة

[۳٥٨-] حدثنا سُفْيَانُ بنُ وكيعٍ، نا أبو خالدٍ الأَحْمَرُ، عن عُبيدِ اللهِ بنِ عُمَرَ، عن نافعٍ، عن ابنِ عُمَرَ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم صَلَّى إلى بَعِيْرِهِ أو: رَاحِلَتِهِ، وكانَ يُصَلِّيْ على رَاحِلَتِهِ حَيْثُمَا تَوَجَّهَتْ بِهِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وهو قولُ بعضِ أهلِ العلمِ: لَايَرَوْنَ بالصَّلاَةِ إلى البَعِيْرِ بأسًا: أن يَسْتَتِرَ بِهِ.

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے اونٹ کی طرف یا فرمایا اپنے راحلۃ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے (راحلہ اور بَعیر کا ایک مطلب ہے) اور آپؐ راحلہ پر نماز پڑھتے تھے جس جانب بھی وہ آدمی کے ساتھ متوجہ ہو ——— یہ بعض اہل علم کا قول ہے، وہ کہتے ہیں کہ اونٹ کی طرف منہ کر کے اس کو سترہ بنا کر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔

بابُ مَاجاءَ إِذَا حَضَرَ العَشَاءُ وَأُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَابْدَأُوا بِالعَشَاءِ

جب شام کا کھانا سامنے آئے اور نماز شروع ہو جائے تو پہلے کھانا کھالے

حدیث: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب شام کا کھانا سامنے آئے اور نماز کے لئے اقامت کہی جائے یعنی نماز شروع ہو جائے تو پہلے کھانا کھالے''

تشریح: اس حدیث کا مدعیٰ یہ ہے کہ شدید بھوک کے ساتھ نماز نہیں پڑھنی چاہئے، بلکہ پہلے بھوک کا بھوت مار لے پھر نماز پڑھے، اس لئے کہ اگر شدید بھوک کے ساتھ نماز پڑھے گا تو نماز کے اندر توجہ کھانے کی طرف رہے گی۔ اور نماز کھانا بن جائے گی، اور اگر پہلے کھانا کھالے گا تو کھاتے وقت توجہ نماز کی طرف رہے گی اور کھانا نماز بن جائے گا۔ اور یہ صورت غیر رمضان میں روزہ داروں کو پیش آتی ہے۔ رمضان میں تو لوگ نماز مغرب تھوڑی تاخیر سے پڑھتے ہیں، مگر غیر رمضان میں تاخیر نہیں ہوتی، اذان کے بعد فوراً نماز شروع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اگر روزہ دار کو شدید بھوک لگ رہی ہو تو اُسے پہلے کھانا کھالینا چاہئے پھر جماعت میں شریک ہونا چاہئے اگر کھانا کھانے کی وجہ سے جماعت فوت ہو جائے تو مضائقہ نہیں، کیونکہ بھوک کی شدت ترکِ جماعت کے اعذار میں سے ہے۔ جمہور علماء نے اس حدیث کا یہی مطلب سمجھا ہے۔ اور وکیع رحمہ اللہ نے دوسری تفسیر کی ہے وہ کہتے ہیں: اگر کھانا ایسا ہو جو نماز پڑھتے پڑھتے سڑ جائے گا یا خراب ہو جائے گا تو جماعت ترک کر کے پہلے کھانا کھالے، مگر یہ مطلب فہم سے بعید ہے اس لئے کہ ایسا کھانا جو نماز پڑھتے پڑھتے سڑ جائے کونسا ہے؟ ہاں ٹھنڈا ضرور ہو سکتا ہے مگر اس کو دوبارہ گرم کر لے گا اس میں کیا پریشانی ہے؟ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اصحاب رسول ﷺ نے حدیث شریف کا پہلا ہی مطلب سمجھا ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''ہمیں اس حال میں نماز میں نہیں کھڑا ہونا چاہئے کہ ہمارے دلوں میں کوئی چیز ہو'' اور حدیث مذکور کے ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی راوی ہیں، اور ان کا عمل یہ تھا کہ ایک مرتبہ مسجد میں نماز کھڑی ہو گئی اور حضرت کھاتے رہے درانحالیکہ امام کے پڑھنے کی آواز حضرت سن رہے تھے، یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے عمل سے یہ بات بتلائی کہ بھوک کے وقت پہلے کھالینا چاہئے تا کہ بھوک نماز میں خشوع وخضوع کے زائل ہونے کا سبب نہ بن جائے۔ غرض وکیع رحمہ اللہ نے جو تفسیر کی ہے وہ ٹھیک نہیں۔

[۱٤٨] باب ماجاء إِذَا حَضَرَ العَشَاءُ وأقيمت الصلاةُ فابْدَأُوْا بالعَشَاءِ

[۳۵۹-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا سفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ، عنِ الزُّهْرِيِّ، عن أنسٍ، يَبْلُغُ بِهِ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال: "إِذَا حَضَرَ العَشَاءُ، وأُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ، فَابْدَأُوْا بالعَشَاءِ"

وفى الباب: عن عَائشةَ، وابنِ عُمَرَ، وسَلَمَةَ بنِ الأَكْوَعِ، وأُمِّ سَلَمَةَ.

قال ابو عيسى: حديثُ أنسٍ حديثٌ حَسَنٌ صحيحٌ؛ وعليه العَمَلُ عندَ بعضِ أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، مِنْهُمْ: ابوبكرٍ، وعمرُ، وابنُ عَمرَ؛ وبِه يقولُ أحمدُ، وإسحاقُ، يقولان: يَبْدَأُ بالعَشَاءِ وإِنْ فَاتَتْهُ الصلاةُ فى الجماعةِ.

قال ابو عيسى: سمعتُ الجَارُوْدَ يقولُ: سمعتُ وكيعاً يقول فى هذا الحديثِ: يَبْدَأُ بالعَشَاءِ إذا كانَ الطَّعَامُ يُخَافُ فَسَادُهُ.

والذى ذَهَبَ إِلَيْهِ بَعْضُ أهلِ العلمِ مِنْ أَصْحَابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وَغَيْرِهِمْ أَشْبَهُ بالإِتّبَاعِ، وإِنَّمَا أَرَادُوْا أَلَّا يَقُوْمَ الرَّجُلُ إِلَى الصَّلَاةِ، وقَلْبُهُ مشغولٌ بسببِ شيءٍ.

[۳٦٠-] وقَدْ رُوِىَ عنِ ابنِ عباسٍ أَنَّه قال: لانَقُوْمُ إِلَى الصَّلَاةِ وَفِىْ أَنْفُسِنَا شيئٌ.

[۳٦١-] ورُوِىَ عن ابنِ عُمَرَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَنَّهُ قال: إِذَا وُضِعَ العَشَاءُ وأُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَابْدَأُوْا بالعَشَاءِ، قال : وَتَعَشَّى ابنُ عمرَ وهُوَ يَسْمَعُ قِرَاءَ ةَ الإِمَامِ؛ حدَّثَنا بذلك هنادٌ، نا عَبْدَةُ عن عُبَيْدِ اللّه، عن نافعٍ عن ابنِ عمرَ.

ترجمہ: پہلی حدیث (نمبر ۳۵۹) کو ابن شہاب زہری حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: وہ یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ پہنچتے ہیں اس حدیث کے ساتھ رسول اللہ ﷺ تک (اس جملہ کا مفہوم وہی ہے جو قال رسول اللہ کا ہے۔حدیث کا ترجمہ گذر چکا ہے) ——— احمد واسحاق رحمہما اللہ فرماتے ہیں: شام کے کھانے سے شروع کرے اگرچہ جماعت ہاتھ سے نکل جائے۔اور وکیع رحمہ اللہ نے اس حدیث کی تفسیر میں یہ بات کہی ہے کہ کھانے سے اس وقت شروع کرے جبکہ کھانے کے بگڑنے کا اندیشہ ہو۔اور جس مطلب کی طرف صحابہ میں سے بعض اہل علم گئے ہیں اس کی اتباع قرین صواب ہے۔اور انھوں نے یہ چاہا ہے کہ آدمی نماز کے لئے کھڑا نہ ہو درانحالیکہ اس کا دل کسی چیز میں اٹکا ہوا ہو (اور حدیث ۳٦٠ اور ۳٦١ کا ترجمہ اوپر آ گیا اور حدیث ۳٦١ کی سند میں عن عبید اللہ ہمارے نسخوں میں رہ گیا ہے۔وہ مصری نسخہ سے بڑھایا ہے)

بَابُ مَاجَاءَ فِی الصَّلَاةِ عند النُّعَاسِ

اونگھتے ہوئے نماز پڑھنا

جب آدمی پر نیند کا خمار سوار ہو تو نماز نہیں پڑھنی چاہئے، بلکہ پورے ہوش کی حالت میں نماز پڑھنی چاہئے، تاکہ وہ جو کچھ زبان سے ادا کر رہا ہے اس کو سمجھ بھی رہا ہو۔ اونگھتے ہوئے نماز پڑھنے میں اس بات کا امکان ہے کہ بے خبری میں اپنے لئے بددعا کرنے لگے اور وہ بددعا اس کے لئے وبالِ جان بن جائے۔ اور اس کی نوبت تہجد میں پیش آتی ہے۔ فرائض میں اولاً تو یہ نوبت ہی پیش نہیں آتی ثانیاً اگر نیند آئے گی تو بھی مقتدی کو آئے گی، اور مقتدی کی نماز کچھ پڑھے بغیر بھی مکمل ہو جاتی ہے، پس فرض نماز وقت ہی میں پڑھنی ضروری ہے۔ مذکورہ حکم نوافل کے لئے خاص طور پر تہجد کے لئے ہے۔

حدیث: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی اونگھنے لگے درانحالیکہ وہ نماز پڑھ رہا ہو تو چاہئے کہ وہ سو جائے تا آنکہ اس کی نیند چلی جائے یعنی جب نیند پوری ہو جائے تب نماز پڑھے۔ اس لئے کہ تم میں سے ایک جب نماز پڑھتا ہے درانحالیکہ وہ اونگھ رہا ہو تو ممکن ہے وہ استغفار کرتے ہوئے اپنے آپ کو بددعا دینے لگے''

[۱٤۹] باب ماجاء فی الصَّلاة عند النُّعَاسِ

[۳٦۲-] حدثنا هَارونُ بنُ إسحاق الهَمْدَانِیُّ، نا عَبْدَةُ بنُ سُلَيْمَانَ الْكِلَابِیُّ، عن هِشَامِ بنِ عُرْوَةَ، عن أَبِيهِ، عن عائشةَ، قالت: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: '' إِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّیْ فَلْيَرْقُدْ حَتّٰى يَذْهَبَ عنهُ النَّوْمُ، فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا صَلّٰى وَهُوَ يَنْعَسُ، فَلَعَلَّهُ يَذْهَبُ لِيَسْتَغْفِرَ فَيَسُبَّ نَفْسَهُ!''

وفی الباب: عن أنسٍ وأبی هريرةَ. قال أبو عيسى: حديثُ عائشةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

بَابُ مَاجَاءَ مَنْ زَارَ قَوْمًا فَلَا يُصَلِّ بِهِمْ

اجازت کے بغیر مہمان نماز نہ پڑھائے

یہ مسئلہ پہلے (۱:۵٦۷ میں) ضمناً گذرا ہے کہ جو شخص کسی کی عملداری میں جائے وہ حاکم کی اجازت کے بغیر امامت نہ کرائے۔ اور گھر والا اپنے گھر کا سلطان ہے، لہٰذا اگر وہاں با جماعت نماز پڑھی جا رہی ہو تو مہمان کو امامت کے لئے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ امامت میزبان کا حق ہے۔ البتہ اگر میزبان اجازت دیدے یا اس میں امامت کی صلاحیت نہ ہو تو پھر مہمان امام بن سکتا ہے۔

حدیث: ابوعطیہ عقیلی کہتے ہیں: مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ ہماری مسجد میں آیا کرتے تھے اور حدیثیں بیان کرتے تھے۔ ایک دن دورانِ سبق یا دورانِ وعظ نماز کا وقت ہوگیا، چنانچہ ان کو وہیں نماز پڑھنی پڑھی لوگوں نے ان سے امامت کی درخواست کی، انھوں نے فرمایا: چاہئے کہ تم میں سے کوئی آگے بڑھے، اور میں امامت کیوں نہیں کررہا اس کی وجہ بتاؤنگا۔ پھر انھوں نے حدیث سنائی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب کوئی شخص کسی قوم کی زیارت کے لئے جائے یعنی وہاں مہمان بن کر جائے تو وہ وہاں امامت نہ کرے، اور چاہئے کہ انہی میں سے کوئی شخص امامت کرے۔

سوال: یہاں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب لوگوں نے اجازت دیدی تو پھر امامت سے کیا چیز مانع ہوئی؟ اجازت کے بعد تو زائر کے لئے امام بننے کا جواز ہے؟

جواب: جس حدیث میں استثناء ہے حضرت مالک کو وہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی۔ اور حضرت کی حدیث میں استثناء نہیں ہے اس لئے حضرت نے امامت نہیں کی۔ اور اس سے بہتر جواب یہ ہے کہ مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ چاہتے تھے کہ لوگ اس واقعہ کے ذریعہ حدیث کو یاد رکھیں۔ اگر حضرت نماز پڑھا دیتے تو اس حدیث کو یاد رکھنے کے لئے بطور خاص کوئی واقعہ نہ ہوتا، پس حدیث بعض کو یاد رہتی اور بعض بھول جاتے، اور امامت سے انکار کے بعد اب سب کو یہ حدیث یاد رہے گی۔

[۱۵۰] باب ماجاء من زَارَ قَوْماً فلا يُصَلِّ بهم

[۳۶۳-] حدثنا هَنَّادٌ ومَحمودُ بنُ غَيْلَانَ، قالا: نا وكيعٌ، عن أبانَ بنِ يَزِيْدَ العَطَّارِ، عن بُدَيْلِ بنِ مَيْسَرَةَ العُقَيْلِيِّ، عن أبي عَطِيَّةَ رجلٍ مِّنْهُمْ قال: كانَ مالِكُ بنُ الحُوَيْرِثِ يَأْتِينَا فِي مُصَلَّانَا يَتَحَدَّثُ فَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ يَوْمًا فَقُلْنَا له تقدَّمْ، فقال: لِيَتَقَدَّمْ بَعْضُكُمْ، حَتّٰى أُحَدِّثَكُمْ لِمَ لَا أَتَقَدَّمُ؟ سَمِعْتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ: "مَنْ زَارَ قَوْمًا فَلَا يَؤُمُّهُمْ وَلْيَؤُمُّهُمْ رَجُلٌ مِنْهُمْ"

قال أبو عيسى: هٰذَا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ والعَمَلُ على هذا عندَ أَكْثَرِ أهلِ العلمِ من أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغيرِهم، قالوا: صاحِبُ المَنْزِلِ أَحقُّ بالإمامةِ مِن الزَّائِرِ.

وَقَالَ بعضُ أهلِ العلمِ: إِذَا أُذِنَ لَهُ فَلَا بَأْسَ أَنْ يُصَلِّيَ بِهِ.

وقال إسحاقُ بِحَديثِ مالكِ بنِ الحُوَيْرِثِ، وَشَدَّدَ فِي أَنْ لَّا يُصَلِّيَ أَحَدٌ بِصَاحِبِ الْمَنْزِلِ، وإِنْ أَذِنَ لَهُ صاحبُ المنزلِ، قالَ: وَكَذٰلِكَ فِي الْمَسْجِدِ لَا يُصَلِّيْ بِهِمْ فِي الْمَسْجِدِ إِذَا زَارَهُمْ، يَقُوْلُ لِيُصَلِّ بِهِمْ رَجُلٌ مِنْهُمْ.

ترجمہ: اس پر اکثر صحابہ وغیرہ کا عمل ہے۔ وہ فرماتے ہیں: گھر کا مالک مہمان سے زیادہ امامت کا حقدار ہے۔ اور بعض اہل علم کہتے ہیں: جب گھر والا اجازت دیدے تو مہمان کے لئے نماز پڑھانے میں کوئی مضائقہ نہیں (تمام نسخوں میں بہ ہے، حالانکہ بھم ہونا چاہئے) اور اسحاق بن راہویہ: مالک بن الحویرث کی حدیث ہی کو لیتے ہیں اور انھوں نے اس میں سختی کی ہے کہ گھر کے مالک کو کوئی شخص نماز نہ پڑھائے اگرچہ گھر والا اس کو اجازت دے (اور) فرمایا: مسجد کے لئے بھی یہی حکم ہے، مہمان لوگوں کو مسجد میں نماز نہ پڑھائے جب وہ ان سے ملنے جائے، بلکہ کہے: آپ ہی لوگوں میں سے کوئی شخص نماز پڑھائے۔

بابُ ماجاء فی کَرَاهِيَةِ أَنْ يَّخُصَّ الإِمَامُ نَفْسَهُ بالدُّعَاءِ

امام صرف اپنے لئے دعا کرے یہ بات مکروہ ہے

امام سب نمازیوں کی طرف سے نمائندہ ہوتا ہے۔ پس اس کو اپنے ہی لئے دعا نہیں کرنی چاہئے۔ بلکہ دعا میں اپنے مقتدیوں کو بھی شامل کرنا چاہئے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: ''امام کا مقتدیوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو دعا میں خاص کر لینا مقتدیوں کے ساتھ خیانت ہے'' مگر ہم عجمی لوگ نماز میں تو دعا مانگنے پر قادر نہیں، کچھ ماثورہ دعائیں یاد کر لی ہیں ان کو بغیر سمجھے پڑھ لیتے ہیں، ان کا صیغہ تک بدل نہیں سکتے۔ اس لئے علماء نے اس کا حل یہ نکالا ہے کہ نماز کے بعد ہر شخص اپنی حاجت مانگے اور اپنی زبان میں مانگے۔ اور امام اپنی دعا میں مقتدیوں کو بھی شامل کرے۔ مگر لوگوں نے نمازوں کے بعد جہراً دعا مانگنا شروع کر دیا۔ امام کچھ ماثورہ دعائیں پڑھ لیتا ہے اور جہاں اس کا سانس ٹوٹتا ہے مقتدی آمین کہہ دیتے ہیں۔ نہ امام نے سمجھا کہ اس نے کیا مانگا اور نہ مقتدیوں ہی کو پتا چلا کہ امام نے کیا مانگا۔ ایسی دعا لاحصل ہے، اب دعا محض رسم ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ ماثورہ دعائیں تو قعدہ اخیرہ میں پڑھ لینا کافی تھا۔ نماز کے بعد ان کو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے دعا سراً ہونی چاہئے اور ہر شخص کو اپنی حاجت خود مانگنی چاہئے۔ اور کبھی لوگوں کو دعا مانگنے کا طریقہ سکھلانے کے لئے یا اگر سب کی حاجت مشترک ہو تو پھر جہراً دعا مانگی جاسکتی ہے۔

حدیث: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ دوسرے شخص کے گھر میں دیکھے تا آنکہ اس سے اجازت لیلے۔ اگر اس نے اجازت حاصل کئے بغیر دوسرے کے گھر میں جھانک لیا تو وہ اس میں داخل ہو گیا۔ اور کوئی شخص کسی قوم کی امامت نہ کرے پس وہ خود کو ان کے ورے دعا میں خاص کر لے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس نے مقتدیوں کے ساتھ خیانت کی۔ اور چھوٹے بڑے استنجے یا ریح کے دباؤ کے وقت نماز نہ پڑھے''

تشریح: اس حدیث میں تین مسئلے ہیں:

پہلا مسئلہ: اجازت حاصل کئے بغیر نہ تو کسی کے گھر میں داخل ہو اور نہ ہی اس کے اندر جھانکے، بخاری شریف

میں ہے: إنَّمَا جُعِلَ الاستئذانُ من أجل البَصَر یعنی اجازت طلب کرنے کا حکم نظر ہی کی وجہ سے ہے تا کہ کسی کی نامناسب حالت پر دوسرے کی نظر نہ پڑے (حدیث ۶۲۴۱) اجازت حاصل کرنے سے پہلے کسی کے گھر میں جھانک لینے سے استئذان کا مقصد فوت ہوجاتا ہے پس اس سے احتراز ضروری ہے۔ اور اس میں لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ دروازے کے سامنے کھڑے ہوکر اجازت طلب کرتے ہیں۔ اور عورتیں تو اجازت لینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتیں، وہ ہر گھر کو اپنا گھر سمجھتی ہیں اور گھس آتی ہیں اور طالب علم بھی ایک دوسرے کے کمروں میں بے اجازت داخل ہوجاتے ہیں۔ یہ سب غلط طریقے ہیں ان کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

دوسرا مسئلہ: امام کو دعا کے ساتھ اپنے کو خاص نہیں کرنا چاہئے۔ یہ مقتدیوں کے ساتھ خیانت ہے۔ یہی مسئلہ باب میں مقصود ہے۔

تیسرا مسئلہ: چھوٹے بڑے استنجے کے دباؤ کے وقت اسی طرح ریح کے دباؤ کے وقت نماز شروع نہیں کرنی چاہئے بلکہ پہلے فراغت حاصل کرلے پھر نماز پڑھے ورنہ نماز کے اندر ذہن استنجے ہی کی طرف رہے گا اور یہ چیز نماز کی روح خشوع وخضوع سے محرومی کا سبب بنے گی۔

[۱۵۱] باب ماجاء فی کراهیة أن یَّخُصَّ الإمامُ نفسَه بالدعاء

[۳٦٤-] حدثنا عَلِيُّ بنُ حُجْرٍ، نا إسماعیلُ بنُ عَیَّاشٍ، قال: حَدَّثَنِیْ حَبِیْبُ بنُ صَالِحٍ، عن یزیدَ بنِ شُرَیْحٍ، عن أبی حَیٍّ الْمُؤَذِّنِ الحِمْصِیِّ، عن ثَوْبَانَ، عَنِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم قال: " لَایَحِلُّ لِامْرِیٍٔ أَنْ یَنْظُرَ فِیْ جَوْفِ بَیْتِ امْرِیٍٔ حَتّٰی یَسْتَأْذِنَ، فَإِنْ نَظَرَ فَقَدْ دَخَلَ، وَلَا یَؤُمُّ قَوْمًا فَیَخُصُّ نَفْسَه بِدَعْوَةٍ دُوْنَهُمْ، فَإِنْ فَعَلَ فَقَدْ خَانَهُمْ، وَلَا یَقُومُ إِلَی الصلاةِ وَهُوَ حَقِنٌ"

وفی الباب: عن أبی هریرةَ، وأبی أُمَامَةَ. قال أبو عیسی: حدیثُ ثوبانَ حدیثٌ حسنٌ.

وقَدْ رُوِیَ هذا الحدیثُ عن مُعَاوِیَةَ بنِ صالحٍ، عن السَّفْرِ بنِ نُسَیْرٍ، عن یَزِیْدَ بنِ شُرَیْحٍ، عن أبی أُمَامَةَ، عن النبیِّ صلی الله علیه وسلم.

وَرُوِیَ هٰذَا الحدیثُ عن یَزِیْدَ بنِ شُرَیْحٍ، عن أَبِی هریرةَ، عن النبیِّ صلی الله علیه وسلم.

وکَأَنَّ حدیثَ یزیدَ بنِ شُریحٍ، عن أبی حیٍّ المؤذنِ، عن ثوبانَ فی هذا أَجْوَدُ إسناداً وَأَشْهَرُ.

وضاحت: امام ترمذی رحمہ اللہ نے حدیث باب کی تین سندیں ذکر کی ہیں: پہلی سند حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے، یہی عمدہ اور مشہور سند ہے۔ دوسری سند: حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے اور تیسری حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے (ان دوسندوں کے بارے میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے کچھ نہیں فرمایا صرف پہلی

سند کو عمدہ اور مشہور قرار دیا ہے)

بَابُ مَاجَاءَ مَنْ أَمَّ قَوْمًا وَهُمْ لَهُ كَارِهُوْنَ

جس کو مقتدی ناپسند کریں اس کا امامت کرنا

حدیث: آنحضرت ﷺ نے تین آدمیوں پر لعنت فرمائی:

اول: وہ شخص جو کسی قوم کی امامت کرے درانحالیکہ لوگ اس کی امامت کو ناپسند کرتے ہوں ——— اور یہ ناگواری دنیاوی جھگڑے اور دنیاوی اسباب کی بنا پر نہ ہو بلکہ کسی دینی وجہ سے ہو۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے مرقات شرح مشکوۃ میں اس کی تین وجہیں بیان کی ہیں۔ ایک: امام کا جاہل ہونا، مثلاً وہ صحیح قرآن نہیں پڑھتا یا نماز کے بنیادی مسائل سے واقف نہیں اس لئے لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں، دوسری وجہ: وہ فاسق وفاجر ہے، برملا گناہ کرتا ہے، سنیما دیکھتا ہے یا کسی اور برائی میں مبتلا ہے اس لئے لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں۔ تیسری وجہ: وہ بدعتی ہے اور مقتدی اہل السنہ والجماعۃ میں سے ہیں اس لئے امام کو ناپسند کرتے ہیں۔ پس ایسے شخص کی امامت مکروہ تحریمی ہے۔ اور اگر ناپسندیدگی کی وجہ مقتدیوں میں پائی جاتی ہو، مثلاً امام اہل السنہ میں سے ہے دیوبندی ہے، اور مقتدی بدعتی ہیں اس لئے وہ امام کو ناپسند کرتے ہیں تو پھر مقتدی ملعون ہیں، ایسے مقتدیوں کی ناراضگی کا قطعاً اعتبار نہیں۔

دوم: وہ عورت جو پوری رات اس حال میں گذارے کہ اس کا شوہر اس سے ناراض ہو تو اس پر بھی لعنت ہے، دن بھر شوہر کے ناراض رہنے سے عورت ملعون نہیں ہوتی کیونکہ ممکن ہے عورت کو دن میں شوہر کے ساتھ تنہائی کا موقع نہ ملے، مگر رات میں میاں بیوی تنہائی میں ہوجاتے ہیں پھر بھی عورت شوہر کو راضی نہ کرے تو وہ ملعون ہے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اس کی بھی تین وجوہ بیان کی ہیں: (۱) نافرمانی: یعنی عورت شوہر کا کہنا نہیں مانتی (۲) بد اخلاقی یعنی عورت بے ادب ہے اس کا شوہر کے ساتھ رکھاؤ ٹھیک نہیں (۳) بددینی: مثلاً وہ بے پردہ پھرتی ہے، نمازوں کا اہتمام نہیں کرتی۔ اگر مذکورہ وجوہ میں سے کسی وجہ سے شوہر ناراض ہو تو رات پوری ہونے سے پہلے عورت کو چاہئے کہ شوہر کو راضی کرلے ورنہ وہ گناہ گار ہوگی ——— اور اگر ناراضگی کی وجہ شوہر میں ہے مثلاً وہ بد اخلاق ہے، اس کا برتاؤ ٹھیک نہیں، وہ بددین ہے، وقت ناوقت گھر پہنچتا ہے اس لئے عورت ناراض ہے تو ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے: فالأمر بالعکس یعنی اب ملعون اور گناہ گار شوہر ہوگا، عورت پر کوئی گناہ نہیں۔

سوم: وہ شخص جو حَيَّ علی الفلاح سنے اور جواب نہ دے۔ یہاں اجابت قولی مراد نہیں، ورنہ یوں کہا جاتا کہ جو اذان سنے اور جواب نہ دے، بلکہ اجابت فعلی مراد ہے یعنی جو نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں نہ جائے گھر ہی میں نماز پڑھ لے وہ ملعون ہے۔ البتہ اگر کسی عذر شرعی کی وجہ سے جماعت سے پیچھے رہے تو پھر گناہ نہیں اور ترک جماعت کے

اعذار اکیس ہیں (دیکھئے درمختار ۲: ۲۹۲ باب الاقامۃ، مطبع زکریا)

اور اسی قسم کی حدیثوں کی بناء پر امام احمد رحمہ اللہ نے اجابتِ فعلی کو فرض اور ابن الہمام رحمہ اللہ وغیرہ نے واجب کہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سنت کے تارک پر لعنت روا نہیں۔ اور جمہور جماعت کو سنت مؤکدہ اشد تاکید کہتے ہیں۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ بیشک عام سنت پر لعنت روا نہیں مگر سنت مؤکدہ اشد تاکید قریب من الواجب ہوتی ہے پس اس کا تارک ملعون ہے۔ اور ثمرۂ اختلاف یہ ہے کہ بغیر عذر گھر میں نماز پڑھنے والے کی نماز امام احمد اور ابن الہمام رحمہما اللہ کے نزدیک صحیح نہیں۔ اور جمہور کے نزدیک ذمہ فارغ ہوجائے گا۔ تفصیل گذر چکی ہے (دیکھیں ۱: ۵۴۰)

یاد رکھنا چاہئے کہ باب کی حدیث درحقیقت مرسل ہے یعنی اس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں، اور اس کو محمد بن القاسم الاسدی نے مرفوع متصل کیا ہے اور وہ ضعیف راوی ہے۔ مگر اس سے مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا کیونکہ باب میں دوسری روایتیں موجود ہیں۔

فائدہ: امام احمد رحمہ اللہ نے کثرتِ رائے کا اعتبار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: چند مقتدیوں کے ناراض ہونے سے کسی شخص کا امامت کرنا مکروہ نہیں، اگر امام سے اکثر مقتدی ناراض ہوں تو امامت مکروہ ہے۔ اور احناف قلت وکثرت کا اعتبار نہیں کرتے بلکہ اگر ذی علم اور سمجھ دار لوگ امام سے ناراض ہیں تو پھر امامت مکروہ ہے، خواہ وہ تعداد میں کم ہوں۔

[۱۵۲] باب ماجاء من أَمَّ قَوْمًا وهُمْ لَهُ كارِهُوْنَ

[۳٦٥-] حدثنا عبدُ الأعلى بنُ واصلٍ الكوفيُّ، نا محمدُ بنُ قَاسِمٍ الأَسَدِيُّ، عن الفَضْلِ بنِ دَلْهَمٍ، عن الحسنِ، قال: سمعتُ أنسَ بنَ مالكٍ قال: لَعَنَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم ثلاثةً: رجلٌ أَمَّ قَوْمًا وَهُمْ لَهُ كَارِهُوْنَ، وامْرَأَةٌ بَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَلَيْهَا سَاخِطٌ، ورجلٌ سمعَ حيَّ عَلَى الفلاحِ، ثُمَّ لَمْ يُجِبْ.

وفي الباب: عن ابنِ عباسٍ، وطلحةَ، وعبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، وأبي أُمَامَةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ أنسٍ لَايَصِحُّ: لِأَنَّهُ قَدْ رُوِيَ هذا عن الحسنِ عنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم مُرْسَلٌ.

قال أبو عيسى: ومحمدُ بنُ القاسِمِ تكَلَّمَ فيه أحمدُ بنُ حَنْبَلٍ، وَضَعَّفَهُ، وَلَيْسَ بِالحافِظِ.

وقَدْ كَرِهَ قَوْمٌ من أهلِ العلمِ أَنْ يَؤُمَّ الرَّجُلُ قَوْمًا وَهُمْ لَهُ كَارِهُوْنَ، فَإِذَا كَانَ الإِمَامُ غَيْرَ ظَالِمٍ، فَإِنَّمَا الإِثْمُ عَلَى مَنْ كَرِهَهُ.

وقال أحمدُ وإسحاقُ فِيْ هذا: إذا كَرِهَ وَاحِدٌ أوِ اثْنَانِ أو ثلاثةٌ فلَا بَأْسَ ان يُصَلِّيَ بهم حتّٰى يَكْرَهَهُ

أَكْثَرُ القومِ.

[۳۶۶-] حدثنا هنادٌ، نا جَرِيرٌ، عن مَنْصُوْرٍ، عن هِلالِ بنِ يَسَافٍ، عن زيادِ بنِ أبى الجَعْدِ، عن عَمْرِو بنِ الحارثِ بنِ المُصْطَلِقِ، قال: كانَ يُقَالُ: أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اثْنَانِ: امْرَأَةٌ عَصَتْ زَوْجَهَا، وإمامُ قومٍ وَهُمْ لَهُ كَارِهُوْنَ.

قال جريرٌ: قالَ منصورٌ: فَسَأَلْنَا عن أَمْرِ الإِمَامِ؟ فقيلَ لَنَا: إِنَّمَا عَنَى بِهٰذَا الأَئِمَّةَ الظَّلَمَةَ، فَأَمَّا مَنْ أَقَامَ السُّنَّةَ فَإِنَّمَا الإِثْمُ عَلَى مَنْ كَرِهَهُ.

[۳۶۷-] حدثنا محمدُ بنُ إسماعيلَ، نا عليُّ بنُ الحسنِ، نا الحسينُ بنُ واقِدٍ، قال: نا أبو غالِبٍ، قال: سمعتُ أبا أُمَامَةَ يقولُ: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "ثَلَاثَةٌ لَاتُجَاوِزُ صَلَاتُهُمْ آذَانَهُمْ: العَبْدُ الآبِقُ حَتّٰى يَرْجِعَ، وامْرَأَةٌ باتت وزوجُها عليها سَاخِطٌ، وإمامُ قومٍ وهُمْ له كَارِهُوْنَ"

قال أبو عيسىٰ: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ من هذا الوجهِ. وأبو غالبٍ اسْمُهُ حَزَوَّرٌ.

ترجمہ: (حدیث ۳۶۵) رسول اللہ ﷺ نے تین شخصوں پر لعنت فرمائی: ایک: وہ شخص جو کسی قوم کی امامت کرے درانحالیکہ وہ اس کو ناپسند کرنے والے ہیں۔ (دوم) اور وہ عورت جس نے رات گذاری درانحالیکہ اس کا شوہر اس پر ناراض ہے (سوم) اور وہ شخص جو حی علی الفلاح (یعنی اذان) سنے اور جواب نہ دے ——— امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح نہیں، اس لئے کہ یہ حدیث حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے روایت کی گئی ہے اور وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں (پس یہ حدیث) مرسل ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: محمد بن القاسم میں امام احمد نے کلام کیا ہے اور اس کی تضعیف کی ہے اور وہ حافظ (حدیثوں کو خوب یاد کرنے والا) نہیں ہے (اور وہی حدیث کو مرفوع متصل کرتا ہے پس اس کا اعتبار نہیں)

اور اہل علم کی ایک جماعت نے اس کو ناپسند کیا ہے کہ کوئی شخص کسی قوم کی امامت کرے درانحالیکہ وہ اس کو ناپسند کرتے ہوں۔ پس جب امام ظالم نہ ہو یعنی ناگواری کی وجہ اس میں نہ پائی جاتی ہو تو گناہ انہیں لوگوں پر ہے جو اس کو ناپسند کرتے ہیں۔

اور امام احمد اور اسحاق رحمہما اللہ نے حدیث کی شرح میں فرمایا: جب امام کو ایک یا دو شخص یا تین شخص ناپسند کریں تو کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کو نماز پڑھائے، یہاں تک کہ اس کو اکثر لوگ ناپسند کریں۔

(حدیث ۳۶۶) عمرو بن الحارث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: کہا جاتا تھا کہ قیامت کے دن سب سے سخت عذاب دو شخصوں کو ہوگا: (ایک:) وہ عورت جو اپنے شوہر کی نافرمانی کرتی ہے (دوم) کسی قوم کا امام درانحالیکہ وہ اس کو ناپسند کرتے ہوں۔ حدیث کے راوی جریر کہتے ہیں: ہمارے استاذ منصور نے فرمایا: ہم نے امام کے معاملہ میں دریافت کیا

(کہ اس سے کونسا امام مراد ہے؟) تو ہم سے کہا گیا: اس سے ظالم ائمہ (حکام) ہی مراد ہیں۔ پس رہا وہ امام (حاکم) جو دینی راہ برپا کرے تو گناہ اسی پر ہوگا جو اس کو ناپسند کرے یعنی امام حکومت کا عہدہ دار ہو، اور چونکہ ہر منتظم سے کچھ لوگ ناراض ہوتے ہیں مگر وہ متبع شریعت ہو تو پھر لوگ معلون ہونگے جو اس امام سے ناراض ہیں۔ اور اگر امام کے کرتوت خلافِ شرع ہیں مگر اس کے خلاف زبان کھولنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے اس لئے لوگ خاموش ہیں تو ایسا امام (حاکم) ملعون ہے۔

(حدیث ۳۶۷) نبی ﷺ نے فرمایا: تین شخصوں کی نمازیں ان کے کانوں سے آگے نہیں بڑھتیں یعنی قبول نہیں ہوتیں، اگرچہ ذمہ فارغ ہوجاتا ہے: (ایک) بھاگنے والا غلام یہاں تک کہ (مولی کے پاس) لوٹ آئے (دوم) وہ عورت جس نے پوری رات گذاری درانحالیکہ اس کا شوہر اس سے ناراض ہے (سوم) کسی قوم کا امام جس کو لوگ ناپسند کرتے ہیں ـــــ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اس سند سے حسن غریب ہے۔ اور ابو غالب کا نام حَزَوَّرْ ہے۔

نوٹ: کان یقال سے حدیث حکماً مرفوع ہوجاتی ہے۔

بابُ ماجاءَ إِذَا صَلَّى الإِمَامُ قَاعِدًا فَصَلُّوْا قُعُوْدًا

معذور امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو غیر معذور مقتدی بیٹھ کر نماز پڑھیں

اگر امام معذوری کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھائے تو مقتدی کیا کریں؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام اعظم، امام شافعی اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کے نزدیک ایسے معذور امام کی اقتداء درست ہے اور جو مقتدی قیام پر قادر ہیں وہ کھڑے ہوکر اقتداء کریں گے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب بیان کیا ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ یہ امام مالک رحمہ اللہ کی ایک روایت ہے، اور امام مالک کا مذہب اور امام محمد رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ ایسے معذور امام کی اقتداء میں قیام پر قادر مقتدیوں کا نماز پڑھنا درست نہیں۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اگر معذور امام شروع ہی سے بیٹھ کر نماز پڑھا رہا ہے تو مقتدی بیٹھ کر اقتداء کریں۔ اور اگر امام کو درمیان نماز میں عذر پیش آیا اور وہ بیٹھ گیا تو مقتدی کھڑے کھڑے اقتداء کریں۔

اس مسئلہ میں دو فعلی روایتیں ہیں اور ایک قولی:

پہلا واقعہ: سن ۵ ہجری کا واقعہ ہے۔ آنحضرت ﷺ گھوڑے پر سوار ہوکر کہیں تشریف لے جارہے تھے۔ اچانک گھوڑا بدک گیا اور وہ آپؐ کو لے کر بے تحاشہ بھاگا اور ایک کھجور کے درخت کے قریب سے اس طرح گذرا کہ آپؐ کا پاؤں درخت سے رگڑ کھا گیا، آپؐ گھوڑے سے گر پڑے اور آپؐ کی کمر سے نیچے تک کا حصہ زخمی ہوگیا۔ اس موقع پر آپؐ نماز پڑھانے کے لئے تشریف نہیں لاتے تھے۔ آپؐ کا قیام ایک مَشْرُبَۃ میں تھا یعنی حضرت عائشہ رضی

اللہ عنہا کے حجرہ کے اوپر کمرہ تھا اس میں آپ قیام فرما رہے اور علاج ہوتا رہا۔ اس اثنا میں مسجد نبوی میں نماز کس نے پڑھائی؟ احادیث میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اسی موقعہ کا واقعہ ہے ایک دفعہ آنحضور ﷺ بیٹھے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ چند صحابہ عیادت کے لئے پہنچ گئے۔ انھوں نے موقع غنیمت جان کر کھڑے کھڑے آپ کی اقتداء کرلی۔ آپؐ نے ان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نماز کے بعد یہ مسئلہ بتایا کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ پس جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو ـــــ آنحضرت ﷺ کا صحابہ کو بیٹھنے کے لئے اشارہ فرمانا فعلی حدیث ہے۔ پھر مسئلہ بتایا کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یہ قولی حدیث ہے۔

دوسرا واقعہ: آپؐ کے مرضِ موت کا ہے۔ مرضِ موت کے آغاز میں آپؐ پر بار بار غشی طاری ہوتی تھی۔ آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس حکم بھیجا کہ وہ عشاء کی نماز پڑھائیں۔ انھوں نے نماز پڑھانی شروع کی۔ اس کے بعد آپؐ نے بیماری میں افاقہ محسوس کیا اور حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے سہارے تشریف لائے۔ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے آپؐ کی آمد محسوس کی تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ آنحضور ﷺ نے اشارہ بھی کیا کہ وہ نماز پڑھاتے رہیں مگر ان کی ہمت نہ ہوئی، آپؐ امام کی بائیں جانب بٹھا دیئے گئے۔ اور آپؐ نے درمیان سے نماز پڑھانی شروع کی۔ مقتدیوں نے کھڑے کھڑے اقتداء کی۔

امام احمد رحمہ اللہ نے دونوں حدیثوں کو جمع کیا ہے، انھوں نے فرمایا: پہلے واقعہ میں امام کا عذر اصلی تھا، یعنی وہ شروع ہی سے معذور تھا اس لئے بیٹھ کر اقتداء کا حکم دیا گیا۔ اور دوسرے واقعہ میں عذر طاری تھا یعنی معذور امام درمیان میں آیا تھا اس لئے لوگوں نے کھڑے کھڑے اقتداء کی۔ امام اعظم، امام شافعی اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ فرماتے ہیں: یہ روایتیں ناسخ منسوخ ہیں۔ لہٰذا مرضِ موت والے واقعہ کو معمول بہا بنائیں گے، کیونکہ وہ بعد کا واقعہ ہے اور پہلا واقعہ جس میں آپؐ نے مقتدیوں کو اشارہ سے بٹھا دیا تھا منسوخ ہے۔ اور امام مالک اور امام محمد رحمہما اللہ نے ان دونوں واقعوں کے ساتھ آنحضور ﷺ کے ارشاد: لَا يَؤُمَّنَّ أحدٌ بعدي جالساً: یعنی میرے بعد کوئی شخص ہرگز بیٹھ کر امامت نہ کرائے: اس روایت کو بھی ملایا ہے۔ پس انھوں نے یہ مسئلہ طے کیا کہ ایسے معذور امام کے پیچھے قیام پر قادر لوگوں کی اقتداء صحیح نہیں اور فعلی روایتوں کو نبی ﷺ کے ساتھ خاص رکھا ہے۔ اور حدیث لَا يَؤُمَّنَّ أحد دار قطنی میں ہے اور بے حد ضعیف ہے اس کی ایک سند میں جابر جعفی کذاب ہے اور دوسری سند میں مجالد متروک راوی ہے اس لئے جمہور نے اس روایت کا اعتبار نہیں کیا۔

[١٥٣] باب ماجاء إِذَا صَلَّى الإمامُ قاعداً فصلوا قعوداً

[٣٦٨-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ، عن ابنِ شهابٍ، عن أنسِ بنِ مالكٍ، قال: "خَرَّ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم عَنْ فَرَسٍ فَجُحِشَ، فَصَلَّى بِنَا قَاعِدًا، فَصَلَّيْنَا مَعَهُ قُعُودًا، ثُمَّ انْصَرَفَ، فَقَالَ: "إِنَّمَا

الإِمَامُ أَوْ قَالَ: إِنَّمَا جُعِلَ الإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ، فَإِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا، وَإِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا، وَإِذَا رَفَعَ فَارْفَعُوْا، وَإِذَاقَالَ: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، فقولوا: رَبَّنَا ولكَ الحمدُ، وَإِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا، وإِذَا صَلَّى قَاعِدًا فَصَلُّوْا قُعُوْدًا أَجْمَعُوْنَ"

وفي الباب: عن عائشةَ، وأبي هريرةَ، وجابرٍ، وابنِ عُمرَ، ومعاويةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ أنسٍ أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم خَرَّ عن فَرَسٍ فَجُحِشَ: حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وقَدْ ذَهَبَ بعضُ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم إلى هذا الحديثِ، مِنْهُمْ جَابِرُ بْنُ عبدِ اللّٰهِ، وأُسَيْدُ بنُ حُضَيْرٍ، وأبو هريرةَ، وغيرُهُمْ، وبهذا الحديثِ يقولُ أحمدُ وإسحاقُ.

قالَ بَعْضُ أهلِ العلمِ: إِذَا صَلَّى الإِمَامُ جَالِسًا: لَمْ يُصَلِّ مَنْ خَلْفَهُ إِلَّا قِيَامًا، فَإِنْ صَلُّوْا قُعُوْدًا لَمْ يُجْزِهِمْ؛ وهو قولُ سفيانَ الثوريِّ، ومالكِ بنِ أنسٍ، وابنِ المبارَكِ، والشافعيِّ.

ترجمہ: اس حدیث کا بیان جس میں یہ مضمون آیا ہے کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ گھوڑے سے گر گئے۔ پس آپ زخمی ہو گئے۔ آپؐ نے ہمیں بیٹھ کر نماز پڑھائی۔ پس ہم نے آپؐ کی بیٹھ کر اقتداء کی، پھر جب آپؐ نے سلام پھیرا تو فرمایا: امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ لہٰذا جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو۔ اور جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، اور جب وہ رکوع سے سر اٹھائے تو تم بھی سر اٹھاؤ، اور جب وہ تسمیع کرے تو تم تحمید کرو۔ اور جب وہ بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم سبھی بیٹھ کر نماز پڑھو۔ یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔ اور صحابہ میں سے بعض حضرات مثلاً حضرت جابر، حضرت اسید اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم وغیرہ اسی حدیث کی طرف گئے ہیں۔ اور احمد واسحاق رحمہما اللہ نے بھی اس حدیث کو اختیار کیا ہے۔ اور بعض اہل علم کہتے ہیں کہ جب امام بیٹھ کر نماز پڑھائے تو جو لوگ اس کے پیچھے ہیں وہ نماز نہیں پڑھیں گے مگر کھڑے ہو کر۔ پس اگر انھوں نے بیٹھ کر اقتداء کی تو ان کی نماز صحیح نہ ہوگی۔ اور یہ سفیان ثوری، امام مالک، ابن المبارک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا قول ہے۔

بابٌ منه

غیر معذور مقتدی: معذور امام کی کھڑے ہو کر اقتدا کریں

اس باب میں مصنف رحمہ اللہ بہت الجھے ہیں اور باب سے متعلق اور غیر متعلق سب روایتیں لے آئے ہیں، پس جاننا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کے مرضِ وفات کی مدت چودہ دن ہے۔ اس مدت میں آپؐ چار مرتبہ مسجد میں تشریف

لائے ہیں۔ پہلی مرتبہ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے سہارے تشریف لائے ہیں اس موقعہ پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نماز عشاء شروع کرا چکے تھے۔ اور ایک مرتبہ آنحضور ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں بیٹھ کر نماز پڑھی ہے۔ اور ایک مرتبہ آنحضور ﷺ نماز مغرب میں تشریف لائے ہیں۔ سر مبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور آپؐ نے مغرب میں سورۃ المرسلات پڑھی ہے۔ اور آخری مرتبہ وفات والے دن حجرہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر جماعت کا حال ملاحظہ فرمایا، پھر پردہ ڈال دیا، نماز میں شریک نہیں ہوئے۔ پس اس باب میں صرف پہلی روایت لانی چاہئے تھی، کیونکہ مسئلہ باب سے وہی متعلق ہے۔ باقی روایات کا مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔

[١٥٤] بابٌ منه

[٣٦٩-] حدثنا مَحمودُ بنُ غَيْلاَنَ، نا شَبَابَةُ، عن شُعْبَةَ، عَنْ نُعَيمِ بنِ أبى هِنْدٍ، عن أبى وائلٍ، عن مَسْرُوْقٍ، عن عائشةَ: قالَتْ: صَلّٰى رسولُ الله صلى الله عليه وسلم خَلْفَ أبىْ بكرٍ فى مَرَضِهِ الَّذِىْ مَاتَ فيه قاعداً.

قال أبو عيسى: حديثُ عائشةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ غريبٌ.

[٣٧٠-] وقد رُوِىَ عن عائشةَ عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم أنّه قال: " إِذَا صَلَّى الإمامُ جَالِسًا فَصَلُّوْا جُلُوْسًا"

[٣٧١-] ورُوِىَ عنها أنَّ النبىَّ صلى الله عليه وسلم خَرَجَ فى مَرَضِهِ، وأبوبكرٍ يُصَلِّىْ بِالنَّاسِ، فَصَلّٰى إلى جَنْبِ أبى بَكْرٍ، والنَّاسُ يَأْتَمُّوْنَ بأبى بَكْرٍ وأبو بكرٍ، يَأْتَمُّ بِالنبىِّ صلى الله عليه وسلم.

[٣٧٢-] وَرُوِىَ عنها: أنَّ النبىَّ صلى الله عليه وسلم صَلّٰى خَلْفَ أبى بَكْرٍ قَاعِدًا.

[٣٧٣-] ورُوِىَ عن أنسِ بنِ مالكٍ: أنَّ النبىَّ صلى الله عليه وسلم صَلّٰى خَلْفَ أبى بكرٍ وَهُوَ قَاعِدٌ، حدثنا بذلك عبدُ اللهِ بنُ أبى زِيَادٍ، نا شَبَابَةُ بنُ سَوَّارٍ، نا محمدُ بنُ طَلحةَ، عن حُمَيْدٍ، عن ثابتٍ، عن أنسٍ، قال: صَلّٰى رسولُ الله صلى الله عليه وسلم فِىْ مَرَضِهِ خَلْفَ أبى بكرٍ قاعِدًا فِىْ ثَوْبٍ مُتَوَشِّحًا بِهِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وهكذا رَوَاه يحيىَ بنُ أيوبَ، عن حُميدٍ، عن ثابتٍ، عن أنسٍ، وقد رَوَاه غيرُ واحدٍ عن حُميدٍ، عن أنسٍ، ولم يذكرُوا فيه عن ثابتٍ، ومن ذَكَرَ فِيْهِ عن ثابتٍ فَهُوَ أَصَحُّ.

ترجمہ: (حدیث ۳۶۹) صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے اس مرض میں جس میں آپ نے وفات پائی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی حدیث (۳۷۰) اور صدیقہ سے یہ قولی روایت بھی مروی

ہے کہ "جب امام بیٹھ کر نماز پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر نماز پڑھو" (حدیث ۳۷۱) اور صدیقہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کا یہ واقعہ بھی بیان کرتی ہیں کہ آپ اُپنے مرض کے زمانہ میں نکلے درانحالیکہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے۔ پس آنحضور ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھی درانحالیکہ لوگ ابوبکرؓ کی اقتداء کررہے تھے اور وہ آنحضرت ﷺ کی اقتداء کررہے تھے (صرف یہی ایک حدیث اس باب سے متعلق ہے۔ چونکہ آنحضرت ﷺ کی آواز پست ہوگئی تھی اس لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بآواز بلند تکبیر کہتے تھے اور لوگ اسی کو سن کر ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہوتے تھے اس لئے کہہ دیا کہ لوگ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء کررہے تھے، پس یہ مجازی تعبیر ہے) (حدیث ۳۷۲) اور صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں بیٹھ کر نماز پڑھی (یہ تکرار ہے) (حدیث ۳۷۳) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے مرضِ موت میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی، درانحالیکہ آپ ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے تھے (یہ چوتھا آخری واقعہ ہے پھر اسی دن آپؐ کی وفات ہوگئی) بعض رواۃ نے اس حدیث کی سند میں حمید اور حضرت انس کے درمیان ثابت کا واسطہ بڑھایا ہے، اور بعض یہ واسطہ نہیں بڑھاتے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ واسطہ والی سند صحیح ہے۔

بابُ ماجاء فی الإمَامِ یَنْهَضُ فی الرَّکْعَتَیْنِ ناسیًا

قعدۂ اولیٰ بھول کر کھڑا ہوجانے کا حکم

ثلاثی یا رباعی فرض نماز میں اگر نمازی قعدۂ اولیٰ بھول کر تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہوجائے تو اُسے واپس نہیں لوٹنا چاہئے بلکہ وہ نماز کو آگے جاری رکھے اور آخر میں سجدۂ سہو کرے نماز صحیح ہوجائے گی۔ اور اگر کوئی شخص کھڑا ہونے کے بعد قعدہ کی طرف لوٹ آئے تو بعض کتب فقہ میں لکھا ہے کہ اس کی نماز باطل ہوگئی، کیونکہ وہ فرض (قیام) سے واجب (قعدہ) کی طرف لوٹا، اس لئے نماز باطل ہوگئی۔ مگر یہ بات صحیح نہیں۔ کھڑے ہونے کے بعد قعدہ کی طرف لوٹنا اگرچہ غلط ہے مگر نماز باطل نہیں ہوتی، اور یہی مفتی بہ قول ہے اور سجدۂ سہو بہر صورت واجب ہوگا۔

حدیث: شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہمیں (کوفہ کے گورنر) حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔ اور وہ دو رکعت کے بعد کھڑے ہوگئے یعنی قعدۂ اولیٰ بھول گئے۔ پس لوگوں نے ان کو متنبہ کرنے کے لئے سبحان اللہ کہا۔ امام صاحب نے بھی سبحان اللہ کے ذریعہ ان کو متنبہ کیا، یعنی انھوں نے بھی سبحان اللہ کہا (مقتدیوں کے سبحان اللہ کا مطلب یہ تھا کہ آپ بھولے، اور امام صاحب کے سبحان اللہ کا مطلب یہ تھا کہ جب میں کھڑا ہوگیا تو تمہیں بھی کھڑا ہوجانا چاہئے تھا۔ پس آپ لوگ مسئلہ بھولے۔ وہ لوگ یہ بات سمجھ گئے اور کھڑے ہوگئے) پس جب انھوں

نے نماز پوری کی تو آخری سلام پھیرا پھر سہو کے دو سجدے کئے درانحالیکہ وہ بیٹھے ہوئے تھے یعنی جس طرح سجدۂ تلاوت کھڑے ہوکر کرنا مستحب ہے یہاں ایسا نہیں، بلکہ بیٹھے ہوئے ہی دونوں سجدے کئے۔ پھر لوگوں کو حدیث سنائی کہ آنحضرت ﷺ نے ان کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا جیسا کہ انھوں نے کیا۔ یعنی آپ بھی ایک مرتبہ قعدۂ اولیٰ بھول کر کھڑے ہوگئے تھے، پس آپ نے بھی آخری سلام پھیرنے کے بعد بیٹھے بیٹھے سجدۂ سہو کیا تھا۔

تشریح: امام ترمذی رحمہ اللہ اس حدیث کی پہلے دو ضعیف سندیں لائے ہیں، پہلی سند میں ابن ابی لیلیٰ صغیر ہیں اور دوسری میں جابر جعفی کذاب ہے۔ پھر آخر میں اس کی ''حسن صحیح'' سند پیش کریں گے۔ اور سجدۂ سہو قبل السلام مسنون ہے یا بعد السلام؟ یہ مسئلہ آگے تفصیل سے آئے گا۔

فائدہ: جب امام کو اس کی کسی غلطی پر تنبیہ کرنا مقصود ہو تو سبحان اللہ کہنا چاہئے۔ اللہ اکبر کہنے کا اس موقع پر کوئی تک نہیں، کیونکہ اس صورت میں مفہوم یہ ہوجاتا ہے کہ امام نے کوئی بڑا محیر العقول کام کیا ہے جس پر اللہ کی بڑائی کی جارہی ہے، یعنی بیشک امام نے بہت بڑا کام کیا ہے مگر بڑے اللہ ہی ہیں، ظاہر ہے کہ یہ بے موقع بات ہے۔ امام نے تو بھول کی ہے اور سبحان اللہ کا اس موقعہ پر مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ عیوب سے اور بھول چوک سے پاک ہیں، پس امام فوراً غور کرے گا کہ آخر اللہ کے بے عیب ہونے کی بات مجھ سے کیوں کہی جارہی ہے؟ اس طرح اس کو اپنی بھول یاد آجائے گی۔

[۱۵۵] باب ماجاء في الإمام يَنْهَضُ من الركعتين ناسياً

[۳۷٤-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا هُشَيْمٌ، نا ابنُ أبي لَيلَى، عن الشَّعْبِيِّ، قال: صَلّٰى بِنَا المُغِيْرَةُ بنُ شُعْبَةَ، فَنَهَضَ في الرَّكْعَتَيْنِ، فَسَبَّحَ بِهِ الْقَوْمُ، وسَبَّحَ بِهِمْ، فَلَمَّا قَضَى صَلَاتَهُ سَلَّمَ، ثُمَّ سَجَدَ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ وهُوَ جَالِسٌ، ثُمَّ حَدَّثَهُمْ: أَنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم فَعَلَ بِهِمْ مِثْلَ الَّذِيْ فَعَلَ.

وفي الباب: عن عُقْبَةَ بنِ عَامِرٍ، وسَعْدٍ، وعبدِ اللّٰهِ بنِ بُحَيْنَةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ المُغيرةِ بنِ شُعْبَةَ، قَدْ رُوِيَ مِن غَيْرِ وَجْهٍ عَنِ الْمُغِيْرَةِ بنِ شُعْبَةَ، وقَدْ تَكَلَّمَ بَعْضُ أهلِ العلمِ في ابنِ أبي لَيْلىٰ مِنْ قِبَلِ حِفْظِهِ، قال أحمد: لَا يُحْتَجُّ بحَدِيْثِ ابنِ أبي ليلىٰ، وقال محمدُ بنُ إسماعيلَ: ابنُ أبي ليلىٰ وهُوَ صَدُوْقٌ وَلَا أَرْوِيْ عَنْهُ، لِأَنَّهُ لَا يَدْرِيْ صَحِيْحَ حَدِيثِه من سَقِيْمِهِ، وكلُّ مَنْ كَانَ مِثْلَ هٰذَا فَلَا أَرْوِيْ عَنْهُ شَيْئًا.

وَقَدْ رُوِيَ هٰذا الحديثُ مِنْ غَيْرِ وجهٍ عَنِ المغيرةِ بنِ شعبةَ، وروَى سفيانُ، عن جابرٍ، عن المغيرةِ بن شُبَيْلٍ، عن قيسِ بنِ أبي حَازِمٍ، عن المغيرةِ بنِ شُعْبَةَ؛ وجابرٌ الجُعْفِيُّ قَدْ ضَعَّفَهُ بَعْضُ أهلِ العلمِ، تَرَكَهُ يَحْيىَ بنُ سعيدٍ وعبدُ الرحمنِ بنُ مَهْدِيٍّ غيرُهما.

والعملُ على هذا عندَ أهلِ العلمِ: عَلٰى أَنَّ الرَّجُلَ إِذا قامَ في الرَّكْعَتَيْنِ مَضَى فِيْ صَلَاتِهِ، وَسَجَدَ

سَجْدَتَيْنِ: مِنهُمْ مَنْ رَأَى قَبلَ التَّسْلِيمِ ، ومِنهُمْ مَنْ رَأَى بَعْدَ التَّسْلِيمِ، ومَنْ رَأَى قَبلَ التَّسلِيمِ فَحدِيثُهُ أَصَحُّ، لِمَا رَوَى الزُّهْرِيُّ ويَحيىَ بنُ سعيدِ الأنصارِيُّ، عن عبدِ الرحمنِ الأعْرَجِ، عن عبدِ اللهِ بنِ بُحَينَةَ.

[۳۷۵-] حدثنا عبدُ الله بنُ عبدِ الرحمنِ، نايزيدُ بنُ هَارُوْنَ، عن المَسْعُوْدِيِّ، عن زِيَادِ بنِ عِلاَقَةَ، قال: صَلَّى بِنَا المغيرةُ بنُ شُعْبَةَ، فَلَمَّا صَلَّى رَكْعَتَيْنِ قَامَ وَلَمْ يَجْلِسْ، فَسَبَّحَ بِه مَنْ خَلْفَهُ فَأَشَارَ إِلَيْهِمْ أَنْ قُوْمُوْا، فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ صَلاَتِهِ سَلَّمَ وَسَجَدَ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ، وقَالَ هٰكَذَا صَنَعَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وقد رُوِيَ هذا الحديثُ من غيرِ وجهٍ عن المغيرةِ بنِ شعبةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

ترجمہ: حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے (یہ بات امام صاحب نے باب میں تین بار کہی ہے) اور بعض اہل علم نے ابن ابی لیلیٰ صغیر میں حافظہ کی جانب سے کلام کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابن ابی لیلیٰ صغیر کی حدیث سے مسائل میں استدلال نہیں کیا جائے گا۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: ابن ابی لیلیٰ صدوق ہیں، یعنی فی نفسہ اچھے راوی ہیں مگر جس حدیث کی سند میں یہ راوی آتا ہے میں اس کو سبق میں بیان نہیں کرتا، اس لئے کہ وہ اپنی صحیح اور ضعیف احادیث کے درمیان امتیاز نہیں کرتا۔ پھر قاعدہ کلیہ بیان کیا کہ ہر وہ راوی جس کا یہ حال ہو یعنی وہ صحیح اور ضعیف میں امتیاز نہ کرتا ہو میں اس کی روایتیں سبق میں بیان نہیں کرتا۔

اور یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے (یہ تکرار ہے) پھر حدیث مغیرۃ کی دوسری سند ہے: سفیان روایت کرتے ہیں جابر جعفی سے، وہ مغیرۃ بن شُبَیل سے، وہ قیس بن ابی حازم سے، اور وہ مغیرۃ بن شعبہ سے۔ اور جابر جعفی کی بعض اہل علم نے تضعیف کی ہے۔ اس کو یحییٰ قطان اور ابن مہدی نے متروک قرار دیا ہے۔ اور اس حدیث پر علماء کا عمل ہے، یعنی جب مصلّی دو رکعت پر کھڑا ہو جائے تو وہ اپنی نماز کو آگے جاری رکھے (قعدہ کی طرف واپس نہ لوٹے) اور سہو کے دو سجدے کرے۔ پھر علماء میں سے بعض کی رائے یہ ہے کہ سلام سے پہلے سجدے کرے، اور بعض کی رائے یہ ہے کہ سلام کے بعد سجدے کرے، اور جن لوگوں کی رائے قبل السلام سجدہ کرنے کی ہے ان کی حدیث اصح ہے۔ کیونکہ اس حدیث کو زُہری اور یحییٰ بن سعید نے عبد الرحمٰن الاعرج سے اور انھوں نے عبد اللہ بن بُحَینَۃ سے روایت کیا ہے (یہ حدیث آگے آئے گی) اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت مغیرۃ کی حدیث کی تیسری سند لکھی ہے۔ اور اس کو حسن صحیح کہا ہے (یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جب یہ حدیث حسن صحیح ہے تو عبد اللہ بن بُحَینَۃ کی حدیث اس سے اصح کیسے ہوئی؟ حسن صحیح سے اوپر تو کوئی مرتبہ نہیں؟! پس انصاف کی بات یہ تھی کہ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے: دونوں روایتیں صحیح ہیں کسی ایک کو اصح کہنا ناانصافی ہے) ——— (حدیث ۳۷۵) زیاد بن علاقہ کہتے ہیں: ہمیں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ

نے نماز پڑھائی۔ پس جب وہ دو رکعت پڑھا چکے تو کھڑے ہو گئے بیٹھے نہیں، یعنی قعدۂ اولیٰ نہیں کیا۔ پس پیچھے جو لوگ تھے انھوں نے سبحان اللہ کہا۔ پس حضرت نے لوگوں کو اشارہ کیا کہ آپ لوگ کھڑے ہو جائیں (یہ اشارہ ہاتھ سے نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے بھی سبحان اللہ کہا تھا پس لوگ اس کا مقصد سمجھ گئے اور کھڑے ہو گئے) پھر نماز پوری کر کے آخری سلام پھیرا اور سجدۂ سہو کیا، پھر سلام پھیرا۔ اور فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے بھی اسی طرح کیا تھا۔

بَابُ مَاجَاءَ فِي مِقْدَارِ الْقُعُوْدِ فِي الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ

پہلی دو رکعتوں کے بعد بیٹھنے کی مقدار

تمام ائمہ متفق ہیں کہ ثلاثی اور رباعی نمازوں کے پہلے قعدہ میں صرف التحیات پڑھنی ہے، آگے کچھ نہیں پڑھنا۔ اور واجب نماز اور ایک قول کے مطابق ظہر سے پہلے کی چار سنتیں بھی فرائض کے ساتھ ملحق ہیں۔ ان میں بھی صرف تشہد پڑھنا ہے۔ باقی تمام نمازوں میں ہر قعدہ میں تشہد، درود اور دعا سب کچھ پڑھنا ہے۔ اس لئے کہ نوافل وسنن شفعہ شفعہ ہیں یعنی ان کی ہر دو رکعت ایک نماز ہے، البتہ صرف التحیات پڑھیں تو بھی درست ہے مگر اکثر لوگ اس مسئلہ سے واقف نہیں۔ وہ ہر نماز کے پہلے قعدہ میں صرف تشہد پڑھتے ہیں اور درود شریف وغیرہ نہ صرف یہ کہ نہیں پڑھتے بلکہ اگر کوئی بھولے سے پڑھ لے تو سجدۂ سہو کرتا ہے۔ یہ غلط فہمی فرائض کے قعدۂ اولیٰ سے پیدا ہوئی ہے چونکہ ان کے پہلے قعدہ میں تشہد پر اکتفا کرنا ضروری ہے اس لئے لوگوں نے تمام نمازوں کے لئے یہی حکم تصور کر لیا۔

اس کی نظیر: سجدۂ سہو آخری سلام کے بعد کرنا مسنون ہے۔ اور نماز میں آخری سلام تشہد، درود اور دعا کے بعد ہے۔ پس سجدۂ سہو بھی سب کچھ پڑھ کر سلام پھیرنے کے بعد کرنا چاہئے، البتہ جماعت کے فرضوں میں یہ حکم ہے کہ صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیرے اور سجدۂ سہو کرے تا کہ مسبوق جان لیں کہ یہ ایمر جنسی سلام ہے اور وہ کھڑے ہونے میں جلدی نہ کریں۔ غرض یہ حکم عارضی مصلحت سے تھا، مگر لوگوں نے اس کو اصل حکم سمجھ لیا، چنانچہ وہ ہر نماز میں یہی کرنے لگے۔ بلکہ فقہ کی بعض کتابوں میں بھی اس حکم کو عام کر دیا ہے، حالانکہ سجدۂ سہو میں اصل طریقہ یہ ہے کہ قعدۂ اخیرہ میں بیٹھ کر پہلے تشہد، درود اور جتنی دعائیں کرنی ہیں سب مانگ لے پھر سلام پھیر کر سہو کے دو سجدے کرے، پھر صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیر دے۔ غرض جس طرح سجدۂ سہو کے مسئلہ میں باجماعت نماز کے مسئلہ سے غلط فہمی ہوئی ہے اسی طرح یہاں بھی فرضوں کے قعدۂ اولیٰ سے غلط فہمی ہوئی ہے۔

حدیث: ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ جب پہلی دو رکعتوں میں بیٹھتے تھے تو (اس طرح بیٹھتے تھے کہ) گویا آپ گرم پتھر پر بیٹھے ہیں —— اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ قعدۂ اولیٰ میں جم کر نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ اس طرح بیٹھتے تھے کہ گویا ابھی اٹھیں گے۔

[۱۵٦] باب ماجاء فی مِقْدَارِ القعود فی الرکعتین الأُوْلَيَيْنِ

[٣٧٦-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، نا أبو داوُدَ، هو الطَّيَالِسِيُّ، ناشُعْبَةُ، ناسَعْدُ بنُ إبراهيمَ، قال: سمعتُ أبا عُبَيْدَةَ بنَ عبدِ اللهِ بنِ مَسْعُوْدٍ، يُحَدِّثُ عن أبيهِ، قال: كَانَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم إِذَا جلَسَ فى الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ، كَأَنَّهُ عَلَى الرَّضْفِ؛ قال شُعْبَةُ: ثُمَّ حَرَّكَ سَعْدٌ شَفَتَيْهِ بشيئٍ، فَأَقُوْلُ: حتى يَقُوْمَ؟ فَيَقُوْلُ: حتى يَقُوْمَ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ، إلا أنَّ أبا عُبيدةَ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ أبيهِ والعمَلُ على هذا عند أهل العلم يَخْتَارُوْنَ أن لا يُطِيْلَ الرجلُ القُعُوْدَ فى الرَّكْعَتينِ الْأُوْلَيَيْنِ، ولَا يَزِيْدَ على التَّشَهُّدِ شيئًا فى الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ، وقالوا: إِنْ زَادَ عَلَى التشهُّدِ فَعَلَيْهِ سَجْدَتَا السَّهْوِ، هكذا رُوِيَ عن الشَّعْبِيِّ وغيرِهِ.

ترجمہ: ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ دو رکعت پر بیٹھتے تھے تو (ایسا محسوس ہوتا) گویا وہ گرم پتھر پر ہیں۔ شعبہ کہتے ہیں (یہاں پہنچ کر میرے استاذ سعد کی آواز پست ہوگئی، مگر وہ کچھ بولے ضرور کیونکہ) پھر سعد نے اپنے ہونٹوں کو کسی چیز (لفظ) کے ساتھ حرکت دی (یعنی ایسا محسوس ہوا کہ گویا وہ کچھ بولے لیکن کیا بولے؟ شعبہ سن نہ سکے۔ شعبہ کہتے ہیں:) میں نے استاذ سے پوچھا: حتی یقوم؟ کھڑے ہونے تک؟ تو انھوں نے کہا: حتی یقوم (یعنی ہاں کھڑے ہونے تک یعنی میں یہی جملہ بولا ہوں، چونکہ شعبہ رحمہ اللہ یہ حدیث دیگر اساتذہ سے سن چکے تھے اور ان کی حدیث میں حتی یقوم تھا اس لئے انھوں نے پوچھا: کیا آپ نے بھی حتی یقوم فرمایا؟ استاذ نے اثبات میں جواب دیا)

اور اس پر علماء کا عمل ہے وہ یہ بات پسند کرتے ہیں کہ نمازی پہلی دو رکعت پر بیٹھنے کو لمبا نہ کرے اور تشہد پر کچھ اضافہ نہ کرے۔ اگر وہ تشہد پر زیادتی کرے گا تو اس پر سجدۂ سہو لازم ہوگا۔ شعبی وغیرہ سے اسی طرح مروی ہے (فرائض کے قعدۂ اولی میں تشہد سے زیادہ پڑھنے والے پر سجدہ سہو ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اور منصوص نہیں ہے بلکہ تابعین کے مختلف اقوال کی بناء پر مجتہدین میں اختلاف ہوا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کا مسلک شعبی وغیرہ کی رائے کے مطابق ہے یعنی تشہد کے علاوہ پڑھنے والے پر سجدۂ سہو واجب ہوگا یہی احناف کا مذہب ہے)

بابُ ماجاء فی الإِشَارَةِ فی الصَّلَاةِ

نماز میں اشارہ کرنے کا حکم

اگر نماز میں کوئی اشارہ کیا جائے خواہ وہ مفہوم ہو یا غیر مفہوم یعنی وہ اشارہ سمجھ لیا جائے یا نہ سمجھا جائے تو اس سے نماز

باطل نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ عمل قلیل ہے۔ البتہ فرض نماز میں مجبوری کے بغیر کوئی اشارہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ وہ بارگاہِ خداوندی کی خاص ملاقات ہے۔ اور نوافل چونکہ پرائیویٹ ملاقات ہیں اس لئے ان میں اشارہ کرنے کی گنجائش ہے۔

اس باب میں دو روایتیں ہیں اور دونوں کا تعلق نفل نماز سے ہے۔

حدیث(۱): حضرت ابن عمر حضرت صہیب رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: میں آنحضرت ﷺ کے پاس سے گذرا اس وقت آپ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے آپ کو سلام کیا تو آپؐ نے اشارہ سے جواب دیا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: مجھے ایسا یاد ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ آنحضور ﷺ نے انگلی کے اشارہ سے جواب دیا۔ یعنی اشارہ سے بتلایا کہ آپؐ نماز میں ہیں یا آپؐ نے ان کا سلام قبول کرلیا ہے۔

حدیث(۲): ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آنحضرت ﷺ قبا والوں کے سلام کا جواب کس طرح دے رہے تھے جبکہ آپؐ نماز میں تھے؟ حضرت بلالؓ نے کہا: ہاتھ کے اشارہ سے جواب دے رہے تھے ـــــ یہ دونوں واقعے الگ الگ ہیں اور دونوں صحیح ہیں، اور ابن عمرؓ دونوں سے روایت کرتے ہیں۔

[۱۵۷] باب ماجاء فی الإشارۃِ فی الصلاۃ

[۳۷۷-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ بنُ سَعْدٍ، عن بُكَيْرِ بنِ عبدِ اللهِ بنِ الأَشَجِّ، عن نَابِلٍ صاحبِ العَبَاءِ، عن ابنِ عُمَرَ، عن صُهَيْبٍ، قال: مَرَرْتُ برسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم وَهُوَ يُصَلِّيْ، فَسَلَّمْتُ عَلَيهِ، فَرَدَّ إِلَيَّ إِشَارَةً، وقال: لَا أَعْلَمُ إِلَّا أَنَّهُ قَالَ: إِشَارَةً بِأُصْبُعِهِ.

وفی الباب: عن بلالٍ، وأبی هريرةَ، وأنسٍ، وعائشةَ.

[۳۷۸-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، نا وكيعٌ، نا هشامُ بنُ سعدٍ، عن نافعٍ، عن ابنِ عمرَ، قال: قلتُ لِبِلَالٍ: كيفَ كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يَرُدُّ عَلَيْهِمْ حِيْنَ كَانُوْا يُسَلِّمُوْنَ عَلَيْهِ، وَهُوَ فِيْ الصَّلَاةِ؟ قال: كان يُشِيْرُ بِيَدِهِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وحديثُ صُهَيْبٍ حسنٌ لَانَعْرِفُهُ إِلَّا مِن حَدِيثِ اللَّيْثِ عن بُكَيْرٍ، وقد رُوِيَ عن زَيْدِ بنِ أَسْلَمَ، عن ابنِ عُمَرَ، قال: قُلْتُ لِبلالٍ: كَيفَ كَانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم يَرُدُّ عَلَيْهِمْ حيثُ كَانُوْا يُسَلِّمُوْنَ عَلَيْهِ فِيْ مَسْجِدِ بَنِيْ عَمْرِو بنِ عَوْفٍ؟ قال: كانَ يَرُدُّ إِشَارَةً.

وَكِلَا الحَدِيْثَيْنِ عِنْدِيْ صحيحٌ: لِأَنَّ قِصَّةَ حديثِ صُهَيْبٍ غَيْرُ قِصَّةِ حديثِ بِلالٍ، وإِنْ كَانَ ابنُ عُمَرَ رَوَى عنهما، فَاحْتَمَلَ أَنْ يَكُوْنَ سَمِعَ مِنْهُمَا جَمِيْعًا.

وضاحت: حدیث (۳۷۷) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اس

حدیث کے تنہالیث بن سعد راوی ہیں۔ اور حدیث (۳۷۸) ابن عمرؓ: حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اس کو نافع کے علاوہ زید بن اسلم بھی ابن عمر سے روایت کرتے ہیں۔ اور دونوں حدیثیں صحیح ہیں، اور یہ دو الگ الگ واقعے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اور میرے نزدیک دونوں حدیثیں صحیح ہیں اس لئے کہ صہیبؓ کی حدیث کا واقعہ اور ہے اور بلالؓ کا واقعہ اور ہے اگرچہ ابن عمرؓ نے دونوں سے روایت کی ہے، پس احتمال ہے کہ انھوں نے دونوں ہی سے سنا ہو۔

بابُ مَاجاءَ أَنَّ التَّسْبِيحَ للرجال و التَّصْفِيقَ لِلنِّسَاءِ

تنبیہ کے لئے مرد تسبیح کہیں اور عورتیں چٹکی بجائیں

تصفیق کے اصلی معنی ہیں: تالی بجانا، اور یہاں بائیں ہاتھ کی پشت پر دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں مارنا مراد ہے۔ اور حدیث کا مطلب تمام ائمہ نے یہ سمجھا ہے کہ اگر امام کو غلطی پر تنبیہ کرنی مقصود ہو تو مرد مقتدی سبحان اللہ کہیں اور عورتیں تصفیق کریں۔ وہ سبحان اللہ نہ کہیں، کیونکہ صَوتُ العورةِ عَوْرَةٌ عورت کی آواز بھی ستر ہے۔ اور یہیں سے بعض کتابوں میں یہ مسئلہ لکھ دیا ہے کہ اگر عورت منہ سے لقمہ دے گی تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ کیونکہ عورت کی آواز ستر ہے، اور ننگا پا ظاہر کرنا مفسد صلوٰۃ ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں۔ صوتُ العورة عورةٌ کا مطلب یہ ہے کہ عورت پر بدن کی طرح اپنی آواز کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اجنبیوں کے سامنے آواز ظاہر کرنے سے بھی اُسے اجتناب کرنا چاہئے۔

اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک مرد وزن سب سبحان اللہ کہیں گے۔ وہ فرماتے ہیں: آنحضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ امام کو تنبیہ کرنے کے لئے مرد سبحان اللہ کہیں تالی نہ بجائیں۔ یہ ان کے شایانِ شان نہیں، یہ تو عورتوں کا شیوہ ہے۔ مگر حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث سے امام مالک رحمہ اللہ کے بیان کردہ مطلب کی تردید ہوتی ہے، ان کی مرفوع حدیث کے الفاظ ہیں: إِذَا نَابَكُمْ أَمرٌ فَلْيُسَبِّحِ الرجالُ ولْيُصَفِّحِ النساءُ یعنی جب (نماز میں) کوئی بات پیش آئے تو چاہئے کہ مرد تسبیح کہیں اور عورتیں چٹکی بجائیں (بخاری حدیث ۷۱۹۰ کتاب الأحکام، باب الإمام یاتی الخ) اس میں صراحت ہے کہ سبحان اللہ صرف مرد کہیں گے، عورتیں بجائے تسبیح کے تصفیق کریں گی۔

فائدہ: تسبیح کہنے کا صرف یہی موقعہ نہیں ہے بلکہ اس کے بہت سے مواقع ہیں۔ مثلاً کوئی شخص بے خبری میں نمازی کے سامنے سے گذرنا چاہے تو اس وقت بھی نمازی کو تسبیح کہنی چاہئے، تاکہ گذرنے والا متنبہ ہو جائے۔ اسی طرح امام اپنے مقتدیوں کو کسی غلطی پر متنبہ کرنا چاہے تو بھی تسبیح کہے جیسا کہ پہلے حدیث گذری ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص گھر کے اندر نماز میں مشغول ہے اور باہر سے کوئی اجازت طلب کرتا ہے تو چاہئے کہ زور سے تسبیح کہے اور اپنا نماز میں مشغول ہونا بتائے، جیسا کہ باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ میں نبی ﷺ سے اجازت طلب کرتا تھا جبکہ

آپ نماز میں ہوتے تھے تو آپ سبحان اللہ کہتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی جگہیں ہوسکتی ہیں۔

[۱۵۸] باب ماجاء أن التَّسْبِيْحَ للرجال والتَّصْفِيْقَ للنساء

[۳۷۹-] حدثنا هَنَّادٌ، نا أبو مُعَاوِيَةَ، عن الأَعْمَشِ، عن أبي صالحٍ، عن أبي هريرةَ، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: " التَّسْبِيْحُ لِلرِّجَالِ وَالتَّصْفِيْقُ لِلنِّسَاءِ"

وفي الباب: عن عليٍّ، وسهلِ بنِ سعدٍ، وجابرٍ، وأبي سعيدٍ، وابنِ عُمَرَ.

[۳۸۰-] قالَ عليٌّ: كنتُ إذا اسْتَأْذَنْتُ عَلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم وَهُوَ يُصَلِّيْ سَبَّحَ.

قال أبو عيسى: حديثُ أبي هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، والعملُ عليهِ عندَ أهلِ العلمِ، وبه يقولُ أحمدُ وإسحاقُ.

ترجمہ: حدیث (۳۸۰) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں جب آنحضور ﷺ سے گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرتا اور آپ نماز پڑھ رہے ہوتے تو آپ سبحان اللہ کہتے۔ معلوم ہوا کہ تسبیح کے دیگر مواقع بھی ہیں۔

بابُ ماجاء في كَرَاهِيَةِ التَّثَاؤُبِ فِيْ الصَّلاَةِ

نماز میں جماہی لینا مکروہ ہے

تثاؤب: کے معنی ہیں: جماہی لینا، جماہی کو جمائی بھی کہتے ہیں۔ یہ وہی لفظ ہے جو اردو میں داماد کے لئے مستعمل ہے، اور نماز میں جماہی لینا ٹھیک نہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: "نماز میں جماہی آنا شیطان کے اثر سے ہے" یعنی نماز سے پہلے ٹھیک تھا، جماہی کا نہ اتا تھا نہ پتا۔ لیکن نماز شروع کرتے ہی جماہی پر جماہی آنے لگی تو یہ جماہی شیطان کے اثر سے ہے۔ اور اس کا علاج حدیث شریف میں یہ آیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اُسے روکے، ہونٹ بھینچ لے، پھر بھی نہ رُکے تو ہاتھ رکھ کر روکے۔ غرض جس طرح ممکن ہو روکے، اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مجھے جب جماہی آنا چاہتی ہے تو میں کھنکھارتا ہوں۔ اور شامی (۱:۳۵۳) میں یہ طریقہ لکھا ہے کہ جب جماہی آنا چاہے تو یہ تصور کرے کہ کبھی کسی نبی کو جماہی نہیں آئی فوراً جماہی رک جائے گی۔ واللہ اعلم

[۱۵۹] باب ماجاء في كراهية التَّثَاؤُبِ في الصلاة

[۳۸۱-] حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نا إسماعيلُ بنُ جَعْفَرٍ، عن العَلاَءِ بنِ عبدِ الرحمنِ، عن أبيه، عن أبي هريرةَ، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال: " التَّثَاؤُبُ فِي الصَّلاَةِ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَإِذَا تَثَاءَ بَ

أَحَدُکُمْ فَلْیَکْظِمْ مااسْتَطَاعَ"

وفی الباب: عن أبی سعیدِ الخُدریِّ، وجَدِّ عدیِّ بنِ ثابتٍ.

قال أبو عیسی: حدیثُ أبی ھریرۃَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

وقَدْ کَرِہَ قَوْمٌ مِنْ أھلِ العلمِ التَّثَاؤُبَ فی الصَّلاَۃِ؛ قال إبراھیمُ: إِنِّیْ لَأَرُدُّ التَّثَاؤُبَ بالتَّنَحْنُحِ.

بابُ ماجاءَ أنَّ صَلاَۃَ القاعِدِ علی النِّصْفِ مِنَ صَلاَۃِ القائمِ

بیٹھ کرنماز پڑھنے کا ثواب آدھا ہے

اس باب میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ان کو دو بیماریاں تھیں ایک: بواسیر کی دوسری بھگندر کی ان پر جب بواسیر کا حملہ ہوتا تھا یعنی خون بہت بہہ جاتا تھا تو وہ نڈھال ہوجاتے تھے اس لئے انھوں نے آنحضرت ﷺ سے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا مسئلہ دریافت کیا۔اس حدیث کو عیسیٰ بن یونس اور ابراہیم بن طہمان روایت کرتے ہیں۔اور دونوں کی روایتیں مختلف ہیں۔عیسیٰ بن یونس کی حدیث یہ ہے: عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے حضور اکرم ﷺ سے بیٹھ کر نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا: آپؐ نے فرمایا:"جو شخص کھڑے ہو کر نماز پڑھے: یہ بہتر ہے۔اور جو بیٹھ کر نماز پڑھے اس کے لئے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والے کے ثواب کا آدھا ہے۔اور جو لیٹ کر پڑھے اس کے لئے بیٹھ کر پڑھنے والے کے ثواب کا آدھا ہے"

اور ابراہیم بن طہمان کی حدیث یہ ہے: عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بیمار کی نماز کے بارے میں پوچھا: آپؐ نے فرمایا:"کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اور اگر کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھو، اور اگر بیٹھ کر پڑھنے کی طاقت بھی نہ ہو تو کروٹ پر لیٹ کر پڑھو"

تشریح: ان دونوں روایتوں کا مدعیٰ متعین کرنے میں شارحین بہت الجھے ہیں، کیونکہ ان کی زیادہ سے زیادہ چار تقدیریں ہوسکتی ہیں: (۱) دونوں روایتیں فرض نماز سے متعلق ہوں (۲) دونوں نفل نماز سے متعلق ہوں (۳) دونوں میں مریض کی نماز کا حکم ہو (۴) یا دونوں تندرست کی نماز کے بارے میں ہوں۔

(۱) اگر ان کو فرض کے بارے میں اور تندرست کی نماز سے متعلق کیا جائے تو اشکال یہ ہوگا کہ تندرست کے لئے بیٹھ کر فرض پڑھنا جائز ہی نہیں، اس پر قیام فرض ہے (۲) اور اگر ان کو فرض سے اور بیمار کی نماز سے متعلق کیا جائے تو پہلی حدیث پر اشکال ہوگا کہ بیمار کو تو جس حال میں بھی وہ نماز پڑھے گا پورا ثواب ملے گا۔جو شخص قیام پر قدرت نہیں رکھتا وہ فرض نماز بیٹھ کر پڑھے گا اور بیٹھ کر بھی پڑھنے پر قادر نہیں تو لیٹ پر پڑھے گا اور اس کو ہر حال میں پورا ثواب ملے گا، تنصیف نہیں ہوگی (۳) اور اگر نفل نماز سے اور بیمار سے ان کا تعلق جوڑا جائے تو بھی درست نہیں کیونکہ جب معذور

کو فرض نماز بیٹھ کر پڑھنے کی صورت میں پورا ثواب ملتا ہے تو نفل بیٹھ کر پڑھنے والے کو تو بدرجۂ اولی پورا ثواب ملے گا (۴) اور اگر نفل نماز سے اور تندرست سے متعلق کیا جائے تو پہلی حدیث پر اشکال ہوگا کہ تندرست آدمی کے لئے نفل نماز بیٹھ کر پڑھنے کی تو گنجائش ہے مگر اس کے لئے لیٹ کر نفل پڑھنا جائز نہیں۔ غرض دونوں حدیثوں میں چار ہی تقدیریں ہوسکتی ہیں اور ہر تقدیر پر اعتراض ہے۔ شارحین اس کا کوئی قابل قبول حل تلاش نہیں کرسکے، البتہ امام ترمذی رحمہ اللہ ایک دور کی کوڑی لائے ہیں کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تندرست آدمی کو بھی لیٹ کر نفل پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ حضرت حسن رحمہ اللہ کا قول مجتہدین پر حجت نہیں۔ مجتہدین اس کی اجازت نہیں دیتے۔

میں نے دونوں حدیثوں کو ملا کر ان کا جو مطلب سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دونوں فرض کے بارے میں ہیں اور ان میں بیمار کی نماز کا حکم ہے۔ دوسری حدیث میں حضرت عمران رضی اللہ عنہ کا بیمار کی نماز کے بارے میں دریافت کرنا اس کی دلیل ہے۔ اور پہلی حدیث میں ثواب کا بیان ہے اور دوسری میں صحتِ صلوٰۃ کا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ صحتِ صلوٰۃ میں عامل کی قدرت کا اعتبار ہے اور ثواب میں نفس الامری قدرت کا لحاظ ہے۔ یعنی اگر مصلی کا خیال ہے کہ وہ کھڑے ہو کر فرض پڑھنے پر قادر نہیں تو وہ نماز بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے، نماز ہوجائے گی۔ اور اگر اس کی بھی ہمت نہیں تو لیٹ کر پڑھے، نماز صحیح ہوجائے گی۔ مگر ثواب نفس الامری قدرت کے لحاظ سے ملے گا۔ پس جو شخص بے ہمت ہوگیا اور اس نے بیٹھ کر نماز پڑھی حالانکہ نفس الامر میں اُسے قیام پر قدرت ہے تو اُسے آدھا ثواب ملے گا۔ اور اگر وہ واقعی قیام پر قادر نہیں اس لئے بیٹھ کر نماز پڑھی تو پورے ثواب کا مستحق ہوگا۔ یہی مسئلہ لیٹ کر نماز پڑھنے والے کا ہے: اگر وہ بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے مگر وہ بے ہمتی کی بناء پر لیٹ کر پڑھتا ہے تو بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں جتنا ثواب ملے گا اس سے آدھا ملے گا۔ اور اگر نفس الامر میں بھی بیٹھ کر پڑھنے پر قادر نہیں تو پھر لیٹ کر پڑھی ہوئی نماز کا پورا ثواب ملے گا۔

غرض آنحضرت ﷺ نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کو ایک تو مسئلہ بتایا ہے کہ مریض کھڑے ہو کر، بیٹھ کر، اور لیٹ کر ہر طرح نماز پڑھ سکتا ہے۔ اور دوسری بات یہ بتائی ہے کہ ثواب میں نفس الامری قدرت کا لحاظ ہے۔ پھر یہ دو الگ الگ حدیثیں ہوگئیں تو اشکال پیدا ہوگیا۔

اور بہت سے اکابر کے بارے میں مروی ہے کہ وہ معذور ہونے کے باوجود بتکلف کھڑے ہو کر فرض نماز پڑھا کرتے تھے، اس تکلف کی ضرورت اس لئے پیش آتی تھی کہ ثواب میں نفس الامری قدرت کا لحاظ ہے۔ گو کہ نماز بیٹھ کر بھی صحیح ہوجاتی ہے۔

فائدہ (۱): حدیث مذکور کی دونوں سندیں صحیح ہیں۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے عیسیٰ بن یونس کی حدیث کے اصح ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے یہ کہہ کر کہ ان کے متعدد متابع ہیں جبکہ ابراہیم بن طہمان کا کوئی متابع نہیں۔ اور فرمایا ہے

کہ یہ حدیث تندرست کے بارے میں اور نفل نماز کے بارے میں ہے۔ پھر جب اعتراض ہوا کہ تندرست آدمی کے لئے لیٹ کر نفل پڑھنا جائز نہیں تو اس کا جواب یہ دیا کہ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تندرست آدمی نفل نماز لیٹ کر بھی پڑھ سکتا ہے۔ مگر یہ جواب دوسرے کو خاموش کرنے والا نہیں۔ کیونکہ خود امام ترمذی اور ائمہ اربعہ کے نزدیک تندرست آدمی کے لئے لیٹ کر نفل پڑھنا جائز نہیں۔

فائدہ (۲): مریض کے لئے لیٹ کر نماز پڑھنا بالاتفاق جائز ہے۔ اور اس کو جس طرح سہولت ہو اس طرح لیٹ کر نماز پڑھے، چاہے دائیں کروٹ پر لیٹے، چاہے بائیں پر اور چاہے تو چت لیٹے البتہ جب چت لیٹ کر نماز پڑھے تو پاؤں کعبہ کی طرف کرے اور سر کے نیچے کوئی چیز رکھ لے تاکہ سر اونچا ہو جائے اور رکوع وسجود کا اشارہ کرنے میں سہولت ہو۔

[۱۶۰] باب ماجاء أنَّ صلاةَ القاعدِ على النصفِ من صلاة القائم

[۳۸۲-] حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نا عيسىَ بنُ يُوْنُسَ، نا الحُسَيْنُ المُعَلِّمُ، عن عبدِ اللهِ بنِ بُرَيْدَةَ، عن عِمْرَانَ بنُ حُصَيْنٍ، قال: سَأَلْتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم عن صَلَاةِ الرَّجُلِ وَهُوَ قَاعِدٌ، فَقَالَ: "مَنْ صَلَّى قَائِمًا فَهُوَ أَفْضَلُ، وَمَنْ صَلَّاهَا قَاعِدًا فَلَهُ نِصْفُ أَجْرِ الْقَائِمِ، وَمَنْ صَلَّاهَا نَائِمًا فَلَهُ نِصْفُ أَجْرِ الْقَاعِدِ"

وفي الباب: عن عبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، وأنسٍ، والسَّائِبِ.

قال أبو عيسى: حديثُ عِمرانَ بنِ حُصينٍ، حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[۳۸۳-] وقد رُوِىَ هٰذَا الحديثُ عن إبراهيمَ بنِ طَهْمَانَ بِهٰذَا الإِسْنَادِ، إِلَّا أَنَّهُ يَقُولُ: عن عِمْرَانَ بنِ حُصَيْنٍ، قال: سَأَلْتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم عَنْ صَلَاةِ الْمَرِيْضِ، فَقَالَ: "صَلِّ قَائِمًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَقَاعِدًا، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَعَلَى جَنْبٍ" حدثنا بذلك هَنَّادٌ، نا وكيعٌ، عن إبراهيمَ بنِ طَهْمَانَ، عن حُسَيْنٍ الْمُعَلِّمِ بِهٰذَا الإِسْنَادِ.

قال أبو عيسى: لَانَعْلَمُ أَحَدًا رَوَى عن حُسينٍ المعلِّمِ نَحْوَ رِوَايَةِ إبراهيمَ بنِ طَهْمَانَ، وَقَدْ رَوَى أبو أُسَامَةَ وغَيْرُ وَاحِدٍ عَنْ حُسَيْنٍ الْمُعَلِّمِ نَحْوَ رِوَايَةِ عيسىٰ بنِ يُوْنُسَ.

ومَعْنَى هذا الحديثِ عندَ بعضِ أهلِ العلمِ فى صَلَاةِ التَّطَوُّعِ؛ حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا ابنُ أبى عَدِىٍّ، عن أَشْعَثَ بنِ عبدِ الملكِ، عنِ الحسنِ، قال: إِنْ شَاءَ الرَّجُلُ صَلَّى صَلَاةَ التَّطَوُّعِ قَائِمًا وَجَالِسًا وَمُضْطَجِعًا.

واختَلَفَ أهلُ العلمِ فِيْ صَلَاةِ الْمَرِيْضِ إِذَا لَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يُصَلِّيَ جَالِسًا: فقال بعضُ أهلِ العلمِ:

إِنَّهُ يُصَلِّيْ على جَنْبِهِ الأَيْمَنِ، وقال بعضهم يُصَلِّيْ مُسْتَلْقِيًا على قَفَاهُ وَرِجْلَاهُ إِلَى الْقِبْلَةِ.
وقَالَ سُفيانُ الثوريُّ في هذا الحديث: مَنْ صَلَّى جَالِسًا فَلَهُ نِصْفُ أَجْرِ الْقَائِمِ قال: هذا لِلصَّحِيْحِ ولِمَنْ لَيْسَ لَهُ عُذْرٌ، فَأَمَّا مَنْ كَانَ لَهُ عُذْرٌ مِنْ مَرَضٍ أو غَيْرِهِ فَصَلَّى جَالِسًا، فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِ الْقَائِمِ؛ وقد رُوِيَ فِيْ بَعْضِ الحديثِ مِثْلُ قَوْلِ سُفيانَ الثَّوْرِيِّ.

ترجمہ اور وضاحت: امام ترمذی رحمہ اللہ نے پہلے عیسیٰ بن یونس کی حدیث (نمبر ۳۶۲) روایت کی پھر فرمایا کہ یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی ہے، پھر فرمایا کہ یہ حدیث ابراہیم بن طہمان سے بھی اسی سند سے مروی ہے، مگر اس کا متن مختلف ہے، پھر امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: ہم کسی راوی کو نہیں جانتے جس نے حسین معلّم سے ابراہیم بن طہمان کی طرح حدیث روایت کی ہو یعنی ابراہیم اس روایت کے ساتھ متفرد ہیں (مگر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ ابراہیم اعلیٰ درجہ کے ثقہ راوی ہیں) اور ابو اسامہ وغیرہ حسین معلّم سے عیسیٰ بن یونس کی طرح روایت کرتے ہیں یعنی یہ روات عیسیٰ کے متابع ہیں (یہ اس حدیث کے اصح ہونے کی طرف اشارہ ہے) ——— پھر فرماتے ہیں: اس حدیث کا مصداق بعض علماء کے نزدیک نفل نماز ہے اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر آدمی چاہے تو نفل نماز پڑھے کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر اور کروٹ پر لیٹ کر (حضرت حسن رحمہ اللہ کا قول سوالِ مقدر کے جواب کے طور پر لائے ہیں) پھر بیمار کے نماز پڑھنے کا طریقہ بیان کیا ہے، فرماتے ہیں: بیمار کی نماز میں علماء میں اختلاف ہے جبکہ وہ بیٹھ کر نماز نہ پڑھ سکتا ہو، پس بعض علماء کہتے ہیں کہ وہ دائیں کروٹ پر لیٹ کر نماز پڑھے، اور بعض کہتے ہیں کہ اپنی گدّی پر چت لیٹ کر پڑھے درانحالیکہ اس کے دونوں پیر قبلہ کی جانب ہوں ——— پھر سفیان ثوری رحمہ اللہ نے اس حدیث کا جو محمل متعین کیا ہے اس کو ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں: اور سفیان ثوری نے اس حدیث کی شرح میں فرمایا ہے: جو شخص بیٹھ کر نماز پڑھے گا اس کو کھڑے ہو کر پڑھنے والے سے آدھا ثواب ملے گا۔ فرمایا: یہ حدیث تندرست کے لئے ہے اور اس شخص کے لئے ہے جس کو کوئی عذر نہ ہو، پس رہا وہ شخص جس کو کوئی عذر ہو بیماری ہو یا کوئی اور عذر ہو چنانچہ اس نے بیٹھ کر نماز پڑھی تو اس کو کھڑے ہو کر پڑھنے والے کے مانند ثواب ملے گا۔ اور ایک حدیث میں سفیان ثوری کے قول کی طرح مروی ہے (یہ بخاری کی حدیث کی طرف اشارہ ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "جب بندہ بیمار پڑتا ہے یا سفر کرتا ہے تو اس کے لئے وہ نیک اعمال بدستور لکھے جاتے ہیں جو وہ تندرستی اور اقامت کی حالت میں کرتا تھا)

بابٌ فِي مَنْ يَتَطَوَّعُ جالِساً

نفل نماز بیٹھ کر پڑھنے کا بیان

نفل نماز کھڑے ہونے کی طاقت کے باوجود بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔ اور سنن مؤکدہ بھی نفل ہیں مگر ثواب آدھا

ہو جائے گا۔ باب میں ایک تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے۔ وہ فرماتی ہیں: میں نے آنحضور ﷺ کو بیٹھ کر تہجد پڑھتے (کبھی) نہیں دیکھا ہاں وفات سے ایک سال پہلے یعنی حیات طیبہ کے آخری سال میں آپ بیٹھ کر تہجد پڑھتے تھے۔ اور آپ چھوٹی سورت بھی ترتیل کے ساتھ اور اس طرح پڑھتے تھے کہ وہ لمبی سے لمبی سورت کے مانند ہو جاتی تھی۔ اور دو حدیثیں صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ہیں، پہلی حدیث (نمبر ۳۸۵) میں وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب تہجد بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے تو تلاوت بھی بیٹھ کر فرماتے تھے۔ پھر جب قراءت میں تیس چالیس آیات کے بقدر باقی رہ جاتا تو آپ کھڑے ہو جاتے۔ اور اتنی مقدار تلاوت کر کے رکوع وسجدہ کرتے۔ پھر دوسری رکعت بیٹھ کر پڑھتے اور اسی کے مانند کرتے۔ یعنی تیس چالیس آیات کے بقدر کھڑے ہو کر تلاوت فرمانے کے بعد کھڑے سے رکوع وسجدہ کرتے۔ اور صدیقہ رضی اللہ عنہا کی دوسری حدیث (نمبر ۳۸۶) یہ ہے کہ آنحضور ﷺ لمبی رات تک کھڑے کھڑے اور لمبی رات تک بیٹھے بیٹھے نفلیں پڑھتے تھے۔ یعنی کبھی کھڑے ہو کر اور کبھی بیٹھ کر تہجد پڑھتے تھے۔ اور آپؐ جب بیٹھ کر نماز پڑھتے تو رکوع وسجود بھی بیٹھ کر کرتے۔ اور جب کھڑے ہو کر پڑھتے تو رکوع وسجود بھی کھڑے ہو کر کرتے ـــــ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ سب حدیثیں صحیح ہیں۔ اور مصلّی کو اختیار ہے جس طرح چاہے تہجد پڑھے ـــــ سُبْحَۃٌ اور تطوُّع دونوں لفظ ہر نفل نماز کو شامل ہیں، مگر یہاں تہجد کی نماز مراد ہے۔

[۱۶۱] بابٌ فی مَن یَتَطَوَّعُ جالساً

[۳۸٤-] حدثنا الأنصاریُّ، نا مَعْنٌ، نا مالكُ بنُ أنسٍ، عن ابنِ شهابٍ، عن السَّائِبِ بنِ یَزِیْدَ، عَنِ الْمُطَّلِبِ بنِ أبی وَدَاعَةَ السَّهْمِیِّ، عن حَفْصَةَ زَوْجِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم، أَنَّهَا قَالَتْ: مَارَأَیْتُ رسولَ اللهِ صلی الله علیه وسلم صَلّٰی فِیْ سُبْحَتِهِ قَاعِدًا حَتّٰی کَانَ قَبْلَ وَفَاتِهِ صَلّٰی الله علیه وسلم بِعَامٍ، فَإِنَّهُ کَانَ یُصَلِّیْ فِیْ سُبْحَتِهِ قَاعِدًا، وَیَقْرَأُ بِالسُّوْرَةِ وَیُرَتِّلُهَا حَتّٰی تَکُوْنَ أَطْوَلَ مِنْ أَطْوَلَ مِنْهَا.

وفی البابِ: عن أُمِّ سَلَمَةَ، وأنسِ بنِ مَالِكٍ. قال أبو عیسی: حدیثُ حَفْصَةَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

وَقَدْ رُوِیَ عن النبیِّ صلی الله علیه وسلم: أَنَّهُ کَانَ یُصَلِّیْ مِنَ اللَّیْلِ جَالِسًا فَإِذَا بَقِیَ مِنْ قِرَاءَ تِهِ قَدْرُ ثَلاَثِیْنَ أَوْ أَرْبَعِیْنَ آیَةً قَامَ، فَقَرَأَ ثم رَکَعَ، ثم صَنَعَ فی الرَّکْعَةِ الثَّانِیَةِ مثلَ ذٰلِكَ.

ورُوِیَ عَنْهُ: أَنَّهُ کَانَ یُصَلِّیْ قَاعِدًا، فَإِذَا قَرَأَ وَهُوَ قَائِمٌ رَکَعَ وَسَجَدَ وَهُوَ قَائِمٌ، وإِذَا قَرَأَ وَهُوَ قَاعِدٌ رَکَعَ وَسَجَدَ وَهُوَ قَاعِدٌ.

قال أحمدُ وإسحاقُ: والعَمَلُ علی کِلاَ الحَدِیْثَیْنِ، کَأَنَّهُمَا رَأَیَا کِلاَ الحَدِیْثَیْنِ صَحِیْحًا مَعْمُوْلاً بِهِمَا.

[۳۸۵-] حدثنا الأنصاريُّ، نا مَعْنٌ، نا مالكٌ، عن أبى النَّضرِ، عن أبى سَلَمَةَ، عن عائشة: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كانَ يُصَلِّيْ جَالِسًا فَيَقْرأُ وَهُوَ جَالِسٌ، فَإذَا بَقِيَ مِنْ قِرَاءَ تِهِ قَدْرُ مَايَكُوْنُ ثَلاثِيْنَ أَوْ أَرْبَعِيْنَ آيَةً، قَامَ فَقَرَأَ وَهُوَ قَائِمٌ، ثُمَّ رَكَعَ وَسَجَدَ، ثُمَّ صَنَعَ فِي الرَّكْعَةِ الثَّانِيَةِ مِثْلَ ذٰلِكَ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[۳۸٦-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا هُشَيْمٌ، نا خَالِدٌ، وهُوَ الحَذَّاءُ، عَنْ عَبدِ اللّٰهِ بنِ شَقِيْقٍ، عن عائشةَ، قال: سَأَلْتُهَا عن صَلاَةِ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم عَنْ تَطَوُّعِهِ، قالت: كانَ يُصَلِّيْ لَيْلاً طَوِيْلاً قَائِمًا وَلَيْلاً طَوِيْلاً قَاعِدًا، فَإذَا قَرَأَ وَهُوَ قَائِمٌ رَكَعَ وَسَجَدَ وَهُوَ قَائِمٌ، وَإِذَا قَرَأَ وَهُوَ جَالِسٌ رَكَعَ وَسَجَدَ وَهُوَ جَالِسٌ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ملحوظہ: امام ترمذیؒ پہلے حدیث نمبر ۳۸۵و۳۸٦ بغیر سند کے لائے ہیں، پھران کو سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔

بابُ ماجاءَ أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال:

"إِنِّي لَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ فِي الصَّلاَةِ فَأُخَفِّفُ"

اچانک پیش آنے والی حالت کی نماز میں رعایت

حدیث: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "بخدا! میں بچہ کے رونے کی آواز سنتا ہوں درانحالیکہ میں نماز میں ہوتا ہوں، پس میں نماز ہلکی کردیتا ہوں اس اندیشہ سے کہ کہیں اس کی ماں پریشانی میں مبتلا نہ ہو"

تشریح: یہ اختصار سب مصلیوں کی رعایت میں عموماً اور ماں کی رعایت میں خصوصاً ہوتا تھا۔ ظاہر ہے جب بچہ رونا شروع کرتا ہے تو وہ چپ ہی نہیں ہوتا، پس تمام لوگوں کا خشوع وخضوع متاثر ہوگا۔ اور ماں کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تو بہت زیادہ ہے، اُسے تو نماز توڑنی بھی پڑسکتی ہے۔ اس لئے آنحضور ﷺ جب کسی بچہ کے رونے کو سنتے تو نماز مختصر فرمادیتے۔ اس حدیث کی بناء پر فقہاء نے یہ بات کہی ہے کہ خصوصی احوال میں یعنی تمام نمازیوں کی یا بہت سے مصلیوں کی رعایت میں نماز طویل اور مختصر کرنا جائز ہے۔ مثلاً کھلی جگہ میں جماعت ہورہی ہے اچانک بارش شروع ہوجائے تو اختصار کرنے کی گنجائش ہے۔ کیونکہ یہ ایمرجنسی حالت ہے۔ یا امام مسجد میں ایک ساتھ بہت لوگوں کا آنا محسوس کرے تو وہ نماز طویل کرسکتا ہے تاکہ لوگ وضو سے فارغ ہوکر جماعت میں شریک ہوجائیں، البتہ کسی مخصوص آدمی کی رعایت میں نماز میں طول واختصار کرنا مکروہ ہے۔

[۱۶۲] بابُ ماجاءَ أَنَّ النبیَّ صلی اللہ علیه وسلم قال:

"إِنِّیْ لَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِیِّ فی الصَّلَاةِ فَأُخَفِّفُ"

[۳۸۷-] حدثنا قُتیبةُ، نا مَرْوَانُ بنُ مُعَاوِیَةَ الفَزَارِیُّ، عن حُمَیْدٍ، عن أنسِ بنِ مالكٍ: أَنَّ رسولَ اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال:" واللّٰهِ إِنِّیْ لَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِیِّ وَأَنَا فِیْ الصَّلَاةِ فَأُخَفِّفُ مَخَافَةَ أَنْ تُفْتَتَنَ أُمُّهُ"

وفی الباب: عن أبی قتادةَ وأبی سعیدٍ وأبی هریرة. قال أبو عیسی: حدیثُ أنسٍ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

بابُ ماجاءَ لَاتُقْبَلُ صَلَاةُ الحَائِضِ إلَّا بِخِمَارٍ

بالغ عورت کی نماز اوڑھنی کے بغیر نہیں ہوتی

یہاں حائضہ سے بالغہ عورت مراد ہے۔ اور یہ قید اتفاقی ہے بالغہ ہو یا لڑکی ہو جو ابھی بالغ تو نہیں ہوئی مگر سیانی ہے، سنجیدگی کے ساتھ نماز پڑھتی ہے سب کے لئے نماز میں سر ڈھانپنا ضروری ہے۔ اگر چوتھائی سر یا زیادہ کھلا رہ جائے گا تو نماز باطل ہو جائے گی۔ اور سر پر لگے ہوئے بال اور لٹکے ہوئے بال دو الگ الگ عضو ہیں۔

جاننا چاہئے کہ عورت کا ستر بھی اُتنا ہی ہے جتنا مرد کا ہے۔ یعنی ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ستر ہے۔ اس لئے کسی عورت کے لئے دوسری عورت کے سامنے شرعی ضرورت کے بغیر یہ حصہ کھولنا جائز نہیں۔ اور دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں اور چہرہ کے علاوہ عورت کا پورا بدن نماز کا حجاب ہے۔ اور اس میں ٹخنے بھی شامل ہیں، اگر چوتھائی ٹخنہ بھی کھلا رہ گیا تو نماز نہیں ہوگی۔ اور محارم کا حجاب ستر کے علاوہ پیٹ اور اس کے مقابل پیٹھ کا حصہ ہے سینہ اور اس کے مقابل پیٹھ کا حصہ محرم کے حجاب میں شامل نہیں۔ اور اجنبیوں سے پورے بدن کا حجاب ہے حتی کہ آواز بھی حجاب میں داخل ہے، اور دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں مستثنیٰ ہیں اور تنہا امام شافعی رحمہ اللہ چہرہ کو بھی مستثنیٰ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک نماز کا جو حجاب ہے وہی اجنبیوں کا حجاب ہے۔ مگر امام شافعی رحمہ اللہ کا چہرہ کو مستثنیٰ کرنا صحیح نہیں۔ کیونکہ سورۃ الاحزاب آیت ۵۹ میں ہے: "اے نبی! آپ اپنی عورتوں سے، اپنی بیٹیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی چادریں چہرہ پر نیچے تک لٹکا لیا کریں" اس آیت میں صاف صراحت ہے کہ اجنبیوں کے حجاب میں چہرہ داخل ہے۔ اور شوہر سے بالکل حجاب نہیں حتی کہ ستر کا بھی حجاب نہیں۔ واللہ اعلم

[۱۶۳] بابُ ماجاءَ لَاتُقْبَلُ صلَاةُ الحائضِ إلا بخمار

[۳۸۸-] حدثنا هَنَّادٌ، نا قَبِيْصَةُ، عن حَمَّادِ بنِ سَلَمَةَ، عن قَتَادَةَ، عن ابنِ سِيْرِيْنَ، عن صَفِيَّةَ ابْنَةِ الحَارِثِ، عن عائشةَ: قالتْ: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "لَاتُقْبَلُ صَلَاةُ الحَائِضِ إِلَّا بِخِمَارٍ"

وفي الباب: عَنْ عَبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو. قال أبو عيسى: حديثُ عائشةَ حديثٌ حسنٌ.

والعملُ عليه عندَ أهلِ العلمِ: أنَّ الْمَرْأَةَ إِذَا أَدْرَكَتْ فَصَلَّتْ وَشَيْئٌ مِنْ شَعْرِهَا مَكْشُوْفٌ: لَاتَجُوْزُ صَلَاتُهَا؛ وهو قولُ الشافعيِّ، قال: لَاتَجُوْزُ صَلَاةُ الْمَرْأَةِ وَشَيْئٌ مِنْ جَسَدِهَا مَكْشُوْفٌ؛ قَالَ الشافعيُّ: وقد قِيْلَ: إِنْ كَانَ ظَهْرُ قَدَمَيْهَا مَكْشُوْفًا فَصَلَاتُهَا جَائِزَةٌ.

ترجمہ: اس حدیث پر علماء کا عمل ہے کہ عورت جب بالغ ہوجائے (یہ قید اتفاقی ہے) اور وہ نماز پڑھے اور اس کے بالوں میں سے کچھ بال کھلے ہوں تو اس کی نماز درست نہیں۔ اور یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے، وہ کہتے ہیں کہ عورت کی نماز صحیح نہیں درانحالیکہ اس کے جسم میں سے کچھ بھی کھلا ہو۔ یعنی تھوڑا کشف بھی معاف نہیں۔ اور احناف کے نزدیک چوتھائی سے کم معاف ہے۔ جب کوئی عضو چوتھائی یا اس سے زیادہ کھل جائے تو نماز باطل ہوجائے گی ——— امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بات کہی گئی ہے کہ اگر دونوں پاؤں کا بالائی حصہ کھلا رہ جائے تو نماز صحیح ہے۔

وضاحت: سورۃ النور کی آیت ۳۱ ہے ﴿وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا﴾ یعنی نہ کھولیں عورتیں اپنی زیبائش مگر جو کھلی رہتی ہیں ان میں سے۔ اور حدیث وآثار سے ثابت ہے کہ چہرہ اور کفین إلا ماظهر منها میں داخل ہیں اور علماء نے قدمین کو ٹخنوں سے نیچے تک ان کے ساتھ لاحق کیا ہے۔ اور یہ مسئلہ اجماعی ہے کہ نماز میں چہرہ کفین اور قدمین کا حجاب سے استثناء ہے۔

بابُ ماجاءَ في كَرَاهِيَةِ السَّدْلِ في الصَّلَاةِ

نماز میں کپڑا لٹکانا مکروہ ہے

آنحضور ﷺ نے نماز میں کپڑا لٹکانے سے منع فرمایا ہے۔ اور سدل کی کیا صورت ممنوع ہے اس میں اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف کی بنیاد علت میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک ممانعت کی علت ننگا پا کھلنے کا احتمال ہے۔ اس لئے وہ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص صرف ایک کپڑے میں نماز پڑھ رہا ہو تو اس کے لئے کپڑے کو لٹکانا مکروہ ہے کیونکہ اس صورت میں کپڑے کے گرجانے سے ننگا پا کھلنے کا احتمال ہے۔ اور اگر ایک سے زائد کپڑے ہوں تو پھر سدل ممنوع نہیں، اور باقی ائمہ کہتے ہیں: کپڑا لٹکانے میں یہود کی مشابہت ہے، علاوہ ازیں اس کپڑے کو گرنے

سے بچانے کے لئے بار بار روکنا پڑے گا۔ پس نماز میں بے اطمینانی ہوگی، لہٰذا ہر کپڑے میں خواہ وہ پہلا کپڑا ہو یا دوسرا تیسرا سدل مکروہ ہے۔ غرض جمہور کے نزدیک علت: مشابہتِ یہود اور بے اطمینانی ہے۔

[۱٦٤] بابُ ماجاءَ فی کراهيةِ السَّدْلِ فی الصَّلاَةِ

[۳۸۹-] حدثنا هنادٌ، نا قَبِيصَةُ، عن حَمَّادِ بنِ سَلَمَةَ، عن عِسْلِ بنِ سُفيانَ، عن عَطَاءٍ، عن ابی هريرةَ، قال: نَهى رسولُ الله صلی الله عليه وسلم عن السَّدْلِ فِی الصَّلاَةِ.

وفی الباب: عن أبی جُحَيْفَةَ. قال أبو عيسى: حديثُ أبی هريرةَ لاَنَعْرِفُهُ مِنْ حديثِ عَطَاءٍ عن أبی هريرةَ مرفوعاً إلاَّ مِنْ حديثِ عِسْلِ بنِ سُفيانَ.

وقد اختَلَفَ أهلُ العلمِ فی السَّدْلِ فی الصلاةِ فَكَرِهَ بَعْضُهُمُ السَّدْلَ فِی الصَّلاَةِ، وقالوا: هٰكَذَا تَصْنَعُ اليهودُ، وقال بعضُهم: إِنَّمَا كُرِهَ السَّدْلُ فِی الصَّلاَةِ إِذَا لَمْ يَكُنْ عَلَيْهِ إِلاَّ ثَوْبٌ واحِدٌ، فَأَمَّا إِذَا سَدَلَ عَلَى الْقَمِيْصِ فَلاَ بَأْسَ، وهُوَ قَوْلُ احمدَ، و كَرِهَ ابنُ المبارَكِ السَّدْلَ فی الصَّلاَةِ.

وضاحت: اس حدیث کو صرف عسل بن سفیان نے مرفوع کیا ہے اور وہ ضعیف راوی ہے۔ مگر اس سے مسئلہ متاثر نہیں ہوتا کیونکہ باب میں دیگر صحیح روایات ہیں ـــــ اور علماء نے نماز میں کپڑا لٹکانے کے بارے میں اختلاف کیا ہے۔ بعض علماء نے نماز میں سدل کو مکروہ قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں: یہ یہود کا طریقہ ہے (یہ جمہور کے مسلک کی ترجمانی ہے) اور بعض علماء فرماتے ہیں: نماز میں کپڑا لٹکانا اس صورت میں مکروہ ہے جبکہ مصلی کے بدن پر صرف ایک کپڑا ہو، رہا قمیص پر سدل کرنا تو یہ مکروہ نہیں۔ اور یہ احمد واسحاق رحمہما اللہ کا قول ہے۔ اور ابن المبارک رحمہ اللہ نے نماز میں سدل کو (مطلقاً) مکروہ کہا ہے، یعنی وہ جمہور کے ساتھ ہیں۔

بابُ ماجاء فی كَرَاهِيَةِ مَسْحِ الحصَى فی الصَّلاَةِ

نماز میں کنکریوں کو ہاتھ لگانا مکروہ ہے

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان کچھ بچھائے بغیر زمین ہی پر نماز پڑھتے تھے۔ کیونکہ ان حضرات کو پہننے کے لئے کپڑے میسر نہیں تھے، بچھانے کے لئے مصلے یا کوئی اور کپڑا کہاں سے لاتے؟ اور عرب کی مٹی میں سنگریزے ہوتے ہیں ان پر سجدہ کرنے میں دشواری ہے اس لئے پہلے سجدہ کی جگہ ہموار کر لیتے تھے پھر نماز شروع کرتے تھے، مگر کبھی جگہ ہموار کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور کبھی اس کا خیال نہیں رہتا تھا اس لئے نماز کے اندر ہی ایک آدھ مرتبہ ہاتھ پھیر کر سجدہ کی جگہ ہموار کرنے کی تو اجازت دی گئی مگر بار بار کنکریوں پر ہاتھ پھیرنا اور ان سے کھیلنا ناپسندیدہ عمل ہے

اس لئے آنحضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا: ''نماز میں کنکریوں سے مت کھیلو، اس لئے کہ اللہ کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہے''

[۱٦٥] بابُ ماجاءَ فی کراهیةِ مَسْحِ الْحَصٰی فی الصلاۃ

[-۳۹۰] حدثنا سَعِیْدُ بنُ عبدِ الرحمنِ المَخْزُوْمِیُّ، نا سفیانُ بنُ عُیَیْنَةَ، عنِ الزُّهْرِیِّ، عن أبی الأَحْوَصِ، عن أبی ذَرٍّ، عن النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم قال: " إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَلَا يَمْسَحِ الْحَصٰى فَإِنَّ الرَّحْمَةَ تُوَاجِهُهُ"

[-۳۹۱] حدثنا الحُسینُ بنُ حُرَیْثٍ، نا الولیدُ بنُ مُسْلِمٍ، عَنِ الأَوْزَاعِیِّ، عن یحیَی بنِ أبی کَثِیْرٍ، قال: حَدَّثَنِیْ أَبُوْ سَلَمَةَ بنُ عبدِ الرحمنِ، عن مُعَیْقِیْبٍ قال: " سألتُ رسولَ اللہ صلی اللہ علیه وسلم مَنْ مَسْحِ الحَصٰی فِیْ الصَّلَاةِ؟ فَقَالَ: " إِنْ كُنْتَ لَابُدَّ فَاعِلًا فَمَرَّةً وَاحِدَةً"

قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

وفی الباب: عن عَلِیِّ بنِ أبی طالبٍ، وحُذَیْفَةَ، وجابرِ بنِ عبدِ اللّٰهِ، ومُعَیْقِیْبٍ.

قال أبو عیسی: حدیثُ أبی ذَرٍّ حدیثٌ حسنٌ، وقد رُوِیَ عَنِ النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم أَنَّهُ كَرِهَ الْمَسْحَ فِی الصَّلَاةِ، وقال: " إِنْ كُنْتَ لَابُدَّ فَاعِلًا فَمَرَّةً وَاحِدَةً" كَأَنَّهُ رُوِیَ عَنْهُ رُخْصَةٌ فِیْ الْمَرَّةِ الوَاحِدَةِ، والعملُ عَلَی هذا عند أهلِ العلمِ.

وضاحت: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث (نمبر ۳۹۰) ان سے ابوالاحوص نے روایت کی ہے۔ یہ راوی قلیل الروایہ ہے اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے اس کی صرف یہی ایک حدیث ہے۔ اور اس کے احوال مخفی ہیں اس وجہ سے ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کو صرف حسن کہا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: جب تم میں سے کوئی نماز کے لئے کھڑا ہو تو وہ کنکریوں کو نہ چھوئے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کی طرف متوجہ ہے۔ اور دوسری حدیث (نمبر ۳۹۱) کا ترجمہ یہ ہے: حضرت معیقیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے دریافت کیا کہ نماز میں کنکریوں کو چھو سکتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اگر برابر کرنا ضروری ہو تو ایک مرتبہ کرو'' یہ حدیث حسن صحیح ہے، ہمارے نسخوں میں لفظ حسن چھوٹ گیا ہے، مصری نسخہ سے بڑھایا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عمل قلیل سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

نوٹ: مصری نسخہ میں حدیث نمبر ۳۹۱ بالکل آخر باب میں ہے، اور وہی نسخہ صحیح ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ نے وفی الباب میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اور امام ترمذیؒ ایسا تو کرتے ہیں کہ وفی الباب میں کسی حدیث کا حوالہ دیں، پھر اس کو اسی باب میں روایت کریں، مگر ایسا نہیں کرتے کہ حدیث ذکر کرنے کے بعد وفی الباب میں حوالہ دیں۔

بابُ ماجاء فی کَرَاهِیَةِ النَّفْخِ فِیْ الصَّلاَةِ

نماز میں پھونکنا مکروہ ہے

آنحضرت ﷺ نے نماز میں پھونک مار کر سجدہ کی جگہ صاف کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ام سلمۃ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ہمارے گھر میں (یعنی آنحضور ﷺ کے گھر میں) ایک لڑکا تھا جس کا نام افلح تھا اور ایک روایت میں رَباح نام آیا ہے، وہ جب بھی سجدہ میں جاتا تو پہلے پھونک مار کر جگہ صاف کرتا پھر پیشانی زمین پر رکھتا۔ حضور اکرم ﷺ نے اس کو ایسا کرتے دیکھ لیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اے افلح! اپنی پیشانی خاک آلود کر'' یعنی پھونک مت مار اگر پیشانی پر مٹی لگ جائے تو لگنے دے۔

فائدہ: امام ترمذی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ احناف کے نزدیک نماز میں پھونکنا مفسدِ صلوٰۃ ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں، کتبِ احناف میں یہ مسئلہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ نماز میں بے ضرورت کھنکھارنا مکروہ ہے۔ اور کھنکھارنے میں اگر حروف پیدا ہوجائیں تو نماز فاسد ہوجائے گی، کیونکہ حنفیہ کے نزدیک نماز میں کلام کی مطلقاً گنجائش نہیں۔ یہ مسئلہ آئندہ باب میں آرہا ہے۔ اور یہ مسئلہ اگرچہ کتبِ احناف میں ہے مگر اس پر عمل نہیں کیونکہ کوئی بھی شخص بے ضرورت نہیں کھنکھارتا یا اس کا اقرار نہیں کرتا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ بے ضرورت کوئی نہیں کھنکارتا۔ غرض اس مسئلہ کا مصداق نہیں پایا جاتا۔ غرض امام ترمذی رحمہ اللہ نے مذہبِ احناف کی صحیح ترجمانی نہیں کی۔

[۱٦٦] بابُ ماجاءَ فی کراهیةِ النَّفْخِ فِی الصَّلاَةِ

[۳۹۲-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا عَبَّادُ بنُ العَوَّامِ، نا مَيْمُونٌ أبو حَمْزَةَ، عن أبی صَالِحٍ مَوْلَی طَلْحَةَ، عن أُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ: رَأَی النبیُّ صلی الله علیه وسلم غُلاَمًا لَنَا يُقَالُ لَهُ: أَفْلَحُ، إِذَا سَجَدَ نَفَخَ، فقالَ: "يا أَفْلَحُ! تَرِّبْ وَجْهَكَ"

قال أحمدُ بنُ مَنِيعٍ: كَرِهَ عَبَّادٌ النَّفْخَ فِیْ الصَّلاَةِ، وقال: إِنْ نَفَخَ لَمْ يَقْطَعْ صَلاَتَهُ، قال أحمدُ بنُ مَنِيعٍ: وبِهِ نَأْخُذُ.

قال أبو عيسى: ورَوَی بَعضُهم عن أبی حَمْزَةَ هٰذا الحديثَ، وقال مولًی لَنَا يُقَالُ رَبَاحٌ.

حدثنا أحمدُ بنُ عَبْدَةَ الضَّبِّيُّ، نا حَمَّادُ بنُ زَيْدٍ، عن مَيْمُونٍ أبی حَمْزَةَ بهذا الإسناد نحوَه، وقال: غلامٌ لنا يقال له: رَبَاحٌ.

قال أبو عيسى: وحديثُ أم سلمة إسنادُه ليس بذاك، وميمونٌ أبو حمزةَ قَدْ ضَعَّفَهُ بعضُ أهلِ العلمِ.

واختَلَفَ أهلُ العلمِ فِي النَّفْخِ فِيْ الصَّلَاةِ: فَقَالَ بَعْضُهم: إِنْ نَفَخَ فِيْ الصَّلَاةِ اسْتَقْبَلَ الصَّلَاةَ، وهُوَ قَوْلُ سفيانَ الثوريِّ، وأهلِ الكوفة، وقال بعضُهم: يُكْرَهُ النَفْخُ فِيْ الصَّلَاةِ، وإِنْ نَفَخَ فِيْ صَلَاتِهِ لَمْ تُفْسَدْ صَلَاتُهُ، وهو قولُ أحمدَ وإسحاقَ.

ترجمہ اور وضاحت: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میمون ابوحمزہ الاعور القصاب کی وجہ سے ضعیف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کے استاذ احمد بن منیع کہتے ہیں: عباد بن العوام (استاذ الاستاذ) نماز میں پھونکنے کو ناپسند کرتے تھے، مگر فرمایا کہ اگر پھونکا تو نماز فاسد نہیں ہوگی۔ احمد بن منیع کہتے ہیں: ہم اسی قول کو لیتے ہیں۔ پھر امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پہلی سند سے اس لڑکے کا نام افلح آیا ہے، مگر ایک دوسری سند سے اس کا نام رباح آیا ہے اور آخر میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: نماز میں پھونکنے میں علماء کا اختلاف ہے: بعض کہتے ہیں کہ اگر نماز میں پھونکے تو از سر نو نماز پڑھے یہ سفیان ثوری اور اہل کوفہ کا قول ہے۔ اور بعض کہتے ہیں: نماز میں پھونکنا مکروہ ہے لیکن اگر نماز میں پھونکے تو اس کی نماز فاسد نہیں ہوگی۔ یہ امام احمد و اسحاق رحمہما اللہ کا قول ہے۔

بابُ ماجاءَ فِي النَّهْيِ عن الإخْتِصَارِ فِيْ الصَّلَاةِ

نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہونا منع ہے

اختصار کے معنی ہیں: دونوں ہاتھ خاصرۃ (کوکھ) پر رکھ کر کھڑا ہونا۔ آنحضرت ﷺ نے نماز میں حالت قیام میں کوکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہونے کو ناپسند کیا ہے۔ کیونکہ یہ شیطان اور جہنمیوں کے کھڑے ہونے کا انداز ہے، یعنی دوزخی محشر میں جب کھڑے کھڑے تھک جائیں گے تو ستانے کے لئے اس طرح کھڑے ہونگے۔ اس لئے نماز کے باہر بھی اس انداز پر کھڑے ہونے کو ناپسند کیا گیا ہے۔ تاہم اس طرح کھڑے ہونے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔

[۱۶۷] بابُ ماجاءَ في النهي عن الاختصار في الصلاة

[۳۹۳-] حدثنا أبو كُرَيْبٍ، نا أبو أُسَامَةَ، عن هِشَامِ بنِ حَسَّانَ، عن محمدِ بنِ سِيْرِيْنَ، عن أبي هريرةَ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم نَهَى أَنْ يُصَلِّيَ الرَّجُلُ مُخْتَصِرًا.

وفي البابِ: عن ابنِ عُمَرَ. قال أبو عيسى: حديثُ أبي هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وقَدْ كَرِهَ قَوْمٌ مِن أهلِ العلمِ الاختِصَارَ فِيْ الصَّلَاةِ؛ والإخْتِصَارُ: هُوَ أَنْ يَضَعَ الرَّجُلُ يَدَهُ عَلَى خَاصِرَتِهِ فِيْ الصَّلَاةِ، وكَرِهَ بَعْضُهُمْ أَنْ يَمْشِيَ الرجلُ مُخْتَصِرًا، ويُرْوَى أَنَّ إِبْلِيْسَ إِذَا مَشَى: يَمْشِيْ مُخْتَصِرًا.

وضاحت: مُختَصِرًا: اختصار سے اسم فاعل ہے اور ترکیب میں حال ہے یعنی کوکھ پر ہاتھ رکھنے کی حالت میں نماز پڑھنے سے نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اہل علم کی ایک جماعت نے نماز میں اختصار کو ناپسند کیا ہے اور اختصار کے معنی ہیں نماز میں خاصرہ یعنی کوکھ پر ہاتھ رکھنا اور بعض حضرات کوکھ پر ہاتھ رکھ کر چلنے کو بھی ناپسند کرتے ہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ شیطان جب چلتا ہے تو وہ کوکھ پر ہاتھ رکھ کر چلتا ہے (پس اس کی مشابہت اختیار نہیں کرنی چاہئے اور یہ حدیث جمع الفوائد (نمبر۳۳۴۲) میں ہے)

بابُ ماجاء في كَرَاهِيَةِ كَفِّ الشَّعْرِ فِيْ الصَّلاةِ

نماز میں بالوں کو روکنا مکروہ ہے

بال باندھ کر نماز پڑھنے کی کراہیت کا حکم مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ عورتوں کے لئے اولیٰ اور مستحب یہ ہے کہ وہ بال باندھ کر نماز پڑھیں۔ تاکہ نماز میں بالوں کے کھل جانے کا خدشہ نہ رہے۔ کیونکہ عورت کے اگر ایک چوتھائی بال نماز میں کھل گئے اور ایک رکن کے بقدر یعنی تین بار سبحان اللہ کہہ سکیں اتنی دیر کھلے رہے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ یہ مسئلہ علامہ محمود خطاب سبکی رحمہ اللہ نے ابوداؤد کی شرح المنهل العذب المورود (۵:۳۷) میں لکھا ہے۔ اور وہاں سے میں نے ''ڈاڑھی اور انبیاء کی سنتیں'' میں نقل کیا ہے۔

[۱۶۸] بابُ ماجاءَ في كَرَاهيةِ كَفِّ الشَّعْرِ فِيْ الصلاة

[۳۹۴-] حدثنا يحيىَ بنُ مُوسٰى، نا عبدُ الرزاقِ، انا ابنُ جُرَيْجٍ، عن عِمْرانَ بنِ مُوْسَى، عن سَعيدِ بنِ أبى سَعيدٍ المَقْبُرِيِّ، عن أبيه، عن أبى رَافِعٍ: أَنَّهُ مَرَّ بِالْحَسَنِ بنِ عَلِيٍّ وَهُوَ يُصَلِّىْ، وَقَدْ عَقَصَ ضَفِرَتَهُ فِيْ قَفَاهُ، فَحَلَّهَا، فَالْتَفَتَ إِلَيْهِ الحَسَنُ مُغْضِبًا، فقالَ: أَقْبِلْ عَلَى صَلاَتِكَ، وَلاَ تَغْضَبْ، فَإِنِّىْ سمعتُ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يقول: " ذلك كِفْلُ الشَّيْطَانِ"

وفى الباب: عن أُمِّ سَلَمَةَ، وعبدِ اللهِ عباسٍ. قال أبو عيسى: حديثُ أبى رافعٍ حديثٌ حسنٌ.
والعملُ على هذا عندَ أهلِ العلم كَرِهُوْا أَنْ يُصَلِّيَ الرجلُ وهو مَعْقُوْصٌ شَعْرُهُ.
وعِمرانُ بنُ مُوسَى: هو القُرَشِيُّ المَكِّيُّ، وَهُوَ أَخُوْ أَيُّوْبَ بنِ مُوسَى.

ترجمہ: آنحضور ﷺ کے آزاد کردہ ابو رافع رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس سے گذرے درانحالیکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اور انھوں نے اپنے بالوں کو گدی پر چوٹی کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔ ابو رافع نے بال کھول دیئے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے نماز ہی میں ان کی طرف غضبناک نظروں سے دیکھا۔ ابو رافع نے فرمایا:

آپ اپنی نماز کی طرف متوجہ رہیں اور غصہ نہ کریں، اس لئے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے سنا ہے کہ یہ یعنی بالوں کو باندھ کر نماز پڑھنا شیطان کا حصہ ہے —— اور علماء نے آدمی کے نماز پڑھنے کو ناپسند کیا ہے درانحالیکہ اس کے بال بندھے ہوئے ہوں (شعرہ: معقوص کا نائب فاعل ہے)

بابُ مَاجَاءَ فِی التَّخَشُّعِ فِیْ الصَّلاَۃِ

نماز میں خشوع وخضوع کا بیان

آنحضور ﷺ نے تہجد گذاروں سے فرمایا: ''نماز دودو، دودو رکعتیں ہیں۔ ہر دو رکعت پر قعدہ ہے، یعنی تہجد کی ہر دو رکعت پر سلام پھیر دیا جائے۔ جاننا چاہئے کہ آئندہ ابواب میں یہ مسئلہ آرہا ہے کہ نفل نماز ایک سلام سے دو رکعتیں پڑھنا افضل ہے یا چار رکعتیں؟ جو حضرات ایک سلام سے دو رکعتوں کی افضلیت کے قائل ہیں وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ مگر ان کا استدلال صحیح نہیں۔ کیونکہ یہاں آنحضور ﷺ نے تہجد پڑھنے والے بندوں کے لئے ایک سہولت تجویز فرمائی ہے، یہ مسئلہ کا بیان نہیں ہے۔ چونکہ تہجد لمبے پڑھے جاتے ہیں اس لئے اگر چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھی جائیں گی تو لوگ تھک جائیں گے، اس لئے نبی ﷺ نے یہ مشورہ دیا ہے کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیر دیا کرو، پھر کچھ آرام کر کے اگلا شفعہ شروع کرو۔ اور یہ مسئلہ ایسا ہی ہے جیسا پہلے گذرا ہے کہ تہجد گذاروں نے بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ جب وہ تہجد میں لمبے سجدے کرتے ہیں تو ہاتھوں کو کھلا رکھنے کی وجہ سے تھک جاتے ہیں، چنانچہ آپؐ نے فرمایا: ''گھٹنوں سے مدد لیا کرو'' یعنی تہجد کے سجدوں میں کہنیاں گھٹنوں پر ٹیک لیا کرو۔ یہ ایک سہولت تھی اس سے نفل نماز میں گھٹنوں پر ہاتھ ٹیکنے کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی، اسی طرح یہاں بھی سہولت کا بیان ہے اس سے نفل نماز دو دو رکعت پڑھنے کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔ غرض یہ حدیث اگرچہ لفظوں کے اعتبار سے عام ہے مگر شانِ ورود کے اعتبار سے خاص ہے۔

اور اس حدیث کے عموم سے علماء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ سنن ونوافل میں ہر دو رکعت مستقل نماز ہے خواہ ایک سلام سے دو رکعت پڑھی جائیں یا چار رکعت۔ پس سنن ونوافل کی ہر دو رکعت پر قعدہ فرض ہے کیونکہ وہ قعدۂ اخیرہ ہے اور اس میں تشہد، درود اور دعا سب کچھ پڑھنا ہے۔ اور وتر کی نماز اور ایک قول کے مطابق ظہر کی چار سنتیں فرائض کے ساتھ ملحق ہیں۔ لہٰذا ان میں قعدہ اولیٰ میں صرف تشہد پڑھیں گے۔

دوسری بات آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں یہ بیان فرمائی ہے کہ الصلاۃُ تَخَشُّعٌ وتَضَرُّعٌ وتمسکُنٌ یعنی نماز کی حقیقت خشوع وخضوع اور سکون ہے۔ سراپے کی عاجزی یعنی سر سے پیر تک پرسکون رہنے کو تمسکن کہتے ہیں۔ اور صوت (آواز) میں تذلل اختیار کرنے کا نام خشوع ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ﴾

معلوم ہوا کہ خشوع کا تعلق آواز سے ہے۔ اور اندروں کی عاجزی کا نام خضوع ہے، جس کو اردو میں گڑگڑانا کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے تہجد کے بارے میں مروی ہے: لَه اَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ الْمِرْجَلِ۔ جب آپ تہجد میں تلاوت فرماتے تھے تو آپؐ کے اندر سے ہانڈی کی سنسناہٹ جیسی آواز نکلتی تھی۔ یہ تین چیزیں یعنی خشوع وخضوع اور سکون نماز کی ماہیت ہیں۔

پھر فرمایا کہ نماز پڑھنے کے بعد دونوں ہاتھ بارگاہِ خداوندی میں اٹھاؤ اور خوب گڑگڑا کر دعا مانگو۔ یہ دعا مانگنا نماز کا مغز ہے، لہٰذا جو شخص نماز کے بعد دعا نہ مانگے اس کی نماز خاک ہے۔

یہاں یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ جب صحابہ نماز کے اندر دعا مانگنے پر قادر تھے اور قعدۂ اخیرہ دعاؤں ہی کے لئے ہے پس نماز کے بعد دعا مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ بندوں کی بعض حاجتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو نماز کے اندر نہیں مانگا جاسکتا، اس سے نماز فاسد ہوجائے گی۔ علاوہ ازیں عربی بولنے والا ہر شخص صحیح زبان بھی نہیں بولتا۔ اور نماز کے اندر صرف صحیح عربی ہی میں دعا مانگی جاسکتی ہے اس لئے آنحضور ﷺ نے نمازوں کے بعد دعا مانگنے کی تاکید فرمائی۔

اور اس حدیث سے اور اس کے مثل حدیثوں سے نمازوں کے بعد دعا مانگنے کا نہ صرف جواز ثابت ہوتا ہے بلکہ اس کی تاکید بھی ثابت ہوتی ہے۔ پس یہ حدیث نمازوں کے بعد دعا کے لئے اصل (بنیاد) ہے۔

فائدہ: عالمگیری میں ہے کہ دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ دونوں ہاتھ سینہ کے مقابل اس طرح اٹھائے جائیں کہ انگلیوں کا کچھ حصہ چہرہ کے مقابل ہو اور دونوں ہاتھوں کے درمیان چار انگشت کا فاصلہ ہو۔ پھر دعا کے اختتام پر ہاتھوں کو چہرہ پر پھیر لیا جائے۔

[۱۶۹] بابُ ماجاءَ فی التَّخشُّعِ فی الصَّلاَةِ

[۳۹۵-] حدثنا سُوَيْدُ بنُ نَصْرٍ، نا عبدُ اللّٰهِ بنِ الْمُبَارَكِ، نا لَيْثُ بنُ سَعْدٍ، نا عبدُ رَبِّهِ بنُ سَعِيدٍ، عن عِمرانَ بنِ أبی أنَسٍ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ نَافِعِ بنِ العَمْيَاءِ، عن رَبِيْعَةَ بنِ الحَارِثِ، عن الفَضْلِ بنِ عبَّاسٍ، قال: قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: " الصَّلاَةُ مَثْنَى مَثْنَى، تَشَهُّدٌ فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ، وَتَخَشُّعٌ وَتَضَرُّعٌ وتَمَسْكُنٌ، وتُقْنِعُ يَدَيْكَ - يقولُ: تَرْفَعُهُمَا - إلیٰ رَبِّكَ، مُسْتَقْبِلاً بِبُطُوْنِهِمَا وَجْهَكَ، وتقولُ: يارَبِّ! يارَبِّ! ومَنْ لَمْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَهُوَ كَذَا وَكَذَا"

قال أبو عيسى: وقال غَيْرُ ابنِ المباركِ فِيْ هٰذا الحديثِ: " مَنْ لَمْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَهِيَ خِدَاجٌ"

قال أبو عيسى: سمِعتُ محمدَ بنَ إسماعيلَ يقولُ: رَوَى شعبةُ هذا الحديثَ عَن عبدِ رَبِّه بنِ سعيدٍ فَأَخْطَأَ فِيْ مَوَاضِعَ: فقال: عن أَنَسِ بنِ أبی أُنَيْسٍ، وَهُوَ عِمْرَانُ بنُ أبی أنَسٍ؛ وقال: عن عبدِ اللّٰهِ بنِ الحارثِ، وإِنَّمَا هُوَ عبدُ اللّٰهِ بنُ نَافِعِ بنِ العَمْيَاءِ، عن رَبِيْعَةَ بنِ الحارثِ، وقال شُعْبَةُ: عن عَبدِ اللّٰهِ بن

الحَارِثِ، عن المُطَّلِبِ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، وإِنَّمَا هُوَ عَنْ رَبِيْعَةَ بنِ الحَارِثِ بنِ عبدِ المُطَّلِبِ، عن الفَضْلِ بنِ عَباسٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم.
قال محمدٌ: وحديثُ اللَّيْثِ بنِ سَعْدٍ أَصَحُّ مِنْ حديثِ شُعبةَ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تہجد دو دو، دو دو رکعتیں ہیں ہر دو رکعت پر قعدہ ہے۔ اور نماز خشوع وخضوع اور تمسکن ہے اور اٹھائیں آپ اپنے دونوں ہاتھ (کسی راوی نے ترفعهما کے ذریعہ تُقنع کے معنی بیان کئے ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں: تُقْنِعُ يَدَيْكَ إلى ربك مُسْتَقْبِلاً با کو بالفتح اور بالکسر دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں) اپنے پروردگار کی طرف درانحالیکہ ان کا اندرونی حصہ آپ اپنے چہرے کی طرف کرنے والے ہوں اور مستقبلاً کو بالفتح پڑھیں تو ترجمہ ہوگا: درانحالیکہ ہاتھوں کا اندرونی حصہ سامنے کیا ہوا ہو اور عاجزی وانکساری کے ساتھ یا اللہ! یا اللہ! کہہ کر دعا کرے، اور جس نے ایسا نہیں کیا اس کی نماز کذا وکذا ہے (یہ محاورہ ہے اس کا ترجمہ نہیں ہوتا اور مطلب یہ ہے کہ اس کی نماز ناقص ہے) اور ابن المبارک کے علاوہ نے یعنی لیث بن سعد کے دیگر تلامذہ نے فهي خداج کہا ہے۔ اس کے معنی بھی ناقص وناتمام کے ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے امام بخاری رحمہ اللہ کو فرماتے سنا کہ شعبہ رحمہ اللہ بھی اس حدیث کو عبد ربہ سے روایت کرتے ہیں، مگر انھوں نے سند میں تین غلطیاں کی ہیں: (۱) انھوں نے استاذ الاستاذ کا نام انس بن ابی انیس لیا ہے جبکہ صحیح نام عمران بن انس ہے (۲) پھر اس کے بعد کے راوی کا نام عبد اللہ بن الحارث بتایا ہے جبکہ صحیح نام عبد اللہ بن نافع بن العمیاء ہے، وہ ربیعہ بن الحارث سے روایت کرتے ہیں (یعنی شعبہ نے راوی کے نام میں سے عبد اللہ لیا اور مروی عنہ کے باپ کے نام کے ساتھ اس کو ملا دیا) (۳) اور شعبہ نے صحابی کا نام مطلب بتایا ہے جبکہ یہ فضل بن عباس کی حدیث ہے (ربیعہ بن الحارث کے دادا کا نام عبد المطلب تھا، شعبہ نے اس میں سے المطلب لے لیا اور اصل راوی فضل کو چھوڑ دیا) امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: امام لیث رحمہ اللہ کی سند امام شعبہؒ کی سند سے اصح ہے۔

بابُ ماجاء فِيْ كَرَاهِيَةِ التَّشْبِيْكِ بَيْنَ الأَصَابِعِ فِيْ الصَّلاَةِ

نماز میں انگلیوں کو انگلیوں میں داخل کرنا مکروہ ہے

شبکۃ کے معنی ہیں جال۔ اور تشبیک کے معنی ہیں: انگلیوں کو انگلیوں میں داخل کرنا، اور جال بنانا۔ نماز میں یا انتظار نماز کی حالت میں یا نماز کے لئے مسجد کی طرف جاتے ہوئے تشبیک کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ کیونکہ یہ کیفیت جالبِ نوم ہے۔ یعنی تشبیک کرنے کی وجہ سے اگر نیند نہ بھی آئے تو اس کا مقدمہ ''اونگھ'' یا اس کا مقدمہ ''سستی'' ضرور پیدا ہوتی

ہے اور نمازی کو اور منتظر نماز کو ایسی کیفیت اختیار نہیں کرنی چاہئے جو سستی پیدا کرے، اس سے نماز بے مزہ ہو جائے گی اور اسی وجہ سے ان حالات میں فقہاء نے انگلیاں چٹخانے کی ممانعت کی ہے، اس سے بھی آرام ملتا ہے اور طبیعت میں سستی پیدا ہوتی ہے اور نیند آتی ہے۔

[۱۷۰] بابُ ماجاءَ فی کراهیة التشبیك بینَ الأصابع فی الصلاة

[۳۹۶-] حدثنا قُتیبةُ، نا اللَّیْثُ بنُ سَعْدٍ، عن ابنِ عَجْلاَنَ، عن سَعیدٍ المُقْبُرِیِّ، عن رَجُلٍ، عن کَعْبِ بنِ عُجْرَةَ: أنَّ رسولَ الله صلی الله علیه وسلم قال:" إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ فَأَحْسَنَ وُضُوْءَهُ ثُمَّ خَرَجَ عَامِدًا إِلَى المَسجِدِ فَلاَ يُشَبِّكَنَّ بَيْنَ أَصَابِعِهِ فَإِنَّهُ فِيْ صَلاَةٍ"

قال أبو عیسی: حدیثُ کعبِ بنِ عُجْرَةَ رَوَاهُ غَیْرُ وَاحِدٍ عن ابنِ عَجْلاَنَ مِثْلَ حَدیثِ اللَّیْثِ، وَرَوی شَرِیكٌ عن مُحمدِ بنِ عَجْلاَنَ، عن أبیهِ، عن أبی هُرَیْرَةَ، عن النبیِّ صلی الله علیه وسلم نحوَ هذا الحدیثِ؛ وحدیثُ شَرِیْكٍ غیرُ مَحفوظٍ.

ترجمہ: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی شخص وضو کرے اور اچھی طرح وضو کرے پھر مسجد جانے کے لئے گھر سے نکلے تو وہ انگلیوں کے درمیان ہرگز تشبیک نہ کرے کیونکہ وہ (حکما) نماز میں ہے'' ـــــ ابن عجلان سے یہ حدیث متعدد روات نے امام لیث کی طرح روایت کی ہے۔ اور شریک بھی اس کو روایت کرتے ہیں مگر ان کی سند ہے: محمد بن عجلان اپنے والد عجلان سے، وہ ابو ہریرہ سے اور وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ شریک کی یہ سند غیر محفوظ ہے۔ صحیح سند وہی ہے جو اوپر آئی (کیونکہ لیث کے متابع ہیں اور شریک کا کوئی متابع نہیں۔ خیال رہے کہ امام لیث کی سند میں ایک مجہول راوی ہے جس کی وجہ سے وہ سند ضعیف ہے)

بابُ ماجاء فی طُوْلِ الْقِیَامِ فِیْ الصَّلاَةِ

نوافل میں لمبا قیام کرنے کا بیان

یہ دو باب ہیں۔ ان میں یہ مسئلہ ہے کہ نفلوں میں طولِ قنوت یعنی قراءت لمبی کرنا افضل ہے (اس صورت میں رکعتوں کی تعداد کم ہوگی) یا کثرتِ سجود یعنی تلاوت مختصر کر کے زیادہ رکعتیں پڑھنا افضل ہے؟ پہلے باب کی حدیث سے طول قنوت کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور دوسرے باب کی حدیث سے کثرتِ سجود کی فضیلت نکلتی ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے ان دونوں حدیثوں کے بارے میں صرف اتنی بات کہی ہے کہ یہ دونوں روایتیں صحیح ہیں مگر مسئلہ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ البتہ اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے فیصلہ کیا ہے کہ دن کے نوافل میں کثرت

سجود افضل ہے اور رات کے نوافل میں طول قنوت۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ سے دن میں لمبے نفل پڑھنا مروی نہیں جبکہ آپؐ رات میں طویل نفلیں پڑھا کرتے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت اسحاق رحمہ اللہ کے فیصلہ کو پسند کیا ہے۔ اور قرین صواب بھی یہی بات ہے، چنانچہ ہمارے اکابر کا بھی معمول یہی رہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دن کے مزاج میں انقباض ہے اگر بندہ لمبی قراءت کرے گا تو طبیعت ساتھ نہیں دے گی۔ اور رات کے مزاج میں انبساط ہے چنانچہ جتنے تفریحی پروگرام ہوتے ہیں (مشاعرہ، سنیما، ڈرامے، قوالیاں وغیرہ) سب رات میں منعقد کئے جاتے ہیں، پس رات کے نوافل میں طول قنوت افضل ہے۔ البتہ کسی عارض کی وجہ سے برعکس معاملہ بھی ہوسکتا ہے، مثلاً ایک شخص کو رمضان میں نفلوں میں یاد کیا ہوا پارہ پڑھنا ہے یا وہ جمعہ کے روز نفل نماز میں سورۂ کہف پڑھنا چاہتا ہے تو لمبی نماز پڑھے، کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح کسی کا معمول رات میں لمبے تہجد پڑھنے کا اور آٹھ رکعت پڑھنے کا ہے، کسی دن دیر سے اٹھا۔ صبح ہونے میں پندرہ بیس منٹ باقی ہیں تو اُسے مختصر قراءت کرکے آٹھ رکعتیں پڑھ لینی چاہئیں اور طولِ قنوت کی فضیلت ہاتھ سے نکل جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ دوسری فضیلت یعنی کثرتِ سجود کی فضیلت سے ہمکنار ہوجائے گا۔ اور اس کا ورد بھی مکمل ہوجائے گا۔

غرض عوارض کی بات اور ہے ورنہ عام حالات میں دن میں کثرت سجود کی روایت پر اور رات میں طول قنوت کی حدیث پر عمل کرنا چاہئے۔ کیونکہ دن کے نیچر میں انقباض ہے اور رات کے نیچر میں انبساط ہے۔ چنانچہ دن کی تمام نمازیں گونگی ہیں اور رات کی سب نمازیں جہری ہیں۔ اور جمعہ اور عیدین میں جہر کی وجہ عارضی ہے۔ مسلمان عید کی تیاری مہینہ بھر پہلے سے شروع کردیتے ہیں اور خاص عید کے دن صبح ہی سے نہاتے دھوتے ہیں، اچھے کپڑے پہنتے ہیں، اور جمعہ بھی ایک طرح کی عید ہے اس کے لئے بھی پہلے سے تیاری ہوتی ہے، یہ باتیں انقباض کو ختم کرنے والی ہیں اس لئے عیدین اور جمعہ میں جہری قراءت ہے۔ واللہ اعلم

[۱۷۱] بابُ ماجاءَ فی طول القیام فی الصلاۃ

[۳۹۷-] حدثنا ابنُ أبی عُمَرَ، نا سفیانُ بنُ عُیَینَةَ، عن أبی الزُّبَیرِ، عن جابرٍ، قال: قِیلَ لِلنَّبِیِّ صلی اللہ علیه وسلم أَیُّ الصَّلَاةِ أَفْضَلُ؟ قال: "طُوْلُ الْقُنُوْتِ"

وفی الباب: عن عبدِ اللہ بنِ حُبْشِیٍّ، وانسِ بنِ مالكٍ. قال أبو عیسی: حدیثُ جابرٍ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ. وقد رُوِیَ من غیرِ وجهٍ عن جابرِ بنِ عبدِاللہ.

فائدہ: قنوت کے بہت سے معنی حاشیہ میں لکھ رکھے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ان میں سے ایک معنی "قیام" کو اختیار کیا ہے اور اس کے لحاظ سے یہ باب قائم کیا ہے۔ مگر اس معنی کے لئے کوئی وجہ ترجیح نہیں۔ حدیث

میں قنوت کے دوسرے معنی بھی لئے جاسکتے ہیں۔

باب ماجاء فی کَثْرَۃِ الرُّکُوْعِ وَالسُّجُوْدِ

کثرت رکوع وسجود کی فضیلت

حدیث: معدان بن ابی طلحہ کہتے ہیں: میری آنحضور ﷺ کے آزاد کردہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، میں نے ان سے عرض کیا: آپ میری ایسے عمل کی طرف راہنمائی فرمائیں جس کے ذریعہ اللہ مجھے فائدہ پہنچائیں، اور جس کی بدولت مجھے جنت کا دخول نصیب ہو۔ یہ سوال سن کر حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ دیر تک خاموش رہے پھر غور وفکر کے بعد فرمایا: ''بہت زیادہ سجدے کرنے کو لازم پکڑ'' یعنی بکثرت نوافل پڑھ۔ اس لئے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے: ''جو بھی بندہ اللہ کے حضور سجدہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سجدہ کے ذریعہ اس کے ایک درجہ کو بلند فرماتے ہیں اور اس کا ایک گناہ معاف فرماتے ہیں''۔ معدان کہتے ہیں: پھر ایک عرصہ بعد میری ملاقات حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ہوئی میں نے یہی سوال ان سے بھی کیا، انھوں نے بغیر توقف کے وہی جواب دیا جو حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے دیا تھا۔ اور وہی حدیث سنائی جو انھوں نے سنائی تھی ——— بعض اصحاب کے مخصوص القاب تھے، مثلاً سید الشہداء، اسد اللہ، فاروق، صدیق، ذوالنورین وغیرہ۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا لقب حکیم الامت تھا۔ چنانچہ ان کی علمی قابلیت کا اس حدیث سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کو جواب دینے سے پہلے سوچنا پڑا اور انھوں نے فوراً جواب دیدیا۔

فائدہ: جاننا چاہئے کہ بعض لوگوں کو جو بھی مولانا صاحب ملتے ہیں وہ ان سے ایک ہی مسئلہ پوچھتے ہیں اور ان کا مقصد کبھی تو مولانا صاحب کا امتحان کرنا ہوتا ہے اور کبھی آسانی تلاش کرنا، یہ دونوں مقصد مذموم ہیں۔ اور کبھی اس لئے پوچھا جاتا ہے کہ پہلے مولانا صاحب نے جو جواب دیا تھا اس پر دل مطمئن نہیں۔ مؤمن کا دل کسوٹی ہے وہ غلط بات پر مطمئن نہیں ہوتا، غرض اس مقصد سے پوچھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور حضرت معدان نے دوبارہ اس امید پر دریافت کیا ہے کہ شاید ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کوئی اور عمل بتلائیں پس میں دونوں پر عمل کروں اور اپنے کو زیادہ فائدہ پہنچاؤں، یہ تنافس ہے۔ خیر کے کام میں آگے بڑھنے کی سعی ہے جو کہ مطلوب ومستحسن ہے۔

[۱۷۲] بابُ ماجاءَ فی کثرۃ الرکوع والسجود

[۳۹۸-] حدثنا أبو عَمَّارٍ، نا الوَلِیْدُ بنُ مُسْلِمٍ، عن الأَوْزَاعِیِّ، قال: حَدَّثَنِی الولیدُ بنُ هِشَامٍ المُعَیْطِیُّ، قال: حَدَّثنی مَعدانُ بنُ أبی طَلْحَةَ الیَعْمَرِیُّ، قال: لَقِیْتُ ثَوْبَانَ مَوْلَی رسولِ اللہ صلی اللہ

عليه وسلم، فَقُلْتُ لَهُ: دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ يَنفَعُنِي اللّٰهُ به، وَيُدْخِلُنِي اللّٰهُ الجَنَّةَ؟ فَسَكَتَ عَنِّي مَلِيًّا، ثم الْتَفَتَ إِلَيَّ فقال: عَلَيْكَ بِالسُّجُوْدِ فَإِنِّيْ سَمِعْتُ رسولَ اللّٰه صلى الله عليه وسلم يقولُ:" مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْجُدُ لِلّٰهِ سَجْدَةً إِلاَّ رَفَعَهُ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَةً وَحَطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً"

قال مَعْدَانُ: فَلَقِيْتُ أَبَا الدَّرْدَاءِ، فَسَأَلْتُهُ عَمَّا سَأَلْتُ عَنْهُ ثَوْبَانَ، فَقَالَ: عَلَيْكَ بِالسُّجُوْدِ، فَإِنِّيْ سمعتُ رسولَ اللّٰه صلى الله عليه وسلم يقول:" مَامِنْ عَبْدٍ يَسْجُدُ لِلّٰهِ سَجْدَةً إِلاَّ رَفَعَهُ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَةً وَحَطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً"

وفي الباب: عن أبي هريرةَ، وأبي فاطمةَ. قال أبو عيسى: حديثُ ثوبانَ وأبي الدرداءِ في كَثْرَةِ الرُّكُوْعِ والسُّجُوْدِ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وقد اخْتَلَفَ أهلُ العلمِ فِيْ هٰذا: فَقَالَ بَعْضُهُمْ: طُوْلُ القِيَامِ فِيْ الصَّلَاةِ أَفْضَلُ مِنْ كَثْرَةِ الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: كَثْرَةُ الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ أَفْضَلُ مِنْ طُوْلِ القِيَامِ.

وقال أحمدُ بنُ حنبلٍ: قد رُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم فِيْ هٰذا حَدِيْثَانِ، ولم يَقْضِ فِيْهِ بِشَيْءٍ.

وقال إسحاقُ: أَمَّا بِالنَّهَارِ فَكَثْرَةُ الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ، وَأَمَّا بِاللَّيْلِ فَطُوْلُ القِيَامِ، إِلاَّ أَنْ يَكُوْنَ رَجُلٌ لَهُ جُزْءٌ بِاللَّيْلِ يَأْتِيْ عَلَيْهِ، فَكَثْرَةُ الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ فِيْ هٰذَا أَحَبُّ إِلَيَّ، لِأَنَّهُ يَأْتِيْ عَلٰى جُزْئِهِ وَقَدْ رَبِحَ كثرةَ الركوعِ والسُّجودِ.

قال أبو عيسى: وإِنَّمَا قالَ إسحاقُ هٰذا: لِأَنَّهُ كذا وُصِفَتْ صلاةُ النبيِّ صلى الله عليه وسلم بِاللَّيْلِ، وَوُصِفَ طولُ القيامِ؛ وَأَمَّا بِالنَّهَارِ فَلَمْ تُوْصَفْ مِنْ صَلَاتِهِ مِنْ طُوْلِ القِيَامِ مَا وُصِفَ بِاللَّيْلِ.

ترجمہ: بعض علماء نماز میں طول قیام کو رکوع اور سجدوں کی کثرت سے افضل بتاتے ہیں اور بعض کثرت رکوع وسجود کو قیام میں دیر تک کھڑے رہنے سے افضل بتاتے ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں دو (صحیح) حدیثیں مروی ہیں، اور انھوں نے ان مسئلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اور اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے فرمایا: رہا دن تو کثرتِ رکوع وسجود افضل ہے اور رہی رات تو طولِ قیام افضل ہے۔ مگر یہ کہ کسی شخص کے لئے رات میں کوئی وظیفہ ہو تو وہ اس کے مطابق کرے، پس اس کے حق میں رکوع سجود کی کثرت مجھے زیادہ پسند ہے، اس لئے کہ اس صورت میں وہ اپنا ورد پورا کرلے گا، اور کثرت رکوع وسجود والی فضیلت سے بہرہ ور ہوگا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بات وہی ہے جو حضرت اسحاق نے کہی۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کی رات میں نماز کی یہی کیفیت بیان کی گئی ہے یعنی (رات کی نماز میں) طولِ قیام بیان کیا گیا ہے اور رہا دن تو دن کے نوافل میں طولِ قیام کے بارے میں بیان نہیں کیا گیا جیسا کہ رات کے نوافل کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔

بابُ ماجاء فی قَتلِ الأَسوَدَینِ فِیْ الصَّلاَۃِ

نماز میں سانپ بچھو مارنے کا حکم

حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں دو کالوں کو مارنے کا حکم دیا: سانپ کو اور بچھو کو۔

تشریح: اس حدیث کا ماسیق لاجلہ الکلام یہ ہے کہ اگر نمازی کے سامنے سے سانپ یا بچھو گذریں تو ان کو جانے نہ دیا جائے مار دینا چاہئے۔ کیونکہ اگر ان کو جانے دیا جائے گا تو وہ کہیں گھس جائیں گے اور بعد میں نقصان پہنچائیں گے۔ حدیث شریف کا منشاء بس اتنا ہی ہے۔ رہی یہ بات کہ ان کو مارنے سے نماز باقی رہے گی یا جاتی رہے گی؟ تو یہ الگ بات ہے۔ اگر عملِ قلیل سے مارا ہے مثلاً بچھو سامنے سے گذر رہا تھا اتفاق سے قریب ہی چپل بھی رکھی تھی وہ اس پر رکھ کر دبا دی تو یہ عمل قلیل ہے پس نماز باقی رہے گی۔ اور اگر ان کو مارنے کے لئے عمل کثیر کرنا پڑا ہے تو نماز جاتی رہے گی از سرِ نو نماز پڑھے۔ اور نماز کے بطلان کا کوئی گناہ نہیں ہوگا کیونکہ ان کو مارنے کے لئے نماز توڑنا عذر شرعی ہے۔

[۱۷۳] بابُ ماجاءَ فی قتل الأَسوَدَینِ فِیْ الصَّلاَۃ

[۳۹۹-] حدثنا علیُّ بنُ حُجرٍ، انا إسماعیلُ بنُ عُلَیَّۃَ، عن علیِّ بنِ المبارکِ، عن یحییَ بنِ أبی کَثیرٍ، عن ضَمْضَمِ بنِ جَوْسٍ، عن أبی ھریرۃَ، قال: أَمَرَ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بِقَتْلِ الأَسْوَدَیْنِ فِیْ الصَّلاَۃِ: الحَیَّۃِ والعَقْرَبِ.

وفی الباب: عن ابن عباسٍ، وأبی رافع. قال أبو عیسی: حدیثُ أبی ھریرۃَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

والعملُ عَلَی ھذا عندَ بعضِ أھلِ العلمِ مِن أصحابِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم وغیرِھِمْ، وبہ یقولُ أحمدُ وإسحاقُ؛ وکَرِہَ بَعْضُ أھلِ العلمِ قَتْلَ الحَیَّۃِ وَالعَقْرَبِ فِیْ الصَّلاَۃِ، قال إبراھیمُ: إِنَّ فِیْ الصَّلاَۃِ لَشُغلاً؛ والقولُ الأَوَّلُ أَصَحُّ.

ترجمہ: اس حدیث پر بعض صحابہ اور تابعین کا عمل ہے اور یہی احمد و اسحاق رحمہما اللہ کا قول ہے (اس عبارت کا مطلب اگر یہ ہے کہ نماز کے اندر سانپ بچھو کو ضرور مار ڈالنا چاہئے تو یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ ان کو مارنے کے لئے خواہ کتنا بھی عمل کرنا پڑے نماز باطل نہیں ہوگی تو یہ بات محلِ نظر ہے ابن قدامہ رحمہ اللہ نے بھی صریح کوئی بات نہیں لکھی وہ (مغنی ۱:۶۶۳) میں صرف اتنی بات لکھتے ہیں کہ احمد و شافعی رحمہما اللہ وغیرہ کے نزدیک نماز کے اندر دو کالوں کو مارنے میں حرج نہیں۔ اور شرح مہذب (۹۲:۴) میں ہے: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اگر ان کو

مارنے کے لئے عمل کثیر کرنا پڑے تو نماز فاسد ہوگی) اور بعض اہل علم نے سانپ اور بچھو کے مارنے کو مکروہ کہا ہے (اس کا اگر یہ مطلب ہے کہ نماز کے اندران کو نہیں مارنا چاہئے تو یہ قول حدیث کے معارض ہے پس مردود ہے۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ ان کو مارنے سے عمل کثیر کی صورت میں نماز فاسد ہوجاتی ہے تو صحیح ہے) اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بیشک نماز میں مشغولیت ہے (یہ قول بھی ذو معنی ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ نماز کے افعال واعمال طے شدہ ہیں ان کے علاوہ میں مشغول ہونا جائز نہیں لہٰذا دو کالوں کو مارنے سے نماز فاسد ہوجائے گی تو بات ٹھیک ہے اور القول الأول أصح کی ضرورت نہیں۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ نماز میں ان دونوں کو مارنا نہیں چاہئے۔ نماز کے کاموں میں مشغول رہنا چاہئے، تو پھر قول اول اصح ہے)

بَابُ ماجاء في سَجْدَتَيِ السَّهْوِ قَبْلَ السَّلاَمِ

سلام سے پہلے سجدۂ سہو کرنے کا بیان

امام ترمذی رحمہ اللہ نے پہلے یہ مسئلہ چھیڑا تھا کہ سجدۂ سہو میں دو رائیں ہیں۔ ایک: قبل السلام کی رائے ہے، دوسری: بعد السلام کی۔ پھر فرمایا تھا کہ قائلینِ قبل السلام کی روایت اصح ہے۔ وہ حدیث یہاں لائے ہیں۔ اس مسئلہ میں روایات میں اتنا شدید اختلاف ہے کہ کوئی دو امام ایک بات پر متفق نہیں، ہر مجتہد کی رائے الگ ہے۔

سب سے پہلے یہ بات جان لینی چاہئے کہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک سجدہ سہو کی حقیقت: دو سجدے، تشہد اور سلام ہے۔ چنانچہ مذہب حنفیہ میں سجدۂ سہو کرنے کا اصل طریقہ یہ ہے کہ قعدہ اخیرہ میں سب کچھ پڑھ لے: تشہد بھی، درود بھی اور دعا بھی۔ اس کے بعد سلام پھیرے، پھر دو سجدے کرے، پھر صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیر دے۔ مگر جماعت کی نماز میں عارضی مصلحت سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیا جائے پھر سجدے کئے جائیں اور درود و دعا سہو کے قعدہ میں تشہد کے بعد پڑھے جائیں۔ اور ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ مسبوق جان لیں کہ یہ ایمر جنسی سلام ہے اور وہ کھڑے ہونے میں جلدی نہ کریں۔ مگر اب طریقہ یہ چل پڑا ہے کہ ہر نماز میں صرف تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیتے ہیں، بلکہ بعض کتابوں میں یہی مسئلہ لکھ دیا ہے۔ حالانکہ امام اعظمؒ کے قول کی صحیح صورت وہ ہے جو میں نے بیان کی ائمہ کے اختلاف کو اور احادیث کے مطلب کو سمجھنے کے لئے مذہب کی اصل صورت سے واقف ہونا ضروری ہے۔

غرض احناف کے نزدیک سہو کی تمام صورتوں میں افضل یہ ہے کہ سلام کے بعد سجدے کئے جائیں۔ اور سلام کے بارے میں فقہ حنفی میں تین قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ صرف ایک سلام پھیرے اور وہ بھی سامنے پھیرے، دائیں بائیں منہ نہ موڑے۔ اس قول پر کسی حنفی عالم نے فتوی نہیں دیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دائیں بائیں دو سلام پھیرے، صاحب ہدایہ وغیرہ نے اسی قول کی تصحیح کی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ صرف ایک سلام پھیرے اور دائیں جانب منہ

موڑے۔ ابوالحسن کرخی رحمہ اللہ نے اس قول کی تصحیح کی ہے اور یہی مفتی بہ ہے۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سہو کی ہر صورت میں سلام سے پہلے سجدہ کرنا اولیٰ ہے ان کے نزدیک سجدۂ سہو کی حقیقت ہے: سَجدتان لا تشهُّدَ و لا سلامَ: صرف دو سجدے بغیر تشہد اور سلام کے، چنانچہ ان کے یہاں طریقہ یہ ہے کہ قعدہ اخیرہ میں سب کچھ پڑھ کر سلام پھیرے بغیر دو سجدے کرتے ہیں پھر معاً سلام پھیر دیتے ہیں۔

اور امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے: الدَّالُ بالدَّال و القاف بالقاف: یعنی اگر نماز میں زیادتی ہوئی ہے تو بعد سلام سجدہ کرنا اولیٰ ہے۔ اور نقصان (کمی) ہوئی ہے تو قبل السلام سجدہ کرنا افضل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ زیادتی کی صورت میں بعد السلام سجدے اس لئے ہیں کہ وہ نماز سے باہر ہو جائیں اگر قبل السلام سجدے کئے جائیں گے تو وہ نماز میں داخل ہو جائیں گے، اور زیادتی در زیادتی لازم آئے گی۔ اور نقصان کی صورت میں قبل السلام سجدے اس لئے ہیں کہ وہ نماز میں داخل ہو کر جو کمی ہوئی ہے اس کی تلافی کریں۔

اور امام احمد اور امام اسحاق رحمہما اللہ فرماتے ہیں: احادیث میں جو صورتیں آئی ہیں ان کی اتباع کرنا اولیٰ ہے۔ احادیث میں پانچ صورتیں آئی ہیں جن میں سے بعض کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ غرض سہو کی جن صورتوں میں قبل السلام سجدہ کرنا وارد ہوا ہے اگر ان میں سے کوئی صورت پیش آئے تو قبل السلام سجدہ کیا جائے اور جن صورتوں میں بعد السلام سجدہ کرنا مروی ہے وہ صورت پیش آئے تو پھر سجدہ بعد السلام کرنا چاہئے۔ اور اگر سہو کی کوئی نئی صورت پیش آئے تو پھر امام احمد: امام شافعی رحمہما اللہ کے ساتھ ہیں اور امام اسحاق: امام مالک رحمہما اللہ کے ساتھ ہیں۔

امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب بظاہر اچھا معلوم ہوتا ہے مگر اس پر عمل ممکن نہیں۔ کیونکہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو پہلے گذری ہے، آنحضرت ﷺ کا پہلے قعدہ کو بھول کر کھڑے ہونے کی صورت میں بعد السلام سجدہ کرنا مروی ہے۔ اور عبداللہ بن بُحَینَۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو کہ باب میں ہے یہ آیا ہے کہ آنحضور ﷺ ظہر کے پہلے قعدہ سے کھڑے ہو گئے تو آپؐ نے قبل السلام سجدہ کیا۔ یہ دونوں حدیثیں اعلیٰ درجہ کی صحیح ہیں پس عمل کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ غرض ہر امام کی اپنی رائے جداگانہ ہے، اور امام احمد اور امام اسحاق رحمہما اللہ شروع میں ساتھ ضرور ہیں مگر بعد میں وہ بھی علحدہ علحدہ ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ تمام ائمہ متفق ہیں کہ سجدۂ سہو قبل السلام بھی جائز ہے اور بعد السلام بھی، اختلاف صرف اولیٰ اور افضل کا ہے۔ مگر چونکہ مسئلہ میں خوب بحث ہوئی ہے اس لئے احناف کے ذہن میں قبل السلام سجدے کی گنجائش نہیں رہی۔ اور شوافع بعد السلام سجدے کو جانتے ہی نہیں۔ یہ جو ذہن بن گئے ہیں وہ ٹھیک نہیں۔ میں حنفی ہوں اور جب کبھی سجدۂ سہو کی ضرورت پیش آتی ہے اپنے امام کے مذہب پر عمل کرتا ہوں مگر مجھے جب کسی وجہ سے جلدی ہوتی ہے تو امام شافعیؒ کے مذہب پر عمل کرتا ہوں کیونکہ اس میں تشہد ایک ہی مرتبہ پڑھنا ہے اس لئے آدمی جلدی فارغ ہو جاتا ہے۔

روایات کا خلاصہ: اس کے بعد جاننا چاہئے کہ مسئلہ باب میں قولی اور فعلی دونوں طرح کی روایتیں ہیں اور وہ مختلف ہیں یعنی آنحضرت ﷺ سے قبل السلام اور بعد السلام دونوں طرح سجدہ سہو کرنا مروی ہے اور آپؐ نے قبل السلام سجدہ سہو کرنے کے لئے بھی ارشاد فرمایا ہے اور بعد السلام بھی۔ اور قولی روایتوں میں سے بعد السلام والی روایت بخاری (حدیث ۴۰۱ باب التوجه نحو القبلة) اور مسلم (۲۱۲:۱ السهو فی الصلاۃ) میں ہے اور قبل السلام والی قولی روایت صرف مسلم (۲۱۱:۱) میں ہے۔ اور فعلی روایتوں میں سے صرف قبل السلام والی روایت متفق علیہ ہے (بخاری حدیث ۱۲۲۴، مسلم ۲۱۱:۱) اور بعد السلام والی فعلی روایت بھی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ قول وفعل میں تعارض کے وقت فعلی روایت کو ترجیح دیتے ہیں اور احناف قولی روایت کو تفصیل (۲۰۹:۱ میں) گذر چکی ہے۔ یہ اختلاف کی بنیاد ہے۔

آخری بات: امام اعظم رحمہ اللہ کی تین دلیلیں ہیں:

۱- حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کسی کو نماز کی رکعتوں کی تعداد میں شک ہو جائے تو وہ غور کرے اور ظن غالب پر عمل کرے پھر سلام پھیر کر سہو کے دو سجدے کرے، یہ قولی حدیث متفق علیہ ہے، البتہ مسلم میں مختصر ہے۔

۲- آنحضور ﷺ نے قاعدہ کلیہ بیان فرمایا ہے: ''سہو کی ہر صورت میں دو سجدے ہیں، سلام پھیرنے کے بعد'' یہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو ابوداؤد (حدیث ۱۰۳۸) میں ہے اور صحیح سند کے ساتھ ہے اور اسماعیل بن عیاش کی وجہ سے حدیث کی صحت متاثر نہیں ہوتی، کیونکہ ان کا استاذ عبید اللہ کلاعی شامی ہے اور اسماعیل شامی اساتذہ کی روایتوں میں بالاجماع معتبر ہیں۔

۳- عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''جسے نماز میں شک ہو جائے تو چاہئے کہ وہ سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کرے۔ یہ حدیث بھی صحیح ہے (ابوداؤد ۱۰۳۳)

اور امام اعظم رحمہ اللہ کی عقلی دلیل یہ ہے کہ بعد السلام سجدہ کرنے میں عبادت زیادہ ہے کیونکہ اس صورت میں تشہد دو مرتبہ پڑھنا پڑتا ہے۔ پس اس صورت کو افضل قرار دینا اولیٰ ہے۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ ان احادیث کے درمیان ناسخ ومنسوخ کی بات کہتے ہیں اور قبل السلام والی حدیث کو ناسخ قرار دیتے ہیں اور ان کی دو دلیلیں ہیں:

پہلی دلیل: ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کی حدیث ہے کہ آنحضور ﷺ سے قبل السلام اور بعد السلام سجدہ کرنا مروی ہے اور آخری عمل قبل السلام سجدہ کرنے کا ہے۔ مگر یہ حدیث زہری کے مراسیل میں سے ہے اور مراسیلِ زہری بالاتفاق ضعیف ہیں۔ یحییٰ قطان نے ان کے بارے میں فرمایا ہے: شِبْهُ لاشیئٍ یعنی زہری کے مراسیل کی حیثیت پرچھائیں سے زیادہ نہیں۔

دوسری دلیل: بعد التسلیم سجدے والی حدیث حضرت ذوالیدین رضی اللہ عنہ کے قصہ میں مروی ہے اور وہ شہدائے بدر میں سے ہیں پس یقیناً یہ واقعہ سن ۲ ہجری سے پہلے کا ہے یعنی ابتدائے اسلام کا ہے۔ مگر یہ بھی کوئی مضبوط دلیل نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن مسعود اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں بھی بعد التسلیم سجدہ کرنا مروی ہے۔ اور یہ دونوں حضرات آنحضرت ﷺ کے بعد تک بقیدِ حیات رہے ہیں۔

[۱۷٤] بابُ ماجاءَ فی سجدتی السهو قبل السلام

[٤٠٠-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ، عن ابنِ شهابٍ، عن عبدِ الرحمنِ الأَعْرَجِ، عن عبدِ اللّٰهِ ابنِ بُحَيْنَةَ الأَسدِيِّ، حَلِيفِ بنى عبدِ المطلب: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قَامَ فِيْ صَلاَةِ الظُّهْرِ وَعَلَيْهِ جُلُوْسٌ، فَلَمَّا أَتَمَّ صَلاَتَهُ سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، يُكَبِّرُ فِيْ كُلِّ سَجْدَةٍ وَهُوَ جَالِسٌ، قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ، وسَجَدَهُمَا النَّاسُ مَعَهُ مَكَانَ مَا نَسِيَ مِنَ الْجُلُوْسِ.

وفى الباب: عن عبدِ الرحمنِ بنِ عَوْفٍ.

[٤٠١-] حدثنا محمدُ بنُ بشارٍ، نا عبدُ الأَعْلٰى، وأبو داوُد، قالا: نا هشامٌ، عن يحيىَ بنِ أبى كَثِيرٍ، عن محمدِ بن إبراهيمَ: أَنَّ أبا هريرةَ وَالسَّائِبَ القارىَ كانايَسْجُدَانِ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ قَبْلَ التَّسْلِيْمِ.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ بُحَيْنَةَ حديثٌ حسنٌ، والعَمَلُ على هٰذا عندَ بَعْضِ أهلِ العلمِ، وهوَ قولُ الشافعيِّ: يَرَى سُجُوْدَ السَّهْوِ كُلَّهُ قَبْلَ التَّسْلِيْمِ، ويقولُ: هٰذا النَّاسِخُ لِغَيْرِهِ مِنَ الأَحَادِيْثِ، وَيَذْكُرُ أَنَّ آخِرَ فِعْلِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم كَانَ علىٰ هٰذَا.

وقال أحمدُ وإسحاقُ: إِذَا قَامَ الرَّجُلُ فِيْ الرَّكْعَتَيْنِ، فَإِنَّهُ يَسْجُدُ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ قَبْلَ السَّلاَمِ عَلٰى حديثِ ابنِ بُحَيْنَةَ.

وعبدُ اللّٰه بنُ بُحَيْنَةَ: هُوَ عبدُ اللّٰهِ بنُ مالكٍ ابنُ بُحَيْنَةَ، مالكٌ أبوه، وبُحَيْنَةُ أُمُّهُ، هكذا أَخْبَرَنِيْ إسحاقُ بنُ منصورٍ، عن عليِّ بنِ المدِيْنِيِّ.

قال أبو عيسى: واختَلَفَ أهلُ العلمِ فِيْ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ مَتَى يَسْجُدُهُمَا الرَّجُلُ قَبْلَ السَّلاَمِ أَوْ بَعْدَهُ؟ فَرَأَى بَعْضُهم أن يَسْجُدَهُمَا بَعْدَ السَّلاَمِ، وَهُوَ قولُ سفيانَ الثوريِّ وأهلِ الكوفةِ؛ وقال بَعْضُهم: يَسْجُدُهُمَا قبلَ السلامِ، وَهُوَ قَوْلُ أكثرِ الفُقَهَاءِ مِنْ أهلِ المَدِيْنَةِ، مِثْلُ يحيىَ بنِ سعيدٍ، وَرَبِيْعَةَ، وغيرِهِمَا، وبهِ يقولُ الشافعيُّ.

وقال بَعْضُهم: إذا كانَتْ زيادةٌ فى الصَّلاَةِ فَبَعْدَ السَّلاَمِ، وإذَا كان نُقْصَانًا فَقَبْلَ السَّلاَمِ، وهو قولُ مالكِ بنِ أنسٍ.

وقال أحمدُ: مَا رُوِىَ عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم فِى سَجدَتَيِ السَّهوِ فَيُستَعمَلُ كُلٌّ على جِهَتِه: يَرَى إِذَا قامَ فى الرَّكعَتَينِ عَلٰى حَدِيثِ ابنِ بُحَينَة، فَإِنَّه يَسجُدُهُمَا قَبلَ السَّلَامِ، وإذَا صَلَّى الظُّهرَ خمساً فإنَّه يسجُدُهُمَا بعدَ السلامِ، وإذاسَلَّم فى الركعتَينِ من الظُّهرِ والعصرِ فَإِنَّه يَسجُدُهما بعدَ السلامِ، وكلٌّ يُستَعمَلُ على جِهَتِهِ، وكُلُّ سَهوٍ لَيسَ فِيهِ عَنِ النبىِّ صلى الله عليه وسلم ذِكرٌ، فإنَّ سَجدَتَيِ السَّهوِ فِيهِ قبل السلامِ.

وقال إسحاقُ نحوَ قولِ أحمدَ فى هذا كلِّه، إلَّا أنَّه قال: كُلُّ سَهوٍ لَيسَ فيهِ عَن النبىِّ صلى الله عليه وسلم ذِكرٌ، فإن كانَت زِيَادَةً فى الصَّلَاةِ يَسجُدُهُمَا بعدَ السلامِ، وإن كانَ نُقصَانًا يَسجُدُهُمَا قَبلَ السَّلَامِ.

ترجمہ: باب میں عبداللہ ابن بُحَينَة کی حدیث ہے۔ یہ صحابی قبیلہ اسد کے ہیں اور وہ بنی عبدالمطلب کے حلیف تھے یعنی ان سے دوستی کرلی تھی اور مکہ میں بس گئے تھے۔ اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ باہر کا آدمی مکہ میں رہائش حاصل کرنے کے لئے مقامی کسی قبیلہ سے حلف کرتا تھا۔ وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز میں کھڑے ہوگئے درانحالیکہ آپ پر بیٹھنا تھا یعنی قعدۂ اولی بھول گئے۔ پس جب آپؐ نے نماز پوری کی تو بیٹھے ہوئے سلام پھیرنے سے پہلے دوسجدے کئے آپؐ ہر سجدہ کے ساتھ تکبیر کہتے تھے۔ اور آپؐ کے ہمراہ لوگوں نے بھی سجدے کئے اس قعدہ کی جگہ میں جو حضور اکرم ﷺ بھول گئے تھے ـــــــ (اس حدیث کا مضمون بعینہ وہی ہے جو حضرت مغیرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث کا ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ یہاں قبل التسلیم سجدہ کرنے کی بات ہے اور حضرت مغیرہ کی حدیث میں بعد التسلیم۔ اور پیچھے حضرت امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسی حدیث کے بارے میں کہا تھا کہ یہ اصح ہے، حالانکہ مصنف رحمہ اللہ کی یہ بات بے اصل ہے کیونکہ مغیرۃ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو خود ترمذی رحمہ اللہ نے حسن صحیح کہا ہے۔ پس یہ حدیث اصح کیسے ہوگئی؟ حسن صحیح سے اوپر تو کوئی مرتبہ نہیں)

اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے محمد بن ابراہیم کی سند سے یہ بات نقل کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ اور السائب القاری قبل السلام سجدہ کیا کرتے تھے ـــــــ السائب القاری جلیل القدر تابعی ہیں اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد تھے اور قبیلہ قارہ سے ان کا تعلق تھا اس لئے قاری کہلاتے تھے۔ ان کا عمل حجت نہیں۔ مگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، ان کا عمل حجت ہے۔ مگر ان کی طرف اس قول کی نسبت صحیح نہیں۔ علامہ عراقی رحمہ اللہ جو کہ شافعی ہیں فرماتے ہیں: ابن مسعود، ابن عباس، ابو ہریرہ اور ابن الزبیر وغیرہ بعد السلام سجدہ کیا کرتے تھے اور طحاوی رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی عمل لکھا ہے۔

اور جاننا چاہئے کہ ابن بُحَينَة کی حدیث اعلی درجہ کی صحیح ہے اور متفق علیہ ہے اور ہمارے ہندوستانی نسخوں سے لفظ

صحیح کسی کی کارستانی سے اڑ گیا ہے، مصری نسخہ میں حسنٌ صحیحٌ ہے۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: اور اس پر بعض اہل علم کا عمل ہے اور یہی قول امام شافعی کا ہے۔ وہ سہو کی تمام صورتوں میں سلام سے پہلے سجدہ کرنے کو افضل بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ابن بُحَینَۃ کی حدیث دیگر احادیث کے لئے ناسخ ہے اور کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا آخری عمل اسی کے مطابق تھا (مگر یہ دعوی محتاج دلیل ہے) اور احمد واسحاق نے فرمایا: جب مصلی دو رکعتوں سے یعنی قعدہ اولی بھول کر کھڑا ہو جائے تو وہ سلام سے پہلے سجدہ کرے ابن بُحَینَۃ کی حدیث کے موافق (مگر حضرت مغیرہ کی حدیث سے صرف نظر کرنے کی کوئی وجہ نہیں اس میں اسی صورت میں بعد السلام سجدہ کرنا مروی ہے اور وہ بھی اعلی درجہ کی صحیح حدیث ہے) اور عبداللہ کے والد کا نام مالک ہے اور بُحَینَۃ ان کی والدہ ہیں ـــــ جاننا چاہئے کہ اعلام متناسبہ (نسب ناموں) میں جو ابن آتا ہے اس کا الف نہیں لکھا جاتا، اور نہ پڑھا جاتا ہے۔ اور اعلام غیر متناسبہ میں جو ابن آتا ہے اس کا الف لکھا جاتا ہے مگر پڑھا نہیں جاتا۔ چنانچہ عبداللہ ابن بُحَینَۃ میں الف لکھا گیا ہے، کیونکہ بُحَینَۃ اعلام غیر متناسبہ میں سے ہے۔ یعنی وہ والدہ ہیں۔ اور نسب مردوں سے چلتا ہے۔ نیز اعلام غیر متناسبہ کا ابن پہلے نام کی صفت ہوتا ہے اس لئے عبداللہ بن مالک ابنُ بُحَینَۃ پر پیش ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علماء کا سجدۂ سہو کے بارے میں اختلاف ہے کہ ان کو کب کرے؟ سلام سے پہلے کرے یا سلام کے بعد؟ بعض کا خیال یہ ہے کہ سلام کے بعد کرے اور یہ ثوری اور کوفہ والوں کا قول ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ان کو سلام سے پہلے کرے، اور یہ اکثر فقہائے مدینہ مثلاً یحیی بن سعید اور ربیعۃ الرای وغیرہ کا قول ہے، اور امام شافعی رحمہ اللہ یہی بات کہتے ہیں۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ جب نماز میں زیادتی ہو جائے تو سجدے سلام کے بعد کرے اور جب نقصان ہو جائے تو سلام سے پہلے کرے۔ اور یہ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آنحضور ﷺ سے سجدہ کے بارے میں جو مروی ہے اسی کے مطابق عمل کرنا چاہئے (لفظی ترجمہ: پس استعمال کی جائے ہر روایت اس کے رُخ پر) دیکھتے ہیں وہ ابن بُحَینَۃ کی حدیث پر عمل کرنے کو جبکہ مصلی دو رکعت سے کھڑا ہو جائے۔ یعنی قعدۂ اولی بھولنے کے وقت قبل السلام سجدہ کرے۔ اور جب ظہر کی پانچ رکعت پڑھ لے تو بعد السلام سجدہ کرے (یہ صورت ابن مسعود کی حدیث میں آئی ہے) اور جب ظہر اور عصر کی دو رکعت پر سلام پھیر دے تو بھی سلام کے بعد سجدہ کرے (یہ ذوالیدین والا واقعہ ہے) ـــــ اور چوتھی صورت: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے رکعت کی تعداد میں شک ہونے کی بناء پر قبل السلام سجدہ کیا۔ اور پانچویں صورت: عمران بن حصین کی حدیث میں ہے کہ آنحضور ﷺ نے تین رکعت پر سلام پھیر دیا تو ایک رکعت پڑھ کر بعد السلام سجدہ کیا۔ یہ دونوں حدیثیں مسلم شریف باب السهو فی الصلاۃ میں ہیں۔

اور ہر حدیث استعمال کی جائے اس کے رخ پر (یہ مکرر ہے) اور ہر وہ بھول جس کے بارے میں حضور اکرم ﷺ

سے کچھ مروی نہیں اس میں سلام سے پہلے سجدے ہیں۔ اور اسحاق رحمہ اللہ کی رائے پانچوں صورتوں میں امام احمد رحمہ اللہ کے مانند ہے، مگر وہ فرماتے ہیں کہ بھول کی جو صورتیں آنحضور ﷺ سے مروی نہیں ان میں اگر نماز میں زیادتی ہوگئی ہے تو سجدے بعد السلام کرے اور اگر نقصان ہوا ہے تو قبل السلام کرے۔

بابُ ماجاءَ فی سَجْدَتَیِ السَّھْوِ بَعْدَ السَّلامِ والْکَلامِ

سلام کے بعد سجدۂ سہو کا بیان

یہ باب عراقی فقہاء کے لئے ہے۔ اور کلام فی الصلوٰۃ کا مسئلہ آگے آرہا ہے۔ یہاں وہ مسئلہ نہیں چھیڑا گیا۔ اور باب میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں: آنحضور ﷺ نے ایک مرتبہ ظہر کی پانچ رکعت پڑھادیں۔ سلام کے بعد آپ سے عرض کیا گیا: کیا نماز میں زیادتی ہوگئی یا آپ کو بھول لاحق ہوئی؟ صورت حال جان کر آپؐ نے دو سجدے کئے اور یہ سجدے سلام کے بعد کئے ــــــ جاننا چاہئے کہ احناف کا مستدل یہ حدیث نہیں ہے، کیونکہ یہ حدیث اسلام کے ابتدائی دور کی ہے جب کہ نماز میں کلام جائز تھا۔ بلکہ احناف کی اصل دلیل ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی وہ قولی حدیث ہے جو متفق علیہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب کسی شخص کو نماز میں رکعتوں کی تعداد میں شک ہوجائے تو وہ سوچنے کے بعد جو ظن غالب قائم ہو اس پر عمل کرے پھر بعد السلام سجدۂ سہو کرے (بخاری حدیث ۴۰۱)

فائدہ: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ثلاثی اور رباعی فرض نماز کے دونوں قعدے یکساں ہیں یعنی سنت (بمعنی واجب) ہیں پس ان کے نزدیک دونوں میں سے کسی کے بھی ترک کی صورت میں سجدۂ سہو کرلینا کافی ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک قعدۂ اولیٰ واجب اور قعدۂ ثانیہ فرض ہے۔ لہٰذا قعدہ اخیرہ چھوٹ جانے سے فرض باطل ہوجاتا ہے۔ اور مذہب احناف میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص قعدہ اخیرہ بھول کر اگلی رکعت کے لئے کھڑا ہوجائے اور اُسے اس رکعت کا سجدہ کرنے سے پہلے یاد آجائے تو قعدہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔ سجدۂ سہو کے بعد نماز صحیح ہوجائے گی اور اگر اس رکعت کا سجدہ کرلیا تو پھر وہ رکعت پوری ہوگئی اور فرض باطل ہوگیا اور اُسے چاہئے کہ مزید ایک رکعت ملا کر اسے نفل بنالے اور فرض از سر نو پڑھے ــــــ اور حدیث مذکور میں آنحضور ﷺ نے قعدۂ اخیرہ کیا تھا یا نہیں اس سے حدیث خاموش ہے پس یہ نہ کسی کے موافق ہے نہ معارض۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ کی طرح یہاں بھی امام ترمذی رحمہ اللہ نے ائمہ کے گروپ ٹھیک سے قائم نہیں کئے۔ انھوں نے قائلین قبل السلام کے گروپ میں امام احمدؒ کو بھی رکھ دیا ہے اور بعد السلام والے گروپ میں صرف احناف کو رکھا ہے حالانکہ قبل السلام والے گروپ میں تنہا امام شافعی رحمہ اللہ ہیں اور بعد السلام والے گروپ میں اکیلے احناف ہیں۔ اور امام مالک واحمد رحمہما اللہ نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر ہیں۔

[١٧٥] بابُ ماجاءَ فی سَجْدَتَيِ السَّهْوِ بعد السلام والكلام

[٤٠٢-] حدثنا إسحاقُ بنُ منصورٍ، نا عَبدُ الرحمنِ بنُ مَهْدِيٍّ، نا شُعْبَةُ، عَنِ الحَكَمِ، عن إبراهيمَ، عن عَلْقَمَةَ، عن عبدِ اللهِ بنِ مَسْعُوْدٍ: أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم صَلَّى الظُّهْرَ خَمْسًا، فَقِيْلَ لَهُ: أَزِيْدَ فِيْ الصَّلَاةِ أم نَسِيْتَ؟ فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ بَعْدَ مَا سَلَّمَ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[٤٠٣-] حدثنا هنادٌ ومحمودُ بنُ غَيْلَانَ، قالا: نا أبو مُعَاوِيَةَ، عن الأَعْمَشِ، عن إبراهيمَ، عن عَلْقَمَةَ، عن عبدِ اللّٰهِ: أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم سَجَدَ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ بَعْدَ الْكَلَامِ.

وفی الباب: عن مُعاويةَ، وعبدِ اللهِ بنِ جَعْفَرٍ، وأبی هُرَيْرَةَ.

[٤٠٤-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيْعٍ، نا هُشَيْمٌ، عن هِشَامِ بنِ حَسَّانٍ، عن محمدِ بنِ سِيْرِيْنَ، عن أبی هريرةَ أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم سَجَدَهُمَا بَعْدَ السَّلَامِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وقد رَوَاهُ أَيُّوْبُ وغيرُ واحدٍ عن ابنِ سِيْرِيْنَ.

وحديثُ ابنِ مسعودٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، والعملُ عَلَى هذا عندَ بعضِ أهلِ العلمِ، قالوا: إِذَا صَلَّى الرجلُ الظُّهْرَ خَمْسًا فَصَلَاتُه جَائِزَةٌ، وسَجَدَ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ وإِنْ لَمْ يَجْلِسْ فِيْ الرَّابِعَةِ، وَهُوَ قَوْلُ الشَّافِعِيِّ وأحمدَ وإسحاقَ.

وقال بَعضُهم: إذا صَلَّى الظُّهْرَ خَمْسًا ولم يَقْعُدْ فی الرَّابِعَةِ مِقْدَارَ التَّشَهُّدِ فَسَدَتْ صَلَاتُه، وَهُوَ قَوْلُ سُفيانَ الثَّوْرِيِّ وبعضِ أهلِ الْكُوْفَةِ.

ملحوظہ: اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جو حسن صحیح حدیث ہے کہ آنحضور ﷺ نے بعد السلام سجدے کئے، یہ قرینہ ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے گذشتہ باب میں جو بیان کیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ قبل السلام سجدہ کیا کرتے تھے وہ بات صحیح نہیں۔ کیونکہ راوی کا عمل اس کی روایت کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ عراقی رحمہ اللہ نے امام ترمذی رحمہ اللہ کے قول کی تردید کی ہے۔

بابُ ماجاء فی التَّشَهُّدِ فی سَجْدَتَيِ السَّهْوِ

سجدۂ سہو کے بعد تشہد کا بیان

جو حضرات قبل التسلیم سجدہ کے قائل ہیں ان کے نزدیک سجدہ سہو کی حقیقت صرف دو سلام ہے اس میں نہ تشہد ہے

نہ سلام۔ اور قائلین بعد التسلیم کے یہاں سجدۂ سہو کی حقیقت تین چیزیں ہیں: دو سجدے، تشہد اور سلام —— اس باب کی حدیث انہی حضرات کے حق میں ہے۔

حدیث: عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی اور آپ کو بھول ہوئی۔ پس آپؐ نے دو سجدے کئے پھر تشہد پڑھا پھر سلام پھیرا۔

تشریح: یہ حدیث اگرچہ سند کے اعتبار سے صحیح ہے مگر اس میں تشہد کا ذکر شاذ ہے کیونکہ اس کو محمد بن سیرین سے بہت سے تلامذہ روایت کرتے ہیں اور صرف اشعث اس میں تشہد کا ذکر کرتے ہیں۔ باقی کوئی بھی تلمیذ اس حدیث میں تشہد کا تذکرہ نہیں کرتا۔ نیز خالد حذاء سے بھی متعدد حضرات نے یہ حدیث روایت کی ہے مگر کسی نے بھی حدیث میں تشہد کا ذکر نہیں کیا، صرف اسی سند سے یعنی اشعث عن ابن سیرین عن خالد الحذاء کی سند سے ثم تشهد آیا ہے پس یہ ٹکڑا شاذ ہے۔

نوٹ: ابن سیرین نے باب کی حدیث کے علاوہ روایتیں ابوالمہلب سے خالد حذاء کے واسطہ کے بغیر بھی روایت کی ہے، مگر باب کی حدیث خالد عن ابی قلابۃ کے توسط سے ابوالمہلب سے روایت کی ہے۔ اور ابو قلابہ: ابو المہلب کے بھتیجے ہیں۔ وروى ابن سيرين عن أبي المهلب کا یہی مطلب ہے۔ اور حدیث مذکور کو حدیث عمران، حدیث ذوالیدین اور حدیث خرباق بھی کہتے ہیں۔

[۱۷۶] بابُ ماجاءَ في التَّشَهُّدِ فِيْ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ

[٤٠٥-] حدثنا محمدُ بنُ يحيىَ، نا محمدُ بنُ عبدِ اللهِ الأنصاريُّ، قال: أَخْبَرَنِيْ أَشْعَثُ، عن ابنِ سِيْرِيْنَ، عن خَالِدِ الْحَذَّاءِ، عن أبي قِلَابَةَ، عن أبي الْمُهَلَّبِ، عن عِمْرَانَ بنِ حُصَيْنٍ، أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم صَلّٰى بِهِمْ، فَسَهَا فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ تَشَهَّدَ ثُمَّ سَلَّمَ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ.

ورَوَى ابنُ سِيرِينَ عن أبي الْمُهَلَّبِ – هو عَمُّ أبي قِلَابَةَ – غَيْرَ هٰذَا الحَدِيْثِ.

ورَوَى محمدٌ هذا الحديثَ عن خالدِ الحَذَّاءِ، عن أبي قِلَابَةَ، عن أبي الْمُهَلَّبِ؛ وأبو الْمُهَلَّبِ: اسمُه عبدُ الرحمنِ بنُ عمرٍو، ويقالُ أيضًا: معاويةُ بنُ عمرٍو.

وقد رَوَى عبدُ الوهَّابِ الثَّقَفِيُّ وهُشَيْمٌ وغيرُ واحِدٍ هذا الحديثَ عن خالدِ الحَذَّاءِ، عن أبي قِلَابَةَ بطُولِهِ، وهو حديثُ عِمرانَ بنِ حُصَيْنٍ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم سَلَّمَ فِيْ ثَلَاثِ رَكَعَاتٍ مِنَ الْعَصْرِ فَقَامَ رَجلٌ يقالُ لَهُ: الْخِرْبَاقُ.

واختَلَفَ أهلُ العلمِ في التَّشَهُّدِ فِيْ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ، فقال بعضُهم: يَتَشَهَّدُ فِيهِمَا وَيُسَلِّمُ، وقال

بَعْضُهُمْ: لَيْسَ فِيهِمَا تَشَهُّدٌ وتَسْلِيمٌ؛ وَإِذَا سَجَدَهُمَا قَبْلَ التَّسْلِيمِ لَمْ يَتَشَهَّدْ، وهو قولُ أحمدَ وإسحاقَ، قالا: إِذَا سَجَدَ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ قَبْلَ السَّلَامِ لَمْ يَتَشَهَّدْ.

ترجمہ: سجدۂ سہو میں تشہد کے سلسلہ میں علماء میں اختلاف ہے، بعض حضرات کہتے ہیں: ان کے بعد تشہد پڑھے اور سلام پھیرے اور بعض کہتے ہیں: ان کے بعد تشہد اور سلام نہیں ہے اور جب قبل السلام سجدے کرے تو تشہد نہ پڑھے اور یہ امام احمد اور امام اسحاق رحمہما اللہ کا قول ہے۔ وہ دونوں فرماتے ہیں: جب سلام سے پہلے سہو کے سجدے کرے تو تشہد نہ پڑھے۔

بابٌ فِيمَنْ يَشُكُّ فِي الزِّيَادَةِ والنُّقْصَانِ

رکعتوں کی تعداد میں شک ہوجائے تو کیا کرے؟

مذاہب فقہاء:

۱- ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اگر رکعتوں کی تعداد میں شک ہوجائے تو بناء علی الاقل کرے، اس کے لئے دوسری تعبیر ہے: بناء علی الیقین کرے۔ مثلاً تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار؟ اس میں شک ہو تو تین سمجھے کیونکہ وہ یقینی ہے اور جہاں قعدۂ اخیرہ کا احتمال ہو وہاں قعدۂ اخیرہ کرے پس مذکورہ صورت میں تیسری پر بھی اور چوتھی پر بھی قعدہ کرے۔ یہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ائمہ ثلاثہ نے اگرچہ قعدۂ اولیٰ وثانیہ کو یکساں قرار دیا ہے مگر ان کے یہاں بھی قعدہ اخیرہ کی حیثیت زیادہ ہے ورنہ احتیاط کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

۲- امام شعبی اور امام اوزاعی رحمہما اللہ کے نزدیک حکم یہ ہے کہ نماز میں جس جگہ بھی شک ہوجائے فوراً سلام پھیر کر نماز ختم کردے اور از سرِ نو نماز پڑھے تا آنکہ اُسے رکعتوں کی تعداد صحیح یاد رہے۔

۳- حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سہو کی ہر صورت میں سجدۂ سہو کرلینا کافی ہے۔

۴- اور احناف کے نزدیک اگر مصلی کو پہلی بار شک پیش آیا ہے یا کبھی سال دو سال میں ایک آدھ بار شک ہوتا ہے تو اس کے لئے استیناف کا حکم ہے یعنی وہ از سرِ نو نماز پڑھے۔ اور اگر شک پیش آتا رہتا ہو اور وہ ذی رائے ہو تو تحری کرے اور ظن غالب پر عمل کرے۔ اور ذی رائے نہ ہو تو پھر بناء علی الاقل کرے اور جہاں قعدہ اخیرہ کا احتمال ہو وہاں قعدہ کرے کیونکہ قعدۂ اخیرہ فرض ہے، اور آخر میں سجدۂ سہو کرے۔

جاننا چاہئے کہ ذی رائے شخص کو تحری نماز کا وظیفہ جاری رکھتے ہوئے کرنی ہے، ورنہ اس پر سجدۂ سہو واجب ہوگا، علامہ حصکفی رحمہ اللہ نے درمختار میں یہی مسئلہ لکھا ہے۔ اور ابن الہمام رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ چاہے وظیفہ موقوف

کرکے سوچے اور چاہے وظیفہ جاری رکھنے کے ساتھ سوچے ہر صورت میں سجدۂ سہو واجب ہے۔ اور علامہ کشمیری قدس سرہ نے صاحب درمختار کے قول کو اظہر (قوی) قرار دیا ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ مسئلۂ باب میں تین روایتیں ہیں۔ ایک: ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جب کسی شخص کو نماز میں رکعتوں کی تعداد میں شک ہو جائے تو چاہئے کہ وہ نماز از سرنو پڑھے (بحوالہ نصب الرایہ ۲: ۱۷۳) امام اوزاعی اور امام شعبی رحمہما اللہ نے اسی حدیث کو اختیار کیا ہے۔ دوسری حدیث حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہے جو متفق علیہ ہے، اس میں ہے کہ جب کسی شخص کو رکعتوں کی تعداد میں شک ہو جائے تو وہ صحیح بات سوچے اور اس کے مطابق عمل کرے۔ اور تیسری روایت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی ہے جو اس باب میں ہے۔ اس میں بناء علی الاقل کی بات ہے، ائمہ ثلاثہ نے اس حدیث پر مسئلہ کا مدار رکھا ہے۔ اور احناف نے تینوں حدیثوں کو جمع کیا ہے اور مسئلہ کی تین صورتیں تجویز کی ہیں۔ واللہ اعلم

[۱۷۷] بابٌ فیمن یَشُكُّ فی الزیادةِ والنقصان

[۴۰۶-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِیعٍ، نا إسماعیلُ بنُ إبراهیمَ، نا هِشامٌ الدَّسْتَوَائِیُّ، عن یَحییَ بنِ أبی كَثِیرٍ، عن عِیَاضِ بنِ هِلَالٍ، قال: قُلْتُ لِأَبِی سَعِیدٍ: أَحَدُنَا یُصَلِّیْ فَلَا یَدْرِیْ كَیْفَ صَلّٰی؟ فَقَال: قال رسولُ اللهِ صلى الله علیه وسلم: " إِذَا صَلّٰی أَحَدُكُمْ فَلَمْ یَدْرِ كَیْفَ صَلّٰی فَلْیَسْجُدْ سَجْدَتَیْنِ وَهُوَ جَالِسٌ "

وفی الباب: عن عثمانَ، وابنِ مسعودٍ، وعائشةَ، وأبی هریرةَ. قال أبو عیسی: حدیثُ أبی سعیدٍ حدیثٌ حسنٌ. وقد رُوِیَ هذا الحدیثُ عن أبی سعیدٍ مِنْ غَیْرِ هٰذَا الوَجْهِ.

ورُوِیَ عَنِ النبیِّ صلى الله علیه وسلم أَنَّهُ قَالَ: " إِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِی الوَاحِدَةِ وَالثِّنْتَیْنِ فَلْیَجْعَلْهَا وَاحِدَةً، وَإِذَا شَكَّ فِیْ الإِثْنَتَیْنِ وَالثَّلَاثِ فَلْیَجْعَلْهُمَا اثْنَتَیْنِ، وَیَسْجُدْ فی ذٰلِكَ سَجْدَتَیْنِ قَبْلَ أَنْ یُسَلِّمَ "

والعملُ عَلَی هذا عندَ أصحابِنا؛ وقال بَعْضُ أهلِ العلمِ: إِذَا شَكَّ فی صَلَاتِهِ فَلَمْ یَدْرِ كَمْ صَلّٰی؟ فَلْیُعِدْ.

[۴۰۷-] حدثنا قُتَیْبَةُ، نا اللَّیْثُ، عن ابنِ شِهَابٍ، عن أبی سَلَمَةَ، عن أبی هریرةَ، قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله علیه وسلم: " إِنَّ الشَّیْطَانَ یَأْتِیْ أَحَدَكُمْ فِیْ صَلَاتِهِ فَیُلَبِّسُ علیه، حتی لَایَدْرِیْ كَمْ صَلّٰی؟ فَإِذَا وَجَدَ ذٰلِكَ أَحَدُكُمْ فَلْیَسْجُدْ سَجْدَتَیْنِ وَهُوَ جَالِسٌ "

قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

[۴۰۸-] حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا محمدُ بنُ خالدِ بنِ عَثْمَةَ، نا إبراهیمُ بنُ سَعْدٍ، قال: حدثنی محمدُ بنُ إسحاقَ، عن مَكْحُوْلٍ، عن كُرَیْبٍ، عَنِ ابنِ عَبَّاسٍ، عن عبدِ الرحمنِ بنِ عَوْفٍ، قال:

سمِعتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم يقولُ: " إِذَا سَهَا أَحَدُكُمْ فِيْ صَلَاتِهِ فَلَمْ يَدْرِ وَاحِدَةً صَلّٰى أَوْ ثِنْتَيْنِ فَلْيَبْنِ على وَاحِدَةٍ، فَإِنْ لَمْ يَدْرِ ثِنْتَيْنِ صَلّٰى أَوْ ثَلَاثًا فَلْيَبْنِ علىٰ ثِنْتَيْنِ، فَإِنْ لَمْ يَدْرِ ثَلَاثًا صَلّٰى أَوْ أَرْبَعًا فَلْيَبْنِ علىٰ ثَلَاثٍ، وَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ"

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ وقد رُوِيَ هذا الحديثُ عن عبدِ الرحمنِ بنِ عَوْفٍ مِنْ غَيْرِ هٰذَا الوَجْهِ؛ رَوَاهُ الزُّهْرِيُّ عن عُبَيْدِ اللّٰهِ بنِ عبدِ الله بنِ عُتْبَةَ، عن ابنِ عَبَّاسٍ، عن عبدِ الرحمنِ بنِ عَوْفٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

ترجمہ: (حدیث ۴۰۶) عیاض بن ہلال کہتے ہیں: میں نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ہم میں سے کوئی نماز پڑھ رہا ہو اور اُسے یاد نہ رہے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں (تو کیا حکم ہے؟) انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: "جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے اور اُسے یاد نہ رہے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں تو چاہئے کہ وہ بیٹھے ہوئے دو سجدے کرے" (یہ حدیث حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا مستدل ہے) —— اور یہ حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے متعدد طرق سے مروی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "جب کسی کو ایک رکعت میں اور دو رکعت میں شک ہو جائے تو چاہئے کہ اُسے ایک رکعت گردانے، اور جب دو اور تین میں شک ہو جائے تو ان کو دو گردانے، اور اس میں قبل التسلیم سہو کے دو سجدے کرے (یہ ابن عوف رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو یہاں مختصر ہے اور باب کے آخر میں بالتفصیل آرہی ہے) اور ہمارے اکابر (علمائے حجاز) کے نزدیک اس حدیث پر عمل ہے اور بعض علماء کہتے ہیں کہ جب نماز میں شک ہو جائے اور یہ یاد نہ رہے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں تو وہ نماز کو لوٹائے (یہ اوزاعی اور شعبی کا قول ہے)

(حدیث ۴۰۷) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "بیشک شیطان تم میں سے ایک شخص کے پاس اس کی نماز میں آتا ہے اور اس پر رکعتوں کو مشتبہ کر دیتا ہے یہاں تک کہ اُسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس نے کتنی رکعت پڑھی ہیں، پس جب کسی مصلی کو یہ بات پیش آئے تو اُسے بیٹھے ہوئے دو سجدے کر لینے چاہئیں"

(حدیث ۴۰۸) عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جب کسی شخص کو اس کی نماز میں سہو لاحق ہو اور اُسے یاد نہ رہے کہ اس نے ایک رکعت پڑھی یا دو؟ تو چاہئے کہ ایک پر بناء کرے (یعنی اس کو ایک سمجھے) اور اگر یہ یاد نہ رہے کہ اس نے دو پڑھیں یا تین؟ تو اُسے دو پر بنا کرنی چاہئے۔ اور اگر تین اور چار میں شک ہو جائے تو تین پر بناء کرے اور قبل التسلیم سجدہ سہو کرے۔ ابن عوفؓ کی یہ حدیث اس سند کے علاوہ طریق سے بھی مروی ہے، اس کو زہری: عبید اللہ سے، وہ ابن عباس سے، وہ ابن عوف سے اور وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔

بابُ ماجاء فی الرجُلِ یُسَلِّمُ فی الرَّکْعَتَیْنِ مِنَ الظُّھْرِ والعَصْرِ

ظہر اور عصر کی دو رکعتوں پر سلام پھیر دے تو کیا حکم ہے؟

حدیث: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک مرتبہ ظہر یا عصر کی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا اور حجرہ میں تشریف لے گئے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حیران تھے کہ یہ کیا ہوا؟ کیونکہ آنحضرت ﷺ کو بھول ہوئی ہو یہ بات بھی ممکن ہے، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ نماز کم کردی گئی ہو، کیونکہ پہلے ہر نماز مغرب کے علاوہ دو رکعت تھی، پھر بعد میں زیادتی عمل میں آئی ہے۔ اور وحی نماز کے اندر بھی نازل ہوتی تھی، تحویل قبلہ کا حکم نماز ہی کے اندر آیا ہے۔ لہٰذا یہ احتمال بھی تھا کہ شاید نماز کے اندر وحی آئی ہو اور فرض گھٹا دیئے گئے ہوں۔ اور پیچھے سے کچھ لوگ یہ کہتے ہوئے کہ نماز میں کمی کردی گئی مسجد سے نکل بھی گئے۔ حضرت ذوالیدین رضی اللہ عنہ آنحضور ﷺ کے حجرہ میں گئے اور عرض کیا: کیا فرض میں کمی ہوگئی یا آپ کو بھول لاحق ہوئی؟ آپؐ نے فرمایا: نہ کمی ہوئی اور نہ بھول ہوئی۔ حضرت ذوالیدینؓ نے عرض کیا: آپ نے دو ہی رکعتیں پڑھائی ہیں۔ چنانچہ آپؐ مسجد میں تشریف لائے آپؐ کے چہرہ پر غصہ کے آثار تھے۔ اور آپؐ محراب کے قریب ایک لکڑی پر دونوں ہاتھ رکھ کر اور ہاتھوں پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر کھڑے ہوئے اور پوچھا: ذوالیدین کیا کہتے ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: آنجناب نے صرف دو رکعتیں پڑھائی ہیں، چنانچہ آپؐ قبلہ کی طرف متوجہ ہوئے اور باقی دو رکعتیں پڑھائیں اور سلام کے بعد سہو کے دو سجدے کئے۔ اور وہ نماز کے سجدوں کے مانند تھے یا ان سے بھی طویل تھے، پھر نماز پوری فرمائی۔

تشریح: جو شخص بھول کر درمیانِ نماز سلام پھیر دے اس کی نماز ختم نہیں ہوتی کیونکہ قاعدہ ہے: سلامُ مَن عَلَیْهِ بَقِیَّةٌ مِنَ الصَّلاةِ لَایَقْطَعُ الصلاۃ: جس کی نماز ابھی باقی ہے وہ اگر (بھولے) سے سلام پھیر دے تو اس کی نماز باطل نہیں ہوتی، جیسے بعض مسبوق لاعلمی میں جب امام سجدۂ سہو کے لئے سلام پھیرتا ہے تو وہ بھی سلام پھیر دیتے ہیں یا بعض مسبوق بھول کر امام کے ساتھ سلام پھیر دیتے ہیں۔ بس جب ان کو مسبوق ہونا یاد آئے تو وہ کھڑے ہو کر باقی نماز پڑھ لیں بشرطیکہ کوئی منافی صلاۃ عمل نہ کیا ہو اور آخر میں سجدۂ سہو کرلیں، نماز صحیح ہوجائے گی۔

کلام فی الصلاۃ کا مسئلہ:

① ـــــ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی بناء پر نماز میں فی الجملہ (کچھ نہ کچھ) کلام کی گنجائش تسلیم کی ہے، چنانچہ ان کا مشہور قول ہے کہ نماز کے اندر ناسیاً کلام کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔ اور علامہ نووی رحمہ اللہ نے شرح مہذب میں اس کے ساتھ غیرُ طویلٍ کی قید بڑھائی ہے یعنی کلام بھول کر کیا گیا ہو اور طویل نہ ہو۔ مگر امام ترمذی

رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ پر ہونے والے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک نسیان کی قید نہیں، بلکہ مطلقاً کلام فی الصلاۃ کی گنجائش ہے چاہے بھول کر ہو یا جان بوجھ کر ـــــــ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کو روزے پر قیاس کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ روزہ ایک عبادت ہے اور وہاں بھول کر کھانے پینے سے روزہ باطل نہیں ہوتا اور نماز بھی ایک عبادت ہے پس اس میں بھی کلام مفسد صلوٰۃ نہیں ہونا چاہئے۔ پھر اعتراض ہوا کہ عمداً کھانے پینے سے تو روزہ ٹوٹ جاتا ہے پھر عمداً کلام فی الصلاۃ سے نماز فاسد کیوں نہیں ہوتی؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ روزہ کی حدیث میں نسیان کی قید موجود ہے اور یہاں کوئی قید نہیں۔ اس لئے خواہ عمداً کلام کرے یا ناسیاً نماز فاسد نہیں ہوگی۔ اس سوال وجواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول عمداً کلام فی الصلاۃ سے بھی نماز نہ ٹوٹنے کا ہے۔

(۲) ـــــ اور امام احمد رحمہ اللہ کا قول مصنف رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ہے کہ اگر امام یا مقتدی یا دونوں کے گمان میں نماز پوری ہو چکی ہے جبکہ نفس الامر میں پوری نہیں ہوئی پھر کلام کیا گیا تو کلام اثر انداز نہیں ہوگا، بصورت دیگر نماز فاسد ہو جائے گی۔ وہ فرماتے ہیں: مذکورہ حدیث میں حضور اکرم ﷺ کا اور صحابہ کا خیال یہ تھا کہ فرض مکمل ہو چکا ہے۔ آنحضرت ﷺ سمجھ رہے تھے کہ آپؐ نے پوری نماز پڑھائی ہے اور صحابہ کا خیال تھا کہ شاید نماز میں کمی ہو گئی ہے۔ غرض امام اور مقتدی سب یہ سمجھ رہے تھے کہ نماز مکمل ہو چکی ہے اس لئے یہ کلام مفسد صلاۃ نہیں۔

(۳) ـــــ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک مطلقاً کلام مفسد صلاۃ ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر، عمداً ہو یا ناسیاً یا جاہلاً۔ اور ان کی تین دلیلیں ہیں:

۱- حضرت معاویہ بن الحکم سُلَمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دوران جماعت ایک شخص نے چھینکا انھوں نے جواباً یرحمک اللہ کہا۔ لوگوں نے ان کو گھورا تو وہ نماز ہی میں بولے: تم لوگ مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ صحابہ نے رانوں پر ہاتھ مارے چنانچہ وہ خاموش ہو گئے۔ نماز کے بعد آنحضور ﷺ نے ان کو مسئلہ بتلایا: **إنَّ هذه الصلاةَ لایَصْلُح فیها شیئٌ من کلام الناس إنما هی التسبیح والتکبیر وقراءۃُ القرآن** یعنی نماز میں کلام کی مطلق گنجائش نہیں، نماز صرف تسبیح وتکبیر اور قراءتِ قرآن ہے (مسلم، مشکوۃ حدیث ۹۷۸ باب مالا یجوز إلخ)

۲- حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ پہلے لوگ نماز میں بات چیت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۸ نازل ہوئی یعنی ﴿قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ﴾ پس خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ اور کلام سے روک دیا گیا۔ یہ حدیث ابن ماجہ کے علاوہ پوری جماعت نے روایت کی ہے (بخاری حدیث ۴۵۳۴ کتاب التفسیر)

۳- حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ارضِ حبشہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے حضور اکرم ﷺ نماز کے اندر سلام کا جواب دیتے تھے۔ جب میں ہجرت کے بعد مدینہ آیا اور خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو آنحضور

ﷺ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے سلام کیا آپ نے جواب نہیں دیا، پھر نماز مکمل فرما کر جواب دیا اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں اپنے دین میں احکام بھیجتے ہیں، تمہارے حبشہ جانے کے بعد اللہ نے جو احکام بھیجے ہیں ان میں سے یہ حکم بھی ہے کہ تم نماز میں بات نہ کرو'' (ابوداؤد، مشکوۃ حدیث ۹۸۹) ـــــــ ان تینوں حدیثوں سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ نماز میں سلام کا جواب دینا یا کوئی دوسرا کلام کرنا مفسد نماز ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اس مسئلہ میں جو اختلاف ہے وہ نقطۂ نظر کا اختلاف ہے۔ احناف نے جو تین روایتیں پیش کی ہیں وہ قولی ہیں اور باب میں مذکور حدیث فعلی ہے اور فعل وقول میں جب تعارض ہوتا ہے تو ائمہ ثلاثہ فعلی حدیث کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کے ذریعہ قولی حدیث میں تخصیص کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ فعلی حدیث قولی سے اقوی ہے کیونکہ اس میں نسخ کا احتمال نہیں جبکہ قولی حدیث میں یہ احتمال ہوتا ہے اس لئے امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث پر مسئلہ کا مدار رکھا ہے۔ اور احناف کے تینوں مستدلات میں اس حدیث کے ذریعہ تخصیص کی ہے اور یہ مسئلہ طے کیا ہے کہ نماز کے اندر فی الجملہ یعنی تھوڑے کلام کی گنجائش ہے، طویل کلام کی گنجائش نہیں۔ گویا انھوں نے ان تینوں حدیثوں کا محمل کلام طویل کو قرار دیا ہے۔

اور حنفیہ تعارض کے وقت قولی حدیث کو اختیار کرتے ہیں کیونکہ فعلی حدیث میں احتمالات نکل سکتے ہیں، وہ تشریع کے وقت کی ترخیص بھی ہوسکتی ہے اور وہ نبی ﷺ کی خصوصیت بھی ہوسکتی ہے اس لئے حنفیہ نے مسئلہ کا مدار قولی احادیث پر رکھا ہے اور نماز میں کلام کی گنجائش باقی نہیں رکھی۔

فائدہ: کلام فی الصلاۃ کے مسئلہ میں امام احمد رحمہ اللہ سے متعدد اقوال مروی ہیں اور وہ آخری بات جس پر ان کی رائے ٹھہر گئی ہے وہ امام اعظم رحمہ اللہ کے قول کے مطابق ہے یعنی مطلقاً کلام مفسد صلاۃ ہے۔ تفصیل مغنی (۱:۷۰۲) میں ہے۔ اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ کے بھی اس مسئلہ میں متعدد اقوال ہیں اور قاضی عیاض رحمہ اللہ نے امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ نماز میں کلام کی صورت میں نماز کا اعادہ مستحب ہے۔ اور حارث بن مسکین (مالکی) فرماتے ہیں: امام مالک کے تلامذہ کا اس پر اجماع ہے کہ کلام فی الصلاۃ والی احادیث اسلام کے ابتدائی دور کی ہیں اور وہ سب منسوخ ہیں (عمدۃ القاری ۴:۲۶۸) پس اب مسئلہ میں اختلاف صرف امام شافعی رحمہ اللہ کا رہ جاتا ہے۔

[۱۷۸] باب ماجاء فی الرجل یُسَلِّمُ فی الرکعتین من الظهر والعصر

[۴۰۹-] حدثنا الأنصاریُّ، نا مَعْنٌ، نا مالكٌ، عن أیوبَ بنِ أبی تَمِیْمَةَ وَهُوَ السَّخْتِیَانِیُّ، عن مُحمدِ بنِ سِیْرِیْنَ، عن أبی هریرةَ: أنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم انْصَرَفَ مِنَ اثْنَتَیْنِ، فقال له ذُو الیَدَیْنِ: أَقُصِرَتِ الصلاةُ أم نَسِیْتَ یارسولَ اللهِ؟ فقال النبیُّ صلی الله علیه وسلم: أَصَدَقَ ذُو

اليَدَيْنِ؟ فقال الناسُ: نعم، فقامَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم فَصَلَّى اثْنَتَيْنِ أُخْرَيَيْنِ، ثم سَلَّمَ، ثم كَبَّرَ، فَسَجَدَ مِثْلَ سُجُوْدِهِ أو أَطْوَلَ، ثم كَبَّرَ فَرَفَعَ ثم سَجَدَ مِثْلَ سُجُوْدِهِ أَوْ أَطْوَلَ.

وفي الباب: عن عِمرانَ بنِ حُصَيْنٍ، وابنِ عمرَ، وذِي اليَدَيْنِ.

قال أبو عيسى: وحديث أبي هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

واختَلَفَ أهلُ العلمِ في هذا الحديثِ، فقال: بعضُ أهلِ الكوفةِ: إِذَا تَكَلَّمَ فِيْ الصَّلَاةِ نَاسِيًا أَوْ جَاهِلًا أَوْ مَا كَانَ: فَإِنَّهُ يُعِيدُ الصَّلَاةَ، وَاعْتَلُّوْا بِأَنَّ هٰذَا الحديثَ كان قَبْلَ تَحْرِيْمِ الكلامِ في الصَّلَاةِ.

وأما الشافعيُّ فَرَأَى هذا حديثًا صحيحاً، فقال به، وقال: هذا أَصَحُّ مِنَ الحديثِ الذي رُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم في الصَّائِمِ إِذَا أَكَلَ نَاسِيًا، فَإِنَّهُ لاَ يَقْضِيْ، وإِنَّمَا هُوَ رِزْقٌ رَزَقَهُ اللهُ؛ قال الشافعيُّ: وَفَرَّقُوْا هٰؤُلَاءِ بَيْنَ العَمْدِ والنِّسيانِ في أَكْلِ الصَّائِمِ لِحَدِيْثِ أبي هريرةَ.

قال أحمدُ في حديثِ أبي هريرةَ: إِنْ تَكَلَّمَ الإمامُ في شيءٍ مِنْ صَلَاتِهِ وَهُوَ يَرَى أَنَّهُ قَدْ أَكْمَلَهَا، ثُمَّ عَلِمَ أَنَّهُ لَمْ يُكْمِلْهَا، يُتِمُّ صلاتَه، ومَنْ تكَلَّمَ خَلْفَ الإمامِ، وهو يَعْلَمُ أَنَّ عليه بَقِيَّةً مِنَ الصَّلَاةِ فَعَلَيْهِ أَنْ يَسْتَقْبِلَهَا، واحتَجَّ بِأَنَّ الفَرَائِضَ كانَتْ تُزَادُ وتُنْقَصُ على عَهْدِ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم، فَإِنَّمَا تَكَلَّمَ ذُو اليَدَيْنِ وَهُوَ عَلَى يَقِيْنٍ مِنْ صَلَاتِهِ أَنَّهَا تَمَّتْ، ولَيْسَ هٰكَذَا اليومَ، لَيْسَ لِأَحَدٍ أَنْ يَتَكَلَّمَ عَلَى مَعْنَى مَا تَكَلَّمَ ذُوْ اليَدَيْنِ، لِأَنَّ الفَرَائِضَ اليومَ لايُزَادُ فِيها وَلَا يُنْقَصُ؛ قال أحمدُ: نحواً مِنَ هٰذَا الكلامِ، وقال إسحاقُ نحوَ قولِ أحمدَ في هذا الباب.

ترجمہ: علماء کا اس حدیث کی شرح میں اختلاف ہے بعض اہل کوفہ کہتے ہیں: جب نماز میں کلام کرے خواہ وہ بھول کر ہو یا جان بوجھ کر یا مسئلہ نہ جاننے کی وجہ سے یا کوئی بھی صورت ہو تو وہ نماز کو لوٹائے۔ اور انھوں نے عذر پیش کیا کہ یہ حدیث کلام فی الصلاۃ کی حرمت سے پہلے کی ہے۔ رہے امام شافعی تو انھوں نے اس حدیث کو صحیح سمجھا ہے اور وہ اس کے قائل ہیں (قیاس) اور فرمایا کہ یہ حدیث اس حدیث سے اصح ہے جو روزہ کے مسئلہ میں آنحضرت ﷺ سے مروی ہے کہ جب روزہ دار بھول کر کھائے تو قضا نہیں کرے گا، کیونکہ یہ رزق اللہ نے کھلایا ہے (اعتراض مقدر کا جواب) امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علماء نے روزہ میں کھانے میں عمد و نسیان کے درمیان فرق کیا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی وجہ سے (یعنی اس میں نسیان کی قید ہے اس لئے بھول سے کھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، عمد کی صورت میں ٹوٹ جائے گا اور کلام فی الصلاۃ کی حدیث میں یہ قید نہیں ہے اس لئے دونوں صورتوں میں نماز باطل نہیں ہوگی)

اور امام احمد رحمہ اللہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث (جو باب میں ہے) کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر امام کسی نماز

میں کلام کرے اور اس کا گمان یہ ہو کہ اس نے نماز مکمل کر لی ہے پھر اس نے جانا کہ نماز مکمل نہیں ہوئی تو وہ اپنی نماز پوری کرے (یعنی اعادہ کی ضرورت نہیں) اور مقتدیوں میں سے جس نے کلام کیا درانحالیکہ وہ جانتا تھا کہ ابھی نماز باقی ہے تو اس پر از سر نو نماز پڑھنا واجب ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ نے حدیث سے اس طرح استدلال کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں فرائض میں کمی زیادتی ہوتی تھی۔ پس ذوالیدین نے اس یقین سے کلام کیا ہے کہ نماز مکمل ہوگئی ہے (لفظ یقین مناسب تعبیر نہیں ورنہ سوال ہوگا کہ پھر وہ حضور ﷺ کے پیچھے کمرے میں کیوں گئے؟) لیکن آج کسی کے لئے اس انداز پر کلام کرنا ممکن نہیں جس انداز پر ذوالیدین نے کیا تھا (یعنی امام کو تو آج بھی بھول ہوسکتی ہے کہ اس نے نماز مکمل کر لی ہے اس لئے اس کا کلام تو مفسد نہ ہوگا مگر مقتدیوں کو بھول ہونے کا کوئی سوال نہیں، انہیں تو یقین ہوگا کہ نماز مکمل نہیں ہوئی) کیونکہ اب فرائض میں کمی زیادتی نہیں ہوسکتی۔ پس مقتدی کی نماز فاسد ہوجائے گی۔ اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ میں نے امام احمد کے قول کو ان کے الفاظ میں نقل نہیں کیا بلکہ بالمعنی لکھا ہے۔ اور امام اسحاق اس مسئلہ میں امام احمد کے ہم زبان ہیں۔

بابُ ماجاءَ فی الصَّلاۃِ فِی النِّعالِ

چپل پہن کر نماز پڑھنے کا بیان

جوتے چپل اور موزے پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے کیونکہ نماز میں پاؤں کھلے رکھنا ضروری نہیں۔ البتہ یہ شرط ہے کہ جوتے چپل پاک ہوں اور سجدہ میں پاؤں کی انگلیاں زمین سے لگیں خواہ بالواسطہ لگیں یا بلاواسطہ۔ بوٹ آگے سے پتلے ہوتے ہیں اور ان کی نوک اور پاؤں کی انگلیوں کے درمیان خلا رہتا ہے اس لئے ان کو پہن کر نماز پڑھنا صحیح نہیں۔ کیونکہ ان میں سجدہ میں پاؤں کی انگلیاں بالواسطہ بھی زمین سے نہیں لگتیں اس لئے نماز صحیح نہیں ہوگی۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ آنحضور ﷺ سے چپلوں میں نماز پڑھنا ثابت ہے اور صحابہ بھی چپلوں میں نماز پڑھتے تھے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے کہ باجماعت نماز ہورہی تھی آنحضور ﷺ نے درمیان نماز میں اپنے چپل اتار دیئے پس صحابہ نے بھی اتار دیئے، نماز کے بعد آپ نے پوچھا: آپ حضرات نے چپل کیوں اتارے؟ سب نے عرض کیا: آپ کی اتباع میں۔ آپ نے فرمایا: میں نے اس لئے اتارے تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ان میں گندگی ہونے کی بات بتلائی تھی (مشکوۃ حدیث ۷۶۶) مگر کسی حدیث میں اشارہ تک نہیں کہ آنحضرت ﷺ یا صحابہ مسجد نبوی میں یا دیگر مساجد میں چپل پہن کر نماز پڑھتے تھے، روایتیں اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔ ممکن ہے آنحضور ﷺ نے اور صحابہ نے اسفار میں اور میدانِ جنگ میں نمازیں چپلوں میں پڑھی ہوں وہاں چپلوں کو نکالنے کا موقع نہیں ہوتا اس لئے وہ حضرات چپلوں سمیت نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم

[۱۷۹] باب ماجاء في الصّلاةِ في النِّعالِ

[۴۱۰-] حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نا إسماعيلُ بنُ إبراهيمَ، عن سَعيدِ بنِ يَزِيْدَ أبي مَسْلَمَةَ، قال: قلتُ لِأَنَسِ بنِ مَالِكٍ: أَكَانَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّي فِي نَعْلَيْهِ؟ قال: نَعَمْ.

وفي الباب: عن عبدِ اللهِ بنِ مَسعودٍ، وعبدِ اللهِ بنِ أبي حَبِيْبَةَ، وعبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، وعَمْرِو بنِ حُرَيْثٍ، وشَدَّادِ بنِ أَوْسٍ، وَأَوْسٍ الثَّقَفِيِّ، وأبي هريرةَ، وعطاءٍ رَجُلٍ مِن بَنِي شَيْبَةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ أنسٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ والعَمَلُ على هذا عندَ أهلِ العلمِ.

بابُ ماجاءَ في القُنُوْتِ فِيْ صلاَةِ الْفَجْرِ

فجر کی نماز میں دعائے قنوت کا بیان

لفظ قنوت کے معنی ہیں دعا۔ اور قنوت تین ہیں۔ ایک: وہ جو وتر میں پڑھا جاتا ہے اس کا بیان ابواب الوتر میں آئے گا۔ دوسرا: قنوت نازلہ ہے یعنی وہ قنوت جو دشمن کی طرف سے آنے والی کسی اُفتاد کے وقت میں پڑھا جاتا ہے اس کا بیان آگے نہیں آئے گا۔ یہ قنوت اجماعی ہے۔ جب مسلمانوں کو دشمن کی طرف سے کسی آفت کا سامنا ہو تو انہیں قنوتِ نازلہ پڑھنا چاہئے۔ پھر امام اعظم رحمہ اللہ کا مشہور قول یہ ہے کہ یہ قنوت صرف نماز فجر کی دوسری رکعت کے قومہ میں پڑھا جائے اور دوسرا قول یہ ہے کہ تمام جہری نمازوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک پانچوں نمازوں میں قنوتِ نازلہ پڑھ سکتے ہیں۔ اور تیسرا قنوت ہے: قنوتِ راتبہ۔ یعنی ہمیشہ پڑھا جانے والا قنوت۔ اس کے صرف امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ قائل ہیں، پھر امام مالک رحمہ اللہ اس کو مستحب گردانتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ سنت۔ باقی دو امام اس قنوت کو تسلیم نہیں کرتے اور یہ قنوت صرف فجر کی نماز میں دوسری رکعت کے قومہ میں پڑھتے ہیں۔

حدیث: براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز فجر اور مغرب میں قنوت پڑھا کرتے تھے ـــــــ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس حدیث میں قنوتِ راتبہ مراد لیا ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ قنوتِ نازلہ ہے قنوتِ راتبہ نہیں ہے۔ کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ بھی مغرب میں قنوتِ راتبہ کے قائل نہیں۔ اور چونکہ اکثر احادیث میں آنحضرت ﷺ کا صرف نماز فجر میں قنوت نازلہ پڑھنا مروی ہے اس لئے امام اعظم رحمہ اللہ کا مشہور قول یہی ہے اور اس حدیث میں مغرب میں بھی قنوت نازلہ پڑھنا مروی ہے اس لئے ان کا دوسرا قول تمام جہری نمازوں میں قنوتِ نازلہ پڑھنے کا ہے۔

مسئلہ: حنفی امام کے پیچھے بھی شافعی مقتدی کو قنوتِ راتبہ پڑھنا چاہئے اور چاہئے کہ وہ چھوٹا سا قنوت پڑھے پھر

امام کے ساتھ اگلے رکن میں شامل ہو جائے مثلاً دوسری رکعت کے قومہ میں رب اغفرلی ہی کہہ لے۔ اور شافعی امام کے پیچھے حنفی مقتدی کو خاموش کھڑا رہنا چاہئے۔

[۱۸۰] باب ماجاء في القُنُوْتِ في صلاةِ الفجر

[۴۱۱-] حدثنا قُتَيْبَةُ، ومحمدُ بنُ المُثَنَّى، قالا: نا محمدُ بنُ جَعْفَرٍ، عن شعبةَ، عن عَمْرِو بنِ مُرَّةَ، عن ابنِ أبي لَيْلَى، عن البَرَاءِ بنِ عَازِبٍ: أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كانَ يَقْنُتُ في صَلاَةِ الصُّبحِ والمَغرِبِ.

وفي الباب: عن عليٍّ، وأنسٍ، وأبي هُريرةَ، وابنِ عباسٍ، وخُفافِ بنِ أَيْمَاءَ بنِ رَحَضَةَ الغِفَارِيِّ.

قال أبو عيسى: حديثُ البراءِ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

واختَلَفَ أهلُ العلمِ في القُنُوْتِ في صَلاَةِ الفَجْرِ: فَرَأَى بعضُ أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغيرِهم القُنوتَ في صلاةِ الفجرِ؛ وهُوَ قولُ الشافعيِّ؛ وقالَ أحمدُ وإسحاقُ: لايَقْنُتُ في الفَجْرِ إلا عِندَ نَازِلَةٍ تَنزِلُ بِالْمُسْلِمِيْنَ، فإذا نَزَلَتْ نازلةٌ فَلِلإمَامِ أنْ يَدْعُوَ لِجُيُوْشِ الْمُسْلِمِيْنَ.

نوٹ: سند میں ابن ابی لیلیٰ سے کبیر مراد ہیں۔

بابٌ في تَرْكِ القُنُوْتِ

فجر میں دعائے قنوت نہ پڑھنے کا بیان

یہ باب مانعین قنوت کے لئے ہے۔ ابو مالک اشجعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے اپنے والد سے پوچھا: آپ نے مدینہ منورہ میں خلفاء ثلاثہ کی اقتداء میں اور کوفہ میں تقریباً پانچ سال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نمازیں پڑھی ہیں، کیا یہ حضرات فجر میں قنوت پڑھتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: پیارے بیٹے! یہ نئی چیز ہے۔

فائدہ: نماز کی موجودہ شکل مختلف مراحل سے گذری ہے۔ آنحضور ﷺ نے ابتدائی ایام میں فجر میں قنوت پڑھا ہے مگر بعد میں ترک کر دیا تھا۔ اور صغار صحابہ نے جب دیکھا کہ مرور زمانہ سے لوگ آنحضرت ﷺ کے اس عمل کو بھول گئے ہیں تو انھوں نے کبھی کبھی اس پر عمل شروع کیا تاکہ لوگ اس عمل کو بھی محفوظ کریں، مگر چونکہ ہر نئی چیز لذیذ ہوتی ہے اس لئے بعض لوگوں نے اس سے دلچسپی لینی شروع کر دی اور وہ یہ عمل دوام کے ساتھ کرنے لگے۔ ابو مالک اشجعی رحمہ اللہ کے علاقہ میں بھی بعض لوگ فجر میں دوام کے ساتھ قنوت پڑھنے لگے تھے، چنانچہ آپ نے اپنے والد سے استصواب کیا انھوں نے اس کو بدعت قرار دیا۔

[۱۸۱] بابٌ في ترك القنوت

[۴۱۲-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا يَزِيدُ بنُ هَارُوْنَ، عن أبى مالكٍ الأَشْجَعِيِّ، قال: قلتُ لِأَبِي: يا أَبَتِ! إِنَّكَ قد صَلَّيْتَ خَلْفَ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم وأَبِيْ بكرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ وعليِّ بنِ أبى طالبٍ هٰهُنَا بالكُوْفَةِ نحواً مِنْ خَمْسِ سِنِيْنَ، أَكَانُوْا يَقْنُتُوْنَ؟ قال: أَيْ بُنَيَّ مُحْدَثٌ.

حدثنا صالحُ بنُ عبدِ الله، نا أبو عَوَانَةَ، عن أبى مالكٍ الأَشْجَعِيِّ بِهٰذا الإسنادِ نحوَهُ بمعناه.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ والعملُ عليهِ عندَ أكثرِ أهلِ العلمِ؛ وقال سفيانُ الثوريُّ: إِنْ قَنَتَ في الفَجْرِ فَحَسَنٌ، وإِنْ لَمْ يَقْنُتْ فَحَسَنٌ، واختارَ أَنْ لاَ يَقْنُتَ، ولَمْ يَرَ ابنُ المبَارَكِ القُنُوْتَ فِيْ الفَجْرِ.

قال أبو عيسى: وأبو مالكٍ الأَشْجَعِيُّ: اسْمُهُ سَعْدُ بنُ طَارِقِ بنِ أَشْيَمَ.

ترجمہ: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث پر اکثر اہل علم کا عمل ہے اور سفیان ثوری فرماتے ہیں: اگر فجر میں قنوت پڑھے تو بھی ٹھیک ہے اور اگر نہ پڑھے تو بھی ٹھیک ہے اور خود انھوں نے یہ بات پسند کی کہ قنوت نہ پڑھا جائے اور حضرت عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ فجر کی نماز میں قنوت کے قائل نہیں تھے۔

بابُ ماجاء في الرَّجُلِ يَعْطِسُ في الصَّلاَةِ

نماز میں چھینک آنے کا بیان

نماز کے اندر اگر چھینک آئے تو نہ تحمید کرنی چاہئے اور نہ کسی دوسرے چھینکنے والے کی تشمیت کرنی چاہئے۔ اور اگر کسی نے چھینکنے کے بعد غیر اختیاری طور پر تحمید کرلی تو کوئی مضائقہ نہیں، البتہ تشمیت سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ کیونکہ یرحمک اللہ میں کاف خطاب کی ضمیر ہے پس کلام متحقق ہو گیا اس لئے نماز فاسد ہو جائے گی۔

حدیث: حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور انھیں چھینک آئی تو انھوں نے اس طرح تحمید کی: الحمد لله حمداً كثيراً طَيِّبًا مُبَارَكاً فيه مباركاً عليه كما يُحِبُّ رَبُّنَا وَيَرْضٰى (مصری نسخہ میں دونوں جگہ مبارکا علیہ نہیں ہے۔ اور اس جملہ کو موجود مان لیا جائے تو یہ مبارکا فیہ کی تاکید ہے) نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: نماز میں کون بولا؟ آپؐ نے یہی سوال تین مرتبہ کیا۔ حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں بولا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: کیا بولے تھے؟ انھوں نے تحمید کے وہ کلمات دوہرائے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! واقعہ یہ ہے کہ

میں نے تیس سے زائد فرشتوں کو دیکھا جو ان کلمات کی طرف جھپٹے، ہر فرشتہ چاہتا تھا کہ وہ ان کلمات کو لے کر بارگاہِ رب العالمین میں پہنچے ـــــــ یعنی نبی ﷺ نے اس کو شاندار ذکر قرار دیا۔ پس تحمید کے موقع پر یہ ذکر کرنا چاہئے۔

تشریح: بیشک مذکورہ تحمید شاندار ذکر ہے مگر اس کے باوجود چھینکنے کے بعد یہ یا کوئی اور ذکر نماز کے اندر نہیں کرنا چاہئے کیونکہ نبی پاک ﷺ نے تحمید کرنے والے کو تین مرتبہ ڈانٹا ہے۔ اور اس کو کلام فی الصلاۃ قرار دیا ہے۔ جو لوگ عربی زبان کی باریکیوں سے واقف ہیں وہ من المتکلم فی الصلاۃ؟ کے وزن کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ کتنی سخت ڈانٹ ہے، چنانچہ حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ سہم گئے تھے جواب دینے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ پھر آپ نے ان کی تسلی کی خاطر اس کو شاندار ذکر قرار دیا۔ غرض آنحضور ﷺ نے تحمید کرنے کو بھی نماز کے اندر بولنا قرار دیا ہے اس وجہ سے تمام علماء متفق ہیں کہ نماز کے اندر نہ تحمید کی گنجائش ہے نہ تشمیت کی۔

[۱۸۲] باب ماجاء في الرجل يَعْطِسُ في الصلاة

[٤١٣-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا رِفَاعَةُ بنُ يَحيى بنِ عبدِ اللّهِ بنِ رِفَاعَةَ بنِ رَافِعٍ الزُّرَقِيُّ، عن عَمِّ أبيهِ مُعاذِ بنِ رِفاعةَ، عن أبيهِ، قال صَلَّيْتُ خَلْفَ رَسولِ الله صلى الله عليه وسلم فَعَطَسْتُ، فَقُلْتُ: الحمدُ لله حَمْداً كَثِيراً طَيِّبًا مُبارَكاً فيه مُبارَكاً عليه كما يُحِبُّ رَبُّنَا ويَرْضَى، فَلَمَّا صَلَّى رسولُ الله صلى الله عليه وسلم انصَرَفَ فقال: " مَنِ الْمُتَكَلِّمُ في الصلاةِ؟" فَلَمْ يَتَكَلَّمْ أَحَدٌ، ثُمَّ قَالَهَا الثَّانِيَةَ: " مَنِ الْمُتَكَلِّمُ فِيْ الصَّلَاةِ؟" فَلَمْ يتكلمْ احدٌ، ثم قالَها الثَّالِثَةَ: " مَنِ الْمُتَكَلِّمُ في الصَّلاةِ؟" فقال رِفَاعَةُ بنُ رَافِعِ بنِ عَفْرَاءَ: أَنَا يارسولَ الله! قال: كَيْفَ قُلْتَ؟ قال: قُلتُ: الحَمْدُ لله حَمْدًا كثيراً طَيِّبًا مُبارَكاً فيه مبارَكاً عليه كما يُحِبُّ ربُّنا ويَرْضَى، فقال النبيُّ صلى الله عليه وسلم: " وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَقَدِ ابْتَدَرَهَا بِضْعَةٌ وَّثَلَاثُوْنَ مَلَكاً أَيُّهُمْ يَصْعَدُ بِهَا"

وفي الباب: عن أنسٍ، ووائِلِ بنِ حُجْرٍ، وعامِرِ بنِ رَبِيْعَةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ رِفَاعَةَ حديثٌ حسنٌ، وكَأَنَّ هٰذا الحديثَ عند بعضِ أهلِ العلمِ: أَنَّهُ في التَّطَوُّعِ، لِأَنَّ غيرَ واحِدٍ من التابعينَ قالوا: إِذَا عَطَسَ الرجلُ في الصلاةِ الْمَكْتُوْبَةِ: إِنَّمَا يَحْمَدُ اللّهَ فِيْ نَفْسِهِ، ولم يُوَسِّعُوْا بِأَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ.

وضاحت: امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو نفل نماز پر محمول کیا ہے (مگر یہ صحیح نہیں، کیونکہ دوسری کتب میں صراحت ہے کہ یہ مغرب کی نماز کا واقعہ ہے) اور انھوں نے فرمایا ہے کہ نوافل میں تحمید کی گنجائش ہے مگر فرائض میں تحمید نہیں کرنی چاہئے۔ ہاں دل دل میں تحمید کرسکتا ہے ـــــــ جاننا چاہئے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہاں اقرار

کرلیا ہے کہ فی نفسہ کے معنی دل میں پڑھنے کے ہیں جبکہ فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں اقرأبها فی نفسك میں انہیں اصرار تھا کہ اس کے معنی سراً فاتحہ پڑھنے کے ہیں۔ اور صحیح بات وہی ہے جو یہاں ہے یعنی فی نفسہ کے معنی: دل ودماغ میں تحمید کرنے اور پڑھنے کے ہیں۔

بابٌ فی نَسْخِ الْکَلَامِ فی الصَّلَاۃِ

نماز میں کلام کا جواز منسوخ ہے

حدیث: حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم دورانِ نماز آنحضور ﷺ کے پیچھے باہم گفتگو کیا کرتے تھے۔ مصلی اپنے دائیں بائیں موجود شخص سے نماز کے اندر ضروری بات کرلیا کرتا تھا (بخاری شریف میں فی حاجته بھی ہے) یہاں تک کہ آیت ﴿قُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ﴾ نازل ہوئی۔ پس ہمیں خاموش رہنے کا حکم دیا گیا اور بات کرنے سے روک دیا گیا —— یہ مسئلہ پہلے تفصیل سے گذر چکا ہے۔

[۱۸۳] بابٌ فی نَسْخِ الکلامِ فی الصَّلَاۃِ

[٤١٤-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا هُشَيْمٌ، نا إسماعيلُ بنُ أبى خَالِدٍ، عن الحارثِ بنِ شُبَيْلٍ، عن أبى عَمْرٍو الشَّيْبَانِىِّ، عن زَيْدِ بنِ أَرْقَمَ، قال: كُنَّا نَتَكَلَّمُ خَلْفَ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم فِىْ الصَّلَاةِ، يُكَلِّمُ الرجلُ مِنَّا صَاحِبَه إلى جَنْبِهِ، حَتّٰى نَزَلَتْ ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ﴾ فَأُمِرْنَا بِالسُّكُوْتِ ونُهِينَا عن الْكَلَامِ.

وفى الباب: عن ابنِ مسعودٍ، ومعاويةَ بنِ الحَكَمِ. قال أبو عيسى: حديثُ زيدِ بنِ أَرْقَمَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

والعملُ عليه عندَ أكثرِ أهلِ العلمِ، قالوا: إِذَا تَكَلَّمَ الرَّجُلُ عَامِدًا فِى الصَّلَاةِ أَوْ نَاسِيًا أَعَادَ الصَّلَاةَ، وهو قولُ الثوريِّ وابنِ المباركِ.

وقال بعضُهم: إذا تَكَلَّمَ عَامِدًا فى الصَّلَاةِ أَعَادَ الصَّلَاةَ، وإِنْ كَانَ نَاسِيًا أَوْ جَاهِلًا أَجْزَأَهُ؛ وبه يقولُ الشافِعِىُّ.

ترجمہ: اس حدیث پر اکثر اہل علم کا عمل ہے۔ وہ کہتے ہیں: جب آدمی نماز میں بات چیت کرے، خواہ بالقصد یا بھول کر تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔ یہ ثوری اور ابن المبارک کا قول ہے (یہی احناف کا مذہب ہے) اور بعض نے کہا: جب نماز میں بالقصد بات کرے تو نماز کا اعادہ کرے اور اگر (نماز کو) بھول کر یا مسئلہ نہ جاننے کی وجہ سے بولا ہے تو

نماز ہوگئی اور اسی کے شافعیؒ قائل ہیں (معلوم ہوا کہ پہلے باب میں جو سوال مقدر کا جواب دیا ہے وہ امام شافعی رحمہ اللہ کی کسی روایت پر مبنی ہے) اور آیت: ﴿وَقُوْمُوْا﴾ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۸ ہے۔

بابُ ماجاءَ فی الصَّلاۃِ عند التَّوْبَۃِ

صلاۃ التوبہ کا بیان

سورۂ آل عمران کی آیت ۱۳۵ ہے: ''اور نیکو کار وہ لوگ ہیں کہ جب وہ کوئی ایسا کام کر گذرتے ہیں جو بے شرمی کا ہے یا وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں یعنی کوئی بھی گناہ کا کام کرتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، پس وہ اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں'' اس آیت سے آنحضرت ﷺ نے صلاۃ التوبہ مشروع فرمائی ہے کیونکہ اللہ کو یاد کرنے کی بہت سی شکلیں ہوسکتی ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ نماز ہے۔ نماز کا مقصد اور اس کا سب سے بڑا فائدہ اللہ کا ذکر ہے۔ لہٰذا جب بندہ کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوجائے تو اُسے چاہئے کہ اچھی طرح پاکی حاصل کرے پھر کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ جتنی چاہے پڑھے اور اللہ کو راضی کرے پھر عاجزی اور انکساری کے ساتھ خوب گڑگڑا کر توبہ کرے ان شاء اللہ اس کے گناہ پر قلم عفو پھیر دیا جائے گا ــــــ اور توبہ کی ماہیت تین چیزیں ہیں: گناہ پر پشیمان ہونا، اس گناہ سے باز آجانا اور دوبارہ وہ گناہ نہ کرنے کا عہد کرنا۔ جب یہ تینوں شرطیں جمع ہونگی تو توبہ متحقق ہوگی ورنہ صرف زبانی جمع خرچ ہوگا۔

[۱۸۴] بابُ ماجاءَ فی الصَّلاۃِ عِنْدَ التَّوْبَۃِ

[۴۱۵-] حدثنا قُتیبۃُ، نا أبو عَوَانَۃَ، عن عُثمانَ بنِ المُغِیرۃِ، عن علیِّ بنِ رَبِیْعَۃَ، عن أَسْمَاءَ بنِ الحَکَمِ الفَزَارِیِّ، قال: سمعتُ علِیًّا یقولُ: إِنِّیْ کُنْتُ رَجُلاً إِذَا سَمِعْتُ مِنْ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حَدِیْثًا نَفَعَنِی اللّٰہُ مِنْہُ بِمَا شَاءَ أَنْ یَنْفَعَنِیْ بِہ، وإِذَا حَدَّثَنِیْ رَجُلٌ مِنْ أَصْحَابِہِ اسْتَحْلَفْتُہُ، فَإِذَا حَلَفَ لِی صَدَّقْتُہُ، وإِنَّہُ حَدَّثَنِیْ أبو بَکْرٍ، وصَدَقَ أبو بَکْرٍ، قال: سمعتُ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقولُ: "مَا مِنْ رَجُلٍ یُذْنِبُ ذَنْبًا ثم یَقُوْمُ فَیَتَطَهَّرُ، ثم یُصَلِّیْ ثم یَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ، إِلاَّ غَفَرَ اللّٰہُ لَہُ" ثُمَّ قَرَأَ هذہ الآیَۃَ: ﴿وَالَّذِیْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً أَوْ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ ذَکَرُوْا اللّٰہَ﴾ إلی آخِرِ الآیَۃِ.

وفی الباب: عن ابنِ مسعودٍ، وأبی الدَّرْدَاءِ، وأَنَسٍ، وأبی أُمَامَۃَ، ومُعَاذٍ، ووَاثِلَۃَ، وأبی الیَسَرِ، واسمُہُ: کعبُ بنُ عَمْرٍو.

قال أبو عیسی: حدیثُ علیٍّ حدیثٌ حسنٌ، لانَعْرِفُہُ إِلاَّ مِن هذا الوَجْہِ مِن حَدِیثِ عُثمانَ بنِ المُغِیرۃِ، ورَوَی عنہ شُعْبَۃُ وغیرُ واحِدٍ، فَرَفَعُوْہُ مِثْلَ حدیثِ أبی عَوَانَۃَ؛ ورَوَاہُ سُفیانُ الثوریُّ ومِسْعَرٌ: فَأَوْقَفَاہُ، وَلَمْ یَرْفَعَاہُ إِلی النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم، وَقد رُوِیَ عن مِسْعَرٍ هذا الحدیثُ مَرْفُوْعًا أَیْضًا.

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں ایک ایسا شخص تھا کہ جب میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث سنتا تو اللہ تعالیٰ مجھے اس سے فائدہ پہنچاتے وہ جو چاہتے کہ مجھے اس سے فائدہ پہنچائیں یعنی جس قدر ممکن ہوتا میں اس پر عمل کرتا۔ اور جب مجھ سے آپؐ کے صحابہ میں سے کوئی حدیث بیان کرتا تو میں اس سے قسم لیتا (کہ کیا آپ نے خود یہ حدیث آنحضرت ﷺ سے سنی ہے یا کسی اور سے سنی ہے؟) پس جب وہ میرے سامنے قسم کھاتا تو میں اس کو سچا قرار دیتا (اور اس کی حدیث پر عمل شروع کر دیتا) اور بے شک شان یہ ہے کہ مجھ سے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی اور ابوبکرؓ نے سچ کہا، فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جو بھی شخص کوئی گناہ کرے، پھر وہ اٹھے، پس پاکی حاصل کرے، پھر نماز پڑھے پھر اللہ سے گناہ کی معافی مانگے تو اللہ تعالیٰ اس کا گناہ معاف کر دیتے ہیں، پھر نبی ﷺ نے یہ آیت پڑھی ——— یہ ابوعوانہ کی حدیث ہے، وہ عثمان بن المغیرۃ سے اس کو روایت کرتے ہیں اور مرفوع کرتے ہیں۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: عثمان بن المغیرۃ کے علاوہ ہم کسی کی سند سے اس حدیث کو نہیں جانتے، البتہ ان سے ابوعوانہ کے علاوہ شعبہ وغیرہ بھی روایت کرتے ہیں اور وہ بھی ابوعوانہ کی طرح حدیث کو مرفوع کرتے ہیں۔ اور سفیان ثوری اور مسعر رحمہما اللہ نے بھی (عثمان سے) یہ حدیث روایت کی ہے مگر انھوں نے اس کو موقوف بیان کیا ہے (یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول قرار دیا ہے) البتہ مسعر سے ایک روایت مرفوع بھی آئی ہے۔

وضاحت: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ احتیاط دورِ نبوی سے تھی یا آپؐ کے بعد تھی؟ اس سلسلہ میں کوئی صراحت نہیں ممکن ہے آپؐ کی حیات سے ہو، کیونکہ سورۃ الفرقان (آیت ۷۳) میں رحمان کے خاص بندوں کا حال یہ بیان کیا گیا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا﴾ یعنی رحمان کے خاص بندوں کا ایک وصف یہ ہے کہ جب ان کو اللہ کے احکام کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر اندھے بہرے ہو کر نہیں گرتے۔ اس آیت سے ثابت ہوا کہ دین کی ہر بات بے تحقیق نہیں مان لینی چاہئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی لئے حدیث کے سلسلہ میں احتیاط برتتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جب یہ احتیاط دورِ نبوی میں تھی تو بعد میں بھی بدرجۂ اولیٰ رہی ہوگی۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے آپ نے قسم نہیں لی کیونکہ ان کی صداقت کا یقین تھا۔ وہ صدیق تھے اگر ان سے بھی قسم لی جاتی تو ماوشما کا فرق اٹھ جاتا۔ نیز وہ امیر المؤمنین تھے اور انبیاء کے بعد مخلوقِ خدا میں سب سے برتر تھے، پس ان سے قسم لینا ان کے علوشان کے خلاف تھا۔ علاوہ ازیں یہ صرف ایک احتیاطی تدبیر تھی کوئی شریعت کا لازمی حکم نہیں تھا۔

بَابُ مَاجَاءَ مَتَى يُؤْمَرُ الصَّبِيُّ بِالصَّلَاةِ؟

بچے کو نماز کا حکم کس عمر میں دینا چاہئے؟

تمام ائمہ متفق ہیں کہ نابالغ بچہ پر خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی نماز فرض نہیں۔ اور حدیث شریف میں جو سات سال اور

دس سال کی عمر میں بچہ کو نماز کا حکم دینے کا حکم آیا ہے وہ تمرین اور عادت ڈالنے کے لئے ہے۔ اور دس سال کے بعد اگر بچہ نماز چھوڑے تو اس سے نماز کی قضا بھی کروانی چاہئے تاکہ قضا کرنے کی بھی عادت پڑے۔ البتہ امام احمد رحمہ اللہ کی ایک روایت یہ ہے کہ دس سال کے بعد بچہ پر نماز فرض ہو جاتی ہے خواہ وہ بالغ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو ـــــ اور بلوغ: علامت سے بھی ہوتا ہے اور عمر سے بھی۔ لڑکی میں علامتیں: حاملہ ہونا یا حیض آنا ہے اور لڑکے میں علامتیں: حاملہ کرنا اور احتلام ہونا ہے۔ اگر یہ علامات نہ پائی جائیں تو پھر امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک قمری حساب سے سترہ سال اور صاحبین اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک پندرہ سال پر بچہ بالغ ہو جاتا ہے، خواہ علاماتِ بلوغ ظاہر ہوں یا نہ ہوں۔ اور فتوی صاحبین کے قول پر ہے۔ اور علماء نے یہ بات بھی کہی ہے کہ لڑکی نو سال سے پہلے اور لڑکا بارہ سال سے پہلے بالغ نہیں ہو سکتا، اس کے بعد کسی بھی وقت بالغ ہو سکتے ہیں۔ غرض تمام ائمہ متفق ہیں کہ عباداتِ بدنیہ جیسے نماز، روزہ اور عباداتِ مرکبہ جیسے حج نابالغ پر فرض نہیں۔ اور عباداتِ مالیہ مثلاً زکوۃ میں اختلاف ہے، امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک نابالغ پر وہ بھی فرض نہیں۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نابالغ پر اگر وہ صاحبِ نصاب ہے تو اس کے مال میں سے زکوۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ تفصیل کتاب الزکاۃ میں آئے گی۔

[۱۸۵] بابُ ماجاء مَتٰی یُؤْمَرُ الصبیُّ بالصلاۃ؟

[۴۱۶-] حدثنا علیُّ بنُ حُجْرٍ، نا حرملۃُ بنُ عبدِ العزیزِ بنِ الرَّبیعِ بن سَبْرَۃَ الجُھَنِیُّ، عن عَمِّہِ عبدِ الملکِ بنِ الرَّبِیْعِ بنِ سَبْرَۃَ، عن أبیہ، عن جَدِّہِ، قال: قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "عَلِّمُوْا الصَّبِیَّ الصَّلَاۃَ ابنَ سَبْعِ سِنِیْنَ، واضرِبُوْہُ عَلَیْھَا ابنَ عَشْرَۃٍ"

وفی البابِ: عن عبدِ اللہِ بنِ عَمْرٍو. قال أبو عیسی: حدیثُ سَبْرَۃَ بنِ مَعْبَدٍ الجُھَنِیِّ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ؛ وعلیہ العملُ عندَ بعضِ أھلِ العلمِ؛ وبہ یقولُ أحمدُ وإسحاقُ: وقالا: ما تَرَکَ الغلامُ بعدَ عَشْرٍ من الصلاۃِ فإنہ یُعیدُ.

قال أبو عیسی: وسَبْرَۃُ ھو ابنُ مَعْبَدٍ الجُھَنِیُّ، ویقالُ ھو ابنُ عَوْسَجَۃَ.

ترجمہ: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: سات سال کے بچہ کو نماز سکھلاؤ اور دس سال کے بچہ کو نماز چھوڑنے پر سزا دو ـــــ الصبیَّ اور الصلاۃَ: علّموا کے دو مفعول ہیں۔ اور ابنَ سبع حال ہے۔ اسی طرح ابنَ عشرۃ بھی حال ہے۔ اور سکھلانا قولی بھی ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ بچہ کو نماز پڑھنے کا طریقہ اور اس میں جواذکار ہیں وہ یاد کرائے جائیں اور فعلی سکھلانا یہ ہے کہ اس سے نماز پڑھوائی جائے اور مسجد میں ساتھ لے جائے۔ اور علماء نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ نماز چھوڑنے پر بچہ کو ہاتھ سے سزا دی جائے لکڑی سے سزا نہ دی جائے۔

بَابُ مَاجَاءَ فِى الرَّجُلِ يُحْدِثُ بَعْدَ التَّشَهُّدِ

قعدۂ اخیرہ میں تشہد کے بعد حدث پیش آجائے تو کیا حکم ہے؟

جاننا چاہئے کہ اس باب میں جو حدیث ہے اس میں ایک افریقی راوی ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ اس سے بدظن ہیں اس لئے آپ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، مگر پہلے یہ بات آچکی ہے کہ اس راوی میں ضعف کی کوئی وجہ نہیں اس کی تضعیف غلط فہمی کی بنیاد پر کی گئی ہے۔چنانچہ امام بخاری، احمد بن صالح، ابوداؤد اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ وغیرہ نے اس کی توثیق کی ہے پس یہ حدیث قابل استدلال ہے۔

اور باب میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو قعدۂ اخیرہ میں بقدر تشہد بیٹھنے کے بعد یا تشہد پڑھ لینے کے بعد خود بخود حدث پیش آجائے تو کیا حکم ہے؟ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک اس کے لئے استیناف یعنی نماز از سرنو پڑھنا افضل ہے، اور بناء کرنا بھی جائز ہے اور دونوں میں سے کچھ نہ کرے تو بھی نماز صحیح ہوگئی، کیونکہ وہ نماز کا آخری فرض بھی ادا کر چکا ہے۔اس لئے کہ حنفیہ کے نزدیک نماز کا آخری فرض تشہد پڑھ لینا یا بقدر تشہد بیٹھ لینا ہے اور دلیل باب کی حدیث ہے۔آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب کسی شخص کو حدث پیش آئے درانحالیکہ وہ نماز کے آخر میں بیٹھ چکا ہے، سلام پھیرنے سے پہلے یعنی وہ تشہد پڑھ چکا ہو یا بقدر تشہد بیٹھ چکا ہو اور سلام نہ پھیرا ہو اور حدث پیش آجائے تو اس کی نماز ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ سلام ارکان صلاۃ میں سے نہیں بلکہ نماز کا آخری فرض قدر تشہد بیٹھنا ہے۔

اور دوسری دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو ابوداؤد (حدیث ۹۷۰) وغیرہ میں ہے۔آنحضور ﷺ نے فرمایا: إذا قلتَ هذا أو قضيتَ هذا فقد قضيتَ صلاتَك: جب تو نے تشہد پڑھ لیا یا تشہد کے بقدر بیٹھ چکا تو تیری نماز پوری ہوگئی۔دار قطنی، ابن حبان اور بیہقی نے اس ٹکڑے کو مُدرج فی الحدیث کہا ہے مگر یہ بات صحیح نہیں۔زہیر بن معاویہ سے متعدد ثقہ حضرات اس ٹکڑے کو مرفوع روایت کرتے ہیں (معارف السنن ۴: ۳۴)

غرض حنفیہ اور اسحاق بن راہویہ کے نزدیک نماز کا آخری فرض بقدر تشہد بیٹھنا ہے اس کے بعد حدث لاحق ہو تو نماز صحیح ہوجاتی ہے، اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک آخری فرض سلام ہے اور ان کا مستدل تَحْلِيْلُهَا التسليمُ ہے۔ تفصیل کتاب الطہارۃ کے شروع میں گذر چکی ہے۔پس قدر تشہد کے بعد بھی اگر مصلی کو حدث پیش آئے تو نماز فاسد ہوجائے گی، کیونکہ ابھی ایک فرض باقی ہے اور نماز از سرنو پڑھنی ہوگی کیونکہ ائمہ ثلاثہ بناء کا مسئلہ تسلیم نہیں کرتے۔

فائدہ: احناف کے نزدیک ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قدرِ تشہد کے بعد اگر مصلی جان بوجھ کر حدث کرے یعنی کوئی منافئ صلوٰۃ کام کرے تو نماز ہوجائے گی یعنی ذمہ فارغ ہوجائے گا، مگر چونکہ سلام واجب ہے اس لئے اس کو جان بوجھ کر ترک کرنے کی صورت میں کراہیت تحریمی کا ارتکاب لازم آئے گا۔اور نماز وقت کے اندر واجب

الاعادہ ہوگی اور وقت گذرنے کے بعد اس کا اعادہ مستحب ہوگا۔ اور اگر قدر تشہد کے بعد خود بخود نماز ختم ہوگئی جیسے فجر کی نماز میں سورج نکل آیا یا تیمم کرنے والے کو پانی مل گیا تو نماز صحیح ہوگئی اور کوئی کراہیت بھی نہیں ہوگی۔

[۱۸۶] بابُ ماجاء في الرجلِ يُحْدِثُ بعد التشهد

[۴۱۷-] حدثنا أحمدُ بنُ مُحمدٍ، نا ابنُ المباركِ، أنا عبدُ الرحمنِ بنُ زِيَادِ بنِ أَنْعُمٍ، أنَّ عَبدَ الرحمنِ بنَ رَافِعٍ، وبَكْرَ بنَ سَوَادَةَ أخْبَرَاهُ، عن عبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: " إِذَا أَحْدَثَ يَعْنِي الرجُلُ وَقَدْ جَلَسَ فِيْ آخِرِ صَلاَتِهِ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ فَقَدْ جَازَتْ صَلاَتُه"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ لَيْسَ إسنادُه بالقَوِيِّ، وقدِ اضطَرَبُوْا في إسنادِهِ.

وقد ذَهَبَ بعضُ أهلِ العلمِ إلى هذا، قالوا: إذا جَلَسَ مِقْدَارَ التَّشَهُّدِ، وَأَحْدَثَ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ فقد تَمَّتْ صَلاتُه.

وقال بعضُ أهلِ العلمِ: إِذَا أَحْدَثَ قَبْلَ ان يَتَشَهَّدَ أَوْ قَبْلَ أَنْ يُسَلِّمَ أَعَادَ الصلاةَ، وهوقولُ الشافعيِّ.

وقالَ أحمدُ: إِذَا لَمْ يَتَشَهَّدْ وَسَلَّمَ أَجْزَأَهُ لِقَوْلِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم:" وَتَحْلِيْلُهَا التَّسْلِيْمُ" وَالتَّشَهُّدُ أَهْوَنُ، قَامَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم في اثْنَتَيْنِ، فَمَضَى في صَلاتِهِ وَلَمْ يَتَشَهَّدْ.

وقالَ إسحاقُ بنُ إبراهيمَ: إِذَا تَشَهَّدَ وَلَمْ يُسَلِّمْ أَجْزَأَه وَاحْتَجَّ بحَدِيثِ ابنِ مَسعودٍ حِيْنَ عَلَّمَهُ النبيُّ صلى الله عليه وسلم التَّشَهُّدَ، فقال:" إذا فَرَغْتَ مِن هذا فقد قَضَيْتَ مَا عَلَيْكَ"

قال أبو عيسى: وعبدُ الرحمنِ بنُ زِيادٍ: هو الإفريقيُّ، وقد ضَعَّفَه بعضُ أهلِ الحديثِ، منهم يحيى بنُ سعيدٍ القطانُ، وأحمدُ بنُ حنبلٍ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب آدمی نے حدث کیا درانحالیکہ وہ اپنی نماز کے آخر میں بیٹھ چکا ہے، سلام پھیرنے سے پہلے تو بالتحقیق اس کی نماز ہوگئی'' یہ افریقی کی حدیث ہے اور اس کی سند قوی نہیں اور روات اس کی سند میں مختلف ہیں۔ اور بعض علماء اس حدیث کی طرف گئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب آدمی بقدر تشہد بیٹھ چکے اور سلام پھیرنے سے پہلے حدث پیش آجائے تو اس کی نماز ہوگئی (یہ احناف کا مذہب نہیں اس صورت میں ان کے یہاں استیناف یا بناء کا حکم ہے) اور بعض اہل علم کہتے ہیں: جب تشہد سے پہلے یا سلام سے پہلے حدث پیش آجائے تو نماز کا اعادہ ضروری ہے اور یہ شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اور امام احمد نے فرمایا: جب تشہد نہ پڑھا ہو اور سلام پھیر دے تو کافی ہے (یعنی آخری رکعت کے دوسرے سجدہ سے اٹھتے ہی معاً سلام پھیر دے تو کافی ہے) رسول اللہ ﷺ کے ارشاد: تحليلها التسليم کی وجہ سے۔ اور تشہد کا معاملہ ہلکا ہے (یعنی سلام پھیرنا تو فرض ہے مگر تشہد پڑھنا فرض نہیں)

کیونکہ رسول اللہ ﷺ دو رکعت پر کھڑے ہو گئے تھے اور نماز کو آگے جاری رکھا تھا اور تشہد نہیں پڑھا تھا (معلوم ہوا کہ تشہد فرض نہیں اور دوسرے تشہد کا حکم وہی ہے جو پہلے کا ہے۔ پس دونوں کا فرض نہ ہونا ثابت ہوا) اور حضرت اسحاق فرماتے ہیں: جب تشہد پڑھ لے اور سلام نہ پھیرے تو کافی ہے (یعنی تشہد فرض ہے سلام فرض نہیں) اور انھوں نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے جبکہ ان کو آنحضرت ﷺ نے تشہد سکھلایا تو فرمایا: جب تو اس سے فارغ ہو جائے تو جو تجھ پر فرض تھا تو نے اُسے ادا کر دیا۔ اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد اور یحییٰ قطان رحمہما اللہ نے افریقی کی تضعیف کی ہے۔

بابُ ماجاء إذا كانَ المَطَرُ فَالصَّلَاةُ فِي الرِّحَالِ

بارش ہو تو نماز ڈیروں میں پڑھے

تمام ائمہ کے نزدیک کچھ اعذار ہیں جن کی وجہ سے جماعت سے متخلف ہونا جائز ہے۔ اور بارش ان اعذار میں سے ایک عذر ہے۔ رہی یہ بات کہ کتنی بارش عذر ہے؟ یہ معاملہ رائے مبتلی بہ پر چھوڑ دیا گیا ہے، کیونکہ رات اور دن میں، اور مختلف زمانوں میں اور بجلی کے ہونے نہ ہونے کی وجہ سے اور سڑک کے پختہ اور خام ہونے کی وجہ سے، نیز صحت اور عمر کے اعتبار سے، لوگوں کے احوال مختلف ہوتے ہیں۔ پس اگر کسی کا خیال ہے کہ بارش میں اس کے لئے مسجد تک پہنچنا بہت مشکل ہے تو وہ گھر پر نماز پڑھ سکتا ہے۔ اور اگر مسجد جانے میں کوئی خاص دشواری نہ ہو تو پھر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنی ضروری ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ایک حدیث ہے إذا ابْتَلَّتِ النِّعالُ فَصَلُّوْا في الرِّحال (جب اتنی بارش ہو جائے کہ جوتا چپل اور پاؤں زمین پر رکھنے سے بھیگ جائیں تو گھر نماز پڑھو) یہ حدیث بے سروپا ہے۔ صاحب نہایہ (یہ غریب الحدیث کے موضوع پر کتاب ہے) نے نعل اور رحل کے مادوں میں یہ حدیث ذکر کی ہے، مگر یہ حدیث کتبِ احادیث میں نہیں پائی جاتی اس لئے یہ غیر معتبر ہے کیونکہ کسی حدیث کا کتب فقہ میں یا کتب تفسیر میں یا بزرگوں کے ملفوظات میں یا کسی اور جگہ پایا جانا حدیث کی صحت کے لئے کافی نہیں تا آنکہ وہ حدیث کی کسی کتاب میں ملے اور اس کے تمام روات ثقہ بھی ہوں۔

حدیث: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم لوگ ایک سفر میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے۔ بارش شروع ہوگئی تو آپؐ نے اعلان کروایا کہ جو اپنے ڈیرے میں نماز پڑھنا چاہے اس کے لئے اجازت ہے۔

تشریح: حضور اکرم ﷺ کا قافلہ جب کسی جگہ پڑاؤ کرتا تھا تو آپؐ کے خیمہ کے قریب کوئی جگہ ہموار کر کے نماز پڑھنے کے لئے تیار کرلی جاتی تھی۔ چونکہ بارش میں وہ جگہ بھیگ گئی تھی اور سب مسلمانوں کو یکجا باجماعت نماز

پڑھنے کے لئے کوئی جگہ میسر نہیں تھی اس لئے آنحضور ﷺ نے یہ اعلان کرایا کہ اپنے ڈیروں میں نماز پڑھ لو۔

[۱۸۷] بابُ ماجاء إذا كانَ الْمَطَرُ فالصلاةُ فی الرحال

[۴۱۸-] حدثنا أبو حَفصٍ عَمْرُو بنُ عليّ، نا أبو داودَ الطَّيَالِسِيُّ، نا زُهَيْرُ بنُ مُعاوية، عن أبی الزُّبَيْرِ، عن جابرٍ، قال كُنَّا مَعَ النبیِّ صلی الله عليه وسلم فی سَفَرٍ فَأَصَابَنَا مَطَرٌ، فقال النبیُّ صلی الله عليه وسلم: "مَنْ شَاءَ فَلْيُصَلِّ فِیْ رَحْلِهِ"

وفی الباب: عن ابنِ عُمَرَ، وسَمُرَةَ، وأبی الْمَلِيْحِ عن أبيهِ، وعبدِ الرحمنِ بنِ سَمُرَةَ. قال أبو عيسى: حديثُ جابرٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وقد رَخَّصَ أهلُ العلمِ فی القُعُوْدِ عن الجماعةِ والجُمُعَةِ فِی الْمَطَرِ والطِّيْنِ، وبه يقولُ أحمدُ وإسحاقُ.

قال: سمعتُ أبا زُرْعَةَ يقولُ: رَوَى عَفَّانُ بنُ مُسْلِمٍ عن عَمْرِو بنِ عَلِیٍّ حَدِيْثًا، وقال أبو زُرْعَةَ: لَمْ أَرَ بالبَصْرَةِ أَحْفَظَ مِنْ هٰؤُلَاءِ الثَّلَاثَةِ: علیِّ بنِ المدينیِّ، وابنِ الشاذكُونیِّ، وعَمْرِو بن علیٍّ.

وأبو المَلِيحِ بنُ أُسَامَةَ: اسْمُهُ عَامِرٌ، ويُقَالُ: زيدُ بنُ أسامَةَ بنِ عُمَيْرٍ الهُذَلِیُّ.

وضاحت: امام ترمذی رحمہ اللہ کے استاذ ابو حفص عمرو بن علی بڑے محدث ہیں اوران کی جلالت شان کے لئے یہ بات کافی ہے کہ ان کے اورامام احمد، امام بخاری اورامام مسلم رحمہم اللہ کے استاذ عفان بن مسلم رحمہ اللہ نے ان سے ایک حدیث روایت کی ہے جیسے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے تلمیذ حضرت امام ترمذی رحمہ اللہ سے ایک حدیث روایت کی ہے جو ترمذی جلد ثانی میں ہے۔ اورابوزرعہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بصرۃ میں حفاظ حدیث تین شخص تھے: ابن المدینی، ابن الشاذکونی اورابوحفص عمرو بن علی۔

بابُ ماجاءَ فی التَّسْبِيحِ فی أَدْبَارِ الصَّلَاةِ

نماز کے بعد کی تسبیحات کا بیان

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ تمام وہ احادیث جن میں دُبر الصلوات میں دعا کرنے کا ذکر ہے ان سب جگہوں میں قعدۂ اخیرہ مراد ہے کیونکہ دُبر: حیوان کا جز ہوتا ہے پس سب جگہ نماز کا آخری جز یعنی قعدۂ اخیرہ مراد لیا جائے گا اس طرح انھوں نے نمازوں کے بعد دعا کی نفی کی ہے۔ مگر ان کا یہ خیال صحیح نہیں، کیونکہ دبر اگرچہ حیوان کا جز ہوتا ہے مگر دبر الشیئ: شیئ کا ظرف ہوتا ہے جز نہیں ہوتا باب میں مذکور حدیث اس کی دلیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے

دبر الصلوات میں الباقیات الصالحات یعنی ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ، ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر اور دس مرتبہ لا إلٰہ إلا اللہ پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ ان کو پڑھنے والا اعمال میں آگے نکل جانے والوں کو پالیتا ہے اور پیچھے رہنے والے اس کو نہیں پاسکتے۔ ظاہر ہے یہ الباقیات الصالحات نماز کے بعد ہی پڑھے جاتے ہیں، قعدۂ اخیرہ میں نہیں پڑھے جاتے۔ خود ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ دبر الصلوات سے قعدۂ اخیرہ مراد نہیں بلکہ سلام کے بعد کا وقت مراد ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے کہ الباقیات الصالحات فرضوں کے بعد متصلاً پڑھنے چاہئیں۔ مگر میری ناقص رائے یہ ہے کہ دبر الصلوات میں فرضوں کے متعلقات بھی شامل ہیں پس سنن ونوافل سے فارغ ہوکر یہ باقیات پڑھنے چاہئیں۔ تاکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جو حدیث پہلے گذری ہے کہ: ”آنحضور ﷺ فرضوں کے بعد صرف اللّٰھم أنت السلام کے بقدر بیٹھتے تھے“ اس کے خلاف لازم نہ آئے۔

حدیث: فقرائے صحابہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! بیشک مالدار صحابہ اعمال میں ہم سے سبقت لے گئے، کیونکہ وہ ہماری طرح نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں اور ان کے پاس مال ہے جس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں اور وہ غلام آزاد کرتے ہیں اور ہم تہی دست ہیں یہ خیر کے کام ہمارے لئے ممکن نہیں، آنحضور ﷺ نے فرمایا: نمازوں کے بعد الباقیات الصالحات پڑھ لیا کرو۔ اس کی بدولت تم ان لوگوں کو جو آگے نکل گئے ہیں پالوگے اور جو پیچھے رہ گئے وہ تم کو نہیں پاسکیں گے۔

تشریح: یہ تسبیح عوام الناس میں تسبیح فاطمہ کے نام سے مشہور ہے۔ مگر حقیقت میں یہ تسبیح فقراء ہے۔ اور تسبیح فاطمہ دوسری ہے اور وہ ہے رات میں سونے سے پہلے میاں بیوی دونوں ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھیں اس عمل کی برکت سے عورت گھر کے کاموں سے تھکے گی نہیں آنحضرت ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بطور خاص یہ عمل بتلایا تھا (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۲۳۸۷)

[۱۸۸] بابُ ماجاء في التَّسبيحِ في أَدْبَارِ الصَّلوة

[۴۱۹-] حدثنا إسحاقُ بنُ إبراهيمَ بنِ حَبِيْبِ بنِ الشَّهِيْدِ، وعليُّ بنُ حُجْرٍ، قالا: حدثنا عَتَّابُ بنُ بَشِيْرٍ، عن خُصَيْفٍ، عن مُجاهِدٍ وعِكْرِمَةَ، عن ابنِ عباسٍ، قال: جاء الْفُقَرَاءُ إلى رسولِ الله صلى الله عليه وسلم فقالوا: يارسولَ الله إِنَّ الأَغْنِيَاءَ يُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّيْ، وَيَصُوْمُوْنَ كَمَانَصُوْمُ، وَلَهُمْ أَمْوَالٌ يُعْتِقُوْنَ وَيَتَصَدَّقُوْنَ، قال: "فَإِذَا صَلَّيْتُمْ فَقُولُوا: سُبْحَانَ اللهِ ثَلاَثًا وَثَلاَثِيْنَ مَرَّةً، والحمدُ لِلّٰهِ

ثَلاثًا وثَلاثِيْنَ مرةً، والله أكبرُ أربَعًا وثَلاثِيْنَ مرةً، ولا إلهَ إلا اللهُ عَشْرَ مَرَّاتٍ، فَإِنَّكُمْ تُدْرِكُوْنَ بِهِ مَنْ سَبَقَكُمْ، وَلاَ يَسْبِقُكُمْ مَنْ بَعْدَكُمْ"

وفي الباب: عن كَعْبِ بنِ عُجْرَةَ، وأنسٍ، وعبدِ الله بنِ عَمْرٍو، وزيدِ بنِ ثابتٍ، وأبي الدَّرْدَاءِ، وابنِ عُمَرَ، وأبي ذرٍّ. قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عباسٍ حديثٌ حسنٌ غريبٌ.

[٤٢٠-] وقد رُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أنَّهُ قال: " خَصْلَتَانِ لاَ يُحْصِيهِمَا رَجُلٌ مسلمٌ إلاَّ دَخَلَ الجنةَ: يُسَبِّحُ اللهَ في دُبُرِ كلِّ صلاةٍ ثلاثاً وثلاثين، ويَحْمَدُهُ ثلاثاً وثلاثين، ويُكَبِّرُهُ أربعًا وثلاثين، ويسبِّحُ اللهَ عند مَنَامِهِ عَشْرًا ويَحْمَدُهُ عشراً، ويُكَبِّرُهُ عَشْرًا"

وضاحت: آخری حدیث (نمبر۴۲۰) جو بلا سند بیان ہوئی ہے وہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی ہے اور ہمارے نسخوں میں عبارت آگے پیچھے ہوگئی ہے، مصری نسخہ میں صحیح عبارت ہے اور یہ حدیث جلد ثانی (ص ۱۷۷ ابواب الدعوات) میں ہے وہاں مصری نسخہ کے موافق عبارت ہے صحیح حدیث اس طرح ہے: "آنحضور ﷺ نے فرمایا: جو مسلمان دو باتوں کی حفاظت کرے وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا، ایک: نمازوں کے بعد دس دس مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کہنا۔ دوسری: سونے سے پہلے ۳۳، ۳۳ اور ۳۴ مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر کہنا"۔ اس لئے کہ الحَسَنَةُ بعشرة أمثالها کے ضابطہ سے ان کا ثواب ڈھائی ہزار نیکیاں ہو جائے گا اور کون مسلمان ہے جو دن بھر میں ڈھائی ہزار گناہ کرتا ہو (پس ان نیکیوں کے برائیوں کو بھسم کرنے کے بعد بھی ان میں سے کچھ نیکیاں بچ جائیں گی اور وہ قیامت کے دن دخولِ جنت کا موجب ہونگی) ـــــ اور جاننا چاہئے کہ فرضوں کے بعد کی تسبیح کے بارے میں اوپر دو عدد مروی ہیں۔ پس تسبیح وتحمید وتہلیل ۳۳، ۳۳ اور ۳۴ مرتبہ پڑھنے چاہئیں۔ اور وقت میں تنگی ہو تو دس دس مرتبہ پڑھ لے۔

بابُ ماجاء في الصَّلاةِ عَلى الدَّابَّةِ في الطِّيْنِ والمَطَرِ

کیچ اور بارش میں اونٹ پر فرض نماز کا جواز

پہلے یہ مسئلہ گذرا ہے کہ سفر میں اونٹ پر نفل نماز پڑھنا جائز ہے۔ اور حضر میں جائز نہیں۔ اور سفر سے کیا مراد ہے؟ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سفر شرعی مراد ہے اور احناف کے نزدیک سفر لغوی۔ چنانچہ عالمگیری میں ہے کہ جس شخص کا کھیت گاؤں سے باہر ہو اور وہ اونٹ پر سوار ہو کر اپنے کھیت کی طرف جا رہا ہو تو وہ گاؤں سے نکلنے کے بعد سواری پر نفل پڑھ سکتا ہے۔

اور تمام ائمہ متفق ہیں کہ بغیر عذر کے سواری پر فرض نماز پڑھنا جائز نہیں۔ البتہ معقول عذر ہو تو جائز ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک طالب (وہ شخص جو دشمن کے پیچھے جا رہا ہے) اور مطلوب (جس کے پیچھے دشمن آ رہا ہے) دونوں کے لئے سواری پر فرض پڑھنا جائز ہے۔ اور حنفیہ کے نزدیک مطلوب کے لئے تو جائز ہے کیونکہ اس کے

لئے عذر ہے اگر وہ نماز پڑھنے کے لئے رکے گا تو جان سے جائے گا۔ اور طالب کے حق میں عذر نہیں پس اس کے لئے جائز نہیں۔ تفصیل آپ حضرات بخاری میں پڑھیں گے۔ اسی طرح دلدل ہو اور زمین پر اتر کر نماز پڑھنے کی جگہ نہ ہو تو بھی سواری پر فرض پڑھنا جائز ہے، اسی طرح سیلاب آیا ہو یا کیچ ہو اور زمین پر سجدہ کرنا مشکل ہو اور آدمی کے پاس سواری بھی نہ ہو تو وہ کھڑے کھڑے اشارہ سے نماز پڑھے۔

حدیث: آنحضور ﷺ رفقاء کے ساتھ ایک سفر میں تھے قافلہ ایک تنگ نائے (تنگ راستہ، پہاڑوں کے درمیان کا دَرَہ) سے گذر رہا تھا کہ اچانک بارش شروع ہو گئی دونوں طرف سے پہاڑوں کا پانی اترنے لگا اور وادی میں سیلاب کی صورت بن گئی۔ اسی اثناء میں نماز کا وقت آ گیا۔ آنحضور ﷺ نے اذان واقامت کہی۔ اور اپنی سواری آگے کر دی۔ باقی لوگ پیچھے ہو گئے اور آپؐ نے باجماعت نماز پڑھائی اور رکوع وسجود کی جگہ اشارہ کیا اور آپ سجدہ کا اشارہ زیادہ جھکتا ہوا فرما رہے تھے ——— اس حدیث کی بناء پر امام نووی نے فرمایا کہ آنحضور ﷺ نے خود اذان دی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں، کیونکہ یہی حدیث مسند احمد میں ہے وہاں صراحت ہے کہ آپؐ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہنے کا حکم دیا تھا پس یہاں اسناد مجازی ہے۔

تشریح: اس حدیث کی سند میں ایک راوی ہے عمر بن الرّمّاح یہ متکلم فیہ راوی ہے۔ بیہقی، ابن العربی اور ابن القطان نے اس کی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے مگر امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ راوی ٹھیک ہے اور حدیث صحیح ہے۔ اور امام محمد اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ نے اس حدیث کی بناء پر یہ بات کہی ہے کہ اگر زمین پر اتر کر باجماعت نماز پڑھنا مشکل ہو تو لوگ سواری پر باجماعت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اور امام اعظم اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک ایسی صورت میں فرادیٰ فرادیٰ نماز پڑھیں گے جماعت جائز نہیں کیونکہ صحتِ اقتدا کے لئے اتحادِ مکان ضروری ہے۔ دو آدمی ایک ہی جانور پر ہوں تو جماعت کر سکتے ہیں، یہ ائمہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالاً أَوْ رُكْبَانًا﴾ [البقرة ۲۳۹] کے ساتھ رکھے جانے کے قابل نہیں اللہ تعالیٰ نے آیت مذکور میں یہ حکم دیا ہے کہ جب دشمن کا خوف ہو اور زمین پر اتر کر جماعت کرنا اور صلاۃ الخوف پڑھنا مشکل ہو تو پھر ہر شخص تنہا تنہا نماز پڑھے سوار سواری پر اور پیادہ زمین پر پس یہی حکم کیچ اور بارش کے لئے ہے۔

[۱۸۹] بابُ ماجاء في الصلاة على الدَّابَّةِ في الطين والمطر

[۴۲۱-] حدثنا يَحْيَى بنُ موسَى، نا شَبَابَةُ بنُ سَوَّارٍ، نا عُمرُ بنُ الرَّمَّاحِ، عن كَثِيرِ بنِ زِيَادٍ، عن عَمْرِو بنِ عُثمانَ بنِ يَعْلَى بنِ مُرَّةَ، عن أبيهِ، عن جَدِّهِ: أَنَّهُمْ كَانُوا مَعَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم في سَفَرٍ، فَانْتَهَوْا إِلَى مَضِيْقٍ، فَحَضَرَتِ الصلاةُ، فَمُطِرُوْا السَّمَاءَ مِنْ فَوْقِهِمْ، وَالْبَلَّةُ مِنْ أَسْفَلَ مِنْهُمْ،

فَأَذَّنَ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وھو عَلٰی رَاحِلَتِهٖ، وأَقَامَ، فَتَقَدَّمَ علی راحِلَتِهٖ فَصَلّٰی بِهِم، يُوْمِئُ إِيْمَاءً، يَجْعَلُ السُّجُوْدَ أَخْفَضَ مِنَ الرُّكُوعِ.

قال أبو عیسی: ھذا حدیثٌ غریبٌ تَفَرَّدَ به عُمرُ بنُ الرَّمَّاحِ البَلْخِیُّ، لایُعْرَفُ إلاَّ مِنْ حدیثِه، وقد رَوَی عنه غیرُ واحِدٍ من أھلِ العلمِ، وکذا رُوِیَ عنْ أنسِ بنِ مالکٍ أَنَّهُ صَلّٰی فی ماءٍ وطِیْنٍ علی دابَّتِهٖ، والعملُ علی ھذا عندَ أھلِ العلمِ، وبه یقولُ أحمدُ وإسحاقُ.

وضاحت: یہ حدیث غریب ہے اس لئے کہ اس کے راوی تنہا عمر بن الرماح ہیں، البتہ ان سے روایت کرنے والے متعدد حضرات ہیں اس لئے یہ حدیث قابل لحاظ ہے اور اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے پانی اور کیچ میں سواری پر نماز پڑھی اور یہی امام احمد واسحاق رحمہما اللہ کی رائے ہے۔

بابُ ماجاءَ فی الاِجْتِهَادِ فی الصَّلاَةِ

نبی ﷺ کا تہجد میں انتہائی محنت فرمانا

خلاصۂ کائنات، محبوب رب العالمین ﷺ تہجد بہت طویل پڑھتے تھے اتنے طویل کہ ہمارے لئے ان کا تصور مشکل ہے۔ ایک ایک رکعت میں پوری سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ نساء پڑھتے تھے۔ اور زندگی کے آخری سال میں آپؐ نے تہجد کھڑے ہوکر بھی پڑھے ہیں اور بیٹھ کر بھی، اور کبھی نماز کے دوران کھڑے ہوجاتے اور کبھی بیٹھ جاتے مگر آخری سال کے علاوہ ہمیشہ کھڑے ہوکر تہجد پڑھنے کا معمول تھا۔ نماز کی درازی کی وجہ سے پیروں پر ورم آجاتا تھا۔ کسی نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نماز میں اتنی مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہوں کی بخشش کا اعلان فرمادیا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: ''تو کیا میں شکر گذار بندہ نہ بنوں؟'' یعنی یہ امتیاز اور یہ عظمت آپ کو عبادت ہی کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے پھر اس میں اضافہ کیوں نہ کیا جائے؟۔ چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد آپؐ کی عبادت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔

سوال: یہاں ایک دوہرا اعتراض ہے کہ جب بھی انبیاء معصوم ہیں تو ان کے لئے یہ اعلان کیوں نہ کیا گیا۔ صرف آنحضور ﷺ کے لئے یہ اعلان کیوں کیا گیا؟ نیز ﴿مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ﴾ امکانِ گناہ کو مستلزم ہے حالانکہ انبیاء کی عصمت کا عقیدہ مسلمہ ہے۔

جواب: دونوں اعتراضوں کا مشترکہ جواب یہ ہے کہ بیشک تمام انبیاء معصوم ہیں اور عصمتِ انبیاء کا عقیدہ باون تولہ پاؤرتی ہے مگر دیگر انبیاء کے لئے اعلان اس لئے نہیں کیا گیا کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور حضور اکرم ﷺ

کے لئے ایک موقع ایسا آیا کہ یہ اعلان ضروری تھا۔

غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر جن شرائط پر کفار کے ساتھ صلح ہوئی تھی بظاہر اس میں مشرکین کا پلڑا بھاری نظر آرہا تھا۔ اور یہ صلح صحابہ کو ناگوار تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو پریشان تھے، کبھی آنحضرت ﷺ کے پاس جاتے تھے اور کبھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس اور عرض کرتے کہ کیا ہم لوگ حق پر نہیں ہیں؟ اور وہ لوگ باطل پر نہیں ہیں؟ پھر ہم دب کر صلح کیوں کریں؟ اس میں تو دین کی رسوائی ہے، مگر بہر حال آنحضرت ﷺ نے اللہ کے حکم سے صلح کر لی۔ جب قافلہ مدینہ کی طرف لوٹا تو یہ آیات نازل ہوئیں اور پہلی ہی آیت میں اعلان کیا گیا کہ اس صلح میں دین کی رسوائی نہیں بلکہ یہ فتح مبین ہے۔ اور اگر کسی کے ذہن میں یہ وسوسہ آئے کہ اس صلح میں آنحضور ﷺ سے غلطی ہوئی ہے تو وہ یہ اعلان سن لے کہ ہم نے اپنے نبی کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کر دیئے۔ غرض یہاں ذنب سے لوگوں کے ذہنوں میں علی سبیل الفرض پیدا ہونے والے خیالات ہیں، پس یہ آیت امکانِ گناہ کو مستلزم نہیں۔ اور اس سے دوسرے انبیاء کی عصمت پر حرف نہیں آتا وہ سب بالیقین صغائر و کبائر سے منزّہ ہیں اور ان کے لئے یہ اعلان اس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

[۱۹۰] بابُ ماجاء في الاجتهاد في الصلاة

[۴۲۲-] حدثنا قُتَيْبَةُ، وبِشْرُ بنُ مُعَاذٍ، قالا: نا أبو عَوَانَةَ، عن زِيَادِ بنِ عِلَاقَةَ، عن المُغِيْرَةِ بنِ شُعْبَةَ، قال: صَلَّى رسولُ الله صلى الله عليه وسلم حَتَّى انْتَفَخَتْ قَدَمَاهُ، فَقِيْلَ لَهُ: أَتَتَكَلَّفُ هذا وقد غُفِرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ؟! قال: "أَفَلَا أَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا؟!"

وفي الباب: عن أبي هُرَيْرَةَ، وعائشةَ. قال أبو عيسى: حديثُ المغيرةِ بنِ شُعْبَةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

بابُ ماجاءَ أَنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ العَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الصَّلَاةُ

قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کا حساب ہوگا

حدیث: حریث بن قبیصہ رحمہ اللہ اپنے گاؤں سے مدینہ منورہ آئے، اور مسجد نبوی میں نماز پڑھ کر دعا کی: "اے اللہ! میرے لئے کوئی اچھا ہمنشین (استاذ) آسان فرما" پھر اٹھے اور مسجد نبوی میں جو اسباق ہو رہے تھے ان کے پاس سے گذرے ایک مجلس کی طرف ان کا میلان ہوا وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مجلس تھی وہ اس مجلس میں بیٹھ گئے اور عرض کیا: میں نے یہاں پہنچ کر نماز پڑھنے کے بعد اللہ سے اچھے ہمنشین کی دعا کی ہے اور میرے دل کا میلان آپ کی طرف ہوا ہے پس آپ مجھے کوئی ایسی حدیث سنایئے جو آپ نے خود آنحضرت ﷺ سے سنی ہو، شاید اللہ تعالیٰ مجھے

اس حدیث سے نفع پہنچائیں یعنی میں اس پر عمل کروں۔ چونکہ وہ نماز پڑھ کر آئے تھے اس لئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز ہی کے بارے میں ایک حدیث سنائی کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: "قیامت کے دن بندے کے جس عمل کا سب سے پہلے حساب ہوگا وہ نماز ہے۔ اگر نماز کامل نکلی تو وہ کامیاب ہوگیا اور اگر اس میں خرابی پائی گئی تو لوٹیا ڈوبی! اور اگر کسی بندے کے فرائض میں کمی رہی تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے: دیکھو! میرے بندے کے پاس نوافل ہیں؟ اگر نفل ہونگے تو ان کے ذریعہ فرائض کی کمی پوری کی جائے گی۔ پھر تمام عملوں کا اسی طرح حساب ہوگا، یعنی جو بھی فرض ناقص ہوگا اور اس کی جنس سے نوافل ہونگے تو ان کے ذریعہ اس کمی کو پورا کیا جائے گا۔

الحمد للہ! لوگ نماز کی حد تک نوافل کا خوب اہتمام کرتے ہیں۔ چنانچہ فرضوں سے پہلے اور بعد میں سنتیں پڑھتے ہیں اور ان کے علاوہ بھی جتنی اللہ توفیق دیتے ہیں نوافل پڑھتے ہیں مگر روزوں اور زکات کا حال اس سے مختلف ہے۔ عام طور پر لوگ صرف فرض ادا کرتے ہیں، حالانکہ نفل روزے رکھنے چاہئیں، زکات سے زیادہ بھی غرباء پر خرچ کرنا چاہئے تاکہ وہ ہمارے کام آئے اور ہمارے فرائض کی ان سے تکمیل ہو۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ متفق علیہ حدیث میں ہے: قیامت کے دن سب سے پہلے دماء یعنی خون کا حساب ہوگا۔ اس حدیث کا باب کی حدیث سے کوئی تعارض نہیں، کیونکہ جس عمل کو سب سے پہلے جانچا جائے گا وہ نماز ہے اور جس کا سب سے پہلے نتیجہ آؤٹ ہوگا وہ خون کا معاملہ ہے۔ اور یہ تطبیق خود حدیثوں کے اندر موجود ہے چنانچہ یہاں أول ما یُحَاسَبُ ہے یعنی نماز کا حساب سب سے پہلے ہوگا یعنی جانچا جائے گا اور متفق علیہ حدیث میں ہے: أول ما یُقضٰی۔ یعنی سب سے پہلے دماء کا فیصلہ کیا جائے گا۔ واللہ اعلم

[۱۹۱] بابُ ماجاء أن أولَ ما يُحَاسَبُ به العبدُ يوم القيامة الصلاةُ

[۴۲۳-] حدثنا عليُّ بنُ نَصْرِ بنِ عَلِيِّ الجَهْضَمِيُّ، نا سَهْلُ بنُ حَمَّادٍ، نا هَمَّامٌ، قال: حدثني قَتَادَةُ، عنِ الحَسَنِ، عن حُرَيْثِ بنِ قَبِيصَةَ، قال: قَدِمْتُ المدينةَ فقلتُ: اللّٰهُمَّ يَسِّرْ لِي جَلِيسًا صَالِحًا. قال: فَجَلَسْتُ إِلَى أبي هريرةَ، فَقُلْتُ: إِنِّي سَأَلْتُ اللّٰهَ أَنْ يَرْزُقَنِي جَلِيسًا صَالِحًا، فَحَدِّثْنِي بِحَدِيْثٍ سَمِعْتَهُ مِنْ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم لَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يَنْفَعَنِي بِهِ، فقال سمعتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يقولُ: " إِنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ به العَبْدُ يومَ القِيَامَةِ مِنْ عَمَلِهِ صَلَاتُهُ، فَإِنْ صَلُحَتْ فَقَدْ أَفْلَحَ وَأَنْجَحَ، وَإِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ، فَإِنِ انْتَقَصَ مِنْ فَرِيْضَةٍ شَيْئًا قال الربُّ تبارَكَ وتعالىٰ: انظُرُوْا هَلْ لِعَبْدِي مِنْ تَطَوُّعٍ؟ فَيُكَمَّلُ بِهَا مَا انْتَقَصَ مِنَ الفَرِيْضَةِ، ثُمَّ يَكُونُ سَائِرُ عَمَلِهِ عَلَى ذٰلِكَ"

وفي الباب: عن تميمٍ الدَّارِيِّ. قال أبو عيسى: حديثُ أبي هريرة حديثٌ حسنٌ غريبٌ مِنْ هذَا

الوَجْهِ، وقد رُوِیَ هذا الحدیثُ مِنْ غَیْرِ هذا الوَجْهِ عَنْ أبی هریرةَ.
وقد رَوَی بعضُ أصحابِ الحَسَنِ، عن الحَسَنِ، عن قَبِیْصَةَ بنِ ذُوَیْبٍ غیرَ هٰذا الحدیثِ، والمشهورُ هُو قَبِیْصَةُ بنُ حُرَیْثٍ.
ورُوِیَ عن أنسِ بنِ حَکِیْمٍ، عن أبی هریرةَ، عن النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم نحوُ هذا.

وضاحت: پہلی سند میں راوی کا نام حریث بن قبیصہ ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث دیگر اسانید سے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس کے بعد جاننا چاہئے کہ دو راوی الگ الگ ہیں: (۱) قبیصہ بن حُریث ان کو حریث بن قبیصہ بھی کہتے ہیں (۲) قبیصہ بن ذُویب۔ یہ حدیث کس کی ہے؟ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حسن بصری رحمہ اللہ کے بعض تلامذہ نے حسن بصری سے اور انھوں نے قبیصہ بن ذُویب سے بھی اس کے علاوہ حدیث روایت کی ہے (پس احتمال ہے کہ یہ حدیث بھی انہی کی ہو) مگر مشہور یہ ہے کہ یہ حدیث قبیصہ بن حریث کی ہے (ابن ذُویب کی نہیں ہے)

نوٹ: العبدُ: نائب فاعل اور الصلاۃُ: أنَّ کی خبر ہے۔

بابُ ماجاءَ فِیْ مَنْ صَلّٰی فِی یَوْمٍ وَلَیْلَةٍ ثِنْتَیْ عَشْرَةَ رَکْعَةً مِنَ السُّنَّةِ مَالَهُ مِنَ الْفَضْلِ؟

رات دن میں بارہ سنن مؤکدہ کی فضیلت

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک سننِ مؤکدہ کی کوئی تحدید وتعیین نہیں وہ فرماتے ہیں: الصلاۃُ خیرُ موضوعٍ: نماز بہترین کام ہے پس اُسے زیادہ سے زیادہ کرنا چاہئے۔ تحدید وتعیین کر کے اس پر روک نہیں لگانی چاہئے۔ مگر حضرت کی یہ رائے دو وجہ سے غور طلب ہے: ایک: یہ نص کے مقابلہ میں قیاس ہے۔ دوسری وجہ: بیشک حد بندی نہ کرنے میں فائدہ ہے مگر نقصان بھی ہے۔ تعیین نہ ہونے کی صورت میں بہت سے لوگ صرف دو چار رکعتیں پڑھ لینے پر اکتفا کریں گے اور اگر تحدید کردی جائے تو کم از کم لوگ مقررہ تعداد تو پوری کرلیں گے۔ غرض حد بندی نہ کرنے میں صرف خواص کا فائدہ ہے اور تحدید وتعیین میں عام لوگوں کا فائدہ ہے اس لئے شریعت نے تحدید کی ہے۔ چنانچہ دوسرے تمام ائمہ سننِ مؤکدہ کی تعیین کے قائل ہیں پھر امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک شب وروز میں بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک دس رکعتیں ہیں۔ اور یہ اختلاف ظہر سے پہلے کی سنتوں کی وجہ سے ہوا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ظہر سے پہلے چار سنت مؤکدہ ہیں اور شوافع اور حنابلہ کے نزدیک دو ہیں۔ اور اس اختلاف کی بنیاد نقطۂ نظر کا اختلاف بھی ہے اور روایات کا اختلاف بھی۔ چونکہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک ہر

نفل نماز خواہ رات کی ہو یا دن کی ایک سلام سے دو رکعتیں ہی افضل ہیں۔ اس لئے انھوں نے ظہر سے پہلے دو سنتوں والی روایت لی ہے، اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک دن رات کی ہر نفل نماز ایک سلام سے چار افضل ہیں اور صاحبین کے نزدیک دن میں ایک سلام سے چار افضل ہیں، اس لئے حنفیہ نے چار سنتِ مؤکدہ والی روایت کو ترجیح دی ہے۔

اس کے بعد پانچ باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں:

پہلی بات: بارہ رکعت سنتِ مؤکدہ کی بھی روایت ہے اور دس رکعت کی بھی۔ اور دونوں صحیح ہیں۔ احناف نے بارہ رکعت والی حدیث کو بایں وجہ اختیار کیا ہے کہ اس کے ضمن میں دس رکعت والی روایت خود بخود آجاتی ہے، کیونکہ ادنی اعلی کا فرد اور جز ہوتا ہے جیسے خمسٌ من الفطرة اور عشر من الفطرة میں سب نے دوسری حدیث کو اختیار کیا ہے کیونکہ اس میں خمسٌ من الفطرة والی حدیث پر بھی عمل ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں عبادت بھی زیادہ ہے اور ثواب بھی اور احتیاط بھی۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے دس والی روایت لی ہے کیونکہ انھوں نے جو اصل طے کی ہے اس پر یہی روایت فٹ آتی ہے۔ اور آنحضور ﷺ سے ظہر سے پہلے جو چار رکعتیں پڑھنا مروی ہے اس کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ وہ سب ظہر کی سنتیں نہیں ہیں بلکہ دو رکعت سنت زوال ہیں اور دو سنت ظہر۔ یعنی حضور اکرم ﷺ زوال کے بعد دو رکعت سنت پڑھا کرتے تھے پھر ظہر سے پہلے دو رکعت پڑھتے تھے اس طرح وہ چار ہوئیں۔

اور علامہ بدر الدین عینی اور علامہ کشمیری رحمہما اللہ کا رجحان یہ ہے اور میری بھی ناقص رائے یہی ہے کہ دونوں روایتیں معمول بہا ہیں عمومی احوال میں ظہر سے پہلے چار رکعت سنت مؤکدہ ہیں۔ اور وقت میں تنگی ہو، جماعت کھڑی ہونے والی ہو تو پھر دو رکعت پڑھ لے، اس سے بھی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

دوسری بات: یہ دس یا بارہ رکعتیں سنتِ راتبہ اور رواتب بھی کہلاتی ہیں اور وجہ تسمیہ یہ ہے: رَتَبَ رُتوباً کے معنی ہیں: جم جانا، چونکہ بندہ حدیث میں مذکور ثواب کا مستحق مواظبت کرنے ہی پر ہوتا ہے یعنی دو چار مرتبہ ان کو پڑھ لینے سے ثواب نہیں ملتا بلکہ مواظبت پر ملتا ہے اس لئے اس کو سنتِ راتبہ اور رواتب کہتے ہیں۔

تیسری بات: عصر سے پہلے چار سنتوں کا احادیث میں تذکرہ ہے اگرچہ ان کا کوئی ثواب یا فضیلت مروی نہیں پس اس کا درجہ سننِ مؤکدہ سے نیچے ہوگا۔ البتہ احادیث میں عشاء سے پہلے سنتوں کا تذکرہ نہیں ہے اور شرح منیہ (کبیری) میں جو سنن سعید بن منصور کے حوالہ سے روایت ذکر کی ہے اس کی کوئی اصل نہیں۔ کیونکہ علماء کو وہ حدیث نہیں ملی۔ اور دیگر کتب حدیث میں بھی وہ موجود نہیں، پس وہ درجہ کے لحاظ سے اور بھی نیچے ہے یعنی صرف مستحب ہے۔

چوتھی بات: جن نمازوں سے پہلے سستی پائی جاتی ہے وہاں سننِ قبلیہ تجویز ہوئی ہیں اور اس میں سستی کی کمی بیشی بھی ملحوظ ہے، چنانچہ فجر سے پہلے دو ہی رکعت سنتِ مؤکدہ ہیں کیونکہ اس وقت آدمی رات بھر سو کر بیدار ہوتا ہے اس لئے سستی کم ہوتی ہے۔ اور ظہر سے پہلے چار سنتیں رکھی گئی ہیں کیونکہ اس سے پہلے قیلولہ ہے جو مختصر ہوتا ہے اور اس

وقت عام طور پر آدمی کچی نیند سے بیدار ہوتا ہے اس لئے سستی زیادہ ہوتی ہے، پس تعداد بڑھائی گئی تاکہ ان کو پڑھنے سے سستی دور ہو جائے پھر آدمی چاک و چوبند ہو کر فرض ادا کرے۔ اور عصر اور مغرب اور عشا: سستی کے اوقات نہیں ہیں، اس لئے سنن قبلیہ نہیں رکھی گئیں۔ اسی طرح جن نمازوں کے بعد مشاغل ہیں وہاں بھی سنتیں تجویز ہوئی ہیں، چنانچہ فجر کے بعد سنت نہیں رکھی گئی کیونکہ اس وقت فوراً کوئی مشغلہ نہیں۔ علاوہ ازیں آگے مکروہ وقت آ رہا ہے پس اگر کوئی شخص فرض دیر سے پڑھے گا تو سنت مکروہ وقت میں پہنچ جائے گی۔ اور عصر کے بعد اگرچہ مشغلہ ہے مگر مکروہ وقت کا لحاظ کر کے سنتیں نہیں رکھی گئیں۔ اور عصر و مغرب کے بعد مشغولیت ہے اور عشاء کے بعد سونے کا تقاضہ رہتا ہے اس لئے وہاں سنتیں تجویز کی گئیں، تاکہ آدمی فرض کی آخری رکعت ہی میں مشغلہ کی طرف متوجہ نہ ہو جائے، اور عشاء کی آخری رکعت ہی میں سو نہ جائے۔ اور نفلوں کے آخر میں ذہن اگر مشغلہ کی طرف متوجہ ہو جائے گا تو کوئی حرج نہیں کیونکہ ان میں بہت گنجائش ہے۔ اور وتر کی نماز درحقیقت عشاء کے بعد کی نماز نہیں ہے، بلکہ وہ تہجد کے بعد کی نماز ہے، مگر عام لوگوں کی سہولت کے لئے اس کو عشاء کے بعد پڑھ لینے کی اجازت دی گئی ہے اس لئے عشاء کی سنتیں اس سے پہلے ہیں۔

پانچویں بات: اور آخری اور سب سے اہم بات یہ یاد رکھنی چاہئے کہ فضائل اعمال کی تمام روایتوں میں فَاہَو اور وَاظَبَ اور دَاوَمَ کی قید ملحوظ ہوتی ہے خواہ وہ قید مذکور ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ باب میں ایک ہی روایت متعدد اسانید سے ہے کسی میں یہ قید ہے اور کسی میں نہیں ہے۔ پس جہاں یہ قید مذکور نہیں ہوتی وہاں بھی وہ مقدر ہوتی ہے ـــــ آنحضور ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو صلاۃ التسبیح سکھلائی اور فرمایا: اس نماز کی بدولت دس قسم کے گناہ معاف ہوتے ہیں، چونکہ اس نماز میں چار رکعت میں تین سو مرتبہ ایک خاص تسبیح پڑھنی ہوتی ہے اس لئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کون شخص ہے جو اس نماز کو روزانہ پڑھ سکے گا؟ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے روزانہ پڑھنے کے لئے نہیں فرمایا تھا پھر حضرت عباسؓ نے یہ سوال کیوں کیا؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جانتے تھے کہ فضائل اعمال کی تمام روایات میں مواظبت اور مداومت کی قید ملحوظ ہوتی ہے، خواہ اس کا تذکرہ ہو یا نہ ہو اس لئے حضرت عباسؓ نے وہ بات عرض کی اور رخصت طلب کی، چنانچہ آپؐ نے آسانی مرحمت فرمائی یہاں تک کہ فرمایا: اچھا زندگی میں ایک مرتبہ پڑھ لو تب بھی ثواب کے مستحق ہو جاؤ گے۔ اب روزانہ پڑھنے کی وہ قید ہٹ گئی ـــــ اور پابندی ایک عرفی چیز ہے جس کو لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ طالب علم ہر مہینہ دس بارہ دن غیر حاضر رہے تو اس کو پابندی کرنے والا کوئی نہیں کہتا۔ اور اگر سال بھر میں مختلف اوقات میں بیس پچیس روز غیر حاضر رہے تو اس کا شمار پابندی کرنے والوں میں ہوتا ہے۔ غرض مواظبت و مداومت ایک عرفی بات ہے اس کا کوئی مقررہ پیمانہ نہیں۔

[۱۹۲] بابُ ماجاء فی من صَلّٰی فی یومٍ ولیلۃٍ ثِنْتَیْ عَشْرَۃَ رکعۃً من السُّنَّۃِ مَالَہُ من الفَضْلِ؟

[۴۲۴-] حدثنا محمدُ بنُ رافعٍ، نا إسحاقُ بنُ سُلیمانَ الرَّازِیُّ، نا المُغیرۃُ بنُ زیادٍ، عن عَطاءٍ، عن عائشۃَ، قالت: قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "مَنْ ثَابَرَ علی ثِنْتَیْ عَشْرَۃَ رَکْعَۃً مِن السُّنَّۃِ، بَنَی اللّٰہُ لَہ بَیْتًا فی الجَنَّۃِ: أَرْبَعَ رَکْعَاتٍ قَبلَ الظُّھْرِ، ورکْعَتَیْنِ بعدَھا، ورکعتَیْنِ بعدَ المغربِ، ورکْعَتَیْنِ بعدَ العشاءِ، ورکعتَینِ قبلَ الفَجْرِ"

وفی الباب: عن أُمِّ حبیبۃَ، وأبی ھریرۃَ، وأبی موسی، وابنِ عُمرَ.

قال أبو عیسی: حدیثُ عائشۃَ حدیثٌ غریبٌ من ھذا الوجہِ؛ ومغیرۃُ بنُ زیادٍ قد تکَلَّمَ فیہ بعضُ أھلِ العلمِ مِنْ قِبَلِ حِفْظِہِ.

[۴۲۵-] حدثنا محمودُ بنُ غَیْلَانَ، نا مُؤَمَّلٌ، نا سفیانُ الثَّوریُّ، عن أبی إسحاقَ، عن المُسَیَّبِ بنِ رافعٍ، عن عَنْبَسَۃَ بنِ أبی سُفیانَ، عن أُمِّ حَبیبۃَ، قالت: قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "مَنْ صَلّٰی فی یَوْمٍ ولَیْلَۃٍ ثِنْتَیْ عَشْرَۃَ رَکْعَۃً بُنِیَ لہ بَیتٌ فی الجنَّۃِ: أَرْبعًا قبلَ الظھرِ، ورکْعَتَیْنِ بعدَھا، ورکعتَیْنِ بَعْدَ المغرِبِ، ورکْعَتَیْنِ بعدَ العِشاءِ، ورکعتَیْنِ قبلَ الفَجْرِ: صلاۃِ الغَدَاۃِ"

قال أبو عیسی: وحدیثُ عَنْبَسَۃَ عن أُمِّ حَبِیْبَۃَ فی ھذا البابِ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ؛ وقد رُوِیَ عن عَنْبَسَۃَ من غیرِ وجہٍ.

ترجمہ: حدیث (۴۲۴) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے بارہ سنتوں پر مواظبت کی تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک حویلی بنائیں گے (پڑھو) ظہر سے پہلے چار رکعتیں، اور اس کے بعد دو رکعتیں، اور مغرب کے بعد دو رکعتیں، اور عشاء کے بعد دو رکعتیں، اور فجر سے پہلے دو رکعتیں۔ حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث اس سند سے غریب (ضعیف) ہے، اس کے راوی مغیرہ میں بعض محدثین نے یادداشت کی جانب سے کلام کیا ہے۔ اور حدیث (۴۲۵) جو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اعلیٰ درجہ کی ہے اس کا بھی یہی مضمون ہے اور حدیث کے آخر میں صلاۃ الغداۃ کسی راوی نے بڑھایا ہے اور اس سے یہ وہم دفع کرنا مقصود ہے کہ فجر سے صبح صادق مراد نہیں ہے بلکہ نماز فجر مراد ہے۔

بابُ ماجاءَ فی رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ مِنَ الْفَضْلِ

فجر کی سنتوں کی فضیلت

گذشتہ باب سننِ مؤکدہ کے سلسلہ کا عمومی باب تھا۔ اب تفصیلی ابواب شروع کرتے ہیں۔ جاننا چاہئے کہ سننِ

مؤکدہ میں سب سے زیادہ تاکید فجر کی سنتوں کی ہے، یہاں تک کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ایک قول ان کے وجوب کا بھی ہے گوکہ اس پر فتوی نہیں۔ اور حدیثوں میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان دو رکعتوں کا درجہ سنت کا نہیں بلکہ اس سے اوپر کا درجہ ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: آنحضرت ﷺ فجر کی سنتوں کا جتنا اہتمام فرماتے تھے دوسری سنتوں کا اتنا اہتمام نہیں کرتے تھے (متفق علیہ، مشکوۃ حدیث ۱۱۶۳) اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فجر کی سنتوں کو نہ چھوڑو اگرچہ گھوڑے تم کو روند ڈالیں (ابوداؤد ۱:۱۷۹ باب فی تخفیفهما) اس حدیث کے مخاطب مجاہدین ہیں، ان سے خطاب ہے کہ اگر جنگ کا میدان ہو، کفار صبح سویرے جنگ کے لئے تیار ہو جائیں اور اندیشہ ہو کہ اگر سنتیں پڑھ کر فجر کے فرض پڑھیں گے تو دشمن حملہ کر دے گا، اور ان کے گھوڑے روند ڈالیں گے تو بھی اس نماز کو ترک نہ کرو، اس کو ضرور پڑھو۔

علاوہ ازیں ان رکعتوں کی قضاء کا حکم بھی ہے جبکہ سنتوں کی قضا مشروع نہیں، یہ بھی دلیل ہے کہ ان میں وجوب کی شان ہے، اور ان کی قضا زوال تک ہے زوال کے بعد نہیں، معلوم ہوا کہ یہ نماز واجب نہیں، ورنہ ابداً قضاء کا حکم ہوتا۔

حدیث: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''فجر کی دو رکعتیں دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہیں''

تشریح: اس ارشاد کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو صبح چار پیسوں کے نفع کی خاطر فرض جلدی سے ادا کر کے کام پر لگ جاتے ہیں انہیں بتایا گیا ہے کہ یہ سنتیں عام نوافل کی طرح نہیں ہیں۔ یہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے سب سے بہتر قیمتی اور کارآمد ہیں، پس معمولی نفع کی خاطر ایسی قیمتی دولت ضائع نہ کرو۔

[۱۹۳] بابُ ماجاء فی رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ من الفضل

[۴۲۶-] حدثنا صالحُ بنُ عبدِ الله، نا أبو عَوَانَةَ، عن قتادةَ، عن زُرَارَةَ بنِ أَوْفَی، عن سَعْدِ بنِ هِشَامٍ، عن عائشةَ قالت: قال رسولُ الله صلی الله علیه وسلم: " رَکْعَتَا الفَجْرِ خیرٌ مِنَ الدُّنْیَا ومَافِیْهَا"

وفی الباب: عن علیٍّ، وابنِ عمرَ، وابنِ عباسٍ. قال أبو عیسی: حدیثُ عائشةَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ. وقد رَوَی أحمدُ بنُ حَنْبَلٍ عن صالحِ بنِ عبدِ اللهِ التِّرْمِذِیِّ حَدِیثًا.

وضاحت: امام ترمذی رحمہ اللہ کے استاذ صالح بن عبداللہ ترمذی ثقہ راوی ہیں کیونکہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے ان سے ایک حدیث روایت کی ہے اور بڑے آدمی کا کسی سے روایت کرنا اس کی توثیق ہے (خیال رہے یہ حدیث امام احمد: صالح سے روایت نہیں کرتے، کوئی اور حدیث ان سے روایت کی ہے۔ یہ حدیث تو امام احمد رحمہ اللہ نے مسند میں یحییٰ کی سند سے روایت کی ہے (الفتح الربانی ۴:۲۲۱)

بابُ ماجاء في تخفيفِ ركعتيِ الفجرِ، والقراءةِ فيهما

فجر کی سنتوں کو مختصر کرنا اور ان میں اخلاص کی دو سورتیں پڑھنا مسنون ہے

اس باب میں دو مسئلے ہیں:

پہلا مسئلہ: فجر کی سنتیں ہلکی پڑھنی چاہئیں۔ نبی ﷺ تہجد بھی ہلکی دو رکعتوں سے شروع فرماتے تھے اور فجر کی سنتیں بھی مختصر پڑھتے تھے، اور اس کی وجہ حدیث (بخاری حدیث نمبر ۱۱۴۲ باب عقد الشیطان) میں یہ بیان کی گئی ہے کہ: ''جب بندہ رات میں سوتا ہے تو شیطان یہ منتر پڑھ کر کہ عليك ليلٌ طويلٌ فارقُدْ (سوتا رہ ابھی رات بہت باقی ہے) سونے والے کی گدی پر تین گرہیں لگاتا ہے، اگر بندہ بیدار ہوتے ہی اللہ کا ذکر کرے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے پھر جب وہ طہارت حاصل کرتا ہے یعنی وضوء یا غسل کرتا ہے تو دوسری گرہ کھل جاتی ہے، اور نماز پڑھنے پر تیسری گرہ کھل جاتی ہے اور بندہ چست ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہ کام نہ کرے تو وہ گرہیں باقی رہتی ہیں اور وہ سست اٹھتا ہے''

تشریح: یہ نشاط اور کسل جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہے، ہر شخص تجربہ کر کے دیکھ سکتا ہے۔ اگر آدمی پہلے طریقہ پر اٹھے گا تو نماز فجر میں خوب جی لگے گا اور نماز کے بعد عبادت کرنے کا یعنی تلاوت اور مطالعہ وغیرہ کرنے کا شوق پیدا ہوگا، اور دوسرے طریقہ پر اٹھے گا تو نماز میں دل جمعی نہیں ہوگی، نہ کچھ مزہ آئے گا اور نہ نماز کے بعد اچھے کاموں کی طرف طبیعت مائل ہوگی۔

غرض جو لوگ تہجد کے وقت بیدار ہوتے ہیں آنحضور ﷺ نے ان کے لئے یہ مسنون کیا کہ تہجد کے شروع میں دو رکعتیں ہلکی پڑھیں تا کہ بعد میں طویل تہجد نشاط کے ساتھ پڑھا جا سکے اور مسلمانوں کی اکثریت فجر کے وقت بیدار ہوتی ہے، ان کے لئے یہ مسنون کیا کہ فجر سے پہلے سنتیں ہلکی پڑھیں تا کہ فرض نشاط کے ساتھ پڑھا جائے۔ غرض آپؐ نے دونوں عمل لوگوں کی دونوں قسموں کے لئے کئے ہیں ورنہ آپؐ شیطان کے اثر اس کے منتر اور اس کے وسوسوں سے محفوظ تھے۔

دوسرا مسئلہ: آنحضرت ﷺ فجر کی سنتوں میں اخلاص کی دو سورتیں یعنی قُلْ يأيها الكافرون اور قل هو الله أحد پڑھا کرتے تھے [1] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے ایک مہینہ نبی ﷺ کے قریب رہ کر اور کان لگا کر سنا ہے کہ آپؐ فجر کی سنتوں میں کونسی سورتیں پڑھتے ہیں؟ (رَمَقَ (ن) رَمْقًا دیر تک دیکھنا) پس آپؐ فجر کی سنتوں میں سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص پڑھا کرتے تھے۔

---

(۱) اخلاص کے معنی ہیں خالص کرنا، اس میں کوئی ملاوٹ نہ کرنا۔ سورۂ کافرون میں اخلاص فی العبادت کا بیان ہے اور قل هو الله أحد میں اخلاص فی الاعتقاد کا۔ اس لئے یہ دونوں سورتیں اخلاص کی سورتیں کہلاتی ہیں۔

یہ حدیث ابواحمد محمد بن عبداللہ الزبیری کی وجہ سے ضعیف ہے۔ یہ راوی اگرچہ فی نفسہ ثقہ ہے مگر بقول امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ: سفیان ثوری کی روایتوں میں کثیر الخطا ہے (تہذیب ۹:۲۵۵) مگر یہ حدیث سفیان ثوری سے اگرچہ ابو احمد ہی روایت کرتے ہیں مگر یہ مضمون کہ آنحضور ﷺ فجر کی سنتوں میں اخلاص کی دو سورتیں پڑھا کرتے تھے متعدد روایات میں مروی ہے پس فجر کی سنتوں میں یہ سورتیں پڑھنا مسنون ہے۔

فائدہ: آنحضور ﷺ نے بعض نمازوں میں مخصوص سورتیں پڑھی ہیں، مثلاً آپؐ جمعہ وعیدین میں سورۂ اعلی اور سورۂ غاشیہ اور کبھی سورۃ الجمعہ اور سورۃ المنافقون پڑھتے تھے۔ اور وتر میں سورۂ اعلی، سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص پڑھا کرتے تھے، پس یہ ماثورہ سورتیں پڑھنی چاہئیں، مگر واجب کی طرح ان کا التزام نہیں کرنا چاہئے، گاہے ماہے دوسری سورتیں بھی پڑھنی چاہئیں۔

[۱۹٤] بابُ ماجاء فی تخفیف ركعتَيِ الفجر، والقراءةِ فيهما

[٤٢٧-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، وأبو عَمَّارٍ قالا: نا أبو أحمدَ الزُّبَيْرِيُّ، نا سُفيانُ، عن أبی إسحاق، عن مُجاهدٍ، عن ابنِ عُمَرَ قال: رَمَقْتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم شَهْرًا فكانَ يَقْرأُ فی الركعتَيْنِ قبلَ الفَجْرِ بِقُلْ يأيها الكافرونَ وقلْ هُوَ اللّٰهُ أحدٌ.

وفی الباب: عن ابنِ مسعودٍ، وأنسٍ، وأبی هريرةَ، وابنِ عباسٍ، وحفصةَ، وعائشة.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عمرَ حديثٌ حسنٌ، ولانَعْرِفُهُ مِنْ حديثِ الثوریِّ عن أبی إسحاقَ إلا مِن حديثِ أبی أحمدَ، والمعروفُ عندَ النَّاسِ حديثُ إسرائيلَ عن أبی إسحاقَ، وقد رُوِیَ عن أبی أحمدَ عن إسرائيلَ هذا الحديثُ أيضًا.

وأبو أحمدَ الزبيریُّ ثِقَةٌ حَافِظٌ قال: سمعتُ بُنْدَاراً يقولُ: مَارَأَيْتُ أَحَدًا أَحْسَنَ حِفْظًا مِنْ أبی أحمدَ الزُّبيریِّ، واسمُه: محمدُ بن عبدِ اللهِ بنِ الزُّبَيْرِ الأَسَدِیُّ الكوفیُّ.

وضاحت: ابن عمرؓ کی مذکورہ حدیث ابواسحاق ہمدانی سے ان کے پوتے اسرائیل روایت کرتے ہیں۔ محدثین میں یہ حدیث اسی شاگرد کی روایت سے معروف ہے، رہی یہ بات کہ اس حدیث کو ابواسحاق سے ثوریؒ بھی روایت کرتے ہیں یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں جاننا چاہئے کہ صرف ابواحمد الزبیری ثوری سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔ ثوری کا کوئی دوسرا شاگرد یہ حدیث ان سے روایت نہیں کرتا۔ اور ابواحمد زبیری نے بھی یہ حدیث عن اسرائیل عن ابی اسحاق روایت کی ہے۔ اور زبیری اگرچہ فی نفسہ ثقہ اور حافظ ہیں، محمد بن بشار جو بُندار سے مشہور ہیں فرماتے ہیں: میں نے ابواحمد زبیری سے اچھا حافظہ والا کوئی نہیں دیکھا، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ثوری کی روایتوں میں ان سے کبھی غلطی

ہوجاتی تھی، جیسا کہ امام احمدؒ نے فرمایا ہے، اس لئے ممکن ہے یہاں بھی ان سے غلطی ہوگئی ہو اور انھوں نے بجائے اسرائیل کے ثوری کا نام لے لیا ہو۔ اس لئے امام ترمذیؒ نے اس سند کو صرف حسن کہا ہے اس پر صحیح کا حکم نہیں لگایا۔

بابُ ماجاء في الْكَلَامِ بَعْدَ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ

فجر کی سنتوں کے بعد بات کرنا

فجر کی سنتوں اور فرض کے درمیان نہ تو بات چیت کرنا سنت ہے اور نہ خاموش رہنا عبادت ہے، ضرورت ہو تو بات چیت کر سکتے ہیں ورنہ ذکر میں مشغول رہنا چاہئے تجربہ یہ ہے کہ اگر فجر کی سنت اور فرض کے درمیان بے ضرورت باتیں کی جاتی ہیں تو فرض نماز بے لطف ہو جاتی ہے اور ذکر میں مشغول رہنے یا خاموش رہنے یا لیٹ جانے سے لطف بڑھ جاتا ہے اور یہ صرف تجربہ کی بات ہے، ورنہ روایات سے نہ تو بات چیت کرنا سنت ثابت ہوتا ہے اور نہ خاموش رہنا۔ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب آپ تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو گھر والوں کو بیدار نہیں کرتے تھے، وہ از خود اٹھنا چاہیں تو اٹھیں، البتہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں تہجد کے وقت گھر والوں کو بھی بیدار فرماتے تھے، اور پورے سال جب آپ تہجد سے فارغ ہوتے اور وتر پڑھنے کا وقت آتا تو ازواج کو بیدار فرماتے، پھر وتر پڑھ کر آرام فرماتے اور صبح صادق ہوتے ہی فجر کی سنتیں پڑھتے۔ پھر اگر کوئی ضروری بات ہوتی تو اہلیہ محترمہ سے گفتگو فرماتے ورنہ لیٹ جاتے اور جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ اطلاع دیتے تو نماز پڑھانے کے لئے تشریف لے جاتے۔

حدیث: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ جب فجر کی سنت پڑھ کر فارغ ہوجاتے اور آپؐ کو مجھ سے کوئی حاجت ہوتی یعنی مجھ سے بات کرنے کو آپؐ کا جی چاہتا تو آپؐ مجھ سے باتیں کرتے، ورنہ نماز پڑھانے کے لئے تشریف لے جاتے۔

تشریح: آنحضور ﷺ نے فجر کی سنت اور فرض کے درمیان صرف حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بات چیت کی ہے، بقیہ ازواج سے اس وقت میں بات چیت کرنا مروی نہیں۔ حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہٗ نے فرمایا: آنحضور ﷺ کا فجر کی سنتوں اور فرض کے درمیان لیٹنا نشاط کے لئے تھا اور محبوب سے دو گھڑی بات کرنے سے بھی نشاط دوبالا ہوجاتا ہے، چونکہ صدیقہؓ آنحضور ﷺ کی محبوبہ تھیں اس لئے آپ صرف انہی سے بات کیا کرتے تھے دیگر ازواج سے بات کرنا مروی نہیں۔

[۱۹۵] بابُ ماجاء في الكلام بعد ركعتَيِ الفجر

[۴۲۸-] حدثنا يوسُفُ بنُ عيسى، نا عبدُ اللهِ بنُ إدريسَ، قال: سمعتُ مالكَ بنَ أنسٍ، عن أبي النَّضرِ، عن أبي سَلَمَةَ، عن عائشةَ، قالت: كانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم إِذَاصَلَّى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ:

فَإِنْ كَانَتْ لَهُ إِلَيَّ حَاجَةٌ كَلَّمَنِيْ، وَإِلَّا خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وقد كَرِهَ بعضُ أهلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغيرِهِمْ الْكلَامَ بعدَ طُلوعِ الفَجْرِ حتى يُصَلِّيَ صلاةَ الفَجْرِ، إِلَّا مَاكَانَ مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ أَوْ مَالاَ بُدَّ مِنْهُ، وهوقولُ أحمدَ وإسحاق.

ترجمہ: صحابہ اور تابعین میں سے بعض اہل علم نے صبح صادق کے بعد بات کرنے کو ناپسند کیا ہے یہاں تک کہ فجر کی نماز پڑھ لے (اور یہ کراہت بے ضرورت باتیں کرنے میں ہے کیونکہ ان کی کوئی نہایت نہیں ہوتی اور اس سے فرض بے لطف ہو جاتا ہے) البتہ اللہ کا ذکر کرنا یا کوئی ضروری بات کرنا تو اس کی گنجائش ہے اور یہ احمد واسحاق رحمہما اللہ کا قول ہے۔

بَابُ ماجاء لاصَلاَةَ بَعْدَ طُلُوْعِ الْفَجْرِ إِلَّا رَكْعَتَيْنِ

صبح صادق کے بعد دوسنتوں کے علاوہ نوافل جائز نہیں

مذاہبِ فقہاء: صبح صادق کے بعد دو رکعت سنتِ مؤکدہ کے علاوہ نوافل جائز ہیں یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صبح صادق اور نماز فجر کے درمیان جتنی چاہیں نفلیں نماز پڑھ سکتے ہیں، کوئی مضائقہ نہیں، اور جمہور کے نزدیک سنت مؤکدہ کے علاوہ نوافل ممنوع ہیں۔

دلائل: جمہور کی دلیل باب کی حدیث ہے، ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''صبح صادق کے بعد کوئی نماز نہیں سوائے دوسجدوں کے'' یعنی سوائے دو رکعت سنت مؤکدہ کے، اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ صبح صادق کے بعد صرف دو ہلکی رکعتیں پڑھا کرتے تھے (بخاری حدیث ۱۱۷۳)

اور امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل عمرو بن عَبَسَہ السلمی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں: میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! دعا کی قبولیت کے لئے کونسا وقت افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جوفُ الليلِ الآخِرُ، فصلِّ ما شئتَ حتى تُصَلِّيَ الصُّبْحَ (مع الاختصار) قبولیت دعا کے لئے سب سے قیمتی گھڑی رات کا آخر ہے۔ پس آپ صبح کی نماز تک جتنی چاہیں نفلیں پڑھیں، اس وقت کی نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور اس کا ثواب لکھا جاتا ہے (ابوداؤد ۱:۱۸۱ بابٌ من رخص فيهما) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صبح صادق کے بعد بھی نفلیں جائز ہیں، فجر کی نماز تک اس کی گنجائش ہے۔ اور جمہور کی طرف سے اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ یہی حدیث مسند احمد (۴:۱۱۱) میں ہے وہاں حتى يطلع الفجر ہے اور یہی لفظ قرینِ صواب ہے، ورنہ عمرو بن عَبَسَہؓ اور حضرت حفصہؓ کی حدیثوں میں تعارض ہو جائے گا (معارف السنن ۴:۶۷)

نوٹ: امام ترمذی رحمہ اللہ نے ابن عمر کی حدیث کو غریب کہا ہے اس لئے کہ قدامۃ بن موسیٰ سے اوپر اس کی یہی ایک سند ہے، مگر یہ بات حضرت مصنف رحمہ اللہ کے علم اور آپ کے مسودہ کے اعتبار سے ہے، علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے نصب الرایہ (۱:۲۵۵) میں اس حدیث کی تین سندیں اور بھی لکھی ہیں۔

[۱۹۶] بابُ ماجاء لاصلاة بعد طلوع الفجر إلا ركعتين

[۴۲۹-] حدثنا أحمدُ بنُ عَبْدَةَ الضَّبِّيُّ، نا عبدُ العزيزِ بنُ محمدٍ، عن قُدامَةَ بنِ مُوسَى، عن مُحمدِ بنِ الْحُصَيْنِ، عن أبي عَلْقَمَةَ، عن يَسَارٍ مَوْلَى ابنِ عُمَرَ، عن ابنِ عُمَرَ: أَنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم قال: "لَاصَلاَةَ بَعْدَ الفَجْرِ إِلاَّ سَجْدَتَيْنِ"

وفي الباب: عن عبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، وحَفْصَةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ حديثٌ غريبٌ لَانَعْرِفُهُ إِلاَّ مِنْ حديثِ قُدَامَةَ بنِ مُوسَى. وَرَوَى عَنْهُ غيرُ وَاحِدٍ، وهُوَ مَا أَجْمَعَ عليهِ أهلُ العلمِ، كَرِهُوْا أَنْ يُصَلِّيَ الرَّجُلُ بعدَ طُلوعِ الفَجْرِ إِلاَّ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ.

ومَعْنَى هذا الحديثِ إِنَّمَايقولُ: لَاصَلاَةَ بعدَ طلوعِ الفَجْرِ إلا رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ.

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث غریب ہے۔ ہم اس کو صرف قدامہ بن موسیٰ کی سند سے جانتے ہیں (یعنی قدامہ سے اوپر یہی سند ہے اور قدامہ کے استاذ محمد بن الحصین مجہول ہیں) اور ان سے متعدد حضرات نے روایت کیا ہے (یعنی قدامہ بن موسیٰ سے نیچے حدیث کی متعدد سندیں ہیں) اور اس مسئلہ میں علماء کا اجماع ہے (امام شافعی رحمہ اللہ کا اختلاف امام ترمذی کے علم میں نہیں ہے) اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ صبح صادق کے بعد کوئی نفل جائز نہیں سوائے فجر کی سنتوں کے (یعنی حدیث میں جو إلا سجدتین ہے اس سے مراد فجر کی سنتیں ہیں)

بابُ ماجاءَ في الِاضْطِجَاعِ بَعْدَ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ

فجر کی سنتوں کے بعد لیٹنے کا بیان

اضطجاع کے معنی ہیں کروٹ پر لیٹنا۔ آنحضرت ﷺ کا معمول تھا کہ آپ تہجد سے فارغ ہو کر دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے تھے اور صبح صادق کے بعد فوراً سنت پڑھتے تھے، پھر دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے تھے۔ پھر جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ نماز کی اطلاع کرتے تو آپ نماز پڑھانے کے لئے تشریف لے جاتے۔ یہ لیٹنا کس درجہ کا حکم ہے؟ اس سلسلہ میں آٹھ قول ہیں: پہلا قول: ابن حزم ظاہری کے نزدیک فجر کی نماز اور سنتوں کے درمیان لیٹنا فرض ہے

چاہے ایک سکنڈ کے لئے لیٹے۔ اور یہ لیٹنا نماز فجر کی صحت کیلئے بھی شرط ہے، جو شخص لیٹے بغیر فجر پڑھے گا اس کا فرض صحیح نہیں ہوگا۔ دوسرا قول: امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک لیٹنا سنت ہے۔ تیسرا قول: بعض علماء کے نزدیک (غالباً امام احمد کے نزدیک) مستحب ہے۔ چوتھا قول: احناف کے نزدیک مباح ہے۔ پانچواں قول: امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بدعت ہے۔ یہ آٹھ اقوال میں سے چند اقوال ہیں اور اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ یہ لیٹنا امر تشریعی تھا یعنی شرعی حکم تھا یا کسی مصلحت سے تھا؟ جو حضرات وجوب یا سنت یا استحباب کے قائل ہیں ان کے نزدیک یہ شرعی حکم تھا اور قائلین اباحت کے نزدیک یہ تہجد گذاروں کی مصلحت کے لئے تھا شرعی حکم نہیں تھا، تا کہ جو تہجد گذار لمبے تہجد پڑھنے کی وجہ سے تھک گئے ہیں وہ پہلے تھوڑی دیر آرام کرلیں، اور تھکن دور کر کے پھر فرض پڑھیں۔

فائدہ: بعض حضرات کے نزدیک گھر میں لیٹنا سنت ہے اور مسجد میں لیٹنا بدعت ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ گھر ہی میں لیٹتے تھے، مسجد میں کبھی نہیں لیٹے۔ مگر یہ قول صحیح نہیں۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی میں تہجد پڑھنے والوں سے فرمایا ہے کہ ''جب تم فجر کی سنت پڑھ چکو تو دائیں کروٹ پر لیٹ جاؤ'' ظاہر ہے یہ حضرات مسجد ہی میں لیٹیں گے، لیٹنے کے لئے گھر نہیں جائیں گے ——— اور ایک قول یہ ہے کہ یہ لیٹنا تہجد گذاروں کے لئے سنت ہے، سب مسلمانوں کے لئے سنت نہیں، یہ فرق معقول ہے، اور احناف نے جو مباح کہا ہے اس میں سب شامل ہیں تہجد گذار بھی اور عام مسلمان بھی۔

[۱۹۷] بابُ ماجاء فی الإضطجاع بعد ركعتَي الفجر

[۴۳۰-] حدثنا بِشرُ بنُ معاذٍ العَقَدِيُّ، نا عبدُ الواحِدِ بنُ زيادٍ، نا الأعْمَشُ، عن أبی صَالِحٍ، عن أبی هريرةَ قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم " إذا صَلَّى أَحَدُكُمْ رَكْعَتَي الْفَجْرِ فَلْيَضْطَجِعْ على يَمِينِهِ"

وفی البابِ: عن عائشةَ، قال أبو عيسى: حديثُ أبی هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ غريبٌ مِن هٰذا الوجهِ.

[۴۳۱-] وقد رُوِیَ عن عائشةَ أنَّ النبیَّ صلى الله عليه وسلم كَانَ إِذَا صَلَّى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فی بَيْتِهِ اضْطَجَعَ على يَمِينِهِ.

وقد رَأَى بعضُ أهلِ العلمِ أنْ يُفعلَ هٰذا استِحبَابًا.

وضاحت: یہ حدیث غریب اس لئے ہے کہ عبدالواحد بن زیاد اس حدیث کے ساتھ متفرد ہیں، اعمش کا دوسرا کوئی شاگرد یہ قولی حدیث بیان نہیں کرتا۔ اسی لئے ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کو باطل قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے

ہیں: اس مسئلہ میں کوئی قولی حدیث ثابت نہیں، صرف فعلی روایات صحیح ہیں یعنی آپ کا معمول لیٹنے کا تھا (ابن القیم نے زاد المعاد میں ابن تیمیہ کا یہ قول ذکر کیا ہے) مگر امام ترمذی رحمہ اللہ وغیرہ حضرات نے اس تفرد کے باوجود حدیث کو فی نفسہ حسن صحیح قرار دیا ہے۔ بلکہ نووی رحمہ اللہ نے تو اس کو علی شرط الشیخین بتلایا ہے، اور امام اعمش رحمہ اللہ اگرچہ مدلس ہیں، مگر ابو صالح سے ان کی روایتیں سماع پر محمول کی گئی ہیں۔ اور حدیث کے مخاطب صرف تہجد گذار بندے ہیں۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے عام لوگوں کو اس کا مخاطب سمجھ لیا ہے اس لئے انھوں نے وہ سخت بات کہی ہے —— اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت (نمبر ۴۳۱) متفق علیہ روایت ہے مگر فی بیتہ کے لفظ سے روایت نظر سے نہیں گذری اگرچہ واقعہ گھر ہی کا ہے۔

بَابُ ماجاء إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فلاصَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ

تکبیر شروع ہونے کے بعد سنن ونوافل میں مشغول ہونا جائز نہیں

حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب نماز کھڑی کردی جائے یعنی اقامت شروع ہوجائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں''

تشریح: پیچھے ایک حدیث گذری ہے: بَیْنَ کُلِّ اَذَانَیْنِ صلاۃٌ لِمَنْ شَاءَ۔ وہ حدیث اور یہ حدیث ایک ہی مسئلہ سے متعلق ہیں، دونوں کو الگ الگ کردینے کی وجہ سے ان کو سمجھنا دشوار ہوگیا ہے۔ مؤذن حی علی الصلاۃ کہہ کر فرض نماز کے لئے بلاتا ہے پس کسی کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اذان کے بعد مسجد میں پہنچ کر تحیۃ المسجد، تحیۃ الوضو اور دیگر نوافل میں مشغول ہونا جائز نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ اللہ کے داعی کی مخالفت ہے کیونکہ مؤذن نے فرض نماز کے لئے بلایا ہے۔ بین کل أذانین صلاۃ میں اس شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے کہ اذان کے بعد بھی سنن پڑھ سکتے ہیں اور یہ اللہ کے داعی کی مخالفت نہیں کیونکہ وہ نماز کھڑی ہونے سے پہلے دوبارہ بلائے گا۔ رہی یہ بات کہ اذان کے بعد سنن ونوافل میں مشغول ہونا کب تک جائز ہے؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث میں اس کی حد بیان کی گئی ہے کہ جب مؤذن دوسری مرتبہ بلائے یعنی تکبیر شروع کرے تو اب نفلوں میں مشغول ہونا جائز نہیں۔ اب جماعت میں شامل ہونا ضروری ہے۔

غرض یہ دونوں حدیثیں ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں اور ان کو الگ الگ کردینے کی وجہ سے پہلی حدیث میں یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ مغرب کی اذان واقامت کے درمیان نفل ہیں یا نہیں؟ تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

اور اس حدیث سے دو اور مسئلے کھڑے ہوگئے ہیں:

ایک: اگر کوئی شخص نفل پڑھ رہا ہے اور اقامت شروع ہوجائے تو کیا حکم ہے؟ ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں: نماز توڑ

دے یعنی وہ جس رکن میں ہے وہیں سلام پھیر دے اور جماعت میں شامل ہو جائے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نفل نماز توڑنے سے اس کی قضا واجب نہیں ہوتی، اور احناف کے نزدیک نماز توڑنا جائز نہیں اور توڑنے کی صورت میں قضا واجب ہے، اور احناف کے نزدیک حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اقامت کے بعد نفل نماز شروع کرنا جائز نہیں، مگر جو شخص پہلے سے نفل پڑھ رہا ہے اس کا نفل میں مشغول رہنا حدیث شریف کے خلاف نہیں، البتہ اُسے چاہئے کہ پہلے قعدہ پر نماز پوری کر دے۔ اور جماعت میں شریک ہو جائے۔

دوسرا مسئلہ: یہ ہے کہ فجر کی اقامت شروع ہونے کے بعد بلکہ فرض شروع ہونے کے بعد بھی پہلے سنت پڑھنی چاہئے یا جماعت میں شامل ہونا چاہئے؟ چھوٹے دو اماموں کے نزدیک جماعت میں شامل ہونا ضروری ہے۔ سنت پڑھنا جائز نہیں۔ ان کا مستدل باب کی حدیث ہے۔ آنحضرت ﷺ نے تکبیر شروع ہو جانے کے بعد جماعت میں شامل ہونے کا حکم دیا ہے، لہٰذا اب سنت پڑھنا جائز نہیں ——— اور بڑے دو اماموں کے نزدیک اگر ایک رکعت اور دوسرا قول یہ ہے کہ قعدہ ملنے کی امید ہو تو پہلے سنت پڑھنی چاہئے پھر جماعت میں شریک ہونا چاہئے، وہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث عام مخصوص منہ البعض ہے، اس حدیث میں سے واجب اور فرض نماز کی تمام علماء نے تخصیص کی ہے، یعنی اگر کوئی صاحب ترتیب ہے اور اس نے عشاء کی نماز یا وتر نہیں پڑھے اور فجر کی جماعت شروع ہو جائے تو پہلے فرض اور واجب نماز پڑھنی ضروری ہے، اور جب عام میں ایک مرتبہ تخصیص ہو جاتی ہے تو وہ ظنی ہو جاتا ہے، اور ظنی ہونے کے بعد معمولی دلیل سے بھی حتی کہ قیاس سے بھی مزید تخصیص جائز ہے۔ چونکہ آنحضرت ﷺ فجر کی سنتوں کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے اور کبھی آپؐ نے ان کو ترک نہیں کیا اور ان کے بارے میں بہت تاکید فرمائی ہے (حتی کہ امام اعظم رحمہ اللہ کا ایک قول ان کے واجب ہونے کا بھی ہے) اس لئے بڑے دو اماموں نے اس حدیث کے عموم سے فجر کی سنتوں کو بھی خاص کیا ہے۔ مگر جماعت خانہ میں یعنی جس جگہ جماعت ہو رہی ہے سنتیں پڑھنا جائز نہیں یہ صورۃً جماعت کی مخالفت ہے، اس لئے سنتیں گھر پر یا مسجد کے دروازے پر یعنی فناء مسجد میں، یا مسجد سے باہر کسی جگہ پڑھے۔ اسی طرح اگر مسجد صیفی (صحنِ مسجد) اور شتوی (اصل مسجد) الگ الگ ہیں اور جماعت کسی ایک حصہ میں ہو رہی ہے تو دوسرے حصہ میں سنت پڑھ سکتا ہے، اور اگر کوئی علحدہ جگہ نہ ہو تو پھر سنت نہ پڑھے جماعت میں شریک ہو جائے۔ احناف اس سلسلہ میں کوتاہی کرتے ہیں، جہاں جماعت ہو رہی ہے وہیں سنتیں پڑھتے ہیں، یہ حنفی مذہب نہیں ہے، اس کا لحاظ رکھا جائے۔

[۱۹۸] بابُ ماجاء إذا أُقیمتِ الصلاۃُ فلا صلاۃ إلا المکتوبۃ

[۴۳۲-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِیعٍ، نا رَوْحُ بنُ عُبادۃَ، نازکریاَ بنُ إسحاق، نا عَمْرُو بنُ دِینَارٍ، قال:

سمعتُ عطاءَ بنَ يسارٍ، عن أبى هريرةَ قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم" إِذَا أُقِيْمَتِ الصَّلاَةُ فَلاَ صَلاَةَ إِلاَّ الْمَكْتُوْبَةَ"

وفى الباب: عن ابنِ بُحَيْنَةَ، وعبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، وعبدِ اللهِ بنِ سَرْجِسَ، وابنِ عباسٍ، وأنسٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ أبى هريرةَ حديثٌ حسنٌ؛ وهكذا رَوَى أيوبُ، ووَرْقَاءُ بنُ عُمَرَ، وزيادُ بنُ سَعْدٍ، وإسماعيلُ بنُ مسلمٍ، ومحمدُ بن جُحَادةَ، عن عَمْرِو بنِ دينارٍ، عن عطاءِ بنِ يسارٍ، عن أبى هريرةَ عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم؛ ورَوَى حَمَّادُ بنُ زَيْدٍ، وسُفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ، عن عَمرِو بنِ دِيْنَارٍ ولَمْ يَرْفَعَاهُ؛ والحديثُ المَرْفُوْعُ أَصَحُّ عندنا.

وقد رُوِيَ هذا الحديثُ عن أبى هريرةَ عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم مِن غير هذا الوَجْهِ: رَوَاهُ عَيَّاشُ بنُ عَبَّاسٍ القِتْبَانِيُّ المِصْرِيُّ، عن أبى سَلَمَةَ، عن أبى هريرةَ عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم.

والعَمَلُ على هذا عندَ أهلِ العلمِ من أصحابِ النبىِّ صلى الله عليه وسلم وغيرِهم: إِذَا أُقِيْمَتِ الصلاةُ أَنْ لاَيُصَلِّيَ الرجلُ إِلاَّ المكتوبةَ، وبه يقولُ سفيانُ الثوريُّ وابنُ المباركِ والشافعيُّ وأحمدُ وإسحاقُ.

وضاحت: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث مرفوع ہے اور صحیح ہے، بخاری کے علاوہ تمام کتب میں مروی ہے، مسلم شریف میں بھی ہے، مگر چونکہ روات میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہے یا موقوف؟ اس لئے امام ترمذی رحمہ اللہ نے ڈر کر صرف حسن کا فیصلہ کیا ہے۔ اس حدیث کو جس طرح عمرو بن دینار کے شاگرد زکریا بن اسحاق نے مرفوع کیا ہے اسی طرح ایوب وغیرہ دوسرے پانچ تلامذہ نے بھی مرفوع کیا ہے، مگر حماد بن زید اور سفیان بن عیینہ نے اس کو عمرو بن دینار سے موقوف روایت کیا ہے یعنی اس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول قرار دیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ حدیث مرفوع ہے، آپ نے یہ فیصلہ اپنے مزاج کے خلاف کیا ہے اور یہی فیصلہ صحیح ہے۔ اور اس حدیث کی ایک دوسری سند بھی ہے وہ یہ ہے: عیاش بن عباس قتبانی مصری: ابو سلمۃ سے، وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں اس سند سے بھی یہ حدیث مرفوع ہے، پس یہ شاہد ہے اور اس حدیث پر صحابہ وغیرہ کا عمل ہے کہ جب نماز کے لئے اقامت کہی جائے تو آدمی فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہ پڑھے۔ اور یہی قول سفیان ثوری، ابن المبارک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا ہے (امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا مسلک بیان نہیں کیا نہ اس کے لئے باب قائم کیا، کیونکہ اس سلسلہ میں کوئی صریح حدیث نہیں ہے)

بابُ ماجاء فِيمَنْ تفُوْتُهُ الرَّكْعَتانِ قَبْلَ الفَجْرِ يُصَلِّيهِمَا بَعْدَ صَلاَةِ الصُّبْحِ

اگر فجر کی سنتیں رہ جائیں تو ان کو فرضوں کے بعد پڑھے

جس شخص نے فجر کی سنتیں نہ پڑھی ہوں تو کیا وہ فرض ادا کرنے کے بعد سورج نکلنے سے پہلے ان کو پڑھ سکتا ہے؟ جمہور اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول قدیم یہ ہے کہ نہیں پڑھ سکتا اس لئے کہ فجر اور عصر کے بعد نوافل ممنوع ہیں اور سنن مؤکدہ بھی نفل ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول جدید یہ ہے کہ پڑھ سکتا ہے، قول جدید کی دلیل باب کی حدیث ہے۔ اور جمہور کہتے ہیں کہ یہ حدیث منقطع ہے اور محکم الدلالۃ بھی نہیں یعنی اس کی دلالت قطعی نہیں اس کے بالمقابل عصر اور فجر کے بعد نوافل کی ممانعت والی روایات تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں وہ ثبوت کے اعتبار سے بھی قطعی ہیں اور دلالت کے اعتبار سے بھی محکم ہیں۔ اس لئے باب کی حدیث سے استدلال درست نہیں۔

حدیث: حضرت قیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے پس نماز کے لئے اقامت کہی گئی، میں نے آپؐ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی، سلام پھیرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر بیٹھے، آپؐ نے مجھے دیکھا کہ میں نماز پڑھ رہا ہوں جب میں نماز سے فارغ ہوکر جانے لگا تو آپؐ نے فرمایا: ''قیس! ٹھہرو، یہ ڈبل ڈبل نماز کیسی؟'' یعنی تم نے فرضوں کے بعد کونسی نماز پڑھی؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے فجر کی سنتیں نہیں پڑھی تھیں، فرض نماز کے بعد میں نے وہ سنتیں پڑھیں، آپؐ نے فرمایا: فَلَا إِذًا (إِذًا کو نون کے ساتھ إِذَنْ لکھنا بھی درست ہے اور تنوین کے ساتھ بھی)

تشریح: یہ حدیث منقطع ہے اس لئے کہ محمد بن ابراہیم تیمی کا حضرت قیس رضی اللہ عنہ سے لقاء وسماع نہیں۔ نیز سعد بن سعید کے دوسرے شاگرد عطاء بن ابی رباح اس حدیث کو مرسل بیان کرتے ہیں یعنی حدیث میں حضرت قیس رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں کرتے، بلکہ محمد بن ابراہیم حضرت قیس کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ اور وہ تابعی ہیں۔ واقعہ پیش آیا اس وقت وہ مجلس میں موجود نہیں تھے علاوہ ازیں اس حدیث کی دلالت بھی قطعی نہیں۔ کیونکہ فلا إِذَنْ کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف ہوا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ''پس کوئی بات نہیں'' یعنی اگر تم نے سنتیں نہیں پڑھیں تو کوئی حرج نہیں۔ فرض پڑھنے کے بعد سنتیں پڑھ سکتے ہو۔ اور جمہور اس لفظ کا ترجمہ کرتے ہیں: ''تو بھی نہیں'' یعنی اگرچہ فجر کی سنتیں نہیں پڑھیں تو بھی فرض نماز کے بعد پڑھنا جائز نہیں۔

غرض اس حدیث کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف ہوا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے جو معنی کئے ہیں اس کا قرینہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ حدیث ابن ماجہ اور ابوداؤد میں ہے وہاں فلا إذن کے بجائے فسَكَتَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم ہے، اور مصنف عبدالرزاق میں: فَمَضَى ولم يقل شيئًا ہے، اور بیہقی میں: فسكت النبي صلى الله عليه

وسلم ولم ینکِر علیہ ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے ان مختلف الفاظ کی روشنی میں فلا إذن کا ترجمہ کیا: ''پس کوئی بات نہیں'' کیونکہ ایک حدیث دوسری حدیث کی شرح کرتی ہے۔

دیگر ائمہ کہتے ہیں: یہ قاعدہ کہ ایک حدیث دوسری حدیث کی شرح کرتی ہے بالکل صحیح ہے، مگر تمام قواعد کلیہ عُکّازۃ العُمیان (اندھے کی لاٹھی) ہوتے ہیں یعنی قاعدے اپنی جگہ صحیح ہوتے ہیں مگران کو جاری کرنے میں غلطی ہوجاتی ہے۔ امام شافعیؒ نے جو یہ قاعدہ یہاں جاری کیا وہ ٹھیک نہیں، کیونکہ اس قاعدہ کا مصداق وہ صورت ہے جب دو روایتیں الگ الگ ہوں، ایک مجمل ہو دوسری مفصل یا بالکل ہی الگ ہوں جیسے ایک حدیث میں ہے کہ جب زانی زنا کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں رہتا اور دوسری حدیث میں ہے کہ کسی بھی مسلمان کو کسی بھی گناہ کی وجہ سے اسلام سے باہر مت کرو (لا تکفرہ بذنب، ولا تخرجہ من الإسلام بعمل، ابوداؤد حدیث ۲۵۳۲) یہاں دوسری روایت پہلی روایت کی شرح کرے گی اور اس کی روشنی میں پہلی حدیث کا مطلب طے کیا جائے گا، اور تطبیق بھی ایک طرح کی شرح اور وضاحت ہے۔ اور مسئلۂ باب میں دو الگ الگ روایتیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی روایت ہے جو مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے، پس یہ روایت بالمعنی ہے۔ راوی نے حدیث کا جو مطلب سمجھا اس کے مطابق اس نے روایت کردیا، ایسی جگہوں میں مجتہدین کو اپنی مجتہدانہ صلاحیتیں بروئے کار لاکر یہ طے کرنا ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کے اصلی الفاظ کیا ہونگے؟ انہی الفاظ پر مسئلہ کا مدار رکھا جائے گا۔ اور اگر یہ بات معلوم نہ ہوسکے کہ آنحضور ﷺ کے اصل الفاظ کونسے ہیں نہ یقین کے درجہ میں اور نہ ظن غالب کے درجہ میں تو پھر اس حدیث سے مسئلہ مستنبط نہیں کیا جاسکتا، مگر اس کی کوئی مثال نہیں۔

اور حدیث مذکور میں ظن غالب یہ ہے کہ اصل لفظ فلا إذن ہی ہے اور دلیل یہ ہے کہ ہر متکلم کے لئے کچھ الفاظ اور محاورات ہوتے ہیں جس کو وہ بکثرت استعمال کرتا ہے۔ نبی ﷺ نے متعدد حدیثوں میں یہی محاروہ استعمال کیا ہے۔ پس یہاں بھی یہی لفظ اصل ہے، باقی تمام الفاظ روایت بالمعنی ہیں۔ پس مسئلہ کا مدار اسی لفظ پر رکھا جائے گا اور دیگر روایات میں اس لفظ کے جو معنی ہیں وہی معنی یہاں بھی لینے ہونگے، دیگر حدیثوں میں اس لفظ کے معنی متعین ہیں وہاں کوئی اختلاف نہیں، مثلاً متفق علیہ حدیث ہے کہ حضرت بشیرؓ نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے حضرت نعمان رضی اللہ عنہ کو ایک غلام ہبہ کیا اور اس ہبہ پر آنحضور ﷺ کو گواہ بنانا چاہا، آپؐ نے فرمایا: کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ تمہاری ساری اولاد تمہارے ساتھ یکساں حسن سلوک کرے؟ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ضرور یہ بات چاہتا ہوں آپؐ نے فرمایا: فلا إذَنْ۔ یہاں اس محاورے کے معنی ''تو نہیں'' متعین ہیں یعنی جب تم یہ چاہتے ہو تو صرف ایک لڑکے کو ہبہ مت کرو، ہبہ کرنا ہے تو سب کو یکساں دو[1] (مشکوٰۃ حدیث ۳۰۱۹)

---

(۱) یہاں یہ سوال نہیں ہونا چاہئے کہ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ تو غلام ہبہ کرچکے تھے اور ہبہ لوٹانا جائز نہیں پس آنحضرت ﷺ نے غلام واپس لینے کا حکم کیوں دیا؟ کیونکہ یہ تشریع (قانون سازی) کے وقت کی ترخیص ہے۔

اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر حج سے فارغ ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اس وقت حضرت صفیہ بنت حُیَی رضی اللہ عنہا رو رہی تھیں میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! صفیہ کے ایام شروع ہوگئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: کیا وہ ہمیں روک دیں گی؟ یعنی ان کی وجہ سے سارے قافلہ کو رک جانا پڑے گا؟ آپؐ کا خیال تھا کہ حضرت صفیہؓ نے ابھی تک طواف زیارت نہیں کیا، ازواج مطہرات نے عرض کیا: انھوں نے طواف زیارت تو کرلیا ہے آپؐ نے فرمایا: فلا إذًا یہاں بھی ''تو نہیں'' کے معنی متعین ہیں دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ یعنی اگر صفیہؓ طواف زیارت کرچکی ہیں تو اب قافلہ کو رکنا نہیں پڑے گا کیونکہ حائضہ پر طواف وداع نہیں۔

غرض دو باتیں متعین ہیں: ایک یہ کہ آنحضور ﷺ کے محاورات میں یہ لفظ (فلا إذن) موجود ہے اس لئے ظن غالب یہ ہے کہ یہاں بھی اصل لفظ یہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سب جگہ اس لفظ کے معنی ''تو نہیں'' متعین ہیں پس وہی معنی یہاں بھی لینے ہونگے اور یہ معنی لینے کی صورت میں امام شافعی رحمہ اللہ کا اس حدیث سے استدلال درست نہیں رہتا اس لئے صحیح قول جمہور ہی کا ہے۔ واللہ اعلم

[۱۹۹] بابُ ماجاء فيمن تفوته الركعتان قبل الفجرِ يصليهما بعد صلاة الصبح

[٤٣٣-] حدثنا محمدُ بنُ عَمْرٍو السَّوَّاقُ، نا عبدُ العزيزِ بنُ محمدٍ، عن سَعْدِ بنِ سَعِيدٍ، عن محمدِ بنِ إبراهيمَ، عن جَدِّهِ قَيْسٍ، قال: خَرَجَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم فَأُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَصَلَّيْتُ مَعَهُ الصُّبْحَ ثم انْصَرَفَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم، فَوَجَدَنِيْ أُصَلِّيْ، فَقَالَ: "مَهْلاً يا قَيْسُ! أَصَلاَتَانِ مَعًا؟" قلتُ: يارسولَ اللهِ! إِنِّيْ لَمْ أَكُنْ رَكَعْتُ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ، قال: "فَلَا إِذَنْ"

قال أبو عيسى: حديثُ محمدِ بنِ إبراهيمَ لاَنَعْرِفُهُ مِثْلَ هٰذا إِلاَّ مِنْ حَدِيثِ سَعْدِ بنِ سَعِيدٍ.

وقال سُفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ: سَمِعَ عطاءُ بنُ أَبِي رَبَاحٍ مِنْ سَعْدِ بنِ سَعِيدٍ هٰذا الحديثَ، وإِنَّمَا يُرْوَى هٰذا الحديثُ مُرْسَلاً.

وقد قالَ قَوْمٌ مِنْ أَهْلِ مَكَّةَ بهذا الحديثِ: لَمْ يَرَوْا بَأْسًا أَنْ يُصَلِّيَ الرجلُ الركعتَيْنِ بعدَ المكتُوْبَةِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ.

قال أبو عيسى: وسَعْدُ بنُ سَعِيدٍ هُوَ أَخُو يَحْيَى بنِ سعيدٍ الأَنْصَارِيِّ، وقَيْسٌ هُوَ جَدُّ يَحيى بنِ سعيدٍ، ويُقَالُ هُوَقَيْسُ بنُ عَمْرٍو، ويُقَالُ هُوَ قَيْسُ بنُ قَهْدٍ.

وإِسْنَادُ هٰذا الحديثِ ليسَ بِمُتَّصِلٍ، محمدُ بنُ إبراهيمَ التيميُّ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ قَيْسٍ، وَرَوَى بَعْضُهم هٰذا الحديثَ عن سَعْدِ بنِ سَعِيدٍ عن محمدِ بنِ إبراهيمَ أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم خَرَجَ فَرَأَىْ قَيْسًا.

ترجمہ اور وضاحت: سند میں عن جدّہٖ قیسٍ میں ضمیر خلافِ قاعدہ سعد بن سعید کی طرف لوٹتی ہے یعنی حضرت قیس: محمد بن ابراہیم تیمی کے دادا نہیں ہیں بلکہ سعد بن سعید کے دادا ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: محمد بن ابراہیم کی حدیث کو ہم اس طرح صرف سعد بن سعید کی سند سے جانتے ہیں، یعنی سعد بن سعید سے اوپر اس کی صرف یہی ایک سند ہے۔ اور سفیان بن عیینہ کہتے ہیں: یہ حدیث سعد بن سعید سے عطاء بن ابی رباح نے بھی سنی ہے یعنی سعد سے نیچے تو اور بھی سند ہے، مگر اوپر یہی ایک سند ہے۔ اور یہ حدیث مرسل ہی روایت کی جاتی ہے، یعنی حدیث کے آخر میں حضرت قیس رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں ہے، اور بعض اہل مکہ (یعنی امام شافعی رحمہ اللہ جن کی ولادت مکہ میں ہوئی ہے) اس حدیث کو لیتے ہیں وہ اس میں کچھ حرج نہیں سمجھتے کہ آدمی فجر کے فرض پڑھنے کے بعد سورج نکلنے سے پہلے دو رکعتیں (سنتیں) پڑھے —— امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سعد بن سعید حضرت یحییٰ بن سعید انصاری کے بھائی ہیں، اور قیس: یحییٰ بن سعید انصاری کے دادا ہیں (پس وہ سعد بن سعید کے بھی دادا ہیں) اور قیس کے والد کے نام میں اختلاف ہے، کہا جاتا ہے کہ ان کے والد کا نام عمرو ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کے والد کا نام قہد ہے، اور اس حدیث کی سند متصل نہیں ہے۔ محمد بن ابراہیم تیمی کا حضرت قیس سے سماع نہیں، اور بعض حضرات نے اس حدیث کو سعد بن سعید سے، انھوں نے محمد بن ابراہیم سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر تشریف لائے پس آپ نے قیس کو دیکھا (الی آخرہ یعنی حدیث مرسل ہے، محمد بن ابراہیم نے حضرت قیس کا واقعہ بیان کیا ہے روایت نہیں کی)

بابُ ماجاء فی إعَادَتِهِمَا بَعْدَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ

سورج نکلنے کے بعد فجر کی سنتیں پڑھنے کا بیان

ائمہ ثلاثہ اور امام محمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص فجر کی سنتیں نہ پڑھ سکا ہو تو سورج نکلنے کے بعد جب مکروہ وقت گذر جائے تو زوال سے پہلے تک سنتیں پڑھ لے۔ یہ سنتوں کی قضاء نہیں ہے بلکہ ان کا بدل ہے، کیونکہ قضا فرض اور واجب نماز کی ہوتی ہے اور یہ دو رکعتیں مفتی بہ قول کے مطابق سنت ہیں، اس کی نظیر تہجد کی نماز ہے، آنحضرت ﷺ جب کسی عذر کی وجہ سے تہجد نہیں پڑھتے تھے تو دن میں بارہ رکعت پڑھ لیتے تھے۔ یہ تہجد کا بدل تھا، اس کی قضا نہیں تھی، اور چونکہ آپؐ رات میں تہجد لمبے پڑھتے تھے اور دن میں لمبے نوافل پڑھنے کا آپ کا معمول نہیں تھا کیونکہ دن کے مزاج میں انقباض ہے اور رات کے مزاج میں انبساط ہے اس لئے آپ بدل میں چار رکعت زائد یعنی بارہ رکعت پڑھتے تھے تاکہ اس طول کی تلافی ہو جائے۔ اور شیخین یعنی امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ سے اس سلسلہ میں کچھ مروی نہیں اس لئے علماء نے فرمایا ہے کہ اس مسئلہ میں امام محمد رحمہ اللہ کے قول پر عمل کرنا چاہئے۔

[٢٠٠] بابُ ماجاء فی إعادتِهِمَا بعد طلوع الشمس

[٤٣٤-] حدثنا عقبةُ بنُ مُكْرَمٍ العَمِّيُّ البِصْرِيُّ، نا عَمْرُو بنُ عاصِمٍ، نا هَمَّامٌ، عن قَتَادَةَ، عن النَّضْرِ بنِ أَنَسٍ، عن بَشِيْرِ بنِ نَهِيْكٍ، عن أبی هريرةَ، قال: قالَ رسولُ الله صلی الله علیه وسلم: "مَنْ لَمْ يُصَلِّ رَكْعَتَيِ الفَجْرِ فَلْيُصَلِّهِمَا بَعْدَ مَا تَطْلُعُ الشمسُ"

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ لَانَعْرِفُهُ إِلاَّ مِنْ هٰذَا الوَجْهِ، وقد رُوِيَ عن ابنِ عُمَرَ أَنَّهُ فَعَلَهُ، والعَمَلُ على هٰذا عِنْدَ بعضِ أهلِ العلمِ؛ وبه يقولُ سفيانُ الثوريُّ، والشافعيُّ، وأحمدُ، وإسحاقُ، وابنُ المبارَكِ.

قال: ولَانَعْلَمُ أَحَدًا رَوَى هٰذَا الحديثَ عن هَمَّامٍ بِهٰذَا الإِسْنَادِ نَحْوَ هٰذَا إِلاَّ عَمْرُو بنُ عَاصِمٍ الكِلَابِيُّ؛ والمَعْرُوْفُ مِنْ حديثِ قَتَادَةَ، عن النَّضْرِ بنِ أَنَسٍ، عن بَشِيْرِ بنِ نَهِيْكٍ، عن أبی هريرةَ، عن النبیِّ صلی الله علیه وسلم، قال: "مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ"

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) نہیں پڑھیں تو چاہئے کہ وہ ان دونوں کو سورج نکلنے کے بعد پڑھ لے"

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کو ہم نہیں جانتے مگر اسی سند سے (یعنی عمرو بن عاصم کلابی سے اوپر اس کی صرف یہی ایک سند ہے، امام ترمذیؒ نے اس حدیث پر کوئی حکم نہیں لگایا کہ یہ روایت کس درجہ کی ہے) اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے ایسا کیا (یعنی ان کی فجر کی سنتیں رہ گئیں تھیں تو ان کو سورج نکلنے کے بعد پڑھا۔ یہ روایت موطا مالک ص ۴۵ فی رکعتی الفجر میں ہے) اور اس حدیث پر بعض اہل علم کا عمل ہے اور اسی کے سفیان ثوری، شافعی، احمد، اسحاق اور ابن المبارک رحمہم اللہ قائل ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے یہ حدیث ہمام سے اس سند سے اس کے مانند روایت کی ہو سوائے عمرو بن عاصم کلابی کے (یہ تکرار ہے اور یہ راوی صدوق ہے مگر حافظہ میں خرابی تھی اور مذکورہ مضمون یہی راوی تنہا روایت کرتا ہے) اور قتادہ کی مذکورہ سند سے محدثین کے نزدیک جو متن معروف ہے وہ یہ ہے کہ جس نے سورج نکلنے سے پہلے نماز فجر کی ایک رکعت پالی اس نے صبح کی نماز پالی (پس عمرو بن عاصم کی روایت شاذ ہے)

فائدہ: علامہ کشمیری قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ حضرت قتادہ کی اس سند سے بیس روایتیں مروی ہیں مگر کسی سند سے من أدرك ركعة من صلاة الصبح والا متن مروی نہیں (تفصیل کے لئے معارف السنن (۴:۱۰۰ اور ۲:۱۵۳) دیکھیں یعنی جوبات امام ترمذیؒ نے فرمائی ہے اس کے بالکل برعکس شاہ صاحب نے دعوی کیا ہے)

بابُ ماجاءَ فی الْأَرْبَعِ قَبْلَ الظُّهْرِ

ظہر سے پہلے چار رکعت سنتِ مؤکدہ کا بیان

علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ نے اکثر ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھی ہیں اور کبھی دو رکعتیں بھی پڑھی ہیں۔ علامہ کشمیری قدس سرہٗ نے اس کو معتدل قول قرار دیا ہے، اور گذشتہ ابواب میں یہ بات بتا چکا ہوں کہ ظہر سے پہلے چار رکعت سنت مؤکدہ کی بھی روایت ہے اور دو رکعت کی بھی، اور دونوں صحیح ہیں۔ چار کامل سنت ہیں اور دو بھی سنت ہیں۔ لہٰذا ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھنی چاہئیں، اور اگر وقت میں تنگی ہو یا موقع نہ ہو تو دو پڑھنا بھی درست ہے۔ اور جب چار پڑھے تو ایک سلام سے پڑھے یہی نبی ﷺ کی اصل سنت ہے اور دو سلام سے پڑھے تو بھی سنت پر عمل ہو جائے گا۔ اس میں زیادہ جھگڑنا نہیں چاہئے۔

[۲۰۱] بابُ ماجاء فی الأربع قبل الظهر

[۴۳۵-] حدثنا بُنْدَارٌ، نا أبو عامرٍ، نا سفيانُ، عن أَبِی إِسْحَاق، عن عاصمِ بنِ ضَمْرَةَ، عن عليٍّ، قال كانَ النبیُّ صلی الله عليه وسلم يُصَلِّیْ قَبْلَ الظُّهْرِ أَرْبَعًا، وبَعْدَهَا رَكْعَتَيْنِ.

وفی الباب: عن عائشةَ وأُمِّ حبيبةَ؛ قال أبو عيسى: حديثُ عليٍّ حديثٌ حسنٌ.

حدثنا أبوبكرٍ العَطَّارُ، قال: قال عليُّ بنُ عبدِ اللهِ، عن يحيىَ بنِ سعيدٍ، عن سفيانَ، قال: كُنَّا نَعْرِفُ فَضْلَ حديثِ عاصمِ بنِ ضَمْرَةَ عَلَى حديثِ الحارثِ.

والعَمَلُ على هذا عندَ أكثرِ أهلِ العلمِ مِنْ أَصحابِ النبیِّ صلی الله عليه وسلم ومَنْ بَعدَهُمْ: يَخْتَارُوْنَ أَنْ يُصَلِّيَ الرَّجُلُ قَبْلَ الظهرِ أَرْبَعَ رَكْعَاتٍ، وَهُوَ قَوْلُ سفيانَ الثوریِّ، وابنِ المباركِ وإسحاق.

وقالَ بعضُ أهلِ العلمِ: صلاةُ الليلِ وَالنَّهَارِ مَثْنَى مَثْنَى، يَرَوْنَ الْفَصْلَ بَيْنَ كلِّ رَكعَتَيْنِ، وبه يقولُ الشافعیُّ وأحمدُ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور ظہر کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث حسن ہے (عاصم بن ضمرۃ اور حارث اعور دونوں حضرت علی سے بکثرت روایتیں کرتے ہیں اور دونوں کا حافظہ کمزور تھا۔ نیز دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اقوال کو حدیث مرفوع بھی کر دیا کرتے تھے اور حارث: عاصم سے زیادہ کمزور ہیں) سفیان ثوری کہتے ہیں: ہم حارث کی حدیث پر عاصم کی حدیث کی برتری پہچانتے تھے (یعنی عاصم کی حدیثیں حارث کی حدیثوں سے اچھی ہوتی ہیں) اور اس پر اکثر صحابہ اور بعد کے علماء کا عمل ہے وہ یہ بات پسند کرتے

ہیں کہ آدمی ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھے۔ اور یہ سفیان ثوری، ابن المبارک اور اسحاق رحمہم اللہ کا قول ہے (یہی حنفیہ کا قول ہے) اور بعض اہل علم کہتے ہیں کہ رات اور دن کی نفلیں دو دو، دو دو ہیں (یہ مسئلہ چند ابواب کے بعد آرہا ہے) ان کے نزدیک ہر دو رکعتوں کے درمیان فصل کرنا بہتر ہے اور یہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا قول ہے۔

بابُ ماجاء فی الرَّکْعَتَیْنِ بَعْدَ الظُّھْرِ

ظہر کے بعد دو سنتِ مؤکدہ کا بیان

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ظہر کے بعد چار رکعت ہیں اور وہ چاروں مندوب (مستحب) ہیں۔ باقی ائمہ کے نزدیک دو رکعت سنتِ مؤکدہ ہیں اور دو رکعت مندوب۔

[۲۰۲] بابُ ماجاء فی الرکعتین بعد الظھر

[۴۳۶-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِیعٍ، نا إسماعیلُ بنُ إبراھیمَ، عن أیوبَ، عن نافعٍ، عن ابنِ عمرَ، قال: صَلَّیْتُ مَعَ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم رَکْعَتَیْنِ قَبْلَ الظُّھْرِ، وَرَکْعَتَیْنِ بَعْدَھَا.

قال: وفی البابِ عن علیٍّ، وعائشۃَ، قال أبو عیسی: حدیثُ ابنِ عمرَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

ترجمہ: ابن عمرؓ کہتے ہیں: میں نے ظہر سے پہلے نبی ﷺ کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں اور ظہر کے بعد دو رکعتیں (معیت صرف تعداد میں ہے) یہ حدیث اعلی درجہ کی صحیح ہے، اس لئے ظہر سے پہلے بھی دو رکعتیں پڑھنا بھی درست ہے، مگر کامل سنت چار رکعتیں ہیں۔

بابٌ آخَرُ

ظہر سے پہلے کی سنتیں رہ جائیں تو ان کو بعد میں پڑھے

اگر کوئی شخص ظہر سے پہلے چار یا دو سنتیں نہ پڑھ سکا ہو تو ظہر کے بعد اُسے چار رکعتیں اور موقع نہ ہو تو دو رکعتیں پڑھ لینی چاہئیں۔ اور چاہئے کہ پہلے ظہر کے بعد والی سنتیں پڑھے پھر پہلے والی سنتیں پڑھے، کیونکہ جو گاڑی لیٹ ہوگئی: ہوگئی، بروقت کو لیٹ نہیں کرنا چاہئے۔ علاوہ ازیں شریعت نے کسی مصلحت سے فرضوں کے بعد ان کے مانند نوافل نہیں رکھے، تاکہ ناظر اس شبہ میں مبتلا نہ ہو کہ مصلی نے نماز کا اعادہ کیا اور امام کے ساتھ پڑھی ہوئی نماز کا اعتبار نہ کیا، کیونکہ یہ شکایت امام (حاکم وقت) تک پہنچ گئی تو گردن نپ جائے گی، اس لئے بھی پہلے دو سنتیں پڑھے پھر چار۔

پہلی حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب ظہر سے پہلے چار رکعتیں نہیں

پڑھ سکتے تھے تو ان کو ظہر کے بعد پڑھا کرتے تھے۔

تشریح: یہ حدیث ٹھیک ہے مگر غریب ہے کیونکہ ابن المبارک سے آخر تک اس کی یہی ایک سند ہے اور اس حدیث کو خالد حذاء سے شعبہ رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے پھر ان سے صرف قیس روایت کرتے ہیں یعنی یہ دوسری سند بھی غریب ہے۔ اور عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ (کبیر) سے بھی یہ مضمون مروی ہے، مگر یہ سند بھی مرسل ہے۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص پابندی سے ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور ظہر کے بعد چار رکعتیں پڑھے اس پر اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ حرام کردیتے ہیں'' (امام مالک رحمہ اللہ نے اس حدیث کی بناء پر فرمایا ہے کہ ظہر کے بعد چار رکعتیں ہیں اور چاروں ایک درجہ کی ہیں مگر جمہور کے نزدیک ان میں سے دو سنت مؤکدہ ہیں اور دو غیر مؤکدہ) یہ حدیث بھی ٹھیک ہے، مگر ایک ہی سند سے مروی ہونے کی وجہ سے غریب ہے، البتہ اس کی ایک اور سند بھی ہے جس کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے، وہ باب کی تیسری حدیث (نمبر ۴۳۹) ہے۔ اس کا بھی یہی مضمون ہے۔ اس حدیث کو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے صرف ان کے بھائی عنبسہ روایت کرتے ہیں، پھر نیچے اس کی متعدد سندیں ہیں۔

[۲۰۳] بابٌ آخر

[۴۳۷-] حدثنا عبدُ الوارِثِ بنُ عُبَيْدِ اللهِ العَتَكِيُّ المَرْوَزِيُّ، نا عبدُ اللهِ بنُ المباركِ، عن خالِدٍ الحَذَّاءِ، عن عبدِ اللهِ بنِ شَقِيقٍ، عن عائشةَ أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كان إِذَالَمْ يُصَلِّ أَرْبَعًا قَبْلَ الظُّهْرِ صَلَّاهُنَّ بَعْدَهَا.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ، إِنَّمَا نَعْرِفُهُ مِنْ حَدِيثِ ابنِ المبارَكِ مِنْ هٰذا الوجهِ؛ ورَوَاهُ قَيْسُ بنُ الربيعِ، عن شُعْبَةَ، عن خالدٍ الحَذَّاءِ نَحوَ هذا، ولا نَعْلَمُ أَحَدًا رَوَاهُ عن شُعبة غيرُ قَيْسِ بنِ الرَّبِيْعِ.

وقد رُوِيَ عن عبدِ الرحمنِ بنِ أبي لَيْلَى عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم نحوُ هذا.

[۴۳۸-] حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نايزيدُ بنُ هارونَ عن محمدِ بنِ عبدِ اللهِ الشُّعَيْثِيِّ، عن أبيهِ، عن عَنبَسَةَ بنِ أَبِي سُفيانَ، عن أُمِّ حَبِيْبَةَ، قالتْ: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: ''مَنْ صَلَّى قَبْلَ الظُّهْرِ أَرْبَعًا وَبَعْدَهَا أَرْبَعًا حَرَّمَهُ اللهُ على النَّارِ''

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ، وقد رُوِيَ مِن غَيْرِ هٰذا الوَجْهِ.

[۴۳۹-] حدثنا أبوبَكْرٍ محمدُ بنُ إسحاقَ البَغْدَادِيُّ، حدثنا عبدُ اللهِ بنُ يُوْسُفَ التِّنِّيسِيُّ الشَّامِيُّ، حدثنا الهَيْثَمُ بنُ حُمَيْدٍ، قال: أَخْبَرَنِي العَلَاءُ بنُ الحَارِثِ، عن القاسِمِ أبي عبدِ الرحمنِ، عن عَنْبَسَةَ بنِ

أبي سُفيانَ، قال: سمعتُ أُختي أمَّ حبيبةَ زَوْجَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، تَقُولُ: سمعتُ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يقولُ: "مَنْ حَافَظَ عَلَى أَرْبَعِ رَكْعَاتٍ قَبْلَ الظُّهْرِ وَأَرْبَعٍ بَعْدَهَا حَرَّمَهُ اللّٰهُ على النَّارِ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ غريبٌ مِن هذا الوجهِ.

والقاسمُ: هو ابنُ عبدِالرحمنِ، يُكْنَى أبا عبدِ الرحمنِ، وهو مَوْلَى عبدِ الرحمنِ بن خالدِ بنِ يزيدَ بنِ معاويةَ، وهو ثِقَةٌ شامِيٌّ وهو صاحِبُ أبي أُمَامَةَ.

وضاحت: عنبسہ بن ابی سفیان حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے چھوٹے بھائی ہیں اور تابعی ہیں اوران کی وفات حضرت معاویہ سے پہلے ہوئی ہے، اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کی دو سندیں ہیں، امام ترمذی رحمہ اللہ نے دونوں سندوں سے حدیث روایت کی ہے۔ اور پہلی سند کو صرف حسن قرار دیا ہے اور دوسری کو حسن صحیح کہا ہے، مگر دونوں سندیں غریب ہیں۔ کیونکہ اس کو عنبسہ ہی روایت کرتے ہیں۔

اور یہ قاسم: حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پوتے (جو مدینہ کے فقہاء سبعہ میں سے ہیں) نہیں ہیں اُن کے والد کا نام عبدالرحمٰن ہے اوران قاسم کی کنیت ابوعبدالرحمٰن ہے۔ یہ قاسم: یزید کے پوتے عبدالرحمٰن بن خالد کے مولیٰ (آزاد کردہ) ہیں۔ شام کے باشندے تھے اور ثقہ ہیں، اور حضرت ابوامامہ کے خاص شاگرد ہیں۔

بابُ ماجاء في الأَرْبَعِ قَبْلَ العَصْرِ

عصر سے پہلے چار نفلوں کا بیان

پہلی حدیث: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضور ﷺ عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے، ان کے درمیان جدائی کیا کرتے تھے، مقرب فرشتوں پر اور جن مؤمنین اور مسلمین نے ان کی پیروی کی ہے ان پر سلام بھیجنے کے ذریعہ۔

تشریح: آنحضرت ﷺ عصر سے پہلے چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھتے تھے اور يفصل بينهن بالتسليم سے سلام نہائی مراد نہیں بلکہ تشہد پڑھنا مراد ہے، کیونکہ سلام نہائی میں صرف دائیں بائیں موجود نمازیوں پر سلام بھیجا جاتا ہے تمام فرشتوں پر اور تمام مؤمنین پر سلام نہیں بھیجا جاتا۔ البتہ تشہد میں یہ جملہ ہے: السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين اس جملہ میں سب مؤمنین، مسلمین، عام فرشتے اور مقرب فرشتے سب پر سلام بھیجا جاتا ہے پس یہاں فصل کرنے سے تشہد پڑھنا مراد ہے اور یہ تفسیر حضرت اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے کی ہے۔ اور جاننا چاہئے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے مگر آگے باب كيف كان يتطوع النبي صلى الله عليه وسلم

بالنہار؟ میں یہ حدیث اسی سند سے پھر آئے گی وہاں حضرت نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اس بندے پر رحم فرمائے جو عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھے'' یعنی آپؐ نے دعا دی۔ حدیث شریف کا یہ انداز اشارہ کرتا ہے کہ ان چار رکعتوں کا درجہ سنن مؤکدہ سے کم ہے۔

[۲۰۴] باب ماجاء فی الأربع قبل العصر

[۴۴۰-] حدثنا بُندارٌ محمدُ بنُ بَشّارٍ، نا أبو عَامِرٍ، ناسُفیانُ، عن أبی إسحاق، عن عاصِمِ بنِ ضَمْرَةَ، عن علیٍّ، قال: کان النبیُّ صلی اللہ علیه وسلم یُصَلِّی قَبْلَ العَصْرِ أَرْبَعَ رَکْعَاتٍ، یَفْصِلُ بَیْنَهُنَّ بِالتَّسْلِیْمِ عَلَى الْمَلَائِکَةِ الْمُقَرَّبِیْنَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُؤْمِنِیْنَ.

وفی الباب: عن ابنِ عُمرَ، وعبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، قال أبو عیسی: حدیثُ علیٍّ حدیثٌ حسنٌ.

واختارَ إسحاقُ بنُ إبراهیمَ أنْ لاَ یُفْصَلَ فی الأَرْبَعِ قَبْلَ العَصْرِ، واحتجَّ بِهٰذا الحدیثِ، وقال: مَعْنٰی قَوْلِهٖ: ''أَنَّهُ یَفْصِلُ بَیْنَهُنَّ بِالتَّسْلِیْمِ'' یَعْنِیْ التشهُّدَ.

ورأى الشافعیُّ وأحمدُ: صلاةَ اللیلِ والنَّهارِ مَثْنٰی مَثْنٰی، یَخْتَارَانِ الفَصْلَ.

[۴۴۱-] حدثنا یَحیَی بنُ مُوْسَی، وأحمدُ بنُ إبراهیمَ، ومحمودُ بنُ غَیْلاَنَ، وغیرُ واحدٍ، قَالُوْا: نا أبو داوُدَ الطَّیَالِسِیُّ، نا محمدُ بنُ مُسْلِمِ بنِ مِهْرَانَ، سَمِعَ جَدَّهُ، عن ابنِ عمرَ، عن النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم، قال: ''رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأً صَلّٰی قبلَ العصرِ أَرْبَعًا''

قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ غریبٌ.

ترجمہ: اسحاق بن راہویہ نے یہ بات پسند کی ہے کہ عصر سے پہلے چار رکعت میں فصل نہ کیا جائے (یعنی ان کو ایک سلام سے پڑھا جائے) اور انھوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے اور فرمایا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول: یفصل بینھن بالتسلیم سے تشہد مراد ہے (سلام نہائی مراد نہیں) اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ نے رات اور دن کے نوافل میں دودو، دودو رکعتوں کو افضل قرار دیا ہے وہ دونوں فصل کو پسند کرتے ہیں (یعنی ان کے نزدیک عصر سے پہلے والی چار سنتوں کو دو سلام سے پڑھنا چاہئے)

دوسری حدیث میں ابوداؤد طیالسی کے استاذ محمد بن مسلم بن مہران کے والد کا نام ابراہیم ہے اور مسلم ان کے دادا ہیں۔ اور جدہ سے مسلم بن مہران مراد ہیں۔ اور حضرت اسحاق کے والد کا نام بھی ابراہیم ہے چونکہ وہ سفر حج میں راستہ میں پیدا ہوئے تھے اس لئے وہ راہویہ (راستے والے) کہلاتے تھے اور امام اسحاق: ابن راہویہ سے مشہور ہیں۔ اس دوسری حدیث میں چونکہ محمد بن مسلم میں کلام کیا گیا ہے۔ اس لئے حدیث کو صحیح قرار نہیں دیا۔

بابُ ماجاء فی الرَّکْعَتَیْنِ بَعْدَ الْمَغرِبِ وَالْقِرَاءَ ةِ فِیْھِمَا

مغرب کے بعد دوسنتوں اوران میں قراءت کابیان

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک مغرب کے بعد چھ رکعت سنت ہیں اور وہ سب ایک درجہ کی ہیں یعنی مندوب ہیں اور دیگر ائمہ کے نزدیک دوسنت مؤکدہ ہیں اور چار مندوب ہیں اور یہ چھ نفل اوابین کہلاتے ہیں۔ اور نبی ﷺ جس طرح فجر کی سنتوں میں اخلاص کی دوسورتیں پڑھتے تھے مغرب کے بعد کی سنتوں میں بھی یہی دوسورتیں پڑھتے تھے۔

حدیث: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں گن نہیں سکتا اتنی مرتبہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مغرب کے بعد کی سنتوں میں اور فجر سے پہلے کی سنتوں میں قل یاأیھا الکافرون اور قل ھو اللہ أحد پڑھتے سنا ہے۔

تشریح: یہ بات تو پہلے بھی آچکی ہے کہ مغرب کے بعد دو رکعتیں سنت مؤکدہ ہیں۔ اس حدیث میں خاص بات یہ ہے کہ آپ ان میں بھی اخلاص کی دوسورتیں پڑھتے تھے۔

[۲۰۵] باب ماجاء فی الرکعتین بعد المغرب، والقراءۃ فیھما

[۴۴۲-] حدثنا محمدُ بنُ المُثَنّٰی، نا بَدَلُ بنُ المَحَبَّرِ، نا عبدُ المَلِكِ بنُ مَعْدَانَ، عن عاصِمِ بنِ بَهْدَلَةَ، عن ابی وائِلٍ، عن عبدِ اللهِ بنِ مسعودٍ، أَنَّهُ قَالَ: مَاأُحْصِیْ مَا سَمِعْتُ مِنْ رسولِ الله صلی الله علیه وسلم یَقْرَأُ فی الرَّکْعَتَیْنِ بَعْدَ المَغرِبِ وفی الرَّکْعَتَیْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الفَجْرِ بِقُلْ یَا أیها الکافرونَ وقُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ.

وفی الباب: عن ابنِ عُمَرَ؛ قال أبو عیسی: حدیثُ ابنِ مسعودٍ حدیثٌ غریبٌ لَانَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ حَدیثِ عبدِ الملكِ بنِ مَعْدَانَ، عن عَاصِمٍ.

وضاحت: یہ حدیث ضعیف بھی ہے اور اس کی سند میں تفرد بھی ہے۔ عبدالملک بن معدان سے آخر تک اس کی یہی سند ہے اور یہ راوی ضعیف ہے۔ اس کے استاذ عاصم مشہور قاری ہیں، جن کے شاگرد حفص کی ہم قراءت پڑھتے ہیں۔ ان سے یہ روایت صرف عبدالملک کرتا ہے۔

بابُ ماجاء أَنَّهُ یُصَلِّیْهِمَا فی البَیْتِ

مغرب کے بعد کی سنتیں گھر میں پڑھنے کابیان

سنن ونوافل کے سلسلہ میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کو گھر میں پڑھنا اولی ہے، مسجد میں صرف فرض نمازیں پڑھنی

چاہئیں، تاکہ بیوی بچوں کو ترغیب ہو اور وہ بھی ان کا اہتمام کریں، نیز اس سے گھر میں برکت بھی ہوگی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسجد میں نوافل بالکل نہ پڑھے جائیں۔ بعض اعتبارات سے مسجد میں پڑھنا بھی افضل ہے، مثلاً کوئی نیک آدمی مسجد میں ہو اور اس کی معیت مقصود ہو تو نفلیں مسجد میں پڑھنا افضل ہے کیونکہ نیکوں کی معیت شرعاً مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ﴾ مسلمانو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھی بنو (التوبہ ۱۱۹) اسی طرح ملکہ سبا کے واقعہ میں ہے کہ اس نے اسلام قبول کرتے وقت کہا تھا: ﴿رَبِّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ پروردگار! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا کہ سورج کی پوجا کرتی رہی، اب میں سلیمان کے ساتھ سارے جہاں کے پالنہار پر ایمان لاتی ہوں (النمل ۴۴) ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ نیک لوگوں کی معیت مطلوب ہے۔

اسی طرح اگر مسجد سے قریب کسی نیک آدمی کا گھر ہو اور اس کے قُرب سے حصولِ برکت مقصود ہو تو بھی مسجد میں نوافل پڑھنا بہتر ہے، صحابہ کرام اسی وجہ سے تہجد پڑھنے کے لئے دور دور سے مسجد نبوی میں آتے تھے، اسی طرح اگر کوئی متبرک جگہ ہو مثلاً حرمین شریفین تو بھی مسجد میں نفل پڑھنا افضل ہے۔ غرض مختلف جہتوں سے مسجد میں نوافل پڑھنا افضل ہے، اور کوئی وجہ ترجیح نہ ہو تو پھر فرائض کے علاوہ تمام نمازیں گھر میں افضل ہیں اس میں ریاء وسمعہ کا احتمال نہیں رہتا، اصل مسئلہ یہی ہے مگر جب احوال بدلے تو مسئلہ بدلا، جب علماء نے دیکھا کہ لوگوں کے مشاغل بڑھ گئے ہیں اور عبادت کا ذوق وشوق کم ہوگیا ہے تو انھوں نے فرضوں کے ساتھ واجب کو بھی شامل کیا اور واجب کو بھی مسجد میں پڑھنے کا حکم دیا، پھر جب ذوق وشوق اور کم ہوگیا تو فتوی دیا کہ سنن مؤکدہ بھی مسجد ہی میں پڑھے جائیں۔ پھر جب بڑے شہروں کے احوال دیکھے کہ لوگ چھوٹے چھوٹے مکانوں میں رہتے ہیں اور گھر میں نماز میں سکون حاصل نہیں ہوتا تو سب نمازیں مسجد میں پڑھنے کا فتوی دیا اور لوگ سبھی نفلیں مسجدوں میں پڑھنے لگے۔ غرض یہ احکام عوارض کی وجہ سے ہیں اور آج فتوی یہ ہے کہ سنن مؤکدہ اور واجب نمازیں فرائض کے ساتھ ملحق ہیں یعنی فرائض کے ساتھ واجب اور سنن مؤکدہ کو بھی مسجد میں پڑھنا چاہئے، لیکن جس شخص کو اعتماد ہو کہ گھر جاکر سنتیں پڑھے گا فوت نہیں کرے گا اس کے لئے آج بھی دیگر نوافل گھر میں پڑھنا افضل ہے، یہ جمہور کی رائے ہے اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک دن کے نوافل مسجد میں اور رات کے نوافل گھر میں پڑھنا افضل ہے۔

فائدہ: فرائض، واجب اور سننِ مؤکدہ کے علاوہ نو نوافل مسجد میں پڑھنا افضل ہے: (۱) تراویح (۲) سورج گہن کی نماز (۳) تحیۃ المسجد (۴) احرام کا دوگانہ (۵) طواف کا دوگانہ (۶) معتکف کے سب نوافل (۷) مسافر جب سفر سے لوٹے تو چاہئے کہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے مسجد میں جاکر دو رکعت نفل نماز پڑھے (۸) جس شخص کو مشغولیت کی وجہ سے نماز فوت ہونے کا اندیشہ ہو اُسے بھی نفل نماز مسجد میں پڑھنی چاہئے (۹) جمعہ کی سنتیں (معارف السنن ۴: ۱۱۱)

[٢٠٦] باب ماجاء أنه يصليهما في البيت

[٤٤٣-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا إسماعيلُ بنُ إبراهيمَ، عن أيُّوبَ، عن نافعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، قال: صَلَّيْتُ مَعَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغرِبِ فِيْ بَيْتِه.

وفي الباب: عن رافعِ بنِ خَدِيْجٍ، وكَعْبِ بنِ عُجْرَةَ؛ قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عمرَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[٤٤٤-] حدثنا الحَسَنُ بن عَلِيِّ الحُلْوَانِيُّ، نا عبدُ الرَّزَّاقِ، نا مَعْمَرٌ، عن أيُّوبَ، عن نافعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، قال: حَفِظْتُ عن رسولِ الله صلى الله عليه وسلم عَشْرَ رَكْعَاتٍ كَانَ يُصَلِّيْهَا بِاللَّيْلِ والنَّهَارِ: رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ، ورَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا، ورَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغرِبِ، ورَكْعَتَيْنِ بَعْدَ العِشَاءِ الآخِرَةِ، قال: وَحَدَّثَتْنِيْ حَفْصَةُ أَنَّهُ كانَ يُصَلِّيْ قَبْلَ الْفَجْرِ رَكْعَتَيْنِ هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

حدثنا الحَسَنُ بنُ عليٍّ، نا عبدُ الرزاقِ، نا مَعْمَرٌ، عن الزُّهْرِيِّ، عن سَالِمٍ، عن ابنِ عُمَرَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم: مِثْلَهُ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مغرب کے بعد آپؐ کے گھر میں دو سنتیں پڑھیں (یعنی آنحضور ﷺ مغرب کے بعد کی سنتیں گھر میں پڑھا کرتے تھے۔ اور معیت تعداد میں ہے جماعت کے ساتھ پڑھنا مراد نہیں) (دوسری حدیث) ابن عمر کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے دس رکعتیں یاد کی ہیں جن کو آپ رات دن میں پڑھا کرتے تھے (دس رکعت سنت مؤکدہ کی ایک روایت پیچھے بھی گذری ہے اور ایک روایت آئندہ بھی آرہی ہے) ظہر سے پہلے دو رکعتیں، ظہر کے بعد دو رکعتیں، مغرب کے بعد دو رکعتیں اور عشاء کے بعد دو رکعتیں، ابن عمرؓ کہتے ہیں: اور مجھ سے (میری بہن) حفصہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ فجر سے پہلے دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے (یعنی یہ عمل گاہ بہ گاہ دیکھنے کا تو اتفاق ہوتا تھا مگر آنحضور ﷺ یہ دو رکعتیں ہمیشہ پڑھتے تھے یہ بات مجھ سے میری بہن حفصہ رضی اللہ عنہا نے بیان کی) اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے ابن عمر کی اس حدیث کی ایک اور سند لکھی ہے اور وہ سند بھی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ پہلی سند نافع کی ہے اور دوسری حضرت سالم کی۔ نافع سے ایوب سختیانی اور ان سے معمر روایت کرتے ہیں اور سالم سے امام زہری پھر ان سے معمر روایت کرتے ہیں۔

بابُ ماجاء فی فضل التطوع، وست رکعات بعد المغرب

نوافل کی فضیلت اور مغرب کے بعد چھ نفلوں کا بیان

مصری نسخہ میں واو کے ساتھ وست رکعات ہے، مغرب کے بعد کے یہ نوافل صلاۃ الاوابین کہلاتے ہیں ان نفلوں کے بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں سب احادیث ضعیف ہیں، مگر فضائل اعمال میں کافی ہیں یعنی ان سے مندوب (استحباب) کے درجہ کا حکم ثابت ہوسکتا ہے۔ اور ان کی تعداد کے سلسلہ میں دو روایتیں ہیں، چھ رکعت کی، اور بیس رکعت کی اور دونوں ضعیف ہیں۔ جاننا چاہئے کہ اوابین کی ان چھ یا بیس رکعتوں میں مغرب کے بعد کی دو سنتیں بھی شامل ہیں۔

اَوّاب: مبالغہ کا وزن ہے۔ آبَ یَؤُبُ أَوْبًا کے معنی ہیں لوٹنا، مشہور دعا ہے: آئبون تائبون ہم اپنے وطن کی طرف لوٹنے والے ہیں اور توبہ کرنے والے ہیں۔ اور اوّاب کے معنی ہیں: اللہ کی طرف بہت زیادہ رجوع ہونے والا، اور صلاۃ الاوابین کا ترجمہ ہے: جو بندے اللہ تعالیٰ کی طرف بہت زیادہ رجوع ہونے والے ہیں ان کی نماز، یعنی اس نماز کو وہی بندے پڑھتے ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلق ہوتا ہے، پس لغوی معنی کے اعتبار سے مغرب کے بعد جو نفلیں ہیں وہ بھی اوابین ہیں۔ اور اشراق وچاشت کی نمازیں بھی صلاۃ الاوابین ہیں اور تہجد بھی صلاۃ الاوابین ہے بلکہ تہجد پر صلاۃ الاوابین کا اطلاق زیادہ بامعنی ہے، کیونکہ تہجد اللہ تعالیٰ کے بہت ہی خاص بندے (جن کو اللہ تعالیٰ سے بے حد لگاؤ ہوتا ہے) پڑھتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ صحیح حدیثوں میں اشراق وچاشت کی نمازوں کو صلاۃ الاوابین کہا گیا ہے اور مغرب کے بعد کے نوافل کو صلاۃ الاوابین ایک مرسل روایت میں کہا گیا ہے، مگر لوگوں میں صلاۃ الاوابین سے مشہور مغرب کے بعد کے نوافل ہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ضعیف روایتوں کا ضعف اگر محتمل (قابل برداشت) ہو یعنی روایت کا ضعف ہلکے درجہ کا ہو مثلاً راوی کے حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے روایت کی تضعیف کی گئی ہو یا وہ ضعیف روایت متعدد طرق سے مروی ہو اور وہ حسن لغیرہ ہوگئی ہو ایسی ضعیف روایتیں فضائل الاعمال میں معتبر ہیں۔ اور اس قاعدہ کے دو مطلب ہیں اور دونوں صحیح ہیں: ایک: جو اعمال قرآن یا صحیح احادیث سے ثابت ہیں اگر ان کا ثواب کسی ضعیف حدیث میں آئے تو اس حدیث کا اعتبار کیا جائے گا۔ دوسرا مطلب: مندوب کے درجہ کے احکام ایسی ضعیف حدیثوں سے ثابت ہوسکتے ہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ فضائل الأعمال کی ترکیب یا تو حقیقۃً مرکب اضافی ہے یا مرکب توصیفی سے بدلی ہوئی ہے یعنی یہ حقیقت میں موصوف صفت ہیں پھر عبارت کو سبک اور آسان بنانے کے لئے اس کو مرکب اضافی سے بدلا گیا ہے، اگر پہلی ترکیب ہے تو اعمال سے اعمال ثابتہ مراد ہیں یعنی فی فضائلِ الأعمال الثابتۃ یعنی وہ احکام جو قرآن یا

صحیح احادیث سے ثابت ہیں اگر ان کا ثواب کسی ضعیف حدیث میں آئے اور روایت کا ضعف قابلِ برداشت ہو تو وہ روایت معتبر ہے، جیسے قرآن کریم سے تہجد کی نماز ثابت ہے اگر اس کا ثواب کسی ضعیف روایت میں آئے اور روایت کا ضعف محتمل ہو تو اس روایت کو لے لیا جائے گا کیونکہ عمل تو فی نفسہ ثابت ہے ضعیف حدیث سے اس کو ثابت نہیں کرنا۔ اور اگر یہ مرکب توصیفی سے بدلی ہوئی ترکیب ہے اور اس کی اصل ہے: أعمالٌ فُضلٌ (زائد اعمال) یعنی وہ اعمال جو فرض، واجب اور سنن مؤکدہ کے علاوہ ہیں (نوافلُ الأعمال بھی مرکب توصیفی سے بدلی ہوئی ترکیب ہے اس کی اصل ہے أعمال نافلۃٌ اور اس کے بھی یہی معنی ہیں) اور مطلب یہ ہے کہ فرض، واجب اور سنن مؤکدہ کے ثبوت کے لئے تو حدیث کا صحیح ہونا شرط ہے مگر مندوب کے درجہ کے احکام ضعیف حدیثوں سے بھی ثابت ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ان کا ضعف قابل برداشت ہو جیسے صلاۃ التسبیح کی تمام روایتیں متکلم فیہ ہیں مگر ان کی تعداد گیارہ ہے اس لئے ائمہ نے ان سے صلاۃ التسبیح کا استحباب ثابت کیا ہے۔ غرض اس باب کی بھی تمام روایتیں ضعیف ہیں مگر ان کا ضعف قابل برداشت ہے اس لئے ان سے صلاۃ الاوابین کا استحباب اور اس کی رکعتوں کی تعداد ثابت کرنا صحیح ہے۔

[۲۰۷] باب ماجاء فی فضل التطوع، وستِّ ركعاتٍ بعد المغرب

[٤٤٥-] حدثنا أبو كُرَيْبٍ يعنى محمدَ بنَ العلاءِ الهَمْدَانِيَّ الكُوفِيَّ، نازيدُ بنُ الْحُبَابِ، نا عُمَرُ بنُ أبى خَثْعَمٍ، عن يَحيى بنَ أبى كَثيرٍ، عن أبى سَلَمَةَ، عن أبى هريرةَ، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "مَنْ صَلَّى بَعْدَ الْمَغرِبِ سِتَّ رَكْعَاتٍ لَمْ يَتَكَلَّمْ فِيمَا بَيْنَهُنَّ بِسُوْءٍ، عُدِلْنَ لَهُ بِعِبَادَةِ ثِنْتَىْ عَشْرَةَ سَنَةً"

قال أبو عيسى:

[٤٤٦-] وقد رُوِىَ عن عائشةَ عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم قال: "مَنْ صَلَّى بَعْدَ المغربِ عِشرينَ رَكْعَةً بَنَى اللّٰهُ لَهُ بَيْتًا فِى الْجَنَّةِ"

قال أبو عسي: حديثُ أبى هريرةَ حديثٌ غريبٌ؛ لَانَعرِفُهُ إِلَّا مِن حَدِيثِ زيدِ بنِ الحُبَابِ، عن عُمرَ بنِ أبى خَثْعَمَ. قَالَ: وسَمِعْتُ محمدَ بنَ إسماعيلَ يقولُ: عُمرُ بنُ عبدِ اللهِ بنِ أبى خَثْعَمَ مُنْكَرُ الحديثِ، وضَعَّفَهُ جداً.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس شخص نے (پابندی سے) مغرب کے بعد چھ رکعتیں اس طرح پڑھیں کہ ان کے درمیان کوئی بری بات نہ بولا (یعنی گالی گلوچ اور غیبت وغیرہ نہ کی) تو یہ چھ رکعتیں اس کے لئے بارہ سال کی عبادت کے برابر قرار دی جائیں گی" (جاننا چاہئے کہ یہ ثواب پابندی سے عمل کرنے کا ہے کیونکہ فضائل اعمال کی

روایات میں دَاوَمَ ،ثَابَرَ اور وَاظَبَ کی قید ملحوظ رہتی ہے چاہے وہ قید ذکر کی جائے یا نہ کی جائے تفصیل پیچھے گذر چکی ہے) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث بھی مروی ہے کہ: ''جس نے مغرب کے بعد (پابندی سے) بیس رکعتیں پڑھیں اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک حویلی بنائیں گے'' (یہ حدیث ابن ماجہ (ص ۹۸) میں ہے اور یعقوب بن الولید المدائنی کی وجہ سے ضعیف ہے۔امام احمد رحمہ اللہ نے اس راوی کو کذاب اور حدیثیں گڑھنے والا قرار دیا ہے) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث (بھی) غریب ہے ہم اس کو نہیں جانتے مگر زید بن الحباب کی سند سے وہ اس کو عمر بن ابی خثعم سے روایت کرتے ہیں (اور یہ راوی نہایت ضعیف ہے) امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: عمر بن عبداللہ بن ابی خثعم منکر الحدیث ہے اور امام بخاریؒ نے اس کو بہت ہی زیادہ ضعیف قرار دیا ہے۔

بابُ ماجاء فی الرَّکْعَتَیْنِ بَعْدَ العِشَاءِ

عشا کے بعد دو سنتوں کا بیان

حدیث: عبداللہ بن شقیق کہتے ہیں: میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آنحضور ﷺ کی نفل نمازوں (سنن مؤکدہ) کے بارے میں پوچھا، انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ ظہر سے پہلے دو رکعتیں، اور ظہر کے بعد دو رکعتیں، اور مغرب کے بعد دو رکعتیں، اور عشا کے بعد دو رکعتیں، اور فجر سے پہلے دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

[۲۰۸] باب ماجاء فی الرکعتین بعد العشاء

[۴۴۷-] حدثنا أبو سَلَمَةَ یحییَ بنُ خلفٍ، نا بِشْرُ بنُ المُفَضَّلِ، عن خالدِ الحَذَّاءِ، عن عبدِ اللهِ بنِ شَقِیْقٍ، قال: سَأَلْتُ عائشةَ عن صلاةِ رسولِ اللهِ صلی اللہ علیه وسلم، فقالتْ: کان یُصَلِّیْ قَبْلَ الظهرِ رَکْعَتَیْنِ، وَبَعْدَهَا رکْعَتَیْنِ، وبعدَ المغربِ ثِنْتَیْنِ، وبعدَ العِشَاءِ رَکْعَتَیْنِ، وقبلَ الفجرِ ثِنْتَیْنِ.

وفی الباب: عن علیٍّ، وابنِ عُمَرَ، قال أبو عیسی: حدیثُ عبدِ اللهِ بنِ شقیقٍ عن عائشةَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

فائدہ: عشاء کے بعد چار نفلوں کی روایت بھی بخاری شریف (حدیث ۱۱۷ کتاب العلم) میں ہے، ان میں سے دو سنت مؤکدہ ہیں اور دو غیر مؤکدہ۔ مگر عشاء سے پہلے نوافل کے بارے میں کوئی روایت نہیں اور کبیری میں بحوالہ سنن سعید بن منصور: حضرت براء رضی اللہ عنہ کی جو حدیث بیان کی گئی ہے وہ وہم ہے (معارف السنن ۴: ۱۱۵) مگر نماز بہترین کام ہے پس موقع ہو تو عشاء سے پہلے بھی نفلیں دو یا چار پڑھنی چاہئیں۔

بابُ ماجاء أنَّ صَلاَۃَ اللَّیْلِ مَثْنَی مَثْنَی

رات کی نفلیں دودو، دودورکعتیں ہیں

مذاہبِ فقہاء : امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک رات اور دن کے نوافل چار چار رکعت ایک سلام سے پڑھنا افضل ہے، اگرچہ ایک سلام سے دورکعت بھی جائز ہیں اور چھ یا آٹھ رکعت بھی ایک سلام سے پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ آٹھ سے زیادہ نفلیں ایک سلام سے پڑھنا ٹھیک نہیں ــــــ اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک رات میں ایک سلام سے دورکعتیں افضل ہیں اور دن میں چار رکعتیں۔ اور دن میں دودو پڑھنا اور رات میں چار چار پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور ایک سلام سے آٹھ رکعت تک پڑھنا بھی جائز ہے ــــــ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک سب نفلیں دو دو افضل ہیں چاہے رات کی نفلیں ہوں یا دن کی، اور چار پڑھنا بھی جائز ہے ــــــ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک رات میں ایک سلام سے دو سے زیادہ نفلیں پڑھنا جائز ہی نہیں، اور دن میں دودو کر کے پڑھنا افضل ہے اور چار پڑھنا بھی جائز ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ مسئلہ باب میں صرف یہی ایک حدیث ہے اور وہ اعلی درجہ کی صحیح ہے، اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اسی حدیث میں والنہار کا اضافہ بھی آیا ہے یعنی صلاۃ اللیل والنہار مثنی مثنی مگر یہ اضافہ صحیح نہیں۔ وہ حدیث آگے آرہی ہے اور اس باب میں اختلاف نص فہمی کا ہے دلائل کا نہیں۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''رات کی نماز دودو، دودو ہیں (صلاۃ اللیل: اگرچہ عام ہے مگر مراد خاص ہے یعنی تہجد کی نماز مراد ہے، اور نصوص میں ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ الفاظ عام ہوں اور مراد خاص ہو یا الفاظ خاص ہوں اور مراد عام ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے الوسالۃ میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے اور دسیوں بیسیوں مثالوں سے یہ مسئلہ واضح کیا ہے) پھر جب صبح صادق کا اندیشہ ہو تو دوگانہ کے ساتھ ایک رکعت اور ملالو (یعنی وتر پڑھ لو) اور اپنی نماز کا آخر وتر کو بناؤ یعنی تہجد سے فارغ ہو کر آخر میں وتر پڑھو''

تشریح: حدیث شریف کے تین جز ہیں:

پہلا جزء: رات کی نماز دودو، دودو رکعتیں ہیں: اس حدیث کی وجہ سے امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ رات میں ایک سلام سے دو سے زیادہ نفلیں پڑھنا جائز نہیں، کیونکہ نبی ﷺ نے رات میں دورکعت پڑھنے کا حکم دیا ہے(۱)

(۱) جاننا چاہئے کہ اخبار انشاء کو متضمن ہوتے ہیں جیسے لا إیمان لمن لا أمانۃ لہ جملہ خبریہ ہے مگر وہ انشاء کو متضمن ہے یعنی اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے حکم دیا ہے کہ امانت داری اختیار کرو، اسی طرح صلاۃُ اللیل مثنی مثنی بھی اگرچہ مبتدا خبر ہیں مگر ان میں انشاء مضمر ہے یعنی رات میں نفل دودورکعت پڑھے جائیں۔

اور چونکہ حدیث میں والنہار کا اضافہ صحیح نہیں، نیز نبی ﷺ سے دن میں ایک سلام سے چار رکعت پڑھنا مروی بھی ہے اس لئے دن میں چار رکعت ایک سلام سے جائز ہیں۔

اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مدعیٰ یہ ہے کہ رات میں نفلیں دو دو رکعت کر کے پڑھنے چاہئیں، اور چونکہ نفل کے باب میں رات اور دن یکساں ہیں پس دن کو رات پر قیاس کریں گے اور دن کی نفلوں میں بھی دو رکعت پر سلام پھیرنا افضل قرار پائے گا، علاوہ ازیں ان دونوں حضرات کے نزدیک والنہار والا اضافہ معتبر ہے یا قیاس کے لئے قرینہ ہے۔

اور صاحبین نے حدیث باب کی وجہ سے رات میں نوافل دو دو کر کے پڑھنے کو افضل قرار دیا ہے اور انھوں نے والنہار کے اضافہ کو نہیں لیا، اور دن میں ایک سلام سے چار رکعت کو افضل قرار دیا، کیونکہ آنحضرت ﷺ دن میں چار رکعت نفل ایک سلام سے پڑھا کرتے تھے۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دن میں فرض نمازیں چار رکعت والی ہیں جیسے ظہر اور عصر اور رات میں بھی فرض نماز چار رکعت ہے جیسے عشاء کی نماز اور فرائض غیر اولیٰ ہیئت پر نہیں ہوسکتے۔ علاوہ ازیں آنحضرت ﷺ سے دن میں ایک سلام سے چار رکعت سنت پڑھنا ثابت ہے اور نبی عموماً جو کام کرتے ہیں اُسے غیر اولیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ غیر اولیٰ کام ان کے شایانِ شان نہیں۔ اور دن پر رات کو قیاس کریں گے کیونکہ رات اور دن نوافل کے باب میں یکساں ہیں پس رات میں بھی چار چار رکعت ایک سلام سے پڑھنا افضل ہے۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ حدیث میں امر: تشریعی نہیں ہے بلکہ ارشادی ہے یعنی تہجد گذاروں کو ایک بھلائی کی بات بتائی گئی ہے، چونکہ تہجد بہت لمبے پڑھے جاتے ہیں اس لئے آنحضور ﷺ نے تہجد گذاروں سے فرمایا کہ تہجد کی نماز میں ہر دو رکعت پر سلام پھیر دیا کرو پھر تھوڑی دیر آرام کر کے اگلی رکعتیں شروع کرو، تاکہ تھک نہ جاؤ، اگر وہ چار رکعت ایک سلام سے پڑھیں گے اور طویل پڑھیں گے تو تھک جائیں گے۔ غرض حدیث میں تہجد گذاروں کو ان کے نفع کی بات بتائی گئی ہے نفل نماز دو دو رکعت کر کے پڑھنا افضل ہے یہ حدیث کا مدعیٰ نہیں ہے۔

دوسرا جزء: جب صبح صادق کا اندیشہ ہو تو دوگانہ کے ساتھ ایک رکعت اور ملائی جائے۔ فاتحہ کے مسئلہ میں تفصیل سے یہ قاعدہ گذرا ہے کہ جب شریعت کسی متعدی لفظ کو اپنی اصطلاح بناتی ہے تو وہ لفظ لازم ہوجاتا ہے، پھر اگر اُسے متعدی بنانا ہو تو عام طریقہ کے مطابق حرف جر کے ذریعہ متعدی بنائیں گے، مگر لغت والے متعدی اور اس متعدی کے درمیان فرق ہوگا، لغت والے لازم کے متعدی ہونے کے بعد جو معنی ہوتے ہیں وہ تو ظاہر ہیں اور شریعت والے لازم کو جب متعدی کریں گے تو اس کے معنی میں دوسری چیز کے ضمن میں کوئی کام کرنے کا مفہوم پیدا ہوگا، جیسے قَرَءَ الکتابَ

حرف جر کے بغیر متعدی ہے، پھر شریعت نے اس کو اپنی اصطلاح بنایا پس یہ لازم ہو گیا قرأ فی الصلاۃ کے معنی ہیں: نماز میں قراءت کی۔ پھر جب متعدی کیا تو حرف جر کا واسطہ لائے، اور کہا: لاصلاةَ لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب اب معنی ہونگے: فاتحہ کو دوسری چیز کے ساتھ نہ پڑھا تو نماز نہیں ہوئی اور وہ دوسری چیز سورت ملانا ہے یعنی حدیث میں فاتحہ اور سورت کے مجموعہ پر حکم لگایا ہے کہ ان کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح أَوْتَرَ الأشياءَ کے معنی ہیں: چیزوں کو طاق بنایا یہ متعدی بنفسہ ہے، پھر جب یہ لفظ شرعی اصطلاح بنا تو لازم ہو گیا کہیں گے: أَوْتَرَ الرجلُ: آدمی نے وتر پڑھے۔ پھر جب باء کے ذریعہ متعدی کیا اور کہا: أَوْتَرَ بر كعةٍ تو معنی ہونگے: ایک رکعت کو کسی اور چیز کے ساتھ ملایا یعنی دوگانہ کے ساتھ ملایا۔ یعنی جب صبح صادق کا اندیشہ ہو تو دوگانہ پر سلام نہ پھیرا جائے بلکہ اس کے ساتھ ایک رکعت اور ملائی جائے یہی وتر اصطلاحی ہے، اور جب آخری نماز وتر بن گئی تو رات کی نماز بھی حکماً وتر بن گئی (اس جزء کی مزید وضاحت آگے ابواب الوتر میں آئے گی)

تیسرا جزء: اپنی نماز کا آخر وتر کو بناؤ۔ یہ امر استحبابی ہے، وجوبی نہیں۔ کیونکہ نبی ﷺ سے وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنا ثابت ہے۔ لہٰذا جو شخص عشاء کے بعد وتر پڑھ چکا ہو پھر وہ توفیق خداوندی سے تہجد کے لئے بیدار ہو جائے تو اس کے لئے تہجد پڑھنا جائز ہے اور اس کا سابقہ وتر باطل نہیں ہوگا (یہ مسئلہ بھی آگے ابواب الوتر میں آئے گا)

[۲۰۹] باب ماجاء أن صلاةَ الليل مثنى مثنى

[۴۴۸-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا الليثُ، عن نافِعٍ، عن ابنِ عمرَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، أنَّهُ قال: "صلاةُ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى، فإذا خِفْتَ الصبحَ فَأَوْتِرْ بِوَاحِدَةٍ، واجْعَلْ آخِرَ صَلَاتِكَ وِتْرًا"

وفي الباب: عن عَمْرِو بنِ عَبَسَةَ؛ قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

والعَمَلُ على هذا عندَ أهلِ العلمِ: أنَّ صلاةَ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى، وهوَ قولُ سُفيانَ الثوريِّ، وابنِ المباركِ، والشافعيِّ، وأحمدَ، وإسحاقَ.

وضاحت: جو قول سفیان ثوری اور ابن المبارک رحمہما اللہ کا ہے وہی صاحبین کا ہے، امام اعظم رحمہ اللہ کا قول اس سے مختلف ہے۔

بابُ ماجاء في فَضْلِ صَلَاةِ اللَّيْلِ

تہجد کی نماز کی فضیلت

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "رمضان کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والے روزے اللہ کے مہینے محرم

کے روزے ہیں، اور فرائض کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والی نماز تہجد کی نماز ہے"

تشریح: امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صرف حسن کہا ہے جبکہ تمام راوی ثقہ ہیں اور یہ حدیث اسی سند سے مسلم شریف (۱:۳۶۸) میں بھی ہے۔ ممکن ہے یہاں نسخوں کی غلطی ہو یا حضرت مصنف رحمہ اللہ کے ذہن میں کوئی خاص وجہ ہو ـــــ شهر الله سے پہلے مضاف صیام پوشیدہ ہے اور اضافت تشریف کے لئے ہے اور المحرم: شهر کی صفت ہے یعنی قابل احترام قرار دیا ہوا مہینہ ـــــ اور واجب اور سنن مؤکدہ فرائض کے ساتھ ملحق ہیں یعنی تہجد کا درجہ فضیلت میں فرائض واجب اور سنن مؤکدہ کے بعد ہے۔

[۲۱۰] باب ماجاء فی فضل صلاة الليل

[۴۴۹-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا أبو عَوَانَةَ، عن أبى بِشْرٍ، عن حُمَيْدِ بنِ عبدِ الرحمنِ الحِمْيَرِيِّ، عن أَبِى هُرَيْرَةَ، قال: قالَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم:" أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ شَهْرِ رَمَضَانَ شَهْرُ اللهِ المحرَّمُ، وأفضَلُ الصلاةِ بَعْدَ الفَرِيْضَةِ صَلاَةُ اللَّيْلِ"

وفى الباب: عن جابرٍ، وبلالٍ، وأبى أُمَامَةَ، قال أبو عيسى: حديثُ أبى هريرةَ حديثٌ حسنٌ.

وأبو بِشْرٍ: اسمهُ جَعْفَرُ بنُ إياسٍ، وهو جَعْفَرُ بنُ أبى وَحْشِيَّةَ.

نوٹ: یہ حدیث آگے بھی روزوں کے بیان (۱:۹۳) میں آئے گی۔ وہاں بھی صرف تحسین کی ہے، اس لئے یہاں نسخہ کی غلطی کا احتمال کم ہے۔

بابُ ماجاءَ فى وَصْفِ صَلاَةِ النبىِّ صلى الله عليه وسلم باللَّيْلِ

نبی ﷺ کے تہجد کا بیان

یہ یکے بعد دیگرے تین باب ایک ہی مسئلہ سے متعلق ہیں کہ آنحضرت ﷺ تہجد کتنی رکعتیں پڑھتے تھے؟ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آنحضور ﷺ نے تہجد مختلف طریقوں سے پڑھا ہے، کم سے کم نو رکعت اور زیادہ سے زیادہ تیرہ رکعت پڑھنا مروی ہے، جن میں تین رکعت وتر کی ہوتی تھیں۔ یعنی نو میں چھ رکعت تہجد اور تین رکعت وتر اور تیرہ میں دس رکعت تہجد اور تین رکعت وتر۔ مگر امام ترمذی رحمہ اللہ کے یہ دونوں دعوے قابل غور ہیں۔ آپؐ سے سات رکعت تہجد پڑھنا بھی مروی ہے جس میں چار رکعت تہجد اور تین رکعت وتر ہوتی تھی، چنانچہ خود مصنف رحمہ اللہ آئندہ یہ حدیث لائیں گے، اور تہجد کی زیادہ سے زیادہ سترہ رکعتیں مروی ہیں جن میں چودہ رکعت تہجد اور تین رکعت وتر ہیں۔ ابن حزم ظاہری کی المحلّی بالآثار (وہ کتاب جس کو روایات سے مزین کیا گیا ہے) میں آنحضرت ﷺ کے تہجد کے سلسلہ

کی سب روایتیں جمع کی گئی ہیں اور کل تیرہ صورتیں مروی ہیں، ان روایتوں میں سب سے اعلیٰ گیارہ رکعت والی روایت ہے، یعنی آٹھ رکعت تہجد اور تین رکعت وتر، اور صحت میں دوسرے درجہ پر تیرہ رکعت والی روایت ہے، اور بعض حضرات نے گیارہ رکعت والی اور تیرہ رکعت والی روایتوں کو جمع کیا ہے کہ اس میں آٹھ رکعت تہجد کے ہیں اور تین رکعت وتر کے اور دو رکعت وتر کے بعد کی سنتیں ہیں جن کو آپؐ بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ دو رکعتیں فجر کی سنتیں ہیں۔ ان کو بھی تہجد کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح تیرہ رکعت ہوگئیں ہیں۔

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ نے دو رسالوں میں: توثیق الکلام میں (جس کی میں نے شرح لکھی ہے جس کا نام ہے: ''کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے؟'') اور مصابیح التراویح میں (یہ رسالہ فارسی میں ہے اور مولانا اشتیاق صاحب رحمہ اللہ نے اس کی شرح لکھی ہے جس کا نام ہے: انوار المصابیح ہے) اس مسئلہ پر کلام کیا ہے اور اس کی وجہ بیان کی ہے کہ آنحضور ﷺ کا تہجد مختلف کیوں تھا؟ فرماتے ہیں: شب معراج میں پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں، پھر تخفیف ہوئی اور پانچ رہ گئیں، اور نماز درحقیقت ایک رکعت ہے، دوسری رکعت اس کے ساتھ ملائی گئی ہے اس لئے اس کو شفعہ (جوڑا) کہتے ہیں کیونکہ بندہ ایک رکعت کما حقہ پڑھ ہی نہیں سکتا پس دوسری رکعت ملانا ضروری ہوا تاکہ پہلی رکعت میں جو کمی رہ گئی ہے اس کی دوسری رکعت سے تلافی ہوجائے ——— اور جو احکام آسانی کے لئے منسوخ ہوتے ہیں ان کا استحباب باقی رہتا ہے۔ چنانچہ آنحضور ﷺ رات دن میں پچاس رکعتیں پڑھتے تھے۔ آپؐ یہ تعداد فرض، واجب، سنن مؤکدہ، تہجد، اشراق وچاشت اور اوابین وغیرہ کے ذریعہ پوری فرماتے تھے۔ اور پچاس کی تعداد میں جو کمی رہ جاتی تھی تہجد میں اس کو پورا فرمادیا کرتے تھے، اس لئے آپؐ نے کم وبیش تہجد پڑھا ہے اور چونکہ مغرب کی تین رکعتیں ہیں اس لئے پچاس کی تعداد پوری نہیں ہوسکتی، یا انچاس ہونگی یا اکیاون، اس لئے پچاس کی تعداد پوری کرنے کے لئے تین رکعت وتر بڑھائی گئیں تاکہ تعداد ٹھیک پوری ہوجائے۔

حدیث: ابوسلمۃ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کی راتوں میں تہجد کی کتنی رکعتیں پڑھتے تھے؟ یعنی رمضان کی وجہ سے آپؐ تہجد کی رکعتوں میں اضافہ فرماتے تھے یا نہیں؟ صدیقہؓ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے (پہلے) چار رکعت پڑھتے تھے آپ ان کی عمدگی اور درازی کے بارے میں نہ پوچھیں، یعنی رمضان المبارک کی وجہ سے رکعتوں کی تعداد میں تو اضافہ نہیں فرماتے تھے، مگر کیفیت بدل جاتی تھی، آپؐ چار رکعتیں اتنی طویل اور اتنی شاندار پڑھتے تھے کہ الفاظ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کیا جاسکتا، پھر تھوڑی دیر آرام فرماتے تھے اور سوجاتے تھے، یہاں تک کہ میں خراٹے سنتی تھی پھر بیدار ہوکر اگلی چار رکعت پڑھتے تھے اور وہ رکعتیں بھی نہایت شاندار اور نہایت لمبی پڑھتے تھے، پھر آرام فرماتے تھے، پھر تین رکعت وتر پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے

رسول! کیا آپ وتر پڑھنے سے پہلے سوجاتے ہیں؟ حضور اکرم ﷺ چار رکعت پڑھ کر بھی سوتے تھے اور وتر پڑھنے سے پہلے بھی سوتے تھے، مگر صدیقہؓ نے وہاں سوال نہیں کیا، شاید یہ خیال کیا ہوگا کہ تہجد نفل نماز ہے اور نوافل میں گنجائش ہے، مگر وتر فرائض کے قریب ہیں یعنی واجب ہیں اس لئے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! آپ وتروں سے پہلے سوجاتے ہیں یہاں تک کہ میں خراٹے سنتی ہوں پھر آپ وضو کئے بغیر وتر پڑھتے ہیں تو کیا سونے سے آپ کی وضو نہیں ٹوٹتی؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! میری آنکھیں سوتی ہیں مگر میرا دل نہیں سوتا'' یعنی میں چوکنا سوتا ہوں اگر ناقض وضوء کوئی بات پیش آئے گی تو مجھے اس کا احساس ہوجائے گا، اس لئے میری نیند ناقض وضوء نہیں۔

تشریح: دو نمازیں بالکل ایک دوسرے سے علحدہ ہیں۔ایک: صلاۃ اللیل یعنی تہجد کی نماز۔ یہ نماز سال بھر کی ہے رمضان اور غیر رمضان ہر وقت پڑھی جاتی ہے۔تہجد کے معنی ہیں: **ترك الهجود**: نیند چھوڑنا، چونکہ یہ نماز رات کے آخری حصہ میں پڑھی جاتی ہے یعنی بندہ پہلے سوجاتا ہے پھر اٹھ کر اس نماز کو پڑھتا ہے اس لئے اس کا نام تہجد رکھا گیا ہے۔دوسری: قیامِ رمضان یعنی تراویح ہے۔یہ رمضان کی زائد نماز ہے یہ نماز صرف رمضان میں پڑھی جاتی ہے باقی گیارہ مہینوں میں نہیں پڑھی جاتی اور حدیث مذکور صلاۃ اللیل سے متعلق ہے، قیام رمضان سے متعلق نہیں۔

جاننا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہ تو تراویح کی رکعتوں کی تعداد متعین تھی اور نہ یہ نماز جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی تھی، بلکہ صرف اس کی ترغیب دی گئی تھی کہ یہ ایسی نماز ہے جو سابقہ گناہوں کے لئے کفارہ بنتی ہے، چنانچہ لوگ رمضان میں سونے سے پہلے از خود یہ نماز پڑھتے تھے اور اللہ جس کو جتنی توفیق دیتا وہ اتنی رکعت پڑھتا۔پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی یہی طریقہ رہا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی چھ سال سخت آزمائش کے تھے، مسلمان بیک وقت دو سپر پاور طاقتوں: ایران اور روم کے ساتھ جنگوں میں مصروف تھے، جب یہ دونوں طاقتیں ٹوٹیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت کے آخری چھ سالوں میں ملک وملت کی تنظیم سے تعلق رکھنے والے بہت سے کام کئے ہیں، ان میں سے ایک کام باقاعدہ جماعت کے ساتھ تراویح کا نظام بنانا بھی ہے۔شروع میں امام تراویح کی آٹھ رکعتیں پڑھاتا تھا اور سحری کے وقت تک پڑھاتا تھا اس وقت یہ خیال تھا کہ یہ تہجد ہی کی نماز ہے۔پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ بات آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے جو دو یا تین دن جماعت کے ساتھ نماز پڑھائی ہے وہ بیس رکعتیں پڑھائی ہیں، اور آنحضرت ﷺ تنہا بھی سونے سے پہلے بیس رکعتیں پڑھا کرتے تھے (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث بیہقی ۲:۴۹۶ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ماہ رمضان میں بلا جماعت بیس رکعتیں اور وتر پڑھتے تھے، اور علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے **التلخيص الحَبِير في تخريج أحاديث الرافعي الكبير** (۱:۱۱۹) میں یہ روایت لکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دن جماعت سے جو نماز پڑھائی تھی وہ بیس رکعتیں پڑھائی تھیں۔حافظ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس روایت کی صحت پر تمام محدثین کا اتفاق ہے

(فتاوی رحیمیہ ۱: ۲۹۰) چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نظام بدل دیا، اور دونوں اماموں: حضرت ابی بن کعب اور حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہما کو حکم دیا کہ بیس رکعتیں پڑھائیں اور مختصر پڑھائیں اور لوگوں کو سونے کا موقع دیں، پھر آخری پہر اٹھ کر ہر شخص تنہا تہجد پڑھے، بخاری (حدیث ۲۰۱۰) میں ہے کہ اس نئے نظام کے شروع ہونے کے بعد ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں تشریف لائے لوگوں کو ایک امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور فرمایا: نِعْمَ البدعة هذه یعنی لوگ جو اس نماز کو بدعت کہتے ہیں وہ غلط ہے۔ یہ بدعت نہیں بلکہ شاندار کام ہے (اس نماز کو لوگوں کے خیال کے مطابق ''بدعت'' کہا ہے اور نِعْمَ سے اس کی تردید کی ہے) پھر فرمایا: والّتی یَنَامُوْنَ عنها أفضلُ مِن التی یَقُوْمُوْنَ: یعنی جس نماز سے لوگ سوتے رہتے ہیں وہ اس نماز سے افضل ہے جس کو وہ پڑھتے ہیں، یعنی تراویح سے زیادہ فضیلت والی نماز تہجد ہے، لہٰذا لوگوں کو چاہئے کہ جس طرح تراویح اہتمام کے ساتھ پڑھتے ہیں تہجد کی نماز بھی پڑھیں، سوتے نہ رہیں۔ اس ارشاد میں یہ بات صاف کردی گئی ہے کہ تراویح: تہجد کی نماز نہیں ہے بلکہ یہ دو بالکل مختلف نمازیں ہیں ایک کا وقت سونے سے پہلے ہے دوسری کا سونے کے بعد، ایک کی بیس رکعتیں ہیں، دوسری کی آٹھ۔ اور حضرت عائشہؓ کی یہ روایت دوسری نماز کے بارے میں ہے یعنی تہجد کے بارے میں ہے جو سال بھر پڑھی جاتی ہے، تراویح کے بارے میں نہیں ہے جو صرف رمضان میں پڑھی جاتی ہے۔

غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے آج تک امت شرقاً غرباً تراویح جماعت کے ساتھ بیس رکعت پڑھتی چلی آرہی ہے۔ صرف غیر مقلدین اس مسئلہ میں اختلاف کرتے ہیں وہ کہتے ہیں: تراویح کی آٹھ رکعتیں ہیں، اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث جو بیہقی اور مصنف ابن ابی شیبہ (حدیث ۷۷۷۴ طبع محمد عوامہ) میں ہے اس کو ضعیف بتاتے ہیں۔ مگر غیر مقلدین کا یہ خیال صحیح نہیں، کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث قیام رمضان (تراویح) سے متعلق نہیں ہے بلکہ قیام لیل (تہجد) سے متعلق ہے۔ رسول اللہ ﷺ یہ آٹھ رکعتیں سال بھر پڑھتے تھے، اور تراویح صرف رمضان میں پڑھی جاتی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما والی حدیث کا ضعف تسلیم ہے مگر مسئلہ باب میں وہی تنہا روایت ہے، اس کے معارض کوئی روایت نہیں، حضرت عائشہ کی یہ حدیث تہجد سے متعلق ہے تراویح سے متعلق نہیں، پس حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کو لینا ضروری ہے۔ غرض اصح مافی الباب کا قاعدہ یہاں جاری نہیں ہوسکتا۔

علاوہ ازیں بیس رکعت تراویح پر چاروں ائمہ، تمام صحابہ، تابعین اور تمام علماء کا اجماع ہے۔ اور اگر بالفرض حضرت عائشہ کی اس حدیث کو تراویح سے متعلق کیا جائے تو غیر مقلدین سے عرض ہے کہ آنحضور ﷺ اس نماز کو سال بھر پڑھتے تھے، آپ بھی سال بھر پڑھیں تو ہم جانیں کہ آپ ''اہل حدیث'' ہیں۔ یہ کیا کہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ، کڑوا کڑوا تھو تھو! اور اگر وہ کہیں کہ نبی ﷺ نے صرف تین دن یا دو تین رمضان میں جماعت سے پڑھی ہے اس لئے ہم اس پر عمل

کرتے ہیں تو سنیں: اس حدیث پر عمل کرنا ہے تو تراویح جماعت کے ساتھ صرف دو دن یا تین دن پڑھو، پھر مسجدوں سے دفع ہو جاؤ تاکہ فتنہ ختم ہو، اور وہ بھی مہینہ کی آخری تاریخوں میں تاکہ پورا رمضان مسجدوں میں سکون رہے۔

قولہ: ثم یصلی ثلاثا: تمام ائمہ متفق ہیں کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ ایک سلام سے ہیں یا دو سلام سے؟ احناف کے نزدیک ایک سلام سے ہیں اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک دو سلام سے، حاشیہ میں فتح القدیر کے حوالہ سے چار روایتیں لکھی ہیں وہ احناف کی دلیل ہیں:

پہلی حدیث مستدرک حاکم میں ہے اور وہ بخاری اور مسلم کی شرط پر ہے، صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ تین رکعتوں سے وتر پڑھتے تھے، سلام نہیں پھیرتے تھے مگر ان کے آخر میں، یعنی ایک سلام سے پڑھتے تھے۔ یہی حدیث نسائی (حدیث ۱۶۹۸ باب کیف الوتر بثلاث) میں ہے، اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر کی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرتے تھے۔

دوسری روایت بھی مستدرک حاکم میں ہے: کسی نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے کہا کہ ابن عمر وتر کی دو رکعتوں پر سلام پھیرا کرتے تھے، حسن بصریؒ نے فرمایا: ان کے ابا حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے بڑے فقیہ تھے اور وہ دوسری رکعت سے تکبیر کہہ کر کھڑے ہو جاتے تھے، یعنی دو رکعت پر سلام نہیں پھیرتے تھے۔

تیسری روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے: حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: تمام مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں سلام نہیں پھیرا جائے گا مگر ان کے آخر میں، یعنی حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے اس پر اجماع کا دعوی کیا ہے کہ وتر ایک سلام سے ہیں، چنانچہ میرے علم میں حضرت معاویہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے علاوہ کوئی دوسرا صحابی نہیں جو وتر دو سلام سے پڑھتا ہو۔

چوتھی روایت طحاوی سے نقل کی ہے اور پوری سند لکھی ہے۔ ابو زیاد مدینہ کے ساتوں فقہاء اور دیگر بہت سے علماء سے روایت کرتے ہیں کہ وتر تین رکعتیں ہیں سلام نہیں ہے مگر ان کے آخر میں۔

اور ائمہ ثلاثہ کی دلیل صرف یہی ایک حدیث ہے: فإذا خِفتَ الصبحَ فأَوْتِرْ بركعةٍ: وہ اس کا ترجمہ کرتے ہیں: جب صبح کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت وتر پڑھو۔ مگر سوال ہوگا کہ کیا وتر ایک رکعت ہے؟ وہ جواب دیں گے: نہیں! وتر تین رکعت ہیں مگر ان کو دو سلام سے پڑھو، ائمہ ثلاثہ نے اس حدیث کا جو مطلب بیان کیا ہے وہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں۔ أوتِرْ بركعةٍ کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ دوگانہ کے ساتھ ایک رکعت ملا کر پڑھو، یعنی تہجد میں تو ہر دو رکعتوں پر سلام پھیرا جاتا ہے مگر جب صبح صادق کا اندیشہ ہو تو اب دو رکعتوں پر سلام نہ پھیرو بلکہ اس کے ساتھ ایک رکعت اور ملا کر اس کو وتر حقیقی بناؤ، اور جب یہ وتر حقیقی بن گئے تو تہجد اور رات کی سب نمازیں وتر حکمی بن جائیں گی۔

اور حدیث کا یہ ترجمہ کہ دوگانہ کے ساتھ ایک رکعت ملا کر پڑھو اس لئے ہے کہ لفظ ایتار ایک اصطلاح ہے اور پھر

اس کو حرف جر کے ذریعہ متعدی کیا گیا ہے اور جب شرعی اصطلاح کو متعدی کیا جاتا ہے تو اس کے معنی میں دوسری چیز کے ضمن میں کوئی کام کرنے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ قاعدہ زمخشری رحمہ اللہ نے مفصل میں بیان کیا ہے اور فاتحہ کے مسئلہ میں اور صلاۃ اللیل مثنی مثنی کے بیان میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔

قولہ: إن عینی تنامان: یہ مسئلہ کہ انبیاء کی نیند ناقض وضوء نہیں تفصیل سے کتاب الطہارۃ باب ماجاء فی الوضوء من النوم میں گذر چکا ہے، چونکہ انبیاء کا دل نہیں سوتا یعنی وہ چوکنا سوتے ہیں اس لئے اگر کوئی ناقض وضوء بات پیش آئے گی تو ان کو پتا چل جائے گا اس لئے انبیاء کی نیند ناقض وضوء نہیں۔ اور امت بھی اگر چوکنا سوئے تو سونے کی وجہ سے ان کی بھی وضو نہیں ٹوٹتی۔ اور چوکنا سونا کیا ہے؟ اس کی ظاہری علامت یہ طے کی گئی ہے کہ کھڑے ہو کر، رکوع، سجدہ اور قعدہ کی حالت میں یا مقعد زمین پر جما کر سوئے تو چوکنا سونا ہے، پس اس طرح سونے سے وضو نہیں ٹوٹتی، اور ٹیک لگا کر سونا، یا چت لیٹ کر یا کروٹ پر سونا غفلت والا سونا ہے پس یہ نیند ناقض وضوء ہے، اور پیچھے یہ بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ یہ قاعدہ کہ انبیاء کی نیند ناقض وضوء نہیں اگرچہ کتابوں میں عام لکھا ہے مگر میری رائے میں انبیاء بھی گہری نیند سوتے ہیں، ورنہ نیند کا فائدہ یعنی تھکن دور ہونا اور بدن میں چستی پیدا ہونا حاصل نہیں ہوگا۔ اور اس نیند کا حکم چوکنا سونے والی نیند سے علحدہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ آپ عشاء کے بعد سوئے ہوں پھر بیدار ہو کر وضوء کئے بغیر تہجد پڑھی ہو، ہاں تہجد کے درمیان یا چار رکعت کے بعد یا تہجد اور وتر کے درمیان سوتے تھے تو نئی وضوء کئے بغیر نماز پڑھتے تھے، کیونکہ ان اوقات میں آپ چوکنا سوتے تھے اور عشاء کے بعد رات بھر گہری نیند سوتے تھے۔

دوسری حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ رات میں گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک رکعت کے ذریعہ (نماز کو) طاق بناتے تھے (یعنی نویں اور دسویں رکعت کے ساتھ ایک رکعت اور ملایا کرتے تھے جس سے وہ وتر حقیقی بن جاتی تھیں، پھر وہ رات کی نماز میں شامل ہو کر سب کو وتر حکمی بنا دیتی تھیں) پھر جب وتر سے فارغ ہو جاتے تو (صبح کے انتظار میں) دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے تھے۔

تیسری حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ جب تہجد نہیں پڑھ پاتے تھے: آپؐ کو تہجد سے نیند روک دیتی تھی (اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ نیند کا تقاضہ ہوتا تھا تو آپؐ سونے کو تہجد پر مقدم رکھتے تھے، مثلاً سفر ہے اور رات کے آخری حصہ میں پڑاؤ کیا ہے۔ اب سونا بھی ہے کیونکہ صبح آگے سفر کرنا ہے دوسری طرف تہجد کا وقت ہے تو آپ سو جاتے تھے اور تہجد بالقصد ترک فرما دیتے تھے) یا آپؐ پر آپ کی آنکھیں غالب آجاتی تھیں (یعنی بیدار ہونے کے ارادے کے باوجود آنکھ نہیں کھلتی تھی) تو آپ دن میں سورج نکلنے کے بعد بارہ رکعت پڑھتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ رات میں تہجد بہت لمبے پڑھتے تھے اور دن میں لمبے نوافل پڑھنا آپؐ کا معمول نہیں تھا اس

لئے کیفیت کی تلافی کمیت بڑھا کر کرتے تھے یعنی آٹھ کی جگہ بارہ رکعت پڑھتے تھے۔اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ آنحضور ﷺ کے وتر کبھی قضا نہیں ہوئے، وہ بہرحال اپنے وقت پر پڑھ لئے جاتے تھے، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ آدمی کو اپنے اوراد کی حفاظت کرنی چاہئے، آدمی جب کوئی ورد مقرر کر لیتا ہے تو اگرچہ وہ عمل شرعاً لازم نہیں ہوجاتا مگر اُسے پابندی سے کرنا چاہئے، کیونکہ پابندی میں بڑی برکت ہے۔

ایک واقعہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مذکورہ حدیث میں ایک راوی آئے ہیں حضرت زرارۃ بن اوفی، یہ بڑے آدمی تھے، بصرہ کے قاضی تھے اور بنو قُشیر کی مسجد میں امامت کرتے تھے۔ایک دفعہ فجر کی نماز پڑھا رہے تھے سورۂ مدثر کی آیت: ﴿فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ﴾ پڑھی اور روح پرواز کر گئی اور گر پڑے۔ بہز بن حکیم کہتے ہیں: جو لوگ قاضی صاحب کی میت کو گھر لے گئے ان میں میں بھی تھا، امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ واقعہ بھی سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔

[۲۱۱] باب ماجاء في وصفِ صلاةِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم بالليل

[۴۵۰-] حدثنا إسحاقُ بنُ مُوسى الأنصارِيُّ، نا مَعْنٌ، نا مَالِكٌ، عن سَعِيدِ بنِ أبي سعيدٍ المقْبُرِيِّ، عن أبي سَلَمَةَ، أنَّه أخْبَرَهُ، أنَّهُ سَأَلَ عائشةَ: كيفَ كانتْ صَلاَةُ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم في رَمَضَانَ؟ فقالت: ماكانَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَزِيْدُ فِيْ رَمَضَانَ وَلاَ فِيْ غَيْرِهِ عَلَى إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً: يُصَلِّيْ أَرْبَعًا فَلاَ تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُوْلِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّيْ أَرْبَعًا فَلاَ تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وطُوْلِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّيْ ثَلاَثًا، فقالتْ عَائِشَةُ: فقلتُ يَارسولَ اللهِ! أَتَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوْتِرَ؟ فقال: "يَاعائشةُ! إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلاَ يَنَامُ قَلْبِيْ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[۴۵۱-] حدثنا إسحاقُ بنُ مُوسَى الأنْصَارِيُّ، نا مَعْنُ بنُ عيسى، نا مالكٌ، عن ابنِ شِهابٍ، عن عُرْوَةَ، عن عائشةَ: أنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم كانَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً، يُوْتِرُ مِنْهَا بِوَاحِدَةٍ، فإِذَا فَرَغَ مِنْهَا اضْطَجَعَ على شِقِّهِ الأَيْمَنِ.

حدثنا قُتَيْبَةُ، عَنْ مَالِكٍ، عن ابنِ شهابٍ نحوَه؛ قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

قوله: أنه اخبره: کہ انھوں نے یعنی ابوسلمہ نے ان کو خبر دی یعنی سعید مقبری کو بتایا کہ انھوں نے یعنی ابوسلمہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا۔

[۲۱۲] بابٌ مِنْهُ

[۴۵۲-] حدثنا أبو كُرَيْبٍ، نا وكيعٌ، عن شُعْبَةَ، عن أبي جَمْرَةَ، عن ابنِ عباسٍ، قال: كان رسولُ الله

صلى الله عليه وسلم يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[۲۱۳] بابٌ مِنْهُ

[٤٥٣-] حدثنا هَنَّادٌ، نا أبو الأَحْوَصِ، عن الأَعْمَشِ، عن إبراهيمَ، عن الأَسْوَدِ، عن عائشةَ، قالتْ: كانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ تِسْعَ رَكْعَاتٍ.

وفي الباب: عن أبي هريرةَ، وزيدِ بنِ خالدٍ، والفَضْلِ بنِ عباسٍ، قال أبو عيسى: حديثُ عائشةَ حديثٌ حسنٌ غريبٌ مِنْ هٰذا الوَجْهِ. ورَوَاهُ سُفيانُ الثوريُّ عن الأَعْمَشِ نحوَ هٰذَا، حدثنابذلك محمودُ بنُ غَيْلَانَ، نا يَحيىَ بنُ آدمَ، عن سُفيانَ، عن الأَعْمَشِ.

قال أبو عيسى: وأَكْثَرُ ما رُوِيَ عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم فِيْ صَلَاةِ اللَّيْلِ ثلاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً مَعَ الوِتْرِ، وأقلُّ مَا وُصِفَ مِنْ صَلَاتِهِ مِنَ اللَّيْلِ تسعُ رَكْعَاتٍ.

[٤٥٤-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا أبو عَوَانَةَ، عن قَتَادَةَ، عن زُرَارَةَ بنِ أَوْفَى، عن سَعْدِ بنِ هِشَامٍ، عن عَائِشَةَ، قالتْ: كانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم إِذَا لَمْ يُصَلِّ مِنَ اللَّيْلِ: مَنَعَهُ مِنْ ذٰلِكَ النَّوْمُ، أَوْ غَلَبَتْهُ عَيْنَاهُ: صَلّٰى مِنَ النَّهَارِ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

حدثنا عباسٌ هو ابنُ عَبدِ العَظِيْمِ العَنْبَرِيُّ، نا عَتَّابُ بنُ المُثَنّٰى، عن بَهْزِبْنِ حَكِيْمٍ، قال: كانَ زُرَارَةُ بنُ أَوْفَى قَاضِيَ البَصْرَةِ، فَكَانَ يَؤُمُّ فِيْ بَنِي قُشَيْرٍ، فَقَرَأَ يَوْمًا فِيْ صَلَاةِ الصُّبحِ ﴿فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيْرٌ﴾ خَرَّ مَيِّتًا، وكُنْتُ فِيمَنِ احْتَمَلَهُ إِلَى دَارِهِ.

قال أبو عيسى: وسعدُ بنُ هشامٍ: هوَ ابنُ عَامِرٍ الأَنْصَارِيُّ، وهشامُ بنُ عامرٍ: هُوَ مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

وضاحت: حدیث (۴۵۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: نبی ﷺ رات میں نو رکعتیں پڑھا کرتے تھے (اس مضمون کی روایت حضرت ابوہریرہ، زید بن خالد اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے) امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت عائشہؓ کی اس حدیث کی سند کو ''غریب'' کہا ہے، کیونکہ اعمش سے اوپر اس کی یہی ایک سند ہے، اور اعمش سے اس حدیث کو ابوالاحوص کے علاوہ سفیان ثوری بھی روایت کرتے ہیں، امام ترمذی نے ان کی سند بھی لکھی ہے ـــــ پھر فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تہجد کی رکعتوں کی تعداد مع وتر زیادہ سے زیادہ تیرہ مروی ہے اور کم

سے کم نومروی ہے (اور یہ بات پہلے بیان کی جاچکی ہے کہ یہ بات محل نظر ہے) —— اور حدیث (۴۵۴) کے ایک راوی: سعد بن ہشام ہیں۔ یہ عامر انصاری کے پوتے ہیں اور ان کے والد ہشام بن عامر صحابی ہیں۔

بابٌ في نُزولِ الرَّبِّ تبارَكَ وتَعَالىٰ إلى السَّماءِ الدُّنيا كُلَّ لَيلَةٍ

ہر رات دنیا والے آسمان پر پروردگار کا نزول فرمانا

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ہر رات دنیا والے آسمان پر اترتے ہیں جس وقت رات کا پہلا تہائی گذر جاتا ہے (غروب شمس اور صبح صادق کے درمیان جو وقت ہے اس کو تین حصوں میں تقسیم کرو، اس میں سے جب پہلا حصہ گذر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سمائے دنیا پر نزول فرماتے ہیں) اور صدا دیتے ہیں: میں شہنشاہ ہوں، کوئی ہے جو مجھ سے دعا کرے جس کی دعا میں قبول کروں؟! کوئی ہے جو مجھ سے مانگے جس کو میں عنایت کروں؟! کوئی ہے جو مجھ سے بخشش طلب کرے جس کی میں بخشش کروں؟! یہ صدا برابر دیتے رہتے ہیں یہاں تک کہ صبح صادق طلوع ہوجاتی ہے"

تشریح: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے اور آپ ہی سے ایک دوسری حدیث میں یہ بھی مروی ہے کہ جب رات کا ایک تہائی باقی رہتا ہے یعنی جب دو تہائی رات گذر جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ نزول فرماتے ہیں۔ یہ حدیث بھی اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے بلکہ اس کی سند پہلی حدیث سے بھی زیادہ شاندار ہے اور دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ایک شان دوسری شان سے غافل نہیں کرتی اور ایک تہائی رات گذرنے پر اترنا یا ایک تہائی رات باقی رہنے پر اترنا حسی اترنا نہیں ہے جو تعارض ہو بلکہ اس کا مطلب: اللہ تعالیٰ کی عنایات کا بندوں کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ اور عنایات کے متوجہ ہونے میں تشکیک (کمی زیادتی) ہے ایک تہائی رات گذرنے پر اللہ تعالیٰ کی عنایت بندوں کی طرف متوجہ ہونا شروع ہوتی ہے مگر اس وقت کم مبذول ہوتی ہے پھر جب دوسرا تہائی گذر جاتا ہے اور آخری تہائی باقی رہتی ہے تو عنایات پہلے سے زیادہ متوجہ ہوتی ہیں۔

فائدہ (۱): حدیث شریف کا سبق یہ ہے کہ رات کے یہ حصے یعنی دوسری اور تیسری تہائی برکت والے حصے ہیں۔ اس وقت بندوں کو اٹھنا چاہئے اور عبادت میں مشغول ہونا چاہئے، اور تیسری تہائی تو بہت ہی زیادہ برکت والی ہے اب تو بندوں کو اٹھنا ہی چاہئے اور عبادت میں مشغول ہونا چاہئے۔

فائدہ (۲): اللہ تعالیٰ کے سمائے دنیا پر اترنے کا مطلب صرف عنایات کا بندوں کی طرف متوجہ ہونا ہی نہیں ہے بلکہ نزول اللہ کی ایک صفت ہے جو اللہ کے لئے ثابت ہے۔ اور یہ صفات متشابہات میں سے ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کتاب الزکاۃ باب ماجاء في فضل الصدقة میں صفات متشابہات پر بحث کی ہے۔ وہاں صفت نزول پر بھی بحث آئے گی۔

[۲۱۴] بابٌ فی نزول الرب تبارك وتعالیٰ إلی السماء الدنیا کل لیلة

[۴۵۵-] حدثنا قُتَیبةُ، نا یعقوبُ بنُ عبدِ الرحمنِ الإسکندرانیُّ، عن سُهَیْلِ بنِ أبی صَالِحٍ، عن أبیهِ، عن أبی هریرةَ، أنَّ رسولَ اللهِ صلی الله علیه وسلم قال: "یَنْزِلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وتَعَالیٰ إِلَی السَّمَاءِ الدُّنْیَا کُلَّ لَیْلَةٍ، حِیْنَ یَمْضِی ثُلُثُ اللَّیْلِ الأَوَّلُ، فیقولُ: "أَنَا المَلِكُ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَدْعُوْنِیْ فَأَسْتَجِیْبَ لَهُ؟! مَنْ ذَا الَّذِیْ یَسْأَلُنِیْ فَأُعْطِیَهُ؟! مَنْ ذَا الَّذِیْ یَسْتَغْفِرُنِیْ فَأَغْفِرَ لَهُ؟! فَلاَ یَزَالُ کَذٰلِكَ حتی یُضِیْءَ الفَجْرُ"

وفی الباب: عن علیِّ بنِ أبی طَالِبٍ، وأبی سَعِیدٍ، ورِفَاعَةَ الْجُهَنِیِّ، وجُبَیْرِ بنِ مُطْعِمٍ، وابنِ مَسْعُوْدٍ، وأبی الدَّرْدَاءِ، وعُثْمَانَ بنِ أبی العاصِ.

قال أبو عیسی: حدیثُ أبی هریرةَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ؛ وقد رُوِیَ هذا الحدیثُ مِنْ أَوْجُهٍ کَثِیْرَةٍ، عن أبی هریرةَ، عن النبیِّ صلی الله علیه وسلم، أَنَّهُ قَالَ: "یَنْزِلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وتَعَالیٰ حِیْنَ یَبْقَی ثُلُثُ اللَّیْلِ الآخِرُ"؛ وهٰذا أَصَحُّ الرِّوَایَاتِ.

وضاحت: پہلی روایت میں الأولُ اور دوسری روایت میں الأخِرُ: مرفوع ہیں اور ثُلُث کی صفت ہیں اور دوسری روایت (حین یَبْقی ثلث اللیل الآخر) بخاری (حدیث ۱۱۴۵) میں ہے۔

بابُ ماجاء فی القراءۃ باللیل

تہجد میں قراءت کا بیان

تہجد میں سراً قراءت کرنا بھی جائز ہے اور جہراً قراءت کرنا بھی جائز ہے، مگر بہتر درمیانی کیفیت ہے۔ یعنی نہ تو بالکل آہستہ قراءت کرے اور نہ جہر مفرط یعنی بہت زور سے قراءت کرے، کیونکہ اگر سراً پڑھے گا تو طبیعت اکتا جائے گی اور دیر تک نہیں پڑھ سکے گا، اور اگر بہت اونچی آواز سے پڑھے گا تو تھک جائے گا، اس لئے درمیانی کیفیت سے پڑھنا بہتر ہے۔

پہلی حدیث: مسجد نبوی سے لگے ہوئے جس طرح حضور اکرم ﷺ کے حجرے تھے، شیخین: ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے حجرے بھی لگے ہوئے تھے، ایک مرتبہ آنحضور ﷺ رات میں حجرہ سے باہر تشریف لائے، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس سے گذرے، آپؐ نے محسوس کیا کہ وہ تہجد پڑھ رہے ہیں اور ہلکی آواز سے قراءت کررہے ہیں، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گھر کے پاس سے گذرے، وہ بھی تہجد میں مشغول تھے اور بہت زور سے قرآن پڑھ رہے تھے، فجر کے بعد آپؐ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "رات میں تمہارے پاس سے گذرا تم

سراً قرآن پڑھ رہے تھے، کیوں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں اس ہستی کو سنا رہا تھا جس سے سرگوشی کررہا تھا۔ آپؐ نے یہ جواب پسند کیا مگر فرمایا کہ اپنی آواز ذرا بلند کرو، یعنی ہلکے جہر سے پڑھو۔ پھر حضرت عمرؓ سے فرمایا: میں تمہارے پاس سے گذرا تم بہت زور سے پڑھ رہے تھے، کیوں؟ انھوں نے عرض کیا: میں اونگھنے والوں (یعنی سونے والوں) کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا یعنی زور سے اس لئے پڑھ رہا تھا کہ گھر میں جو لوگ سو رہے ہیں وہ بھی بیدار ہوجائیں اور تہجد میں مشغول ہوں اور شیطان بھاگے، کیونکہ جہاں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے شیطان وہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کا جواب بھی پسند کیا مگر فرمایا: ''ذرا آواز پست کرو'' یعنی بہت بلند آواز سے نہ پڑھو۔

تشریح: یہ حدیث غریب ہے، صرف یحییٰ بن اسحاق اپنی سند سے مرفوع کرتے ہیں۔ ثابت بنانی کے اکثر تلامذہ اس حدیث کو مرسل روایت کرتے ہیں یعنی سند کے آخر میں حضرت ابوقتادہ کا تذکرہ نہیں کرتے۔

فائدہ: آج کل مسلمانوں کے گھروں میں شیاطین ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں، لوگ تعویذ کراتے کراتے تھک جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ گھروں میں شیاطین کو دعوت دینے والی بہت سی چیزیں موجود ہیں، بیت الخلاء گندے ہوتے ہیں، بچوں کے کپڑے دن بھر گندے پڑے رہتے ہیں، نالیاں گندگی سے اٹی پٹی ہوتی ہیں یہ سب شیاطین کو دعوت دینے والی چیزیں ہیں۔ شیاطین کو ناپاکی اور گندگی سے خاص مناسبت ہے اور شیاطین کو بھگانے کے طریقے یعنی تلاوت قرآن ذکر الٰہی وغیرہ لوگوں نے چھوڑ دیئے ہیں۔ اس لئے گھروں میں شیاطین حاضر رہتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس گھر میں قرآن بلند آواز سے پڑھا جاتا ہے شیاطین ٹھہر نہیں سکتے۔

دوسری حدیث: عبداللہ بن ابی قیس کہتے ہیں: میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: رسول اللہ ﷺ تہجد میں قراءت کس طرح فرماتے تھے؟ سراً یا جہراً؟ صدیقہؓ نے جواب دیا: ''ہر طرح قرآن پڑھتے تھے، کبھی سراً پڑھتے تھے کبھی جہراً'' یہ گنجائش سن کر راوی نے کہا: تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جس نے معاملہ میں گنجائش رکھی!

تشریح: رسول اللہ ﷺ سے تہجد میں ہر طرح تلاوت کرنا ثابت ہے، آپ کبھی سراً تلاوت فرماتے تھے کبھی جہراً، کبھی ایک رکعت میں سراً اور دوسری رکعت میں جہراً پڑھتے تھے، کبھی ایک ہی رکعت میں کچھ جہراً پڑھتے تھے اور کچھ سراً۔ پس تہجد میں جس طرح جی چاہے تلاوت کرنے کی اجازت ہے۔

تیسری حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک رات قرآن کی ایک آیت کے ساتھ کھڑے رہے، یعنی پوری رات تہجد کی نماز میں ایک ہی آیت پڑھتے رہے۔

تشریح: آنحضور ﷺ نے ایک مرتبہ پورا تہجد سورۂ انعام کی (آیت ۱۱۸) ﴿ إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ کے ذریعہ پڑھا ہے، یعنی ہر رکعت میں بار بار اسی آیت کو پڑھتے تھے۔ یہاں سے یہ مسئلہ نکلا کہ جو شخص حافظ قرآن نہیں یا جس کو ایک آدھ سورت ہی یاد ہے اگر وہ لمبا تہجد پڑھنا چاہے تو اس کا

طریقہ یہ ہے کہ جو سورت یاد ہے اسی کو بار بار پڑھے، کیونکہ فرائض میں تو آیت یا سورت کی تکرار ٹھیک نہیں، مگر نوافل میں اس کی گنجائش ہے۔

جاننا چاہئے کہ بعض احناف نے اس حدیث سے نماز میں فاتحہ فرض نہ ہونے پر استدلال کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس رات حضور اکرم ﷺ نے صرف یہی ایک آیت پڑھی تھی، فاتحہ نہیں پڑھی تھی، مگر اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ آپؐ نے اس رات فاتحہ نہیں پڑھی تھی ممکن ہے فاتحہ پڑھنے کے بعد سورت کی جگہ آپؐ نے بار بار یہ آیت پڑھی ہو، اس لئے مذکورہ استدلال تام نہیں۔

[۲۱۵] باب ماجاء في القراءة بالليل

[٤٥٦-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلاَنَ، نا يَحيىَ بنُ إسحاق، نا حَمَّادُ بنُ سَلَمَةَ، عن ثابتٍ البُنَانِيِّ، عن عبدِ اللهِ بنِ رَبَاحٍ الأنصارِيِّ، عن أبي قَتَادَةَ، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال لِأَبِيْ بَكْرٍ: "مَرَرْتُ بِكَ وَأَنْتَ تَقْرَأُ، وأَنْتَ تَخْفِضُ مِنْ صَوْتِكَ؟" فَقَالَ: إِنِّيْ أَسْمَعْتُ مَنْ نَاجَيْتُ، قال: "ارْفَعْ قَلِيْلاً" وقال لِعمَرَ: "مَرَرْتُ بِكَ وَأَنْتَ تَقْرَأُ وَأَنْتَ تَرْفَعُ صَوْتَكَ؟" فقال: إني أُوْقِظُ الوَسْنَانَ وَأَطْرُدُ الشيطانَ، قال: "اخْفِضْ قَلِيْلاً"

وفي الباب: عن عائشةَ، وأُمِّ هانيءٍ، وأنسٍ، وأُمِّ سلمةَ، وابنِ عباسٍ.

[٤٥٧-] حدثنا قُتَيبَةُ، نا اللَّيْثُ، عن مُعاويةَ بنِ صالحٍ، عن عبدِ اللهِ بنِ أبي قَيْسٍ، قال: سَأَلْتُ عائشةَ كَيْفَ كانَ قِرَاءَةُ النبيِّ صلى الله عليه وسلم بِاللَّيْلِ أكان يُسِرُّ بالقراءة أم يَجْهَرُ؟ فقالت: كُلُّ ذٰلِكَ قَدْ كَانَ يَفْعَلُ، رُبَّمَا أَسَرَّ بِالْقِرَاءَةِ وَرُبَّمَا جَهَرَ، فقلتُ: الحمدُ للهِ الذي جَعَلَ في الأَمْرِ سَعَةً.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ صحيحٌ غريبٌ.

قال أبو عيسى: حديثُ أبي قتادةَ حديثٌ غريبٌ، وإِنَّمَا أَسْنَدَهُ يَحيىَ بنُ إسحاق عن حَمَّادِ بنِ سَلَمَةَ، وأَكْثَرُ النَّاسِ إِنَّمَا رَوَوْا هٰذَا الحديثَ عن ثابتٍ، عن عبدِ اللهِ بنِ رَبَاحٍ مُرْسَلاً.

[٤٥٨-] حدثنا أبوبكرٍ محمدُ بنُ نافعٍ البَصْرِيُّ، نا عبدُ الصَّمَدِ بنُ عبدِ الوارثِ، عن إسماعيلَ بنِ مسلمٍ العَبْدِيِّ، عن أبي المُتَوَكِّلِ النَّاجِيِّ، عن عائشةَ، قالت: قامَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم بِآيَةٍ مِنَ الْقُرآنِ لَيْلَةً.

قال أبوعيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ من هذا الوجه.

ترجمہ: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابوقتادہ کی حدیث غریب ہے اس کو یحییٰ بن اسحاق نے حماد بن سلمہ سے

روایت کرتے ہوئے مرفوع کیا ہے، اور اکثر محدثین اس حدیث کو ثابت بنانی کی سند سے عبداللہ بن رباح سے مرسل روایت کرتے ہیں۔

بابُ ماجاء فی فَضلِ صَلاَةِ التَّطَوُّعِ فی البَیْتِ

نفل نماز گھر میں پڑھنا افضل ہے

پہلی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری نمازوں میں زیادہ فضیلت والی نماز وہ ہے جسے تم گھروں میں پڑھو، مگر فرائض مستثنیٰ ہیں''یعنی فرائض کے علاوہ دیگر نمازوں میں زیادہ ثواب ان کو گھر میں پڑھنے میں ہے۔

تشریح: یہ مسئلہ پیچھے تفصیل سے گذر چکا ہے۔ وہاں ہم نے یہ بات بتائی تھی کہ بدلے ہوئے حالات میں علماء نے واجب اور سنن مؤکدہ کو فرائض کے ساتھ لاحق کیا ہے، یعنی فرض، واجب اور سنن مؤکدہ مسجد میں پڑھے، باقی نوافل گھر میں افضل ہیں۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اپنے گھروں میں نماز پڑھو، اور ان کو قبریں مت بناؤ''

تشریح: اس حدیث میں دو مسئلے ہیں:

پہلا مسئلہ: یہ ہے کہ گھروں میں نمازیں پڑھنی چاہئیں تاکہ گھروں میں برکت ہو، اور گھر کے دیگر افراد: بیوی، بچے اور بھائی بہنوں کو ترغیب ہو، البتہ اس حکم سے فرائض مستثنیٰ ہیں، کیونکہ مسجدیں فرائض کی ادائیگی کے لئے بنائی گئی ہیں پس اگر لوگ فرض نمازیں بھی گھر میں پڑھیں گے تو مسجدیں ویران ہوجائیں گی، اسی لئے اوپر والی حدیث میں فرائض کا استثناء کیا ہے، اور علماء نے واجب اور سنن مؤکدہ کو فرائض کے تابع کیا ہے۔

دوسرا مسئلہ: گھروں میں تدفین نہیں کرنی چاہئے، تدفین گورغریباں میں ہونی چاہئے —— اور دونوں مسئلوں کو ایک ساتھ بیان کرنے میں حکمت یہ ہے کہ گھروں میں نمازیں پڑھنی ہے، اگر گھروں میں قبریں بھی ہونگی تو ہوسکتا ہے کہ نماز میں قبر سامنے پڑے، حالانکہ قبر کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کی ممانعت آئی ہے (یہ حدیث کتاب الجنائز میں آئے گی)

فائدہ: کسی بزرگ کی قبر کے قریب مسجد بنانا یا مسجد میں یا مسجد کے آس پاس کسی کو دفن کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ تفصیل سے باب ماجاء فی کراھیة أن یُّتخذَ علی القبر مسجد کے تحت گذر چکا ہے، اور اس حدیث میں یہ حکم ہے کہ گھر میں کسی بزرگ کی یا عام مسلمانوں کی قبر بنانا جائز نہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کی تدفین جو مسجد کے قریب اور مکان کے اندر ہوئی ہے وہ آپ کی خصوصیت ہے۔ آنحضور ﷺ جس جگہ مدفون ہیں پہلے وہ جگہ مسجد سے خارج اور مسجد سے قریب تھی اب وہ جگہ مسجد میں داخل ہوچکی ہے۔

نوٹ: اس حدیث کے دوسرے جزء کا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ گھروں کو قبریں نہ بناؤ یعنی اعمال سے معطل نہ کرو۔ جس طرح قبرستان میں کوئی عمل نہیں ہوتا، بس مردے پڑے ہیں، اسی طرح گھروں کو صرف پڑنے کی جگہ مت بناؤ، بلکہ ان میں نمازیں بھی پڑھو۔ اگر یہ مطلب لیا جائے تو حدیث کے دونوں جزوں میں ارتباط ظاہر ہے، دوسرا جزء گویا پہلے جزء کی تعلیل ہے۔

[۲۱۶] باب ماجاء فی فضل صلاة التطوع فی البیت

[۴۵۹-] حدثنا محمدُ بنُ بَشّارٍ، نا محمدُ بنُ جَعْفَرٍ، نا عبدُ اللهِ بنُ سَعیدِ بن أبی هِنْدٍ، عن سالمٍ أبی النَّضرِ، عن بُسْرِ بنِ سَعیدٍ، عن زَیْدِ بنِ ثَابِتٍ، عن النبیِّ صلی الله علیه وسلم قال: "أَفْضَلُ صَلاَتِکُمْ فِیْ بُیُوْتِکُمْ إِلاَّ الْمَکْتُوْبَةَ"

وفی الباب: عن عُمَرَ بنِ الخطابِ، وجابرِ بنِ عبدِ اللهِ، وأبی سعیدٍ، وأبی هریرةَ، وابنِ عُمَرَ، وعائشةَ، وعبدِ اللهِ بنِ سعدٍ، وزیدِ بنِ خالدٍ الجُهَنِیِّ.

قال أبو عیسی: حدیثُ زیدِ بنِ ثابتٍ حدیثٌ حسنٌ؛ وقد اخْتَلَفُوْا فِیْ رِوَایَةِ هذا الحدیثِ، فَرَوَاهُ مُوْسَی بنُ عُقْبَةَ، وإبراهیمُ بنُ أبی النَّضرِ مَرْفُوْعًا، وأَوْقَفَهُ بَعْضُهُمْ؛ ورَوَاهُ مالِكٌ، عن أبی النَّضرِ، ولم یَرْفَعْهُ، والحدیثُ المَرْفُوْعُ أَصَحُّ.

[۴۶۰-] حدثنا إسحاقُ بنُ مَنْصُوْرٍ، نا عبدُ اللهِ بنُ نُمَیْرٍ، عن عُبَیْدِ اللهِ بنِ عُمَرَ، عن نَافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، عنِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم قال: "صَلُّوْا فِیْ بُیُوْتِکُمْ، وَلاَ تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْرًا"

قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

ترجمہ: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت زید بن ثابت کی حدیث حسن ہے، اور اس حدیث کی روایت میں رواۃ نے اختلاف کیا ہے۔ پس موسیٰ بن عقبہ اور ابراہیم بن ابی النضر اس کو مرفوع کرتے ہیں، اور بعض رُوات اس کو موقوف کرتے ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ نے اس کو ابوالنضر سے روایت کیا ہے اور مرفوع نہیں کیا، اور حدیث مرفوع زیادہ صحیح ہے۔

وضاحت: یہ حدیث ابوالنضر سالم بن ابی امیہ تیمی سے چار حضرات روایت کرتے ہیں۔ اور تین حدیث کو مرفوع کرتے ہیں اور ایک موقوف کرتا ہے یعنی حضرت زید کا قول قرار دیتا ہے، پس اصح تین راویوں کی روایت ہے۔ وہ تین راوی: عبداللہ بن سعید بن ابی ہند (ان کی روایت باب کے شروع میں ہے) اور ابوالنضر سالم کے لڑکے ابراہیم (جو وَرَدان سے مشہور ہیں اور جن کی روایت طبرانی کی معجم کبیر ۵: ۱۴۴ میں ہے) اور امام المغازی موسیٰ بن عقبہ (ان

کی روایت بخاری حدیث ۷۳۱ میں ہے) ہیں۔ یہ تینوں یہ روایت ابوالنضر سالم سے روایت کرتے ہیں اور مرفوع کرتے ہیں اور صرف امام مالکؒ اس حدیث کو ابوالنضر سالم سے روایت کرتے ہیں اور موقوف بیان کرتے ہیں۔

أَبْوَابُ الوِتْرِ

بَابُ ماجاء فی فَضْلِ الوِتْرِ

وتر کی فضیلت کا بیان

احناف کے نزدیک وتر واجب ہے باقی ائمہ کے نزدیک سنت ہے، لیکن یہ ایسی سنت ہے جس کا ترک ان کے یہاں بھی جائز نہیں، جس طرح عیدین کی نماز ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سنت ہے مگر وہ اس کے ترک کے روادار نہیں۔ اور حنفیہ کے نزدیک عیدین بھی واجب ہیں، اور واجب اور فرض میں عمل کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، دونوں پر عمل ضروری ہے البتہ عقیدہ کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے۔ فرض کو فرض ماننا ضروری ہے، اس کا منکر کافر ہے، اور واجب کو واجب ماننا ضروری نہیں اس کا منکر کافر یا گمراہ نہیں۔

اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ واجب ایک فقہی اصطلاح ہے۔ اس کا درجہ فرض اور سنت مؤکدہ کے درمیان ہے اور یہ اصطلاح احناف نے تجویز کی ہے۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک علی وجہ البصیرت یہ اصطلاح نہیں ہے، ہاں کہیں کہیں وہ بھی ''واجب'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں مگر احکام شرعیہ میں واجب ایک مستقل حکم ہے جو فرض اور سنت مؤکدہ کے درمیان ہے، اس طرح یہ مرتبہ ان کے ذہنوں میں واضح نہیں، چنانچہ تمام وہ احکام جو دلائل کی رو سے واجب کے مرتبہ میں ہیں، ائمہ ثلاثہ ان کو اِدھر اُدھر کر دیتے ہیں، بعض کو فرض کے خانے میں رکھ دیتے ہیں اور بعض کو سنت کے خانہ میں، کیونکہ ان کے یہاں واجب کا کوئی خانہ علی وجہ البصیرت نہیں ہے۔ مثلاً صدقۂ فطر کو ائمہ ثلاثہ فرض کہتے ہیں اس لئے کہ حدیث میں لفظ فَرَضَ آیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۸۱۵) اور وتر، عیدین اور قربانی کو سنت کہتے ہیں کیونکہ ان میں حدیثوں میں ایسا کوئی لفظ نہیں آیا اور احناف چاروں کو یعنی صدقۂ فطر، وتر، عیدین اور قربانی کو واجب کہتے ہیں۔

اس کے بعد چند باتیں جاننی چاہئیں:

پہلی بات: تہجد اور وتر کی روایات میں بہت الجھاؤ ہے، کہیں تہجد اور وتر دونوں کو ''صلاۃ اللیل'' کہا گیا ہے، کہیں دونوں کے مجموعہ کو ''صلاۃ الوتر'' کہا گیا ہے، اور کہیں حقیقت کے پیش نظر تہجد کو ''صلاۃ اللیل'' اور آخر میں جو تین رکعت پڑھی جاتی ہیں ان کو ''صلاۃ الوتر'' کہا گیا ہے۔ یہ جو روایات میں الجھاؤ ہے یعنی مختلف اطلاقات ہیں اس کی وجہ سے یہ مسئلہ اختلافی اور پیچیدہ ہو گیا ہے۔

غرض وتر اور صلاۃ اللیل (تہجد) ایک نماز ہیں یا الگ الگ؟ اس میں اختلاف ہے: امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کے نزدیک الگ الگ نمازیں ہیں، پھر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک وتر تین رکعتیں: دو قعدوں اور ایک سلام کے ساتھ ہیں، اور واجب ہیں۔ رات کی باقی نماز صلاۃ اللیل ہے اور سنت ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک وتر تین رکعتیں: دو سلام سے مستحب ہیں، ایک سلام سے مکروہ ہیں۔ اور وتر سنت ہیں، اسی طرح رات کی نماز بھی سنت ہے مگر وتر آکد ہیں یعنی ان کی زیادہ تاکید آئی ہے اور ان کو چھوڑنا جائز نہیں۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک وتر صرف ایک رکعت ہے اور سنت ہے مگر اس سے پہلے تہجد کا دوگانہ ضروری ہے یعنی امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ایک رکعت وتر سے پہلے جو دوگانہ ہے وہ وتر میں شامل ہے، اس کے علاوہ نماز تہجد ہے، اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک ایک رکعت وتر سے پہلے جو بھی نفل نماز ہے وہ صلاۃ اللیل ہے، مگر صرف ایک رکعت پڑھنا صحیح نہیں، تہجد کے دوگانہ کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تہجد اور وتر ایک ہی نماز ہیں۔ فرق برائے نام ہے۔ اور دونوں سنت ہیں، مگر وتر زیادہ مؤکد ہیں، ان کے نزدیک ایک سے گیارہ تک سب وتر بھی ہیں اور صلاۃ اللیل بھی۔ اور تیرہ رکعتیں صلاۃ الوتر ہیں یا نہیں؟ اس میں ان کے یہاں اختلاف ہے، اور تیرہ سے زیادہ صلاۃ الوتر نہیں ہیں اور ان کو پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیرے اور آخر میں ایک رکعت علحدہ پڑھے، غرض چاروں ائمہ متفق ہیں کہ وتر کی صرف ایک رکعت پڑھنا جائز نہیں، کم از کم تین رکعت پڑھنا ضروری ہے۔ قاضی ابوالطیب (شافعی) نے ایک رکعت وتر پڑھنے کو مکروہ لکھا ہے۔ اور امام احمد اور امام مالک رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے (معارف السنن ۴: ۱۶۸)

دوسری بات: چاروں ائمہ متفق ہیں کہ وتر کا وقت مقرر ہے، یعنی عشاء کے بعد سے صبح صادق تک اس کا وقت ہے اور جو شخص وتر پڑھنا بھول جائے یا سوتا رہ جائے تو یاد آنے پر یا بیدار ہونے پر اس کی قضا ضروری ہے پھر اس میں اختلاف ہوا ہے کہ قضا کب تک ہے؟ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک ابداً قضا ہے یعنی جس طرح فرض کی قضا پوری زندگی میں کرنی ضروری ہے اسی طرح وتر کی قضا بھی ضروری ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک قضا کا وقت فجر کی نماز تک ہے، فجر پڑھنے سے پہلے پہلے قضا کر لینے ضروری ہیں، اگر فجر کی نماز پڑھ لی تو قضا کا وقت گذر گیا۔

تیسری بات: رسول اللہ ﷺ نے وتر مواظبت تامہ کے ساتھ پڑھے ہیں۔ زندگی میں ایک بار بھی قضا نہیں کئے۔ اور انیس روایات ہیں جو وتر کے وجوب پر دلالت کرتی ہیں، اگرچہ ہر حدیث کی سند میں تھوڑا بہت کلام ہے مگر مجموعہ حسن لغیرہ ہو کر قابل استدلال ہے (وہ سب روایات ہدایہ کی تخریج نصب الرایہ میں اور بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں جمع کی گئی ہیں)

غرض وتر کے بارے میں پانچ باتیں اکٹھا ہوئی ہیں جن کی وجہ سے احناف نے وتر کے وجوب کا قول کیا ہے:

ایک: انیس روایات ہیں جن میں وتر کی غایت درجہ تاکید آئی ہے۔

دوسری: آنحضرت ﷺ کا وتر کو مواظبت تامہ کے ساتھ ادا فرمانا۔ زندگی میں ایک بار بھی ترک نہ کرنا، اگر وتر واجب نہ ہوتے تو بیانِ جواز کے لئے ایک ہی بار سہی، آپ وتر ترک فرماتے، تاکہ امت حقیقتِ حال سے واقف ہوتی۔

تیسری: وتر کے وقت کا مقرر ہونا، عشاء کے بعد سے طلوع فجر تک وتر کا وقت ہے، اور یہ شان فرائض کی ہے، نوافل کے لئے اس طرح اوقات کی تعیین نہیں کی گئی۔

چوتھی: اگر کوئی شخص وتر پڑھنا بھول جائے یا سوتا رہ جائے تو یاد آنے پر یا بیدار ہونے پر بالاتفاق اس کی قضا ہے، اور یہ شان بھی فرائض ہی کی ہے۔ نوافل کی اگرچہ وہ سنت مؤکدہ ہوں قضا نہیں۔

پانچویں: وتر نہ پڑھنے کی کسی مجتہد نے اجازت نہیں دی، جو حضرات سنت کہتے ہیں وہ بھی ترک کے روادار نہیں، امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو وتر نہیں پڑھتا اس کو سزا دی جائے گی اور وہ مردود الشہادۃ ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو شخص بالقصد وتر چھوڑتا ہے وہ برا آدمی ہے اور اس کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ امام شافعی رحمہ اللہ بھی قریب قریب یہی بات کہتے ہیں۔

مذکورہ پانچوں باتوں میں اگر غور کیا جائے تو وتر کی فرائض سے مشابہت صاف نظر آئے گی، پھر وتر کو واجب کہا جائے یا سنت اس کا پڑھنا بالاتفاق ضروری ہے پس اختلاف محض لفظی ہے حقیقتِ وجوب کے سب قائل ہیں۔

حدیث: خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ حجرۂ مبارک سے ہمارے پاس (مسجد میں) تشریف لائے، پس فرمایا: ''بیشک اللہ نے تمہارے پاس ایک نماز کی کمک بھیجی ہے'' (کسی جگہ فوج برسرِ پیکار ہو ان کی مدد کے لئے پیچھے سے مزید فوج بھیجی جائے تو اس کو اردو میں کمک اور عربی میں امداد (اضافہ) کہتے ہیں) ''وہ نماز تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے'' (عربوں کے نزدیک سرخ اونٹ بہت قیمتی مال سمجھا جاتا تھا، آج کی اصطلاح میں کہیں گے: وہ نماز تمہارے لئے بنگلوں اور مرسڈیز کاروں سے بہتر ہے) ''وہ وتر کی نماز ہے'' (الوتر سے پہلے ھو پوشیدہ ہے اور یہ مستقل جملہ ہے، یعنی: ھو الوتر) ''اللہ تعالیٰ نے اس کو تمہارے فائدہ کے لئے عشاء کی نماز اور طلوع فجر کے درمیان مقرر کیا ہے''

تشریح: یہ حدیث ان انیس روایتوں میں سے ایک ہے جو وتر کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر فضلُ الوتر کا باب اس لئے قائم کیا ہے کہ اس کا جواب نہ دینا پڑے اور قاری کا ذہن دوسری طرف منتقل ہو جائے وہ یہ خیال کرے کہ یہ تو فضیلت کی روایت ہے گویا حضرت مصنف رحمہ اللہ نے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں، پھر اگلے باب میں حجازیوں کے لئے دلیل لائے ہیں، حالانکہ یہ معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، جس طرح حجازیوں کے لئے باب لائے ہیں عراقیوں کے لئے بھی باب قائم کرنا چاہئے تھا چاہے الگ سے باب لاتے یا یہاں ایسا عنوان رکھتے جس سے پتا چلتا کہ عراقی علماء وتر کے وجوب پر اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ یہ

حضرت مصنف رحمہ اللہ کا طریقہ ہے۔ علاوہ ازیں یہ بات سنن کے موضوع کے بھی خلاف ہے کیونکہ کتاب کا موضوع فقہاء کے مستدلات اکٹھا کرنا ہے۔

اس حدیث میں غور کیا جائے تو اس طرف اشارہ ملتا ہے کہ وتر واجب ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو فرضوں کے لئے کمک (اضافہ) کہا ہے اور کسی چیز میں اضافہ اسی کی جنس سے کیا جائے تبھی امداد کہلاتا ہے، فوج کی مدد کے لئے پیچھے سے فوجی روانہ کئے جائیں تو ہی وہ کمک ہے، اگر عام لوگ روانہ کئے جائیں تو وہ کمک نہیں۔ غرض وتر حقیقی کا عملاً فرضوں کی طرح ہونا اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے، مگر چونکہ فرضوں کا ثبوت قرآن سے ہے یعنی دلیل قطعی اور تواتر سے ہے اس لئے ان پر فرض کا اطلاق کیا جاتا ہے اور وتر کا ثبوت دلیل قطعی سے نہیں ہے بلکہ اخبار آحاد سے ہے یعنی دلائل ظنیہ سے ہے اس لئے اس پر واجب کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

أبواب الوتر

[۲۱۷] باب ماجاء فی فضل الوتر

[٤٦١-] حدثنا قُتيبةُ، حدثنا الليثُ بنُ سَعْدٍ، عن يَزِيْدَ بنِ أبی حَبِيْبٍ، عن عبدِ اللهِ بنِ راشِدٍ الزَّوْفِيِّ، عن عبدِ اللهِ بنِ أبی مُرَّةَ الزَّوْفِيِّ، عن خارِجَةَ بنِ حُذَافَةَ، أنَّهُ قالَ: خَرَجَ عَلَيْنَارسولُ الله صلى الله عليهوسلم فقال: " إِنَّ اللّهَ أَمَدَّكُمْ بِصَلاَةٍ هِيَ خَيْرٌ لَكُمْ مِنْ حُمْرِ النَّعَمِ، الوِتْرُ، جَعَلَهُ اللّهُ لَكُمْ فِيمَا بَيْنَ صَلاَةِ العِشَاءِ إِلَى أَنْ يَطْلُعَ الفَجْرُ"

وفی البابِ: عن أبی هريرةَ، وعبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، وبُرَيْدَةَ، وأبی بَصْرَةَ صاحبِ النبیِّ صلى الله عليه وسلم.

قال أبو عيسى: حديثُ خارِجَةَ بنِ حُذافَةَ حديثٌ غريبٌ لاَنَعْرِفُهُ إِلاَّ مِنْ حَديثِ يزيدَ بنِ أبی حبيبٍ؛ وقد وَهِمَ بَعْضُ المحدِّثِيْنَ فِي هذا الحديثِ، فقال: عبدُ اللهِ بنُ راشدِ الزُّرَقِيُّ،وَهُوَ وَهْمٌ.

وضاحت: خارجۃ بن حذافۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث غریب ہے کیونکہ یزید بن ابی حبیب سے آخر تک ایک سند ہے۔ اور یزید بن ابی حبیب کے استاذ عبداللہ بن راشد مستور ہیں اور استاذ الاستاذ عبداللہ بن ابی مُرّۃ مجہول ہیں اور عبداللہ بن راشد کی نسبت زَوْفی ہے۔ بعض محدثین نے زُرَقی نسبت بیان کی ہے وہ ان کا وہم ہے۔

فائدہ: وتر کے وقت کی تعیین میں عام مسلمانوں کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، تہجد گذاروں کی رعایت کر کے اس کا وقت تجویز نہیں کیا گیا، کیونکہ اکثر مسلمان رات کے آخری حصہ میں اٹھ نہیں پاتے، اور جو بندے آخر رات میں

عبادت کے لئے اٹھتے ہیں وہ ایک فیصد ہوتے ہیں اور قانون سازی میں سواد اعظم کی رعایت کی جاتی ہے، اس لئے وتر کا وقت عشاء کے بعد ہی سے رکھا گیا تا کہ جو شخص اٹھنے کا ارادہ نہیں رکھتا وہ وتر پڑھ کر سوئے، اور تہجد گذاروں کو تہجد کے بعد وتر پڑھنا چاہئے یہی ان کے لئے مستحب ہے۔

بابُ ماجاءَ أنَّ الْوِتْرَ لَيْسَ بِحَتْمٍ

وتر واجب نہیں

حدیث: باب میں جو حدیث ہے وہ موقوف ہے یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے مگر وہ حکماً مرفوع ہے۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وتر تمہاری فرض نمازوں کی طرح واجب نہیں، بلکہ یہ طریقہ رسول اللہ ﷺ نے جاری کیا ہے (اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے قول کی تائید میں حدیث مرفوع لائے ہیں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''بیشک اللہ تعالیٰ یگانہ ہیں، وہ طاق کو پسند کرتے ہیں'' (پہلے لفظ وتر کے معنی ہیں یگانہ یعنی جس میں دوئی کی بُو بھی نہ ہو، اور دوسرے وتر کے معنی ہیں طاق۔ چونکہ طاق میں یگانہ پن کا شائبہ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ طاق کو پسند کرتے ہیں۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حافظوں کو نصیحت کی) ''اے حافظو! وتر (تہجد) پڑھا کرو'' کیونکہ جو حافظ تہجد میں قرآن پڑھتے ہیں قرآن ان کی نوک زبان ہوتا ہے اور حقیقت میں حافظ وہی ہوتے ہیں، اکثر حفاظ تو رمضانی حافظ ہوتے ہیں۔ دن بھر میں ایک پارہ یاد کر کے سنا دیتے ہیں پھر اُسے بھول جاتے ہیں۔

تشریح: اس حدیث سے ائمہ ثلاثہ نے وتر کے عدم وجوب پر استدلال کیا ہے۔ اس لئے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وتر کے واجب ہونے کی نفی کی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ یہ طریقہ رسول اللہ ﷺ نے جاری کیا ہے۔ پس وتر پڑھو تو سبحان اللہ، نہ پڑھو تو کوئی بات نہیں۔

اور بعض احناف نے اس حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نفسِ وجوب کی نفی نہیں کی، بلکہ فرائض خمسہ کے مانند واجب ہونے کی نفی کی ہے۔ اور احناف وتر کو فرائض خمسہ کی طرح فرض نہیں کہتے بلکہ اس سے نیچے کے درجہ میں واجب قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ جواب ٹھیک نہیں، کیونکہ فرض اور واجب میں جو درجاتی فرق ہے وہ یہاں زیر بحث نہیں۔ یہ اصطلاحات تو فقہاء کے دور میں پیدا ہوئی ہیں۔ صحابہ کے زمانہ میں یہ اصطلاحات نہیں تھیں، بلکہ مراد عمل کے اعتبار سے ہے یعنی وتر عملی اعتبار سے ضروری نہیں، بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کا جاری کردہ طریقہ ہے، پڑھنا چاہو تو پڑھو، نہ چاہو تو نہ پڑھو، جبکہ احناف عملی اعتبار سے وتر کو ضروری کہتے ہیں۔

پس صحیح بات یہ ہے کہ یہاں الوتر سے حقیقی وتر مراد نہیں، بلکہ تہجد کی نماز مراد ہے، یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تہجد کی ترغیب دی اور فرمایا: تہجد عملی اعتبار سے ضروری نہیں، کیونکہ وہ سنت ہے مگر قرآن یاد رکھنے کے لئے یہ عمل اکسیر

ہے، اس لئے کہ جب حافظ روزانہ تہجد پڑھے گا اور اس میں دو تین پارے پڑھے گا تو قرآن نوک زباں رہے گا، اور وہ قرآن کبھی نہیں بھولے گا۔ علاوہ ازیں تہجد اللہ کو بہت پسند ہے کیونکہ جو تہجد گذار بندے ہیں وہ تہجد کے بعد وتر پڑھیں گے تو سارا مجموعہ وتر (طاق) ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کو طاق پسند ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''بیشک اللہ تعالیٰ یگانہ ہیں، طاق کو پسند کرتے ہیں'' لہٰذا حافظوں کو چاہئے کہ وہ تہجد کا اہتمام کریں۔ حدیث کا یہی مطلب ہے۔ پس یہ حدیث حنفیہ کے خلاف نہیں، اور ائمہ ثلاثہ کی دلیل بھی نہیں۔ غرض حدیث مذکور میں وتر کا لفظ تہجد اور وتر کے مجموعہ پر بولا گیا ہے اور مقصود تہجد پڑھنے کی ترغیب دینا ہے۔

فائدہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کے راوی ابوبکر بن عیاش بھی ہیں اور سفیان ثوری بھی، دونوں حضرات ابواسحاق سے، وہ عاصم بن ضمرۃ سے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، اور سفیان ثوری کی حدیث میں آخری جملہ: قال: إن اللہ وتر آخر تک نہیں ہے۔ یہ زیادتی صرف ابوبکر بن عیاش کی حدیث میں ہے، اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے ابوبکر بن عیاش والی حدیث کو صرف حسن کہا ہے۔ اور سفیان ثوری کی حدیث کو جو کہ مختصر ہے اصح قرار دیا ہے، مگر حضرت مصنف رحمہ اللہ کا یہ فیصلہ صحیح نہیں، کیونکہ سفیان ثوری کی حدیث کو اصح کہنے کی کوئی وجہ ترجیح نہیں کیونکہ اگر ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ سفیان کے متابع ہیں (وغیرہ میں اشارہ ہے) تو ابوبکر بن عیاش کے بھی متابع منصور بن المعتمر ہیں اس لئے یہ بات وجہ ترجیح نہیں بن سکتی۔ اور دونوں حدیثوں کے تمام راوی ثقہ ہیں اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں کوئی کم نہیں۔ فرق بس اتنا ہے کہ سفیان ثوری کی حدیث مختصر ہے اور ابوبکر بن عیاش کی حدیث مفصل اور ثقہ کی زیادتی بالاجماع معتبر ہے۔

[۲۱۸] باب ماجاء أن الوتر لیس بحتم

[۴۶۲-] حدثنا أبو کُریبٍ، نا أبوبکرِ بنُ عَیَّاشٍ، نا أبو إسحاق، عن عاصمِ بنِ ضَمْرَۃَ، عن عليٍّ، قال: الوترُ لَیسَ بِحَتْمٍ کَصَلَاتِکُم المَکْتُوبَۃِ، ولکِنْ سَنَّ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، قال: ''إنَّ اللہ وِتْرٌ یُحِبُّ الوِتْرَ'' فأَوْتِرُوْا یا أهلَ القُرآنِ.

وفی الباب: عن ابنِ عُمرَ، وابنِ مسعودٍ، وابنِ عباسٍ.

قال أبو عیسی: حدیثُ عليٍّ حدیثٌ حسنٌ.

[۴۶۳-] ورَوَی سُفیانُ الثَّوْرِيُّ وغَیرُہُ عن أبی إسحاق، عن عاصمِ بنِ ضَمْرَۃَ، عن عليٍّ، قال: الوترُ لَیسَ بِحَتْمٍ کَهَیْئَۃِ الصَّلَاۃِ المَکْتُوبَۃِ، ولکِنْ سُنَّۃٌ سَنَّهَا رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؛ حدثنا بذلِکَ بُنْدَارٌ، نا عبدُ الرحمنِ بنُ مَهْدِيٍّ، عن سفیانَ؛ وهذا أَصَحُّ مِن حدیث أبی بکر بنِ عَیَّاشٍ؛ وقد رَوَی منصورُ بنُ المُعْتَمِرِ، عن أبی إسحاق، نحوَ روایۃِ أبی بکرِ بنِ عَیَّاشٍ.

نوٹ: اس حدیث میں خاص توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس میں مرفوع روایت صرف إن الله وتر، یحب الوتر ہے۔ اور یہ ایک مستقل روایت ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بات کی تائید میں پیش کیا ہے۔ باقی آگے پیچھے حضرت علیؓ کا قول ہے اور راوی ایسا کرتے ہیں۔ فاتحہ خلف الامام کی حدیث میں بھی حضرت عبادۃ رضی اللہ عنہ نے ایک عام حدیث کو آنحضور ﷺ کے ایک واقعہ کے ساتھ ملایا ہے، جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے —— دوسری بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت علیؓ کے قول میں وتر سے نماز تہجد مع وتر مراد ہے، صرف وتر حقیقی مراد نہیں ہے۔

بَابُ ماجاء فی کَرَاهِيَةِ النَّوْمِ قَبْلَ الوِتْرِ

وتر سے پہلے سونے کی کراہیت

پیچھے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ نصوص میں وتر اور صلاۃ اللیل کے مجموعہ پر وتر کا بھی اطلاق کیا جاتا ہے، اور صلاۃ اللیل کا بھی، اور کبھی حقیقت کا لحاظ کر کے علحدہ علحدہ اطلاقات آئے ہیں، اس لئے احادیث کو غور سے دیکھنا ضروری ہے کہ کہاں تہجد مراد ہے اور کہاں وتر حقیقی اور کہاں دونوں کا مجموعہ۔ اگر اس نقطہ سے ذہن ہٹ گیا تو روایات سمجھنے میں بہت دشواری ہوگی۔

پہلی حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مجھے رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ میں سونے سے پہلے وتر پڑھ لوں (رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم ابوذر غفاری اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہما کو بھی دیا ہے)

تشریح: اس حدیث میں وتر سے کیا مراد ہے؟ امام ترمذی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ وتر حقیقی مراد ہے اور یہی بات عام طور پر سمجھی گئی ہے اور حضرت کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کو بیدار ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو اُسے وتر مؤخر کرنے چاہئیں، وہ تہجد کے بعد وتر پڑھے، اور جسے بیدار ہونے کا یقین نہ ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ عشاء کے بعد وتر پڑھ لے پھر سوئے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بیدار ہو جائے تو تہجد پڑھے، وتر کے بعد بھی تہجد پڑھنا جائز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تہجد کے بعد دو نفلیں پڑھی ہیں، پس وتر کے بعد بھی نفل پڑھنا جائز ہے اور وتر دوبارہ نہ پڑھے۔

مگر میری رائے میں حدیث مذکور میں صرف وتر مراد نہیں ہے بلکہ وتر اور صلاۃ اللیل کا مجموعہ مراد ہے، اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جس کو اٹھنے کا یقین نہ ہو، اس کے مشاغل ایسے ہوں کہ وہ اٹھ نہیں سکتا یا دیر سے سوتا ہے، یا طبعی طور پر مزاج ایسا ہے کہ پڑا اور مرا ایسے لوگوں کے لئے حکم یہ ہے کہ وہ سونے سے پہلے تہجد کی نیت سے نفلیں پڑھ لیں، پھر وتر پڑھیں اور سو جائیں۔ یہ تہجد نہیں ہے بلکہ ایڈوانس بدل ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی وجہ سے تہجد نہیں پڑھ پاتے تھے تو سورج نکلنے کے بعد بارہ رکعت پڑھتے تھے، ظاہر ہے یہ نفلیں تہجد نہیں ہیں بلکہ اس کا بدل ہیں، اور بدل مؤخر بھی ہو سکتا ہے اور مقدم بھی۔ غرض حدیث میں حقیقی وتر مراد نہیں، بلکہ تہجد کا بدل مراد ہے۔

اور دلیل یہ ہے کہ سونے سے پہلے وتر پڑھ لینے کا حکم ہر مسلمان کے لئے ہے اور سب مسلمان وتر پڑھ کر ہی سوتے ہیں، وتر مؤخر کرنے کا حکم یا فضیلت صرف تہجد گذاروں کے لئے ہے۔ پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کو سونے سے پہلے وتر پڑھنے کا حکم دینا اور وصیت کرنا معقول نہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان حضرات کو تہجد کا بدل پڑھ کر سونے کی وصیت کی گئی تھی۔ واللہ اعلم

مسئلہ: اگر کوئی شخص عشاء پڑھ کر متصلاً کچھ نفلیں پڑھ کر وتر پڑھے تو یہ نفلیں صلاۃ اللیل کے قائم مقام نہیں ہونگی تہجد کا بدل وہی نفلیں ہیں جو سونے سے پہلے پڑھی گئی ہوں اور تہجد کے بدل کے طور پر پڑھی گئی ہوں۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے جسے اندیشہ ہو کہ وہ رات کے آخری حصہ میں بیدار نہیں ہو سکے گا تو چاہئے کہ وہ شروع رات میں وتر پڑھ لے۔ اور تم میں سے جسے امید ہو کہ وہ آخر رات میں کھڑا ہو جائے گا تو اُسے وتر مؤخر کرنے چاہئیں، اور آخر رات میں پڑھنے چاہئیں۔ کیونکہ رات کے آخری حصہ میں قرآن کی تلاوت میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں، اور یہ یعنی آخر رات میں تہجد یا وتر پڑھنا افضل ہے۔

تشریح: اس حدیث میں وتر سے حقیقی وتر مراد ہیں۔ اور حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو بیدار ہونے کی امید نہ ہو اسے سونے سے پہلے وتر پڑھ لینے چاہئیں۔ اور جس شخص کو بیدار ہونے کی امید ہو اس کو تہجد کے ساتھ وتر پڑھنے چاہئیں، کیونکہ رات کے آخری حصہ میں نماز پڑھنا بہتر ہے، اس وقت کی قراءت میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور نیک بندوں کی عبادت میں شرکت سے نورانیت پیدا ہوتی ہے اور قبولیت کی امید بندھتی ہے۔ غرض یہ حدیث باب سے متعلق ہے اور پہلی حدیث میرے ناقص خیال میں باب سے متعلق نہیں۔ واللہ اعلم

[۲۱۹] باب ماجاء في كراهية النوم قبل الوتر

[٤٦٤-] حدثنا أبو كُرَيْبٍ، نا يحيىَ بنُ زَكَرِيَا بنِ أبي زَائِدَةَ، عن إسرائيلَ، عن عيسى بن أبي عَزَّةَ، عن الشَّعْبِيِّ، عن أبي ثَوْرٍ الأزْدِيِّ، عن أبي هريرةَ، قال: أَمَرَنِيْ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم أَنْ أُوْتِرَ قَبْلَ أَنْ أَنَامَ؛ قال عيسى بنُ أبي عَزَّةَ: وكان الشَّعْبِيُّ، يُوْتِرُ أَوَّلَ اللَّيْلِ ثم يَنَامُ.

وفي الباب: عن أبي ذرٍّ؛ قال أبو عيسى: حديثُ أبي هريرةَ حديثٌ حسنٌ غريبٌ من هذا الوجهِ؛ وأبو ثورٍ الأزديُّ: اسمُهُ حبيبُ بنُ أبي مُلَيْكَةَ.

وقدِ اخْتارَ قومٌ مِنْ أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم ومَنْ بَعْدَهُمْ أَنْ لَا يَنَامَ الرجلُ حتى يُوْتِرَ.

[٤٦٥-] ورُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَنَّهُ قال: "مَنْ خَشِيَ مِنْكُمْ أَنْ لَا يَسْتَيْقِظَ مِنْ آخِرِ

اللیلِ فَلْیُوتِرْ مِنْ أوَّلِہ، ومَنْ طَمِعَ مِنْکُمْ أنْ یَقُوْمَ مِنْ آخِرِ اللَّیْلِ، فلیوتِرْ من آخر اللیل، فإنَّ قِرَاءَ ۃَ القرآنِ فی آخِرِ اللَّیْلِ مَحْضُوْرَۃٌ، وھی أفْضَلُ"؛ حدثنا بذلک ھَنَّادٌ، قال: نا أبو مُعاویۃ، عن الأعْمَشِ، عن أبی سُفیانَ، عن جابرٍ، عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم.

وضاحت: پہلی حدیث کی سند میں ہندوستانی نسخوں میں ایک نام غلط ہے، ابوکریب: زکریا بن ابی زائدۃ سے روایت نہیں کرتے بلکہ ان کے لڑکے یحییٰ سے روایت کرتے ہیں۔ مصری نسخہ میں عبارت اس طرح ہے: حدثنا أبو کریب، نا یحیی بن زکریا بن أبی زائدۃ إلخ اور مصری نسخہ ہی صحیح ہے چنانچہ متن اس کے مطابق کردیا ہے۔ حافظ رحمہ اللہ نے تہذیب میں ابوکریب کے اساتذہ میں یحییٰ کا تذکرہ کیا ہے ان کے والد زکریا کا تذکرہ نہیں کیا۔

عیسی بن ابی عزۃ کہتے ہیں: شعبی رحمہ اللہ شروع رات میں وتر پڑھ لیا کرتے تھے، پھر سوتے تھے، یہاں بھی میرے خیال میں وتر سے حقیقی وتر اور تہجد کا بدل مراد ہے یعنی شعبی رحمہ اللہ تہجد کا بدل پڑھ کر سویا کرتے تھے، اگر صرف حقیقی وتر مراد ہوتا تو یہ بات قابل تذکرہ نہیں تھی کیونکہ سبھی مسلمان وتر پڑھ کر سوتے ہیں۔ اور صحابہ اور تابعین میں سے بہت سے لوگوں نے یہ بات پسند کی ہے کہ آدمی جب تک وتر نہ پڑھ لے نہ سوئے، اس کے بعد دوسری حدیث ہے، پھر اس کے بعد اس کی سند ہے (اور یہ حدیث مسلم شریف میں بھی ہے)

بابُ ماجاءَ فی الوِتْرِ مِنْ أوَّلِ اللَّیْلِ وآخِرِہٖ

رات کے شروع میں اور آخر میں وتر پڑھنا

حدیث: مسروق رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کے وتروں کے بارے میں پوچھا یعنی آپؐ وتر کس وقت پڑھتے تھے؟ صدیقہؓ نے جواب دیا: رات کے ہر حصہ میں رسول اللہ ﷺ نے وتر پڑھے ہیں۔ شروع رات میں بھی، درمیان رات میں بھی اور آخر رات میں بھی۔ پس وفات کے قریب آپؐ کا وتر رک گیا تھا سحری کے چہرہ میں۔ یعنی زندگی کے آخری سالوں میں آپ وتر اس وقت پڑھتے تھے جب سحری کا وقت شروع ہوتا تھا یعنی رات کے آخری چھٹے حصہ کے شروع میں تہجد پڑھتے تھے۔

تشریح: اس حدیث میں بھی وتر سے حقیقی وتر اور تہجد کا مجموعہ مراد ہے، اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تہجد کا وقت مقرر نہیں۔ آپؐ نے رات کے ہر حصے میں تہجد پڑھا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک رات آنحضور ﷺ اپنی چہیتی بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ لیٹ گئے، تھوڑی دیر کے بعد فرمانے لگے: عائشہ! مجھے چھوڑ و میں اپنے ربّ سے راز و نیاز کی باتیں کروں، پھر آپؐ نے نماز شروع کردی۔ حضرت عائشہؓ انتظار کرتے کرتے سوگئیں، جب

ان کی آنکھ کھلی تو بستر ٹٹولا کہ شاید آپ نماز پڑھ کر آ گئے ہوں۔ حضرت عائشہ کا ہاتھ آپ کی ایڑیوں پر پڑا، آپ سجدہ میں تھے۔ عاشقوں کا یہی حال ہوتا ہے ان کا دل ہمیشہ لرزتا رہتا ہے کیونکہ عاشق کی برات شاخ آہو (ہرن کے سینگ) پر رہتی ہے چنانچہ بار بار ایسا ہوتا تھا کہ آپ سو جاتے پھر اٹھ کر نماز پڑھنے لگتے، جب تھک جاتے تو سو جاتے پھر تھوڑی دیر کے بعد نماز میں مشغول ہو جاتے۔ غرض آپ نے رات کے ہر حصہ میں تہجد پڑھا ہے۔ البتہ حیات طیبہ کے آخری سالوں میں جب سحری کا وقت شروع ہوتا تھا یعنی رات کا آخری چھٹا حصہ شروع ہوتا تھا اس وقت آپ تہجد پڑھتے تھے۔ اس لئے کہ آپ بوڑھے ہو گئے تھے اور اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا، چاروں طرف سے وفود آتے تھے۔ ان کو مسلمان کرنا، ان کو اسلام کی بنیادی تعلیم دینا، ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنا وغیرہ کاموں کی وجہ سے آپ تھک جاتے تھے، اس لئے شروع رات میں آرام فرماتے، پھر رات کے آخری حصہ میں بیدار ہو کر تہجد پڑھتے تھے۔

[۲۲۰] باب ماجاء فی الوتر من أول الليل وآخره

[٤٦٦-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا ابوبكرِ بنُ عَيَّاشٍ، نَا ابو حَصِينٍ، عن يحيىَ بنِ وثَّابٍ، عن مَسْرُوْقٍ، أنَّهُ سَأَلَ عائشةَ عن وِتْرِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم؟ فقالَتْ: من كُلِّ اللَّيْلِ قَدْ أَوْتَرَ: أَوَّلِهِ وَأَوْسَطِهِ وَآخِرِهِ، فَانْتَهَى وِتْرُهُ حِيْنَ مَاتَ فِيْ وَجْهِ السَّحَرِ.

قال أبو عيسى: أبو حصَينٍ: اسمُهُ عُثمانُ بنُ عاصِمٍ الأسَدِيُّ.

وفى الباب: عن عليٍّ، وجابرٍ، وأبى مسعودٍ الأنصاريِّ، وأبى قتادة.

قال أبو عيسى: حديثُ عائشةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ. وهو الذى اختارَه بعضُ أهلِ العلمِ: الوِتْرُ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ.

ترکیب: أولِه، وأوسطِه، وآخرِه: مجرور ہیں کیونکہ کلِّ اللیلِ سے بدل ہیں...... اور الوترُ من آخر اللیل کو مرفوع اور منصوب دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں۔ پہلی صورت میں ھو مقدر کی خبر ہوگا، اور ھو: اختارہ کے مفعول سے بدل ہوگا اور اگر براہ راست ہٗ سے بدل بنائیں تو منصوب ہوگا۔

بابُ ماجاء فی الوِتْرِ بِسَبْعٍ

سات رکعت وتر پڑھنے کا بیان

حدیث: ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ تیرہ رکعتوں کے ذریعہ وتر پڑھا کرتے تھے پس جب آپ بوڑھے اور کمزور ہو گئے (ضَعُفَ عطفِ تفسیری ہے اور کَبِرَ باب سمع سے ہے جس کے معنی ہیں: بوڑھا ہونا۔

کُبْرَ باب کرم سے نہیں ہے جس کے معنی ہیں بڑے مرتبہ والا ہونا کیونکہ آپ ہمیشہ سے بڑے مرتبہ والے تھے) تو آپؐ نے سات رکعت کے ذریعہ وتر پڑھا۔

تشریح: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث اسی سند سے نسائی: باب الوتر بثلاث عشرۃ رکعۃ میں بھی ہے وہاں أَوْتَرَ بِتِسْعٍ ہے، چنانچہ بعض علماء کے نزدیک آپؐ سے سات رکعت وتر پڑھنا ثابت نہیں۔ پہلے امام ترمذیؒ نے بھی فرمایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے کم از کم نو رکعت وتر پڑھنا مروی ہے اس سے کم کا ثبوت نہیں۔ امام ترمذیؒ کے اس قول سے گمان ہوتا ہے کہ یہاں بسبع تصحیف ہے، صحیح بتسع ہے، مگر ابوداؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث صحیح سند کے ساتھ موجود ہے اس میں آنحضور ﷺ کا سات رکعت وتر پڑھنا بھی مروی ہے (مشکوۃ حدیث ۱۲۶۴)

اور اس حدیث میں وتر سے حقیقی وتر اور تہجد کا مجموعہ مراد ہے، اور تیرہ رکعت وتر کی متعدد توجیہیں کی گئی ہیں: اول: اس میں دس رکعتیں صلاۃ اللیل کی اور تین رکعتیں وتر کی ہیں۔ دوم: اس میں آٹھ رکعتیں تہجد کی، تین رکعتیں وتر کی اور دو رکعتیں نفل ہیں جن کو آپؐ وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ سوم: اس میں آٹھ رکعتیں تہجد کی، تین رکعتیں وتر کی اور دو رکعتیں فجر کی سنتیں ہیں۔ مگر چونکہ اہم نماز وتر ہے اس لئے نفلوں کو اس کے تابع کر کے مجموعہ کو وتر کہہ دیا گیا ہے۔

اس کی نظیر: مکتب کے بچوں سے اگر پوچھا جائے کہ ظہر کی کتنی رکعتیں ہیں؟ تو وہ بارہ رکعت بتائیں گے، اور عصر کی آٹھ رکعت بتائیں گے یعنی اصل نماز کے ساتھ سنن ونوافل کو ملا کر سب کو ظہر وعصر کی نماز بتائیں گے۔ عرف میں ایسا بولنا جائز ہے، اسی طرح یہاں بھی تہجد کو وتر کے ساتھ ملا کر سب کو وتر کہا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: روایت میں جو آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تیرہ رکعت وتر پڑھے اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرہ رکعت وتر کے ساتھ پڑھے، یعنی صلاۃ اللیل کو وتر کے ساتھ ملا کر سب کو وتر کہا گیا ہے۔

اور اس کی دلیل کہ صلاۃ اللیل پر بھی وتر کا اطلاق ہوتا ہے دو ہیں۔

پہلی دلیل: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ رات میں تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ منها الوترُ ورکعتَا الفجر: ان میں وتر اور فجر کی دو سنتیں شامل ہیں (مسلم، مشکوۃ حدیث ۱۱۹۱) معلوم ہوا کہ تیرہ رکعتیں ساری صلاۃ اللیل نہیں ہیں، بعض صلاۃ اللیل ہیں، بعض وتر اور بعض فجر کی سنتیں، مگر چونکہ اہم نماز وتر ہے، اس لئے اس کے ساتھ سنن ونوافل کو ملا کر سب کو وتر کہہ دیا گیا ہے۔

دوسری دلیل: پیچھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث گذری ہے اس کا آخری ٹکڑا ہے: فأوتِرُوا یاأهلَ القرآن (میں نے پہلے کہا تھا کہ یہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے مگر حضرت اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ اس کو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں) أهل القرآن سے حفاظ مراد ہیں۔ اور وتر سے تہجد مراد ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ حافظوں کو تہجد پڑھنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ نصوص میں صلاۃ اللیل پر وتر کا اطلاق آیا ہے۔

[۲۲۱] باب ماجاء في الوتر بسبع

[٤٦٧-] حدثنا هَنَّادٌ، نا أبو مُعَاوِيَةَ، عن الأَعْمَشِ، عن عَمْرِو بنِ مُرَّةَ، عن يَحيى بنِ الجَزَّارِ، عن أُمِّ سلمةَ، قالتْ: كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يُوْتِرُ بِثَلاَثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً، فَلَمَّا كَبِرَ وَضَعُفَ أَوْتَرَ بِسَبْعٍ.

وفي الباب: عن عائشةَ، قال أبو عيسى: حديثُ أُمِّ سَلَمَةَ حديثٌ حسنٌ.

وقد رُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم الوِتْرُ بِثَلاَثَ عَشْرَةَ، وإِحْدَىٰ عَشْرَةَ، وتِسْعٍ وَسَبْعٍ، وخَمْسٍ، وثَلاَثٍ، وواحِدَةٍ.

قال إسحاقُ بنُ إبراهيمَ: مَعْنَى مَا رُوِيَ أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كانَ يُوْتِرُ بثَلاَثَ عَشْرَةَ قَالَ: إِنَّمَا مَعْنَاهُ: أَنَّهُ كَانَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ ثَلاَثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً مَعَ الوِتْرِ، فَنُسِبَتْ صلاةُ اللَّيْلِ إلى الوِتْرِ؛ورَوَى في ذلكَ حديثاً عن عائشة؛ وَاحْتَجَّ بِمَا رُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: "أَوْتِرُوْا يا أهلَ القرآنِ"؛ قالَ: إِنَّمَا عَنَى به قِيَامَ اللَّيْلِ، يقولُ: إِنَّمَاقِيَامُ اللَّيْلِ على أَصْحَابِ الْقُرْآنِ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ سے وتر تیرہ رکعت، گیارہ رکعت، نو رکعت، سات رکعت، پانچ رکعت، تین رکعت اور ایک رکعت پڑھنا مروی ہے (حضرت مصنف رحمہ اللہ نے یہ جو دعوی کیا ہے اس کو ثابت کرنا آسان نہیں) اسحاق بن راہو یہ فرماتے ہیں: اُس حدیث کا مطلب جو روایت کی گئی ہے کہ "رسول اللہ ﷺ تیرہ رکعت کے ذریعہ وتر پڑھا کرتے تھے" اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات میں تیرہ رکعتیں وتر کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ پس تہجد کو وتر کی طرف منسوب کیا گیا ہے یعنی تہجد کو مجازاً وتر کہا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث روایت کی (حضرت عائشہ کی یہ حدیث مسلم میں ہے اور تقریر میں پہلی دلیل ہے) اور انھوں نے استدلال کیا ہے اس حدیث سے جو رسول اللہ ﷺ سے روایت کی گئی کہ آپؐ نے فرمایا: "اے حافظو! وتر پڑھو" حضرت اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث میں بھی (وتر سے) قیام اللیل ہی مراد ہے (نبی ﷺ) فرمارہے ہیں کہ تہجد صرف حافظوں پر ہے۔

بابُ ماجاءَ في الوِتْرِ بِخَمْسٍ

پانچ رکعت وتر پڑھنے کا بیان

حدیث: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ کی نماز رات میں تیرہ رکعتیں ہوتی تھیں۔ آپؐ ان میں سے پانچ رکعتوں کے ذریعہ وتر پڑھتے تھے، ان رکعتوں میں سے کسی میں نہیں بیٹھتے تھے مگر آخر

میں (یعنی پانچویں رکعت ہی پر بیٹھتے تھے، درمیان میں نہیں بیٹھتے تھے) پھر جب مؤذن اذان دیتا تو کھڑے ہوتے پس دو ہلکی رکعتیں پڑھتے۔

تشریح: شوافع کے نزدیک ایک سے تیرہ رکعت تک وتر پڑھنا جائز ہے۔ اور اس کے دو طریقے ہیں: اول: تین، یا پانچ یا سات (تیرہ تک) رکعتیں وتر کی نیت سے پڑھی جائیں اور ان کے آخر میں قعدہ کیا جائے، درمیان میں کہیں قعدہ نہ کیا جائے۔ دوم: دو دو رکعتیں الگ الگ سلام سے پڑھی جائیں پھر ایک رکعت الگ سلام سے پڑھی جائے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم (۶: ۲۰ مصری) میں اس دوسرے طریقہ کو افضل کہا ہے اور پہلے طریقہ کو بیان جواز پر محمول کیا ہے۔

اور احناف کے نزدیک وتر کی صرف تین رکعتیں ہیں کم زیادہ پڑھنا جائز نہیں۔ اور اس حدیث میں جو آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پانچ رکعت وتر پڑھتے تھے اور صرف آخر میں بیٹھتے تھے یہ بیٹھنا آرام کرنے کے لئے تھا۔ قعدہ مراد نہیں، اور پانچوں رکعتیں وتر نہیں تھیں بلکہ تین رکعت وتر اور دو رکعت نفل تھیں جن کو رسول اللہ ﷺ وتر کے بعد بیٹھ کر پڑھتے تھے، مجازاً پانچوں رکعتوں کو وتر کہا گیا ہے۔ اور پوری حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ چار رکعت تہجد پڑھنے کے بعد آرام فرماتے تھے، لیٹ جاتے تھے، پھر چار رکعت پڑھتے تھے اور آرام فرماتے تھے اور لیٹ جاتے تھے، پھر تین رکعت وتر پڑھتے تھے اور آرام کے لئے توقف نہیں فرماتے تھے بلکہ فوراً دو نفلیں بیٹھ کر ادا فرماتے تھے، پھر آرام کرتے تھے، یعنی لیٹتے تھے، پھر جب فجر کی اذان ہوتی تو کھڑے ہوتے اور سنت پڑھتے، غرض اس حدیث میں پانچ رکعتوں پر بیٹھنے کی جو بات ہے وہ احناف کے نزدیک آرام کے لئے بیٹھنا ہے، نماز کا قعدہ مراد نہیں۔ اور شوافع کے نزدیک نماز کا قعدہ مراد ہے۔ واللہ اعلم

[۲۲۲] باب ماجاء فی الوتر بخمس

[۴۶۸-] حدثنا إسحاق بنُ منصورٍ، نا عبدُ اللهِ بنُ نُمَيرٍ، نا هِشامُ بنُ عُروةَ، عن أبيه، عن عائشةَ، قالت: كانت صَلاةُ رسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم مِنَ اللَّيْلِ ثَلاثَ عَشرَةَ ركْعةً، يُوتِرُ مِن ذٰلِكَ بِخَمسٍ، لايَجلِسُ فِي شَيءٍ مِنهُنَّ إلّا في آخِرِهِنَّ، فإذا أذَّنَ المُؤذِّنُ قامَ فَصلّٰى ركْعتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ.

وفي الباب: عن أبي أيوبَ، قال أبو عيسى: حديثُ عائشةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وَقد رَأى بعضُ أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغيرِهِم الوِترَ بِخَمسٍ، وقالُوا: لايَجلِسُ فِي شَيءٍ مِنهُنَّ إلّا فِي آخِرِهِنَّ.

نوٹ: حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کی روایت نسائی (حدیث ۱۷۱۰) میں ہے۔

بابُ ماجاء فی الوِتْرِ بِثلاَثٍ

تین رکعت وتر کا بیان

وتر کی جوتین رکعتیں ہیں امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان میں سے اصل وتر ایک رکعت ہے اور باقی دو تہجد ہیں دیگر ائمہ کے نزدیک تینوں رکعتیں وتر کی ہیں، پھران میں اختلاف ہوا ہے، حنفیہ کے نزدیک وتر تین رکعتیں: دوتشہد اور ایک سلام کے ساتھ ہیں۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک تین رکعتیں دوتشہد اور دو سلام کے ساتھ ہیں۔

حدیث: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر تین رکعت پڑھا کرتے تھے، ان تین رکعتوں میں مفصلات میں سے نو سورتیں پڑھتے تھے، ہر رکعت میں تین سورتیں پڑھتے تھے، ان نو سورتوں میں سے آخری سورت قل ھو اللہ أحد ہوتی تھی۔

تشریح: یہ حدیث حارث اعور کی وجہ سے ضعیف ہے، مگر اس کے صحیح شواہد موجود ہیں، جیسا کہ وفی الباب سے واضح ہوتا ہے، پس اس حدیث کا ضعف مضر نہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ پہلی رکعت میں سورۂ تکاثر، سورۂ قدر، اور سورۂ زلزال پڑھتے تھے اور دوسری رکعت میں سورۂ عصر، سورۂ نصر، اور سورۂ کوثر اور تیسری رکعت میں سورۂ کافرون، سورۂ تبت اور سورۂ اخلاص پڑھتے تھے (طحاوی ۱: ۲۰۳)

[۲۲۳] باب ماجاء فی الوتر بثلاث

[۴٦٩-] حدثنا هَنَّادٌ، نا أبوبكرِ بنُ عَيَّاشٍ، عن أبی إسحاقَ، عن الحارثِ، عن علیٍّ، قال: كانَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يُوْتِرُ بثلاَثٍ، يَقْرَأُ فِيهِنَّ بِتِسْعِ سُوَرٍ مِنَ الْمُفَصَّلِ، يَقْرَأُ فِیْ كُلِّ رَكْعَةٍ بِثلاَثِ سُوَرٍ، آخِرُهُنَّ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾

وفی الباب: عن عِمرانَ بنِ حُصَيْنٍ، وعائشةَ، وابنِ عباسٍ، وأبی أيوبَ، وعبدِ الرحمنِ بنِ أَبْزَى عن أُبَیِّ بنِ كَعْبٍ؛ ويُرْوَى أيضًا عَنْ عبدِ الرحمنِ بنِ أَبْزَى، عنِ النبیِّ صلى الله عليه وسلم؛ هٰكَذَا رَوَى بَعضُهم: فَلَمْ يَذْكُرْ فِيْهِ عن أُبَیٍّ، وذَكَرَ بعضُهُمْ عن عبدِ الرحمنِ بنِ أَبْزَى عَنْ أُبَیٍّ.

قال أبو عيسى: وقدْ ذَهَبَ قَوْمٌ مِنْ أَهْلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبیِّ صلى الله عليه وسلم وغَيرِهِمْ إِلَى هٰذا، وَرَأَوْا أَنْ يُوتِرَ الرَّجُلُ بثلاَثٍ.

قال سفيان: إن شئتَ أوترتَ بخمس، وإن شئتَ أوترتَ بثلاث، وإن شئتَ أوترتَ بركعة، قالَ سُفيانُ: والَّذِیْ أَسْتَحِبُّ: أَنْ يُوْتِرَ بِثلاَثِ رَكْعَاتٍ، وهوَ قَوْلُ ابنِ المباركِ وأهلِ الكوفةِ.

حدثنا سعيدُ بنُ يعقوبَ الطالَقانيُّ، نا حَمَّادُ بنُ زَيْدٍ، عن هِشَامٍ، عن مُحمدِ بنِ سِيرِيْنَ، قال: كانوا يُوْتِرُوْنَ بِخَمْسٍ، وبِثَلاثٍ، وبِرَكْعَةٍ، ويَرَوْنَ كُلَّ ذٰلِكَ حَسَنًا.

وضاحت: باب میں عبدالرحمٰن بن ابزی رضی اللہ عنہ کی حدیث کا بھی حوالہ ہے۔ یہ صحابی صغیر ہیں، وہ تین رکعت وتر کی روایت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے بھی روایت کرتے ہیں اور براہِ راست بھی، اس صورت میں یہ مرسل صحابی ہوگی فرماتے ہیں: اس حدیث کو محدثین نے اسی طرح روایت کیا ہے، پس انھوں نے سند میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا واسطہ ذکر نہیں کیا، اور بعض محدثین نے عبدالرحمٰن بن ابزی سے روایت کیا ہے وہ حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت کرتے ہیں۔ یعنی انھوں نے حضرت ابی کا واسطہ ذکر کیا ہے (یہ تکرار ہے) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحابہ اور ان کے علاوہ علماء کی ایک جماعت اس حدیث کی طرف گئی ہے، انھوں نے یہ بات دیکھی ہے کہ آدمی وتر کی تین رکعتیں پڑھے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آپ چاہیں تو پانچ رکعت وتر پڑھیں، اور چاہیں تو تین رکعت پڑھیں، اور چاہیں تو ایک رکعت پڑھیں، یعنی ایک رکعت وتر پڑھنا بھی جائز ہے اور تین اور پانچ رکعتیں پڑھنا بھی جائز ہے (علامہ نووی شرح مہذب (۲۲:۴) میں فرماتے ہیں: سفیان ثوریؒ کا مذہب وہی ہے جو امام اعظم رحمہ اللہ کا ہے یعنی وتر تین رکعتیں ہی ہیں اور ان کو ایک سلام سے پڑھنا ضروری ہے، اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے جو قول نقل کیا ہے ممکن ہے وہ ان کی کوئی روایت ہو) سفیان ثوری فرماتے ہیں: اور وہ بات جو مجھے پسند ہے یہ ہے کہ وتر تین رکعت پڑھے، اور ابن المبارک اور کوفہ والوں کا یہی قول ہے، اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے محمد بن سیرین رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ یعنی صحابہ پانچ رکعت، تین رکعت اور ایک رکعت وتر پڑھا کرتے تھے، وہ سب صورتوں کو اچھا سمجھتے تھے۔

بابُ ماجاء في الوِتْرِ بِرَكْعَةٍ

ایک رکعت وتر کا بیان

حدیث: محمد بن سیرین کے بھائی انس بن سیرین رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا: کیا میں فجر کی سنتیں لمبی پڑھ سکتا ہوں؟ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ رات میں دو دو، دو دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور ایک رکعت سے نماز کو طاق بنایا کرتے تھے اور دو رکعتیں (فجر کی سنتیں) پڑھتے تھے درانحالیکہ اذان آپؐ کے کان میں ہوتی تھی۔

تشریح: اس حدیث کی شرح پیچھے گذر چکی ہے کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یوتر برکعة کا مطلب ہے: رسول اللہ

ﷺ وتر ایک رکعت پڑھتے تھے، اور حنفیہ کے نزدیک حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تہجد دودو، دودو پڑھتے تھے، پھر جب صبح صادق کا وقت قریب آتا تو آپؐ دو رکعت پر سلام نہیں پھیرتے تھے بلکہ ان کے ساتھ ایک رکعت اور ملا کر اس کو وتر بنا لیتے تھے، اور احناف نے حدیث کا جو مطلب سمجھا ہے وہی صحیح ہے اس لئے کہ مثنی مثنی یعنی وہ رکعتیں جو دودو کر کے پڑھی جارہی ہیں وہ تو صلاۃ اللیل ہیں، خود حضور اکرم ﷺ فرمارہے ہیں: صلاۃ اللیل مثنی مثنی پس وتر ایک ہی رکعت ہوئی، حالانکہ رسول اللہ ﷺ وتر تین رکعت پڑھا کرتے تھے اس لئے لامحالہ یہ بات ماننی پڑے گی کہ وتر کی تیسری رکعت سے پہلے جو دوگانہ ہوتا تھا وہ ایک رکعت کے ساتھ متصل ہوتا تھا، کیونکہ منفصل ہوگا تو وہ تہجد میں شامل ہوجائے گا۔

قوله: والأذانُ فی أُذُنِہِ: اس جملہ کے دو مطلب ہوسکتے ہیں:

پہلا مطلب: رسول اللہ ﷺ اذان شروع ہوتے ہی فجر کی سنتیں شروع فرماتے تھے اور اذان ختم ہونے سے پہلے پوری فرما دیتے تھے یعنی غایت درجہ خفیف پڑھتے تھے۔ پس ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انس بن سیرین کو یہ جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی سنتیں غایت درجہ ہلکی پڑھتے تھے، پس تمہیں بھی لمبی نہیں پڑھنی چاہئیں۔

دوسرا مطلب: آپؐ اذان شروع ہوتے ہی سنت پڑھنی شروع کردیتے تھے، اور اذان سنتے رہتے تھے اور سنتیں پڑھتے رہتے تھے، اور آپؐ کی سنتیں اور اذان تقریباً ساتھ پوری ہوتی تھیں۔ اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ فجر کی سنتیں ہلکی پڑھتے تھے، اسی لئے علماء کے نزدیک فجر کی سنتیں ہلکی پڑھنا مسنون ہے، بلکہ امام مالک رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں: فجر کی سنتوں میں صرف فاتحہ پڑھی جائے سورت نہ ملائی جائے (ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سورت ملانا سنت ہے) تاکہ سنتیں ہلکی رہیں۔

فائدہ(۱): اس حدیث سے دو مسئلے اور بھی ثابت ہوتے ہیں:

پہلا مسئلہ: اگر کوئی شخص پہلے سے کسی دینی کام میں مشغول ہو تو اذان کا جواب دینے کے لئے وہ دینی کام بند کرنا ضروری نہیں۔ مثلاً کوئی شخص تلاوت کررہا ہے یا سبق چل رہا ہے اور اذان شروع ہوجائے تو اذان کا جواب دینے کے لئے تلاوت اور سبق موقوف کرنا ضروری نہیں، کیونکہ اذان کا جواب دینا بھی دینی کام ہے اور تلاوت اور سبق بھی دینی کام ہیں اور ایک دینی کام کے لئے دوسرے دینی کام کو بند کرنا ضروری نہیں، اسی طرح فجر کی سنتیں پڑھنا بھی دینی کام ہے، اور اذان کا جواب دینا بھی دینی کام ہے، آپؐ اذان کا جواب نہ دے کر سنتیں پڑھنے میں مشغول رہتے تھے، ہاں دنیاوی باتیں ہورہی ہوں تو ان کو موقوف کر کے اذان کا جواب دینا چاہئے۔

دوسرا مسئلہ: دورانِ اذان دوسرا دینی کام شروع کرنا جائز ہے، رسول اللہ ﷺ اذان کے بعد ہی فجر کی سنتیں شروع فرماتے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اجابت قولی مسنون ہے۔ اس کا ترک جائز ہے۔ اجابت فعلی میں

اختلاف ہے کہ وہ واجب ہے یا سنت؟ تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

فائدہ (۲): امام اعظم رحمہ اللہ کا قول مشہور ہے کہ "میں کبھی فجر کی سنتیں لمبی پڑھتا ہوں" علماء نے فرمایا ہے کہ یہ بات اس شخص کے لئے ہے جو پابندی سے تہجد پڑھتا ہے مگر کسی وجہ سے اس کا تہجد رہ جائے تو وہ فجر کی سنتیں لمبی پڑھ سکتا ہے تاکہ تہجد میں جو قرآن پڑھنے کا اس کا معمول تھا اس کو وہ پورا کر لے۔ امام اعظم رحمہ اللہ کے قول کا یہی مصداق ہے۔

[۲۲٤] باب ماجاء فی الوتر بر کعة

[٤٧٠-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا حَمَّادُ بنُ زيدٍ، عن أَنَسِ بنِ سيرينَ، قال: سَأَلْتُ ابنَ عمرَ، فقلتُ: أُطِيْلُ فِيْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ؟ فقالَ: كانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى، ويُوْتِرُ بِرَكْعَةٍ، وكانَ يُصَلِّي الركعَتَيْنِ والأَذَانُ في أُذُنِهِ.

وفی الباب: عن عائشةَ، وجَابِرٍ، والفَضْلِ بنِ عبَّاسٍ، وأبی أيوبَ، وابنِ عباسٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

والعَمَلُ على هذا عندَ بعضِ أهلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم والتابعين: رَأَوْا أَنْ يَفْصِلَ الرَّجُلُ بَيْنَ الرَّكْعَتَيْنِ والثَّالِثَةِ، يُوْتِرُ بِرَكْعَةٍ، وبه يقولُ مالكٌ والشافعيُّ وأحمدُ وإسحاقُ.

ترجمہ: اس پر صحابہ اور تابعین میں سے بعض اہل علم کا عمل ہے۔ وہ اس بات کو دیکھتے ہیں کہ آدمی فصل کرے دو رکعتوں کے درمیان اور تیسری رکعت کے درمیان، وتر پڑھے ایک رکعت کے ذریعہ، اور یہی بات مالک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کہتے ہیں۔

بابُ ماجاء ما يَقْرَأُ في الوِتْرِ؟

وتر میں کونسی سورتیں پڑھے؟

پہلی حدیث: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر میں سورۂ اعلی، سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص ایک ایک رکعت میں پڑھتے تھے یعنی پہلی رکعت میں سورۂ اعلی، دوسری میں سورۂ کافرون اور تیسری میں سورۂ اخلاص پڑھتے تھے۔

دوسری حدیث: عبدالعزیز بن جُرَیج کہتے ہیں: میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: رسول اللہ ﷺ وتر میں کونسی سورتیں پڑھا کرتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: پہلی رکعت میں سورۂ اعلی، دوسری میں سورۂ کافرون اور تیسری

میں سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھتے تھے۔

تشریح: اکثر علماء کے نزدیک پہلی حدیث معمول بہ ہے یعنی تیسری رکعت میں صرف سورۂ اخلاص پڑھے۔ اور دوسری حدیث ضعیف ہے کیونکہ خُصیف سیئ الحفظ ہیں اور بڑھاپے میں اس کا حافظہ بگڑ گیا تھا، اور حدیث میں دوسری خرابی یہ ہے کہ عبدالعزیز بن جریج کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے لقاء وسماع نہیں اور وہ جو کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا اس کو علماء نے خصیف کا وہم قرار دیا ہے۔

جاننا چاہئے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے، یہاں اصطلاحی حسن مراد نہیں، بلکہ یہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی خاص اصطلاح ہے، یعنی ہر وہ حدیث جس میں کوئی متہم بالکذب راوی نہ ہو، اور شاذ بھی نہ ہو اور وہ حدیث متعدد سندوں سے مروی ہو تو وہ امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک حسن ہوتی ہے چونکہ اس حدیث میں کوئی متہم بالکذب راوی نہیں ہے پس یہ حدیث حضرت مصنف رحمہ اللہ کے نزدیک حسن ہے۔

دوسری بات یہ جاننی چاہئے کہ سنن ترمذی جامع بھی ہے یعنی حدیثوں کا وہ مجموعہ ہے جس میں اصناف ثمانیہ کی حدیثیں جمع کی گئی ہیں، اور سنن بھی ہے یعنی وہ کتاب بھی ہے جس میں مستدلات فقہاء اکٹھا کئے گئے ہیں، اور کتاب کا اصل نام الجامع المعلَّل ہے یعنی اصناف ثمانیہ کی حدیثوں کا وہ مجموعہ جس میں حدیثوں کی علتوں (خرابیوں) کو واضح کیا گیا ہے چنانچہ حضرت مصنف رحمہ اللہ بہت سے ابواب میں صحیح روایت موجود ہوتے ہوئے بھی ضعیف روایت لاتے ہیں اور صحیح حدیث کا وفی الباب میں حوالہ دیتے ہیں، پھر حدیث میں جو خرابی ہوتی ہے اس کو واضح کرتے ہیں تا کہ طالب علم اس سے واقف ہو جائے، یہاں بھی حدیث میں جو علت خفیہ ہے امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ ہر بڑا محدث ہر حدیث کی خرابی کا ضرور ادراک کرلے ایسا ضروری نہیں، بلکہ بعض حدیثوں کی پوشیدہ خرابی بڑے محدث کی نظر سے بھی اوجھل رہ جاتی ہے۔

[۲۲۵] باب ماجاء ما يقرأ في الوتر؟

[۴۷۱-] حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نا شَرِيْكٌ، عن أبي إسحاق، عن سَعِيْدِ بنِ جُبَيْرٍ، عن ابنِ عباسٍ، قال: كانَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَقْرَأُ فِيْ الْوِتْرِ بِسَبِّحِ اسمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى، وقل يَاأَيُّهَا الكافرونَ، وقُلْ هوَ اللهُ أحدٌ: فِيْ رَكْعَةٍ رَكْعَةٍ.

وفي الباب: عن عليٍّ، وعائشةَ، وعبدِ الرحمنِ بنِ أَبْزَى عن أُبَيِّ بنِ كعبٍ، ويُرْوَى عن عبدِ الرحمنِ بنِ أَبْزَى عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

قال أبو عيسى: وَقَدْ رُوِيَ عَنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: أَنَّهُ قَرَأَ فِيْ الوِتْرِ فِيْ الركعةِ الثَّالِثَةِ

بالْمُعَوِّذَتَيْنِ، وقُلْ هُوَ اللّٰهُ أحدٌ.

والَّذِىْ اختارَهُ أكْثَرُ أهلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم ومَنْ بَعْدَهُم أنْ يَقْرَأَ بسبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ، وقل يا أيها الكافرون، وقُلْ هوَ الله أحدٌ، يَقْرَأُ فِىْ كلِّ رَكْعَةٍ مِنْ ذٰلِكَ بِسُوْرَةٍ.

[۴۷۲-] حدثنا إسحاقُ بْنُ إبراهيمَ بنِ حَبِيْبِ بنِ الشَّهِيْدِ الْبَصْرِيُّ، نا محمدُ بْنُ سَلَمَةَ الحَرَّانِيُّ، عن خُصَيْفٍ، عن عبدِ العزيزِ بنِ جُرَيْجٍ، قال: سَأَلْتُ عائشةَ بِأَىِّ شيئٍ كانَ يُوْتِرُ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم؟ قالتْ كانَ يَقْرَأُ فِىْ الْأُوْلٰى بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلىٰ، وفى الثَّانِيَةِ بِقُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ، وفى الثَّالِثَةِ بِقُلْ هُوَ اللّٰهُ أحدٌ والْمُعَوِّذَتَيْنِ.

قال أبو عيسى: وهذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ؛ وعبدُ العزيزِ هٰذا والِدُ ابنِ جُرَيْجٍ صَاحبُ عَطَاءٍ، وابنُ جُرَيْجٍ اسْمُهُ: عبدُ الملكِ بنُ عبدِ العزيزِ بنِ جُرَيْجٍ.

وقد رَوَى هٰذا الحديثَ يَحيىَ بنُ سعيدِ الأَنْصَارِيُّ، عن عَمْرَةَ، عن عائشةَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

وضاحت: باب میں عبدالرحمٰن بن ابزیٰ (صحابی صغیر) کی حدیث کا حوالہ بھی ہے، اس حدیث کی سند میں ابی بن کعب کا واسطہ ہے یا نہیں؟ یہ عبارت باب ماجاء في الوتر بثلاث میں بھی گذری ہے اور یہ روایت نسائی میں ہے کہ نبی ﷺ وتروں میں یہ تین سورتیں پڑھتے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے وتر کی تیسری رکعت میں سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھیں (یہ حدیث سند کے ساتھ آگے آرہی ہے) اور صحابہ اور بعد کے علماء میں سے اکثر نے جس بات کو پسند کیا ہے وہ یہ ہے کہ نمازی وتر میں سورۂ اعلیٰ، سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص پڑھے، ان سورتوں میں سے ایک ایک سورت ہر رکعت میں پڑھے (یعنی اکثر علماء کے نزدیک تیسری رکعت میں صرف سورۂ اخلاص پڑھنی چاہئے) اس کے بعد عبدالعزیز بن جریج کی حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ سے تیسری رکعت میں سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھنا مروی ہے، مگر یہ حدیث معمول بہ نہیں کیونکہ وہ ضعیف ہونے کے علاوہ منقطع بھی ہے، اور عبدالعزیز: مشہور محدث عبد الملک کے دادا ہیں۔ یہ محدث ابن جریج سے مشہور ہیں اور عبدالعزیز حضرت عطاء بن ابی رباح کے خاص شاگرد ہیں (وہ حضرت عطاء کی خدمت میں سترہ سال رہے ہیں) آخر میں عبدالعزیز کی مذکورہ حدیث کی دوسری سند بیان کی ہے اور شاید امام ترمذی رحمہ اللہ نے عبدالعزیز کی حدیث پر کلام اس لئے نہیں کیا کہ عبدالعزیز کا متابع پایا گیا ہے اس لئے من غیر وجه کا تحقق ہوگیا پس روایت حسن ہوگئی۔

بابُ ماجاء فی القُنُوْتِ فِی الْوِتْرِ

وتر میں دعائے قنوت کا بیان

اس باب میں دو مسئلے ہیں:

پہلا مسئلہ: وتر میں قنوت پورے سال ہے یا صرف رمضان میں ہے یا رمضان کے نصف آخر میں ہے؟ امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کا مختار قول اور امام شافعی رحمہ اللہ کی تین وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ وتر میں قنوت پورے سال ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک صرف رمضان میں ہے، باقی گیارہ مہینے وتر میں قنوت نہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا اصل مذہب اور امام احمد رحمہ اللہ کی ایک روایت یہ ہے کہ رمضان کی سولہویں رات سے ختم رمضان تک قنوت ہے، باقی ساڑھے گیارہ مہینے قنوت نہیں۔

دوسرا مسئلہ: امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک قنوت کی جگہ وتر کی آخری رکعت میں رکوع سے پہلے ہے۔ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک رکوع کے بعد قومہ میں قنوت کی جگہ ہے۔

جاننا چاہئے کہ اس مسئلہ میں کوئی مرفوع روایت نہیں ہے۔ اور صحابہ کے مختلف اقوال اور عمل ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سال بھر قنوت کے قائل تھے اور وہ اس کی جگہ تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے تجویز کرتے تھے۔ احناف نے اسی کو لیا ہے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے صرف رمضان کے آخری پندرہ دنوں میں قنوت پڑھنا مروی ہے آپ تیسری رکعت کے رکوع کے بعد پڑھتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ لفظ قنوت کے بہت سے معانی ہیں، پہلے طول القنوت کا باب گذرا ہے، وہاں حاشیہ میں اس کے بہت سے معانی لکھے ہیں، یہاں قنوت کے معنی ہیں دعا، کوئی بھی دعا پڑھ لی جائے، چھوٹی یا بڑی، قنوت کا تحقق ہو جائے گا، کوئی متعین دعا پڑھنا ضروری نہیں۔ مجھے کبھی جلدی ہوتی ہے تو میں صرف ﴿رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً﴾ الخ پڑھتا ہوں۔

قنوت کے سلسلہ میں دو دعائیں روایات میں آئی ہیں، ایک باب میں ہے دوسری وہ دعا ہے جس کو احناف پڑھتے ہیں، وہ اعلاء السنن اور الدر المنثور میں ہے۔ باب میں جو روایت ہے شوافع نے اُسے اختیار کیا ہے اور دوسری دعا کو احناف نے اختیار کیا ہے۔ اس اختیار کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ احناف کو یہ دعا جو باب میں ہے عموماً یاد نہیں ہوتی، اور شوافع کو وہ دعا جو اعلاء السنن میں ہے یاد نہیں ہوتی۔ یہ ٹھیک نہیں۔ دونوں دعائیں حضور اکرم ﷺ سے مروی ہیں۔ پس دونوں دعائیں یاد کرنی چاہئیں اور پڑھنی چاہئیں، کبھی یہ کبھی وہ۔ اور دونوں کو ایک ساتھ پڑھے تو سبحان اللہ، اور سند کے اعتبار سے جو دعا باب میں ہے وہ اصح ہے، اگرچہ یہ بھی فی نفسہ اعلیٰ درجہ کی صحیح روایت نہیں۔

آخری بات: دعائے قنوت رکوع سے پہلے پڑھنی ہے یا بعد میں؟ حافظ رحمہ اللہ نے فتح (۴۰۸:۲) میں تحریر فرمایا ہے: وقد اختلف عملُ الصحابة في ذلك، والظاهر أنه من الاختلاف المُباح: اس سلسلہ میں صحابہ کا عمل مختلف تھا اور یہ اختلاف جواز وعدم جواز کا نہیں ہے بلکہ افضلیت اور غیر افضلیت کا ہے —— میرا عمل یہ ہے کہ جب میں رکوع سے پہلے دعا پڑھنا بھول جاتا ہوں تو رکوع کے بعد قومہ میں دعا پڑھ لیتا ہوں، اور سجدۂ سہو نہیں کرتا، اگرچہ فقہ میں اس صورت میں سجدۂ سہو ضروری لکھا ہے۔

فائدہ: احناف جو دعا پڑھتے ہیں یعنی اللّٰھم إنا نستعینك إلخ وہ قرآن کی ایک سورت تھی اس کا نام سورۃ الخلع تھا مگر اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی، چونکہ یہ دعا قرآن کا حصہ رہ چکی ہے اس لئے احناف نے اس کو افضل قرار دیا ہے۔

[۲۲۶] باب ماجاء في القنوت في الوتر

[۴۷۳-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا أبو الأحْوَصِ، عن أبي إسحاق، عن بُرَيْدِ بنِ أبي مَرْيَمَ، عن أبي الحَوْرَاءِ، قال: قالَ الحَسَنُ بنُ عليٍّ: عَلَّمَنِيْ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم كَلِمَاتٍ أَقُوْلُهُنَّ فِي الوِتْرِ: "اللَّهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ، وعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ، وتَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا أَعْطَيْتَ، وقِنِيْ شَرَّ مَا قَضَيْتَ، فإِنَّكَ تَقْضِيْ وَلاَ يُقْضَى عَلَيْكَ، إِنَّهُ لاَيَذِلُّ مَنْ وَالَيْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ"

وفي الباب: عن عليٍّ، قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ لانَعْرِفُهُ إلاَّ مِنْ حديثِ أبي الحَوْرَاءِ السَّعْدِيِّ، واسْمُهُ: رَبِيْعَةُ بنُ شَيْبَانَ؛ ولاَ نَعْرِفُ عنِ النبيِّ صلى الله عليه وسلمَ فِيْ القُنُوْتِ شَيْئًا أَحْسَنَ مِنْ هٰذَا.

واخْتَلَفَ أهلُ العلمِ فِي القُنُوْتِ فِيْ الوِتْرِ، فَرَأىٰ عبدُ اللهِ بنُ مَسْعُوْدٍ القُنُوْتَ فِيْ الوِتْرِ فِي السَّنَةِ كُلِّهَا، واخْتَارَ القنوتَ قَبْلَ الركوعِ، وهو قولُ بعضِ أهلِ العلمِ، وبهِ يقولُ سُفيانُ الثوريُّ، وابنُ المباركِ، وإسحاقُ وأهلُ الكُوفةِ.

وقَدْ رُوِيَ عن عليِّ بنِ أبي طالبٍ أَنَّهُ كانَ لاَيَقْنُتُ إلاَّ فِي النِّصْفِ الآخِرِ مِنْ رَمَضَانَ، وكانَ يَقْنُتُ بعدَ الركوعِ، وقدْ ذَهَبَ بعضُ أهلِ العلمِ إلى هذا، وبهِ يقولُ الشافعيُّ وأحمدُ.

ترجمہ: حضرت حسنؓ فرماتے ہیں: مجھے رسول اللہ ﷺ نے وتر میں پڑھنے کے لئے چند کلمات سکھائے (ان کا ترجمہ یہ ہے:) "اے اللہ! مجھے ہدایت عطا فرما، ان بندوں میں شامل کر کے جن کو آپ نے ہدایت عطا فرمائی [1]، اور

(۱) سوال: مسلمان تو پہلے سے ہدایت یافتہ ہے اسی لئے وہ نماز میں کھڑا ہوا ہے پس ہدایت کی دعا تحصیل حاصل ہے؟ جواب: ہدایت کے معنی ثَبِّتْنِيْ علی الهُدی ہیں یعنی مجھے ہدایت پر ثابت قدم رکھ۔ إهدنا الصراط المستقیم کے بھی یہی معنی ہیں۔

مجھے عافیت (بلاؤں سے سلامتی) عطا فرما ان بندوں میں شامل کر کے جن کو آپ نے عافیت عطا فرمائی، اور میرا کارساز بن ان بندوں میں شامل کر کے جن کی آپ کارسازی فرماتے ہیں۔ اور مجھے برکت عطا فرما ان چیزوں میں جو آپ نے مجھے عطا فرمائی ہیں، یعنی صحت و مال و دولت اور بیوی بچوں میں اور مجھے بچالیں ان فیصلوں کے اثرات بد سے جو آپ فرمائیں۔ آپ یقیناً فیصلہ کرتے ہیں اور آپ کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا (یعنی آپ کا فیصلہ تو ضرور پورا ہو کر رہے گا، میں اس کو بدلنے کے لئے عرض نہیں کرتا بلکہ اس کے شر سے پناہ چاہتا ہوں) بیشک شان یہ ہے کہ وہ شخص رسوا نہیں ہوتا جس کو آپ دوست بنالیں، آپ برکت والے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! اور آپ کی شان بہت بلند ہے!''

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے ہم اس کو نہیں جانتے مگر ابو الحوراء السعدی کی سند سے یعنی ان سے اوپر صرف یہی ایک سند ہے (اور یہ اعلیٰ درجہ کا راوی نہیں ہے اس لئے مصنف رحمہ اللہ نے حدیث کو صرف حسن کہا ہے) اور اس کا نام ربیعہ بن شیبان ہے۔ اور ہم رسول اللہ ﷺ سے قنوت میں اس سے اچھی کوئی اور روایت نہیں جانتے۔ اور اہل علم نے وتر میں قنوت کے سلسلہ میں اختلاف کیا ہے، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک وتر میں پورے سال قنوت تھا، اور انھوں نے رکوع سے پہلے قنوت کو پسند کیا ہے۔ اور یہ بعض علماء کا قول ہے، اور ثوری، ابن المبارک، اسحاق اور کوفہ والے یہی بات کہتے ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ قنوت نہیں پڑھا کرتے تھے مگر رمضان کی آخری پندرہ راتوں میں اور رکوع کے بعد قومہ میں قنوت پڑھتے تھے، اور بعض علماء اس کی طرف گئے ہیں اور یہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا قول ہے۔

بابُ ماجاء فی الرَّجُلِ یَنَامُ عن الوتر أَوْ یَنْسَی

جو وتر سے سو تا رہ جائے یا بھول جائے اس کا حکم

تمام ائمہ متفق ہیں کہ وتر کی قضا ہے، اور جب قضا ہے تو وتر واجب ہے، یہ استدلال اِنّی ہے (اگر علت سے معلول پر استدلال کیا جائے جیسے آگ سے دھوئیں پر استدلال کیا جائے تو یہ استدلال لمی ہے اور اگر معلول سے علت پر استدلال کیا جائے جیسے دھوئیں سے آگ پر استدلال کیا جائے تو یہ استدلال انّی ہے، یہاں بھی استدلال انی ہے، کیونکہ جب تمام فقہاء قضا پر متفق ہیں تو ثابت ہوا کہ وتر واجب ہے) پھر اختلاف ہے کہ قضا کب تک ہے؟ حنفیہ کے نزدیک ابداً قضاء واجب ہے کیونکہ جب وتر واجب ہیں تو زندگی بھر میں ان کو ادا کرنا ضروری ہے، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فجر کے فرض پڑھنے تک قضاء ہے۔ جب فرض پڑھ لئے تو اب قضا کا وقت گذر گیا، اب قضا نہیں ہوسکتی، اب گناہ لازم ہو گیا۔ اور یہ باب احناف کے لئے ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص وتر سے سو جائے یا وتر بھول جائے تو چاہئے کہ وہ وتر پڑھے جب

اسے یاد آئے یا جب وہ بیدار ہو" ——— یہ عبارت لف ونشر مشوش ہے نام کا مقابل استیقظ بعد میں آیا ہے اور نسی کا مقابل ذکر پہلے آیا ہے۔

تشریح: اس حدیث کا ایک راوی ہے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم، محدثین کے نزدیک یہ راوی ضعیف ہے، البتہ اس کا بھائی عبداللہ ثقہ ہے اور وہ بھی اس حدیث کو روایت کرتے ہیں مگر مرسل روایت کرتے ہیں یعنی وہ اپنے والد زید بن اسلم پر سند روک دیتے ہیں، عطاء بن یسار اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا تذکرہ نہیں کرتے، اور یہ مرسل حدیث عبدالرحمٰن والی حدیث سے اصح ہے اور اس کا متن یہ ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص وتر سے سوگیا یعنی وقت پر وتر نہیں پڑھ سکا پس چاہئے کہ وہ اُسے پڑھے جب صبح کرے" ——— ائمہ ثلاثہ "جب صبح کرے" کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ جو شخص وقت میں وتر نہ پڑھ سکا ہو وہ اسے صبح صادق کے بعد پڑھے، اور ان کے نزدیک یہ حکم فجر کے فرض پڑھنے تک ہے، اور حنفیہ کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ صبح صادق ہونے کے بعد بھی وتر پڑھے، یعنی صبح ہونے کے بعد تہجد تو گیا، اس کی قضاء نہیں، مگر وتر صبح ہونے کے بعد بھی پڑھنے ہیں، کیونکہ وہ واجب ہیں اور فجر کی نماز تک پڑھنا اس کے بعد نہ پڑھنا حدیث شریف میں اس پر کوئی دلالت نہیں۔

[۲۲۷] باب ماجاء فی الرجل یَنَامُ عن الوتر أو یَنْسٰی

[۴۷۴-] حدثنا محمودُ بنُ غَیْلَانَ، نا وکیعٌ، نا عبدُ الرحمنِ بنُ زیدِ بنِ أَسْلَمَ، عن أبیہ، عن عَطَاءِ بنِ یَسَارٍ، عن أبی سعیدِ الخُدریِّ، قال: قال رسولُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم: " مَنْ نَامَ عَنِ الوِتْرِ أَوْ نَسِیَہُ فَلْیُصَلِّ إِذَا ذَکَرَ وَإِذَا اسْتَیْقَظَ"

[۴۷۵-] حدثنا قُتیبۃُ، نا عبدُ اللہِ بنُ زَیْدِ بنِ أَسْلَمَ، عن أبیہِ، أنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قال: "مَنْ نَامَ عن وِتْرِہِ فَلْیُصَلِّ إِذَا أَصْبَحَ"

وھٰذا أَصَحُّ مِنَ الحَدیثِ الأوَّلِ؛ سمعتُ أَبَا دَاوُدَ السِّجْزِیَّ یعنی سُلیمانَ بنَ الأشعثِ یقولُ: سَأَلْتُ أحمدَ بنَ حنبلٍ: عن عبدِ الرحمنِ بنِ زیدِ بنِ أسلمَ؟ فقال: أخوہ عبدُ اللہِ لَا بَأْسَ بِہِ.

وسمِعتُ محمداً یَذْکُرُ عن علیِّ بنِ عبدِ اللہِ أَنَّہُ ضَعَّفَ عبدَ الرحمنِ بنَ زیدِ بنِ أَسْلَمَ، وقال: عبدُ اللہِ بنُ زَیْدِ بنِ أَسْلَمَ ثِقَۃٌ.

وقد ذَھَبَ بعضُ أھلِ الکوفۃِ إلی ھٰذا الحدیثِ، وقالوا: یُوْتِرُ الرَّجُلُ إِذَا ذَکَرَ، وإِنْ کَانَ بَعْدَ مَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ؛ وبہ یقولُ سفیانُ الثوریُّ.

وضاحت: امام ابوداؤد رحمہ اللہ کی مشہور نسبت سجستانی ہے، اور یہاں سِجْزِی نسبت آئی ہے، یہ دونوں لفظ

سیستان کی عربی ہیں، سیستان: خراسان کے ایک شہر کا نام ہے۔امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے ابوداؤد سجزی یعنی سلیمان بن اشعث (یعنی سے عبارت کسی طالب علم نے بڑھائی ہے) سے سنا وہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے بارے میں پوچھا کہ وہ کیسا راوی ہے؟ انھوں نے فرمایا: اس کے بھائی عبد اللہ میں کوئی خرابی نہیں۔یعنی عبداللہ ثقہ ہیں اور عبدالرحمٰن پر خاموش نقد کیا کہ وہ ٹھیک نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علی بن عبداللہ المدینی، عبدالرحمٰن کی تضعیف کرتے تھے۔اور عبداللہ کو ثقہ قرار دیتے تھے۔بعض کوفہ والے اس حدیث کی طرف گئے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ آدمی وتر پڑھے جب یاد کرے، اگر چہ سورج طلوع ہونے کے بعد یاد کرے۔یعنی وتر کی قضا ابداً واجب ہے، اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

فائدہ: مسند مرفوع حدیث کو اگر چہ امام ترمذیؒ نے عبدالرحمٰن کی وجہ سے غیر اصح قرار دیا ہے اور عبداللہ کی مرسل روایت کو اصح قرار دیا ہے، مگر یہ حدیث ابوداؤد (حدیث ۱۴۳۱) میں زید بن اسلم کے شاگرد ابوغسان محمد بن مطرف مدنی کی سند سے بھی مرفوع مسند مروی ہے اور اس سند میں کوئی خرابی نہیں، پس یہ مسند مرفوع حدیث بھی صحیح ہے۔

بَابُ ماجاء في مُبَادَرَةِ الصُّبْحِ

صبح سے پہلے وتر پڑھ لینے کا بیان

یہ باب ائمہ ثلاثہ کے لئے ہے۔

پہلی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وتر پڑھنے میں صبح سے سبقت کرو''

تشریح: یہاں صبح سے کیا مراد ہے؟ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک صبح کی نماز مراد ہے۔اور وہ حدیث کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ فجر کی نماز سے پہلے وتر پڑھ لو، اگر فجر کے فرض پڑھ لئے تو اب وقت گیا، اب وتر نہیں پڑھے جاسکتے، اب گناہ لازم ہوگیا۔اور امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صبح سے فجر کی نماز مراد نہیں بلکہ صبح صادق مراد ہے۔اور حدیث میں وتر کے وقتِ ادا کا بیان ہے۔یعنی صبح صادق سے پہلے وتر پڑھ لو وتر کا وقتِ ادا یہی ہے۔اگر صبح صادق ہوگئی تو وقت ادا گیا اب قضا پڑھنی ہوگی۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''صبح کرنے سے پہلے وتر پڑھ لو''

تشریح: اس حدیث میں بھی احناف صبح سے صبح صادق مراد لیتے ہیں، یعنی رسول اللہ ﷺ نے وتر کا وقتِ اداء بیان کیا ہے۔اور ائمہ ثلاثہ فجر کی نماز مراد لیتے ہیں کہ صبح کی نماز پڑھنے سے پہلے تک وتر پڑھ لو، بعد میں اس کی قضاء نہیں (مگر حدیث کا یہ مطلب نا قابل فہم ہے)

تیسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب صبح صادق ہوگئی تو تہجد اور وتر دونوں کا وقت ختم ہوگیا۔لہٰذا

صبح صادق سے پہلے وتر پڑھ لو"

تشریح: تہجد اور وتر دونوں کا وقت صبح صادق تک ہے، صبح صادق ہونے پر دونوں کا وقت ختم ہو جاتا ہے، مگر چونکہ تہجد سنت ہے اس لئے اس کی قضاء نہیں البتہ وتر واجب ہیں اس لئے صبح صادق کے بعد بھی ان کی قضاء کرنی ہے۔ غرض اس حدیث میں بھی وتر کے وقتِ ادا کا بیان ہے ـــــ اس حدیث کا ایک راوی: سلیمان بن موسیٰ ہے یہ کوئی اچھا راوی نہیں۔ اور یہ حدیث مذکورہ الفاظ کے ساتھ وہی بیان کرتا ہے۔

چوتھی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "صبح کی نماز کے بعد وتر نہیں" ـــــ یہ حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور محمد بن نصر مروزی کی کتاب "قیام اللیل (ص:۱۳۸) میں ہے۔ ائمہ ثلاثہ کی صریح دلیل یہی ایک حدیث ہے مگر یہ حدیث غایت درجہ ضعیف ہے، اس حدیث کا مدار ابو ہارون عمارۃ بن جُوَین العبدی پر ہے، حافظ رحمہ اللہ نے تقریب میں اس کو متروک اور کذاب کہا ہے (معارف السنن ۴: ۲۵۴)

[۲۲۸] باب ماجاء فی مُبَادَرَةِ الصُّبْحِ

[٤٧٦-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا يَحيىَ بنُ زَكَرِيَّا بنِ أبى زَائِدَةَ، نا عُبَيْدُ اللّٰهِ، عن نَافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال: " بَادِرُوْا الصُّبْحَ بِالوِتْرِ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[٤٧٧-] حدثنا الحَسَنُ بنُ عليِّ الْخَلاَّلُ، نا عبدُ الرزاقِ، نا مَعْمَرٌ، عن يحيىَ بنِ أبى كَثِيرٍ، عن أبى نَضْرَةَ، عن أبى سَعِيدِ الْخُدْرِيِّ قال: قال رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: " أَوْتِرُوْا قَبْلَ أَنْ تُصْبِحُوْا"

[٤٧٨-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلاَنَ، نا عبدُ الرزاقِ، نا ابنُ جُرَيْجٍ، عن سليمانَ بنِ مُوْسَى، عَنْ نَافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، عن رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم قال: " إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ فَقَدْ ذَهَبَ كُلُّ صَلاَةِ اللَّيْلِ والوِتْرُ، فَأَوْتِرُوْا قَبْلَ طُلُوْعِ الْفَجْرِ"

قال أبو عيسى: وسُلَيْمَانُ بنُ مُوسى قَدْ تَفَرَّدَ بِهِ على هٰذا اللَّفْظِ.

[٤٧٩-] ورُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أنّه قال: " لاوِتْرَ بعدَ صَلاَةِ الصُّبْحِ"

وهو قولُ غيرِواحدٍ من أهلِ العلمِ، وبه يقولُ الشافعيُّ وأحمدُ وإسحاقُ: لاَيَرَوْنَ الوِتْرَ بَعْدَ صَلاَةِ الصُّبْحِ.

حدیث (۴۷۷) پر امام ترمذی رحمہ اللہ نے کوئی حکم نہیں لگایا۔ یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے، بخاری اور ابوداؤد کے علاوہ پوری جماعت نے اس کو روایت کیا ہے۔

بابُ ماجاء لا وِترَانِ فی لَیلَۃٍ

ایک رات میں دو وتر نہیں

یہ حدیث ہی کے الفاظ ہیں: ایک رات میں دو وتر نہیں اور اس کے مطلب میں اختلاف ہوا ہے، صورت مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص نے سونے سے پہلے وتر پڑھ لئے، پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے تہجد کے لئے بیدار ہوا، اب ایک طرف حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اپنی رات کی آخری نماز وتر کو بناؤ، اور یہ شخص وتر پڑھ چکا ہے پس وہ کیا کرے؟

جواب: حضرت اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ شخص تہجد شروع کرنے سے پہلے صرف ایک رکعت پڑھے اور نیت کرے کہ اس نے سونے سے پہلے جو وتر پڑھا ہے یہ رکعت اس کے ساتھ مل کر جفت ہوگئی۔ اور جب وہ نماز جفت ہوگئی تو وتر باطل ہوگیا پھر تہجد پڑھے، اور آخر میں وتر پڑھے۔ پس اس حدیث پر بھی عمل ہوگیا کہ رات کی آخری نماز وتر کو گردانو، غرض اس شخص پر تہجد کے شروع میں ایک رکعت پڑھ کر سابقہ وتر کو باطل کرنا لازم ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''ایک رات میں دو وتر نہیں''

اور ائمہ اربعہ فرماتے ہیں: حدیث کا یہ مطلب نہیں، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص سونے سے پہلے وتر پڑھ چکا ہے پھر وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بیدار ہو تو وہ صرف تہجد پڑھے، وتر نہ پڑھے۔ کیونکہ ایک رات میں دو وتر نہیں۔ اور حدیث: اجعَل آخر صلاتك وترًا میں امر استحبابی ہے اور دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وتر کے بعد بھی دو نفل بیٹھ کر پڑھے ہیں۔

[۲۲۹] باب ماجاءَ لَاوِترَان فی لیلۃٍ

[۴۸۰-] حدثنا هَنّادٌ، نا مُلازِمُ بنُ عَمْرٍو، قال حدثنی عبدُ اللهِ بن بَدْرٍ، عن قَیْسِ بنِ طَلْقِ بنِ علیٍّ، عن أبیهِ، قال: سمعتُ رسولَ الله صلی الله علیه وسلم یقولُ: " لَاوِترَانِ فِیْ لَیْلَةٍ"

قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ غریبٌ.

واختَلَفَ أهلُ العلمِ فی الَّذِیْ یُوْتِرُ مِنْ أولِ اللیلِ ثم یقومُ مِنْ آخِرِه: فَرَأَی بعضُ أهلِ العلمِ من أصحابِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم ومَنْ بَعْدَهُمْ نَقْضَ الوِتْرِ، وقالوا: یُضِیْفُ إِلَیْهَا رکعةً، وَیُصَلِّیْ مَا بَدَا لَهُ، ثُمَّ یُوْتِرُ فی آخرِ صَلَاتِهِ، لِأَنَّه لاوِترَانِ فی لیلةٍ، وهو الذی ذهبَ إلیه إسحاقُ.

وقالَ بعضُ أهلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم وغیرِهِمْ: إِذَا أَوْتَرَ مِنْ أَوَّلِ اللَّیْلِ، ثم نامَ، ثم قامَ مِنْ آخِرِهِ: أَنَّه یُصَلِّیْ ما بَدَا لَه، وَلَا یَنْقُضُ وِتْرَهُ، وَیَدَعُ وِتْرَهُ علی مَاکَانَ، وهو قولُ

سفیانَ الثوریِّ، ومالكِ بنِ أنسٍ، وأحمدَ، وابنِ المبارکِ، وهذا أصحُّ لأنه قَدْ رُوِیَ مِنْ غیرِ وجهٍ أنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قد صَلّٰی بعدَ الوترِ.

[۴۸۱-] حدثنا محمدُ بنُ بشَّارٍ، نا حَمَّادُ بنُ مسعَدَةَ، عن مَیْمُوْنِ بنِ موسی المَرَئِیِّ، عن الحسنِ، عن أُمِّهِ، عن أُمِّ سَلَمَةَ: أنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم کانَ یُصَلِّیْ بعدَ الوِتْرِ رَکْعَتَیْنِ.

وقد رُوِیَ نحوُ هذا عن أبی أُمَامَةَ، وعائشةَ، وغیرِ واحدٍ عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم.

ترجمہ: علماء نے اختلاف کیا ہے اس شخص کے بارے میں جو شروع رات میں وتر پڑھ چکا ہو پھر وہ آخر رات میں اٹھے، پس صحابہ اور بعد کے بعض علماء نے وتر توڑنے کی بات کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وتر کے ساتھ ایک رکعت ملائے، اور جو چاہے نماز پڑھے۔ پھر اپنی نماز کے آخر میں وتر پڑھے، اس لئے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں اور اسی کی طرف اسحاق بن راہویہ گئے ہیں ـــــــ اور صحابہ وغیرہ میں سے بعض علماء کہتے ہیں کہ جب اس نے شروع رات میں وتر پڑھ لئے پھر وہ سو گیا پھر وہ رات کے آخری حصہ میں اٹھا تو وہ تہجد پڑھے جتنی اللہ تعالیٰ اس کو توفیق دیں، اور اپنے وتر کو باطل نہ کرے وہ اپنے وتر کو بحالہ چھوڑ دے، یہ سفیان ثوری، مالک، احمد اور ابن المبارک رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اور یہ (مطلب) زیادہ صحیح ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے متعدد سندوں سے مروی ہے کہ آپؐ نے وتر کے بعد نوافل پڑھے ہیں، اس کے بعد یہی حدیث سند کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس حدیث کو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں (ان کی والدہ کا نام خیرۃ ہے اور وہ حضرت ام سلمہ کی آزاد کردہ باندی تھیں) وہ ام سلمہ سے روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وتر کے بعد دو رکعت پڑھا کرتے تھے (اس حدیث کی سند میں میمون بن موسیٰ ہیں یہ صدوق ہیں مگر مدلّس ہیں (تقریب) اور حضرت ام سلمۃ کی یہی حدیث ابن ماجہ میں بھی ہے اس میں وهو جالِسٌ کا اضافہ ہے) اور اس کے مانند روایت کیا گیا ہے ابو امامۃ، اور حضرت عائشہ اور متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے، وہ سب رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں (حضرت عائشہ کی حدیث ابن ماجہ میں صحیح سند کے ساتھ ہے اور ابو امامۃ کی حدیث مسند احمد میں ہے اور اس کی سند حسن ہے)

فائدہ: وتروں کے بعد دو نفلوں کا امام مالک رحمہ اللہ انکار کرتے ہیں، اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ نفلیں نہ میں پڑھتا ہوں اور نہ کسی کو روکتا ہوں، اور امام اعظم اور امام شافعی رحمہما اللہ سے اس سلسلہ میں کچھ مروی نہیں۔ متاخرین احناف نے اور ہمارے اکابر نے ان نفلوں کا ثبوت تسلیم کیا ہے۔ علامہ کشمیری قدس سرہٗ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کا یہ نفلیں بیٹھ کر پڑھنا اتفاقی نہیں بلکہ بالقصد تھا تاکہ وتر کا آخری نماز ہونا متاثر نہ ہو۔ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا: میں یہ نفلیں بیٹھ کر پڑھوں یا کھڑے ہو کر؟ کیونکہ نفل نماز بیٹھ کر پڑھنے سے ثواب آدھا ملتا ہے، حضرت گنگوہی نے فرمایا: بیشک بیٹھ کر نماز پڑھنے سے ثواب آدھا ملتا ہے لیکن اگر کوئی اتباع رسول کی نیت سے بیٹھ کر

پڑھے تو اس کو دو ثواب ملیں گے: نفلوں کا آدھا اور اتباع سنت کا علحدہ اور ہوسکتا ہے کہ نفل اور اتباع رسول کا ثواب مل کر کھڑے ہو کر نفل پڑھنے کے ثواب سے زیادہ ہو جائے۔

بابُ ماجاء فی الوِتْرِ عَلَی الرَّاحِلَةِ

سواری پر وتر پڑھنے کا بیان

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اونٹ پر وتر پڑھنا جائز ہے، کیونکہ ان کے نزدیک وتر سنت ہیں اور سنن ونوافل اونٹ پر پڑھنے جائز ہیں۔ اور امام اعظمؒ کے نزدیک وتر واجب ہیں یعنی وتر عملاً فرض ہیں اس لئے ان کو اونٹ پر پڑھنا جائز نہیں۔

حدیث: سعید بن یسار رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں ایک سفر میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھا، پس میں (نماز پڑھنے کے لئے) ان سے پیچھے رہ گیا (پھر جب ان کے ساتھ ہوا) تو انھوں نے پوچھا: کہاں رہ گئے تھے؟ میں نے کہا: وتر پڑھنے کے لئے اترا تھا، ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: کیا آپ کے لئے رسول اللہ ﷺ میں اچھا نمونہ نہیں؟ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اونٹ پر وتر پڑھتے دیکھا ہے۔

تشریح: ائمہ ثلاثہ نے یہاں وتر سے وترِ حقیقی مراد لئے ہیں، اور احناف کے نزدیک صلاۃ اللیل مع الوتر مراد ہے۔ یعنی ابن عمر رضی اللہ عنہ نے سعید بن یسار کو نصیحت کی کہ وتر یعنی تہجد جانور پر پڑھ سکتے ہیں۔ آنحضور ﷺ اونٹ پر تہجد پڑھتے تھے، اور اس تخصیص کی دلیل یہ ہے کہ خود حضرت ابن عمرؓ تہجد اونٹ پر پڑھتے تھے اور وتر پڑھنے کے لئے زمین پر اترتے تھے۔ طحاوی میں صحیح سند کے ساتھ روایت ہے۔ نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں: ابن عمرؓ اونٹ پر تہجد پڑھتے تھے اور وتر پڑھنے کے لئے زمین پر اترتے تھے، اور فرماتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ بھی ایسا ہی کرتے تھے (طحاوی ۱:۲۸۴ باب الوتر هل يصلى في السفر على الراحلة أم لا؟)۔

[۲۳۰] باب ماجاء في الوتر على الراحلة

[۴۸۲-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا مالِكُ بنُ أَنَسٍ، عن أبي بَكْرِ بنِ عُمَرَ بنِ عَبدِ الرحمنِ، عن سَعيدِ بنِ يَسَارٍ قال: كُنْتُ أَمْشِيْ مَعَ ابنِ عُمَرَ فِيْ سَفَرٍ، فَتَخَلَّفْتُ عَنْهُ، فقال: أَيْنَ كُنْتَ؟ فَقُلْتُ: أَوْتَرْتُ، فَقال أَلَيْسَ لَكَ فِيْ رسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ؟ لَرَأَيْتُ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يُوْتِرُ على رَاحِلَتِهِ.

وفي الباب: عن ابنِ عباسٍ، قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وقد ذَهَبَ بعضُ أهلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغيرِهِمْ إِلَى هذا، وَرَأَوْا أَنْ يُوْتِرَ الرجلُ على رَاحِلَتِهِ، وبه يقولُ الشافعيُّ وأحمدُ وإسحاقُ.

وقالَ بعضُ أهلِ العلمِ: لايُوْتِرُ الرجلُ على الراحِلَةِ، فإذا أرادَ أنْ يُوْتِرَ نَزَلَ فَأَوْتَرَ عَلَى الأَرْضِ، وهو قولُ بعضِ أهلِ الكوفةِ.

ترجمہ: صحابہ اوران کے علاوہ علماء میں سے بعض اس حدیث کی طرف گئے ہیں، انھوں نے یہ بات جائز سمجھی ہے کہ اونٹ پر وتر پڑھے، اوراسی کے شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ قائل ہیں۔ اور بعض علماء کہتے ہیں: آدمی سواری پر وتر نہ پڑھے، پس جب وتر پڑھنے کا ارادہ کرے تو سواری سے اترے اور زمین پر وتر پڑھے، یہ بعض کوفہ والوں کا قول ہے۔

بابُ ماجاء في صَلاَةِ الضُّحَى

چاشت کی نماز کا بیان

اشراق وچاشت دو نمازیں ہیں یا ایک؟ فقہاء ومحدثین کے نزدیک دونوں ایک نماز ہیں۔ اگر سورج نکلنے کے بعد جلدی پڑھ لے تو اشراق ہے، اور دیر سے پڑھے (نو دس یا گیارہ بجے پڑھے) تو چاشت ہے۔ چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ایک ہی باب قائم کیا ہے اور اس کے تحت سب روایتیں لے آئے ہیں ـــــ اور صوفیاء کہتے ہیں: یہ دونوں الگ الگ نمازیں ہیں، اشراق کی کم سے کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار رکعتیں ہیں، اور چاشت کی کم سے کم آٹھ رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعتیں ہیں۔ ظاہر ہے اس مسئلہ میں صوفیا کی رائے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی کیونکہ صوفیا شریعت کے رموز شناس نہیں ہوتے شریعت کے رموز شناس اور نصوص کو سمجھنے والے اول نمبر پر فقہاء ہیں پھر محدثین ہیں، پس ان حضرات کی جو رائے ہے وہی صحیح ہے۔

پہلی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص (پابندی سے) چاشت کی بارہ رکعتیں پڑھے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں سونے کا محل بنائیں گے''

تشریح: اس حدیث کا ایک راوی ہے موسیٰ بن فلان بن انس (یہ فلان کنائی لفظ نہیں ہے بلکہ موسیٰ کے باپ کا نام ہی فلان ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں: اس کا نام موسیٰ بن غیلان ہے اور فلاں: غیلان کی تحریف ہے، مگر اسماء رجال کے ماہرین کے نزدیک یہ بات صحیح نہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس کے باپ کا نام فلاں ہی تھا) یہ کچھ بڑھیا راوی نہیں ، مجہول سا ہے، مگر اس سے مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا کیونکہ باب میں بہت روایتیں ہیں۔

دوسری حدیث: عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کبیر کہتے ہیں: مجھے کسی صحابی نے یہ بات نہیں بتائی کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو چاشت کی نماز پڑھتے دیکھا ہے سوائے ام ہانی رضی اللہ عنہا کے، انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے گھر فتح مکہ کے دن آئے۔ پس غسل کیا پھر آٹھ نفلیں پڑھیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس سے ہلکی

نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ البتہ آپؐ رکوع اور سجدے مکمل ادا فرماتے تھے (یعنی تخفیف صرف قراءت میں کی تھی، رکوع سجدے آپؐ نے باطمینان ادا فرمائے تھے)

تشریح: ام ہانی: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حقیقی بہن اور رسول اللہ ﷺ کی چچازاد بہن ہیں، وہ ہجرت کرکے مدینہ نہیں آئی تھیں مکہ ہی میں قیام تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے رات میں مکہ سے باہر پڑاؤ ڈالا تھا پھر صبح مکہ میں داخل ہوئے تھے اور سیدھے اپنی بہن ام ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے تھے، وہاں غسل فرمایا اور چاشت کی آٹھ رکعت پڑھیں، وہ نماز نہایت ہلکی تھی۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: چاشت کے سلسلہ میں جو روایات مروی ہیں یہ روایت ان میں سب سے اچھی ہے، مگر یہ حدیث نمازِ چاشت کے باب میں صریح نہیں، ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ نفلیں فتح مکہ کے شکریہ کی پڑھی ہوں، اور چونکہ وہ وقت چاشت کا تھا اس لئے ان نفلوں کو چاشت کی نماز تصور کرلیا گیا۔

تیسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اے فرزندِ آدم! تو دن کے شروع میں چار رکعتیں میرے لئے پڑھ، میں دن کے آخر تک تیری کفایت کروں گا''

تشریح: شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ چار رکعتیں نفس کی اصلاح کے لئے متعد بہ مقدار ہے۔ اگر کوئی شام تک اصلاح نفس کے لئے کوئی دوسری عبادت نہ بھی کرے تو یہ عبادت اس کے لئے کافی ہے۔ اور عام طور پر اس حدیث کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شام تک اس کے مسائل حل فرماتے رہتے ہیں۔

چوتھی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص چاشت کی دو رکعتیں پابندی سے پڑھے اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں اگرچہ وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں'' ——— گناہ سے صغائر مراد ہیں کبائر کے لئے توبہ شرط ہے۔ تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

پانچویں حدیث: ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ چاشت کی نماز پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ ہمارا گمان ہوتا تھا کہ آپؐ اس نماز کو کبھی نہیں چھوڑیں گے، پھر اس کو پڑھنا بند کردیتے تھے یہاں تک کہ ہمارا گمان ہوتا تھا کہ اب آپ اس کو کبھی نہیں پڑھیں گے ——— یعنی آنحضور ﷺ نے چاشت کی نماز پابندی سے نہیں پڑھی، جب پڑھتے تو مسلسل پڑھتے اور جب بند کردیتے تو لمبے وقت تک چھوڑے رہتے۔

[۲۳۱] باب ماجاء فی صلاۃ الضحی

[۴۸۳-] حدثنا أبو كُرَيْبٍ محمدُ بنُ العَلاَءِ، نا يُونُسُ بنُ بُكَيْرٍ، عن محمدِ بنِ إسحاقَ، حدثني موسى بنُ فُلانِ بنِ أنسٍ، عن عَمِّهِ ثُمَامَةَ بنِ أَنَسِ بنِ مالكٍ، عن أنسِ بنِ مالكٍ قال: قال رسولُ الله

صلى الله عليه وسلم: "مَنْ صَلَّى الضُّحَى ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً بَنَى اللّٰهُ لَهُ قَصْراً فِي الْجَنَّةِ مِنْ ذَهَبٍ"

وفي الباب: عن أُمِّ هانِئٍ، وأبي هُريرةَ، ونُعَيمِ بنِ هَمَّارٍ، وأبي ذَرٍّ، وعائشةَ، وأبي أُمَامَةَ، وعُتْبَةَ بنِ عبدٍ السُّلَمِيِّ، وابنِ أبي أَوْفَى، وأبي سَعيدٍ، وزيدِ بنِ أَرْقَمَ، وابنِ عباسٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ أنسٍ حديثٌ غريبٌ لانَعْرِفُهُ إلاّ مِنْ هٰذا الوجْهِ.

[٤٨٤-] حدثنا أبو موسى محمدُ بنُ المُثَنّى، نا محمدُ بنُ جَعْفَرٍ، نا شُعْبَةُ، عن عَمْرِو بنِ مُرَّةَ، عن عبدِ الرحمنِ بنِ أبي لَيْلَى، قال: مَا أَخْبَرَنِيْ أَحَدٌ أَنَّهُ رَأَى رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّيْ الضُحى إلاّ أُمُّ هَانِئٍ، فَإِنَّهَا حَدَّثَتْ أَنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم دَخَلَ بَيْتَهَا يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ، فَاغْتَسَلَ فَسَبَّحَ ثَمَانَ رَكْعَاتٍ، مَا رَأَيْتُهُ صَلّٰى صَلاَةً قَطُّ أَخَفَّ مِنْهَا، غَيْرَ أَنَّهُ كَانَ يُتِمُّ الرُّكُوْعَ والسجودَ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وكَأَنَّ أحمدَ رَأَى أَصَحَّ شَيْءٍ في هٰذا البابِ حديثَ أُمِّ هَانِئٍ.

واخْتَلَفُوْا في نُعَيْمٍ: فقال بعضُهُمْ: نُعَيْمُ بنُ خَمَّارٍ، وقال بعضُهُم: ابنُ هَمَّارٍ، ويقال: ابنُ هَبَّارٍ، ويقال: ابنُ هَمَّامٍ، والصحيحُ: ابنُ هَمَّارٍ.

وأبو نُعَيمٍ وَهِمَ فِيْهِ، فقال: ابنُ خَمَّارٍ، وأَخْطَأَ فِيْهِ، ثُمَّ تَرَكَ، فقال: نُعَيْمٌ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، أَخْبَرَنِيْ بِذٰلِكَ عبدُ بنُ حُمَيْدٍ، عن أبي نُعَيْمٍ.

[٤٨٥-] حدثنا أبو جَعْفَرٍ السِّمْنَانِيُّ، نا محمدُ بنُ الحُسَينِ، نا أبو مُسْهِرٍ، نا إسماعيلُ بنُ عَيَّاشٍ، عن بَحِيْرِ بنِ سَعْدٍ، عن خالدِ بنِ مَعْدَانَ، عن جُبَيْرِ بنِ نُفَيْرٍ، عن أبي الدَّرْدَاءِ، وأبي ذَرٍّ، عن رسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم، عنِ اللهِ تبَارَكَ وتعَالٰى، أَنَّهُ قَالَ: "ابنَ آدَمَ! ارْكَعْ لِيْ أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ مِنْ أَوَّلِ النَّهَارِ: أَكْفِكَ آخِرَهُ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ غريبٌ.

وَرَوَى وكيعٌ والنَّضْرُ بنُ شُمَيْلٍ وغيرُ واحدٍ مِنَ الأَئِمَّةِ هٰذا الحديثَ عن نَهَّاسِ بنِ قَهْمٍ، ولاَ نَعرِفُهُ إلاّ مِن حَدِيثِهِ.

[٤٨٦-] حدثنا محمدُ بنُ عبدِ الأعْلَى البَصْرِيُّ، نا يزيدُ بنُ زُرَيْعٍ، عن نَهَّاسِ بنِ قَهْمٍ، عن شَدَّادٍ أبي عَمَّارٍ، عن أبي هريرةَ، قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: "مَنْ حَافَظَ على شُفْعَةِ الضُّحى غُفِرَ لَهُ ذُنُوْبُهُ، وإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ البَحْرِ"

[٤٨٧-] حدثنا زِيادُ بنُ أَيُّوبَ البَغْدَادِيُّ، نا محمدُ بنُ رَبِيْعَةَ، عن فُضَيْلِ بنِ مَرْزُوْقٍ، عن عَطِيَّةَ

العَوْفِيُّ، عن أبي سعيدٍ الخدريِّ، قال: كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّيْ الضُّحى حتى نَقولَ لَايَدَعُ، وَيَدَعُها حتى نقولَ لَايُصَلِّيْ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ.

وضاحت: پہلی حدیث (نمبر ۴۸۳) کی صرف یہی ایک سند ہے، پس وہ غریب ہے، علاوہ ازیں اس میں موسیٰ بن فلاں ہے جو مجہول سا راوی ہے۔ مگر حدیث کے ضعف سے مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا کیونکہ باب میں بہت روایتیں ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ام ہانی کی حدیث (نمبر ۴۸۴) حسن صحیح ہے اور گویا امام احمد رحمہ اللہ نے اس باب میں ام ہانی کی حدیث کو سب سے صحیح سمجھا ہے —— اور باب میں جن صحابہ کی حدیثوں کا حوالہ ہے ان میں ایک صحابی نُعیم رضی اللہ عنہ ہیں، ان کے والد کے نام میں اختلاف ہے اور چار قول ہیں: خَمّار، هَمّار، هَبّار اور هَمّام صحیح نام ہمّار ہے —— اور ایک بڑے محدث ابو نُعیم فضل بن دُکین باپ کا نام خمّار لیتے تھے، اور یہ ان کی غلطی تھی بعد میں جب ان کو غلطی کا احساس ہوا تو باپ کا نام لینا چھوڑ دیا صرف نُعیم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہنے لگے، یہ بات امام ترمذی کو عبد بن حمید نے بتائی ہے —— اور حدیث (۴۸۵) کو امام ترمذی نے غریب کہا ہے۔ مگر منذری نے ابوداؤد کی تلخیص میں ترمذی کی عبارت نقل کی ہے اس میں حسن غریب ہے، مصری نسخہ (ابن عربی کی شرح) میں بھی حسن غریب ہے۔ کیونکہ اسماعیل بن عیاش: شامی اساتذہ میں معتبر ہیں، اور بحیر بن سعد شامی ہیں —— اس کے بعد امام ترمذی نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث یعنی صلاۃ الضحیٰ کی حدیث وکیع اور نضر بن شُمیل وغیرہ بڑے لوگوں نے نہّاس بن قَہم سے روایت کی ہے اور نہّاس سے آخر تک اس کی ایک ہی سند ہے پھر نہّاس کی اس حدیث کو یزید بن زریع کی سند سے بیان کیا ہے (حدیث ۴۸۶) اور وکیع رحمہ اللہ سے حدیث ابن ماجہ (حدیث ۱۳۸۲) میں مروی ہے۔

بابُ ماجاء في الصَّلاَةِ عِنْدَ الزَّوَالِ

زوال کی نماز کا بیان

رسول اللہ ﷺ زوال ہوتے ہی چار نفلیں ایک سلام سے پڑھتے تھے۔ شوافع کے نزدیک یہ سنت الزوال ہے اور مستقل نماز ہے پھر ظہر سے پہلے دو رکعت سنت مؤکدہ الگ سے پڑھتے تھے، امام غزالی رحمہ اللہ نے احیاء العلوم کی کتاب الاوراد میں صلاۃ الزوال کے استحباب کی صراحت کی ہے، اور حنفیہ کے نزدیک یہ مستقل نماز نہیں بلکہ ظہر کی سنتیں ہیں جن کو آپ زوال ہوتے ہی پڑھ لیتے تھے۔ چنانچہ احناف کی کتابوں میں اس نماز کا ذکر نہیں ہے۔

اور حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ مستقل نماز ہے، ظہر کی سنتیں نہیں ہیں کیونکہ سنتوں کا فرضوں سے اتصال اصل ہے اور گرمیوں میں ظہر دیر سے پڑھی جاتی ہے، پھر اس کی سنتیں زوال کے ساتھ ہی کیسے پڑھی

جاسکتی ہیں؟ (الکوکب ۱:۱۹۳)

پہلی حدیث: عبداللہ بن السائب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سورج ڈھلنے کے بعد ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور فرمایا: ''یہ ایک ایسی گھڑی ہے جس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں، پس میں یہ بات پسند کرتا ہوں کہ اس میں میرا کوئی نیک عمل چڑھے''

تشریح: بعض اوقات ایسے ہیں جن میں روحانیت پھیلتی ہے (تفصیل رحمۃ اللہ الواسعہ میں ہے) زوال کے بعد کی گھڑی میں بھی روحانیت پھیلتی ہے اس لئے یہ بھی عبادت کا خاص وقت ہے، آسمان کے دروازے کھلنے کا مطلب: روحانیت کا پھیلنا اور عنایات الٰہی کا متوجہ ہونا ہے۔

دوسری حدیث: حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ زوال کے ساتھ چار رکعتیں پڑھتے تھے اور ان کے آخر ہی میں سلام پھیرتے تھے یعنی ایک سلام سے پڑھتے تھے یہ حدیث ابن ماجہ (حدیث نمبر ۱۱۵۷) میں ہے، اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ ''جب سورج ڈھلتا ہے تو آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں''

[۲۳۲] باب ماجاء فی الصلاة عند الزوال

[۴۸۸-] حدثنا أبو موسىٰ محمدُ بنُ المُثَنّٰى، نا أبو داوُدَ الطَّيَالِسِيُّ، نا محمدُ بنُ مُسْلِمِ بنِ أبی الوَضَّاحِ، هُوَ أبو سعيدِ المُؤَدِّبُ، عن عبدِ الكريمِ الجَزَرِیِّ، عن مجاهِدٍ، عن عبدِ اللهِ بنِ السَّائِبِ، أنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی الله عليه وسلم كان يُصَلِّیْ أَرْبَعًا بَعْدَ أَنْ تَزُوْلَ الشَّمْسُ قبلَ الظُّهرِ فقال: ''إِنَّهَا سَاعَةٌ تُفْتَحُ فِيْهَا أَبْوَابُ السَّمَاءِ، وأُحِبُّ أَنْ يَصْعَدَ لِیْ فِيْهَا عَمَلٌ صَالِحٌ''

وفی الباب: عن علیٍّ، وأبی أيوبَ، قال أبو عيسى: حديثُ عبدِ اللهِ بنِ السَّائِبِ حديثٌ حسنٌ غريبٌ.

[۴۸۹-] وَرُوِیَ عن النبیِّ صلی الله عليه وسلم أنَّه كان يُصَلِّیْ أَرْبَعَ رَكْعَاتٍ بَعْدَ الزوالِ لَايُسَلِّمُ إلَّا فی آخرِهِنَّ.

ملحوظہ: مناوی نے دوسری حدیث (۴۸۹) کے بارے میں فرمایا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے۔

بابُ ماجاء فی صَلَاةِ الْحَاجَةِ

نماز حاجت کا بیان

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کو کوئی حاجت پیش آئے خواہ اللہ تعالیٰ سے یا کسی انسان سے (یعنی وہ کسی اہم معاملہ میں براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہے، یا کسی بندے سے کوئی چیز طلب کرنا چاہے مثلاً

قرض لینا چاہے اور خیال ہو کہ اللہ جانے دے گا یا نہیں) تو خوب اچھی طرح وضو کرے، پھر دو رکعت نفل پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرے، اور نبی ﷺ پر درود بھیجے، پھر یہ دعا پڑھے: لا إله إلا الله الحليم الكريم الی آخرہ ترجمہ: کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو بردبار ہیں، پاک ہے وہ اللہ جو عرشِ عظیم کا پروردگار ہے۔ اور تمام تعریفیں اس اللہ کے لئے ہیں جو سارے جہانوں کا پالنہار ہے، مانگتا ہوں میں آپ سے آپ کی مہربانی واجب کرنے والی چیزیں، اور آپ کی بخشش کا پکا ذریعہ، اور ہر نیکی سے بلا مشقت کمائی، اور ہر گناہ سے سلامتی، نہ چھوڑیں آپ میرے لئے کسی گناہ کو مگر بخش دیں آپ اس کو، اور نہ کسی فکر (ٹینشن) کو مگر دور کردیں آپ اس کو، اور نہ کسی ایسی حاجت کو جس سے آپ راضی ہوں مگر پورا فرمادیں آپ اس کو، اے سب مہربانوں سے بڑے مہربان!

تشریح: یہ حدیث ابوالورقاء فائد بن عبدالرحمٰن کی وجہ سے ضعیف ہے، مگر استحباب کے درجہ کا عمل ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، مذکورہ طریقہ پر نماز پڑھ کر اپنی ضرورت خوب گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور یہ عمل مسلسل جاری رکھے، تا آنکہ مراد برآئے یا مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ پر دل راضی ہوجائے، یہ سب سے بڑی دولت ہے، بندے کی دعا ہر حال میں قبول ہوتی ہے، مگر بندہ جو مانگتا ہے اس کا دینا نہ دینا بندے کی مصلحت پر موقوف ہے، اگر مصلحت ہوتی ہے تو مانگی ہوئی چیز مل جاتی ہے، ورنہ دعا عبادت بنا کر نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہے، اور بندہ کے دل کو مطلوبہ چیز کے نہ ملنے پر راضی کردیا جاتا ہے۔

اور اگر حاجت کسی بندے سے متعلق ہو تو بھی مذکورہ عمل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے خوب عاجزی سے دعا کرے کہ الٰہی! اُس بندے کے دل کو میری حاجت روائی کے لئے آمادہ کردے، کیونکہ تمام بندوں کے دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں وہ جدھر چاہتے ہیں پھیرتے ہیں، پھر دعا سے فارغ ہو کر اس بندے کے پاس جائے اور اپنی حاجت طلب کرے، اگر مقصود حاصل ہوجائے تو اس بندے کا بھی شکر ادا کرے، اور اللہ تعالیٰ کا بھی شکر بجالائے، کیونکہ جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر گذار نہیں ہوتا۔ اور اگر ناکامی ہو تو سمجھے کہ اللہ کی مرضی نہیں، وہ حاجت روائی کا کوئی اور انتظام فرمائیں گے۔

اور اللہ تعالیٰ سے حاجت مانگنے سے پہلے نماز حاجت پڑھنے میں یہ حکمت ہے کہ کسی سے کچھ مانگنے سے پہلے تقرب حاصل کرنا پڑتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگنے سے پہلے بھی وسیلہ ضروری ہے۔ سورۃ المائدۃ آیت ۳۵ میں حکم دیا گیا ہے کہ ''اللہ کا قرب ڈھونڈھو'' اور سب سے بڑا وسیلہ نیک اعمال ہیں اور ان سے بھی بڑھ کر اللہ کی حمد وثنا ہے اسی لئے سورۃ الفاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وستائش ہے پھر ہدایت طلبی ہے۔ پس جب بندہ نماز حاجت پڑھ کر — جو اعلیٰ درجہ کا نیک عمل ہے — اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرکے دعا کرے گا تو ضرور کشادگی کا دروازہ کھلے گا، اور بندہ کی مراد پوری ہوگی۔

اور اگر حاجت کسی بندے سے متعلق ہے تو اس بندے کے پاس جانے سے پہلے نماز حاجت پڑھنے میں دو حکمتیں ہیں:

پہلی حکمت: اس صورت میں صلاۃ الحاجہ عقیدۂ توحید کی حفاظت کے لئے ہے، کیونکہ جب بندہ کسی سے کوئی حاجت طلب کرتا ہے تو اس میں یہ احتمال ہوتا ہے کہ وہ غیر اللہ سے استعانت — کسی درجہ میں سہی — جائز سمجھتا ہے۔ پس یہ حاجت طلبی اس کے عقیدۂ توحید واستعانت میں خلل انداز ہوگی، توحیدِ استعانت: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقۃً مدد طلب نہ کرے ﴿إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ میں اسی توحیدِ استعانت کا بیان ہے جس کو بندہ بار بار ہر نماز کی ہر رکعت میں دوہراتا ہے۔ اس لئے شریعت نے یہ نماز مقرر کی اور اس کے بعد دعا سکھلائی تاکہ عقیدہ میں فساد پیدا نہ ہو۔ کیونکہ جب حاجت مند نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا کہ وہ حاجت روائی کے لئے اس بندے کا دل تیار کریں تو اس کا یہ عقیدہ اور یقین پختہ اور مستحکم ہوگا کہ کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے، وہی کارساز اور کام بنانے والے ہیں، بندے محض واسطہ ہیں، بلکہ آلۂ کار ہیں، ان کے اختیار میں کچھ نہیں، سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

دوسری حکمت: حاجت کا پیش آنا اور اس کی وجہ سے کسی کے دروازے پر دستک دینا ایک دنیاوی معاملہ ہے، شریعت چاہتی ہے کہ یہ دنیا کا معاملہ نیکوکاری کا ذریعہ بن جائے، چنانچہ اس موقع پر نماز اور دعا مشروع کی تاکہ بندے کی نیکوکاری میں اضافہ ہو۔

فائدہ: امور عادیہ (روزمرہ کے کاموں) میں بندوں سے مدد لینا جائز ہے۔ حدیث میں ہے: ''جو اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتے ہیں'' (مشکوۃ حدیث ۲۰۴) اور یہ استعانت مجازی ہے، حقیقی استعانت ذات پاک کے سوا کسی سے بھی جائز نہیں حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے سورۂ فاتحہ کے حواشی میں جو تحریر فرمایا ہے'' ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطۂ رحمتِ الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانتِ ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے'' اس عبارت میں حضرت کی مراد استعانت سے توسُّل ہے، اور یہ مسئلہ یہاں غیر محل میں بیان ہوا ہے جس سے کچھ لوگوں کو اشکال پیدا ہوا ہے، اس لئے وہاں یہ نوٹ لکھ دینا ضروری ہے کہ ''استعانت سے مراد توسُّل ہے اور یہ مسئلہ یہاں غیر محل میں بیان ہوا ہے'' اتنا نوٹ لکھ دیا جائے تو انصاف پسند ذہن مطمئن ہو جائیں گے۔

[۲۳۳] باب ماجاء في صلاة الحاجة

[۴۹۰-] حدثنا عليُّ بنُ عيسى بنِ يَزيدَ البَغْدَادِيُّ، نا عبدُ اللهِ بنُ بَكْرٍ السَّهْمِيُّ، و: نا عبدُ اللهِ بنُ مُنِيرٍ، عن عبدِ اللهِ بنِ بَكْرٍ، عن فَائِدِ بنِ عبدِ الرحمنِ عن عبدِ اللهِ بنِ أبي أَوْفَى، قال: قال رسولُ الله

صلى الله عليه وسلم:" مَنْ كَانَتْ لَهُ إِلَى اللّٰهِ حَاجَةٌ أو إِلَى أَحَدٍ مِنْ بَنِيْ آدَمَ فَلْيَتَوضَّأْ وَلْيُحْسِنِ الوُضُوْءَ ثُمَّ لِيُصَلِّ رَكْعَتَيْنِ، ثم لِيُثْنِ على اللّٰهِ، ولْيُصَلِّ على النبيِّ صلى الله عليه وسلم، ثُمَّ لِيَقُلْ: لاإلٰهَ إلا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، سبحانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، الحمدُ للّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، أَسْأَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ، وعَزَائِمَ مغفِرَتِكَ، وَالْغَنِيمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ، وَالسَّلاَمَةَ مِنْ كُلِّ إِثْمٍ، لاَتَدَعْ لِيْ ذَنْبًا إِلاَّ غَفَرْتَهُ، وَلاَ هَمًّا إِلاَّ فَرَّجْتَهُ، وَلاَ حَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًا إِلاَّ قَضَيْتَهَا، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ غريبٌ في إسنادِه مَقَالٌ، فائِدُ بنُ عبدِ الرحمنِ يُضَعَّفُ في الحديثِ، وفائِدُ: هو أبو الوَرْقَاءِ.

وضاحت: اس حدیث کی سند میں تحویل ہے، مگر تحویل کی ح نہیں لکھی۔ امام ترمذی کے دو استاذ ہیں: ایک: علی بغدادی، دوسرے: عبداللہ بن منیر، اور دونوں کے استاذ ہیں عبداللہ بن بکر سہمی۔ پہلے استاذ: نا (حدثنا) کہتے ہیں اور دوسرے استاذ عن سے روایت کرتے ہیں۔ یہی فرق ظاہر کرنے کے لئے امام ترمذی نے دونوں سندیں الگ الگ کی ہیں۔ غرض عبداللہ بن منیر سے تحویل ہے اس لئے نا سے پہلے واو ہے۔

بابُ ماجاء في صَلاَةِ الإسْتِخَارَةِ

نمازِ استخارہ کا بیان

استخارہ: خیر سے ہے، اس کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ سے بہتری طلب کرنا۔ جو کام فرض یا واجب ہیں ان میں استخارہ نہیں، اس لئے کہ جو فرض یا واجب ہے اُسے تو کرنا ہی ہے، اسی طرح جو کام سنت یا مستحب ہیں ان میں بھی استخارہ نہیں، اس لئے کہ ان کے مقابل دوسرے کام ان سے اچھے نہیں، اسی طرح حرام اور مکروہ تحریمی میں بھی استخارہ نہیں، کیونکہ ان سے بہر حال اجتناب ضروری ہے۔ پس صرف دو قسم کے کام بچے: مباح اور وہ واجب یا مستحب جن کا وقت متعین نہیں، استخارہ صرف انہی دو قسم کے کاموں میں ہے۔

اور استخارہ اس وجہ سے مشروع کیا گیا ہے کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک کام کرنا چاہتا ہے مگر اُسے کام کا انجام معلوم نہیں ہوتا، ایسی صورت میں سمجھداروں سے مشورہ کرنا بھی مسنون ہے اور نماز استخارہ پڑھ کر اور استخارہ کی تعلیم فرمودہ دعا مانگ کر اللہ تعالیٰ سے راہنمائی حاصل کرنا بھی مسنون ہے۔

رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ کی راہنمائی بندے کو کس طرح حاصل ہوگی؟ روایت میں اس طرف کوئی اشارہ نہیں، اور تجربہ یہ ہے کہ یہ راہنمائی کبھی خواب کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، پھر خواب کبھی واضح ہوتا ہے اور کبھی تعبیر طلب ہوتا

ہے، اور کبھی راہنمائی اس طرح کی جاتی ہے کہ اس کام کے کرنے کا شدید داعیہ دل میں پیدا ہوتا ہے یا اس سے دل بالکل ہی ہٹ جاتا ہے، پس ان دونوں کیفیتوں کو بھی من جانب اللہ اور دعا کا نتیجہ سمجھنا چاہئے —— اور اگر استخارہ کے بعد بھی تذبذب باقی رہے تو استخارہ کا عمل مسلسل جاری رکھے، اور جب تک کسی ایک طرف رجحان نہ ہو جائے عملی اقدام نہ کرے۔

اور استخارہ کرنے کے لئے کوئی مدت متعین نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تدوینِ حدیث کے معاملہ میں ایک مہینہ تک استخارہ کیا تھا۔ ایک ماہ کے بعد آپ کو شرح صدر ہو گیا کہ ان کو حدیثیں مدون نہیں کرنی چاہئیں۔ اگر آپ کو شرح صدر نہ ہوتا تو شاید آپ آگے بھی استخارہ جاری رکھتے۔ تفصیل مقدمہ میں گذر چکی ہے۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے استخارہ کی دو حکمتیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی حکمت: زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا کہ جب کوئی اہم کام کرنا ہوتا تھا، مثلاً سفر یا نکاح یا کوئی بڑا سودا کرنا ہوتا تھا تو وہ تیروں کے ذریعہ فال نکالا کرتے تھے، یہ تیر کعبہ شریف کے مجاور کے پاس رکھے رہتے تھے۔ ان میں سے کسی تیر پر لکھا تھا: أَمَرَنِی رَبِّیْ، اور کسی پر لکھا تھا نهانی ربی، اور کوئی تیر بے نشان تھا، اس پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ مجاور تھیلا ہلا کر فال طلب کرنے والے سے کہتا کہ ہاتھ ڈال کر ایک تیر نکالو، اگر امرنی ربی والا تیر نکلتا تو وہ شخص کام کرتا۔ اور نهانی ربی والا تیر نکلتا تو وہ کام سے رک جاتا۔ اور بے نشان تیر ہاتھ میں آتا تو دوبارہ فال نکالی جاتی۔ سورۂ مائدہ آیت ۳ کے ذریعہ اس کی حرمت نازل ہوئی، اور حرمت کی دو وجہیں ہیں: ایک: یہ کہ یہ ایک بے بنیاد عمل ہے، اور محض اتفاق ہے، جب تھیلے میں ہاتھ ڈالا جائے گا تو کوئی نہ کوئی تیر ضرور ہاتھ آئے گا۔ دوم: یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ پر افتراء (جھوٹا الزام) ہے، اللہ پاک نے کہاں حکم دیا ہے؟ اور کب منع کیا ہے؟ اور افتراء حرام ہے۔

نبی ﷺ نے فال کی جگہ استخارہ کی تعلیم دی، اور اس میں حکمت یہ ہے کہ جب بندہ رب علیم سے راہنمائی کی التجا کرتا ہے، اور وہ اپنے معاملہ کو اپنے مولیٰ کے حوالہ کرتا ہے، اور وہ ان کی مرضی معلوم کرنے کا شدید خواہش مند ہوتا ہے، اور وہ اللہ کے دروازہ پر جا پڑتا ہے، اور اس کا دل ملتجی ہوتا ہے تو ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی راہنمائی اور مدد نہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیضان کا باب وَا ہوتا ہے اور اس پر معاملہ کا راز کھولا جاتا ہے، پس استخارہ محض اتفاق نہیں، بلکہ اس کی مضبوط بنیاد ہے۔

دوسری حکمت: استخارہ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان فرشتہ صفت بن جاتا ہے، استخارہ کرنے والا اپنی ذاتی رائے سے نکل جاتا ہے، اور اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے۔ اور وہ اپنا رخ پوری طرح اللہ کی طرف جھکا دیتا ہے تو اس میں فرشتوں کی سی خو بو پیدا ہو جاتی ہے۔ پس وہ رفتہ رفتہ فرشتوں کے مانند ہو جاتا ہے، ملائکہ کے مانند بننے کا یہ ایک تیز بہدف مجرب نسخہ ہے جو چاہے آزما کر دیکھے۔

حدیث: جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ ہمیں تمام معاملات میں استخارہ کرنا سکھاتے تھے جیسا کہ ہمیں قرآن کریم کی سورت سکھاتے تھے، فرماتے تھے: جب تم میں سے کسی کے سامنے کوئی اہم معاملہ ہوتو چاہئے کہ وہ فرض کے علاوہ دو رکعت پڑھے، یعنی استخارہ کی نیت سے دو نفلیں پڑھے، پھر یہ دعا پڑھے: ''اے اللہ! میں آپ سے خیر طلب کرتا ہوں آپ کی صفت علم کے ذریعہ سے، اور میں آپ سے قدرت طلب کرتا ہوں آپ کی صفت قدرت کے ذریعہ سے، اور آپ کے عظیم فضل کی بھیک مانگتا ہوں، پس بیشک آپ قادر ہیں اور میں قادر نہیں۔ اور آپ جانتے ہیں اور میں جانتا نہیں، اور آپ تمام چھپی چیزوں سے پوری طرح باخبر ہیں۔ اے اللہ! اگر آپ جانتے ہیں کہ یہ معاملہ (جب اس جگہ پر پہنچے تو اگر عربی جانتا ہے تو اس جگہ اپنی حاجت کا تذکرہ کرے، مثلاً کوئی چیز بیچنی ہے تو هذا الأمر کے بجائے هذا البيع کہے۔ اور اگر عربی نہیں جانتا تو هذا الأمر کہتے وقت اس کام کا دھیان کرے جس کے لئے استخارہ کر رہا ہے) میرے لئے بہتر ہے میرے دین، میری دنیا اور میری آخرت میں تو اس کو میرے لئے مقدر فرما۔ اور اس کو میرے لئے آسان فرما، پھر میرے لئے اس میں برکت پیدا فرما، اور اگر آپ جانتے ہیں کہ یہ معاملہ میرے لئے برا ہے (یعنی اس کا نتیجہ خراب ہے) میرے دین، میری دنیا اور میری آخرت میں تو اس کو مجھ سے پھیر دے، اور مجھے اس سے پھیر دے، اور میرے لئے بھلائی مقدر فرما جہاں بھی ہو، پھر مجھے اس پر راضی کردے'' فرمایا: اور جب هذا الأمر پر پہنچے تو اپنی حاجت کا تذکرہ کرے —— اس دعا کو پڑھ کر کسی سے بولے بغیر پاک جگہ پر قبلہ کی طرف منہ کر کے باوضو سو جائے، جب سو کر اٹھے تو جو بات مضبوطی سے دل میں جمے اس پر عمل کرے، ان شاء اللہ وہی بات بہتر ہوگی، اور کوئی خواب نظر آئے اور اس کا مطلب سمجھ میں نہ آئے تو کسی تعبیر جاننے والے سے معلوم کرے۔

[۲۳٤] باب ماجاء في صلاة الاستخارة

[٤٩١-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا عبدُ الرحمنِ بنُ أبي المَوَالي، عن محمدِ بنِ المُنْكَدِرِ، عن جابرِ بنِ عبدِ اللهِ، قال: كان رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يُعَلِّمُنَا الإسْتِخَارَةَ فِي الْأُمُوْرِ كَمَا يُعَلِّمُنَا السُّوْرَةَ مِنَ الْقُرآنِ، يقولُ: إِذَا هَمَّ أَحَدُكُمْ بِالأَمْرِ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ مِنْ غَيْرِ الْفَرِيْضَةِ ثم لِيَقُلْ: " اللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ، وأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ العظيمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلاَ أَقْدِرُ، وتَعْلَمُ وَلاَ أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلاَّمُ الغُيُوْبِ، اللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذا الْأَمْرَ خَيْرٌ لِيْ فِيْ دِيْنِيْ ومَعِيْشَتِيْ وَعَاقِبَةِ أَمْرِيْ —— أَوْ قَالَ: فِي عَاجِلِ أَمْرِيْ وآجِلِهِ —— فَيَسِّرْهُ لِيْ، ثُمَّ بَارِكْ لِيْ فِيْهِ، وإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هٰذا الْأَمْرَ شَرٌّ لِيْ فِيْ دِيْنِيْ وَمَعِيْشَتِيْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِيْ —— أَوْ قال: فِي عَاجِلِ أَمْرِيْ وآجِلِهِ —— فَاصْرِفْهُ عَنِّيْ، واصْرِفْنِيْ عَنْهُ، وَاقْدُرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ ارْضِنِيْ بِهِ، قال وَيُسَمِّيْ حَاجَتَهٗ.

وفي الباب: عن عبدِ اللهِ بنِ مسعودٍ، وأبي أيوبَ.
قال أبو عيسى: حديثُ جابرٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ غريبٌ لانَعرِفُهُ إِلَّا مِنْ حديثِ عبدِ الرحمنِ بنِ أبي المَوَالي، وَهُوَ شَيْخٌ مَدِينِيٌّ ثِقَةٌ، رَوَى عَنْهُ سُفيانُ حَديثًا، وقد رَوَى عن عبدِ الرحمنِ غيرُ واحِدٍ مِن الأَئِمَّةِ.

وضاحت: اس حدیث کی عبدالرحمٰن بن ابی الموالی سے اوپر یہی ایک سند ہے اور عبدالرحمٰن مدینی ہیں (مدینۃ السلام یعنی بغداد کے باشندے ہیں) اور ثقہ ہیں، اس لئے کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے اور دیگر متعدد ائمہ حدیث نے ان سے روایت کی ہے، بڑے محدثین کا کسی سے روایت کرنا مروی عنہ کی توثیق ہے۔

بابُ ماجاء في صَلَاةِ التَّسْبِيحِ

صلاۃ التسبیح کا بیان

صلاۃ التسبیح: وہ نماز ہے جس میں چار رکعتوں میں تین سو مرتبہ ایک خاص تسبیح پڑھی جاتی ہے اس لئے اس کا نام صلاۃ التسبیح رکھا گیا ہے۔ اس نماز کے سلسلہ میں گیارہ حدیثیں ہیں اور سب ضعیف ہیں، مگر جب اتنی روایتیں ہیں تو مجموعہ حسن لغیرہ بن جائے گا، اس لئے استحباب کے درجہ کا عمل اس سے ثابت ہوسکتا ہے۔

پہلے یہ قاعدہ آچکا ہے کہ فضائلِ اعمال میں ضعیف روایت معتبر ہے، اس قاعدہ کا ایک مطلب یہ تھا کہ استحباب کے درجہ کا عمل ایسی ضعیف روایت سے جس کا ضعف محتمل (قابل برداشت) ہو ثابت ہوسکتا ہے۔ یہاں بھی جب گیارہ روایتیں ہیں تو ضعف قابل برداشت ہے اس لئے ان سے صلاۃ التسبیح کا ثبوت ہوسکتا ہے۔

علاوہ ازیں سلف سے اس نماز کا رواج چلا آرہا ہے۔ ابن المبارک رحمہ اللہ نے اس نماز کا طریقہ لوگوں کو سکھلایا ہے اور اس نماز کے فضائل بیان کئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ روایتیں بے اصل نہیں بلکہ ان کی اصل ہے۔

کلماتِ تسبیح: سبحان الله، والحمدلله، ولا إله إلا الله، والله أكبر کلماتِ تسبیح کی یہ ترتیب ابن المبارک رحمہ اللہ نے دی ہے، اور شاندار ترتیب ہے، زبان سے بے تکلف کلمات ادا ہوتے ہیں۔ اور حدیث میں ترتیب اس طرح آئی ہے: الله أكبر، والحمدلله، ولا إله إلا الله، وسبحان الله. اس طرح پڑھنا بھی درست ہے۔

صلاۃ التسبیح کا طریقہ: حدیث میں جو طریقہ آیا ہے وہ یہ ہے: چار رکعت صلاۃ التسبیح کی نیت سے نماز شروع کریں، اور ثناء، تعوذ، تسمیہ، فاتحہ اور سورت پڑھنے کے بعد رکوع میں جانے سے پہلے مذکورہ تسبیح پندرہ مرتبہ پڑھیں، پھر رکوع میں پہلے رکوع کی تسبیح پڑھیں پھر مذکورہ تسبیح دس مرتبہ پڑھیں، پھر قومہ میں دس مرتبہ، پھر سجدہ میں سجدہ کی تسبیح

کے بعد دس مرتبہ، پھر جلسہ میں دس مرتبہ، پھر دوسرے سجدہ میں دس مرتبہ پڑھیں، پھر سجدہ سے سر اٹھا کر بیٹھیں اور دس مرتبہ تسبیح پڑھیں، یہ ایک رکعت میں پچھتر مرتبہ تسبیح ہوئی۔ اسی طرح بقیہ رکعتیں پڑھیں تو چار رکعتوں میں تین سو مرتبہ تسبیح ہوجائے گی۔

دوسرا طریقہ: ابن المبارک رحمہ اللہ نے یہ طریقہ تجویز کیا ہے کہ نماز شروع کرنے کے بعد ثنا پڑھ کر پہلے پندرہ مرتبہ مذکورہ تسبیح پڑھیں، پھر تعوذ، تسمیہ، فاتحہ اور سورت پڑھیں اس کے بعد رکوع میں جانے سے پہلے دس مرتبہ یہی تسبیح پڑھیں، رکوع میں دس مرتبہ، پھر قومہ میں دس مرتبہ، پھر پہلے سجدہ میں دس مرتبہ، پھر جلسہ میں دس مرتبہ، پھر دوسرے سجدے میں دس مرتبہ: یہ ایک رکعت میں پچھتر مرتبہ تسبیح ہوئی، اس صورت میں جلسۂ استراحت نہیں کرنا، اس طریقہ سے بھی صلاۃ التسبیح پڑھنا جائز ہے مگر بہتر پہلے طریقہ پر پڑھنا ہے کیونکہ وہ طریقہ حدیث میں آیا ہے، اور جلسۂ استراحت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، بعض ائمہ کے نزدیک جلسۂ استراحت سنت ہے پھر صلاۃ التسبیح کی شان ہی نرالی ہے اگر اس میں جلسۂ استراحت کیا جائے تو کچھ حرج نہیں۔

صلاۃ التسبیح کی فضیلت: یہ ہے کہ اس سے دس قسم کے گناہ معاف ہوتے ہیں، اگلے، پچھلے، نئے، پرانے، بھول سے کئے ہوئے اور دانستہ کئے ہوئے، چھوٹے، بڑے، ڈھکے، چھپے اور علانیہ کئے ہوئے، صلاۃ التسبیح کا یہ فائدہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں آیا ہے جو ابوداؤد اور ابن ماجہ میں ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ نماز اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ہدیہ کی اور ان کو یہ نماز سکھلائی تو انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کون اس نماز کو روزانہ پڑھ سکتا ہے؟ —— حالانکہ حضور اکرم ﷺ نے روزانہ پڑھنے کے لئے نہیں فرمایا تھا، یہاں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ فضائل کی روایات میں وَاظَبَ، دَاوَمَ اور ثَابَرَ کی قید ملحوظ ہوتی ہے اگرچہ وہ قید مذکور نہ ہو یعنی فضائل کی روایتوں میں جو ثواب بیان جاتا ہے وہ پابندی سے عمل کرنے کا ہے —— آپؐ نے فرمایا: روزانہ نہیں پڑھ سکتے تو ہفتہ میں پڑھ لیا کرو، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ہر ہفتہ پڑھنا بھی مشکل ہے، آپؐ نے فرمایا: مہینہ میں پڑھ لیا کرو، انھوں نے عرض کیا: مہینہ میں پڑھنا بھی مشکل ہے، آپؐ نے فرمایا: سال میں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرو، یہاں تک روایت ترمذی میں ہے اور ابوداؤد اور ابن ماجہ میں ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: سال میں پڑھنا بھی مشکل ہے، آپؐ نے فرمایا: زندگی میں ایک مرتبہ پڑھو تو بھی یہ ثواب مل جائے گا۔

پہلی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: چچا جان! کیا میں آپ کے ساتھ صلہ رحمی نہ کروں؟ (صلہ رحمی کے معنی ہیں رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا) کیا میں آپ کو گفٹ (عطیہ، ہدیہ) نہ دوں؟ کیا میں آپ کو نفع نہ پہنچاؤں؟ حضرت عباسؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! (نفی کے جواب میں بلی بہتر ہے اگرچہ نعم بھی جائز ہے، اور کلام مثبت میں نعم بہتر ہے گو بلی بھی جائز ہے) آپؐ نے فرمایا: چچا جان!

آپ چار رکعت پڑھیں، ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور کوئی سورت پڑھیں، پھر جب پڑھنا پورا ہو جائے تو رکوع میں جانے سے پہلے پندرہ مرتبہ اللہ أکبر، والحمدللہ، ولا إلہ إلا اللہ، وسبحان اللہ پڑھیں (ولا إلہ إلا اللہ چھپنے سے رہ گیا ہے) پھر رکوع کریں۔ اور اس تسبیح کو دس مرتبہ پڑھیں، پھر سر اٹھائیں اور یہ تسبیح دس مرتبہ پڑھیں، پھر سجدہ کریں اور یہ تسبیح دس مرتبہ پڑھیں، پھر سر اٹھائیں اور دس مرتبہ تسبیح پڑھیں، پھر سجدہ کریں اور دس مرتبہ تسبیح پڑھیں، پھر سر اٹھائیں اور کھڑے ہونے سے پہلے (یعنی جلسۂ استراحت میں) دس مرتبہ تسبیح پڑھیں۔ پس یہ تسبیح ہر رکعت میں پچھتر مرتبہ ہے، اور وہ چار رکعت میں تین سو مرتبہ ہے، اگر آپ کے گناہ عالج میدان کی ریت کے برابر بھی ہونگے تو اللہ تعالیٰ ان گناہوں کو بخش دیں گے (عالج: جزیرۃ العرب میں ایک علاقہ ہے وہاں میلوں تک ریت پھیلی ہوئی ہے) حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس نماز کو روز پڑھنے کی طاقت کون رکھتا ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر آپ یہ نماز روز پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتے تو اس کو ہفتہ میں پڑھ لیا کرو، پس اگر آپ ہفتہ میں بھی پڑھنے کی طاقت نہیں رکھتے تو مہینہ میں پڑھ لو، پس حضرت عباس رضی اللہ عنہ برابر رسول اللہ ﷺ سے عرض کرتے رہے (یعنی برابر سہولت طلب کرتے رہے) یہاں تک کہ آپؐ نے فرمایا: اس کو سال میں پڑھ لو۔

وضاحت: ابورافع رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ موسیٰ بن عبیدۃ کی علماء نے تضعیف کی ہے اور سعید بن ابی سعید جو ابوبکر بن محمد کا مولیٰ ہے مجہول ہے، اور مصری نسخہ میں یہ حدیث اگلی حدیث یعنی ام سلیم کی حدیث کے بعد ہے، اور مصری نسخہ ہی صحیح ہے، اس لئے کہ امام ترمذیؒ نے وفی الباب میں اس حدیث کا حوالہ دیا ہے، اور حضرت مصنفؒ ایسا تو کرتے ہیں کہ فی الباب میں جس حدیث کا حوالہ دیں اس کو باب ہی میں لائیں مگر ایسا نہیں کرتے کہ پہلے حدیث لے آئیں پھر باب میں اس کا حوالہ دیں، ایسی جگہوں میں نسخوں کا اختلاف ہوتا ہے —— اور جاننا چاہئے کہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث باب میں سب سے اچھی حدیث ہے گو وہ بھی فی نفسہ ضعیف ہے (یہ حدیث ابوداؤد میں ہے)

دوسری حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے (ان کی والدہ) ام سُلیم رضی اللہ عنہا صبح سویرے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گئیں، اور عرض کیا: آپؐ مجھے کچھ کلمات سکھائیں جن کو میں اپنی نماز میں پڑھا کروں (یہ مجاز ہے مراد یہ ہے کہ نماز کے بعد ان کلمات کو پڑھا کروں) آپؐ نے فرمایا: دس مرتبہ اللہ اکبر، دس مرتبہ سبحان اللہ اور دس مرتبہ الحمد للہ پڑھیں، پھر آپ جو چاہیں مانگیں (ہر دعا کے جواب میں) کہا جائے گا: ہاں! ہاں!! (یعنی ہر دعا قبول ہوگی)

تشریح: اس حدیث کی سند اچھی ہے مگر اس باب میں یہ حدیث بے جوڑ ہے، باب سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اور یہ باب مصری نسخہ میں اسی حدیث سے شروع ہوا ہے اور حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث اس کے بعد ہے، چونکہ حدیث میں فی صلاتی آیا ہے، اس لئے امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اس باب میں بیان کر دیا حالانکہ اس میں مجاز ہے، بعد صلاتی مراد ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ منفرد کو بھی یہ تسبیح پڑھ کر دعا کرنی چاہئے، عصر

اور فجر میں نماز کے بعد فوراً تسبیح پڑھ کر دعا کرے، کیونکہ ان کے بعد نفلیں نہیں ہیں، اور تین نمازوں میں سنن ونوافل سے فارغ ہو کر یہ تسبیح پڑھے، پھر دعا مانگے اور باجماعت نماز پڑھنے والے کے لئے بھی یہی حکم ہے: عصر اور فجر میں فرض کے بعد فوراً الباقیات الصالحات پڑھ کر دعا کریں اور تین نمازوں میں جب ہر شخص اپنے نفلوں سے فارغ ہو جائے تو الباقیات الصالحات پڑھ کر دعا کرے، اور الباقیات الصالحات کی یہ کم سے کم مقدار ہے اور افضل ۳۳، ۳۳ اور ۳۴ مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر پڑھنا ہے، نیز اس حدیث سے نمازوں کے بعد دعا مانگنے کا ثبوت بھی نکلتا ہے پس فرضوں کے بعد دعا کرنے کو بدعت کہنا صحیح نہیں۔ تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

ابن المبارک رحمہ اللہ کا قول: ابو وہب رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے عبداللہ بن المبارک سے اُس نماز کے (طریقہ کے) بارے میں پوچھا جس میں (مخصوص) تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ انھوں نے فرمایا: تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع کرو، پھر ثنا: سبحانك اللّٰهم إلخ پڑھو، پھر یہ تسبیح: سبحان الله والحمد لله، ولا إله إلا الله والله أكبر پندرہ مرتبہ پڑھو، پھر تعوذ تسمیہ فاتحہ اور سورت پڑھو، پھر دس مرتبہ مذکورہ تسبیح پڑھو، پھر رکوع کرو اور یہ تسبیح دس مرتبہ پڑھو، پھر سر اٹھاؤ اور دس مرتبہ تسبیح پڑھو، پھر سجدہ کرو اور دس مرتبہ تسبیح پڑھو، پھر سر اٹھاؤ اور دس مرتبہ تسبیح پڑھو، پھر دوسرا سجدہ کرو اور دس مرتبہ تسبیح پڑھو، چاروں رکعتیں اسی طرح پڑھو پس یہ ہر رکعت میں پچھتر مرتبہ تسبیح ہوئی۔ ہر رکعت کے شروع میں پندرہ مرتبہ تسبیح پڑھو (یعنی ہر رکعت میں قراءت سے پہلے پندرہ مرتبہ تسبیح پڑھو) پھر قراءت کرو پھر دس مرتبہ تسبیح پڑھو، پس اگر آدمی یہ نماز رات میں پڑھے تو مجھے یہ پسند ہے کہ نمازی ہر دو رکعت پر سلام پھیرے (ابن المبارک رحمہ اللہ کا مذہب صاحبین رحمہما اللہ کے موافق ہے، یعنی رات میں نفل دو دو افضل ہیں اور دن میں چار چار۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ اگر رات میں صلاۃ التسبیح پڑھے تو چار رکعت دو سلام سے پڑھے) اور اگر دن میں پڑھے تو چاہے سلام پھیرے چاہے نہ پھیرے۔ یعنی دن میں صلاۃ التسبیح چار رکعت ایک سلام سے بھی صحیح ہے اور دو سلام سے بھی۔

ابو وہب کہتے ہیں: مجھے عبدالعزیز بن ابی رزمۃ نے ابن المبارک سے روایت کرتے ہوئے بتایا کہ انھوں نے فرمایا: رکوع میں تین مرتبہ سبحان ربی العظیم سے اور سجدہ میں تین مرتبہ سبحان ربی الاعلی سے شروع کرے، یعنی پہلے رکوع اور سجدہ کی تسبیح پڑھے پھر مذکورہ تسبیح پڑھے۔ احمد بن عبدۃ کہتے ہیں: ہم سے وہب بن زمعۃ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں: مجھے عبدالعزیز بن ابی رزمۃ نے بتایا کہ میں نے ابن المبارکؒ سے پوچھا: اگر کسی کو صلاۃ التسبیح میں بھول ہو جائے اور سجدۂ سہو واجب ہو تو کیا وہ سہو کے سجدوں میں تسبیح پڑھے؟ ابن المبارکؒ نے فرمایا: نہیں، اس نماز میں تسبیح تین سو مرتبہ ہی ہے، اور وہ تین سو کی تعداد پوری ہو گئی۔ پس سہو کے سجدوں میں یہ تسبیح نہ پڑھے۔

فائدہ: ملا علی قاری رحمہ اللہ نے مرقات میں تحریر فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی رکن کی تسبیح بھول جائے اور اگلے رکن میں یاد آئے تو اس چھٹی ہوئی تسبیح کو اگلے رکن کی تسبیح کے ساتھ جمع کرے۔

[٢٣٥] باب ماجاء في صلاة التسبيح

[٤٩٢-] حدثنا أبو كُرَيْبٍ محمدُ بنُ العَلَاءِ، نا زيدُ بنُ حُبَابٍ العُكْلِيُّ، نا مُوسى بنُ عُبَيْدَةَ، قال: حَدَّثَنِى سعيدُ بنُ أبى سَعِيدٍ مولَى أبى بَكْرِ بنِ محمدِ بنِ عَمْرِو بنِ حَزْمٍ، عن أبى رافِعٍ، قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم لِلْعَبَّاسِ: "يَاعَمِّ أَلاَ أَصِلُكَ؟ أَلاَ أَحْبُوكَ؟ أَلاَ أَنْفَعُكَ؟" قال: بَلَى يارسولَ اللهِ قال: "يَاعَمِّ صَلِّ أَرْبَعَ رَكَعَاتٍ تَقْرَأُ فِىْ كُلِّ رَكْعَةٍ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَسُوْرَةٍ، فَإِذَا انْقَضَتِ الْقِرَاءَةُ، فَقُلْ: اللهُ أكبرُ، والحمدُلله، ولا إله إلا الله، وسبحانَ اللهِ خَمْسَ عَشْرَةَ مَرَّةً قَبْلَ أَنْ تَرْكَعَ، ثُمَّ ارْكَعْ فَقُلْهَا عَشْرًا، ثم ارْفَعْ رَأسَكَ فَقُلْهَا عَشْرًا، ثم اسْجُدْ فَقُلْهَا عَشْرًا ثُمَّ ارْفَعْ رَأْسَكَ فَقُلْهَا عَشْرًا، ثم اسْجُدْ فَقُلْهَا عَشْرًا، ثم ارْفَعْ رَأْسَكَ فقلها عشراً قَبْلَ أَنْ تَقُوْمَ، فذلِكَ خَمْسٌ وَسَبْعُوْنَ فِىْ كُلِّ رَكْعَةٍ، وهِىَ ثَلاَثُ مِائَةٍ فى أَرْبَعِ رَكَعَاتٍ، ولو كانَتْ ذُنُوْبُكَ مِثْلَ رَمْلِ عَالِجٍ غَفَرَهَا اللّٰهُ لَكَ"

قال: يارسولَ الله! ومَنْ يَسْتَطِيْعُ أَنْ يَقُوْلَهَا فِىْ يَوْمٍ؟ قال: "إِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ أَنْ تقولَها فى يَوْمٍ فَقُلْهَا فِى جُمُعَةٍ، فَإِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ أَنْ تَقُوْلَهَا فِىْ جُمُعَةٍ فَقُلْهَا فِى شَهْرٍ" فَلَمْ يَزَلْ يقولُ له حَتّٰى قَالَ: "فَقُلْهَا فى سَنَةٍ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ غريبٌ مِن حديث أبى رافعٍ.

[٤٩٣-] حدثنا أحمدُ بنُ محمدِ بنِ موسىٰ، نا عبدُ اللهِ بنُ المباركِ، نا عِكْرِمَةُ بنُ عَمَّارٍ، قال حدثنى إسحاقُ بنُ عبدِ اللهِ بنِ أبى طَلْحَةَ، عن أنسِ بنِ مالكٍ، أنَّ أُمَّ سُلَيْمٍ غَدَتْ على النبىِّ صلى الله عليه وسلم فقالتْ: عَلِّمْنِىْ كَلِمَاتٍ أَقُوْلُهُنَّ فى صَلاَتِىْ، فقال: "كَبِّرِى اللّٰهَ عَشْرًا، وسَبِّحِى اللّٰهَ عَشْراً، واحْمَدِيْهِ عَشْرًا ثم سَلِى ماشِئْتِ، يقولُ: نَعم نَعَمْ"

وفى الباب: عن ابنِ عباسٍ، وعبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، والفَضْلِ بنِ عباسٍ، وأبى رافعٍ. قال أبو عيسى: حديثُ أنسٍ حديثٌ حسنٌ غريبٌ. وقد رُوِىَ عنِ النبىِّ صلى الله عليه وسلم غَيْرُ حديثٍ فى صلاةِ التسبيح، ولا يَصِحُّ مِنْهُ كَبِيْرُ شَيْءٍ.

وقد رأى ابنُ المبارك وغيرُ واحد من أهل العلم صلاةَ التسبيح، وذكروا الفضلَ فيه:

حدثنا أحمدُ بنُ عَبْدَةَ الضَّبِّىُّ، نا أبو وَهْبٍ، قال سألتُ عبدَ اللهِ بنَ المباركِ عن الصَّلاَةِ التى يُسَبَّحُ فِيْهَا، قال: يُكَبِّرُ ثم يقولُ سبحانَكَ اللّٰهمَّ وبِحَمْدِكَ، وتَبَارَكَ اسْمُكَ، وتَعَالٰى جَدُّكَ، وَلاَ إلٰهَ غَيْرُكَ، ثم يقولُ خَمْسَ عَشْرَةَ مَرَّةً: سُبحانَ اللّٰهِ، والحمدُ للّٰهِ، ولا إلٰهَ إلاَّ الله، واللّٰهُ أكبرُ، ثم يَتَعَوَّذُ

وَيَقْرَأُ بسم الله الرحمن الرحيم، وفاتِحَةَ الكتابِ، وسُوْرَةً، ثم يقولُ عَشْرَ مَرَّاتٍ: سُبْحَانَ اللّٰهِ والحمدُ للّٰهِ ولا إله إلا اللّٰهُ واللّٰهُ أكبر، ثم يَرْكَعُ فيقولُها عشرًا، ثم يَرْفَعُ رَأْسَهُ فيقولها عشراً، ثم يَسْجُدُ فيقولُها عشراً، ثم يَرْفَعُ رَأْسَه وَيقُوْلُهَا عَشْرًا، ثم يَسْجُدُ الثَّانِيَةَ فيقولُها عَشْراً، يُصَلِّىْ أَرْبَعَ ركعاتٍ على هٰذا، فذلِكَ خمسٌ وسَبْعُوْنَ تَسْبِيْحَةً فى كُلِّ رَكْعَةٍ، يَبْدَأُ فى كلِّ رَكْعَةٍ بِخَمْسَ عَشْرَةَ تَسْبِيْحَةً، ثم يَقْرَأُ ثم يُسَبِّحُ عَشْراً، فَإِنْ صَلّٰى لَيْلاً فَأَحَبُّ إِلَيَّ أَنْ يُسَلِّمَ فى كلِّ رَكْعَتَيْنِ، وإن صَلّٰى نَهَاراً فَإِنْ شَاءَ سَلَّمَ وَإِنْ شَاءَ لَمْ يُسَلِّمْ.

قال أبو وَهْبٍ: وَأَخْبَرَنِىْ عبدُ العزيزِ، وهو ابنُ أبى رِزْمَةَ، عن عبدِ اللّٰهِ، أنّه قال: يَبْدَأُ فى الركوعِ بسبحانَ ربى العظيمِ، وفى السجودِ بسبحانَ ربِّى الأعلى ثلاثاً ثم يُسَبِّحُ التَّسْبِيْحَاتِ.

قال أحمدُ بنُ عَبْدَةَ: نا وهبُ بنُ زَمْعَةَ قال أخبرنى عبدُ العزيزِ، وهو ابنُ أبى رِزْمَةَ، قال: قلتُ لعبدِ اللّٰهِ بن المباركِ: إنْ سَهَا فِيْهَا: أَيُسَبِّحُ فى سَجْدَتَيِ السَّهْوِ عَشْراً عَشْراً؟ قال: لا إِنَّمَا هِيَ ثَلٰثُمِائَةِ تَسْبِيْحَةٍ.

ترجمہ: صلاۃ التسبیح کے سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ سے متعدد حدیثیں مروی ہیں اوران میں سے کچھ بڑی تعداد صحیح نہیں یعنی اس باب کی کوئی بھی حدیث صحیح نہیں، اورابن المبارک اور متعدد علماء نے صلاۃ التسبیح کو تسلیم کیا ہے اور انھوں نے اس کی فضیلت بیان کی ہے، پھراس کا طریقہ ہے جوابن المبارک نے بیان کیا ہے اورآخر میں صلاۃ التسبیح کے تعلق سے دومسئلے ہیں، تفصیل اوپر گذر چکی۔

بابُ ماجاء فی صِفَةِ الصَّلاَةِ عَلَى النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنے کا طریقہ

مذاہبِ فقہاء: امام شافعی کا مذہب اورامام احمد کی ایک روایت یہ ہے کہ قعدۂ اخیرہ میں درود شریف پڑھنا فرض ہے، جوشخص درود شریف نہ پڑھے اس کی نماز صحیح نہیں، چاہے چھوٹے سے چھوٹا درود پڑھے۔ ابن جریر طبری رحمہ اللہ پانچویں صدی کے بڑے عالم ہیں اور جن کا دعوی تھا کہ وہ امت کے پانچویں مجتہد ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کے لئے نہ تو قرآن وحدیث سے کوئی دلیل ہے اور نہ سلف یعنی صحابہ اورتابعین میں سے کسی نے یہ بات کہی ہے۔ امام شافعیؒ کے علاوہ سب علماء کے نزدیک قعدۂ اخیرہ میں درود شریف پڑھنا سنت ہے۔ پس اگر کوئی نہ پڑھے تو بھی نماز صحیح ہے۔

اورسب سے افضل درود: درود ابراہیمی ہے، خود آنحضور ﷺ نے کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ کو نماز میں پڑھنے

کے لئے یہ درود سکھایا ہے، یہ درود مختلف صیغوں سے مروی ہے، حضرت شیخ مولانا زکریا صاحب قدس سرہٗ نے فضائل درود کے آخر میں اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے زاد السعید میں درود ابراہیمی کے تیس سے زیادہ صیغے جمع کئے ہیں۔ پس جونسا درود پڑھے جائز ہے اور کوئی نیا درود پڑھے تو بھی جائز ہے، مگر ماثورہ اذکار میں جو برکت ہے وہ حاصل نہ ہوگی۔

حدیث: کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ آپ پر سلام بھیجنے کا طریقہ ہے جس کو ہم نے جان لیا ہے (یعنی سورۂ احزاب آیت ۵۶ میں دو حکم دیئے گئے ہیں: ایک: سلام بھیجنے کا دوسرا: درود بھیجنے کا، آپؐ پر سلام کس طرح بھیجیں یہ تو ہمیں تشہد میں معلوم ہوگیا ہے۔ السلام علیك أیها النبی میں سلّموا پر عمل ہوجاتا ہے اور ورحمة الله وبركاته میں مفعول مطلق تسلیماً پر عمل ہوجاتا ہے مگر صَلّوا پر عمل کس طرح کریں، یہ ہمیں معلوم نہیں یعنی آپؐ پر درود شریف کس طرح بھیجیں یہ ہمیں بتائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہو: اَللّٰهُمَّ صَلِّ إلخ۔

تشریح: سورۂ احزاب آیت ۵۶ کی بناء پر علماء نے فرمایا ہے کہ ہر آدمی پر زندگی میں کم از کم ایک بار رسول اللہ ﷺ پر صلاۃ وسلام بھیجنا فرض ہے۔ اور بار بار درود وسلام پڑھنا اہم ترین عبادت ہے۔ پس صلاۃ وسلام کو نماز میں شامل کرنے سے بہتر کیا ہوسکتا ہے کہ ہر نماز میں بار بار آپؐ پر درود وسلام بھیجا جائے۔ اس کی نظیر: شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کا یہ قول ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے پس اس کی شان بلند کرنا ضروری ہے، اور نماز سے بہتر قرآن کریم کی شان بلند کرنے کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوسکتی اس لئے نماز میں قراءت کو فرض قرار دیا گیا ہے۔

فائدہ: عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ کبیر فرماتے ہیں: ہم درودِ ابراہیمی میں وعلی آل محمد کے بعد وعلینا مَعَهم کا اضافہ کرتے ہیں، مگر یہ اضافہ امت نے قبول نہیں کیا۔ اب کوئی اس اضافہ کے ساتھ درود نہیں پڑھتا، اس کی نظیر یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد تشہد میں تبدیلی کی تھی، وہ السلام علیك أیها النبی کی جگہ السلام علی النبی پڑھتے تھے، کیونکہ علیك حاضر سے خطاب ہے اور آنحضور ﷺ پردہ فرما چکے ہیں (یہ حدیث بخاری (۶۲۶۵) میں ہے) امت نے اس تبدیلی کو بھی قبول نہیں کیا اور اس کی دو وجہیں ہیں: ایک: آنحضور ﷺ کی حیات طیبہ میں جو عورتیں گھروں میں نماز پڑھتی تھیں یا جو مرد مسجد نبوی کے علاوہ دیگر مساجد میں نماز پڑھتے تھے، وہاں آپؐ موجود نہیں تھے، پھر بھی وہ صیغۂ حاضر یعنی السلام علیك کہتے تھے، دوسری وجہ: یہ کلمہ حکائی ہے، یعنی شب معراج کی یادگار ہے، اور حکائی کلمہ کو اس کی اصل شکل پر باقی رکھنا ضروری ہے، جیسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ أحدٌ میں مخاطب حضور اکرم ﷺ ہیں، آپؐ کی تشریف بری کے بعد بھی قُلْ کو پڑھنا ضروری ہے اس کو حذف کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ کلمہ حکائی ہے۔ واللہ اعلم

[۲۳٦] باب ماجاء في صفة الصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم

[٤٩٤-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، قال: حدثني أبو أُسَامَةَ، عن مِسْعَرٍ، والأَجْلَحِ، ومالكِ بنِ مِغْوَلٍ، عن الحَكَمِ بنِ عُتَيْبَةَ، عن عبدِ الرحمنِ بنِ أبي لَيْلَى، عن كعبِ بنِ عُجْرَةَ، قال: قلنا: يارسولَ اللّٰهِ! هذا السَّلامُ عليكَ قد عَلِمْنَا فكيفَ الصَّلاَةُ عليك؟ قال:" قولوا اللّٰهُمَّ صَلِّ على محمدٍ وعلى آلِ محمدٍ كما صَلَّيْتَ على إبراهيمَ، إِنَّكَ حميدٌ مجيدٌ، وبَارِكْ على محمدٍ وعلى آلِ محمدٍ كما باركْتَ على إبراهيمَ إِنَّكَ حميدٌ مجيدٌ"

قال محمودٌ: قال أبو أُسامةَ: وَزَادَنِي زائدةُ عن الأَعْمَشِ، عن الحَكَمِ، عن عبدِ الرحمنِ بنِ أبي ليلىَ، قال: ونحنُ نقولُ: وعلينا مَعَهُمْ.

وفي الباب: عن عليٍّ، وأبي حميدٍ،وأبي مسعودٍ، وطلحةَ، وأبي سَعيدٍ، وبُرَيْدَةَ، وزَيد بن خارجةَ، ويقولُ: ابنُ جاريةَ، وأبي هُريرةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ كعبِ بنِ عُجْرَةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وعبدُ الرحمنِ بنُ أبي لَيْلَى: كُنْيَتُهُ أبو عيسى، وأبو ليلى: اسمه يسارٌ.

وضاحت: محمود بن غیلان کہتے ہیں: ابواسامۃ نے کہا: مجھ سے یہ حدیث زائدۃ نے بھی اعمش کی سند سے بیان کی، اس میں یہ زیادتی ہے: ابن ابی لیلیٰ کبیر فرماتے ہیں: ہم وعلی آل محمد کے بعد وعلینامعہم کا اضافہ کرتے تھے (یہ روایت نسائی ۳: ۴۷ میں ہے) ـــــ وفی الباب میں حضرت زید کا تذکرہ آیا ہے ان کے والد کا نام بعض خارجۃ اور بعض جاریۃ بتاتے ہیں۔ اور ابن ابی لیلیٰ کبیر کی کنیت ابوعیسی ہے اور ان کے والد ابولیلیٰ کا نام یسار ہے۔

بابُ ماجاء في فَضْلِ الصَّلاَةِ عَلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم

درود شریف کی فضیلت کا بیان

پہلی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "قیامت کے دن لوگوں میں مجھ سے سب سے زیادہ قریب ان میں سے سب سے زیادہ مجھ پر درود بھیجنے والا ہوگا" یعنی جو صلاۃ وسلام کا ورد زیادہ رکھے گا اس کو قیامت کے دن حضور اکرم ﷺ کی نزدیکی حاصل ہوگی، حضورا کرم ﷺ سے یہ قربت درود شریف کی سب سے بڑی فضیلت ہے۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے بدل اس پر دس بار درود بھیجتے ہیں، اور اس کے بدل میں اس کے لئے دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں"

تشریح: یہ حدیث امام ترمذی رحمہ اللہ نے پہلے سند کے بغیر لکھی ہے پھر اس کی سند لائے ہیں، اور یہ بات کہ درود شریف پڑھنے والے کے نامۂ اعمال میں دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں قاعدہ کے مطابق ہے، کیونکہ درود پڑھنا نیک کام ہے اور ہر نیکی کا ثواب دس گنا ہے، اور درود شریف کی خاص فضیلت یہ ہے کہ ایک درود کے بدلے اللہ تعالیٰ اس پر دس درود بھیجتے ہیں، کتاب الصلاۃ کے بالکل شروع میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ صلاۃ کے معنی ہیں غایت انعطاف، یعنی انتہائی درجہ کا میلان، اور یہ غایت درجہ کا انعطاف اضافت اور نسبت کے بدلنے سے مختلف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا بندوں کی طرف انعطاف اللہ پاک کا بندوں پر رحمت اور مہربانی فرمانا ہے۔ اور فرشتوں کا حضور اکرم ﷺ کی طرف یا مؤمنین کی طرف غایت درجہ میلان استغفار ہے، اور مؤمنین کا حضور اکرم ﷺ کی طرف انتہائی درجہ کا میلان دعا ہے، اور بندوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف غایت درجہ انعطاف ارکان مخصوصہ اور اذکار مخصوصہ کا مجموعہ ہے جس کا فارسی نام نماز ہے۔ غرض حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ ایک درود کے عوض میں اللہ تعالیٰ کی دس خاص عنایتیں بندے پر مبذول ہوتی ہیں ——— (مصری نسخہ میں صلی اللہ علیہ کے بعد اور کتب لہ کے بعد بہا بھی ہے)

تیسری حدیث: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: بیشک دعاء آسمان اور زمین کے درمیان رُکی رہتی ہے اس دعا میں سے کوئی حصہ آسمان پر نہیں چڑھتا یہاں تک کہ آپ نبی ﷺ پر درود پڑھیں۔ یعنی دعا کے ساتھ جب درود ملتا ہے تب وہ دعاء آسمان پر چڑھتی ہے، اس سے پہلے آسمان وزمین کے درمیان معلق رہتی ہے۔

تشریح: یہ اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے، مگر یہ ایسی بات ہے جو اجتہاد سے نہیں کہی جاسکتی اس لئے یہ حکماً مرفوع ہے۔

چوتھی روایت: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد ہے، عبارت کے بعد اس کی وضاحت آرہی ہے۔

[۲۳۷] باب ماجاء في فَضْلِ الصَّلاَةِ عَلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم

[۴۹۵-] حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا محمدُ بنُ خَالِدِ بنِ عَثْمَةَ، قال: حدثنا موسى بنُ يعقوبَ الزَّمْعِيُّ، حدثني عبدُ اللهِ بنُ كَيْسَانَ، أنَّ عبدَ اللهِ بنَ شَدَّادٍ أخبَرَهُ، عن عبدِ اللهِ بنِ مَسْعُوْدٍ، أنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم قال: "أَوْلَى النَّاسِ بِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَكْثَرُهُمْ عَلَيَّ صَلاَةً"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ.

ورُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أنّه قال: "مَنْ صَلَّى عَلَيَّ صلاةً صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ [بها] عَشْراً وَكُتِبَ لَهُ [بها] عَشْرُ حَسَنَاتٍ"

[۴۹۶-] حدثنا عَلِيُّ بنُ حُجْرٍ، نا إسماعيلُ بنُ جَعْفَرٍ، عن العَلاَءِ بنِ عبدِ الرحمنِ، عن أبيهِ، عن أبي

هريرةَ، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلاَةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ [بها] عَشْرًا"
وفي الباب: عن عبدِ الرحمنِ بنِ عَوْفٍ، وعامِرِ بنِ رَبِيْعَةَ، وعَمَّارٍ، وأبي طلحةَ، وأنسٍ، وأُبَيِّ بنِ كعبٍ. قال أبو عيسى: حديثُ أبي هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.
ورُوِيَ عن سفيانَ الثوريِّ وغيرِ واحدٍ مِن أهلِ العلمِ، قالوا: صلاةُ الرَّبِّ الرَّحْمَةُ، وصلاةُ الملائِكَةِ الإِسْتِغْفَارُ.

[۴۹۷-] حدثنا أبو داودَ سليمانُ بنُ سَلْمٍ البَلْخِيُّ الْمَصَاحِفِيُّ، نا النَّضْرُ بنُ شُمَيْلٍ، عن أبي قُرَّةَ الأَسَدِيِّ، عن سعيدِ بنِ الْمُسَيَّبِ، عن عُمرَ بنِ الخطَّابِ، قال: إِنَّ الدُّعَاءَ مَوْقُوْفٌ بَيْنَ السَّمَاءِ والأَرْضِ لاَيَصْعَدُ مِنْهُ شَيْئٌ حتى تُصَلِّيَ عَلٰى نَبِيِّكَ صلى الله عليه وسلم.
قال أبو عيسى: والعَلاءُ بنُ عبدِ الرحمنِ: هو ابنُ يعقوبَ، هُو مَولى الحُرَقَةِ. والعلاءُ: هُو مِن التابعينَ، سَمِعَ مِنْ أنسِ بنِ مالِكٍ وغيرِه.
وعبدُ الرحمنِ بنُ يعقوبَ: وَالِدُ العَلاءِ: هُوَ مِن التابعينَ، سَمِعَ مِن أبي هريرةَ، وأبي سعيدٍ الْخُدْرِيِّ.
ويعقوبُ: هُوَ مِنْ كبارِ التَّابعينَ، قد أَدْرَكَ عُمَرَ بنَ الخطابِ، وروَى عنه.

[۴۹۸-] حدثنا عباسُ بنُ عبدِ العظيمِ العَنْبَرِيُّ، نا عبدُ الرحمنِ بنُ مَهْدِيٍّ، عن مالكِ بنِ أنسٍ، عن العَلاَءِ بنِ عبدِ الرحمنِ بنِ يعقوبَ، عن أبيهِ، عن جدِّه، قال: قال عُمرُ بنُ الخطَّابِ: لاَيَبِعْ في سُوْقِنَا إِلاَّ مَنْ تَفَقَّهَ في الدِّيْنِ. هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ.

وضاحت: سفیان ثوری اور دیگر علماء سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا (صلاۃ کے معنی نسبت بدلنے سے مختلف ہوتے ہیں چنانچہ) اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرتے ہوئے صلاۃ کے معنی رحمت کے ہیں اور ملائکہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کے معنی استغفار کے ہیں ——— دوسری حدیث کی سند میں علاء بن عبدالرحمٰن ہیں، یہ راوی خود اور ان کے والد عبدالرحمٰن اور ان کے دادا یعقوب تینوں تابعی ہیں، علاء صغار تابعین میں سے ہیں، انھوں نے صغار صحابہ یعنی حضرت انس رضی اللہ وغیرہ سے حدیث سنی ہیں، اور ان کے والد عبدالرحمٰن: حُرقۃ کے آزاد کردہ ہیں اور وہ اوساط تابعین میں سے ہیں، انھوں نے ابو ہریرہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے حدیث سنی ہیں، اور ان کے دادا یعقوب کبار تابعین میں سے ہیں، انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا ہے اور ان سے حدیث سنی ہے۔ اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ علاء بن عبدالرحمٰن کے دادا یعقوب کی ایک روایت لائے ہیں جس کو وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہمارے بازار میں کاروبار نہ کرے مگر وہ شخص جسے دین کی سمجھ حاصل ہے، یعنی جو بیع وشراء کے مسائل سے واقف ہے اسی کے لئے کاروبار کرنا جائز ہے، کیونکہ جو شخص مسائل

سے واقف نہیں وہ الٹا سیدھا کاروبار کرے گا (یہ قول یعقوب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ ان کا حضرت عمرؓ سے لقاء وسماع ہے)

أبوابُ الجُمُعَةِ

بابُ فَضْلِ يَوْمِ الْجُمُعَةِ

دنوں میں سب سے افضل جمعہ کا دن ہے، اور جمعہ کو یہ فضیلت اس لئے حاصل ہے کہ اس دن میں گذشتہ زمانہ میں تین اہم واقعات پیش آئے ہیں، اور جس دن میں کوئی اہم واقعہ پیش آتا ہے اس دن کو خصوصیت حاصل ہوجاتی ہے، جیسے ہندوستان میں ۲۶ رجنوری کو آزادی کا معاہدہ ہوا تھا اور ۱۵ راگست کو آزادی ملی تھی، اس لئے ہندوستان میں ان دنوں کی اہمت ہے۔ اسی طرح اگر آئندہ کسی دن میں کوئی اہم واقعہ پیش آنے والا ہو اور لوگ اس کو پہلے سے جانتے ہوں تو بھی اس دن کو اہمیت حاصل ہوجائے گی، جیسے اگر لوگوں کو پہلے سے معلوم ہوتا کہ آئندہ ۲۶ رجنوری اور ۱۵ راگست کو آزادی حاصل ہونے والی ہے تو لوگ پہلے سے ان دنوں میں جشن مناتے۔ مگر مستقبل کا علم صرف علام الغیوب کو ہے یا ان کے بتلانے سے ان کے نمائندے یعنی حضور اکرم ﷺ جانتے ہیں اور انھوں نے ہمیں بتلایا ہے کہ مستقبل میں جمعہ کے دن میں ایک اہم واقعہ پیش آنے والا ہے اس وجہ سے بھی جمعہ کے دن میں فضیلت پیدا ہوگئی ہے، اور ایک خصوصیت بالفعل ہر جمعہ کے دن میں پائی جاتی ہے جو دوسرے چھ دنوں میں نہیں پائی جاتی اس وجہ سے بھی جمعہ کے دن کو فضیلت حاصل ہوئی ہے۔ غرض اس دن میں تین اہم واقعات گذشتہ زمانہ میں پیش آچکے ہیں، ایک مستقبل میں پیش آنے والا ہے اور ایک خصوصیت بالفعل ہر جمعہ میں پائی جاتی ہے، اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا واقعہ: جمعہ کے دن انسانوں کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی ہے، ان کا وجود اہم واقعہ ہے، لوگ بڑے لوگوں کی میلاد مناتے ہیں کیونکہ اس دن میں برکت ہوتی ہے، جیسے آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت جس دن ہوئی ہے اس دن میں بالیقین برکت ہے، مگر ولادت کے دن جشن منانے کے سلسلہ میں یہ بات جاننی چاہئے کہ اگر صحابہ وتابعین نے میلاد منائی ہے تو عید میلاد النبی منانا جائز ہے اور اگر صحابہ وتابعین نے عید میلاد النبی نہیں منائی تو پھر ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم یہ کام کریں۔ غرض جمعہ کے دن کی فضیلت کی ایک وجہ اس کا حضرت آدم علیہ السلام کی میلاد کا دن ہونا ہے۔

دوسرا واقعہ: حضرت آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن جنت میں داخل کیا گیا۔ حضرت آدم کی تخلیق اسی زمین پر ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ نے پوری زمین سے ایک مٹھی بھری، پھر اس کا گارا بنایا، پھر آدم علیہ السلام کا پتلا بنایا پھر جب وہ سوکھ کر کھنکھنانے لگا تو اس میں روح ڈالی، اور جو مٹی بچ گئی اس سے دادی حواء کو بنایا، پھر اسی جمعہ میں یا اس کے علاوہ آئندہ

کسی جمعہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام کو جنت میں داخل کیا، چونکہ انسانوں کے جد امجد کا جنت میں داخل ہونا انسانوں کے لئے اہم واقعہ ہے اور یہ واقعہ جمعہ کے دن میں پیش آیا ہے اس لئے جمعہ کے دن کو فضیلت حاصل ہوئی۔

تیسرا واقعہ: جمعہ کے دن آدم وحواء علیہما السلام کو جنت سے نکالا گیا۔ یہاں کوئی سوال کرے کہ آدم وحواء کا جنت سے اخراج کونسی اچھی بات ہے جو اس کی وجہ سے جمعہ کو فضیلت حاصل ہوئی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اخراج کے واقعہ کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہری، دوسرا باطنی۔ ظاہری پہلو تو واقعی اچھا نہیں کہ دادا دادی کا جنت سے اخراج ہوگیا، مگر باطنی پہلو بہت اچھا ہے، اس لئے کہ جب دادا، دادی زمین پر اترے تو ان کی ساری نسل بھی زمین پر پیدا ہوئی اور پیچھے سے اللہ کی شریعت آئی، پھر لوگوں نے اس پر عمل کیا، اب دوبارہ جب جنت میں جائیں گے تو استحقاق کی بناء پر جائیں گے۔ ورنہ جنت میں رہنا کسی استحقاق کی بناء پر نہ ہوتا، سورۂ اعراف آیت ۴۳ میں ہے: جنتی جنت میں بیٹھے آپس میں باتیں کریں گے اور کہیں گے: ''ہم جو جنت میں آئے ہیں وہ اس لئے آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کے ذریعہ ہماری راہنمائی کی، اگر اللہ تعالیٰ ہماری راہنمائی نہ کرتے تو ہم کبھی بھی جنت میں نہ پہنچ سکتے، پس اللہ کے لئے حمد ہے'' جنتی یہ باتیں کر ہی رہے ہونگے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہوگا: ﴿وَنُوْدُوْا أَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ یعنی تم کو یہ جنت تمہارے ان کاموں کے بدلے میں ملی ہے جو تم دنیا میں کیا کرتے تھے۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے فرشتوں سے یہ بات کہی تھی کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، چنانچہ آدم وحواء زمین پر اترے تبھی انسان کو خلافت ملی، اگر وہ جنت ہی میں رہتے اور ان کی نسل وہاں چلتی تو خلافت کہاں ملتی؟ غرض اخراج کے یہ دو باطنی پہلو ہیں جو بہت اہم ہیں اور ان کا حصول اسی وقت ممکن ہوا جب دادا دادی زمین پر اترے، اور وہ جمعہ کے دن زمین پر اترے ہیں اس لئے اس دن کو فضیلت حاصل ہوئی۔

نوٹ: میں نے ظاہری اور باطنی پہلو کے سلسلہ میں رحمۃ اللہ الواسعہ (۸۴:۳) میں اپنا ایک واقعہ لکھا ہے، طلباء اس کو بھی دیکھ لیں تو بات اور واضح ہوجائے گی۔

چوتھا واقعہ: اور آئندہ جو اہم واقعہ پیش آنے والا ہے وہ یہ ہے کہ جمعہ ہی کے دن قیامت برپا ہوگی، قیامت کا برپا ہونا چاہے کافر کے حق میں برا ہو مگر مؤمنین کے حق میں خیر ہے۔ کیونکہ جب قیامت برپا ہوگی تبھی مؤمنین کو جنت ملے گی۔ اور قیامت جمعہ کے دن برپا ہوگی، یعنی مؤمنین جنت میں جمعہ کے دن جائیں گے اس لئے جمعہ کو فضیلت حاصل ہوئی۔

ساعتِ مرجوّہ: ہر جمعہ میں ایک ساعتِ مرجوّہ (امید باندھی ہوئی گھڑی) ہے باقی چھ دنوں میں یہ گھڑی نہیں ہے۔ اس گھڑی میں بندہ جو کچھ مانگتا ہے اللہ تعالیٰ وہ ضرور عنایت فرماتے ہیں۔ اس گھڑی کی تعیین میں اختلاف ہے، امام اعظم اور امام احمد رحمہما اللہ کی رائے میں وہ گھڑی جمعہ کے دن عصر کی نماز کے بعد سے سورج غروب ہونے تک

آتی ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے میں جب امام خطبہ دینے کے لئے ممبر پر آتا ہے اس وقت سے نماز جمعہ کا سلام پھرنے تک یہ گھڑی آتی ہے۔ غرض تعیین میں تو اختلاف ہے مگر ساعتِ مرجوّۃ کے سب قائل ہیں۔ اس باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی جو حدیث ہے اس میں اس گھڑی کا تذکرہ نہیں، مگر اگلے باب میں سند صحیح کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث آرہی ہے اس میں الساعۃ المرجُوّۃ کا بھی تذکرہ ہے۔

أبواب الجمعة

[۲۳۸] باب فضلِ يوم الجمعة

[۴۹۹-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا المُغِيْرَةُ بنُ عبدِ الرحمنِ، عن أبي الزِّنَادِ، عن الأَعْرَجِ، عن أبي هريرةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: "خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ فيه الشَّمْسُ يومُ الجمعةِ، فيه خُلِقَ آدمُ، وفيه أُدْخِلَ الْجَنَّةَ، وفيه أُخْرِجَ منها، ولاتقُوْمُ الساعةُ إِلَّا في يومِ الْجُمُعَةِ"

وفي الباب: عن أبي لُبَابَةَ، وسَلْمَانَ، وأبي ذَرٍّ، وسَعدِ بنِ عُبَادَةَ، وأوْسِ بنِ أوْسٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ أبي هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

قوله: خيرُ يومٍ طلعت فيه الشمسُ يومُ الجمعۃ: (بہترین وہ دن جس میں سورج نکلتا ہے جمعہ کا دن ہے۔) طلعت فیہ الشمسُ: خیرُ یومٍ کی صفت کاشفہ ہے، کلام کی تزئین کے لئے یہ صفت لائی گئی ہے۔ جو حضرات عربی زبان کے رموز سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ خیرُ یومٍ یومُ الجمعۃ اور خیر یوم طلعت فیہ الشمس یومُ الجمعۃ کے درمیان کیا فرق ہے؟ جیسے قرآن میں ہے: ﴿وَلَا طَائِرٍ يَطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ﴾ اس میں یطیر بجناحیہ: طائر کی صفت کاشفہ ہے، اس کے بغیر بھی بات پوری ہے مگر صفت کاشفہ کی وجہ سے کلام میں جو بلاغت اور خوبصورتی پیدا ہوئی ہے وہ ظاہر ہے۔ اسی طرح حدیث خیرُ نساءٍ رَکِبْنَ الإبلَ نِساءُ قریش (بہترین وہ عورتیں جو اونٹ پر سواری کرتی ہیں قریش کی عورتیں ہیں) اس میں بھی رکبن الإبل محض تزئین کلام کے لئے بڑھایا گیا ہے۔

بابٌ في السَّاعَةِ الَّتِيْ تُرْجَى فِيْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ

جمعہ کے دن میں ساعتِ مرجوّۃ کا بیان

ساعتِ مرجوّۃ یعنی جس گھڑی میں قبولیت دعا کی امید باندھی گئی ہے وہ کس وقت آتی ہے؟ اس میں علماء کے پینتالیس قول ہیں۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے موطا مالک کی شرح تنویر الحوالک میں وہ سب اقوال ذکر کئے ہیں۔ امام

اعظم اور امام احمد رحمہما اللہ کا رجحان اس طرف ہے کہ وہ گھڑی عصر کی نماز کے بعد سے سورج غروب تک آتی ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا رجحان اس طرف ہے کہ زوال کے بعد جب امام خطبہ دینے کے لئے ممبر پر آتا ہے اس وقت سے نماز کا سلام پھرنے تک وہ گھڑی آتی ہے۔

سوال: ساعتِ مرجوہ کی صحیح نشاندہی کیوں نہیں کی گئی تا کہ اللہ کے بندے اس سے فائدہ اٹھاتے؟

جواب: شب قدر بھی ایک قیمتی رات ہے اس کی بھی نشاندہی نہیں کی گئی اس لئے کہ قیمتی ہیرے دکھائے نہیں جاتے ان کو تلاش کرنا پڑتا ہے، شبِ قدر اور ساعتِ مرجوہ بھی قیمتی ہیرے ہیں ان کو پانے کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے، علاوہ ازیں نشاندہی نہ کرنے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ بندہ رمضان کی تمام راتیں اور جمعہ کا پورا دن عبادت میں مصروف رہے۔

پہلی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم اس گھڑی کو جس کی جمعہ کے دن میں امید باندھی گئی ہے عصر کے بعد سے سورج غروب ہونے تک ڈھونڈھو''

تشریح: یہ حدیث محمد بن ابی حمید کی وجہ سے ضعیف ہے۔ علماء نے حافظہ کی وجہ سے اس کی تضعیف کی ہے اور اسی راوی کو حماد بن ابی حمید بھی کہتے ہیں، محمد نام ہے اور حماد لقب ہے۔ اور بعض محدثین کا خیال یہ ہے کہ یہ راوی ابو ابراہیم انصاری ہے، اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر یہ منکر راوی ہے ——— اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یہی حدیث ایک دوسری سند سے بھی مروی ہے اور وہ طبرانی کی معجم کبیر میں ہے، مگر اس کی سند میں مشہور ضعیف راوی عبداللہ بن لہیعہ ہیں۔ تاہم وہ سند اس سند سے بہتر ہے۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک جمعہ کے دن میں ایک گھڑی ہے اس گھڑی میں بندہ جو بھی چیز اللہ سے مانگتا ہے اللہ تعالیٰ وہ چیز اس کو ضرور عنایت فرماتے ہیں'' صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہ گھڑی کونسی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''جس وقت نماز کھڑی کی جاتی ہے (یعنی امام خطبہ دینے کے لئے ممبر پر آتا ہے اس وقت سے) نماز سے پھرنے تک وہ گھڑی آتی ہے''

تشریح: اس حدیث کی سند میں کثیر بن عبداللہ ہے اور وہ کچھ اچھا راوی نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اس کی سند سے جو روایتیں مسند میں لکھی تھیں ان سب کو بعد میں کتاب سے نکال دیا تھا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی حدیث کو حسن غریب کہا ہے۔ غریب بمعنی تفرد اسناد ہے اور امام ترمذی کا حسن فن کے حسن سے فروتر بھی ہوتا ہے۔

تیسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بہترین دن جس میں سورج نکلتا ہے جمعہ کا دن ہے۔ اس دن میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے، اور اسی دن جنت میں داخل کئے گئے، اور اسی دن جنت سے زمین پر اتارے گئے، اور اس دن میں ایک گھڑی ہے نہیں موافق ہوتا اس کے ساتھ کوئی مسلمان بندہ درانحالیکہ وہ نماز پڑھ رہا ہو، پس

وہ اس گھڑی میں اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مانگے مگر اللہ تعالیٰ اس کو وہ چیز عنایت فرماتے ہیں"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پھر میری ملاقات عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ہوئی، میں نے ان سے یہ حدیث بیان کی، تو انھوں نے فرمایا: میں خوب جانتا ہوں وہ گھڑی کس وقت آتی ہے؟ میں نے کہا: آپ مجھے بتائیں اور اس کے بتانے میں بخیلی نہ کریں، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ گھڑی عصر کے بعد سے سورج غروب ہونے تک آتی ہے، میں نے کہا: عصر کے بعد وہ گھڑی کیسے ہوسکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو فرمایا ہے: "نہیں موافق ہوتا اس گھڑی کے ساتھ کوئی مسلمان بندہ درانحالیکہ وہ نماز پڑھ رہا ہو" اور اس وقت (عصر کے بعد) نماز نہیں پڑھی جاتی؟ یعنی حدیث میں یصلی کی قید ہے اور عصر کے بعد نماز پڑھنا ممنوع ہے، پس عصر کے بعد وہ گھڑی کیسے ہوسکتی ہے؟ ابن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا رسول اللہ ﷺ نے نہیں فرمایا کہ "جو شخص کسی جگہ میں بیٹھے درانحالیکہ وہ نماز کا انتظار کررہا ہو تو وہ (حکماً) نماز میں ہے" میں نے کہا: کیوں نہیں! یعنی یہ بات بیشک رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس وہ یہی ہے۔ یعنی یُصلی سے حقیقۃً نماز پڑھنا مراد نہیں بلکہ نماز کا انتظار کرنا مراد ہے اور منتظر صلاۃ حکماً نماز میں ہوتا ہے۔ اور اس کی دلیل کہ حقیقتاً نماز پڑھنا مراد نہیں یہ ہے کہ نماز پڑھنے والا نماز میں دعا کیسے کرے گا؟ یہ کام تو منتظر صلاۃ ہی کرسکتا ہے کہ نماز کے انتظار میں بیٹھا ہے اور دعا میں مشغول ہے، پس دعا اور نماز دونوں کو جمع کرنے کی صورت یہی ہے کہ یصلی سے حکمی نماز مراد لی جائے۔

یہ حدیث موطا مالک میں بھی ہے، وہاں یہ مضمون زائد ہے کہ اِس مجلس میں کعب احبار بھی تھے (یہ تابعی ہیں اور عبداللہ بن سلام صحابی ہیں، اسلام قبول کرنے سے پہلے دونوں حضرات یہودی تھے اور دونوں تورات کے بڑے عالم تھے) انھوں نے کہا: وہ گھڑی مہینہ میں ایک مرتبہ آتی ہے، ابن سلامؓ نے ان کی تردید کی اور فرمایا کہ ہر ہفتہ آتی ہے، حضرت کعب اٹھے اور تورات دیکھی پھر فرمایا: ابن سلام نے صحیح فرمایا وہ گھڑی ہر ہفتہ آتی ہے۔

[٢٣٩] باب ماجاء في الساعة التي تُرْجىٰ في يوم الجمعة

[٥٠٠-] حدثنا عبدُ اللهِ بنُ الصَّبَّاحِ الهاشِمِيُّ البَصْرِيُّ، نا عبيدُ اللّهِ بنُ عبدِ المجيدِ الحَنَفِيُّ، نا محمدُ بنُ أبي حُمَيْدٍ، نا موسى بن وَرْدَانَ، عن أنسِ بنِ مالكٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: " التَمِسُوْا السَّاعَةَ التي تُرْجَى في يَوْمِ الْجُمُعَةِ بَعْدَ الْعَصْرِ إلى غَيْبُوْبَةِ الشمسِ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ غريبٌ مِن هذا الوَجْهِ، وقد رُوِيَ هذا الحديثُ عن أنسٍ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم مِنْ غَيْرِ هذا الوَجْهِ.

ومحمدُ بنُ أبي حُمَيْدٍ يُضَعَّفُ، ضَعَّفَهُ بعضُ أهلِ العلمِ مِنْ قِبَلِ حِفْظِهِ، ويقالُ له: حَمَّادُ بنُ أبي

حُمَيْدٍ، ويقالُ: هو أبو إبراهيمَ الأَنْصارِيُّ، وهو مُنْكَرُ الحديثِ.

ورَأى بعضُ أهلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغيرِهم أنَّ السَّاعَةَ التي تُرْجَى بعدَ العَصْرِ إلى أنْ تغرُبَ الشمسُ، وبه يقولُ أحمدُ وإسحاقُ.

وقال أحمدُ: أَكْثَرُ الأحاديثِ في السَّاعةِ التي تُرْجَى فيها إجابَةُ الدَّعْوَةِ: أنَّها بَعْدَ صَلاَةِ العَصْرِ، وتُرْجَى بعدَ زَوَالِ الشَّمْسِ.

[۵۰۱-] حدثنا زيادُ بنُ أيوبَ البغداديُّ، نا أبو عامرٍ العَقَدِيُّ، نا كَثيرُ بنُ عبدِ اللهِ بنِ عَمْرِو بنِ عَوْفٍ المُزَنِيُّ، عن أبيهِ، عن جَدِّه، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال:" إنَّ في الْجُمُعَةِ سَاعَةً لاَيَسْأَلُ اللّٰهَ العبدُ فيها شيئًا إِلاَّ آتاهُ اللّٰهُ إِيَّاهُ" قالوا: يارسولَ الله! أَيَّةُ ساعَةٍ هي؟ قال:" حِيْنَ تُقَامُ الصلاةُ إلى الانْصِرَافِ مِنْهَا"

وفي الباب: عن أبي موسى، وأبي ذَرٍّ، وسَلْمَانَ، وعبدِ اللهِ بنِ سَلَامٍ، وأبي لُبَابَةَ، وسعدِ بنِ عُبَادَةَ. قال أبو عيسى: حديثُ عَمْرِو بنِ عَوْفٍ حديثٌ حسنٌ غريبٌ.

[۵۰۲-] حدثنا إسحاقُ بنُ موسى الأنصاريُّ، نا مَعْنٌ، نا مالكُ بنُ أنسٍ، عن يَزِيْدَ بنِ عبدِ اللهِ بنِ الهادِ، عن محمدِ بنِ إبراهيمَ، عن أبي سَلَمَةَ، عن أبي هريرةَ قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم:" خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ فيه الشمسُ يومُ الْجُمُعَةِ، فيه خُلِقَ آدمُ، وفيه أُدْخِلَ الْجَنَّةَ، وفيه أُهْبِطَ منها، وفيه ساعَةٌ لاَ يُوَافِقُهَا عبدٌ مُسْلِمٌ يُصَلِّيْ فَيَسْأَلُ اللهَ فِيهَا شَيْئًا إِلاَّ أَعْطَاهُ إِيَّاهُ" قال أبو هريرةَ: فَلَقِيْتُ عبدَ اللّٰهِ بنَ سَلَامٍ، فَذَكَرْتُ له هذا الحديثَ، فقال: أَنَا أَعْلَمُ بِتِلْكَ الساعةِ، فقلتُ: أَخْبِرْنِيْ بِهَا وَلَا تَضْنَنْ بها عَلَيَّ، قال: هِيَ بعدَ العصرِ إلى أنْ تَغرُبَ الشمسُ، قلتُ: فَكَيْفَ تَكُوْنُ بعدَ العصرِ وقد قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم:" لاَ يُوَافِقُهَا عبدٌ مُسْلِمٌ وهو يُصَلِّيْ" وتلكَ الساعةُ لاَيُصَلّٰى فِيهَا؟ فقال عبدُ اللّٰه بنُ سَلَامٍ: أَلَيْسَ قد قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم:" مَنْ جَلَسَ مَجْلِسًا يَنْتَظِرُ الصلاةَ فهو في الصَّلاَةِ"؟ قلتُ: بلى، قال: فهو ذَاكَ؛ وفي الحديثِ قصةٌ طويلةٌ.

قال أبو عيسى: وهذا حديثٌ صحيحٌ، قال: ومعنى قولِه: أَخْبِرْنِيْ بها ولاَ تَضْنَنْ بها عَلَيَّ يقول: لاتَبْخَلْ بها عليَّ، والضَّنِيْنُ: البَخِيْلُ، والظَّنِيْنُ: الْمُتَّهَمُ.

ترجمہ: اور صحابہ وغیرہ میں سے بعض علماء کا خیال ہے کہ وہ گھڑی جس کی امید باندھی گئی ہے عصر کے بعد سے سورج غروب ہونے کے درمیان آتی ہے۔ اور اسی کے احمد واسحاق رحمہما اللہ قائل ہیں۔ اور امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: زیادہ تر حدیثیں اس گھڑی کے سلسلہ میں جس میں قبولیتِ دعا کی امید کی جاتی ہے: یہ ہیں کہ وہ گھڑی عصر کے

بعد آتی ہے۔اور سورج ڈھلنے کے بعد بھی امید کی جاتی ہے۔

قولہ: قصة طويلة: یہ امام ترمذی رحمہ اللہ کی خاص اصطلاح ہے، قصہ بمعنی مضمون ہے اور وہ مختصر مضمون کو بھی قصہ طویلہ کہتے ہیں، اس حدیث میں زائد مضمون بس اتنا ہی ہے جتنا میں نے موطا کے حوالہ سے بیان کیا ہے اسی کو حضرت نے ''لمبا مضمون'' کہا ہے۔

قولہ: لاتضنن بها علی کے معنی ہیں: وہ بات مجھے بتانے میں آپ کنجوسی سے کام نہ لیں۔ ضنین (ضاد سے) بخیل کو کہتے ہیں اور ظنین (ظاء سے) متہم کے معنی میں ہے۔

بابُ ماجاء فی الاِغْتِسَالِ فِیْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ

جمعہ کے دن غسل کرنے کا بیان

اس باب میں چند مسئلے ہیں:

پہلا مسئلہ: ائمہ اربعہ کے نزدیک جمعہ کے دن غسل جمعہ کی وجہ سے ہے اور سنت ہے۔ اور اصحاب ظواہر کے نزدیک غسل واجب (بمعنی فرض) ہے وہ کہتے ہیں کہ جمعہ کے دن ہر بالغ پر خواہ وہ شہری ہو یا دیہاتی، پاک عورت ہو یا حائضہ اور نفاس والی سب پر غسل فرض ہے۔ البتہ ان کے نزدیک صحت جمعہ کے لئے غسل شرط نہیں۔ اگر کوئی شخص غسل کے بغیر جمعہ پڑھے تو بھی اس کی نماز درست ہے مگر جمعہ کے دن غسل نہ کرنے کی وجہ سے ترک فرض کا گناہ لازم ہوگا۔

دوسرا مسئلہ: شیخین: امام اعظم اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک یہ غسل نماز جمعہ کے لئے سنت ہے، اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک جمعہ کے دن کے لئے سنت ہے۔ اور ثمرۂ اختلاف یہ ہے کہ امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک جن لوگوں پر جمعہ فرض نہیں، مثلاً دیہاتی اور عورتیں ان کے لئے بھی جمعہ کے دن غسل کرنا سنت ہے۔ اور شیخین کے نزدیک صرف ان لوگوں کے لئے سنت ہے جن پر جمعہ فرض ہے یا جو جمعہ میں حاضر ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں اور اگر کوئی شخص جمعہ پڑھ کر غسل کرے تو بالاجماع سنت ادا نہیں ہوگی، یہاں ثمرۂ اختلاف ظاہر نہیں ہوگا۔

تیسرا مسئلہ: امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک غسل کی طہارت سے جمعہ پڑھنے سے سنت ادا ہوگی اگر کسی کی غسل کے بعد وضو ٹوٹ گئی اور وہ وضو کر کے جمعہ پڑھے تو سنت ادا نہیں ہوگی، باقی ائمہ کے نزدیک غسل کی طہارت سے جمعہ پڑھنا ضروری نہیں۔ طحاوی (۱:۹۱) میں عبدالرحمٰن بن ابزی رضی اللہ عنہ کا یہ عمل مروی ہے کہ وہ جمعہ سے پہلے غسل کرتے تھے پھر اگر وضو ٹوٹ جاتی تو صرف وضو کر کے جمعہ پڑھتے تھے، نیا غسل نہیں کرتے تھے۔ یہ جمہور کی دلیل ہے، اور امام مالک رحمہ اللہ کی کوئی خاص دلیل میرے علم میں نہیں۔

باب کی حدیثیں: اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اس باب میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے دو حدیثیں ذکر کی ہیں اور

دونوں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ہیں، البتہ پہلی حدیث وہ براہ راست نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں اور دوسری حدیث اپنے ابا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، پھر پہلی حدیث کی تین سندیں ذکر کی ہیں جن میں سے دو صحیح ہیں اور تیسری میں مبہم راوی ہے اس سے مراد بھی ان دو میں سے کوئی ایک ہے اور دوسری حدیث کی بھی تین سندیں ہیں، معمر اور یونس کی سندیں مرفوع متصل ہیں، اور امام مالک رحمہ اللہ کی سند مرسل بھی ہے اور مسند بھی۔ تفصیل عبارت کے بعد آئے گی۔

حدیث (۱): رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص جمعہ پڑھنے آئے اسے چاہئے کہ غسل کرے''

تشریح: اس حدیث میں فَلْیَغْتَسِلْ امر غائب ہے، اصحاب ظواہر نے اس کو وجوب کے لئے لیا ہے اور غسل جمعہ کو واجب قرار دیا ہے۔ اور جمہور کے نزدیک یہ امر استحباب کے لئے ہے، کیونکہ امر غائب خود ڈھیلا ڈھالا امر ہے، پھر دیگر دلائل بھی ہیں جو غسل کے عدم وجوب پر دلالت کرتے ہیں اس لئے جمعا بین الادلۃ اس امر کو استحباب کے لئے لینا ضروری ہے۔

حدیث (۲): ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ ایک صحابی مسجد میں داخل ہوئے (یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (خطبہ کے دوران ہی) فرمایا یہ آنے کا کیا وقت ہے؟ (أَیَّۃُ کلمہ استفہام ہے ۃ مدورہ کے بغیر بھی مذکر وغائب دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿بِأَیِّ أَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ ارض مؤنث سماعی ہے اور ای مذکر استعمال ہوا ہے) آنے والے صحابی نے عرض کیا: نہیں ہے یہ (دیر کرنا) مگر یہ کہ میں نے اذان سنی اور میں نے وضو پر زیادتی نہیں کی یعنی اذان سننے کے بعد بس وضو کی، اتنی دیر ہوئی ہے، اس سے زیادہ میں نے دیر نہیں کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اچھا صرف وضو! حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ نبی ﷺ نے غسل کا حکم دیا ہے (یہ آخری حصہ حدیث مرفوع ہے اور وہی اس باب کی دوسری حدیث ہے)

تشریح: جن لوگوں کے نزدیک غسل واجب نہیں ان کی ایک دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہی واقعہ ہے، اس طرح کہ اگر غسل واجب ہوتا تو اولاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غسل کے بغیر مسجد میں نہ آتے، ثانیاً: حضرت عمرؓ ان کو بیٹھنے نہ دیتے، واپس کرتے کہ غسل کرکے آؤ، اور اگر حضرت عمرؓ حکم نہ دیتے تو مسجد صحابہ سے بھری ہوئی تھی کوئی نہ کوئی نکیر کرتا کہ آپ کا صرف وضو کرکے آنا صحیح نہیں۔ آپ واپس جائیں اور غسل کرکے آئیں۔

فائدہ: جاننا چاہئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ روزانہ صبح غسل کیا کرتے تھے یہ بات حمران نے بیان کی ہے اور وہ روایت مسلم میں ہے (بحوالہ معارف السنن ۴: ۳۲۵) پس حضرت عثمان تو غسل کے بغیر نہیں آئے تھے۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ان کو واپس نہ بھیجنا اور کسی صحابی کا نکیر نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ غسلِ جمعہ فرض نہیں،

کیونکہ حضرت عمر: حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی اس عادت سے کہ وہ روزانہ صبح سویرے غسل کرتے ہیں واقف نہیں تھے، انھوں نے فرمایا تھا: ''اچھا! صرف وضو کرکے آئے ہو؟! حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے غسل کرنے کا حکم دیا ہے'' یہ ارشاد دلیل ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کی روزانہ غسل کرنے کی عادت سے واقف نہیں تھے، ورنہ وہ ان کے صبح میں کئے ہوئے غسل کو کافی گردانتے، کیونکہ قائلینِ وجوب بھی غسل کی طہارت سے جمعہ پڑھنے کو ضروری نہیں کہتے۔

[۲٤۰] باب ماجاء فی الاغتسال فی یوم الجمعة

[۵۰۳-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا سفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ، عن الزُّهْرِيِّ، عن سالمٍ، عن أبيه، أنَّه سَمِعَ النبيَّ صلى الله عليه وسلم يقولُ: "مَنْ أتَى الْجُمُعَةَ فَلْيَغْتَسِلْ"

وفي الباب: عن أبي سَعِيدٍ، وعُمَرَ، وجابرٍ، والبَرَاءِ، وعائشةَ، وأبي الدَّرْدَاءِ. قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وَرُوِيَ عن الزُّهْرِيِّ عن عبدِ الله بن عبد الله بنِ عُمَرَ، عن أبيه، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم هذا الحديثُ أيْضًا، حدثنا بذلك قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ بنُ سَعْدٍ، عن ابنِ شِهَابٍ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ عبدِ اللّٰهِ بنِ عُمَرَ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ عُمَرَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم مِثْلَهُ.

وقال محمدٌ: وحديثُ الزُّهْرِيِّ، عن سَالِمٍ، عن أبيه، وحديثُ عبدِ اللّٰهِ بنِ عبدِ اللّٰهِ، عن أبيه، كِلَا الحَدِيثَيْنِ صحيحٌ.

وقال بعضُ أصحابِ الزُّهْرِيِّ، عن الزُّهْرِيِّ، قال: حَدَّثَنِيْ آلُ عبدِ اللّٰهِ بنِ عُمَرَ، عن ابنِ عُمَرَ.

[قال أبو عيسى:

[۵۰٤-] وقد روى عن ابنِ عُمَرَ، عن عُمَرَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم في الغسل يَوْمَ الْجُمُعَةِ أيْضًا، وهو حديثٌ صحيحٌ، رواهُ يُوْنُسُ، ومَعْمَرٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عن سالمٍ، عن أبيه]: بَيْنَمَا عُمَرُ بنُ الخطابِ يَخْطُبُ يومَ الْجُمُعَةِ إذْ دَخَلَ رَجُلٌ مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم فقال: أيَّةُ ساعةٍ هذه؟ فقال: ما هُوَ إلَّا أنْ سَمِعْتُ النِّدَاءَ، وما زِدْتُ عَلَى أنْ تَوَضَّأْتُ، قال: والوُضُوْءُ أيْضًا وقد عَلِمْتَ أنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم أمَرَ بالغُسْلِ، حدثنا بذلك محمدُ بنُ أبَانَ، نا عبدُ الرزاقِ، عن مَعْمَرٍ، عن الزُّهْرِيِّ، ح: وثنا عبدُ اللّٰهِ بنُ عبدِ الرحمنِ، نا عبدُ اللّٰهِ بنُ صالحٍ، عن اللَّيْثِ، عن يُوْنُسَ، عن الزُّهْرِيِّ بهٰذا الحديثِ.

ورَوَى مالكٌ هذا الحديثَ عن الزُّهرِيِّ، عن سالمٍ، قال بَيْنَمَا عُمَرُ يَخْطُبُ يومَ الْجُمُعَةِ فَذَكَرَ الحديثَ.

قال أبو عيسى: سَأَلْتُ محمداً عن هذا، فقال: الصحيحُ حديثُ الزُّهرِيِّ، عن سالمٍ، عن أبيهِ.

قال محمد: "وقد رُوِيَ عن مالكٍ أيضًا، عن الزُّهرِيِّ، عن سالمٍ، عن أبيه نحوُ هذا الحديثِ.

وضاحت: پہلی حدیث (۵۰۳) ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ہے جس کو وہ براہِ راست حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ اس حدیث کے راوی امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ ہیں، پھر ان کے شاگردوں میں سے سفیان بن عیینہ: زہری اور ابن عمر کے درمیان سالم کا واسطہ ذکر کرتے ہیں (یہ ابن عمر کے جلیل القدر صاحبزادے ہیں اور مدینہ کے فقہاء سبعہ میں سے ہیں۔ باب کے شروع میں یہی سند ہے) اور امام زہری کے دوسرے جلیل القدر شاگرد امام لیث بن سعد مصری: زہری اور ابن عمر کے درمیان عبداللہ کا واسطہ ذکر کرتے ہیں (یہ حضرت عبداللہ بن عمر کے دوسرے صاحبزادے ہیں اور وہ اپنے ابا کے ہم نام ہیں) اور امام زہری کے کچھ دوسرے تلامذہ (اللہ جانے وہ کون ہیں) زہری اور ابن عمر کے درمیان مبہم راوی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ امام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے خاندان کے ایک شخص نے مجھ سے حدیث بیان کی (وہ سالم ہیں یا عبداللہ؟ اس کی تعیین نہیں کی) وہ ابن عمر سے اور وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلی دونوں سندوں کو صحیح قرار دیا ہے اور تیسری سند قابل اعتناء نہیں، کیونکہ اس میں مبہم راوی سے مراد انہی دو میں سے کوئی ایک ہے، اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے دوسری حدیث (۵۰۴) ذکر کی ہے، مگر ہمارے ہندوستانی نسخوں میں پوری ایک سطر عبارت چھوٹ گئی ہے جس سے مضمون خلط ملط ہوگیا ہے۔ میں نے مصری نسخہ سے یعنی ابن العربی المالکی کی شرح عارضۃ الاحوذی سے وہ چھٹی ہوئی عبارت دو کھڑی قوسوں کے درمیان لکھی ہے۔ یہ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا واقعہ ہے۔ یہ بھی امام زہری رحمہ اللہ کی حدیث ہے، مگر اس میں زہری اور ابن عمر کے درمیان سالم ہی کا واسطہ ہے، ابن عمر کے دوسرے صاحبزادے عبداللہ اس حدیث کو روایت نہیں کرتے، پھر زہری کے دو شاگرد معمر اور یونس عن الزہری عن سالم عن ابیہ کی سند سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ اور ان کی بیان کی ہوئی حدیث روایت کرتے ہیں اور امام مالک سند سالم پر روک دیتے ہیں، یعنی سالم یہ واقعہ بیان کرتے ہیں، یہ روایت مرسل ہے اور موطا مالک (ص:۳۵) میں ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے بارے میں بھی امام بخاری سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا: اس کی صحیح سند زہری عن سالم عن ابیہ ہے، یعنی امام مالک کی سند صحیح نہیں، کیونکہ خود امام مالک رحمہ اللہ سے بھی یہ حدیث جویریہ بن اسماء مسند روایت کرتے ہیں، یعنی وہ سالم کے بعد عن ابیہ بڑھاتے ہیں اور وہ روایت بخاری (حدیث ۸۷۸، باب فضل الغسل) میں ہے۔

بابٌ فی فَضْلِ الغُسْلِ یَوْمَ الْجُمُعَةِ

غسلِ جمعہ کی فضیلت کا بیان

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص جمعہ کے دن نہایا اور دھویا (غَسَّلَ: اغتَسَلَ کی تاکید کے لئے ہے یعنی خوب اچھی طرح نہایا) اور سویرے مسجد گیا اور خوب سویرے گیا (ابتکر بھی تاکید کے لئے ہے) اور امام سے قریب بیٹھا اور توجہ سے خطبہ سنا اور خاموش رہا تو اس کے لئے ہر قدم کے بدلے جس کو وہ اٹھاتا ہے ایک سال کے روزوں کا اور رات کی نفلوں کا ثواب ہے'' (قیام کے معنی ہیں سونے سے پہلے نفلیں پڑھنا، تراویح کا نام قیام اللیل اسی وجہ سے ہے کہ وہ سونے سے پہلے پڑھی جاتی ہے)

تشریح: حدیث شریف میں جو ثواب بیان کیا گیا ہے یعنی ہر قدم پر ایک سال کے روزوں اور ایک سال کی نفلوں کا ثواب وہ اس صورت میں ہے جب تین کام پابندی سے ہر جمعہ کو کرے، ایک: خوب اچھی طرح نہائے دھوئے اور صاف ستھرے کپڑے پہنے، دوسرا: صبح سویرے مسجد جائے، تیسرا: امام سے قریب بیٹھے، اور خاموش رہ کر توجہ سے خطبہ سنے، ایک دو جمعہ یہ عمل کرنے کا یہ ثواب نہیں ہے۔

قولہ: اغتَسَلَ وَغَسَّلَ: وکیع رحمہ اللہ جو بڑے درجہ کے محدث ہیں مگر فقہ میں ان کا کوئی خاص مقام نہیں: فرماتے ہیں: اغتَسَلَ کے معنی ہیں خود نہایا اور غَسَّلَ کے معنی ہیں بیوی کو نہلایا یعنی بیوی سے صحبت کی تاکہ وہ نہائے۔ حضرت وکیع رحمہ اللہ نے جو تفسیر کی ہے وہ ایک لطیفہ سے زیادہ نہیں، صحیح تفسیر وہ ہے جو ابن المبارک رحمہ اللہ نے کی ہے، ابن المبارک مجتہد اور فقیہ ہیں، وہ فرماتے ہیں: غَسَّلَ تاکید کے لئے ہے، اور حدیث کی مراد یہ ہے کہ نہائے اور سر دھوئے، کپڑے دھوئے، یعنی خوب اہتمام سے نہائے دھوئے۔

قولہ: بَكَّرَ وابتكَرَ: بَكَّرَ تَبْكِيرًا کے معنی ہیں صبح صادق کے بعد جانا۔ مشہور حدیث ہے: اللّٰهم بارك لأمتی فی بكورها: اے اللہ! میری امت کے سویرے کے کاموں میں برکت فرما۔ اور ابتکر تاکید کے لئے ہے۔ یعنی بہت سویرے مسجد گیا، پہلے شہر میں صرف ایک جگہ جمعہ ہوتا تھا اس وقت مسجد میں اسی کو جگہ ملتی تھی جو جلدی جاتا تھا۔ اب چونکہ جگہ جگہ جمعہ ہوتا ہے اس لئے آدمی خطبہ ختم ہونے سے پہلے پہنچتا ہے تو بھی مسجد میں جگہ مل جاتی ہے اس لئے اب لوگ جلدی نہیں جاتے، غرض آج کے بدلے ہوئے حالات میں حدیث کا سمجھنا مشکل ہے۔

قولہ: دنا واستمع وأنصتَ: مسجد میں پہنچ کر امام سے قریب بیٹھنے کی کوشش کرے، بعض لوگ مسجد میں جلدی پہنچ جاتے ہیں مگر ستون سے یا دیوار سے ٹیک لگانے کے لئے پیچھے بیٹھتے ہیں، حالانکہ آگے جگہ خالی ہوتی ہے یہ صحیح نہیں۔ امام سے قریب بیٹھنے کی کوشش کرنی چاہئے، تب یہ ثواب ملے گا۔

[۲٤۱] باب في فضل الغسل يوم الجمعة

[٥٠٥-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، نا وكيعٌ، نا سفيانُ، وأبو جَنَابٍ يحيىَ بنُ أبي حَيَّةَ، عن عبدِ اللهِ بنِ عيسى، عن يَحيىَ بنِ الحارثِ، عن أبي الأشعَثِ الصَّنْعَانيِّ، عن أَوْسِ بنِ أَوْسٍ، قال قال: رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَغَسَّلَ، وبَكَّرَ وابتَكَرَ، وَدَنَا وَاسْتَمَعَ، وأَنْصَتَ، كانَ لَهُ بِكُلِّ خُطْوَةٍ يَخطُوْهَا أَجْرُ سَنَةٍ: صِيَامِهَا وقِيَامِهَا" قال محمودٌ في هذا الحديثِ: قال وكيعٌ: اغْتَسَلَ هُوَ، وَغَسَّلَ امْرَأتَهُ.

ويُرْوَى عن ابن المباركِ، أنَّه قال في هذا الحديث: مَنْ غَسَّلَ واغتَسَلَ، يعني غَسَلَ رَأْسَهُ واغتَسَلَ.

وفي الباب: عن أبي بكرٍ، وعِمْرَانَ بنِ حُصَيْنٍ، وسلمان، وأبي ذَرٍّ، وأبي سعيدٍ، وابنِ عمرَ، وأبي أيُّوبَ.

قال أبو عيسى: حديثُ أَوْسِ بنِ أَوْسٍ حديثٌ حسنٌ؛ وأبو الأشعَثِ الصَّنْعَانيُّ: اسمُهُ شُرَحْبِيلُ بنُ آدَةَ.

وضاحت: ہندوستانی نسخوں میں سند میں سفیان سے پہلے عن تھا اور مصری نسخہ میں حدثنا ہے اور وہی صحیح ہے کیونکہ ابو جناب حالت رفعی میں ہے، اگر عن ہوتا تو ابی جناب ہوتا، چنانچہ عن کی جگہ ہم نے نا لکھا ہے ——— اسی طرح مصری نسخہ میں قال: قال رسول الله صلی الله علیہ وسلم ہے اور ہمارے نسخوں میں دوسرے قال کے بعد لی بھی ہے۔ مگر یہ حکم خاص طور پر حضرت اوس رضی اللہ عنہ کے لئے نہیں ہے بلکہ عام حکم ہے اس لئے لی کو حذف کیا ہے۔ جاننا چاہئے کہ ابو جناب یحییٰ بن ابی حیۃ کی علماء نے تدلیس کرنے کی وجہ سے تضعیف کی ہے (تقریب ۵۸۹) مگر یہاں چونکہ سفیان ثوری متابع ہیں اس لئے حدیث ٹھیک ہے۔

بابٌ في الوُضُوْءِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ

صرف وضو سے جمعہ پڑھنے کا بیان

جمعہ کے لئے غسل واجب ہے یا سنت؟ اس سلسلہ کے ابواب یہاں پورے ہو رہے ہیں اور گذشتہ سے پیوستہ باب اصحاب ظواہر کے لئے تھا اور اس باب میں جمہور کی دلیل ہے۔

پہلی حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے جمعہ کے دن وضو کیا تو اس نے ٹھیک کیا، اور جس نے غسل کر کے جمعہ پڑھا تو غسل کرنا افضل ہے"

تشریح: اس حدیث نے دوٹوک فیصلہ کردیا کہ جمعہ کے دن غسل کرنا سنت ہے اور صرف وضو کرکے نماز پڑھنا بھی کافی ہے، اور یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی ہے، مگر چونکہ قتادہ کے بعض تلامذہ اس کو مرسل بیان کرتے ہیں یعنی حضرت سمرۃ کا تذکرہ نہیں کرتے اس لئے امام ترمذی رحمہ اللہ نے صرف حسن کہا ہے۔ ورنہ فی نفسہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

جاننا چاہئے کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا حضرت سمرۃ سے سماع ہے یا نہیں؟ یعنی عن الحسن عن سمرۃ بن جندب والی سند موصول ہے یا منقطع؟ اس میں اختلاف ہے اور اصح قول یہ ہے کہ یہ سند موصول ہے یعنی حسن بصریؒ کی حضرت سمرۃ سے جتنی روایتیں ہیں وہ سب ان کی سنی ہوئی ہیں۔ تفصیل (۱:۴۸۵) میں گذر چکی ہے۔

جاننا چاہئے کہ پہلے (حدیث ۵۰۴ میں) حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا جو واقعہ گذرا ہے اس سے امام شافعی رحمہ اللہ نے غسلِ جمعہ کے عدم وجوب پر استدلال کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: اگر غسل واجب ہوتا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غسل کئے بغیر مسجد میں نہ آتے، وہ اس مسئلہ سے ناواقف ہوں یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔ اور اگر بالفرض یہ تسلیم کیا جائے کہ حضرت عثمانؓ یہ مسئلہ نہیں جانتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بیٹھنے کیوں دیا؟ حضرت عمرؓ ان کو واپس کرتے کہ جاؤ غسل کرکے آؤ، پھر مسجد صحابہ سے بھری ہوئی تھی اس وقت لوگوں میں نوے فیصد صحابہ تھے، کسی نے کیوں نہ کہا کہ امیر المؤمنین جمعہ کے دن غسل واجب ہے، لہٰذا ان کو واپس بھیجئے۔ کسی صحابی کا نکیر نہ کرنا عدم وجوب غسل پر اجماع ہے۔

فائدہ: اصحاب ظواہر کا استدلال ایک تو اس حدیث سے ہے جو پہلے گذری ہے کہ "جو شخص جمعہ کے لئے آئے وہ غسل کرکے آئے" جمہور اس حدیث میں امر برائے استحباب لیتے ہیں۔ اور دوسری دلیل آپؐ کا یہ ارشاد ہے: الغُسْلُ واجبٌ علی کل مُحْتَلِمٍ: جمعہ کے دن ہر بالغ پر غسل واجب ہے۔ ان کا استدلال لفظِ واجب سے ہے۔ اس استدلال کا عام طور پر یہ جواب دیا جاتا ہے کہ یہ شریعت والا واجب نہیں بلکہ واجب فی المروءۃ ہے یعنی احسان ونیکوکاری والا واجب ہے مگر یہ تاویل فہم سے بالاتر ہے۔

صحیح بات وہ ہے جو حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی ہے کہ یہ حکم مخصوص حالات کے لئے تھا جبکہ مسجد نبوی چھپر تھی، چھت نیچی تھی، لوگ اون کے کپڑے پہنتے تھے، بذاتِ خود کھیتوں میں کام کرتے تھے، ملک گرم تھا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ لوگ کھیتوں سے جمعہ کے وقت سیدھے مسجد میں آئے وہ پسینہ میں شرابور تھے، جس سے تعفن پیدا ہوا، جب آنحضرت ﷺ مسجد میں تشریف لائے تو آپ نے بدبو محسوس کی تو حکم دیا کہ کھیتوں سے سیدھے مسجد نہ آیا کرو، پہلے گھر جاؤ، غسل کرو، کپڑے بدلو پھر مسجد میں آؤ۔ پھر جب حالات بدل گئے۔ مسجد نبوی کشادہ ہوگئی، کھیتوں میں کام کرنے کے لئے غلام مل گئے کپڑے بھی اون کے نہ رہے تو حکم بدل گیا۔ اب غسل کی وہ سخت تاکید نہ رہی۔ اس توجیہ کا حاصل یہ ہے کہ مخصوص حالات میں غسل واجب تھا، پھر جب حالات بدلے تو وجوب

باقی نہ رہا۔ مگر اگر حالات پلٹیں تو وہ وجوب لوٹ آئے گا۔

اس کی نظیر: زکوٰۃ میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ خاص مصلحت سے رکھا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب اسلام کا بول بالا ہو گیا تو وہ حکمت باقی نہ رہی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مؤلفۃ القلوب کا حصہ موقوف کردیا۔ لیکن وہ قیامت تک کے لئے موقوف نہیں ہوا، قرآن میں وہ آیت باقی ہے۔ اگر آئندہ کبھی حالات ناگفتہ بہ ہوجائیں اور مسلمانوں کے احوال دور اول کے مسلمانوں کی طرح ہوجائیں تو مؤلفۃ القلوب کا حصہ دوبارہ شروع کیا جاسکتا ہے، مگر امیر المؤمنین نے موقوف کیا ہے پس زمانہ کا امیر المؤمنین ہی اس کو شروع کرسکتا ہے۔

اسی طرح جمعہ کے دن غسل کا جو حکم ہے وہ خاص احوال میں تھا جب حالات بدل گئے تو حکم باقی نہ رہا، مگر حدیثیں باقی ہیں، اگر خدانخواستہ حالات پلٹ جائیں یا کسی خاص جگہ کے احوال دور اول جیسے ہوں تو وہاں ان حدیثوں پر عمل ہوگا (حضرت عائشہ کی حدیث بخاری وقت الجمعة إذا زالت الشمس میں اور ابن عباس کی حدیث طحاوی میں ہے)

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے وضو کی اور اچھی طرح وضو کی پھر جمعہ کے لئے آیا اور امام سے قریب بیٹھا، اور توجہ کے ساتھ خطبہ سنا اور خاموش رہا تو اس نے جو گناہ اس جمعہ سے گذشتہ جمعہ کے درمیان کئے ہیں وہ اور مزید تین دن کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے، یعنی کل دس دن کے گناہ معاف ہونگے، اور جس نے کنکری کو چھویا اس نے لغو کام کیا (یہ صغری ہے اور اس کا کبری ہے: ومن لَغَا فلا جُمُعَةَ له: جس نے لغو کام کیا اس کا ثواب گیا)

تشریح: یہ حدیث اعلی درجہ کی صحیح ہے، اور اس کی دلالت بھی واضح ہے کہ غسل جمعہ واجب نہیں، اور اس حدیث میں مواظبت کی شرط بھی نہیں یعنی جس جمعہ میں بھی یہ سب باتیں جمع ہونگی یہ ثواب ملے گا۔ اور یہ ثواب: الحَسَنَة بعشرة أمثالها کے ضابطہ کے مطابق ہے۔

[۲۴۲] بابٌ فی الوضوء یومَ الجمعة

[۵۰۶-] حدثنا أبو موسی محمدُ بنُ المُثَنّی، نا سعیدُ بنُ سفیانَ الجَحْدَرِیُّ، نا شعبةُ، عن قتادةَ، عن الحَسَنِ، عن سَمُرَةَ بنِ جُنْدُبٍ، قال: قال رسولُ اللهِ صلی الله علیه وسلم: "مَنْ تَوَضَّأَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ فَبِهَا ونِعْمَتْ، ومَنِ اغْتَسَلَ فالغُسْلُ أَفْضَلُ".

وفی الباب: عن أبی هریرةَ، وأنسٍ، وعائشةَ. قال أبو عیسی: حدیثُ سَمُرَةَ حدیثٌ حسنٌ.

وقد رَوَی بعضُ أصحابِ قَتادَةَ هذا الحدیثَ عن قتادةَ، عن الحَسَنِ، عن سَمُرَةَ، ورَوَی بعضُهم عن قَتادَةَ، عن الحَسَنِ، عن النبیِّ صلی الله علیهوسلم، مُرْسَلٌ.

والعَمَلُ علی هذا عندَ أهلِ العلمِ من أصحابِ النبیِّ صلی الله علیه وسلم ومَنْ بَعْدَهُمْ: اختارُوا

الغُسْلَ يَوْمَ الْجُمْعَةِ، ورَأَوْا أَنْ يُجْزِئَ الوُضُوءُ مِنَ الغُسْلِ يوم الجمعةِ.

قال الشافعيُّ: وَمِمَّا يَدُلُّ عَلَى أَنَّ أَمْرَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم بالغُسْلِ يومَ الْجُمْعَةِ: أنَّهُ عَلَى الإخْتِيَارِ لاعَلَى الْوُجُوبِ: حديثُ عُمَرَ حَيْثُ قال لعثمانَ: وَالوضوءُ أَيْضًا! وقد عَلِمْتَ أن رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم أَمَرَ بالغُسْلِ يومَ الْجُمْعَةِ، فلو عَلِمَا أَنَّ أَمْرَهُ عَلَى الْوُجُوبِ، لاَ عَلَى الإخْتِيَارِ، لَمْ يَتْرُكْ عُمَرُ عُثْمَانَ حَتّٰى يَرُدَّهُ، ويقولُ له: ارْجِعْ، فاغْتَسِلْ؛ ولَمَا خَفِيَ عَلَى عثمانَ ذلك مع عِلْمِهِ، ولكن دَلَّ هذا الحديثُ: أنَّ الغُسْلَ يومَ الْجُمْعَةِ فيه فَضْلٌ، من غَيْرِ وجوبٍ يَجِبُ عَلَى الْمَرْءِ كذلك.

[۵۰۷-] حدثنا هَنَّادٌ، نا أبو معاويةَ، عن الأَعْمَشِ، عن أبي صالحٍ، عن أبي هريرةَ، قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: " مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ، ثم أَتَى الْجُمُعَةَ، فَدَنَا واسْتَمَعَ وَأَنْصَتَ: غُفِرَ لَهُ ما بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ، وزِيَادَةُ ثلاثةِ أيَّامٍ، ومَنْ مَسَّ الحصَى فقد لَغَا"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: اس پر صحابہ اور بعد کے علماء کا عمل ہے۔ پسند کیا انھوں نے جمعہ کے دن غسل کرنے کو اور دیکھی انھوں نے یہ بات کہ جمعہ کے دن غسل کی جگہ وضو کافی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: ان میں سے جو دلالت کرتی ہیں (یہ خبر مقدم ہے) اس بات پر کہ رسول اللہ ﷺ کا جمعہ کے دن غسل کا حکم افضلیت پر محمول ہے، وجوب پر محمول نہیں ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے (یہ مبتدا مؤخر ہے) بایں طور کہ انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اچھا صرف وضو کر کے آئے ہو؟ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کے دن غسل کا حکم دیا ہے'' پس اگر دونوں (عمر وعثمان رضی اللہ عنہما) جانتے ہوتے کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم وجوب کے طور پر ہے سنت کے طور پر نہیں ہے تو حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ کو نہ چھوڑتے یہاں تک کہ ان کو واپس کرتے اور ان سے کہتے واپس جاؤ اور غسل کر کے آؤ۔ اور البتہ حضرت عثمان پر پوشیدہ نہ ہوتا وجوب غسل کا حکم ان کے رتبۂ علم کے ساتھ (یعنی حضرت عثمان جیسا ذی علم صحابی یہ حکم نہ جانتا ہو یہ بات ممکن نہیں) لیکن یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جمعہ کے دن غسل میں فضیلت ہے، ایسے وجوب کے بغیر جو آدمی پر واجب ہو اس طرح یعنی آدمی پر اس طرح واجب ہو کہ اس کے بغیر چارہ ہی نہ ہو (ويجب على المرأ كذلك: غیر واجب کی تفسیر ہے)

فائدہ: فبھا ونعمتْ: یہ دو مستقل جملے ہیں، اور ان کے درمیان واو عطف تفسیری ہے، اور فبھا کی تقدیر ہے فقد أخَذَ بالخَصْلَةِ الْحَسَنَةِ: اس نے اچھی بات اختیار کی۔ اور نِعمتْ میں ھی ضمیر پوشیدہ ہے جو مخصوص بالمدح ہے اور وہ الخَصْلَةُ الحَسَنَةُ کی طرف لوٹتی ہے یعنی وہ اچھی بات بہت ہی اچھی ہے۔ اور دونوں جملوں کا ایک مطلب ہے اور دوسرا جملہ پہلے جملہ کی تاکید ہے اس لئے علحدہ علحدہ استعمال کرنا بھی صحیح ہے اور ملا کر استعمال کرنا بھی درست ہے۔

بابُ ماجاءَ فی التَّبْكِيرِ إِلَى الْجُمُعَةِ

جمعہ کے لئے سویرے مسجد جانے کا بیان

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو جمعہ کے دن نہایا جنابت کے نہانے کی طرح (یہ منصوب بنزعِ خافض ہے أی کغسلِ الجنابة۔ اور مراد اچھی طرح نہانا ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں: اس جملہ میں اشارہ ہے کہ بیوی سے صحبت کر کے نہائے) پھر وہ مسجد گیا تو گویا اس نے ایک اونٹ کی قربانی کی یا صدقہ کیا (قربانی کا مفہوم ہے: ہر وہ چیز جس سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جائے خواہ ذبیحہ ہو یا کچھ اور۔ اور قَرَّبَ کے معنی مجمع بحار الانوار میں أهدی تقرباً إلى الله تعالى کئے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی نزدیکی حاصل کرنے کے لئے کسی کو کوئی چیز دی، خواہ وہ ذبیحہ کا گوشت ہو، زندہ جانور ہو یا کوئی اور چیز ہو۔ اور بَدَنَة میں اونٹ، گائے، بھینس سب شامل ہیں، لیکن یہاں اونٹ مراد ہے، کیونکہ وہ بقرۃ کے مقابلہ میں آیا ہے) اور جو دوسری گھڑی میں گیا تو گویا اس نے گائے قربان کی یا صدقہ کی (اسی طرح آگے بھی دو دو ترجمے کریں) اور جو تیسری گھڑی میں گیا تو گویا اس نے سینگ دار مینڈھا قربان کیا، اور جو چوتھی گھڑی میں گیا تو گویا اس نے مرغی کی قربانی کی (نسائی میں اس سے پہلے بطخ کا بھی ذکر ہے) اور جو پانچویں گھڑی میں گیا تو گویا اس نے انڈے کی قربانی کی (نسائی میں اس سے پہلے چڑیا کا بھی ذکر ہے) پھر جب امام خطبہ کے لئے ممبر پر آتا ہے تو فرشتے (دفتر بند کر کے) مسجد میں (خطبہ سننے کے لئے) چلے آتے ہیں (یعنی اب جو آتا ہے اس کا اندراج نہیں ہوتا یعنی اس کے لئے (آنے کا) کوئی ثواب نہیں لکھا جاتا)

تشریح: امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ گھڑیاں زوال کے بعد سے شروع ہوتی ہیں اور وہ لحظات خفیفہ ہیں، یعنی زوال کے بعد فوراً پہلی گھڑی شروع ہوتی ہے پھر فوراً دوسری اور تیسری گھڑیاں یکے بعد دیگرے شروع ہوتی ہیں۔ اور ان کی دلیل یہ ہے کہ حدیث میں لفظ رَاحَ آیا ہے جس کے معنی زوال کے بعد جانے کے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ گھڑیاں زوال کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ اور آنحضور ﷺ بھی زوال کے بعد فوراً ممبر پر تشریف لاتے تھے، یہاں سے معلوم ہوا کہ یہ لحظات خفیفہ ہیں۔

اور دیگر تمام ائمہ فرماتے ہیں: یہ گھڑیاں جمعہ کے دن صبح صادق سے شروع ہوتی ہیں، اس لئے کہ ایک حدیث میں بَكَّرَ وابتكر آیا ہے۔ بَكَّرَ کے معنی ہیں: صبح کے وقت جانا۔ اور ابتکر اس کی تاکید ہے یعنی بالکل صبح میں جانا اور امام مالک رحمہ اللہ کے استدلال کا جواب یہ ہے کہ راح جب غدا کے مقابل آئے تو اس کے معنی شام کے وقت جانے کے ہوتے ہیں، اور جب تنہا آئے تو اس کے معنی مطلق جانے کے ہوتے ہیں، خواہ شام میں جائے یا صبح میں، اور یہاں راح تنہا آیا ہے پس اس کے معنی مطلق جانے کے ہیں، اس لئے جمہور کے نزدیک یہ گھڑیاں جمعہ کے دن

صبح صادق کے بعد فوراً شروع ہوتی ہیں اور لمبی گھڑیاں ہیں۔

[٢٤٣] بابُ ماجاء في التبكير إلى الجمعة

[٥٠٨-] حدثنا إسحاقُ بنُ موسى الأنصاريُّ، نا مَعْنٌ، نا مالكٌ، عن سُمَيٍّ، عن أبي صالحٍ، عن أبي هريرةَ: أنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم قال: "مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ غُسْلَ الْجَنَابَةِ، ثُمَّ رَاحَ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَدَنَةً، ومَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّانِيَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَقَرَةً، ومَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّالِثَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ كَبْشًا أَقْرَنَ، ومَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الرابِعَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ دَجَاجَةً، ومَنْ رَاحَ فِي الساعةِ الْخَامِسَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَيْضَةً، فَإِذَا خَرَجَ الإِمَامُ حَضَرَتِ الْمَلاَئِكَةُ يَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ"

وفي الباب: عن عبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، وسَمُرَةَ. قال أبو عيسى: حديثُ أبي هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

الكَبْش: کسی بھی عمر کا مینڈھا، اس کی مادہ ضَأْنٌ ہے، اس کے مڑے ہوئے بڑے سینگ ہوتے ہیں۔ اگر اس کی دُم گول چکی کی طرح بھاری ہو تو دنبہ کہلاتا ہے، اسے عربی میں خَرُوْف کہتے ہیں...... أَقْرَن: سینگ دار یہ صفت کاشفہ ہے...... يستمعون الذكر: حال ہے الملائکۃ سے۔

بابُ ماجاء في تَرْكِ الْجُمُعَةِ مِنْ غَيْرِ عُذْرٍ

عذر شرعی کے بغیر جمعہ ترک کرنے پر وعید

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جس نے (پے بہ پے) تین جمعے چھوڑ دیئے، جمعہ کے حق کو ہلکا سمجھتے ہوئے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتے ہیں"

تشریح: حدیث میں اگرچہ تتابعات کی قید مذکور نہیں مگر وہ مراد ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں متوالیات کی قید مذکور ہے (رواہ ابویعلی) یعنی وعید لگاتار تین جمعہ چھوڑنے پر ہے۔ زندگی میں متفرق تین جمعہ چھوڑنے پر یہ وعید نہیں اور شرعی عذر سے جمعہ چھوڑنا اور ظہر پر اکتفا کرنا جائز ہے لیکن جمعہ کے حق کو ہیچ سمجھنا اور عذر کے بغیر ظہر پر اکتفا کرنا بڑی خطرناک بات ہے، ایسے شخص کے دل پر مہر لگ جاتی ہے، پھر شاید آئندہ اسے جمعہ پڑھنے کی توفیق نہ ہو۔

[٢٤٤] بابُ ماجاء في ترك الجمعة من غير عذر

[٥٠٩-] حدثنا عليُّ بنُ خَشْرَمٍ، نا عيسى بنُ يونسَ، عن محمدِ بنِ عَمْرٍو، عن عَبِيْدَةَ بنِ سفيانَ، عن أبي الجَعْدِ، يعني الضَّمْرِيَّ، وكانتْ له صُحْبَةٌ، فِيْمَا زَعَمَ محمدُ بنُ عَمْرٍو، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ ثَلاَثَ مَرَّاتٍ تَهَاوُنًا بِهَا طَبَعَ اللهُ على قَلْبِهِ"

وفي الباب: عن ابن عُمرَ، وابنِ عباسٍ، وسَمُرَةَ؛ قال أبو عيسى: حديثُ أبي الجَعْدِ حديثٌ حسنٌ.

قال: وسألْتُ محمداً عن اسم أبي الجَعْدِ الضَمْرِيِّ، فلم يَعْرِف اسْمَهُ. وقال: لاَأَعْرِفُ لَهُ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم إِلاَّ هذا الحديثَ.

قال أبو عيسى: ولاَ نَعْرِفُ هذا الحديثَ إِلاَّ مِنْ حديثِ محمدِ بنِ عَمْرٍو.

وضاحت: یہ حدیث ابوالجعد الضمری رضی اللہ عنہ کی ہے۔ محمد بن عمرو کے خیال میں وہ صحابی ہیں اور قلیل الروایۃ صحابی ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا کہ ان کا نام کیا ہے؟ تو امام بخاری کو ان کا نام معلوم نہیں تھا اور فرمایا کہ ان کی یہی ایک حدیث ہے (مگر دیگر محدثین کہتے ہیں کہ ان کی ایک روایت اور بھی ہے جو مسند بزار میں ہے) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: محمد بن عمرو سے آخر تک حدیث کی یہی ایک سند ہے۔

بابُ ماجاء مِنْ كَمْ يُؤْتَى إلى الجُمُعَةِ؟

جمعہ کے لئے کتنی دور سے آنا ضروری ہے؟

محلِ اقامتِ جمعہ کے لوگوں پر جمعہ فرض ہے یہ متفق علیہ ہے اور شہر سے قریب جو علحدہ بستیاں ہیں ان کے باشندوں پر کتنی دور تک جمعہ فرض ہے؟ اس میں احناف کے یہاں آٹھ قول ہیں۔ ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ جو بستی اتنی دور ہو کہ شہر میں جمعہ پڑھ کر پیدل سورج غروب ہونے سے پہلے گھر پہنچ جائیں تو اس بستی کے لوگوں پر جمعہ پڑھنے کے لئے شہر آنا ضروری ہے۔ یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب ہے اور اس قول کی تعبیر ہے: الجمعةُ على مَن آواهُ الليلُ إلى أهلِه: جمعہ اس شخص پر واجب ہے جس کو رات اس کے گھر والوں میں ٹھکانہ دے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ جامع مسجد کی اذان کی آواز اس بستی تک پہنچتی ہو تو وہاں کے لوگوں پر جمعہ فرض ہے۔ یہ امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب ہے۔ اور امام ترمذی اور ابن العربی نے امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب بیان کیا ہے۔ اور احناف کے یہاں مفتی بہ قول یہ ہے کہ محلِ اقامتِ جمعہ میں رہنے والوں پر جمعہ فرض ہے مثلاً دیوبند میں جمعہ ہوتا ہے تو دیوبند کے باشندوں پر جمعہ فرض ہے، اور آس پاس جو علحدہ بستیاں ہیں وہاں کے لوگوں پر جمعہ فرض نہیں، البتہ جو بستیاں بہت زیادہ دور نہیں ہیں ان کے باشندوں کو جمعہ پڑھنے کے لئے شہر آنا چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مدینہ میں مسجد نبوی کے علاوہ نو مسجدیں اور بھی تھیں، مگر حضور اکرم ﷺ نے کسی مسجد میں جمعہ قائم کرنے کی اجازت نہیں دی تھی، جمعہ صرف مسجد نبوی میں ہوتا تھا، اور قبا (گاؤں) سے اور عوالی کے

گاؤں سے لوگ نوبت بہ نوبت جمعہ پڑھنے کے لئے مسجد نبوی میں آتے تھے، ایک گھر میں دو آدمی ہوتے تو ایک اس ہفتہ آتا دوسرا دوسرے ہفتہ آتا، اس طرح لوگ باری باری آتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شہر کے قریب رہنے والوں پر جمعہ فرض نہیں، مگر ان کو جمعہ پڑھنے کے لئے آنا چاہئے۔

پہلی حدیث: ثُوَیر: قبا گاؤں کے ایک باشندے سے اور وہ اپنے والد سے جو صحابی ہیں روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: ہمیں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا تھا کہ ہم جمعہ پڑھنے کے لئے قبا سے مدینہ آئیں۔

تشریح: یہ حدیث اولاً تو ضعیف ہے ابو فاخِتَة ثویر بن علاقة نہایت ضعیف راوی ہے پھر اس کا استاذ مجہول ہے، بلکہ استاذ الاستاذ بھی مجہول ہے، مگر ان کی جہالت مضر نہیں کیونکہ وہ صحابی ہیں، مگر ان سے روایت کرنے والے کی جہالت مضر ہے۔ ثانیاً حدیث میں جو حکم ہے وہ استحبابی ہے، چنانچہ احناف بھی یہی کہتے ہیں کہ شہر سے قریب بستیوں میں رہنے والوں کو جمعہ پڑھنے کے لئے شہر آنا چاہئے۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جمعہ اس شخص پر واجب ہے جس کو رات اس کے گھر میں ٹھکانہ دے''

تشریح: یہ حدیث بھی انتہائی ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں مسلسل تین راوی: حجاج بن نُصیر، معارک بن عباد اور عبد اللہ بن سعید مقبری ضعیف ہیں، احمد بن الحسن کہتے ہیں: ہم لوگ امام احمد رحمہ اللہ کے پاس تھے، مجلس میں یہ مسئلہ چھڑا کہ جمعہ کن لوگوں پر فرض ہے؟ امام احمد رحمہ اللہ نے کوئی مرفوع حدیث بیان نہیں کی تو احمد بن الحسن نے کہا: اس مسئلہ میں مرفوع حدیث موجود ہے، امام احمدؒ کو یہ سن کر اچنبا ہوا، انھوں نے کہا: مرفوع حدیث؟ احمد نے کہا: ہاں۔ پھر انھوں نے سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی۔ امام احمد یہ حدیث سن کر سخت غصے ہوئے اور فرمایا: توبہ کرو! توبہ کرو!! یعنی یہ حدیث انتہائی ضعیف ہے، مسائل میں پیش کرنے کے قابل نہیں۔

جمعہ فی القُریٰ کا مسئلہ:

اس باب میں جو حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے قبا کے باشندوں کو حکم دیا تھا کہ وہ جمعہ پڑھنے کے لئے مدینہ آئیں اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہر بستی میں جمعہ درست نہیں اور ہر بستی والوں پر جمعہ فرض بھی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو قبا والے اپنے گاؤں میں جمعہ قائم کرتے یا سارے مدینہ منورہ میں جمعہ پڑھنے کے لئے آتے۔ ان حضرات کا باری باری آنا واضح دلیل ہے کہ گاؤں والوں پر جمعہ فرض نہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ایک تو فرضیت کا درجہ ہے اور دوسرا صحت جمعہ کا مرتبہ ہے۔ شہر والوں پر تو جمعہ فرض ہے اگر وہ ظہر پڑھیں گے تو گناہ گار ہونگے، اور قصبات اور بڑے دیہاتوں میں جمعہ صرف درست ہے یعنی وہاں کے باشندے اگر جمعہ پڑھیں گے تو وقت کا فریضہ ادا ہو جائے گا، لیکن اگر وہ ظہر پڑھیں تو بھی درست ہے، ترک فرض کا گناہ نہیں ہوگا، کیونکہ جمعہ ان پر فرض نہیں۔ قہستانی میں ہے: تَقَعُ فرضاً في القَصَبات والقُرى الكبيرةِ (شامی

۱:۵۹۰باب الجمعۃ) فرض واقع ہونے کا یہی مطلب ہے کہ ان پر جمعہ فرض تو نہیں لیکن اگر وہ جمعہ پڑھیں تو فرض وقت ادا ہوجائے گا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: لاجمعۃَ و لا تشریقَ إلا فی مِصْرٍ جامعٍ یعنی جمعہ اور عید کی نماز بڑے شہر ہی میں ہے، یعنی انہی لوگوں پر فرض ہے، اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: گاؤں والوں پر جمعہ نہیں، جمعہ صرف مدائن جیسے شہر والوں پر ہے۔ اس میں بھی فرضیت کے درجہ کا بیان ہے۔

غرض یہ ایک خاص فرق ہے جس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ عام طور پر لوگ اس کو نہیں جانتے۔ وہ شہر، قصبات اور بڑے دیہاتوں کو ایک ہی حکم میں رکھتے ہیں، اور سب پر جمعہ فرض سمجھتے ہیں، جمعہ فرض صرف شہر والوں پر ہے۔ اور قصبات اور بڑی بستیوں میں جمعہ درست ہے، رہی یہ بات کہ جمعہ کی صحت کے لئے کس درجہ کا تمدن اور کتنی بڑی جماعت ضروری ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک شہر، قصبہ یا بڑا گاؤں ہونا ضروری ہے جس میں گلی کوچے اور بازار ہوں، اور کم از کم چار آدمیوں کی شرکت نماز میں ضروری ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک: ایسی بستی ضروری ہے جس کے مکانات متصل ہوں، اور اس میں ایسا بازار ہو جس سے بستی کی ضروریات پوری ہوتی ہوں، اور جماعت میں کم از کم بارہ آدمی شرط ہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک: جس بستی میں چالیس آزاد عاقل بالغ مرد بستے ہوں اس میں جمعہ ہوسکتا ہے اور جماعت میں بھی یہی تعداد شرط ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ قرآن کریم میں سورۃ الجمعہ میں جو ارشاد پاک ہے: ﴿یٰأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا إِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلَاةِ مِنْ یَوْمِ الْجُمُعَةِ﴾ الی آخر السورۃ۔ ان آیات میں شہر والوں پر جمعہ فرض ہونے کا بیان ہے۔ اذان سن کر اللہ تعالیٰ کی یاد کی طرف چل پڑنا اور خرید وفروخت موقوف کردینا، شہروں ہی میں ہوتا ہے، شہروں کی معیشت کاروبار پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی طرح نماز جمعہ پوری ہونے کے بعد زمین میں پھیل جانا اور اللہ کا رزق تلاش کرنا بھی شہر کی طرف مشیر ہے۔ اسی طرح کھیل تماشہ اور مشغولیات کی چیزیں بھی شہر ہی میں ہوتی ہیں۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی حیاتِ مبارکہ میں مدینہ، مکہ اور جواثی میں جو بحرین کا ایک شہر ہے: جمعہ کی اجازت دی تھی کیونکہ جمعہ ایسے ہی شہریوں پر فرض ہے۔

اور بڑا گاؤں وہ ہے جو ہر علاقے کا مرکزی مقام سمجھا جاتا ہے، اور گاؤں والوں کی ضروریات وہاں سے پوری ہوتی ہیں، یعنی اس کی شان قصبے جیسی ہونی چاہئے تو وہاں بھی جمعہ درست ہے اور جو بستیاں اس سے چھوٹی ہیں وہ چھوٹے گاؤں ہیں۔ ان میں مذہب حنفی کی رو سے جمعہ درست نہیں۔ لیکن ایک جزئیہ فقہ میں یہ ہے کہ اگر کسی ایسی بستی میں جہاں جمعہ درست نہیں حاکم وقت کی اجازت سے جمعہ قائم کیا جائے تو وقت کا فریضہ ادا ہوجائے گا۔ اور جس ملک میں اسلامی حکومت قائم ہی نہیں ہوئی یا اب باقی نہیں رہی وہاں بہت سے مسائل میں اور خاص طور پر جمعہ قائم کرنے کے سلسلہ میں جماعت مسلمین کے فیصلہ کو حاکم وقت کے حکم کے قائم مقام گردانا گیا ہے۔ اس لئے مفتیانِ کرام نے یہ بھی فتوی دیا ہے کہ جن دیہاتوں میں جمعہ پڑھا جاتا ہے ان کو باقی رکھا جائے، کیونکہ اس کو موقوف کرنے میں فتنہ ہے۔ اور

ایسے ممالک میں ایسی کوئی بالائی طاقت نہیں جو فتنہ فرو کرے، پھر مسئلہ مجتہد فیہ ہے اس لئے ایسے دیہاتوں میں جمعہ قائم تو نہ کیا جائے لیکن جہاں پرانے زمانہ سے قائم ہے اس کو موقوف بھی نہ کیا جائے۔

[۲۴۵] بابُ ماجاء من كم يؤتى إلى الجمعة؟

[۵۱۰-] حدثنا عبدُ بنُ حُمَيْدٍ، ومحمدُ بنُ مَدُّوْيَةَ، قالا: حدثنا الفَضْلُ بن دُكَيْنٍ، نا إسرائيلُ، عن ثُوَيْرٍ، عن رَجُلٍ من أهلِ قُبَاءَ، عن أبيهِ، وكان مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قال: أَمَرَنَا النبيُّ صلى الله عليه وسلم أَنْ نَشْهَدَ الْجُمُعَةَ مِنْ قُبَاءَ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ لانَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ هٰذا الوجهِ، ولا يَصِحُّ في هذا البابِ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم شيئٌ.

وقد رُوِيَ عن أبي هريرةَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: "الجمعةُ عَلَى مَنْ آوَاهُ اللَّيْلُ إلى أَهْلِهِ" وهذا حديثٌ إسنادُه ضعيفٌ، إنّما يُرْوَى مِنْ حديثِ مُعَارِكِ بنِ عَبَّادٍ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ سعيدٍ المَقْبُرِيِّ، وضعَّفَ يحيىَ بنُ سعيدٍ القَطَّانُ: عبدَ اللّٰهِ بنَ سعيدٍ المَقْبُرِيَّ في الحديثِ.

واختَلَفَ أهلُ العلمِ على مَنْ تَجِبُ عَلَيْهِ الْجُمُعَةُ؟ فقال بعضُهُم: تَجِبُ الْجُمُعَةُ عَلَى مَنْ آوَاهُ اللَّيْلُ إلى مَنْزِلِهِ، وقال بعضُهم: لاتَجِبُ الْجمعةُ إلَّا على مَنْ سَمِعَ النداءَ، وهو قولُ الشافعيِّ، وأحمدَ، وإسحاق.

[۵۱۱-] سمعتُ أحمدَ بنَ الحسنِ يقولُ: كُنَّا عِندَ أحمدَ بنِ حَنْبَلٍ، فَذَكَرُوْا على مَنْ تَجِبُ الجمعةُ؟ فَلَمْ يَذْكُرْ أحمدُ فيه عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم شَيْئًا، قال أحمدُ بنُ الحسنِ: فَقُلْتُ لِأَحْمَدَ بنِ حَنْبَلٍ: فيه عن أبي هريرةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قال أحمدُ بنُ حنبلٍ: عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم؟ قلتُ: نعم حدثنا الحَجَّاجُ بنُ نُصَيْرٍ، نا مُعَارِكُ بنُ عَبَّادٍ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ سعيدٍ المَقْبُرِيِّ، عن أبيه، عن أبي هريرةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: "الجمعةُ على مَن آواهُ الليلُ إلى أهْلِهِ" فَغَضِبَ عَلَيَّ أحمدُ، وقال: استَغْفِرْ رَبَّكَ! اسْتَغْفِرْ رَبَّكَ! وإِنَّمَا فَعَلَ به أحمدُ بنُ حنبلٍ هذا: لِأنه لم يَعُدَّ هذا الحديثَ شيْئًا، وَضعَّفَهُ لِحَالِ إسنادِهِ.

ترجمہ: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کو ہم نہیں جانتے مگر اسی سند سے اور اس باب میں یعنی کتنی دور سے جمعہ پڑھنے کے لئے شہر آنا ضروری ہے؟ رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث ثابت نہیں۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''جمعہ اس شخص پر واجب ہے جس کو رات اس کے گھر میں ٹھکانہ دے'' اور

یہ ایسی حدیث ہے جس کی سند ضعیف ہے۔ یہ حدیث معارک بن عباد ہی کی سند سے مروی ہے، وہ عبداللہ بن سعید مقبری سے روایت کرتا ہے، اور یحییٰ قطان نے عبداللہ بن سعید مقبری کو حدیث میں ضعیف قرار دیا ہے۔

اور اہل علم نے اس شخص کے بارے میں جس پر جمعہ واجب ہے اختلاف کیا ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ جمعہ اس شخص پر واجب ہے جس کو رات اس کے گھر میں ٹھکانہ دے، اور بعض علماء کہتے ہیں: جمعہ واجب نہیں مگر اس پر جو اذان کی آواز سنے، اور یہ شافعی احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا قول ہے۔ پھر امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث (نمبر ۵۱۱) بیان کی ہے جس کا ترجمہ اوپر آ گیا۔

بابُ ماجاءَ فی وَقْتِ الْجُمُعَةِ

جمعہ کے وقت کا بیان

تمام ائمہ متفق ہیں کہ ظہر کی طرح جمعہ کا وقت بھی زوال کے بعد شروع ہوتا ہے۔ البتہ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: زوال سے پہلے بھی جس وقت عیدین پڑھی جاتی ہیں یعنی دس گیارہ بجے جمعہ پڑھ لیا جائے تو جائز ہے، لیکن افضل زوال کے بعد جمعہ پڑھنا ہے۔ باقی سب ائمہ کے نزدیک زوال کے بعد ہی جمعہ پڑھنا صحیح ہے۔ اگر زوال سے پہلے جمعہ پڑھ لیا گیا تو اس کا اعادہ ضروری ہے۔ جمہور کی دلیل باب کی حدیث ہے۔

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ جمعہ پڑھا کرتے تھے جس وقت سورج ڈھلتا ہے یعنی زوال کے بعد فوراً جمعہ پڑھتے تھے ——— مگر یہ حدیث فعلی ہے، اور فعلی حدیث سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کی دلیل وہ حدیث ہے جو آگے آئے گی۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم لوگ دوپہر کا کھانا اور قیلولہ جمعہ کے بعد کیا کرتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں دو کھانے تھے، ایک: دن میں گیارہ بجے، دوسرا: مغرب کے بعد کھایا جاتا تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحابہ جب صبح کا کھانا اور قیلولہ جمعہ کے بعد کرتے تھے تو یقیناً حضور اکرم ﷺ اس سے پہلے یعنی دس بجے کے قریب جمعہ پڑھتے ہونگے۔ معلوم ہوا کہ زوال سے پہلے بھی جمعہ جائز ہے۔ اسی طرح عبداللہ بن سیدان سُلمی کی ایک روایت ہے جس میں خلفائے راشدین کا زوال سے پہلے جمعہ پڑھنا مروی ہے اور وہ روایت مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔ مگر یہ حدیث محکم نہیں کیونکہ اس حدیث کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ جمعہ کے دن صحابہ دوپہر کا کھانا اور قیلولہ وقت پر نہیں کرتے تھے بلکہ جمعہ کی وجہ سے دونوں کو مؤخر کرتے تھے اس لئے کہ جمعہ کے لئے مسجد میں جلدی جانا صحابہ کا معمول تھا اور کھانا کھا کر جمعہ پڑھنے کے لئے جانے کی صورت میں طبیعت میں کسل پیدا ہوتا ہے، اس لئے صحابہ کھانے کو اور قیلولہ کو جمعہ کی وجہ سے مؤخر کرتے تھے۔ پس امام احمد رحمہ اللہ کی دلیل ناطق نہیں۔ اور عبداللہ بن سیدان

والی روایت کا جواب معارف السنن (۳۵۶:۴) میں ہے۔

اور جمہور کی مذکورہ دلیل فعلی حدیث ہے جس سے فی نفسہ وجوب ثابت نہیں ہوسکتا لیکن اگر اس کے ساتھ یہ بات ملائی جائے کہ جمعہ: ظہر کا قائم مقام ہے اور ظہر کا وقت زوال سے شروع ہوتا ہے، پھر اس کے قائم مقام کا وقت اس سے پہلے کیسے شروع ہوسکتا ہے؟ اور ساتھ میں یہ بات بھی پیش نظر رکھی جائے کہ نبی ﷺ سے زوال سے پہلے جمعہ پڑھنا کسی محکم دلیل سے ثابت نہیں تو جمہور کی بات بہت وزنی ہوجاتی ہے۔

فائدہ: علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ نے عمدۃ القاری میں پھر وہاں سے علامہ بنوری نے معارف السنن میں یہ بات نقل کی ہے کہ نبی ﷺ گرمیوں میں بھی اور سردیوں میں بھی زوال کے بعد فوراً جمعہ پڑھتے تھے۔ گرمیوں میں وقت ٹھنڈا کر کے جمعہ پڑھنا حضور اکرم ﷺ کا معمول نہیں تھا، پس بعض احناف جو زوال سے ایک دو گھنٹے کے بعد جمعہ پڑھتے ہیں یہ غلط طریقہ ہے، یہ آنحضور ﷺ کی سنت مستمرہ کی خلاف ورزی ہے، اس کو بدلنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ اصلاح کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

[٢٤٦] بابُ ماجاء في وقت الجمعة

[٥١٢-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا سُرَيْجُ بنُ النُّعْمَانِ، نا فُلَيْحُ بنُ سُلَيْمَانَ، عن عثمانَ بنِ عبدِ الرحمنِ التَّيمِيِّ، عن أنسِ بنِ مالكٍ، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كان يُصَلِّي الْجمعةَ حينَ تميلُ الشمسُ.

حدثنا يحيىَ بنُ موسى، نا أبو داودَ الطَّيَالِسِيُّ، نافُلَيْحُ بنُ سُلَيْمَانَ، عن عثمان بنِ عبدِ الرحمنِ التَّيمِيِّ، عن أنسٍ، نحوه.

وفي البابِ: عن سَلَمَةَ بنِ الأكْوَعِ، وجابرٍ، والزُّبَيْرِ بنِ العَوَّامِ.

قال أبو عيسى: حديثُ أنسٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ. وهو الذي أَجْمَعَ عليهِ أكثرُ أهلِ العلمِ: أنَّ وقتَ الجمعةِ إذا زالت الشمس كوقت الظهر، وهو قول الشافعي، وأحمد، وإسحاق، ورأى بعضُهم أن صلاةَ الجمعة إِذاصُلِّيَتْ قَبْلَ الزَّوَالِ: أنَّهَا تجوزُ أيْضًا، وقال أحمدُ: ومن صَلَّاها قبلَ الزوالِ، فإنهُ لَمْ يَرَ عليهِ إعادةً.

وضاحت: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت فلیح کے دو شاگردوں سریج اور ابوداؤد طیالسی کی سندوں سے مروی ہے اور کوقت الظہر میں جمہور کے استدلال کی طرف اشارہ ہے۔ اور بعض کا خیال یہ ہے کہ اگر جمعہ کی نماز زوال سے پہلے پڑھ لی جائے تو بھی درست ہے اور امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا: جو شخص زوال سے پہلے جمعہ پڑھ لے تو اس پر امام احمد کے نزدیک اعادہ نہیں۔

بابُ ماجاء فی الخطبة علی المنبر

ممبر پر خطبہ دینے کا بیان

تمام ائمہ متفق ہیں کہ ممبر پر خطبہ دینا سنت ہے۔ اگر ممبر نہ ہو تو نیچے کھڑے ہو کر خطبہ دینا بھی جائز ہے۔ مسجد نبوی میں پہلے آنحضور ﷺ نیچے کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے، اور ممبر سے مراد ہر اونچی چیز ہے جیسے کرسی، ٹیبل وغیرہ، کسی بھی اونچی چیز سے خطبہ دیا جائے تو سنت ادا ہو جائے گی اور مقصد سامعین تک آواز پہنچانا ہے۔ چونکہ جمعہ میں مجمع زیادہ ہوتا ہے اس لئے بلند جگہ سے خطبہ دیا جائے تو سب کو آواز پہنچے گی اور سب خطیب کو دیکھ بھی سکیں گے، مقرر کو دیکھنے سے اس کے اشاروں اور چہرے کے اتار چڑھاؤ کے ملاحظہ سے بھی بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

حدیث: ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھجور کے ایک تنے کے پاس کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے، پھر جب ممبر رکھا گیا تو وہ ستون بلکنے لگا۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اس کے پاس آئے اور اس کو اپنے بدن سے چپکایا، پس اس کا بلکنا بند ہوا۔

تشریح: مسجد نبوی کھجور کے ایک باغ میں بنائی گئی تھی۔ وہ باغ دو یتیموں کا تھا۔ آنحضور ﷺ نے وہ باغ خرید کر اس کے درخت کٹوا دیئے اور مسجد بنائی، اور کھجور کے درختوں کے تنے ستونوں کی جگہ لگائے۔ اور اس کے پتوں کا چھپر بنایا جو مسجد کی چھت بنا، آپؐ جب خطبہ دیتے تو کھجور کے ایک تنے سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے تھے، پھر جب مسجد میں ممبر رکھا گیا تو آپؐ خطبہ دینے کے لئے ممبر پر چڑھے تو وہ تنا بلند آواز سے رونے لگا، اور اس کے بلکنے کی آواز سب حاضرین نے سنی، آنحضرت ﷺ ممبر سے اترے اور تنے کے پاس تشریف لے گئے اور اس کو سینے سے چمٹایا تو اس نے رونا بند کیا، پھر وہ تنا اکھاڑ کر ممبر کے نیچے دفن کیا گیا۔ یہ آنحضور ﷺ کے معجزات کی روایتوں میں سے ایک روایت ہے۔

[۲٤۷] بابُ ماجاء فی الخطبة علی المنبر

[۵۱۳-] حدثنا أبو حَفصٍ عَمْرُو بنُ عليٍّ الفَلاَّسُ، نا عثمانُ بنُ عُمرَ، ويحيى بنُ كَثيرٍ، أبوغَسَّانَ العَنبَرِيُّ، قالا: حدثنا معاذُ بنُ العَلاَءِ، عن نافعٍ، عن ابن عُمَرَ، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كان يَخطُبُ إلى جِذْعٍ، فلما اتَّخذَ المنبرُ حَنَّ الجِذْعُ، حتى أتاهُ، فَالْتَزَمَهُ، فسَكَنَ.

وفي الباب: عن أنسٍ، وجابرٍ، وسهلِ بنِ سعدٍ، وأُبَيِّ بنِ كعبٍ، وابنِ عباسٍ، وأُمِّ سَلَمَةَ.

قال أبوعيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ غريبٌ؛ ومعاذُ بنُ العَلاءِ: هو بَصْرِيٌّ أخو أبي عَمرِو بنِ العَلاَءِ.

نوٹ: ابوعمرو بن العلاء: علم نحو کے مشہور امام اور سات قاریوں میں سے ہیں، معاذ ان کے بھائی ہیں۔

بابُ ماجاءَ فی الجُلُوْسِ بَیْنَ الْخُطْبَتَیْنِ

دوخطبوں کے درمیان بیٹھنے کا بیان

مذاہبِ فقہاء: امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب اور امام احمد رحمہ اللہ کی مشہور روایت یہ ہے کہ جمعہ کے دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا فرض ہے، اگر بیٹھا نہ گیا تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ یعنی ان دواماموں کے نزدیک نماز جمعہ کی صحت کے لئے دوخطبے شرط ہیں، ایک خطبہ سے نماز صحیح نہ ہوگی۔ اور امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک خطبوں کے درمیان بیٹھنا سنت ہے یعنی ان دواماموں کے نزدیک صحت جمعہ کے لئے صرف خطبہ شرط ہے، دوخطبے ضروری نہیں، ان کی دلیل سورۂ جمعہ کی آیت ۹ ہے، ارشاد پاک ہے: ﴿فَاسْعَوْا إِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ﴾ اس آیت میں صرف خطبہ کا ذکر ہے دو خطبوں کی کوئی قید نہیں۔ اور وہ حدیثیں جن میں آنحضور ﷺ کا دوخطبوں کے درمیان بیٹھنا مروی ہے وہ اخبار آحاد اور فعلی روایات ہیں اور خبر واحد خواہ کتنی ہی اعلی درجہ کی ہو اس سے قرآن پر زیادتی جائز نہیں نیز فعل سے وجوب بھی ثابت نہیں ہوسکتا۔ البتہ خبر واحد پر فی نفسہ عمل ضروری ہے۔ پس ﴿فَاسْعَوْا إِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ﴾ سے نفسِ خطبہ شرط قرار پائے گا۔ اور حدیث کی وجہ سے دوخطبے اور ان کے درمیان بیٹھنا سنت ثابت ہوگا۔

اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چونکہ اعلی درجہ کی خبر واحد سے قرآن پر زیادتی جائز ہے اس لئے چھوٹے دواماموں نے اپنے اصول کے مطابق قرآن پر زیادتی کی اور فرمایا کہ قرآن سے نفس خطبہ کا وجوب اور حدیث سے دوخطبوں کا اور ان کے درمیان بیٹھنے کا وجوب ثابت ہوا، پس دوخطبے نماز جمعہ کی صحت کے لئے شرط ہیں۔

جاننا چاہئے کہ امام مالک رحمہ اللہ بھی اعلی درجہ کی خبر واحد سے قرآن پر زیادتی جائز کہتے ہیں مگر یہاں انھوں نے اپنا اصول چھوڑ دیا ہے۔ اور حنفیہ کے ساتھ ہوگئے ہیں۔ غرض تین امام اپنے اصولوں پر ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ اپنے اصول سے ہٹ گئے ہیں۔

[۲٤۸] بابُ ماجاء فی الجلوس بین الخطبتین

[٥١٤-] حدثنا حُمیدُ بنُ مَسْعَدَةَ البَصْرِیُّ، نا خالِدُ بنُ الحارثِ، نا عُبَیْدُ اللّٰہِ بنُ عُمَرَ، عن نافعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، أنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم کان یَخْطُبُ یَوْمَ الجمعةِ، ثم یَجْلِسُ، ثم یَقُوْمُ فیَخْطُبُ، قال: مِثْلَ مَا یَفْعَلُوْنَ الیومَ.

وفی الباب: عن ابنِ عباسٍ، وجابرِ بنِ عبدِ اللّٰہِ، وجابرِ بنِ سَمُرَةَ.

قال أبو عیسی: حدیثُ ابنِ عُمَر حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ، وھو الذی رآہُ أھلُ العلمِ أنْ یَفصِلَ بَین الخُطْبَتَینِ بِجُلُوسٍ.

ترجمہ: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن خطبہ دیا کرتے تھے پھر بیٹھتے تھے، پھر کھڑے ہوتے تھے، پس خطبہ دیتے تھے، ابن عمرؓ نے فرمایا: جس طرح آج کے ائمہ کرتے ہیں ——— اور یہ وہ بات ہے جس کے علماء قائل ہیں یعنی خطبوں کے درمیان بیٹھ کر فصل کرے۔

بابُ ماجاءَ فی قِصَرِ الْخُطْبَةِ

مختصر خطبہ دینے کا بیان

حدیث: جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھا کرتا تھا پس آپؐ کی نماز بھی درمیانی تھی اور آپؐ کا خطبہ بھی درمیانی تھا۔

تشریح: مسلم شریف میں حدیث ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إنَّ طُوْلَ صَلاَةِ الرجلِ وقِصَرَ خُطْبَتِهِ مَئِنَّةٌ من فِقْهِهِ (۶: ۱۵۸ مصری) یعنی آدمی کی نماز کا لمبا ہونا اور اس کے خطبہ کا مختصر ہونا اس کے سمجھ دار ہونے کی علامت ہے۔ اس لئے کہ لمبی تقریر کرنا مشکل نہیں۔ اور تھوڑے وقت میں اور کم الفاظ میں مافی الضمیر ادا کرنا اور اس کو سمجھا دینا مشکل کام ہے۔

امریکہ کے صدر ابراہیم لنکن کا مشہور واقعہ ہے۔ یہ شخص غضب کا مقرر تھا۔ نامہ نگاروں نے اس سے پوچھا: اگر آپ کو ایک موضوع دیا جائے اور بولنے کے لئے دس منٹ دیئے جائیں تو آپ کتنے دن میں اس کی تیاری کرلیں گے؟ اس نے کہا: دو ہفتے میں۔ نامہ نگاروں نے کہا: اگر بیس منٹ وقت دیا جائے تو؟ اس نے کہا: ایک ہفتہ میں تیاری کرلونگا۔ نامہ نگاروں نے کہا: اگر تیس منٹ وقت دیا جائے تو؟ اس نے جواب دیا: اس کے لئے کسی تیاری کی ضرورت نہیں، آپ جب چاہیں ایسی تقریر مجھ سے کرالیں ——— اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ جب انھوں نے یزید کو جانشین بنانا چاہا تو ملک کے ارباب حل وعقد کو بلا کر دربار منعقد کیا اور ایک شخص کو موضوع پر تقریر کے لئے کہا۔ وہ مقرر دربار میں فوجی لباس میں آیا، اور اس نے تقریر کی: أیھا الناس! ھذا أمیر المؤمنین (اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا) وبعدَہ ھذا (اور یزید کی طرف اشارہ کیا) وإلا فھذا (اور اس نے تلوار سونتی) اور بیٹھ گیا۔ مجمع کو سانپ سونگھ گیا، سب کی زبانیں گنگ ہوگئیں اور اسی مجلس میں سب نے یزید کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس مقرر سے فرمایا: أنتَ أخطبُ العربِ: آپ عرب کے سب

سے بڑے مقرر ہیں۔ غرض مختصر وقت میں موضوع کا حق ادا کرنا مشکل ہوتا ہے، یہ کام سمجھ دار ہی کر سکتا ہے۔ آج کے ائمہ کا عمل الٹا ہے۔ ان کا خطبہ آدھے گھنٹہ کا ہوتا ہے پھر نماز سورۂ والتین اور سورۂ قدر سے پڑھا دیتے ہیں اور دعوی مصلحت کا کرتے ہیں، حالانکہ اگر لوگوں کی مصلحت کا اتنا ہی خیال ہے تو خطبہ مختصر دینا چاہئے اور نماز سنت کے مطابق پڑھانی چاہئے۔

فائدہ: جمعہ کا خطبہ محض ایک دینی تقریر اور بیان نہیں ہے بلکہ وہ ایک شعار بھی ہے، اور شعار میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، ورنہ شعار باقی نہیں رہے گا، جیسے قرآن واذان: جہاں ہدایت کی کتاب اور نماز کی دعوت ہیں اسلام کے شعائر بھی ہیں، پس جس طرح ان کی زبان نہیں بدلی جاسکتی خطبہ بھی غیر عربی میں دینا درست نہیں۔ یہ بات تعامل امت کے خلاف ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو پڑوسی ممالک فتح کئے تھے وہاں عربی نہیں بولی جاتی تھی، فارسی، رومی اور قبطی وغیرہ زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اور اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا، اس وقت ضرورت تھی کہ جمعہ کے خطبہ میں لوگوں سے ان کی زبان میں خطاب کیا جائے مگر صحابہ نے ایسا نہیں کیا —— اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح سرکاری زبان کے لئے نمود وظہور کے مواقع ضروری ہیں جن میں وہی سرکاری زبان استعمال کی جائے خواہ لوگوں کو اس کے سمجھنے میں کتنی ہی دشواری پیش آئے۔ اسی طرح اسلام کی سرکاری زبان عربی ہے اسی میں دین نازل ہوا ہے، اور اسی میں دین محفوظ ہے۔ اور اسلام کا بقاء عربی زبان کی بقاء کے ساتھ وابستہ ہے۔ پس اس کے نمود وظہور کے لئے بھی کچھ مواقع ضروری ہیں، جن میں وہ لوگوں کے سامنے آئے، اور لوگ اس سے واقف ہوں اور اس کو سیکھیں تاکہ اپنے مذہب کے اصل مصادر سے استفادہ کرسکیں۔ جمعہ کا خطبہ ایسا ہی عربی زبان کے نمود وظہور کا ایک موقعہ ہے اس کو کھونا نہیں چاہئے۔

مسئلہ: توارث وتعامل کے خلاف ہونے کی وجہ سے عربی کے علاوہ کسی بھی زبان میں خطبہ دینا مکروہ تحریمی ہے، البتہ اگر "ذکر اللہ" کا تحقق ہوجائے تو نماز جمعہ ہوجائے گی۔

[۲٤۹] بابُ ماجاء فی قِصَرِ الخطبةِ

[۵۱۵-] حدثنا قُتَيْبَةُ، وهَنَّادٌ، قالا: نا أبو الأحْوَصِ، عن سِمَاكِ بنِ حَرْبٍ، عن جابرِ بنِ سَمُرَةَ، قال: كُنْتُ أُصَلِّيْ مَعَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، فكَانَتْ صَلَاتُهُ قَصْدًا وَخُطْبَتُهُ قَصْدًا.

وفي الباب: عن عَمَّارِ بنِ يَاسِرٍ، وابنِ أبي أَوْفَى. قال أبو عيسى: حديثُ جابرِ بنِ سَمُرَةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

لغت: قِصَر: بروزن عِنَبٌ ہے اور قَصْدًا بمعنی متوسطاً ہے۔

بابُ ماجاء في القِرَاءَ ةِ عَلَى الْمِنبَرِ

خطبہ میں قرآن پڑھنے کا بیان

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خطبہ میں کم سے کم ایک آیت پڑھنا ضروری ہے، اگر قرآن کی ایک آیت نہ پڑھی گئی تو خطبہ صحیح نہ ہوگا اور نماز بھی صحیح نہ ہوگی۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک صحتِ خطبہ کے لئے چار باتیں ضروری ہیں: اول: اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا۔ دوم: رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنا، سوم: لوگوں کو تقوی کی وصیت کرنا، چہارم: کم از کم ایک آیت تلاوت کرنا۔ ان چار باتوں میں سے ایک بات بھی رہ گئی تو نماز صحیح نہ ہوگی۔ اور باقی ائمہ کے نزدیک خطبہ میں کم از کم ایک آیت تلاوت کرنا سنت ہے۔ خطبہ اس کے بغیر بھی صحیح ہے۔

حدیث: یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو ممبر پر وَنَادَوْا يَامَالِكُ پڑھتے سنا (یعنی کسی خطبہ میں آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی)

تشریح: یہ فعلی حدیث ہے، اس سے خطبہ میں قرآن پڑھنے کا اشتراط ثابت نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ سنت ہونا ثابت ہوتا ہے، اور خطبہ میں ایک آیت کی تلاوت سبھی فقہاء سنت مانتے ہیں۔

[٢٥٠] بابُ ماجاء في القراء ة على المنبر

[٥١٦-] حدثنا قُتَيبةُ، نا سُفيانُ بنُ عُيَينَةَ، عَنْ عَمرِو بنِ دِينَارٍ، عن عَطَاءٍ، عن صَفوانَ بنِ يَعْلَى بنِ أُمَيَّةَ، عن أبيهِ، قال: سمعتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم يَقْرَأُ على الْمِنْبَرِ ﴿ وَنَادَوْا يَامَالِكُ﴾

وفي الباب: عن أبي هريرةَ، وجَابِرِ بنِ سَمُرَةَ. قال أبو عيسى: حديثُ يَعْلَى بنِ أُمَيَّةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ غريبٌ، وهو حديثُ ابنِ عُيَينَةَ.

وقد اختَارَ قومٌ مِن أهلِ العلمِ أنْ يَقْرَأَ الإمَامُ في الخطبةِ آيًا مِنَ الْقُرآنِ.

قال الشافعيُّ: وإِذَا خَطَبَ الإمامُ فَلَمْ يَقْرَأْ في خُطْبَتِهِ شَيْئًا مِنَ الْقُرآنِ أَعَادَ الخُطْبَةَ.

ترجمہ: یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح غریب ہے اور یہ ابن عیینہ کی حدیث ہے یعنی ابن عیینہ مدار حدیث ہیں ان سے نیچے تو متعدد سندیں ہیں مگر ان سے اوپر یہی ایک سند ہے اور علماء کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے کہ امام خطبہ میں قرآن کی کوئی ایک آیت تلاوت کرے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر امام نے خطبہ دیا اور اپنے خطبہ میں قرآن کی کوئی آیت نہ پڑھی تو دوبارہ خطبہ دے (اور نماز کا بھی اعادہ کرے) اور ونادوا یامالك: سورۃ الزخرف کی آیت ۷۷ ہے۔

بابٌ فی اسْتِقْبَالِ الإِمَامِ إِذَا خَطَبَ

جب امام خطبہ دے تو لوگ اس کی طرف متوجہ رہیں

جب امام خطبہ دے تو لوگوں کو صفوں میں بیٹھے ہوئے امام کی طرف چہرہ پھیرنا چاہئے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ خطبہ دیتے تھے تو ہم چہروں سے حضور اکرم ﷺ کی طرف متوجہ ہوتے تھے، یعنی جس طرح وعظ کی مجلس میں لوگ مقرر کے قریب سمٹ کر بیٹھتے ہیں اس طرح صحابہ اکٹھا ہو کر نہیں بیٹھتے تھے بلکہ صف بنا کر بیٹھتے تھے، البتہ ہر شخص اپنی جگہ بیٹھے ہوئے چہرہ حضور اکرم ﷺ کی طرف پھیرتا تھا، اس لئے کہ مقرر کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اور اس کے ہاتھوں کے اشارے بھی بات سمجھنے میں معین ومددگار ہوتے ہیں۔ اس سے بات بخوبی اور آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔ اگر نیچے دیکھا جائے اور مقرر کو نہ دیکھا جائے تو بھی بات سمجھ میں آتی ہے مگر جتنی آنی چاہئے نہیں آتی۔ اسی طرح اگر مقرر آنکھ بند کر کے یا نیچے دیکھ کر تقریر کرے یا سبق پڑھائے تو بھی بات مؤثر نہیں ہوتی، اور دونوں یعنی مقرر اور سامعین ایک دوسرے کو دیکھیں تو نورٌ علی نور!

[۲۵۱] بابٌ فی استقبال الإمام إذا خطب

[۵۱۷-] حدثنا عَبَّادُ بنُ يَعْقُوْبَ الكُوْفِيُّ، نا محمدُ بنُ الفَضْلِ بنِ عَطِيَّةَ، عن مَنْصُوْرٍ، عن إبراهيمَ، عن عَلْقَمَةَ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ مَسْعُوْدٍ، قال: كان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم إذا اسْتَوَى عَلَى الْمِنْبَرِ اسْتَقْبَلْنَاهُ بِوُجُوْهِنَا.

وفي الباب: عن ابن عُمرَ؛ وحديثُ مَنْصُوْرٍ لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ حَدِيْثِ محمدِ بنِ الفَضْلِ بنِ عَطِيَّةَ؛ ومحمدُ بنُ الفَضْلِ بنِ عَطِيَّةَ ضَعِيفٌ ذاهِبُ الحديثِ عند أصحابِنا.

والعَمَلُ على هذا عندَ أهلِ العلمِ من أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغَيرِهم يَسْتَحِبُّوْنَ اسْتِقْبَالَ الإِمَامِ إِذَا خَطَبَ، وهو قولُ سفيانَ الثوريِّ، والشافعيِّ، وأحمدَ وإسحاقَ.

قال أبو عيسى: ولا يَصِحُّ في هذا البابِ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم شَيْءٌ.

ترجمہ: ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ جب ممبر پر تشریف فرما ہوتے تھے تو ہم آپؐ کی طرف اپنے چہروں سے متوجہ ہو جاتے تھے (یہ دیکھنا برکت کے لئے تھا، اور جب خطبہ شروع ہوتا تھا تو دیکھنے میں وہ مصلحت بھی ہوتی تھی جو اوپر مذکور ہوئی، کسی نیک آدمی کو دیکھنا برکت کا باعث ہے، اور آنحضور ﷺ نیک لوگوں کے سردار تھے، پس رخ انور کو دیکھنا برکت کے علاوہ ایمان کی زیادتی کا سبب بھی تھا) —— منصور کی حدیث کو ہم نہیں

جانتے، مگر محمد بن فضل بن عطیہ کی سند سے (یعنی محمد بن فضل سے آخر تک یہی ایک سند ہے) اور محمد بن فضل ہمارے اکابر کے نزدیک ضعیف ہے اس کو اپنی حدیثیں یاد نہیں تھیں۔ ذاہب الحدیث کا یہی مفہوم ہے اور اس حدیث پر صحابہ اور ان کے علاوہ علماء کا عمل ہے (معلوم ہوا کہ اگر باب میں کوئی صحیح حدیث نہ ہو تو ضعیف حدیث پر بھی عمل ہوگا) وہ پسند کرتے ہیں امام کی طرف متوجہ ہونے کو جب وہ خطبہ دے، اور یہ سفیان ثوری، شافعی، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس باب میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی صحیح حدیث مروی نہیں۔

بابٌ فی الرکعتین إذا جاء الرجل والإمام یخطب

خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم

مذاہب فقہاء: امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں: جو شخص دورانِ خطبہ آئے اس کے لئے مستحب یہ ہے کہ تحیۃ المسجد پڑھے، اور مختصر پڑھے، پھر خطبہ سنے۔ اور امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک اس وقت تحیۃ المسجد نہیں پڑھنی چاہئے، خطبہ سننا ضروری ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اس مسئلہ میں مختلف روایتیں ہیں۔ ایک طرف حضرت ابن عمرؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ نہ نماز پڑھے اور نہ بات چیت کرے یہاں تک کہ امام فارغ ہو جائے''(۱) دوسری طرف سُلیک غَطفانی کا واقعہ ہے۔ وہ ایک مرتبہ پراگندہ اور بوسیدہ حالت میں مسجد میں داخل ہوئے جبکہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دینے کے لئے ممبر پر تشریف لا چکے تھے مگر ابھی خطبہ شروع نہیں کیا تھا، وہ آکر بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''کیا تم نے تحیۃ المسجد پڑھی؟'' انھوں نے نفی میں جواب دیا، آپؐ نے فرمایا: ''اٹھو اور تحیۃ المسجد پڑھو'' سنن دار قطنی (۲:۱۵) میں ہے کہ جب تک وہ نماز پڑھتے رہے آنحضرت ﷺ خطبہ سے رکے رہے(۲) جب وہ نماز پڑھ چکے تو آپؐ نے خطبہ شروع کیا اور خطبہ میں غریبوں پر خیرات کرنے کی ترغیب دی، لوگوں نے خوب صدقہ دیا اور ممبر رسول کے قریب صدقہ کے مال کا ڈھیر لگ گیا۔

(۱) یہ حدیث مجمع الزوائد (۲:۱۸۴) میں ہے اور ایوب بن نہیک کی وجہ سے ضعیف ہے۔ مگر مؤید بالقرائن ہے۔ خود ابن عمر کا مسلک اس کے مطابق تھا (مصنف ابن ابی شیبہ ۲:۱۲۴) اور حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور جمہور سلف: صحابہ وتابعین کا مسلک بھی یہی تھا کہ وہ خروج امام کے بعد صلاۃ وکلام کو جائز نہیں سمجھتے تھے (شرح مسلم للنووی ۶:۱۶۴ مصری) غرض مؤید بالتعامل ہونے کی وجہ سے یہ حدیث قابل استدلال ہے۔

(۲) یہ حدیث مرسل ہے یا موصول؟ معتمر کے تلامذہ میں اختلاف ہے۔ عبید بن محمد العبدی اس کو موصول بیان کرتے ہیں اور امام احمد وغیرہ مرسل، تفصیل دار قطنی (۲:۱۵) میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس میں سے سُلیک غطفانی کو ایک جوڑا دیا اور باقی کپڑے دوسرے غرباء کے لئے رکھ لئے۔

اسی واقعہ کو کسی نے قولی حدیث سے بدلا، بدلنے والا کون ہے یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی، غالباً حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے اس کو قولی حدیث بنایا ہے، جیسے پہلے یہ واقعہ آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور شیخین رضی اللہ عنہما ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے تھے، اور وہاں کھجور اور بکری کا گوشت کھایا تھا۔ پھر جب ظہر کا وقت آیا تو سب نے وضو کی اور نماز پڑھی۔ نماز کے بعد یہ حضرات وہیں رکے رہے۔ بات چیت ہوتی رہی، عصر سے پہلے علالۃ الشاۃ (کلیجی گردہ وغیرہ) لایا گیا، سب نے اس کو تناول فرمایا، پھر نئے وضو کئے بغیر عصر کی نماز پڑھی۔ اس واقعہ کے راوی حضرت جابر رضی اللہ عنہ ہیں اور آپؓ ہی نے اس کو قولی حدیث بنایا ہے فرماتے ہیں: کان آخِرُ الأمرَین من رسول اللہ صلی اللہ عیہ وسلم ترکَ الوضوءِ مما غیرت النار (ابوداؤد حدیث ۱۹۲ قال أبوداود: ھذا اختصار من الحدیث الأول) اسی طرح اس حدیث کو بھی غالباً حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے قولی حدیث بنایا ہے، وہ قولی حدیث یہ ہے: إذا جاء أحدُکم یومَ الجمعۃ والإمامُ یخطب فَلْیَرْکَعْ رکعتین۔ اس حدیث میں جو جملہ ہے: والإمام یخطب اس میں اضطراب ہے، حدیث کے صحیح الفاظ یہ ہیں: إذا جاء أحدکم یومَ الجمعۃ وقد خرج الإمام فلیُصل رکعتین اور امام کے ممبر پر آجانے کے بعد خطبہ شروع ہونے سے پہلے نماز جائز ہے اور احناف جو امام کے نکلنے کے بعد صلاۃ وکلام کو منع کرتے ہیں وہ محض احتیاط کی بات ہے۔ نماز اور کلام کی ممانعت درحقیقت دورانِ خطبہ ہے۔ اور یہ دوسری روایت مسلم شریف (۶: ۱۶۳ مصری) میں ہے جو عمرو بن دینار سے مروی ہے۔ اور عمرو: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے مضبوط راوی ہیں۔ اور والإمام یخطُب: ابوسفیان طلحہ کے الفاظ ہیں انھوں نے حضرت جابرؓ سے صرف چار حدیثیں سنی ہیں۔ اور چاروں بخاری میں ہیں، یہ روایت ان میں نہیں ہے [1]۔ اور ابن عیینہ اور شعبہ رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ باقی روایتیں ابوسفیان: صحیفۂ جابر سے روایت کرتے ہیں (جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے کسی گمنام شاگرد کا مرتب کیا ہوا صحیفہ ہے) (تہذیب ۵: ۲۷) اور بخاری (حدیث ۱۱۶۶) میں عمرو بن دینار کی روایت کے الفاظ ہیں: والإمام یخطب أو قد خَرَجَ شک راوی کے ساتھ ہے پس جو متفق علیہ الفاظ ہیں وہی محفوظ ہیں، چنانچہ ابوالزبیر نے بھی یہ حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، ان کا بیان ہے کہ جب سلیک غطفانی مسجد میں آئے تو آنحضور ﷺ ممبر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ خطبہ شروع نہیں کیا تھا، یہ حدیث مسلم (۶: ۱۶۳) میں ہے، یہ شاہد ہے کہ اصل الفاظ وقد خرج الإمام ہیں۔

علاوہ ازیں نصف درجن واقعات مروی ہیں کہ دورانِ خطبہ لوگ آئے ہیں اور آپؐ نے کسی سے نماز نہیں

(۱) ابوسفیان نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے جو چار حدیثیں سنی ہیں وہ بخاری میں کتاب مناقب الانصار (حدیث ۳۸۰۳) کتاب التفسیر (حدیث ۴۸۹۹) اور دو حدیثیں کتاب الاشربۃ (حدیث ۵۶۰۵ و ۵۶۰۶) میں ہیں ۱۲

پڑھوائی، مثلاً ابو داؤد (۱۵۶:۱) میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کے روز جب رسول اللہ ﷺ ممبر پر تشریف فرما تھے: وہ آئے، آپؐ نے لوگوں کو بیٹھ جانے کا حکم دیا، اس وقت ابن مسعودؓ مسجد نبوی کے دروازہ پر تھے وہ وہیں بیٹھ گئے، آپؐ نے فرمایا: ''ابن مسعود! تم آگے آجاؤ'' لیکن آپؐ نے ان کو نماز کا حکم نہیں دیا، اسی طرح ایک شخص لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا آرہا تھا۔ آنحضور ﷺ نے اس کو بیٹھ جانے کا حکم دیا اور فرمایا کہ تیرا یہ عمل لوگوں کو تکلیف میں ڈال رہا ہے، مگر آپؐ نے اس کو بھی نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا (نسائی ۱:۲۰۷) اسی طرح استسقاء کی حدیث میں ہے کہ ایک اعرابی قحط سالی کی شکایت لے کر آیا، پھر ایک ہفتہ کے بعد دوبارہ سیلاب کی شکایت لے کر آیا۔ دونوں واقعات میں وہ خطبہ کے دوران داخل ہوا تھا مگر آپؐ نے اس کو نماز کا حکم نہیں دیا (یہ حدیث بخاری ابواب الاستسقاء میں ہے) اور خلافتِ فاروقی کا یہ واقعہ تو ابھی گذرا کہ خطبہ کے دوران حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ آئے اور نہ انھوں نے تحیۃ المسجد پڑھی اور نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پڑھوائی۔ یہ تمام واقعات اس پر دلالت کرتے ہیں کہ خطبہ کے دوران نماز کا حکم نہیں، اور جہاں تک حدیثِ باب کا تعلق ہے اگر اس کو تمام طرق سے دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا مقصد سلیک غطفانی کی پراگندہ اور بوسیدہ حالت حاضرین کو دکھلانا مقصود تھا، تحیۃ المسجد مقصود نہیں تھی، نیز جب انھوں نے نفلیں پڑھیں تو رسول اللہ ﷺ ممبر پر بیٹھے ہوئے تھے، ابھی خطبہ شروع نہیں کیا تھا جیسا کہ مسلم شریف میں صراحت ہے، اور ان کے نماز ختم کرنے تک آپؐ خطبہ سے رُکے رہے جیسا کہ دارقطنی میں مذکور ہے۔ اس لئے اس واقعہ سے اور اس کے اختصار سے چھوٹے دو اماموں کا استدلال محلِ نظر ہے۔

[۲۵۲] بابٌ في الركعتين إذا جاء الرجل والإمام يخطب

[۵۱۸-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا حَمَّادُ بنُ زَيْدٍ، عن عَمْرِو بنِ دِيْنَارٍ، عن جابرِ بنِ عبدِ اللهِ، قال: بَيْنَمَا النبيُّ صلى الله عليه وسلم يَخْطُبُ يَوْمَ الجمعةِ، إِذْ جاءَ رجلٌ، فقال النبيُّ صلى الله عليه وسلم: "أَصَلَّيْتَ؟" قال لا: قال: "فَقُمْ فَارْكَعْ"

قال أبو عيسى: وهذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[۵۱۹-] حدثنا محمدُ بنُ أبي عُمرَ، نا سُفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ، عن محمدِ بنِ عَجْلاَنَ، عن عِياضِ بنِ عبدِ اللهِ بنِ أبي سَرْحٍ: أَنَّ أَبَا سعيدِ الخُدْرِيَّ دَخَلَ يومَ الجمعةِ ومَرْوَانُ يَخْطُبُ، فقام يُصَلِّيْ، فَجَاءَ الحَرَسُ لِيُجْلِسُوْهُ، فَأَبَى حتى صَلَّى، فَلَمَّا انْصَرَفَ أَتَيْنَاهُ فقلنا: رَحِمَكَ اللهُ إِنْ كَادُوْا لَيَقَعُوْا بك فقال: ما كُنْتُ لِأَتْرُكَهُمَا بعدَ شيءٍ رَأَيْتُهُ مِنْ رسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم، ثم ذَكَرَ أَنَّ رجلاً جاءَ

يومَ الجمعةِ فی هَيْئَةٍ بَذَّةٍ، والنبیُّ صلی الله عليه وسلم يَخطُبُ يومَ الجمعةِ، فَأَمَرَهُ فَصَلَّی رکعَتَيْنِ، والنبیُّ صلی الله عليه وسلم يَخطُبُ.

قال ابنُ أبی عُمَرَ: كان ابنُ عُيَيْنَةَ يُصَلِّیْ رکعَتَيْنِ إذَا جاءَ والإمَامُ يَخطُبُ، ويَأْمُرُ بهِ؛ وكان أبوعبدِ الرحمنِ المُقْرِئُ يَرَاهُ.

قال أبو عيسى: وسمِعتُ ابنَ أبی عُمَرَ يقولُ: قال ابنُ عُيَيْنَةَ: كان محمدُ بنُ عَجْلانَ ثِقَةً مأموناً فی الحديثِ.

وفی الباب: عن جابرٍ، وأبی هريرةَ، وسهلِ بنِ سعدٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ أبی سعيدٍ الخدریِّ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، والعَمَلُ علی هذا عندَ بعضِ أهلِ العلمِ، وبه يقولُ الشافعیُّ وأحمدُ وإسحاقُ.

وقال بعضُهم: إذا دَخَلَ والإِمَامُ يَخْطُبُ، فَإِنَّهُ يَجْلِسُ وَلاَ يُصَلِّیْ، وهو قولُ سفيانَ الثوریِّ، وأهلِ الكوفةِ،والقولُ الأوّلُ أصَحُّ.

حدثنا قُتَيْبَةُ، نا العَلاَءُ بنُ خالدٍ القُرَشِیُّ، قال: رَأَيْتُ الحسنَ البَصْرِیَّ دَخَلَ المسجدَ يومَ الجُمُعَةِ، والإِمَامُ يَخْطُبُ، فَصَلّٰی رکعَتَيْنِ، ثم جَلَسَ.

إنَّمَا فَعَلَ الحسنُ اتِّبَاعًاللحديثِ،وهُوَ رَوَی عن جابرٍ، عن النبیِّ صلی الله عليه وسلم هذا الحديثَ.

ترجمہ وضاحت: جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: دریں اثنا کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے (ای أراد أن يخطب یعنی خطبہ دینے کے لئے تشریف لائے تھے۔اور یہ تاویل اس لئے ضروری ہے کہ مسلم میں اسی روایت میں وهو قاعدٌ على المنبر ہے۔جس کی کوئی تاویل ممکن نہیں، پس روایتوں کے درمیان تطبیق دینے کے لئے یہاں تاویل ضروری ہے) کہ اچانک ایک شخص آیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''کیا تو نے نماز پڑھی؟'' اس نے کہا نہیں۔آپ نے فرمایا: ''کھڑے ہوؤ اور نماز (تحیۃ المسجد) پڑھو'' یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(حدیث ۵۱۹) عیاض کہتے ہیں: ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن مسجد میں داخل ہوئے جبکہ مروان خطبہ دے رہا تھا، پس انھوں نے نماز پڑھنی شروع کی، پس چوکیدار آئے تا کہ وہ ابوسعید خدریؓ کو بٹھائیں، پس انھوں نے بیٹھنے سے انکار کیا (یعنی نماز پڑھتے رہے) یہاں تک کہ نماز پڑھ لی، پھر جب وہ (نماز کے بعد گھر) واپس لوٹے تو ہم ان کے پاس گئے اور ہم نے کہا: اللہ آپ پر رحم فرمائیں قریب تھے چوکیدار کہ آپ کی توہین کر دیں (یعنی وہ صرف زبانی بیٹھنے کے لئے کہہ رہے تھے مگر قریب تھا کہ وہ ہاتھ پکڑ کر زبردستی بٹھا دیں) پس ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے

فرمایا: نہیں تھا میں کہ ان رکعتوں کو چھوڑتا ایک چیز کے بعد جس کو میں نے رسول اللہ ﷺ سے دیکھا ہے، پھر انھوں نے یہ واقعہ ذکر کیا کہ ایک شخص جمعہ کے دن بوسیدہ حالت میں آیا، جبکہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن خطبہ دے رہے تھے (یعنی خطبہ دینے کے ارادہ سے ممبر پر تشریف فرما تھے) پس آپؐ نے اس کو حکم دیا، پس اس نے دو رکعتیں پڑھیں درانحالیکہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے (یعنی خطبہ دینے کے ارادے سے ممبر پر تشریف فرما تھے) (اس حدیث کی صاف دلالت اس پر ہے کہ اس زمانہ میں دورانِ خطبہ تحیۃ المسجد پڑھنے کا رواج نہیں تھا۔ اگر یہ بات عام ہوتی تو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے عمل کو انوکھا عمل تصور نہ کیا جاتا اور نہ چوکیدار آپؓ کو بٹھانے کی کوشش کرتے) امام ترمذی رحمہ اللہ کے استاذ ابن ابی عمر کہتے ہیں: ابن عیینہ (اس حدیث کے ایک راوی) دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے جبکہ وہ مسجد میں آتے تھے درانحالیکہ امام خطبہ دے رہا ہو۔ اور وہ اس کا حکم (بھی) دیا کرتے تھے، یعنی لوگوں کو مسئلہ بتایا کرتے تھے کہ جو دورانِ خطبہ آئے وہ تحیۃ المسجد پڑھے، اور ابو عبد الرحمٰن المقری (امام بخاری رحمہ اللہ کے جلیل القدر استاذ) بھی یہی بات دیکھتے تھے (یعنی ان کا بھی یہی مسلک تھا)

اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے محمد بن عجلان (حدیث مذکور کے ایک راوی) کی توثیق نقل کی ہے کہ ابن عیینہ فرماتے ہیں: محمد بن عجلان ثقہ ہیں، حدیث میں قابل اعتماد ہیں (اختلاف حدیث کی صحت وعدم صحت میں نہیں ہے، حدیث کی صحت تو سب محدثین تسلیم کرتے ہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ حدیث کے اصل الفاظ: والإمام يخطب ہیں یا قد خوج الإمام ہیں۔ چھوٹے دو امام کہتے ہیں: پہلے لفظ اصل ہیں، اور بڑے دو امام کہتے ہیں: اصل الفاظ وقد خرج الإمام ہیں۔ چنانچہ بخاری اور مسلم دونوں نے حدیث ان الفاظ سے روایت کی ہے اور والإمام یخطب مجاز ہے یعنی أراد أن يخطب) ـــــ اس حدیث پر بعض علماء کا عمل ہے، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔ اور بعض کہتے ہیں: جب آدمی مسجد میں آئے درانحالیکہ امام خطبہ دے رہا ہو تو وہ بیٹھ جائے اور نماز نہ پڑھے، اور یہ سفیان ثوری اور کوفہ والوں کا قول ہے۔ اور پہلا قول اصح ہے (کیونکہ قلم امام ترمذی رحمہ اللہ کے ہاتھ میں ہے جو چاہیں لکھ دیں ہمیں ذرا قلم دیں پھر دیکھیں: ہم کیا لکھتے ہیں!)

علاء کہتے ہیں: میں نے حسن بصری رحمہ اللہ کو دیکھا وہ جمعہ کے دن مسجد میں آئے درانحالیکہ امام خطبہ دے رہا تھا، پس انھوں نے دو رکعتیں پڑھیں، پھر بیٹھے (یعنی دروانِ خطبہ تحیۃ المسجد پڑھی) حسن بصری نے حدیث کی اتباع میں ایسا کیا، اور وہ بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث روایت کرتے ہیں (جاننا چاہئے کہ دو چار حضرات صحابہ وتابعین میں سے دورانِ خطبہ بھی تحیۃ المسجد پڑھا کرتے تھے مگر جمہور صحابہ وتابعین جن میں حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم بھی ہیں دورانِ خطبہ نہ تحیۃ المسجد پڑھتے تھے اور نہ صلاۃ وکلام کو جائز سمجھتے تھے یہ بات علامہ نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم (۶: ۱۶۴) میں لکھی ہے)

بابُ ماجاء فی کراهیة الکلام والإمامُ یخطب

دورانِ خطبہ بات چیت ممنوع ہے

خطبہ سے پہلے یعنی جب امام ممبر پر آ کر بیٹھ جائے اور ابھی خطبہ شروع نہ کیا ہو، اس وقت اور خطبہ پورا ہونے کے بعد نماز شروع کرنے سے پہلے بات چیت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ عدم جواز کے قائل ہیں اور صاحبین وغیرہ جائز کہتے ہیں اور دورانِ خطبہ سب متفق ہیں کہ بات چیت جائز نہیں۔ خطبہ سننا ضروری ہے، صرف امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دورانِ خطبہ بھی کلام جائز ہے، امام کسی کو ہدایت دے، یا کوئی مقتدی امام سے کوئی بات کرے یا لوگ باہم گفتگو کریں یہ سب صورتیں جائز ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام (۱:۲۳۳) میں یہ مسئلہ تحریر کیا ہے اور دلائل میں وہ حدیثیں پیش کی ہیں جن میں نبی ﷺ نے کسی مقتدی کو کوئی ہدایت دی ہے، یا کسی مقتدی نے آپؐ سے کچھ عرض کیا ہے، حالانکہ امام کا کسی مقتدی سے کچھ کہنا، یا مقتدی کا امام سے کچھ عرض کرنا سب ائمہ کے نزدیک جائز ہے، کیونکہ ان صورتوں میں ممانعت کی علت یعنی شور وشغب نہیں ہوتا، شور وشغب باہم گفتگو کرنے میں ہوتا ہے۔ پس وہی صورت ممنوع ہے۔

غرض امام شافعی رحمہ اللہ نے جو دلائل پیش کئے ہیں، وہ ان صورتوں سے متعلق ہیں جو محث سے خارج ہیں۔ اور قبل الخطبہ اور بعد الخطبہ باہم گفتگو کرنے کے سلسلہ میں امام اعظم رحمہ اللہ نے جو موقف اختیار کیا ہے وہی قرین مصلحت ہے۔ اس لئے کہ اگر لوگوں کو بات چیت کرنے کی اجازت دی جائے گی تو دورانِ خطبہ اور نماز شروع ہونے کے بعد تک باتیں ہوتی رہیں گی، باتوں کا سلسلہ بند ہی نہیں ہوگا، جیسا کہ تجربہ سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے۔

[۲۵۳] باب ماجاء فی کراهیة الکلام والإمام یخطب

[۵۲۰-] حدثنا قُتَیْبَةُ، نا اللَّیْثُ بنُ سَعْدٍ، عن عُقَیْلٍ، عن الزُّهْرِیِّ، عن سعیدِ بنِ المُسَیَّبِ، عن ابی هریرةَ، أنَّ رسولَ اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال: "مَنْ قَالَ یَوْمَ الْجُمعةِ وَالإِمَامُ یَخْطُبُ: أَنْصِتْ فقد لَغَا"

وفی الباب: عن ابنِ أَبی أَوْفی، وجابرِ بنِ عبدِ اللہِ. قال ابو عیسی: حدیثُ ابی هریرةَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

والعملُ علیه عندَ أهلِ العلمِ: کَرِهُوْا للرجُلِ أَنْ یَّتَکَلَّمَ والإمامُ یَخْطُبُ، فقالوا: إِنْ تکلَّمَ غَیْرُهُ فَلاَ یُنْکِرُ عَلَیْهِ إِلاَّ بِالإِشَارَةِ.

واختلَفُوْا فی رَدِّ السَّلَامِ وتَشْمِیْتِ العَاطِسِ: فَرَخَّصَ بعضُ أهلِ العلمِ فی رَدِّ السلامِ وتَشْمِیْتِ العَاطِسِ والإِمَامُ یَخطُبُ، وھو قولُ أحمدَ، وإسحاق، وکَرِہَ بعضُ أھلِ العلمِ مِن التابعینَ وغیرِھم ذلك، وھو قولُ الشافعیِّ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے جمعہ کے دن کہا درانحالیکہ امام خطبہ دے رہا ہے: ''چپ'' تو اس نے لغو کام کیا (یہ صغری ہے۔ اور کبری ہے: ومن لغا فلا جمعة له: جس نے لغو کام کیا اس کا جمعہ کا ثواب گیا) اور علماء یہ بات مکروہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کلام کرے درانحالیکہ امام خطبہ دے رہا ہو۔ پس انھوں نے کہا: اگر کوئی شخص بات کر رہا ہو تو اس کو منع نہ کرے مگر اشارہ سے۔ اور علماء نے سلام کے جواب میں اور چھینکنے والے کے جواب میں اختلاف کیا ہے: بعض علماء دورانِ خطبہ سلام کا جواب اور چھینکنے والے کو جواب دینے کی اجازت دیتے ہیں۔ اور یہ امام احمد اور امام اسحاق رحمہما اللہ کا قول ہے (امام ابو یوسف رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں، اور امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خطبہ کے بعد جواب دے) اور تابعین اور ان کے علاوہ علماء میں سے بعض اس کو مکروہ کہتے ہیں اور یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ (مگر ابن العربی، عراقی اور نووی رحمہم اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک وہ بیان کیا ہے جو امام احمد رحمہ اللہ کا ہے یعنی دورانِ خطبہ سلام کا جواب دینا اور یرحمک اللہ کہنا جائز ہے)

بابٌ فی کَرَاھِیَةِ التَّخَطِّی یومَ الجُمُعَةِ

جمعہ کے دن گردنیں پھاندنا مکروہ ہے

ہر بڑے مجمع میں خواہ وہ سبق ہو یا وعظ کی مجلس ہو یا جمعہ کا مجمع ہو، پروگرام اور خطبہ شروع ہونے سے پہلے دو صورتوں میں آگے بڑھنے کی اجازت ہے: ایک: لوگوں نے آگے جگہ خالی چھوڑ دی ہو تو اس کو بھرنے کے لئے آگے بڑھ سکتے ہیں، دوسرے: کسی کو تکلیف پہنچائے بغیر آگے بڑھنا جائز ہے۔ اور پروگرام اور خطبہ شروع ہونے کے بعد مطلقاً آگے بڑھنے کی اجازت نہیں، نسائی (۱:۲۰۷) میں حدیث ہے کہ ایک شخص جمعہ کے دن آگے بڑھ رہا تھا اور آنحضور ﷺ خطبہ دے رہے تھے، آپؐ نے فرمایا: اجلس فقد آذیتَ الناسَ: لوگوں کو کیوں پریشان کر رہا ہے بیٹھ جا! معلوم ہوا کہ اگر آگے تھوڑی بہت جگہ بھی ہو مگر پروگرام شروع ہو چکا ہو تو آگے بڑھنا جائز نہیں، کیونکہ اس صورت میں لوگوں کی توجہ بٹے گی۔ اور یہ حرکت جہلاء بہت کرتے ہیں جس سے آپس میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، بلکہ جھگڑے کی نوبت آتی ہے۔ پس ہر مجمع میں اس سے احتراز ضروری ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھاندتا ہے (یوم الجمعة کی قید

اتفاقی ہے، چونکہ جامع مسجد میں جمعہ کے دن بڑا مجمع ہوتا ہے اس لئے یہ قید لگائی ہے ورنہ ہر بڑے مجمع کے لئے یہی حکم ہے) وہ جہنم کی طرف پل بنایا جائے گا (یعنی اس کو لٹایا جائے گا اور جہنمی اس پر سے گذر کر جہنم میں جائیں گے) ——— اور اگر معروف پڑھیں تو ترجمہ ہوگا: وہ جہنم کی طرف پل بنائے گا یعنی گردنیں پھلانگ کر آگے بڑھنا جہنم میں جانے کا سبب ہے۔

تشریح: یہ حدیث نہایت ضعیف ہے کیونکہ اس میں مسلسل تین راوی: رشدین بن سعد، زبان بن فائد، اور سہل بن معاذ ضعیف ہیں، مگر اس حدیث کے ضعف سے مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا کیونکہ مسئلۂ باب میں دیگر صحیح روایات موجود ہیں۔

[۲۵۴] باب ماجاء فی کراهیة التَّخَطِّیْ یومَ الجمعة

[۵۲۱-] حدثنا أبو کُرَیْبٍ، نا رِشْدِیْنُ بنُ سَعْدٍ، عن زَبَّانَ بنِ فائِدٍ، عن سَهْلِ بنِ مُعَاذِ بنِ أنسٍ الجُهَنِیِّ، عن أبیهِ، قال: قال رسولُ الله صلی الله علیه وسلم: "مَنْ تَخَطّی رِقَابَ النَّاسِ یومَ الْجُمُعَةِ اتُّخِذَ جِسْرًا إلی جَهَنَّمَ"

وفی الباب: عن جابرٍ، قال أبو عیسی: حدیثُ سَهْلِ بنِ مُعَاذِ بنِ أنسٍ الجُهَنِیِّ حدیثٌ غریبٌ لانَعرِفُهُ إلاَّ مِنْ حدیثِ رِشْدِیْنَ بنِ سَعْدٍ.

والعملُ علیهِ عندَ أهلِ العلمِ: کَرِهُوْا أنْ یَتَخَطّی الرجلُ یومَ الجُمُعَةِ رِقَابَ النَّاسِ، وشَدَّدُوْا فی ذلك.

وقد تکلَّم بعضُ أهلِ العلمِ فی رِشْدِیْنَ بنِ سَعْدٍ، وضَعَّفَهُ مِنْ قِبَلِ حِفْظِهِ.

ترجمہ: سہل بن معاذ کی حدیث غریب ہے، ہم اس کو نہیں جانتے مگر رشدین بن سعد کی سند سے یعنی رشدین سے اوپر حدیث کی یہی ایک سند ہے، اور اس حدیث پر علماء کا عمل ہے۔ جمعہ کے دن لوگوں کی گردنیں پھلانگنے کو وہ مکروہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں وہ سختی برتتے ہیں (یعنی مکروہ تحریمی قرار دیتے ہیں) اور بعض علماء نے رشدین بن سعد میں کلام کیا ہے اور اس کی حافظہ کی وجہ سے تضعیف کی ہے۔

بابُ ماجاء فی کَرَاهِیَةِ الإحْتِبَاءِ والإمَامُ یَخْطُبُ

خطبہ کے دوران حَبْوہ بنانا مکروہ ہے

احتباء کہتے ہیں: سرین کے بل بیٹھ کر، گھٹنے کھڑے کرکے، ان کے گرد سہارا لینے کے لئے دونوں ہاتھ باندھ لینا یا کمر اور گھٹنوں کے گرد کپڑا باندھ لینا، یہ ایک طرح کی آرام کرسی ہے۔ حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ معاذ بن انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کے دن دورانِ خطبہ حبوۃ بنانے سے منع کیا۔ اور ممانعت کی وجہ

یہ ہے کہ یہ کیفیت جالبِ نوم (نیند کھینچنے والی) ہے پس ہر وہ ہیئت جو نیند کو دعوت دے مثلاً دیوار یا ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھنا یا آنکھیں بند کر کے خطبہ سننا ممنوع ہے۔ پہلے یہ حدیث گذری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کی تیاری کر لینے کے بعد تشبیک (انگلیاں باہم پیوست کرنے) سے منع فرمایا ہے کیونکہ وہ بھی جالبِ نوم ہے۔ اسی طرح علماء فرماتے ہیں: منتظر صلاۃ کو انگلیاں چٹخانا بھی ممنوع ہے، کیونکہ اس سے بھی نیند یا اس کا مقدمہ اونگھ یا اونگھ کا مقدمہ سستی پیدا ہوتی ہے۔ غرض دورانِ خطبہ ایسی تمام ہیئتوں سے اجتناب کرنا چاہئے جس سے سستی پیدا ہو یا نیند آئے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ بعض صحابہ مثلاً ابن عمر رضی اللہ عنہما سے خطبہ کے دوران حبوۃ بنا کر بیٹھنا مروی ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اگر کوئی شخص خطبہ شروع ہونے سے پہلے سے حبوۃ بنائے ہوئے ہے اور اسی حالت میں خطبہ سنے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ دورانِ خطبہ حبوۃ بنانا ممنوع ہے، کیونکہ یہ لغو عمل ہے۔ اور خطبہ کے دوران کنکری چھونا بھی جائز نہیں، پس چادر باندھنے کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟

دوسری تطبیق یہ ہے کہ یہ ممانعت خلاف اولیٰ (مکروہ تنزیہی) پر محمول ہے، اس لئے کہ جب حدیث میں ممانعت ہے اور صحابہ کا عمل اس کے معارض ہے تو کراہیت کا درجہ گھٹ جائے گا، اگر صحابہ کا عمل معارض نہ ہوتا تو حبوۃ بنانا مکروہ تحریمی ہوتا اور صحابہ کا معارض عمل بس ایک تعبیر ہے ورنہ صحابہ کا عمل حکم شرعی کی وضاحت ہے۔

اس کی نظیر: رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی مخلوق کو زندہ جلانے سے منع فرمایا ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں کچھ لوگوں کو جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا مانتے تھے جب انھوں نے توبہ کرنے سے انکار کیا تو ان کو زندہ جلایا ہے پس حدیث میں جو زندہ جلا کر مارنے کی ممانعت ہے وہ خلاف اولیٰ پر محمول ہوگی، کیونکہ صحابی کا عمل اس حکم شرعی کی وضاحت ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ عمل نہ ہوتا تو زندہ جلانا مکروہ تحریمی ہوتا۔

غرض جس طرح کسی مسئلہ میں دو متعارض حدیثیں ہوں ایک ممانعت کی دوسری جواز کی، تو کراہیت کا درجہ گھٹ جاتا ہے۔ اسی طرح اگر حدیث کے ساتھ صحابی کا عمل معارض ہو تو بھی کراہیت کا درجہ گھٹ جائے گا، پس دورانِ خطبہ حبوۃ بنانا صرف خلاف اولیٰ ہے ناجائز اور مکروہ تحریمی نہیں ہے۔ واللہ اعلم

[۲۵۵] باب ماجاء فی کراهیة الاحتباء والإمام یخطب

[۵۲۲-] حدثنا محمدُ بنُ حُمَيْدٍ الرَّازِيُّ، والعباسُ بنُ محمدٍ الدُّوْرِيُّ، قالا: نا أبو عبدِ الرحمنِ المُقْرِئُ، عن سعيدِ بنِ أبي أيُّوبَ، قال: حدثني أبو مَرْحُومٍ، عن سهلِ بنِ مُعَاذٍ، عن أبِيهِ، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم نَهَى عن الحَبْوَةِ يَوْمَ الجمعةِ والإمامُ يَخْطُبُ.

قال أبو عيسى: وهذا حديثٌ حسنٌ، وأبو مَرْحُومٍ: اسمُهُ عبدُ الرحيمِ بنُ مَيْمُوْنٍ.

وقد كَرِهَ قومٌ مِن أهلِ العلمِ الحَبْوَةَ يومَ الجمعةِ والإمَامُ يَخطُبُ، ورَخَّصَ في ذلك بعضُهم، مِنهُم عبدُ اللهِ بنُ عُمَرَ وغيرُه، وبه يقولُ أحمدُ، وإسحاقُ: لايَرَيَانِ بالحَبْوَةِ والإمَامُ يَخطُبُ بأسًا.

وضاحت: مذکورہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ اس میں ابومرحوم عبد الرحیم بن میمون اور سہل بن معاذ دوضعیف راوی ہیں (مگر امام ترمذی رحمہ اللہ نے حدیث کو حسن کہا ہے، کیونکہ امام ترمذی رحمہ اللہ کا حسن: فن کے ضعیف کے ساتھ جمع ہوتا ہے) اور علماء کی ایک جماعت نے جمعہ کے دن حبوۃ بنانے کو مکروہ کہا ہے جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو، اور بعض علماء نے اس کی اجازت دی ہے۔ ان میں سے ابن عمرؓ وغیرہ ہیں۔ اور احمد واسحاق اسی کے قائل ہیں۔ وہ دونوں حضرات حبوۃ بنانے میں جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو کوئی حرج نہیں سمجھتے۔

بابُ ماجاء في كَرَاهِيَةِ رَفْعِ الأَيْدِيْ عَلَى الْمِنْبَرِ

خطبہ کے دوران دعا میں ہاتھ اٹھانا مکروہ ہے

دعا کے آداب میں سے: ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ہے۔ مگر خطبے میں جو دعائیں مانگی جاتی ہیں وہ ہاتھ اٹھائے بغیر مانگی جائیں گی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے خطبہ میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ثابت نہیں۔

حدیث: مدینہ کا گورنر بشر بن مروان خطبہ دے رہا تھا، اس نے دعا میں ہاتھ اٹھائے، حضرت عمارۃ بن رُوَیبہ رضی اللہ عنہ نے اُسے بددعا دی اور فرمایا: اللہ تعالیٰ ان دو چھوٹے چھوٹے ذلیل ہاتھوں کو ہلاک کریں، البتہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپؐ نہیں زیادہ کرتے تھے اس (اشارہ) پر۔ حدیث کے راوی ہُشیم نے شہادت کی انگلی سے اشارہ کر کے طلباء کو بتایا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ صرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے تھے۔ یہ اشارہ یا تو آپؐ دعاء کے وقت فرماتے تھے یا مقرر دورانِ تقریر جو اشارہ کرتا ہے وہ ہوگا۔ بہر حال حضرت عمارہؓ دعا میں ہاتھ اٹھانے کی نفی کر رہے ہیں اور اس حرکت پر بشر کو کوس رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دعا میں ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔

[۲۵٦] باب ماجاء في كراهية رفع الأيدي على المنبر

[۵۲۳-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا هُشَيْمٌ، نا حُصَيْنٌ، قال: سَمِعْتُ عُمَارَةَ بنَ رُوَيْبَةَ: وبِشْرُ بنُ مَرْوَانَ يَخطُبُ، فَرَفَعَ يَدَيْه في الدُّعَاءِ فقال عُمَارَةُ: قَبَّحَ اللهُ هَاتَيْنِ اليُدَيَّتَيْنِ القُصَيِّرَتَيْنِ، لقد رأيتُ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم، ومَا يَزِيْدُ على أنْ يقولَ هٰكَذَا، وأشارَ هُشَيْمٌ بالسَّبَّابَةِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وضاحت: يُدَيَّتَيْنِ: يَدَيْنِ کی حقارت کے لئے تصغیر بنائی ہے اور قُصَيِّرَتَيْنِ: قَصِيْرَتَيْنِ کی تصغیر ہے، قَصِیر میں

خود ہی تحقیر کا مفہوم ہے، پھر بھی مزید تحقیر کے لئے تصغیر بنائی ہے۔

بابُ ماجاءَ فی أذانِ الجُمُعَةِ

اذانِ جمعہ کا بیان

حضور اکرم ﷺ، صدیق اکبر اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں نماز جمعہ کے لئے صرف ایک اذان دی جاتی تھی اور وہ اذان دو مقصد کے لئے تھی، ایک: غائبین کو نماز کی اطلاع دینا۔ دوم: حاضرین کو خطیب کی آمد کی اطلاع دینا۔ یہ اذان حضور اکرم ﷺ کے سامنے مسجد کے دروازہ پر (چھت پر) دی جاتی تھی (ابوداؤد ا:۱۵۵) پھر جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور مدینہ طیبہ کی آبادی پھیل گئی، اور یہ اذان اطلاع عام کے لئے ناکافی ہوگئی تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے خطبہ سے پہلے ایک اور اذان کا اضافہ کیا اور وہ اذان زَوْرَاء مقام پر دی جانے لگی جو مسجد نبوی سے متصل بازار میں کوئی بلند جگہ تھی، تاکہ لوگ اذان سن کر آجائیں، پھر کچھ وقفہ کے بعد حضرت عثمان تشریف لاتے تھے پس دوسری اذان ممبر کے سامنے مسجد میں دی جاتی تھی، کیونکہ اب جو اذان خطیب کے سامنے دی جاتی تھی اس کا مقصد صرف حاضرین کو آگاہ کرنا تھا اس لئے اس کو مسجد کے دروازے پر (چھت پر) دینے کے بجائے مسجد کے اندر لے لیا گیا۔ اس وقت سے آج تک یہ اذان مسجد میں خطیب کے سامنے دی جاتی ہے۔ اور عرب وعجم میں شرقاً غرباً یہی توارث وتعامل چلا آرہا ہے، صرف وہ لوگ جو اجماع امت کو حجت نہیں مانتے اور آثار صحابہ کو بھی حجت نہیں مانتے یعنی غیر مقلدین اس میں اختلاف کرتے ہیں۔ وہ جمعہ کی پہلی اذان کو بدعتِ عثمانی کہتے ہیں، حالانکہ اس کو بدعت کہنا ضلالت وگمراہی ہے، اس لئے کہ تمام صحابہ کرام کے مشورے اور اجماع سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس اذان کا اضافہ کیا تھا۔ اور اجماع بھی قرآن وحدیث کی طرح قطعی حجت ہے اور صحابہ کرام کا اجماع تو اجماع امت کا سب سے اعلیٰ فرد ہے۔

سوال: سورۂ جمعہ آیت ۹ ﴿إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ﴾ کا مصداق اب پہلی اذان ہے یا دوسری؟ عام طور پر علماء پہلی اذان کو مصداق بتاتے ہیں جبکہ نزول قرآن کے وقت وہ اذان تھی ہی نہیں۔ پس اس کو آیت کا مصداق قرار دینا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

جواب: آیت کا مصداق پہلی اذان ہی ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ نزولِ آیت کے وقت پہلی اذان نہیں تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصولِ تفسیر کا قاعدہ ہے: العِبْرَۃُ لعُموم اللفظ لالخصوص المَوْرِد: نص کے الفاظ اگر عام ہوں تو حکم عام ہوتا ہے، شانِ نزول کے ساتھ خاص نہیں رہتا۔ یہ قاعدہ اس شرح کے مقدمہ میں تفصیل سے گذر چکا ہے۔ یہاں بھی إذا نودی للصلاۃ عام ہے، پہلی اذان یا دوسری اذان کی کوئی قید نہیں۔ پس حکم بھی عام ہوگا اور مصداق وہ اذان ہوگی جو غائبین کو بلانے کے لئے دی جاتی ہے۔ اور وہ پہلی ہی اذان ہے، دوسری اذان تو حاضرین کو خطیب کی

آمد کی اطلاع دینے کے لئے ہے۔ وہ نودی للصلاۃ کا مصداق نہیں ہوسکتی۔

سوال: اذان جمعہ کے بعد کاروبار اور دیگر مشاغل ترک کر کے مسجد جانا فرض ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوْا الْبَيْعَ﴾ مگر عام طور پر پہلی اذان کے بعد لوگ مشاغل ترک نہیں کرتے اور گناہ گار ہوتے ہیں۔ پس کیوں نہ دوسری اذان کو آیت کا مصداق قرار دیا جائے تاکہ لوگ گناہ گار نہ ہوں؟

جواب: یہ خرابی مسلمانوں کے اپنے عمل کی بناء پر پیدا ہوئی ہے۔ اور اس کا علاج بھی مسلمانوں کے پاس ہے، ہمارے دیار میں جو آدھا گھنٹہ پہلے اذان دی جاتی ہے وہ غلط طریقہ ہے، دس منٹ پہلے پہلی اذان دینی چاہئے تاکہ لوگ فوراً مشاغل ترک کر کے مسجد کی طرف چل پڑیں۔ غرض ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں، لوگ خود ہی اس کا علاج کرسکتے ہیں۔

[۲۵۷] باب ماجاء فی أذان الجمعة

[۵۲٤-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا حَمَّادُ بنُ خَالِدٍ الخَيَّاطُ، عن ابنِ ابی ذِئْبٍ، عن الزُّهْرِیِّ، عن السَّائِبِ بنِ يَزِيْدَ، قال: كانَ الأَذَانُ على عَهْدِ رسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم، وأبی بكرٍ، وعُمَرَ: إِذَا خَرَجَ الإِمَامُ أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ، فلما كانَ عثمانُ زَادَ النِّدَاءَ الثَّالِثَ على الزَّوْرَاءِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام نکلتا تھا (یعنی ممبر پر آکر بیٹھ جاتا تھا) جب نماز کھڑی کی جاتی تھی (یعنی ایک اذان خطبہ سے پہلے اور دوسری اذان یعنی اقامت نماز شروع کرنے سے پہلے کہی جاتی تھی) ــــــ (ہندوستانی اور مصری نسخوں میں عبارت اسی طرح ہے۔ یعنی إذا خرج الإمام أقيمت الصلاة مگر علامہ ابن العربی رحمہ اللہ نے ترمذی کی شرح عارضۃ الأحوذی میں عبارت قوله وإذا أقيمت الصلاة لکھی ہے پس واو ہونا چاہئے۔ عبارت اسی وقت صحیح ہوگی) پھر جب عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا (کان: تامّہ ہے) تو انھوں نے زوراء مقام پر تیسری اذان کا اضافہ کیا (یعنی پہلی اذان زوراء مقام پر دی جانے لگی اور وجود پذیر ہونے کے اعتبار سے اس کو تیسری اذان کہا گیا ہے)

بابُ ماجاء فی الْكَلَامِ بَعْدَ نُزُوْلِ الإِمَامِ مِنَ المِنْبَرِ

امام کے ممبر سے اترنے کے بعد گفتگو کرنے کا بیان

پہلے یہ مسئلہ آچکا ہے کہ جب امام ممبر پر آکر بیٹھ جائے اور ابھی خطبہ شروع نہ ہوا ہو اس وقت اور خطبہ ختم ہونے کے

بعد نماز شروع کرنے سے پہلے جو وقفہ ہے اس میں امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک لوگوں کا باہم گفتگو کرنا جائز نہیں، اور صاحبین اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جائز ہے۔

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ممبر سے اترنے کے بعد کوئی ضروری بات ہوتی تو کلام فرماتے تھے۔

تشریح: رسول اللہ ﷺ نے چونکہ خطبہ ختم کرنے کے بعد اور نماز شروع کرنے سے پہلے بات چیت کی ہے اس لئے جمہور کہتے ہیں کہ اس وقفہ میں لوگوں کا باہم باتیں کرنا جائز ہے۔ آپؐ نے خطبہ شروع کرنے سے پہلے سلیک غطفانی سے بات کی ہے۔ پس اس وقت بات کرنا جائز ہے اسی طرح آپؐ خطبہ کے بعد بھی ضروری بات چیت کرتے تھے پس اس وقفہ میں بھی بات کرنا جائز ہے۔

مگر یہ حدیث اولاً تو امام اعظم رحمہ اللہ نے جو قول اختیار کیا ہے اس کے معارض نہیں، کیونکہ امام کا کسی مقتدی سے بات کرنا یا مقتدی کا امام سے کچھ عرض کرنا امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک بھی جائز ہے۔ اختلاف لوگوں کے باہم گفتگو کرنے کے جواز وعدم جواز میں ہے، اور جمہور کے پاس ایک بھی ایسی حدیث نہیں جس سے ان وقفوں میں لوگوں کا باہم گفتگو کرنا ثابت ہوتا ہو۔

ثانیاً یہ حدیث صحیح نہیں اس میں جریر بن حازم کو وہم ہوا ہے، یہ واقعہ درحقیقت عشاء کی نماز کا ہے۔ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ عشاء کی تکبیر شروع ہونے کے بعد حجرہ سے نکلے اور مصلّی کی طرف بڑھے۔ ایک شخص نے آپؐ کا ہاتھ پکڑا، اور کوئی بات شروع کردی اور اتنی دیر بات کرتا رہا کہ بعض لوگ اونگھنے لگے، غرض یہ عشاء کی نماز کا واقعہ ہے نماز جمعہ کا واقعہ نہیں۔ اور یہ بات کہ اس حدیث میں جریر بن حازم کو وہم ہوا ہے امام بخاریؒ نے بیان فرمائی ہے۔

[۲۵۸] باب ماجاء في الكلام بعد نزول الإمام من المنبر

[۵۲۵-] حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا أبو داودَ الطَّيَالِسِيُّ، نا جريرُ بنُ حَازِمٍ، عن ثَابِتٍ، عن أنسِ بنِ مالكٍ، قال: كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يُكَلَّمُ بالحَاجَةِ إِذَا نَزَلَ مِنَ الْمِنْبَرِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ لَانَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ حديثِ جريرِ بنِ حَازِمٍ، سمِعْتُ محمداً يقولُ: وَهِمَ جريرُ بنُ حَازِمٍ في هذا الحديثِ، والصَّحِيْحُ مَا رُوِيَ عن ثابتٍ، عن أنسٍ، قال: " أُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَأَخَذَ رَجُلٌ بِيَدِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، فَمَا زَالَ يُكَلِّمُهُ حتى نَعَسَ بعضُ القومِ؛ قال محمدٌ: والحديثُ هُوَ هٰذا.

وجريرُ بنُ حازمٍ رُبَّمَا يَهِمُ فِيْ الشَّيْءِ، وهوَ صَدُوْقٌ.

قال محمدٌ: وَهِمَ جريرُ بنُ حازمٍ في حديثِ ثابتٍ، عن أنسٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قال: "إِذَا أُقِيمَتِ الصلاةُ فَلَا تَقُوْمُوْا حتى تَرَوْنِيْ"

قال محمدٌ: ويُرْوَى عن حَمَّادِ بنِ زَيْدٍ، قال: كُنَّا عند ثابتٍ البُنَانِيِّ، فَحَدَّثَ حَجَّاجُ الصَّوَّافُ عن يَحيَى بنِ أبي كثيرٍ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ أبي قَتَادَةَ، عن أبيه، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قال: "إِذَا أُقِيمَتِ الصلاةُ فَلَا تَقُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْنِيْ" فَوَهِمَ جريرٌ، فَظَنَّ أَنَّ ثَابِتًا حَدَّثَهُمْ عن أنسٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

[۵۲٦-] حدثنا الحسنُ بنُ عليٍّ الخَلَّالُ، نا عبدُ الرزاقِ، نا مَعْمَرٌ، عن ثابتٍ، عن أنسٍ، قال: "لَقَدْ رَأَيْتُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم بَعْدَ مَا تُقَامُ الصلاةُ، يُكَلِّمُهُ الرجُلُ، يَقُوْمُ بَيْنَه وبَيْنَ القِبْلَةِ، فَمَا زَالَ يُكَلِّمُهُ، ولقد رَأَيْتُ بعضَهم يَنْعَسُ مِنْ طُوْلِ قِيَامِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

قال أبو عيسى: وهذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کو ہم نہیں جانتے مگر جریر بن حازم کی حدیث سے (یعنی تنہا جریر یہ حدیث روایت کرتا ہے) میں نے امام بخاری رحمہ اللہ کو فرماتے سنا کہ جریر بن حازم کو اس حدیث میں وہم ہوا ہے۔ اور صحیح واقعہ وہ ہے جو ثابت بنانی نے، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نماز کے لئے اقامت کہی گئی، پس ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ پکڑا پس وہ برابر آپؐ سے بات کرتا رہا یہاں تک کہ بعض لوگ اونگھنے لگے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: صحیح حدیث یہ ہے۔

اور جریر بن حازم کو کبھی کسی حدیث میں وہم ہوتا ہے اور وہ صدوق (ہلکے درجہ کے ثقہ راوی) ہیں۔ پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے جریر کے وہم کی ایک مثال بیان کی، فرمایا: جریر بن حازم کو ثابت بنانی کی اس حدیث میں جس کو وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے، وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں وہم ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب نماز کے لئے اقامت کہی جائے تو آپ لوگ کھڑے نہ ہوں، یہاں تک کہ مجھے حجرہ سے نکلتا ہوا دیکھ لیں۔ (یہ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی نہیں ہے بلکہ حضرت ابوقتادہ کی ہے۔ جریر بن حازم کو وہم ہوا اور انھوں نے اس کو عن ثابت، عن أنس، عن النبيّ صلى الله عليه وسلم روایت کردیا اور اصل واقعہ حماد بن زید نے بیان کیا ہے) امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حماد بن زید سے روایت کیا گیا کہ انھوں نے فرمایا: ہم لوگ ثابت بُنانی کے پاس تھے پس حجاج الصوّاف نے حدیث بیان کی، یحییٰ بن ابی کثیر سے روایت کرتے ہوئے، وہ عبداللہ بن ابی قتادہ سے، وہ اپنے والد ابوقتادہ سے اور وہ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب نماز کے لئے تکبیر کہی جائے تو تم لوگ کھڑے نہ ہوؤ، یہاں تک کہ مجھے حجرہ سے نکلتا ہوا دیکھ لو۔ پس جریر کو وہم ہوا اور انھوں نے گمان کیا کہ ثابت بُنانی نے

لوگوں سے روایت بیان کی ہے (حالانکہ یہ حدیث حجاج الصواف نے بیان کی تھی، مگر چونکہ ثابت بنانی کی مجلس تھی اس لئے جریر کو خیال ہوا کہ یہ حدیث ثابت بنانی نے بیان کی ہے اور چونکہ ثابت بنانی کی سند متعین تھی اس لئے جریر نے اسی سند سے یعنی عن ثابت، عن أنس، عن النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث روایت کردی)

اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے وہ حدیث جو باب کے شروع میں گذری ہے جس میں جریر کو وہم ہوا ہے پیش کی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: البتہ واقعہ یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا نماز کے لئے اقامت ہوجانے کے بعد، آپؐ سے ایک شخص گفتگو کرنے لگتا وہ رسول اللہ ﷺ اور قبلہ کے درمیان کھڑا ہوجاتا۔ پس آپؐ برابر اس سے گفتگو کرتے رہتے اور البتہ میں نے بعض لوگوں کو دیکھا وہ رسول اللہ ﷺ کے دیر تک کھڑے رہنے کی وجہ سے اونگھنے لگتے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے (اور ممبر سے اترنے کے بعد گفتگو کرنے کی روایت جریر کا وہم ہے)

بابُ ماجاء فی القِرَاءَ ةِ فِیْ صَلاَةِ الْجُمُعَةِ

نماز جمعہ میں کونسی سورتیں پڑھنی چاہئیں؟

جب جمعہ کی نماز میں لمبی قراءت کا ارادہ ہوتا تو آپؐ سورۃ الجمعہ اور سورۃ المنافقین پڑھتے اور ہلکی قراءت کرنا مقصود ہوتا تو سورۃ الاعلی اور سورۃ الغاشیہ تلاوت فرماتے۔ پہلی دو سورتیں تو اس لئے پڑھتے کہ سورۃ الجمعہ کو جمعہ سے مناسبت ہے اور سورۃ المنافقین تحذیر (وارننگ) کے طور پر پڑھی جاتی تھی، کیونکہ نماز جمعہ میں منافقین اور کمزور ایمان والے بھی شریک ہوتے تھے، ان کو اس سورت میں اپنا طرز عمل بدلنے کا اشارہ دیا گیا ہے۔ اور آخری دو سورتوں میں آخرت کی منظر کشی اور آخرت کی زندگی کو بنانے کی ترغیب ہے۔ یہ مضمون بھی اہم اجتماع کے لئے موزوں ہے۔

[۲۵۹] باب ماجاء فی القراء ة فی صلاة الجمعة

[۵۲۷-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا حاتِمُ بنُ إسماعيلَ، عن جَعْفَرِ بنِ محمدٍ، عن أبيهِ، عن عُبَيْدِ اللّٰهِ بنِ أبی رَافِعٍ مولٰی رسولِ اللّٰهِ صلی الله عليه وسلم، قال: اسْتَخْلَفَ مروانُ أبا هريرةَ على المدينةِ، وَخَرَجَ إلی مكةَ. فَصَلّٰی بنا أبو هريرةَ يومَ الجمعةِ، فَقَرَأَ سورةَ الجمعةِ، وفی السَّجْدَةِ الثَّانِيَةِ إِذَا جَاءَ كَ المنافِقُوْنَ قال عُبَيْدُ اللّٰهِ: فَأَدْرَكْتُ أبا هريرةَ، فقلتُ: تَقْرَأُ بِسُوْرَتَيْنِ كان علیٌّ يَقْرَؤُهُمَا بالكُوْفَةِ، فقال أبو هريرةَ: إِنِّیْ سمِعْتُ رسولَ اللّٰهِ صلی الله عليه وسلم يَقْرَأُ بِهِمَا.

وفی الباب: عن ابنِ عباسٍ، والنعمانِ بنِ بشيرٍ، وأبی عِنَبَةَ الخَوْلَانِیِّ. قال أبو عيسی: حديثُ

أبي هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وَرُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم: أَنَّهُ كانَ يَقْرَأُ فى صَلاَةِ الْجُمُعَةِ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى، وهَلْ أَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ.

ترجمہ: عبیداللہ جو کہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ ابورافع کے صاحبزادے ہیں (جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ان کے سکریٹری تھے) فرماتے ہیں کہ مروان نے مدینہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود مکہ گیا۔ ابوہریرہؓ نے ہمیں جمعہ کے دن نماز پڑھائی، اور (پہلی رکعت میں) سورۃ الجمعہ پڑھی اور دوسری رکعت میں سورۃ المنافقین پڑھی، عبیداللہ کہتے ہیں: میں نے ابوہریرہؓ سے ملاقات کی اور میں نے کہا: آپ نے جو دو سورتیں پڑھی ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کوفہ میں ان کو پڑھتے تھے، پس ابوہریرہؓ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو (جمعہ کی نماز میں) ان دونوں سورتوں کو پڑھتے سنا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ جمعہ کی نماز میں سورۃ الاعلیٰ اور سورۃ الغاشیہ تلاوت فرمایا کرتے تھے (یہ حدیث آئندہ أبواب العيدين میں سند کے ساتھ آرہی ہے)

بابُ ماجاء فى مَايَقْرَأُ فى صَلاَةِ الصُّبْحِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ

جمعہ کے دن فجر کی نماز میں کونسی سورتیں پڑھے؟

رسول اللہ ﷺ کا جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۃ السجدۃ اور سورۃ الدہر پڑھنے کا معمول تھا ان دونوں سورتوں میں قیامت اور اس میں پیش آنے والے احوال کا تذکرہ ہے اور قیامت جمعہ کے دن برپا ہوگی۔ اسی لئے چوپائے جمعہ کے دن کان لگاتے ہیں کہ آج قیامت کا صور تو نہیں پھونکا جارہا۔ پس جمعہ کے دن مؤمنین کو بھی قیامت کے احوال یاد آنے چاہئیں، اور انسانوں کو بھی چوپایوں کی طرح قیامت کے تصور سے گھبرانا چاہئے۔

فائدہ: نبی ﷺ جمعہ کے دن سورۃ السجدہ اور سورۃ الدہر تلاوت فرماتے تھے تو مقتدیوں کے لئے کچھ بوجھ نہیں ہوتا تھا اور ہمارے ائمہ ان سورتوں کو پڑھتے ہیں تو مقتدیوں کے لئے بوجھ ہوجاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی روزمرہ کی قراءت سے یہ قراءت ہلکی ہوتی تھی، آپؐ چھ دن فجر کی دونوں رکعتوں میں تقریباً آدھا پارہ پڑھتے تھے۔ روایات میں ہے کہ ساٹھ سے سو آیتیں پڑھتے تھے۔ اور یہ سورتیں اس سے کم ہیں یعنی جمعہ کے دن آپؐ کی قراءت ہلکی ہوتی تھی، اور ہمارے ائمہ کا طریقہ الٹا ہے وہ ہفتہ کے چھ دن ہلکی قراءت کرتے ہیں، پھر جب جمعہ کے دن وہ سورۃ السجدۃ اور سورۃ الدہر پڑھتے ہیں تو قراءت لوگوں کے لئے بوجھ ہوجاتی ہے۔ اس لئے ائمہ جلدی جلدی تراویح کی طرح پڑھتے ہیں، اس لئے میں نے اپنی مسجد کے امام کو ہدایت دی ہے کہ وہ ایک جمعہ سورۃ السجدۃ پڑھے اور دوسرے جمعہ میں

صرف سورۃ الدہر پڑھے تاکہ لوگوں پر بوجھ نہ ہو اور پڑھنے میں جلدی نہ کرے روزانہ کی طرح باطمینان پڑھے۔

[۲۶۰] باب ماجاء في مايقرأ في صلاة الصبح يوم الجمعة

[۵۲۸-] حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نا شَرِيْكٌ، عن مُخَوَّلِ بنِ راشِدٍ، عن مُسْلِمٍ البَطِيْنِ، عن سَعِيدِ بنِ جُبَيْرٍ، عن ابنِ عباسٍ، قال: كانَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يَقرأُ يومَ الجمعةِ في صلاةِ الفَجْرِ تَنْزِيْلَ السَّجْدَةِ، وهَلْ أَتٰى على الإنسانِ.

وفي الباب: عن سَعْدٍ، وابنِ مسعودٍ، وأبي هريرةَ. قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عباسٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ. وقد رَوَاهُ سُفيانُ الثوريُّ وغيرُ واحِدٍ عَنْ مُخَوَّلٍ.

ترجمہ: ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورۃ السجدۃ اور سورۃ الدہر پڑھا کرتے تھے۔ اس حدیث کو مخوّل بن راشد سے سفیان ثوری رحمہ اللہ وغیرہ بھی روایت کرتے ہیں (مصری نسخہ میں رواہ ہے اور وہی نسخہ صحیح ہے اس لئے کہ روی کی صورت میں یہ مخول کی توثیق ہوگی، کیونکہ جب سفیان جیسا بڑا محدث ان سے روایت کرتا ہے تو وہ قابل اعتماد ہوئے، حالانکہ یہ توثیق نہیں ہے، بلکہ شریک کی طرح اس حدیث کو مخول سے ثوری بھی روایت کرتے ہیں، اور ان کی روایت مسلم شریف میں ہے، اور شعبہ رحمہ اللہ بھی روایت کرتے ہیں اور ان کی روایت مسند احمد میں ہے اس لئے مصری نسخہ ہی صحیح ہے)

بابٌ في الصَّلاةِ قَبْلَ الجُمُعَةِ وَبَعْدَهَا

جمعہ سے پہلے کی اور جمعہ کے بعد کی سنتیں

مذاہبِ فقہاء: امام اعظم اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک جمعہ سے پہلے بھی چار اور جمعہ کے بعد بھی چار سنتیں ہیں، پھر امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: چار رکعتیں ایک سلام سے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دو سلام سے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے یہی مروی ہے، وہ جمعہ سے پہلے چار اور جمعہ کے بعد چار سنتیں پڑھتے تھے۔ امام اعظم اور امام شافعی رحمہما اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

جاننا چاہئے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قول بیان کیا ہے کہ ان کے نزدیک جمعہ کے بعد دو سنتیں ہیں، مگر خود امام شافعی رحمہ اللہ نے کتاب الام میں جمعہ کے بعد چار سنتیں لکھی ہیں (معارف السنن)

اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک جمعہ سے پہلے چار سنتیں ایک سلام سے ہیں اور جمعہ کے بعد چھ سنتیں ہیں۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ پہلے چار رکعتیں پڑھے پھر دو رکعتیں۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک جمعہ

سے پہلے چار اور جمعہ کے بعد دو سنتیں ہیں۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک کوئی تحدید نہیں وہ کہتے ہیں: نماز اچھی چیز ہے اُسے زیادہ سے زیادہ پڑھنا چاہئے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ باب میں دو مرفوع حدیثیں اور دو صحابہ کے عمل ہیں۔ پہلی حدیث فعلی ہے۔ اور وہ اعلی درجہ کی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ پڑھا کر فوراً حجرہ میں تشریف لے جاتے اور وہاں دو سنتیں پڑھتے تھے، اور دوسری حدیث قولی ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے جو جمعہ کے بعد نفلیں پڑھنا چاہے وہ چار رکعت پڑھے'' اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے دونوں حدیثوں پر عمل کی یہ صورت تجویز کی کہ اگر گھر میں سنت پڑھے تو دو رکعتیں پڑھے اور مسجد میں پڑھے تو چار رکعتیں پڑھے۔ مگر امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو رد کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے، اس کو ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں۔ اور خود ان کا عمل یہ تھا کہ انھوں نے مسجد میں دو سنتیں پڑھیں، پھر چار پڑھیں۔ معلوم ہوا کہ اسحاق رحمہ اللہ نے جو صورت تجویز کی ہے وہ صحیح نہیں۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مسجد میں پہلے دو، پھر چار رکعتیں پڑھنا مروی ہے۔

اور صاحبین نے دونوں حدیثوں کو جمع کیا ہے اور وہ چھ سنتوں کے قائل ہیں، پھر امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ پہلے چار رکعتیں پڑھے پھر دو رکعتیں۔ جبکہ حضرت علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کا عمل اس کے برعکس ہے، وہ پہلے دو پھر چار رکعتیں پرھتے تھے، اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ شریعت نے کسی بھی نماز کے بعد اس کے مانند سنتیں نہیں رکھیں اور اس میں مصلحت یہ ہے کہ اگر فرض کے بعد اس کے مانند نفلیں پڑھی جائیں گی تو بدگمانی کرنے والے کو موقع ملے گا وہ گمان کرے گا کہ یہ شخص امام کو قابل اعتبار نہیں سمجھتا اس لئے اس نے نماز کا اعادہ کیا۔ اور امام اگر سرکاری آدمی ہوا اور ظالم ہوا اور اس کو شکایت پہنچائی گئی تو وہ شخص مصیبت میں پھنس جائے گا۔ اس لئے فرض کے بعد اس کے مانند سنتیں نہیں رکھی گئیں، غالباً امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے احوالِ زمانہ کی رعایت کرتے ہوئے یہ بات فرمائی ہوگی کہ پہلے چار سنتیں پڑھے پھر دو پڑھے تا کہ کسی کو بدگمانی کا موقع نہ ملے۔ واللہ اعلم

[٢٦١] بابٌ في الصلاة قبل الجمعة وبعدَها

[٥٢٩-] حدثنا ابن أبي عُمَرَ، نا سُفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ، عن عَمْرِو بنِ دِيْنَارٍ، عن الزُّهْرِيِّ، عن سالِمٍ، عن أبيه، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أنَّهُ كان يُصَلِّيْ بَعْدَ الجمعةِ رَكْعَتَيْنِ.

وفي الباب: عن جابرٍ. قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ. وقد رُوِيَ عن نافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ أيضًا.

والعَمَلُ على هذا عندَ بعضِ أهلِ العلمِ، وبه يقولُ الشافعيُّ وأحمدُ.

[۵۳۰-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ، عن نافعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، أَنَّهُ كان إِذَا صَلَّى الجمعةَ انْصَرَفَ فَصَلَّى سَجْدَتَيْنِ فِيْ بَيْتِهِ، ثم قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يَصْنَعُ ذلك.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[۵۳۱-] حدثنا ابنُ أبي عُمَرَ، حدثنا سفيانُ، عن سُهَيْلِ بن أبي صالحٍ، عن أبيهِ، عن أبي هريرةَ، قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: "مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُصَلِّيًا بعدَ الجمعةِ فَلْيُصَلِّ أَرْبَعًا"

هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ. حدثنا الحسنُ بنُ عليٍّ، نا عليُّ بنُ المَدِيْنِيُّ، عن سُفيانَ بنِ عُيَيْنَةَ، قال: كُنَّا نَعُدُّ سُهَيْلَ بنَ أبي صالحٍ ثَبْتًا في الحديثِ، قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ. والعَمَلُ على هذا عندَ بعضِ أهلِ العلمِ.

[۵۳۲-] وَرُوِيَ عن عبدِ اللهِ بنِ مَسْعُوْدٍ أَنَّهُ كانَ يُصَلِّيْ قَبْلَ الْجُمُعَةِ أَرْبَعًا وَبَعْدَهَا أَرْبَعًا.

[۵۳۳-] وَرُوِيَ عن عليِّ بنِ أبي طالبٍ أَنَّهُ أَمَرَ أَنْ يُصَلَّى بعدَ الجمعةِ رَكْعَتَيْنِ ثم أربعًا.

وذَهَبَ سفيانُ الثوريُّ وابنُ المباركِ إلى قولِ ابنِ مسعودٍ.

قال إسحاقُ: إِنْ صَلَّى في المَسْجِدِ يومَ الجمعةِ صَلَّى أَرْبَعًا، وإِنْ صَلَّى فِيْ بَيْتِهِ صَلَّى ركعتَيْنِ، واحْتَجَّ بِأَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كان يُصَلِّيْ بَعْدَ الجمعةِ ركعتينِ في بَيْتِهِ، ولِحَدِيْثِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم مَنْ كَانَ مِنْكُمْ مُصَلِّيًا بعدَ الجمعةِ فَلْيُصَلِّ أَرْبَعًا.

قال أبو عيسى: وابنُ عمرَ هُوَ الَّذِيْ رَوَى عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَنَّهُ كانَ يُصَلِّيْ بَعدَ الجمعةِ ركْعَتَيْنِ فِيْ بَيْتِهِ، وابنُ عُمَرَ بعدَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم صَلَّى في المسجدِ بعدَ الجمعةِ ركعتَيْنِ، وصَلَّى بعدَ الركعتَيْنِ أَرْبَعًا.

حدثنا بذلك ابنُ أبي عُمَرَ، نا سفيانُ، عن ابنِ جُرَيْجٍ، عن عطاءٍ، قال: رَأَيْتُ ابنَ عُمرَ صَلَّى بعدَ الجمعةِ ركعَتَيْنِ ثم صَلَّى بعد ذلك أَرْبَعًا.

حدثنا سعيدُ بنُ عبدِ الرحمنِ المَخْزُوْمِيُّ، نا سفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ، عن عَمْرِو بنِ دِيْنَارٍ، قال: مَارَأَيْتُ أَحَدًا أَنَصَّ لِلْحديثِ مِنَ الزُّهْرِيِّ، ومَا رَأَيْتُ أَحَدًا الدَّرَاهِمُ وَالدَّنَانِيْرُ أَهْوَنُ عِنْدَهُ مِنْهُ، إِنْ كانتِ الدنانير والدَّرَاهِمُ عِنْدَهُ بِمَنْزِلَةِ البَعْرِ.

قال أبو عيسى: سمعتُ ابن أبي عُمَرَ يقول: سمِعْتُ سفيانَ بنَ عُيَيْنَةَ يقولُ: كان عَمْرُو بنُ دينارٍ أَسَنَّ مِنَ الزُّهْرِيِّ.

وضاحت: پہلی حدیث (۵۲۹) سالم رحمہ اللہ کی ہے۔ اس کو عمرو بن دینار امام زہری سے روایت کرتے ہیں۔ یہ

دونوں ہم عصر ہیں، البتہ عمرو بن دینار بارہ سال بڑے ہیں، ان کا سن ولادت ۴۶ھ ہے اور زہری کا ۵۸ھ۔ مگر وفات زہری کی ایک سال پہلے ہوئی ہے۔ سن ۱۲۴ھ میں آپ کی وفات ہوئی ہے جبکہ عمرو بن دینار کی وفات سن ۱۲۶ھ میں ہوئی ہے۔ پھر یہی حدیث نافع کی سند سے روایت کی ہے (نمبر ۵۳۰) اس میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل بھی مذکور ہے، یہ مضمون سالم کی سند میں نہیں تھا۔ یہی امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کا مسلک ہے، یعنی دونوں کے نزدیک: جمعہ کے بعد دو سنتیں ہیں (مگر امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف اس قول کی نسبت صحیح نہیں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا)

اس کے بعد حدیث قولی (۵۳۱) مرفوع ہے جو سہیل کی سند سے ہے، چونکہ یہ حدیث: ابن عمرؓ کی حدیث کے معارض تھی اس لئے شاید کسی کو خیال پیدا ہو کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہوگی اس لئے ابن عیینہ کا قول سہیل کی توثیق میں نقل کیا کہ وہ اس راوی کو مضبوط راوی سمجھتے تھے (پھر اس توثیق والے قول کے بعد ''حدیث حسن'' ہے وہ بے معنی ہے، کیونکہ یہ حدیث نہیں ہے اور مصری نسخہ میں یہ عبارت نہیں ہے) بعض علماء کا عمل اس حدیث کے مطابق ہے (ان کے نام آگے آئیں گے یہ حضرات جمعہ کے بعد چار سنتوں کے قائل ہیں) ——— اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ جمعہ سے پہلے چار اور جمعہ کے بعد چار سنتیں پڑھتے تھے (یہ روایت سند کے ساتھ مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں ہے، اسی کو مذکورہ حضرات نے لیا ہے)

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے حکم دیا کہ جمعہ کے بعد دو رکعتیں پھر چار رکعتیں پڑھی جائیں (یہ روایت بھی مصنف ابن ابی شیبہ میں سند کے ساتھ ہے) سفیان ثوری اور ابن المبارک: حضرت ابن مسعودؓ کے قول کی طرف گئے ہیں (یہ اب فریق ثانی کے نام آئے اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ یہ سب حضرات جمعہ کے بعد چار سنتوں کے قائل ہیں)

اور اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: اگر جمعہ کے بعد مسجد میں نفلیں پڑھے تو چار پڑھے، اور گھر میں پڑھے تو دو پڑھے، اور انھوں نے استدلال کیا کہ نبی ﷺ کا عمل یہ تھا کہ آپؐ گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے اور قولی حدیث ہے کہ جو شخص جمعہ کے بعد نفلیں پڑھنا چاہے وہ چار رکعتیں پڑھے (پس پہلی حدیث گھر میں پڑھنے کی صورت میں ہے کیونکہ اس میں اس کی صراحت ہے اور قولی حدیث مسجد میں پڑھنے پر محمول ہے کیونکہ اس میں جگہ کی صراحت نہیں)

(مگر امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں حدیثوں پر عمل کی یہ صورت صحیح نہیں) فرماتے ہیں: ابن عمرؓ ہی یہ فعلی حدیث روایت کرتے ہیں کہ آپ گھر میں دو رکعتیں پڑھتے تھے، پھر نبی ﷺ کے زمانہ کے بعد ان کا عمل یہ تھا کہ انھوں نے مسجد میں جمعہ کے بعد پہلے دو رکعتیں پڑھیں پھر چار رکعتیں پڑھیں (معلوم ہوا کہ حضرت اسحاق کی تطبیق ٹھیک نہیں، ابن عمرؓ نے دونوں روایتوں کو جمع کیا ہے اور چھ رکعتیں مسجد میں پڑھی ہیں) پھر امام ترمذیؒ نے حضرت ابن عمرؓ کے اس عمل کو سند سے روایت کیا ہے۔

آخر میں امام ترمذیؒ سند کے ساتھ عمرو بن دینار کا قول لائے ہیں جس میں امام زہری کی فضیلت ہے۔ فرماتے ہیں: ''میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جو حدیث کو مرفوع کرنے میں امام زہری سے بہتر ہو'' (أَنَصّ: نَصَّ الحدیثَ سے اسم تفضیل ہے، جس کے معنی ہیں: رفعُ الحدیثِ إلی قائله: بات کو اس کے کہنے والے کی طرف اٹھانا یعنی پہنچانا۔ یعنی حدیث مرفوع کی سندیں جتنی شاندار زہری بیان کرتے ہیں اور کوئی بیان نہیں کرتا۔ کیونکہ زہری رحمہ اللہ اپنی تمام مرویات سونے سے پہلے ایک مرتبہ پڑھتے تھے، اس لئے ان کو سندیں خوب محفوظ تھیں)

دوسری بات: عمرو بن دینار نے یہ فرمائی کہ میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس کے نزدیک دنانیر ودراہم (مصری نسخہ میں دونوں جگہ والدنانیر بھی ہے) اتنے بے حیثیت ہوں جتنے زہری کے نزدیک ہیں، زہری کے نزدیک روپے پیسے مینگنی کے برابر تھے (إنْ: مخففہ من المثقلہ ہے اى: إنّه اور کانت الدنانیر إلخ إن کی خبر ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ اپنے زمانہ کے خلفاء وامراء کے پاس جاتے تھے، جبکہ دوسرے علماء ان سے دور رہتے تھے۔ امام زہری کا خیال تھا کہ اگر علماء: بادشاہوں اور امراء سے دور رہیں گے تو وہ من مانی کریں گے اور ہم ان کے پاس جائیں گے تو ان کی راہ نمائی کریں گے اور ان کو حتی الامکان ظلم سے روکیں گے۔ مگر بعض لوگوں نے آپ پر کاسہ لیسی (پیالہ چاٹنے) کا الزام لگایا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ زہری حکام کے پاس مال ودولت کی لالچ میں جاتے ہیں۔ مگر ان کا یہ الزام بے بنیاد تھا۔ جس کے نزدیک دراہم ودنانیر مینگنیوں سے زیادہ بے حیثیت ہوں، جس کی شہادت ان کے استاذ عمرو بن دینار دے رہے ہیں، وہ کاسہ لیسی کیوں کرے گا؟) پھر امام ترمذی رحمہ اللہ نے ابن عیینہ کا قول نقل کیا ہے کہ عمرو بن دینار (۴۶-۱۲۶ھ) زہری رحمہ اللہ (۵۸-۱۲۴ھ) سے عمر میں بڑے تھے (اور عمرو بن دینار نے یہ دو باتیں اس وقت کہی تھیں جب وہ بیمار پڑے تھے اور زہری ان کی عیادت کے لئے گئے تھے، جب وہ عیادت کرکے لوٹے تو پیچھے حاضرین سے عمرو بن دینار نے یہ باتیں کہیں)

بابٌ فِیمَنْ یُدْرِكُ مِنَ الجُمُعَةِ رَكْعَةً

جس کو جمعہ کی ایک رکعت ملے اس کا حکم

مذاہبِ فقہاء: شیخین: امام اعظم اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ فرماتے ہیں: جو شخص نماز جمعہ میں قعدۂ اخیرہ میں بھی شریک ہوگیا اس نے جمعہ پالیا۔ پس امام کے سلام کے بعد وہ جمعہ کی دو رکعتیں پڑھے گا۔ اور ائمہ ثلاثہ اور امام محمد رحمہم اللہ کے نزدیک جمعہ پانے کے لئے کم از کم ایک رکعت پانا ضروری ہے، جو شخص قعدۂ اخیرہ میں شریک ہوا یعنی جس کی دونوں رکعتیں فوت ہوگئیں اس کو جمعہ نہیں ملا، پس وہ امام کے سلام کے بعد اسی تحریمہ سے ظہر کی چار رکعتیں پڑھے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے نماز کی ایک رکعت پالی اس نے نماز پالی''

تشریح: یہ حدیث پہلے فجر اور عصر کی تخصیص کے ساتھ گذری ہے۔ جمہور نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ جمعہ وہی شخص پاتا ہے جو کم از کم ایک رکعت امام کے ساتھ پالے۔ جس کی دونوں رکعتیں فوت ہوجائیں اسے جمعہ نہیں ملا۔ اور شیخین فرماتے ہیں: اس حدیث کا جمعہ کی نماز سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ حدیث پانچوں نمازوں کے لئے ہے۔ اور اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی بھی نماز کے وقت کے آخر میں نماز کا اہل ہوا، جیسے عورت حائضہ یا نفاس والی تھی وہ پاک ہوئی، یا بچہ بالغ ہوا یا کافر مسلمان ہوا، اور اس نے ایک رکعت کا وقت پالیا، یعنی طہارت حاصل کر کے ایک رکعت پڑھ سکے اتنا وقت اس کو مل گیا تو اس پر وہ نماز فرض ہوگئی، ادا نہ پڑھ سکے تو قضا پڑھے۔

اور اس حدیث کا دوسرا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ مسبوق کو جماعت پانے والا اس وقت قرار دیں گے جب وہ امام کے ساتھ کم از کم ایک رکعت پالے۔ جو شخص قعدۂ اخیرہ میں شریک ہوا وہ جماعت کی فضیلت پانے والا تو ہے مگر جماعت پانے والا نہیں۔ غرض اس حدیث کا مسئلۂ باب سے کوئی تعلق نہیں۔ اور جو حدیث پہلے گذری ہے وہ بھی یہی حدیث ہے۔ چونکہ فجر اور عصر کا آخر وقت محسوس تھا اس لئے عصر اور فجر کی تخصیص کے ساتھ حدیث وارد ہوئی ہے اور حکم تمام نمازوں کے لئے عام ہے کیونکہ تخصص کے بغیر بھی یہ حدیث آئی ہے، اور جب مسئلہ باب میں کوئی خاص حدیث نہیں تو عام ضابطہ جاری ہوگا، اور قعدۂ اخیرہ میں شریک ہونے والے کو جماعت میں شریک ہونے والا قرار دیا جاتا ہے، پس نماز جمعہ کے قعدہ اخیرہ میں شریک ہونے والے کو بھی جمعہ پانے والا قرار دیا جائے گا۔ واللہ اعلم

[۲۶۲] بابٌ فیمن یُدْرِكُ من الجمعة ركعة

[۵۳۴-] حدثنا نَصْرُ بنُ عليٍّ، وسعيدُ بنُ عبدِ الرحمنِ وغَيْرُ واحِدٍ، قالوا: حدثنا سفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ، عن الزُّهرِيِّ، عن أبي سَلَمَةَ، عن أبي هريرةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قال: "مَنْ أدْرَكَ مِنَ الصَّلاَةِ رَكْعَةً فقد أدْرَكَ الصَّلاَةَ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ. والعملُ على هذا عندَ أكْثَرِ أهلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغيرِهم قالوا: مَنْ أدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الجُمُعَةِ صَلَّى إليها أُخْرَى، ومَنْ أدْرَكَهُمْ جُلُوْسًا صَلَّى أرْبَعًا. وبه يقولُ سفيانُ الثوريُّ، وابنُ المباركِ، والشافعيُّ، وأحمدُ، وإسحاقُ.

ترجمہ: اس حدیث پر اکثر صحابہ اور ان کے علاوہ علماء کا عمل ہے۔ وہ فرماتے ہیں: جس نے جمعہ کی ایک رکعت پائی وہ اس کے ساتھ دوسری رکعت ملائے۔ اور جس نے لوگوں کو قعدۂ اخیرہ میں پایا وہ (ظہر کی) چار رکعتیں پڑھے۔ اور یہی بات سفیان ثوری، ابن المبارک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کہتے ہیں۔

بابٌ فی القَائِلَۃِ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ

جمعہ کے دن قیلولے کا بیان

حدیث: سہل بن سعد کہتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں صبح کا کھانا نہیں کھاتے تھے اور قیلولہ نہیں کرتے تھے مگر جمعہ کے بعد۔

تشریح: امام احمد رحمہ اللہ نے اس حدیث سے زوال سے پہلے جمعہ پڑھنے کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: جب صحابہ صبح کا کھانا اور قیلولہ جمعہ کے بعد کرتے تھے تو یقیناً رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز اس سے پہلے پڑھتے تھے۔ صبح کا کھانا زوال سے پہلے گیارہ بجے کے قریب کھایا جاتا تھا پھر قیلولہ کیا جاتا تھا۔ پس آپ نے دس بجے کے قریب جس وقت عیدین پڑھی جاتی ہیں جمعہ پڑھا ہوگا، لہٰذا زوال سے پہلے جمعہ کی نماز پڑھنا جائز ہے، مگر جمہور کے نزدیک حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے۔ حدیث کا صحیح مطلب یہ ہے کہ چونکہ جمعہ کے دن مسجد جلدی جانا ہوتا ہے اور کھا کر جانے کی صورت میں سستی چھائی رہتی ہے اس لئے صحابہ جمعہ کے دن یہ دونوں کام مؤخر کرتے تھے۔ وہ جمعہ کے بعد صبح کا کھانا بھی کھاتے تھے اور قیلولہ بھی کرتے تھے۔ واللہ اعلم

[۲۶۳] بابٌ فی القائلة يوم الجمعة

[۵۳۵-] حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نا عبدُ العزيزِ بنُ أبي حَازِمٍ، وعبدُ اللّٰهِ بنُ جَعْفَرٍ، عن أبي حَازِمٍ، عن سَهْلِ بنِ سَعْدٍ، قال: ما كُنَّا نَتَغَدَّى في عَهْدِ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم ولاَ نَقِيْلُ إِلاَّ بَعْدَ الجُمُعَةِ.

وفي الباب: عن أنسِ بنِ مالكٍ، قال أبو عيسى: حديثُ سهلِ بنِ سَعْدٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

بابٌ فِيْمَنْ يَنْعَسُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَنَّهُ يَتَحَوَّلُ مِنْ مَجْلِسِهِ

جمعہ کے دن نیند آئے تو مجلس بدل لے

جمعہ کے دن یا سبق میں یا کسی بھی مجلس میں نیند آئے تو اس کا علاج یہ ہے کہ جگہ بدل لے۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھے، یا تھوڑا چل کر اپنی جگہ آبیٹھے نیند اڑ جائے گی۔ اس لئے کہ نیند برودت سے آتی ہے اور حرکت سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے نیند اڑ جائے گی۔ لیکن اگر کوئی طالب علم نیند اڑانا ہی نہ چاہے تو اس کا کوئی علاج نہیں وہ امریکہ گھوم کر آئے گا تو بھی سوئے گا!

[٢٦٤] بابٌ فيمن يَنْعَسُ يومَ الجمعة أنه يتحول من مجلسه

[٥٣٦-] حدثنا أبو سعيدٍ الأشجُّ، نا عَبْدَةُ بنُ سُلَيْمَانَ، وأبو خالدٍ الأحْمَرُ، عن محمدِ بنِ إسحاق، عن نافعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: "إِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَلْيَتَحَوَّلْ عن مَجْلِسِهِ ذلك"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی شخص جمعہ کے دن اونگھنے لگے تو چاہئے کہ وہ اپنی مجلس سے منتقل ہوجائے"

بابُ ماجاءَ في السَّفَرِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ

جمعہ کے دن سفر کرنے کا حکم

جمعہ کے دن زوال سے پہلے سفر کرنا جائز ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور جمعہ کا وقت شروع ہونے کے بعد یعنی زوال کے بعد جمعہ پڑھے بغیر سفر کرنا مکروہ ہے۔ البتہ اگر آگے جمعہ ملنے کی امید ہو جیسے دیوبند سے دہلی جارہا ہے، آگے مظفرنگر میں جمعہ مل جائے گا، یا مجبوری ہو مثلاً دس بجے کی ٹرین میں ریزرویشن کرایا تھا مگر گاڑی لیٹ آئی تو زوال کے بعد بھی سفر کرنا جائز ہے۔ اور ضرورت کے بغیر اور آگے جمعہ ملنے کی امید بھی نہ ہو تو زوال کے بعد سفر کرنا مکروہ ہے۔

باب میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سَرِیّہ تجویز فرمایا۔ اور ان کو مثلاً حکم دیا کہ پرسوں نکل جاؤ۔ اتفاق سے پرسوں جمعہ کا دن تھا، حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: جنگ کا انجام معلوم نہیں زندہ سلامت واپس آنا ہوتا ہے یا نہیں اور میرے پاس گھوڑا ہے اس لئے آپ حضرات روانہ ہوجائیں۔ میں آنحضور ﷺ کے ساتھ جمعہ پڑھ کر چلونگا اور شام تک آپ حضرات سے آملونگا۔ ریہ روانہ ہوگیا اور عبداللہ بن رواحہ پیچھے رہ گئے۔ آنحضرت ﷺ نے خطبہ میں ان کو مسجد میں پایا تو پوچھا: آپ یہاں کیسے؟ اپنے ساتھیوں کے ساتھ صبح کیوں روانہ نہیں ہوئے؟ انھوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! جنگ سامنے ہے معلوم نہیں واپسی ہو یا نہ ہو۔ اور میرے پاس گھوڑا ہے اس لئے میرے ساتھی روانہ ہوگئے ہیں اور میں آپؐ کی اقتداء میں جمعہ پڑھ کر چلونگا اور شام تک ان سے جاملونگا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: "تمہارے جو ساتھی آدھا دن پہلے اللہ کے راستہ میں نکل گئے اگر تم زمین کی ساری دولت بھی خرچ کردو تو ان کے صبح نکلنے کے ثواب کو نہیں پاسکتے!"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جمعہ کے دن زوال سے پہلے سفر کرنا جائز ہے اور اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

[٢٦٥] باب ماجاء في السفر يومَ الجمعة

[٥٣٧-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا أبو مُعاوية، عن الحجّاجِ، عن الحَكَمِ، عن مِقْسَمٍ، عن ابنِ عباسٍ، قال بَعَثَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم عبدَ اللهِ بنَ رَوَاحَةَ في سَرِيَّةٍ، فَوَافَقَ ذلكَ يومَ الجمعةِ، فَغَدَا أَصْحَابُه فقال: أَتَخَلَّفُ فأُصَلِّي مع رسولِ الله صلى الله عليه وسلم، ثُمَّ أَلْحَقُهُمْ، فَلَمَّا صَلَّى مع النبيِّ صلى الله عليه وسلم رَآهُ، فَقَالَ له: " ما مَنَعَكَ أَنْ تَغْدُوَ مَعَ أَصْحَابِكَ؟" قال: أَرَدْتُ أَنْ أُصَلِّيَ مَعَكَ ثم أَلْحَقَهُمْ، فقال: " لَوْ أَنْفَقْتَ ما فِي الأَرْضِ مَا أَدْرَكْتَ فَضْلَ غَدْوَتِهِمْ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ لاَنعرِفُهُ إلاَّ مِن هذا الوجهِ، قال عليُّ بنُ المَدِيْنِيِّ: قال يحيى بنُ سعيدٍ: قال شُعْبَةُ: لَمْ يَسْمَعِ الحَكَمُ مِنْ مِقْسَمٍ إِلاَّ خَمْسَةَ أحاديثَ، وعَدَّهَا شُعْبَةُ، وليسَ هذا الحديثُ فيما عَدَّهَا شُعْبَةُ، وكَأَنَّ هذا الحديثَ لم يَسْمَعْهُ الحَكَمُ مِنْ مِقْسَمٍ.

وقد اختَلَفَ أهلُ العلمِ في السفرِ يومَ الجمعةِ، فَلَمْ يَرَ بعضُهم بَأسًا بِأَنْ يَخرُجَ يومَ الجمعةِ في السفرِ مالم تَحْضُرِ الصلاةُ. وقالَ بعضُهم: إِذَا أَصْبَحَ فَلاَ يَخرُجُ حتى يُصَلِّيَ الجمعةَ.

ترجمہ: ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن رواحہ کو ایک سریہ میں بھیجا۔ اتفاق سے وہ جمعہ کا دن تھا، ان کے ساتھی صبح سویرے نکل گئے، اور ابن رواحہؓ نے کہا: میں پیچھے رہوں گا، اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھوں گا، پھر ان کے ساتھ مل جاؤں گا، پس جب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی تو آپؐ نے ان کو دیکھا اور ان سے پوچھا: ''تمہیں صبح سویرے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نکلنے سے کس چیز نے روکا؟'' ابن رواحہؓ نے عرض کیا: میں نے چاہا کہ آپؐ کے ساتھ نماز پڑھوں، پھر میں ان کے ساتھ مل جاؤں گا۔ آپؐ نے فرمایا: ''اگر تم تمام چیزیں جو زمین میں ہیں خرچ کر دو تو بھی ان کے صبح میں نکلنے کے ثواب کو نہیں پا سکتے!''

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کو ہم نہیں جانتے مگر اسی سند سے (جاننا چاہئے کہ اس حدیث میں دو خرابیاں ہیں، ایک: حجاج بن ارطاۃ ضعیف راوی ہے۔ دوسرے: یہ حدیث منقطع ہے کیونکہ حکم نے یہ حدیث مِقسم سے نہیں سنی) شعبہ رحمہ اللہ نے فرمایا: حکم نے مِقسم سے صرف پانچ حدیثیں سنی ہیں، اور شعبہ رحمہ اللہ نے ان کو شمار کیا اور یہ حدیث ان پانچ میں نہیں ہے جن کو شعبہ نے شمار کیا، گویا یہ حدیث حکم نے مِقسم سے نہیں سنی (تفصیل تہذیب (۲: ۴۳۴) میں ہے)

اور علماء کا جمعہ کے دن سفر کرنے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کچھ حرج نہیں سمجھتے کہ آدمی جمعہ کے دن سفر میں نکلے جب تک نماز کا وقت شروع نہ ہو (یہ ائمہ اربعہ کا مذہب ہے) اور بعض علماء کہتے ہیں (جمعہ کے دن) جب صبح صادق

ہوگئی تو اب سفر میں نہ جائے، یہاں تک کہ جمعہ پڑھ لے (یہ امام شافعی رحمہ اللہ کی ایک روایت ہے)

بابٌ في السِّواكِ والطِّيْبِ يَوْمَ الجُمُعَةِ

جمعہ کے دن مسواک کرنے اور خوشبو لگانے کا بیان

ہر بڑے مجمع میں حاضر ہونے سے پہلے نظافت کا خیال کرنا پسندیدہ امر ہے۔ جمعہ میں بھی بڑا مجمع ہوتا ہے اس لئے نہا دھوکر، بدن کا میل کچیل صاف کرکے، مسواک کرکے، صاف ستھرے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر نماز پڑھنے کے لئے جانا چاہئے، یہ مستحب ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ جمعہ کے دن غسل کریں، اور چاہئے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے گھر کی خوشبو میں سے چھوئے (یعنی گھر میں جو خوشبو موجود ہو اُسے لگائے) اور اگر وہ خوشبو نہ پائے تو پانی اس کے لئے خوشبو ہے" (یعنی نہانا کافی ہے، دوسرے سے مانگ کر خوشبو لگانا ضروری نہیں)

تشریح: جو حضرات جمعہ کے دن غسل کے عدم وجوب کے قائل ہیں یہ حدیث ان کی ایک دلیل ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں دوسرا حکم خوشبو لگانے کا ہے، اور وہ بالاجماع واجب نہیں۔ پس پہلا حکم بھی جو اس کا قرین ہے واجب نہیں۔ اور حقّ سے مراد احسان و نیکوکاری کا حق ہے یعنی بڑے مجمع کا تقاضہ یہ ہے کہ وہاں نہا دھوکر اور نظافت وصفائی کے ساتھ جانا چاہئے، شرعی وجوب مراد نہیں۔

[۲۶۶] باب ماجاء في السواك والطِّيْبِ يومَ الجمعة

[۵۳۸-] حدثنا عليُّ بنُ الحَسَنِ الكوفيُّ، نا أبو يَحيى إسماعيلُ بنُ إبراهيمَ التَيمِيُّ، عن يَزيدَ بنِ أبي زِيَادٍ، عن عبدِ الرحمٰنِ بنِ أبي لَيْلَى، عن البَرَاءِ بنِ عَازِبٍ، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: " حَقًّا عَلَى المُسْلِمِيْنَ أَنْ يَغْتَسِلُوْا يومَ الجمعةِ، ولْيَمَسَّ أَحَدُهم مِنْ طِيْبِ أَهْلِهِ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ فَالْمَاءُ له طِيْبٌ"

وفي الباب: عن أبي سعيدٍ، وشَيْخٍ مِنَ الأنْصَارِ.

قال: حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيْعٍ، نا هُشَيْمٌ، عن يَزيدَ بنِ أبي زِيَادٍ، نَحْوَهُ بِمَعْنَاهُ.

قال أبو عيسى: حديثُ البَرَاءِ حديثٌ حَسَنٌ وَرِوَايَةُ هُشَيْمٍ أَحْسَنُ مِنْ رِوَايَةِ إِسْمَاعِيْلَ بنِ إبراهيمَ التَيْمِيِّ، وإسماعيلُ بنُ إبراهيمَ التَيْمِيُّ: يُضَعَّفُ في الحديثِ.

وضاحت: حضرت براء رضی اللہ عنہ کی حدیث کو یزید بن ابی زیاد سے: اسماعیل بن ابراہیم کے علاوہ ہُشیم بھی

روایت کرتے ہیں، اور ہشیم والی سند زیادہ اچھی ہے اسماعیل تیمی کی سند سے، کیونکہ اسماعیل کی حدیث میں تضعیف کی گئی ہے۔ اور ہشیم ثقہ راوی ہیں۔

أبوَابُ العِيدَيْن

بابٌ في المَشْيِ يَوْمَ العِيدَيْنِ

عیدین کے لئے پیدل جانا مستحب ہے

اگر کوئی عذر نہ ہو تو مستحب یہ ہے کہ عیدین اور جمعہ پڑھنے کے لئے پیدل جائے۔ اور عذر ہو جیسے گاؤں والوں کو عید پڑھنے کے لئے شہر آنا ہے یا کوئی بیمار ہے، یا بوڑھا ہے اور اس کے لئے پیدل چلنا دشوار ہے تو سوار ہو کر جانا جائز ہے۔ اور پیدل جانا مستحب اس لئے ہے کہ عید کے موقع پر بڑا اجتماع ہوتا ہے، عیدین تو ایک ہی جگہ ہوتی ہیں، اور جمعہ بھی شہر میں ایک جگہ ہوتا تھا پس اگر لوگ سوار ہو کر آئیں گے تو سواریاں کھڑی کرنے کا مسئلہ پیدا ہوگا۔ نیز پیدل جانے میں عاجزی اور انکساری بھی ہے اور سوار ہو کر جانے میں شان کا اظہار ہے جو عبادت کے شایانِ شان نہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ عیدین کے لئے پیدل جانے کے مستحب ہونے پر کوئی صحیح حدیث نہیں ہے، البتہ جمعہ کے لئے پیدل جانا مستحب ہے اور اس سلسلہ میں صحیح حدیثیں موجود ہیں۔ پس وہ حدیثیں عیدین کے لئے بھی کافی ہیں۔

حدیث: حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سنت یہ ہے کہ آپ عیدین کے لئے پیدل جائیں۔ اور (عید الفطر میں) یہ بھی سنت ہے کہ آپ عیدگاہ جانے سے پہلے کچھ کھائیں۔

تشریح: یہ حدیث حکماً مرفوع ہے کیونکہ صحابی کے من السنۃ کہنے سے حدیث حکماً مرفوع ہو جاتی ہے۔ اور حارث اعور کی وجہ سے حدیث ضعیف ہے، اور عید الفطر میں صبح صادق کے بعد کچھ کھانا مستحب ہے تا کہ افطار متحقق ہو جائے، یعنی عملی طور پر یہ بات معلوم ہو جائے کہ آج روزہ نہیں ہے کیونکہ روزوں کا مہینہ ختم ہو چکا۔

أبوَابُ العِيدَيْن

[٢٦٧] بابٌ في المشي يوم العيدين

[٥٣٩-] حدثنا إسماعيلُ بنُ مُوسى، نا شَرِيكٌ، عن أبي إسحاق، عنِ الحَارِثِ، عن عليٍّ، قال: مِنَ السُّنَّةِ أنْ تَخرُجَ إلى العيدِ مَاشِيًا، وأنْ تَأْكُلَ شَيْئًا قَبْلَ أنْ تَخرُجَ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ، والعَمَلُ على هذا الحديثِ عندَ أكثرِ أهلِ العلمِ يَسْتَحِبُّوْنَ أنْ يَخرُجَ الرجلُ إلى العِيدِ مَاشِيًا، وأنْ لاَ يَرْكَبَ إلاَّ مِنْ عُذْرٍ.

ترجمہ: اس حدیث پر علماء کا عمل ہے۔ وہ یہ بات پسند کرتے ہیں کہ آدمی عید کے لئے پیدل جائے، اور یہ کہ سوار ہوکر نہ جائے مگر عذر کی بناء پر۔

بابٌ فی صَلاۃِ العِیْدَیْنِ قَبْلَ الخُطْبَۃِ

عیدین کی نمازیں خطبہ سے پہلے ہیں

یہ اجماعی مسئلہ ہے: عیدین کی نمازیں خطبہ سے پہلے ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں کچھ امراء نے خطبہ پہلے کردیا تھا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حرکت سب سے پہلے مروان نے کی تھی، اور بعض لوگ یہ بات امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، بہرحال جس نے بھی ایسا کیا ٹھیک نہیں کیا۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کا دائمی عمل یہ تھا کہ وہ پہلے عیدین پڑھاتے تھے پھر خطبہ دیتے تھے۔

سوال: عیدین میں خطبہ بعد میں کیوں ہے؟ اور جمعہ میں پہلے کیوں ہے؟

جواب: عیدین میں لوگ عیدگاہ میں دوگانہ ادا کرنے کے لئے جاتے ہیں، تقریر سننے کے لئے نہیں جاتے۔ پس پہلے دوگانہ ادا کرنا چاہئے پھر خطیب کو جو تقریر کرنی ہو کرے، غرض عیدین میں معاملہ اصل وضع (حالت) پر ہے۔ اور ابتدائے اسلام میں جمعہ میں بھی خطبہ نماز کے بعد تھا لیکن ایک مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا کہ نبی ﷺ جمعہ پڑھا کر خطبہ دے رہے تھے کہ مدینہ میں ایک تجارتی قافلہ آیا، اس نے نقارہ بجایا اور اعلان کیا، تو سارا مجمع منتشر ہوگیا۔ بعض لوگ خریداری کرنے چلے گئے اور بعض لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے گئے۔ صرف بارہ آدمی رہ گئے، چنانچہ سورۃ الجمعۃ کی (آیت ۱۱) نازل ہوئی اور آئندہ اس قسم کا واقعہ پیش نہ آئے اس لئے خطبہ مقدم کردیا گیا (تفصیل تفسیر ابن کثیر میں ہے) علاوہ ازیں عیدین کی نوبت سال میں دو ہی مرتبہ آتی ہے اور اس میں خوب ذوق وشوق ہوتا ہے۔ لوگ پہلے سے تیاری کرکے آتے ہیں اس لئے عیدین میں اصل کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ اور جمعہ ہفتہ واری اجتماع ہے اس میں اگرچہ ذوق وشوق ہوتا ہے مگر عیدین جیسا نہیں ہوتا، بلکہ بعض لوگ سستی کرتے ہیں اور دیر سے آتے ہیں پس اگر خطبہ بعد میں ہوگا تو ان کی پوری نماز یا کوئی رکعت چھوٹ جائے گی، اس لئے خطبہ مقدم کیا گیا تاکہ دیر سے آنے والے بھی نماز سے محروم نہ رہیں۔

اب دو مسئلے سمجھنے چاہئیں:

پہلا مسئلہ: جمعہ کا خطبہ جب بعد میں تھا تو نماز کے لئے شرط نہیں تھا کیونکہ جو چیز بعد میں ہوتی ہے وہ شرط نہیں ہوتی۔ چنانچہ عیدین کا خطبہ بھی نماز کے لئے شرط نہیں، مگر جب جمعہ کا خطبہ مقدم کیا گیا تو اس کو نماز کے لئے شرط قرار دیا گیا، پس خطبہ کے بغیر جمعہ کی نماز صحیح نہیں ہوگی، اور خطبہ دینا شرط ہے اس کا سننا شرط نہیں۔ اگر مسجد میں سب مقتدی

بہرے ہوں یا سب سو رہے ہوں اور کسی نے بھی خطبہ نہ سنا ہو تو بھی نماز صحیح ہے۔

دوسرا مسئلہ: اگر کوئی شخص عیدین کے خطبے نماز سے پہلے دیدے تو کیا حکم ہے؟ امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں: وہ خطبہ محسوب (گنا ہوا) ہوگا، اور ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ یہ عمل سنت متوارثہ کے خلاف ہے۔ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں: وہ خطبہ محسوب نہیں ہوگا اور نماز صحیح ہوگی کیونکہ عیدین کے لئے خطبہ شرط نہیں، اور ایسا کرنے والا برا آدمی ہے۔

حدیث: ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما عیدین کی نمازیں خطبہ سے پہلے پڑھایا کرتے تھے پھر خطبہ دیتے تھے۔

تشریح: پہلے کئی جگہ یہ بات بتائی گئی ہے کہ نصوص میں جہاں بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ابو بکر و عمر کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے وہ عمل زندگی کے آخر تک کیا ہے، یہاں بھی ایسا ہی ہے۔ آپؐ نے ہمیشہ عیدین پہلے پڑھائی ہیں پھر خطبہ دیا ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ آپؐ کے بعد متصلاً جو دو بزرگ یکے بعد دیگرے آپؐ کے مصلی پر کھڑے ہوئے وہ بھی پہلے عیدین پڑھاتے تھے پھر خطبہ دیتے تھے ——— اور بنو امیہ نے عیدین سے پہلے خطبہ دینا اس لئے شروع کیا تھا کہ وہ اپنے خطبہ میں بنو ہاشم کی برائی کیا کرتے تھے، جسے لوگ سننا نہیں چاہتے تھے اس لئے جب وہ برائی شروع کرتے تو لوگ اٹھ کر چل دیتے، اس لئے انھوں نے خطبہ پہلے کردیا تھا تاکہ لوگ مجبوراً سنیں۔

[۲۶۸] باب ماجاء فی صلاۃ العیدین قبل الخطبۃ

[۵۴۰-] حدثنا محمدُ بنُ المُثنّٰی، نا أبو أُسامةَ، عن عُبَیدِ اللّٰہِ، عن نافعٍ، عن ابنِ عُمرَ، قال: کان رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وأبوبکرٍ وعمرُ یُصلُّوْنَ فی العِیْدَیْنِ قَبْلَ الخُطْبَۃِ، ثم یَخطُبُوْنَ.

وفی الباب: عن جابرٍ وابنِ عباسٍ، قال أبو عیسی: حدیثُ ابنِ عُمرَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ. والعملُ علی ھذا عندَ أھلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم وغیرِھِمْ أنَّ صلاۃَ العِیْدَیْنِ قَبْلَ الخُطْبَۃِ؛ ویقالُ: إِنَّ أوّلَ مَنْ خَطَبَ قَبْلَ الصَّلاۃِ: مَرْوَانُ بنُ الحَکَمِ.

بابٌ إِنَّ صَلاۃَ العِیْدَیْنِ بِغَیْرِ أَذَانٍ ولا إِقَامَۃٍ

عیدین کی نمازیں اذان واقامت کے بغیر ہیں

عیدین کے لئے نہ اذان ہے اور نہ اقامت، اس لئے کہ قاعدہ کلیہ ہے: اذان واقامت صرف فرائض کے لئے ہیں دیگر نمازوں کے لئے چاہے وہ واجب ہوں یا سنن مؤکدہ یا نفل: اذان واقامت مشروع نہیں، اور عیدین یا تو سنت

مؤکدہ ہیں یا واجب۔ فرض عین نہیں اس لئے ان کے لئے اذان واقامت بھی مشروع نہیں اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

جاننا چاہئے کہ امام اعظم رحمہ اللہ کے مفتی بہ قول کے مطابق عیدین واجب ہیں۔ فرض کا بھی ایک قول ہے مگر وہ مرجوح قول ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کا مرجوح قول یہ ہے کہ عیدین فرض عین ہیں اور مفتی بہ قول یہ ہے کہ فرض کفایہ ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے یہاں سنت مؤکدہ ہیں اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک سنت واجبہ ہیں۔ ظاہر ہے جب واجب کے ساتھ لفظ سنت بھی ہے تو وہ سنت مؤکدہ ہی کے معنی میں ہوگا۔ یعنی امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک عیدین سنت مؤکدہ ہیں۔

[۲۶۹] بابٌ: أنَّ صلاةَ العيدين بغير أذان ولا إقامة

[۵۴۱-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا أبو الأحْوَصِ، عن سِمَاكِ بنِ حَرْبٍ، عن جابرِ بنِ سَمُرَةَ، قال: صَلَّيْتُ مَعَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم العِيْدَيْنِ غَيْرَ مَرَّةٍ ولاَمَرَّتَيْنِ، بِغَيْرِ أَذَانٍ وَلا إِقَامَةٍ.

وفي الباب: عن جابر بنِ عبدِ اللهِ، وابنِ عَبَّاسٍ. قال أبو عيسى: وحديثُ جابرِ بنِ سَمُرَةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ. والعَمَلُ عليه عندَ أهلِ العلمِ من أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغيرِهم أن لاَيُؤَذَّنَ لِصَلاَةِ العِيْدَيْنِ، وَلا لِشَيْءٍ من النَّوافِلِ.

ترجمہ: جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بارہا (یہ غیر مرة ولا مرتین کا ترجمہ ہے اور یہ حال ہیں) عیدیں اذان واقامت کے بغیر پڑھی ہیں —— اس حدیث پر صحابہ اور ان کے علاوہ علماء کا عمل ہے کہ عیدین کی نماز کے لئے اور نوافل میں سے کسی بھی نماز کے لئے اذان نہ کہی جائے۔

بابُ القِرَاءَةِ فی العِیْدَیْنِ

عیدین میں مسنون قراءت

عیدین کی نمازوں میں لمبی قراءت کا ارادہ ہوتا تو آپ سورۂ ق اور سورۃ القمر پڑھتے تھے۔ اور ہلکی قراءت کرنا مقصود ہوتا تھا تو سورۃ الاعلی اور سورۃ الغاشیہ پڑھتے تھے۔ پہلی دوسورتوں میں اختصار کے ساتھ قرآن کریم کے تمام مقاصد بیان کئے گئے ہیں اور بہت بڑے اجتماع کے موقع پر اسی کی ضرورت ہوتی ہے کہ جامعیت کے ساتھ دین کا خلاصہ لوگوں کے سامنے آجائے۔ اور آخری دوسورتوں میں آخرت کی منظر کشی ہے، اور آخرت کی زندگی کو بنانے کی ترغیب ہے، یہ مضامین بھی اہم اجتماع کے لئے موزوں ہیں۔

پہلی حدیث: نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ عیدین میں اور جمعہ میں سورۃ الاعلی اور

سورۃ الغاشیہ پڑھا کرتے تھے اور کبھی دونوں (عیداور جمعہ) ایک دن میں اکٹھے ہوجاتے تھے تو آپ دونوں نمازوں میں ان سورتوں کو پڑھتے تھے۔

تشریح: اس حدیث کو ابراہیم بن محمد سے ابوعوانہ، سفیان ثوری اور مسعر روایت کرتے ہیں اور وہ سب حبیب بن سالم کے بعد عن ابیہ نہیں بڑھاتے، حبیب بن سالم حضرت نعمان بن بشیر کے آزاد کردہ ہیں وہ نعمان بن بشیر سے براہ راست روایت کرتے ہیں اپنے والد کے واسطہ سے روایت نہیں کرتے۔

اور اس حدیث کو ابراہیم بن محمد سے سفیان بن عیینہ نے بھی روایت کیا ہے اور ان کے تلامذہ میں اختلاف ہے۔ بعض حبیب بن سالم کے بعد عن ابیہ کا اضافہ کرتے ہیں اور بعض اضافہ نہیں کرتے، اور صحیح عن ابیہ کا اضافہ نہ ہونا ہے اس لئے کہ حبیب نے نعمان بن بشیرؓ سے براہ راست حدیثیں روایت کی ہیں، اور ان کے والد روایتِ حدیث میں معروف نہیں۔

فائدہ: جاننا چاہئے کہ اگر جمعہ اور عید ایک ساتھ اکٹھا ہوجائیں تو حنفیہ کے نزدیک گاؤں سے عید پڑھنے کے لئے جو لوگ شہر میں آتے ہیں اگر وہ زوال سے پہلے گاؤں لوٹ جائیں تو ان پر جمعہ فرض نہیں، اور جو دیہاتی زوال تک شہر میں رہیں ان پر اور محلِ اقامت جمعہ میں رہنے والوں پر جمعہ فرض ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں: اگر عید اور جمعہ اکٹھے ہوں تو عید کی نماز تو ضروری ہے جمعہ ضروری نہیں۔ جمعہ بھی پڑھ سکتے ہیں اور ظہر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

دوسری حدیث: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوواقد لیثی سے دریافت کیا: نبی ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں کونسی سورتیں پڑھتے تھے؟ انھوں نے کہا: سورۂ قاف اور سورۂ قمر پڑھا کرتے تھے۔

[۲۷۰] بابُ القراءة في العيدين

[۵۴۲-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا أبو عَوَانَةَ، عن إبراهيمَ بنِ محمدِ بنِ المُنْتَشِرِ، عن أبيه، عن حبيبِ بنِ سالمٍ، عن النُّعْمَانِ بنِ بَشِيْرٍ، قال: كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم يَقْرَأُ في العِيْدَيْنِ وفي الجمعةِ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الأَعْلٰى، وهَلْ أَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ، وَرُبَّمَا اجْتَمَعَا في يَوْمٍ واحدٍ فَيَقْرَأُ بِهِمَا.

وفي الباب: عن أبي واقِدٍ، وسَمُرَةَ بن جُنْدُبٍ، وابنِ عباسٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ النعمانِ بنِ بَشِيْرٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وهكذا رَوَى سفيانُ الثوريُّ، ومِسْعَرٌ، عن إبراهيمَ بنِ محمدِ بنِ المُنْتَشِرِ مِثْلَ حديثِ أبي عَوَانَةَ.

وأما ابن عُيَيْنَةَ فَيُخْتَلَفُ عَلَيْهِ في الرِّوَايَةِ: فَيُرْوَى عنه عن إبراهيمَ بنِ محمدِ بنِ المُنْتَشِرِ، عن أبيه، عن حَبِيبِ بنِ سالمٍ، عن أبيه، عن النُّعْمَانِ بنِ بَشِيْرٍ، وَلَا يُعْرَفُ لِحَبِيْبِ بنِ سالمٍ رِوَايَةٌ عن

أبيه، وحبيبُ بنَ سالمٍ هُوَ مَوْلَى النُّعمانِ بنِ بشير، وروى عن النعمان بن بشير أحاديثَ، وقد رُوِيَ عن ابنِ عُيَيْنَةَ عن إبراهيمَ بنِ محمدِ بنِ المُنْتَشِرِ نحوُ رِوايةِ هؤُلاءِ.

وَرُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أنَّهُ كانَ يَقرأُ في صَلاةِ العِيدَيْنِ بِقاف واقتربَتِ السَّاعَةُ، وبه يقولُ الشافعيُّ.

[۵۴۳-] حدثنا إسحاقُ بنُ مُوسى الأَنصارِيُّ، نا مَعْنُ بنُ عيسى، نا مالكٌ، عن ضَمْرَةَ بنِ سعيدٍ المَازِنِيِّ، عن عُبَيْدِ اللهِ بنِ عبدِ اللهِ بنِ عُتْبَةَ، أنَّ عُمرَ بنَ الخطابِ سَأَلَ أبَا وَاقِدٍ اللَّيْثِيَّ: ماكان رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يَقرأُ بِهِ في الفِطْرِ وَالأَضحى؟ قال: كان يَقرأُ بقاف والقرآن المجيد، واقتربتِ الساعةُ وانشقَّ القَمَرُ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

حدثنا هَنَّادٌ، نا ابنُ عُيَيْنَةَ، عن ضَمْرَةَ بنِ سَعيدٍ، بهذا الإسناد نَحْوَهُ.

قال أبو عيسى: وأبووَاقِدٍ اللَّيْثِيُّ: اسْمُه الحَارِثُ بنُ عَوْفٍ.

ترجمہ: امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی حدیث حسن صحیح ہے۔ اوراسی طرح روایت کیا ہے سفیان ثوری اور مسعر نے ابراہیم بن محمد سے ابوعوانہ کی سند کی طرح (یعنی یہ حضرات بھی حبیب بن سالم کے بعد عن أبیہ کا اضافہ نہیں کرتے)

اور رہے سفیان بن عیینہ تو ان پر روایت میں اختلاف کیا گیا (یعنی ان کے شاگردوں میں اختلاف ہے) پس ابن عیینہ سے روایت کیا جاتا ہے عن إبراهيم الی آخرہ (اس سند میں حبیب کے بعد عن أبیہ کا اضافہ ہے) اور حبیب کی ان کے والد سے روایت معروف نہیں، اور حبیب حضرت نعمانؓ کے آزاد کردہ ہیں، اور انھوں نے حضرت نعمان سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں۔ اور ابن عیینہ سے ابراہیم بن محمد کی سند سے اُن حضرات کے مانند بھی روایت کیا گیا ہے (یعنی ابن عیینہ کے بعض تلامذہ ابوعوانہ، سفیان ثوری اور مسعر کی طرح عن ابیہ کے اضافہ کے بغیر بھی روایت کرتے ہیں)

اور رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا گیا کہ آپ عیدین کی نمازوں میں سورۂ ق اور سورۃ القمر پڑھتے تھے، اور امام شافعی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ اس کے بعد امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہی حدیث سند کے ساتھ روایت کی ہے — اس حدیث میں مدار الاسناد ضمرۃ بن سعید ہیں۔ ان سے امام مالک اور سفیان بن عیینہ دونوں روایت کرتے ہیں، اور ابن عیینہ کی سند عالی ہے، کیونکہ مصنف اور مدار الاسناد کے درمیان صرف ہناد اور ابن عیینہ کا واسطہ ہے اور امام مالک کی سند میں تین واسطے ہیں یعنی اسحاق بن موسیٰ انصاری، معن بن عیسیٰ اور امام مالک، پس وہ سند نازل ہے — اور ابوواقد اللیثی کا نام حارث بن عوف ہے۔

بابُ التَّکْبِیْرِ فی العِیْدَیْنَ

عیدین میں زائد تکبیروں کا بیان

مذاہبِ فقہاء: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک عیدین کی پہلی رکعت میں قراءت سے پہلے سات تکبیریں ہیں، اور دوسری رکعت میں قراءت سے پہلے پانچ تکبیریں ہیں۔ پھر ان میں اختلاف ہے کہ پہلی رکعت میں جو سات تکبیریں ہیں وہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ سات ہیں یا اس کے ساتھ سات ہیں؟ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تکبیر تحریمہ کے علاوہ سات ہیں اس لئے ان کے نزدیک زائد تکبیریں کل بارہ ہیں۔ اور امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک سات میں تکبیر تحریمہ بھی شامل ہے پس ان کے نزدیک تکبیرات زوائد گیارہ ہیں۔

اور حنفیہ کے نزدیک تکبیرات زوائد چھ ہیں، تین پہلی رکعت میں ثناء کے بعد قراءت سے پہلے، اور تین دوسری رکعت میں قراءت کے بعد رکوع سے پہلے۔ اور تکبیر تحریمہ اور رکوع کی تکبیریں ملا کر دونوں رکعتوں میں کل نو تکبیریں ہیں۔ پہلی رکعت میں پانچ: ایک تکبیر تحریمہ، تین تکبیرات زوائد اور ایک رکوع کی تکبیر، اور دوسری رکعت میں چار ہیں: تین تکبیرات زوائد اور ایک رکوع کی تکبیر۔

حدیث: عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عیدین کی پہلی رکعت میں سات تکبیریں کہتے تھے، قراءت سے پہلے۔ اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں کہتے تھے قراءت سے پہلے۔

تشریح: یہ حدیث ائمہ ثلاثہ کی دلیل ہے، اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو باب کی سب سے اچھی روایت بتایا ہے مگر فی نفسہ یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ یہ حدیث کثیر بن عبداللہ، عن ابیہ، عن جدہ کی سند سے ہے اور یہ مشہور متکلم فیہ سند ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں پہلے اس سند کی حدیثیں لکھی تھیں پھر سب قلم زد کر دیں اور مسند سے نکال دیں۔ اور محدثین نے امام ترمذی رحمہ اللہ کے اس فیصلہ پر کہ یہ باب کی سب سے اچھی روایت ہے نقد کیا ہے۔ اور عبداللہ بن عمرو بن العاص کی حدیث کو اصح بتایا ہے جو ابوداؤد (حدیث ۱۱۵۱) میں ہے، مگر وہ بھی ضعیف ہے، اس میں عبداللہ بن عبدالرحمٰن الطائفی متکلم فیہ راوی ہے۔ امام بخاری، امام نسائی اور ابوحاتم نے اس کی تضعیف کی ہے۔

حنفیہ کی دلیل: ابوداؤد (حدیث ۱۱۵۳) کی حدیث ہے: سعید بن العاص نے ابوموسیٰ اشعری اور حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہما سے پوچھا: رسول اللہ ﷺ عیدین میں زائد تکبیریں کتنی کہتے تھے؟ ابوموسیٰ نے فرمایا: چار تکبیریں کہتے تھے، جنازہ کی تکبیروں کی طرح (پہلی رکعت میں تحریمہ کے ساتھ چار تکبیریں اور دوسری رکعت میں رکوع کی تکبیر کے ساتھ چار تکبیریں) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اس کی تصدیق کی کہ ابوموسیٰ نے ٹھیک بتایا۔ پھر ابوموسیٰؓ نے فرمایا: میں جب بصرہ کا گورنر تھا اور وہاں عید پڑھاتا تو اسی طرح تکبیر کہتا تھا ——— اس حدیث کی سند قوی ہے۔ اور

بعض حضرات نے اس کے ایک راوی ابو عائشہ کو جو مجہول الحال بتایا ہے وہ صحیح نہیں۔ یہ ثقہ راوی ہے، وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ہم نشین تھے اور محمد بن ابی عائشہ اور موسیٰ بن ابی عائشہ کے والد ہیں۔

دوسری دلیل: شرح معانی الآثار (کتاب الجنائز ۱:۳۱۹) میں سند قوی کے ساتھ ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو اختلافی مسائل تمام صحابہ کے مشورے سے طے ہوئے ان میں یہ مسئلہ بھی ہے کہ عیدین کی نمازوں میں چار چار تکبیریں کہی جائیں (پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے ساتھ چار تکبیریں اور دوسری رکعت میں رکوع کی تکبیر کے ساتھ چار تکبیریں)

تیسری دلیل: شرح معانی الآثار (کتاب الزیادات ۲:۳۷۱) میں صحیح سند کے ساتھ حدیث ہے: قاسم ابو عبدالرحمٰن کہتے ہیں: مجھ سے متعدد صحابہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں عید کی نماز پڑھائی اور چار چار تکبیریں کہیں، پھر سلام پھیرنے کے بعد آپؐ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''اس عمل کو بھول نہ جانا، عیدین میں جنازہ کی طرح تکبیریں ہیں'' اس وقت آپؐ نے انگوٹھے بند کر کے انگلیوں سے اشارہ بھی کیا کہ چار چار تکبیریں ہیں۔

غرض رسول اللہ ﷺ سے بارہ یا گیارہ تکبیراتِ زوائد بھی مروی ہیں اور چار چار بھی ثابت ہیں۔ اور آپؐ کا آخری عمل چار چار تکبیریں کہنے کا تھا، اور دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اس پر صحابہ کا اجماع ہوا ہے اور حضرت ابو موسیٰ کا جواب اور حضرت حذیفہ کی تصدیق بھی اس کی دلیل ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ یہ اختلاف اولیٰ غیر اولیٰ کا ہے، جواز وعدم جواز کا نہیں۔ احناف چار چار تکبیروں کو افضل قرار دیتے ہیں اور ائمہ ثلاثہ گیارہ یا بارہ تکبیروں کو افضل کہتے ہیں اور یہ اختلاف نقطۂ نظر کا اختلاف ہے۔ حنفیہ کا خیال ہے کہ یہ تکبیراتِ زوائد ہیں اور بھرتی کی چیز کم سے کم ہونی چاہئے اس لئے کم سے کم تکبیروں والی روایت لی ہے اور ائمہ ثلاثہ کا رجحان یہ ہے کہ یہ تکبیرات عیدین کا امتیاز ہیں، اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ (آیت ۱۸۵) میں فرمایا ہے: ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾: اور تاکہ تم اللہ کی بزرگی بیان کرو اس پر کہ انھوں نے تم کو ہدایت دی یہ عیدین کی نمازوں کی طرف اشارہ ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو تکبیر سے تعبیر کیا ہے پس تکبیراتِ زوائد عیدین کی نمازوں کا امتیاز ہیں۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ تکبیروں والی روایت کو لینا چاہئے۔ واللہ اعلم

[۲۷۱] بابُ التکبیر فی العیدین

[۵٤٤-] حدثنا مُسْلِمُ بنُ عَمْرٍو أبُوعَمْرٍو الحَذَّاءُ المدِينِيُّ، نا عبدُ الله بنُ نافِعٍ، عن كثيرِ بنِ عبدِاللهِ، عن أبيه، عن جدِّهِ، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كَبَّرَ في العيدينِ في الأُولٰى سَبْعًا قَبْلَ القِرَاءَةِ، وفي الآخِرَةِ خَمْسًا قَبْلَ القِرَاءَةِ.

وفى الباب: عن عائشةَ، وابنِ عُمَرَ، وعبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو.

قال أبو عيسى: حديثُ جَدِّ كثيرٍ حديثٌ حسنٌ، وهو أحْسَنُ شيءٍ رُوِيَ فى هذا البابِ، عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم، واسمُه: عَمْرُو بنُ عَوْفٍ المُزَنِيُّ، والعملُ على هذا عند بعضِ أهلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغيرِهِمْ، وهٰكذا رُوِيَ عن أبى هريرةَ أنَّهُ صَلَّى بالمَدِينَةِ نَحْوَ هٰذه الصلاةِ، وهو قولُ أهلِ المدينةِ، وبه يقولُ مالكُ بنُ أنَسٍ، والشافعيُّ، وأحمدُ، وإسحاقُ.

[٥٤٥-] ورُوِيَ عن ابنِ مسعودٍ أنَّهُ قال فى التَّكْبِيْرِ فى العيدَيْنِ: تِسْعُ تكبيراتٍ: فى الركعةِ الأُولَى خَمْسُ تكبيراتٍ قبلَ القِرَاءَةِ، وفى الركعةِ الثَّانِيَةِ يَبْدَأُ بِالْقِرَاءَةِ، ثُمَّ يُكَبِّرُ أَرْبَعًا مَعَ تكبيرةِ الركوعِ.

وقد رُوِيَ عن غيرِ واحدٍ مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم نَحْوُ هٰذا، وَهُوَ قولُ أهلِ الكوفةِ، وبه يقولُ سفيانُ الثوريُّ.

ترجمہ: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کثیر کے دادا کی حدیث حسن ہے اور وہ اس باب کی سب سے اچھی مرفوع روایت ہے (خیال رہے کہ امام ترمذی کا حسن: فن کے ضعیف کے ساتھ اکٹھا ہوتا ہے چنانچہ حضرت مصنف رحمہ اللہ کے اس فیصلہ پر بعض محدثین نے نقد کیا ہے۔ اور عبداللہ بن عمرو بن العاص کی روایت کو اصح مافی الباب قرار دیا ہے) اور کثیر کے دادا کا نام عمرو بن عوف المزنی ہے اور اس حدیث پر صحابہ اور ان کے علاوہ بعض علماء کا عمل ہے۔ اور اسی طرح حضرت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے مدینہ میں اس طرح عید کی نماز پڑھائی (یعنی سات اور پانچ تکبیرات زوائد کہیں) اور یہ مدینہ والوں کا قول ہے یعنی حجازی فقہاء کی یہی رائے ہے اور یہی بات امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کہتے ہیں۔

اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؓ نے عیدین کی تکبیروں کے بارے میں فرمایا کہ وہ نو تکبیریں ہیں، پہلی رکعت میں پانچ تکبیریں قراءت سے پہلے (یہ بات للأكثر حكمُ الكل کے ضابطہ سے کہی ہے ورنہ ایک تکبیر یعنی رکوع کی تکبیر قراءت کے بعد ہے) اور دوسری رکعت میں قراءت سے شروع کرے پھر چار تکبیریں کہے رکوع کی تکبیر کے ساتھ۔ اور متعدد صحابہ سے ایسا ہی روایت کیا گیا ہے اور یہ کوفہ والوں کا قول ہے، یعنی عراقی فقہاء کی یہی رائے ہے اور اسی کے سفیان ثوری قائل ہیں۔

بابُ لَاصَلَاةَ قَبْلَ العِيْدَيْنِ ولَا بَعْدَهُمَا

عیدین سے پہلے اور بعد میں نفلیں نہیں

نبی ﷺ کا معمول نماز عید سے پہلے اور اس کے بعد نفلیں پڑھنے کا نہیں تھا، اور چاروں ائمہ اس پر متفق ہیں۔ اور

عورتیں جن کو عید کی نماز میں شریک نہیں ہونا وہ عید کی نماز سے پہلے گھر میں اشراق اور دیگر نوافل پڑھ سکتی ہیں۔ اور مردوں کو نماز عید سے پہلے تو گھر میں کوئی نفل نماز نہیں پڑھنی چاہئے، البتہ عید کے بعد گھر میں نفلیں پڑھ سکتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا واقعہ ہے: ایک شخص عیدگاہ میں نفل پڑھ رہا تھا، کسی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: آپ اس کو روکتے نہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: مجھے اندیشہ ہے کہیں سورہ علق کی آیات (۹و۱۰) ﴿أَرَأَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى عَبْدًا إِذَا صَلّٰى﴾ کا مصداق نہ بن جاؤں، اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ عید سے پہلے نفل نہ پڑھنا سنت ہے۔

اورعیدین سے پہلے اور اس کے بعد نفلیں نہ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ سنن ونوافل فرائض کے آگے پیچھے مشروع ہیں اور عیدین کی نمازیں بالاجماع فرض عین نہیں، علاوہ ازیں سنتیں مصلحتاً تجویز کی گئی ہیں، جن نمازوں سے پہلے سستی ہوتی ہے جیسے ظہر اور فجر کے وقت سو کر اٹھنے کی وجہ سے، وہاں سنن قبلیہ رکھی گئیں ہیں، تاکہ سنت پڑھنے سے سستی دور ہو اور فرض نشاط کے ساتھ ادا ہو، اور ظہر، مغرب اور عشاء کے بعد چونکہ مشاغل ہیں، ظہر اور مغرب کے بعد تو کاروبار ہے اور عشاء کے بعد سونا ہے اس لئے سنن بعدیہ رکھی گئیں ہیں تاکہ فرض کی آخری رکعت میں کاروبار شروع نہ ہوجائے، اور فجر اور عصر کے بعد بھی اگرچہ مشغلہ ہے مگر ان کے بعد مکروہ اوقات آتے ہیں اس لئے وہاں سنن تجویز نہیں ہوئیں۔ کیونکہ جو شخص دیر سے فجر اور عصر پڑھے گا ممکن ہے وہ مکروہ وقت میں سنتیں پڑھے۔ اور عیدین سے پہلے سستی نہیں ہوتی کیونکہ وہ نو دس بجے پڑھی جاتی ہیں پھر ان نمازوں کے لئے صبح ہی سے تیاری ہوتی ہے اور ان کے بعد کوئی مشغلہ بھی نہیں، وہ چھٹی کے دن ہیں اس لئے عیدین کے آگے پیچھے سنتیں تجویز نہیں ہوئیں۔ واللہ اعلم

[۲۷۲] بابُ لاصلاةَ قبلَ العيدين ولا بعدهما

[٥٤٦-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، نا أبو داودَ الطَّيَالِسِيُّ، أَنْبَأَنَا شعبةُ، عن عَدِيِّ بنِ ثابتٍ، قال: سمعتُ سَعِيدَ بنَ جُبَيْرٍ يُحَدِّثُ عن ابنِ عباسٍ: أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم خَرَجَ يَوْمَ الْفِطْرِ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ، ثم لَمْ يُصَلِّ قَبْلَهَا وَلَا بَعْدَهَا.

وفي الباب: عن عبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، وأبي سعيدٍ. قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عباسٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

والعملُ عليه عِندَ بعضِ أهلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغَيْرِهم، وبه يقولُ الشافعيُّ وأحمدُ وإسحاقُ، وقد رَأَى طَائِفَةٌ مِن أهلِ العلمِ الصَّلَاةَ بَعْدَ صلاةِ العِيْدَيْنِ وقَبْلَهَا مِنْ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغَيْرِهِمْ، والقولُ الأوّلُ أَصَحُّ.

[٥٤٧-] حدثنا الحسينُ بنُ حُرَيْثٍ أبو عَمَّارٍ، نا وكيعٌ، عن أبانَ بنِ عبدِ اللهِ البَجَلِيِّ، عن أبي بكرِ

بنِ حَفْصٍ، وهو ابنُ عُمرَ بنِ سعدِ بنِ أبى وَقَّاصٍ، عن ابنِ عُمَرَ، أنَّهُ خَرَجَ يومَ عيدٍ، ولَمْ يُصَلِّ قَبْلَهَا ولاَ بَعْدَهَا، وذَكَرَ أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم فَعَلَهُ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے دن نکلے پس آپؐ نے دو رکعتیں پڑھیں، پھر نہ اس سے پہلے کوئی نماز پڑھی اور نہ اس کے بعد —— اور اس پر بعض صحابہ اور ان کے علاوہ علماء کا عمل ہے۔ اور شافعی، احمد اور اسحاق اسی کے قائل ہیں (اب یہ اجماعی مسئلہ ہے) اور صحابہ اور ان کے علاوہ علماء کی ایک جماعت عیدین کی نمازوں کے بعد اور اس سے پہلے (عیدگاہ میں اور گھر میں) نفل نماز کی قائل ہے اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

(دوسری حدیث) ابن عمرؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ عید کے دن نکلے اور عید سے پہلے اور اس کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھی، اور بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی طرح کیا (اس آخری جملہ سے حدیث مرفوع ہوگئی)

بابٌ فى خُرُوْجِ النِّسَاءِ فى العِيْدَيْنِ

عیدین میں عورتوں کی شرکت کا مسئلہ

عورتوں کے عیدگاہ جانے کے سلسلہ میں امام اعظمؒ سے اجازت اور ممانعت دونوں طرح کے قول مروی ہیں۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جوان عورت کو عیدگاہ نہیں جانا چاہئے، بوڑھی عورت جاسکتی ہے، اور امام محمدؒ سے کچھ مروی نہیں، اور ابن المبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر عورت عیدگاہ جانے پر اصرار کرے اور وہ روز مرہ کے اور کام کاج کے کپڑوں میں جانے پر راضی ہو تو شوہر اجازت دے۔ اور اگر وہ اس پر راضی نہ ہو، بناؤ سنگھار کے ساتھ اور نئے کپڑوں میں جانے پر اصرار کرے تو شوہر کو حق ہے کہ اُسے جانے سے روک دے۔ اس لئے کہ اب وہ نماز پڑھنے کے لئے نہیں جارہی بلکہ اپنے سوٹ اور زیورات کی نمائش کرنے کے لئے جارہی ہے۔ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عورتوں کے لئے عیدگاہ جانا مکروہ ہے، اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: آج کل عورتوں نے جو نئے طریقے نکالے ہیں اگر وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آتے تو آپؐ عورتوں کو مسجد جانے سے منع فرمادیتے، حضرت عائشہ کا یہ ارشاد پنج وقتہ نمازوں کے بارے میں ہے پس اس سے عیدین اور جمعہ کی نمازوں کے لئے جانے کی ممانعت بھی بدرجۂ اولیٰ نکل آئی۔

مسئلہ: عورتوں کا جمعہ اور دیگر نمازوں کے لئے مسجد جانا یا عیدین پڑھنے کے لئے عیدگاہ جانا فی نفسہ جائز ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں عورتیں مسجد نبوی میں اور عیدین کی نمازوں میں حاضر ہوتی تھیں، لیکن اب لغیرہ یعنی خوف فتنہ کی وجہ سے ممنوع ہے۔ جاننا چاہئے کہ جو چیز لغیرہ یعنی کسی دوسری چیز کی وجہ سے واجب یا ممنوع ہوتی ہے اس

پر دلیل کا مطالبہ صحیح نہیں۔ دلیل واجب لعینہ اور ممنوع لعینہ کی ہوتی ہے، واجب لغیر ہ اور ممنوع لغیر ہ میں تو اس غیر میں غور کرنا چاہئے کہ اس میں ایجاب وتحریم کی صلاحیت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو وجوب یا حرمت مان لینی چاہئے، ورنہ قصہ بالائے طاق! عورتوں کے لئے مسجد یا عیدگاہ جانے کی جو ممانعت ہے وہ بھی لغیر ہ ہے اور وہ غیر ہے خوف فتنہ، اگر یہ وجہ معقول ہے تو عورتوں کو مسجد اور عیدگاہ نہیں جانا چاہئے۔

اس کی نظیر: نفسِ تقلید اور تقلید شخصی کا وجوب ہے۔ یہ بھی واجب لعینہ نہیں ہیں، بلکہ لغیر ہ واجب ہیں۔ کیونکہ تقلید اگر واجب لعینہ ہوتی تو مجتہد پر بھی واجب ہوتی، حالانکہ اس پر بالاجماع تقلید واجب نہیں۔ اور یہاں غیر یہ ہے کہ شریعت پر عمل کرنا فرض ہے۔ اور ہر شخص از خود قرآن وحدیث سے مسائل اخذ نہیں کرسکتا۔ پس کسی نہ کسی سے پوچھ کر عمل کرنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ یعنی اگر تم خود نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھو اور اس پر عمل کرو، پس عوام کو لامحالہ کسی کی تقلید کرنی ہوگی۔ تقلید کے بغیر زندگی کی گاڑی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی، چاہے دنیوی معاملات ہوں یا دینی معاملات، فن کے ماہرین کی تقلید تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ غرض تقلید واجب لعینہ نہیں بلکہ واجب لغیر ہ ہے۔ اسی طرح تقلید شخصی بھی واجب لغیر ہ ہے کیونکہ اگر تقلید شخصی نہیں کی جائے گی تو لوگ رخصتیں تلاش کریں گے جس عالم کا قول خواہش نفس کے مطابق ہوگا اس کو لیں گے اور جو قول خواہش کے خلاف ہوگا اس کو چھوڑ دیں گے۔ پس یہ شریعت پر عمل نہیں ہوگا بلکہ تشہّی کا دروازہ کھل جائے گا۔

غرض جس طرح تقلید اور تقلید شخصی واجب لغیر ہ ہیں اسی طرح عورتوں کا عیدگاہ اور مسجد جانا بھی ممنوع لغیر ہ ہے، اور وہ غیر ہے فتنہ کا اندیشہ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

حدیث: ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عیدین میں لے جایا کرتے تھے کنواری لڑکیوں کو، سیانی لڑکیوں کو (وہ لڑکی جو اتنی بڑی ہوگئی ہو کہ ماں باپ اس کو ڈانٹ نہ سکتے ہوں وہ سیانی کہلاتی ہے) اور پردہ نشین خواتین کو، اور حائضہ اور نفاس والی عورتوں کو (یعنی سب عورتوں کو حکم تھا کہ عیدگاہ پہنچیں) رہی حائضہ تو وہ عیدگاہ میں ایک طرف الگ بیٹھتی تھیں (وہ نماز نہیں پڑھتی تھیں، کیونکہ نماز کے لئے طہارت شرط ہے) اور وہ مسلمانوں کے وعظ ونصیحت میں شریک ہوتی تھیں۔ ایک عورت نے کہا: اے اللہ کے رسول! اگر کسی کے پاس اوڑھنا (آج کی اصطلاح میں برقعہ) نہ ہو تو؟ آپؐ نے فرمایا: ''اس کی بہن اس کو اپنے اوڑھنے میں سے عاریت دیدے'' یعنی جس کے پاس برقعہ زائد ہے وہ ایسی عورت کو مستعار دیدے جس کے پاس برقعہ نہیں ہے یا ایک چادر میں دو لپٹ کر جائیں۔

تشریح: یہ حدیث غیر مقلدین لئے پھرتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ عورتوں کو پانچوں نمازوں میں مسجد میں اور عیدگاہ میں جانا چاہئے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب حضور اکرم ﷺ نے عورتوں کو عیدگاہ جانے کا حکم دیا اور مسجد نبوی میں عورتیں آتی تھیں تو آج بھی عورتوں کو مسجد اور عیدگاہ جانا چاہئے۔ حالانکہ اس حدیث میں صاف اشارہ ہے کہ آنحضور ﷺ کے

زمانہ میں عورتیں جو عیدگاہ جاتی تھیں تو مقصود نماز نہیں تھی بلکہ تعلیم مقصود تھی، ظاہر ہے حائضہ اور نفاس والی عورتوں کے لئے عیدگاہ جانالا حاصل ہے کیونکہ ان کے لئے نماز پڑھنا جائز نہیں۔ پھر بھی آپؐ نے ان کو عیدگاہ جانے کا حکم دیا تھا۔

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ دین نیا نازل ہو رہا تھا، مرد وزن سب اس کو سیکھنے کے محتاج تھے۔ اور عیدین کے موقع پر آنحضرت ﷺ اہم اور قیمتی نصائح بیان فرماتے تھے اس لئے ہر مرد وزن کو عیدگاہ چلنے کا حکم تھا، تاکہ سب احکام شریعت اخذ کریں۔ اور اب وہ مقصد باقی نہیں رہا، دین مکمل ہو چکا اور وہ کتابوں میں محفوظ ہے، بچے بچپن ہی سے تدریجاً اس کو حاصل کرتے ہیں۔ اور لوگوں کے احوال بھی بدل گئے، فیشن کا دور ہے، طبیعتیں شر پسند ہوگئی ہیں۔ پس فتنہ کا اندیشہ ہے۔ ان بدلے ہوئے احوال میں مسئلہ یہ ہے کہ عورتوں کو نہ تو فرض نمازوں کے لئے مسجد جانا چاہئے اور نہ جمعہ کے لئے جامع مسجد اور عیدگاہ جانا چاہئے۔ دیوبند کے اسٹیشن پر ایک مرتبہ ایک غیر مسلم نامہ نگار نے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم صاحب سے سوال کیا کہ کیا عورتوں کے لئے مسجد میں جانا حرام ہے، مہتمم صاحب نے جواب دیا: نہیں! عورتیں پاکی کی حالت میں مسجد میں آسکتی ہیں اور آتی ہیں۔ ان لوگوں نے کہا: دارالعلوم سے فتوی عدم جواز کا شائع ہوا ہے۔ مہتمم صاحب نے کہا: وہ فتوی پانچوں نمازوں میں اور خاص طور پر رات کی نمازوں میں جماعت میں شریک ہونے کے سلسلہ میں ہے۔ اس کو مفتیانِ کرام نے خوف فتنہ کی وجہ سے ممنوع قرار دیا ہے، جس طرح عورتوں کے لئے تنہا سفر کرنا ممنوع ہے۔ ان لوگوں نے کہا: ہم تو مسجد کو عبادت گاہ اور جائے امن سمجھتے ہیں۔ مہتمم صاحب نے فرمایا: فتنہ مسجد میں نہیں ہے، گھر سے نکل کر مسجد آنا، پھر واپس جانا، خاص طور پر جب مسجد دور ہو اور رات تاریک ہو تو ہر طرح فتنہ کا اندیشہ ہے اور ہر نماز میں اس کو اس کا شوہر یا کوئی محرم لے کر مسجد میں آئے یہ بات تقریباً ناممکن ہے، اس لئے نماز جو اہم ترین عبادت ہے اس کو ہر طرح محفوظ کرنے کے لئے دور صحابہ سے یہ فتوی چلا آرہا ہے۔ آج یہ کوئی نیا فتوی نہیں دیا گیا۔ ان لوگوں نے یہ بات تسلیم کی کہ زمانہ بہت برا چل رہا ہے، عورت کسی طرح گھر سے باہر نکل کر محفوظ نہیں، لوگ بری نظریں اس پر ضرور ڈالتے ہیں اس لئے یہ فتوی صحیح ہے۔

فائدہ (۱): حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے علاوہ نو مسجدیں اور بھی تھیں۔ مگر عورتیں صرف مسجد نبوی میں آتی تھیں، مدینہ کی دیگر مساجد میں شاذ و نادر ہی جاتی تھیں۔ اور آپؐ کے زمانہ میں عورتیں مسجد نبوی میں تین وجہ سے آتی تھیں۔ اول: اخذِ شریعت کے لئے۔ دوم: آپؐ کی زیارت کے لئے۔ سوم: جگہ کی برکت کی وجہ سے، اور مسجد حرام میں دو مقصد سے آتی تھیں: بیت اللہ کا طواف کرنے کے لئے اور جگہ کی برکت کی وجہ سے۔ مسجد حرام میں تو آج بھی وہ دونوں باتیں متحقق ہیں، اور مسجد نبوی میں اب پہلی وجہ باقی نہیں رہی، کیونکہ دین مکمل ہو چکا اور وہ کتابوں میں محفوظ ہے۔ البتہ جگہ کی برکت اور حضور اکرم ﷺ کی قبر اطہر کی زیارت: یہ دو مقصد آج بھی باقی ہیں اس لئے عورتیں ان دو مسجدوں میں جاسکتی ہیں بلکہ جانا چاہئے۔ ہماری عورتیں بھی نہ صرف جاتی ہیں بلکہ ہم

ان کوترغیب دیتے ہیں کہ حرم شریف میں جائیں۔ اس لئے کہ ان کو زندگی میں ایک بار یہ موقع ملا ہے، بار بار یہ موقع ان کو ملنے والا نہیں اور وہاں فتنہ کا اندیشہ بھی نہیں۔ اس لئے حرمین شریفین کا حکم دوسری مساجد سے مختلف ہے۔

فائدہ (۲): یہ جو مسئلہ ہے کہ عورتوں کو مسجد نہیں جانا چاہئے اس کا ردعمل یہ ہوا ہے کہ عورتیں بازار میں یا اسٹیشن پر یا پبلک مقامات میں ہوتی ہیں اور نماز کا وقت ہو جاتا ہے اور نماز پڑھنے کے لئے کوئی جگہ میسر نہیں ہوتی تو وہ نماز قضا کر دیتی ہیں مگر مسجد میں جاکر نماز نہیں پڑھتیں، کیونکہ ذہن یہ بن گیا ہے کہ عورتوں کو مسجد نہیں جانا چاہئے حالانکہ مسجدیں مردوں کی جاگیر نہیں ہیں، ایسی مجبوری میں عورتوں کو مسجد میں جاکر کسی علحدہ جگہ میں نماز پڑھنی چاہئے۔ اور اتفاقاً جماعت ہو رہی ہو تو وہ جماعت میں بھی شرکت کر سکتی ہیں، ان کو نماز بہر حال قضا نہیں کرنی چاہئے بلکہ پبلک مقامات میں جو مسجدیں ہیں ان میں عورتوں کے نماز پڑھنے کے لئے علحدہ انتظام ہونا چاہئے، ان کا دروازہ الگ ہو، ان کے وضو وغیرہ کا انتظام الگ ہو تا کہ عورتیں اپنے دروازے سے آئیں اور نماز پڑھ کر چلی جائیں۔

[۲۷۳] بابٌ في خروج النساء في العيدين

[۵٤۸-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا هُشَيْمٌ، نا منصورٌ، وهو ابنُ زَاذَانَ، عن ابنِ سِيْرِيْنَ، عن أُمِّ عَطِيَّةَ أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم كان يُخرِجُ الأبْكَارَ، والعَوَاتِقَ، وذَوَاتِ الخُدُوْرِ، والحُيَّضَ: في العيدَيْنِ، فَأَمَّا الحُيَّضُ فَيَعْتَزِلْنَ المُصَلَّى، ويَشْهَدْنَ دَعْوَةَ المسلمينَ، قالتْ إِحْدَاهُنَّ: يارسولَ الله! إِنْ لَمْ يَكُنْ لَهَا جِلْبَابٌ؟ قال: "فَلْتُعِرْهَا أُخْتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا"

حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيعٍ، نا هُشَيْمٌ، عن هشامِ بنِ حَسَّانَ، عن حَفْصَةَ ابْنَةِ سِيْرِيْنَ، عن أُمِّ عَطِيَّةَ، بِنَحْوِهِ.

وفي الباب: عن ابنِ عباسٍ، وجابرٍ، قال أبو عيسى: حديثُ أُمِّ عَطِيَّةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وقد ذَهَبَ بعضُ أهلِ العلمِ إلى هذا الحديثِ، ورَخَّصَ لِلنِّسَاءِ في الخُرُوْجِ إلى العِيْدَيْنِ، وكَرِهَهُ بعضُهم.

وَرُوِيَ عن ابنِ المباركِ، أنَّهُ قال: أَكْرَهُ اليومَ الخُرُوْجَ للنِّسَاءِ في العيدَيْنِ، فإنْ أَبَتِ الْمَرْأَةُ إِلاَّ أَنْ تَخْرُجَ فَلْيَأْذَنْ لَهَا زَوْجُهَا أَنْ تَخْرُجَ في أَطْمَارِهَا، وَلاَ تَتَزَيَّنَ، فَإِنْ أَبَتْ أَنْ تَخْرُجَ كَذٰلِكَ، فَلِلزَّوْجِ أَنْ يَمْنَعَهَا عن الخُرُوْجِ.

[۵٤۹-] وَيُرْوَى عن عائشةَ قالتْ: لَوْ رأَى رسولُ الله صلى الله عليه وسلم مَا أَحْدَثَ النِّسَاءُ، لَمَنَعَهُنَّ المسجدَ كما مُنِعَتْ نِساءُ بني إسرائيلَ.

ويُرْوَى عن سفيانَ الثوريِّ: أنه كَرِهَ اليومَ الخُروجَ للنِّسَاءِ إلى العيد.

وضاحت: ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کو ان سے محمد بن سیرین اور ان کی بہن حفصہ بنت سیرین دونوں روایت کرتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے دونوں سندیں لکھی ہیں ـــــ بعض علماء اس حدیث کی طرف گئے ہیں اور وہ عورتوں کو عیدین میں نکلنے کی اجازت دیتے ہیں۔ اور بعض علماء اس کو مکروہ کہتے ہیں، اور ابن المبارک رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا: انھوں نے فرمایا: میں آج کے احوال میں عورتوں کے لئے عیدین میں نکلنے کو ناپسند کرتا ہوں۔ پس اگر عورت انکار کرے مگر یہ کہ نکلے یعنی عورت عیدگاہ جانے پر اصرار کرے تو اس کو اس کا شوہر اس شرط پر اجازت دے کہ وہ اپنے کام کاج کے کپڑوں میں نکلے اور زینت اختیار نہ کرے، پس اگر وہ اس طرح جانے سے انکار کرے تو شوہر کو نکلنے سے روکنے کا حق ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا گیا: انھوں نے فرمایا: اگر رسول اللہ ﷺ وہ احوال دیکھتے جو عورتوں نے نئے پیدا کئے ہیں تو ضرور ان کو مسجد سے روک دیتے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتیں روک دی گئیں (یہ روایت متفق علیہ ہے دیکھیں بخاری حدیث نمبر ۸۶۹) اور سفیان ثوری سے مروی ہے کہ وہ آج کے احوال میں عورتوں کے لئے عید میں نکلنے کو ناپسند کرتے تھے۔

بابُ ماجاء فی خُرُوْجِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم

إِلَی العِیْدِ فی طَرِیْقٍ، وَرُجُوْعِهِ مِنْ طَرِیْقٍ آخَرَ

ایک راستہ سے عیدگاہ جانا اور دوسرے راستہ سے لوٹنا مسنون ہے

حضور اکرم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپؐ ایک راستہ سے عیدگاہ جاتے تھے اور دوسرے راستہ سے واپس لوٹتے تھے۔ اور فقہ کی کتابوں میں ہر شخص کے لئے اس کو سنت لکھا ہے۔ مگر حضور اکرم ﷺ کے بعد صحابہ کا زمانہ سو سال تک ہے مگر تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے ایسی کوئی روایت نہیں ملی جس سے معلوم ہوتا ہو کہ صحابہ عیدگاہ ایک راستہ سے جاتے تھے اور دوسرے راستہ سے لوٹتے تھے۔ اس لئے میرا ایسا خیال ہے کہ یہ حکم امراء کے ساتھ خاص ہے۔ رسول اللہ ﷺ امیر المؤمنین تھے پس ہر زمانہ کے امراء کو اس سنت پر عمل کرنا چاہئے، اور اس میں دو مصلحتیں ہیں: ایک: امیر کی جان کی حفاظت۔ جب یہ معلوم ہی نہ ہوگا کہ امیر کس راستہ سے جائے گا اور کس راستہ سے لوٹے گا تو حملہ آور کہاں گھات لگائے گا؟ دوسرے: بھیڑ سے بچنا۔ لوگ امراء کو دیکھنے کا غیر معمولی جذبہ رکھتے ہیں، پس جس راستہ سے امیر عیدگاہ گیا ہے اگر وہ اسی راستہ سے واپس لوٹے گا تو اس کو دیکھنے کے لئے راستہ میں ازدحام ہو جائے گا، اس لئے امراء کو آنے جانے میں الگ الگ راستے اختیار کرنے چاہئیں، تا کہ جان بھی سلامت رہے اور راستہ میں بھیڑ بھی نہ ہو۔ واللہ اعلم

[٢٧٤] باب ماجاء فی خروج النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم إلى العيد فی طریق، ورجوعِهِ من طریق آخر

[-٥٥٠] حدثنا عبدُ الأعلى بنُ وَاصِلِ بنِ عبدِ الأعلى الكوفيُّ، وأبو زُرْعَةَ، قالا: نا محمَّدُ بنُ الصَّلْتِ، عن فُلَيْحِ بنِ سُلَيْمَانَ، عن سعيدِ بنِ الحارثِ، عن ابی هریرۃَ، قال كان رسولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم إذا خَرَجَ يومَ العيدِ فی طَرِيقٍ رَجَعَ فی غَيْرِهِ.

وفی الباب: عن عبدِ الله بنِ عُمَرَ، وأبی رَافِعٍ. قال أبو عيسى: حديثُ أبی هريرةَ حديثٌ حسنٌ غريبٌ.

ورَوَى أبو تُمَيْلَةَ، ويُونُس بنُ محمدٍ، هذا الحديثَ عن فُلَيْحِ بنِ سليمانَ، عن سَعِيدِ بنِ الحارثِ، عن جابرِ بنِ عبدِ اللّٰهِ.

وقد استَحَبَّ بعضُ أهلِ العلمِ للإمامِ إذا خَرَجَ فی طَرِيقٍ أَنْ يَرْجِعَ فی غَيْرِهِ اتِّبَاعًا لِهٰذا الحَدِيثِ، وهو قولُ الشافعيِّ. وحديثُ جَابِرٍ كَأَنَّهُ أَصَحُّ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ جب عید کے دن کسی راستہ سے نکلتے تھے تو اس کے علاوہ راستہ سے لوٹتے تھے اس حدیث کو ابوتُمیلہ اور یونس بن محمد نے فُلیح بن سلیمان سے، انھوں نے سعید بن الحارث سے اور انھوں نے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے (یعنی فلیح بن سلیمان کے تلامذہ میں اختلاف ہے، محمد بن الصلت حدیث کی سند ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر پہنچاتے ہیں اور ابوتُمیلہ اور یونس بن محمد سند جابر بن عبداللہ پر پہنچاتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کی رائے میں زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت جابر کی حدیث ہے) اور بعض علماء نے امام کے لئے (معلوم ہوا کہ یہ حکم امیر کے ساتھ خاص ہے) پسند کیا ہے کہ جب وہ ایک راستہ سے عیدگاہ جائے تو اس کے علاوہ راستہ سے لوٹے، اس حدیث کی پیروی کرتے ہوئے۔ اور یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔

بابٌ فی الأَكْلِ يَوْمَ الْفِطْرِ قَبْلَ الْخُرُوْجِ

عیدالفطر میں کچھ کھا کر عیدگاہ جانا چاہئے

عیدالفطر کی نماز کے لئے جانے سے پہلے چند کھجوریں کھائے اور طاق عدد کا خیال رکھے۔ اور کھجوریں میسر نہ ہوں تو کوئی بھی میٹھی چیز یا جو بھی چیز میسر ہو کھائے تاکہ افطار متحقق ہوجائے، یعنی عملی طور پر یہ بات واضح ہوجائے کہ آج روزہ نہیں ہے کیونکہ روزوں کا مہینہ ختم ہوچکا۔

اورعیدالاضحیٰ میں نماز سے پہلے کوئی چیز نہ کھائے بلکہ نماز کے بعداپنی قربانی کا گوشت کھائے، کیونکہ بھوکا ہوگا تو قربانی کا گوشت رغبت سے کھائے گا، البتہ چائے پی سکتا ہےاور پان کھاسکتا ہے، کیونکہ اس سے پیٹ نہیں بھرتا۔اسی طرح اگرقربانی کرنے میں بہت دیر ہوسکتی ہوتو ناشتہ بھی کرسکتا ہے۔عرب تو خود ذبح کرتے تھےاوران کا گوشت دس منٹ میں پک جاتا تھا۔اور ہمارے احوال ان سے مختلف ہیں میں نے دیکھا ہے کہ بعض کوتو کلیجی بھی دوپہر کو بارہ بجے نصیب ہوتی ہے، پس بے چارہ کب تک بھوکا رہے گا۔

[۲۷۵] بابٌ فی الأکل یومَ الفطر قبلَ الخروج

[۵۵۱-] حدثنا الحسنُ بنُ الصَّبَّاحِ البَزَّارُ، نا عبدُ الصَّمَدِ بنُ عبدِ الوارثِ، عن ثَوَابِ بنِ عُتْبَةَ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ بُرَیْدَةَ، عن أبیه، قال: کان النبیُّ صلی الله علیه وسلم لَایَخْرُجُ یَوْمَ الْفِطْرِ حَتّٰی یَطْعَمَ، وَلَا یَطْعَمُ یومَ الْأَضْحٰی حَتّٰی یُصَلِّیَ.

وفی الباب: عن علیٍّ وأنسٍ، قال أبو عیسی: حدیثُ بُرَیْدَةَ بنِ الحُصَیْبِ الْأَسْلَمِیِّ حدیثٌ غریبٌ.

وقال محمدٌ: لا أَعْرِفُ لِثَوَابِ بنِ عُتْبَةَ غَیْرَ هذا الحدیثِ.

وقد اسْتَحَبَّ قومٌ مِنْ أَهْلِ العلمِ أَنْ لَّا یَخْرُجَ یَوْمَ الْفِطْرِ حتّٰی یَطْعَمَ شَیْئًا، ویَسْتَحِبُّ له أَنْ یُفْطِرَ علی تَمْرٍ، ولا یَطْعَمُ یومَ الْأَضْحٰی حتی یَرْجِعَ.

[۵۵۲-] حدثنا قُتَیبةُ، نا هشیمٌ، عن محمدِ بنِ إسحاق، عن حَفْصِ بنِ عُبَیْدِ اللّٰهِ بنِ أَنَسٍ، عن أنسِ بنِ مالكٍ أَنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم کان یُفْطِرُ عَلَی تَمَرَاتٍ یومَ الْفِطْرِ قَبْلَ أَنْ یَخْرُجَ إلی المُصَلّٰی.

قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ غریبٌ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ عیدالفطر کے دن نہیں نکلتے تھے یہاں تک کہ کچھ تناول فرماتے تھے۔اورعیدالاضحیٰ کے دن نہیں کھاتے تھے یہاں تک کہ نماز پڑھ لیتے تھے۔حضرت بریدۃ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث غریب ہے(یعنی ضعیف ہے کیونکہ ثواب بن عتبہ کی علماء نے تضعیف کی ہے) امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں ثواب بن عتبہ کی اس کے علاوہ کوئی حدیث نہیں جانتا(یعنی وہ صرف اسی ایک حدیث کے راوی ہیں) اورعلماء نے یہ بات پسند کی ہے کہ آدمی عیدالفطر میں نہ نکلے یہاں تک کہ کچھ کھائے،اوراس کے لئے پسند کیا ہے کہ وہ چند کھجوریں کھا کراپناروزہ نہ ہونا ظاہر کرے۔اورعیدالاضحیٰ میں نہ کھائے یہاں تک کہ عیدگاہ سے لوٹے۔

(دوسری حدیث) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عیدالفطر میں عیدگاہ جانے سے پہلے چند کھجوریں کھا کراپناروزہ نہ ہونا ظاہر فرماتے تھے۔یہ حدیث اعلی درجہ کی صحیح ہے۔

أبوابُ السَّفرِ

باب التَّقْصِيْرِ فی السَّفَرِ

سفر میں نماز قصر کرنے کا بیان

مذاہبِ فقہاء: الاقتصار، التقصیر اور القَصْر تینوں مترادف الفاظ ہیں۔ اور فصیح ترین لفظ تیسرا ہے اور زیادہ تر وہی استعمال ہوتا ہے ——— سفر شرعی میں قصر یعنی رباعی نمازیں دو رکعت پڑھنا بالاتفاق جائز ہے۔ پھر اتمام کے جائز ہونے نہ ہونے میں اختلاف ہے۔ یعنی سفر میں رباعی نماز پوری پڑھ سکتے ہیں یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے: حنفیہ کے نزدیک قصر واجب ہے، اور قصر: قصر اسقاط ہے، پس پوری نماز پڑھنا جائز نہیں، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک قصر: قصر ترفیہ ہے، پس اتمام بھی جائز ہے۔ پھر ان کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قصر اور اتمام یکساں ہیں، کوئی اولیٰ یا غیر اولیٰ نہیں۔ اور امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں: قصر افضل ہے اور اتمام جائز ہے۔ غرض بنیادی نقطۂ نظر دو ہیں: حنفیہ کے نزدیک قصر واجب ہے اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک قصر و اتمام دونوں جائز ہیں، کوئی واجب نہیں۔

ائمہ ثلاثہ کی دلیل: سورۃ النساء کی آیت ۱۰۱ ہے، ارشاد پاک ہے: ﴿ وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ یعنی جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم (رباعی) نماز سے کم کرو اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کفار تمہیں پریشانی میں ڈالیں گے۔ ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں: لاجناح: اباحت کی تعبیر ہے، اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ قصر کرنا جائز ہے واجب نہیں۔ پس اس کا مقابل اتمام بھی جائز ہے۔

اور دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمان اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سفر میں اتمام کرتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہر جگہ پوری نماز پڑھتی تھیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے خلافت کے آخری سالوں میں حج کے موقع پر مکہ میں پوری نماز پڑھانی شروع کی تھیں۔ اگر اتمام جائز نہ ہوتا تو یہ حضرات سفر میں پوری نماز کیسے پڑھتے؟

اور حنفیہ کا استدلال: یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اور خلفائے راشدین نے مواظبت تامہ کے ساتھ سفر میں رباعی نماز قصر پڑھی ہے۔ ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ آنحضور ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں سفر میں رباعی نماز پوری پڑھی ہو، بلکہ حضور اکرم ﷺ کے بعد سو سال تک صحابہ کا زمانہ رہا ہے، اور ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ تھے، کسی صحابی کے بارے میں یہ مروی نہیں کہ انھوں نے سفر میں اتمام کیا ہو، اور حضرت عثمان اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما جو اتمام کرتے تھے تو وہ اپنے عمل کی تاویل کرتے تھے۔ تاویل کے بغیر کسی صحابی نے سفر میں اتمام نہیں کیا۔ پس نبی ﷺ کا

مواظبتِ تامہ کے ساتھ قصر کرنا وجوب کی دلیل ہے۔ اور اتمام کے جواز کے سلسلہ میں کوئی روایت نہیں، نہ کسی صحابی کا تاویل کے بغیر اتمام کرنا مروی ہے پس قصر واجب ہے اور اتمام جائز نہیں۔

اور آیت کریمہ کی جو تفسیر ائمہ ثلاثہ نے کی ہے کہ لیس علیکم جناح: اباحت کی تعبیر ہے اس کا جواب بخاری (حدیث ۱۶۴۳) میں ہے، حضرت عروۃ نے (جو مدینہ کے فقہاء سبعہ میں سے ہیں اور حضرت عائشہؓ کے بھانجے ہیں) اپنی خالہ سے دریافت کیا کہ سورۃ البقرۃ (آیت ۱۵۸) میں ارشاد پاک ہے: ﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ یعنی جو شخص حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرے (یہ بعینہ وہی تعبیر ہے جو یہاں سورۃ النساء کی آیت ۱۰۱ میں ہے) حضرت عروۃ نے کہا: اس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حج اور عمرہ میں سعی واجب نہیں۔ حالانکہ سعی حنفیہ کے نزدیک واجب ہے اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فرض ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: آپ آیت کا صحیح مطلب نہیں سمجھے، اگر سعی صرف جائز ہوتی تو تعبیر یہ ہوتی: فلا جناح علیه أن لایطوف بهما: یعنی حج اور عمرہ کرنے والے پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہ کرے۔ حضرت عروۃ اہل لسان تھے، بات ان کی سمجھ میں آ گئی، مگر یہ سوال باقی رہا کہ آخر یہ تعبیر کیوں ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: انصار زمانۂ جاہلیت میں جب حج یا عمرہ کرتے تھے تو صفا و مروہ کے درمیان سعی نہیں کرتے تھے، کیونکہ ان دو پہاڑیوں پر دو بت رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان کو خدا نہیں مانتے تھے پھر جب اسلام آیا اور بت وہاں سے ہٹا دیئے گئے تو بھی انصار کو قدیم نظریہ کے مطابق سعی کرنے میں حرج محسوس ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور ان کو سمجھایا کہ صفا مروہ کے درمیان سعی ان بتوں کی وجہ سے نہیں کی جاتی بلکہ اس کا پس منظر کچھ اور ہے۔ لہٰذا بے تکلف سعی کریں اور دل میں کوئی حرج محسوس نہ کریں، اس لئے لاجناح کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ غرض یہ اباحت کی تعبیر نہیں ہے بلکہ انصار کے دلوں سے بوجھ ہٹانے کے لئے یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ یہی بات یہاں بھی ہے ﴿فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلَاةِ﴾ اباحت کی تعبیر نہیں ہے۔ اگر اتمام جائز ہوتا تو تعبیر یہ ہوتی: فلیس علیکم جناح أن أتموا صلاتکم یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز پوری پڑھو۔ اگر یہ تعبیر ہوتی تو اس کا مقابل قصر جائز ہوتا، رہی یہ بات کہ آخر یہ تعبیر کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو بندے حضر میں ہمیشہ ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں پڑھتے ہیں جب سفر میں ان سے دو رکعتیں پڑھنے کے لئے کہا جائے گا تو ان کے دل پر بوجھ پڑے گا۔ اس وجہ سے یہ تعبیر اختیار کی ہے کہ سفر میں دو رکعتیں پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور جو دو صحابہ سفر میں اتمام کرتے تھے ان سے سوالات ہوئے ہیں۔ اگر سفر میں قصر واجب نہ ہوتا تو لوگ کیوں اعتراض کرتے؟ اور ان کو اپنے عمل کی وجہ کیوں بیان کرنی پڑتی؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تو اپنے عمل کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ان کے حق میں سفر متحقق ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہ تمام مسلمانوں کی ماں ہیں پس دنیا میں جہاں بھی رہیں وہ اپنے بیٹوں کے گھر ہیں اور ماں اپنے بیٹوں کے گھر مسافر

نہیں ہوتی۔ یہ تاویل صحیح ہے یا نہیں؟ اس سے بحث نہیں۔ سمجھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے عمل کی تاویل کی ہے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت کے شروع میں چھ یا آٹھ سال تک جب حج کرانے کے لئے مکہ تشریف لاتے تو نماز قصر پڑھاتے تھے، پھر حضرت کا عمل بدل گیا اور مکہ میں اور منی میں چار رکعتیں پڑھانی شروع کیں تو لوگوں نے سوال کیا۔ آپؓ نے جواب دیا: میں نے مکہ کے قریب ایک گاؤں میں شادی کی ہے، میں پہلے مدینہ سے سیدھا اس گاؤں میں آتا ہوں، پھر ایک ماہ کے بعد وہاں سے مکہ آتا ہوں اس لئے مسافر نہیں ہوتا۔ غرض یہ دونوں اکابر اپنے عمل کی تاویل کرتے تھے، تاویل کے بغیر کسی صحابی نے سفر میں اتمام نہیں کیا (حضرت عثمان اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی تاویلات متفق علیہ روایت میں ہیں (مشکوۃ حدیث ۱۳۴۸) اور تفصیل شرح معانی الآثار (۱: ۲۷۷) میں ہے)

علاوہ ازیں: مسلم شریف میں حدیث ہے کہ یعلی بن امیہؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء (آیت ۱۰۱) میں قصر کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ کافروں کے پریشان کرنے کا اندیشہ ہو، اور اب اسلام کا جھنڈا سر بلند ہے، ہر طرف امن وامان ہے، جزیرۃ العرب میں کوئی کافر قبیلہ نہیں رہا، اب قصر کیوں ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے بھی یہ خیال آیا تھا اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بات دریافت کی تھی تو آپؐ نے فرمایا: ''یہ ایک خیرات ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی خیرات کو قبول کرو'' (مشکوۃ حدیث ۱۳۳۵) یعنی إن خفتم کی قید اولاً چاہے احترازی رہی ہو مگر بعد میں یہ قید احترازی نہیں رہی، اتفاقی ہوگئی، لہٰذا کافروں کے اندیشہ کے بغیر بھی قصر واجب ہے، کیونکہ یہ اللہ کا صدقہ ہے، اور سخی کی خیرات قبول کرنا ہی زیبا ہے۔ اب اگر کوئی نماز پوری پڑھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی خیرات کو رد کرتا ہے جو کسی طرح زیبا نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک یہ قصر: قصر اسقاط ہے یعنی سفر میں اللہ تعالیٰ نے رباعی نمازوں میں سے دو رکعتیں ساقط کر دی ہیں پس سفر میں رباعی نماز پوری پڑھنا فجر کی نماز چار رکعتیں پڑھنے کی طرح ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ قصر: قصر ترفیہ (ترخیص) ہے۔ یعنی شریعت نے مسافر کو سہولت دی ہے کہ وہ چاہے تو قصر کرے اور چاہے تو نماز پوری پڑھے۔ واللہ اعلم

أبوَابُ السَّفَر

[۲۷۶] باب التقصير فى السفر

[۵۵۳-] حدثنا عبدُ الوَهَّابِ بنُ عبدِ الحَكَمِ الوَرَّاقُ البَغْدَادِيُّ، نا يحيى بنُ سُلَيْمٍ، عن عُبَيْدِ اللّٰهِ، عن نافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، قال: سَافَرْتُ مع النبيِّ صلى الله عليه وسلم وأبي بَكْرٍ وعُمَرَ وعُثْمَانَ

فَكَانُوا يُصَلُّوْنَ الظُّهْرَ وَالعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ، لَايُصَلُّوْنَ قَبْلَهَا وَلَا بعدَها، وقال عبدُ اللّٰهِ: لو كُنْتُ مُصَلِّيًا قَبْلَهَا أَوْ بَعْدَهَا لَأَتْمَمْتُهَا.

وفي الباب: عن عُمَرَ، وعليٍّ، وابنِ عباسٍ، وأنسٍ، وعِمْرانَ بنِ حُصَيْنٍ، وعائشةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ حديثٌ حسنٌ غريبٌ لَانَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ حديثِ يَحيَى بنِ سُلَيمٍ مِثْلَ هذا.

وقال محمدُ بنُ إسماعيلَ: وقد رُوِيَ هذا الحديثُ عن عُبَيْدِ اللّٰهِ بنِ عُمرَ، عن رَجُلٍ مِنْ آلِ سُرَاقَةَ، عن ابنِ عُمَرَ.

قال أبو عيسى: وقد رُوِيَ عن عَطِيَّةَ العَوْفِيِّ، عن ابنِ عُمَرَ، أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كان يَتَطَوَّعُ في السَّفَرِ قَبْلَ الصَّلَاةِ وبعدَها.

وقَدْ صَحَّ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَنَّهُ كان يَقْصُرُ في السَّفَرِ، وأبو بَكْرٍ وعُمَرُ وعثمانُ صَدْرًا مِنْ خِلَافَتِهِ، والعَمَلُ على هذا عندَ أكثرِ أهلِ العلمِ مِن أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغيرِهِمْ.

وقد رُوِيَ عن عائشةَ أَنَّهَا كانَتْ تُتِمُّ الصلاةَ في السَّفَرِ، والعملُ على ما رُوِيَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم وأصحابِهِ، وهو قولُ الشافعيِّ، وأحمدَ، وإسحاقَ، إِلَّا أَنَّ الشافِعِيَّ يقولُ: التَّقْصِيْرُ رُخْصَةٌ له في السفرِ، فَإِنْ أَتَمَّ الصلاةَ أَجْزَأَ عنه.

[٥٥٤-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيْعٍ، نا هُشيمٌ، نا عليُّ بنُ زيدِ بنِ جُدْعَانَ، عن أبي نَضْرَةَ، قال: سُئِلَ عِمْرانُ بنُ حُصَيْنٍ عن صَلَاةِ المسافِرِ فقال: حَجَجْتُ مع رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ، وحَجَجْتُ مع أبي بكرٍ فَصَلَّى ركعتَين، ومَعَ عُمرَ فَصَلَّى ركعتَينِ، ومَعَ عثمانَ سِتَّ سِنِيْنَ مِنْ خِلَافَتِهِ أَوْ ثمانَ سنينَ، فَصَلَّى ركعتَينِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[٥٥٥-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا سفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ، عن محمدِ بنِ المُنْكَدِرِ، وإبراهيمَ بنِ مَيْسَرَةَ، أَنَّهُمَا سَمِعَا أنسَ بنَ مالكٍ، قال: صَلَّيْنَا مع النبيِّ صلى الله عليه وسلم الظُّهْرَ بالمدينةِ أَرْبَعًا، وبِذِي الحُلَيْفَةِ العَصْرَ رَكعتَينِ. هذا حديثٌ صحيحٌ.

[٥٥٦-] حدثنا قُتيبةُ، نا هشيمٌ، عن مَنْصُوْرِ بنِ زَاذَانَ، عن ابنِ سِيْرِيْنَ، عن ابنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم خَرَجَ مِنَ المَدِيْنَةِ إِلَى مَكَّةَ لَا يَخافُ إِلَّا اللّٰهَ رَبَّ العَالَمِيْنَ، فَصَلَّى ركعتَيْنِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ اور وضاحت: حدیث (۵۵۳) ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ اور خلفائے

راشدین کے ساتھ سفر کیا ہے، وہ ظہر اور عصر دو دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے، نہ ان سے پہلے سنتیں پڑھتے تھے نہ بعد میں۔ اور ابن عمرؓ نے فرمایا: اگر مجھے ان سے پہلے یا بعد میں سنتیں پڑھنی ہوتیں تو میں فرض نماز ہی پوری پڑھتا ———
یہ یحییٰ بن سُلیم کی عبید اللہ عمری سے روایت ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ابن عمرؓ کی یہ حدیث حسن غریب ہے، ہم اس کو اس طرح یحییٰ کی سند ہی سے جانتے ہیں (یحییٰ فی نفسہ ثقہ ہیں، صحیحین میں ان کی روایتیں ہیں، مگر ان کی جو روایتیں عبید اللہ سے ہیں وہ منکر (نہایت ضعیف) ہیں، چنانچہ شیخین نے اس سند کی روایتوں کی صحیحین میں تخریج نہیں کی) امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ حدیث عبید اللہ سے روایت کی گئی ہے، وہ خاندانِ سراقہ کے ایک آدمی سے، وہ ابن عمرؓ سے روایت کرتا ہے (اس سند میں واسطہ مجہول ہے اس لئے ضعیف ہے) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عطیہ عوفی سے روایت کیا گیا ہے، وہ ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ سفر میں فرض نماز سے پہلے بھی اور بعد میں بھی سنتیں پڑھتے تھے (یہ حدیث آگے باب التطوع فی السفر میں سند کے ساتھ آرہی ہے اور یہ بھی ضعیف ہے، کیونکہ عطیہ عوفی ضعیف راوی ہے)

اور نبی ﷺ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپؐ سفر میں قصر فرماتے تھے اور ابوبکر وعمر بھی اور اپنی خلافت کے شروع میں عثمان بھی اور صحابہ وغیرہ اکثر اہل علم کا اسی پر عمل ہے ——— اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ وہ سفر میں نماز پوری پڑھا کرتی تھیں اور عمل اس پر ہے جو نبی ﷺ اور آپؐ کے اصحاب سے مروی ہے، یعنی حضرت عائشہ کے عمل پر عمل نہیں۔ اور وہ شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا قول ہے، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قصر کرنا سفر میں مسافر کے لئے ایک سہولت ہے، پس اگر وہ نماز پوری پڑھے تو اس کے لئے کافی ہے یعنی جائز ہے۔

حدیث (۵۵۴) حضرت عمران رضی اللہ عنہ سے مسافر کی نماز کے بارے میں پوچھا گیا، آپؓ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج کیا، پس آپؐ نے دو رکعتیں پڑھیں، اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا تو انھوں نے دو رکعتیں پڑھیں۔ اور عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا تو انھوں نے دو رکعتیں پڑھیں، اور عثمانؓ کے ساتھ ان کی خلافت کے چھ یا آٹھ سال حج کیا تو انھوں نے دو رکعتیں پڑھیں، یعنی سب نے قصر کیا۔ یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

حدیث (۵۵۵) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے نبی ﷺ کے ساتھ ظہر مدینہ میں چار رکعتیں پڑھیں اور عصر ذوالحلیفہ میں دو رکعتیں پڑھیں، یہ حدیث بھی صحیح ہے (ذوالحلیفہ: مدینہ سے چھ میل ہے، آپ حجۃ الوداع کے لئے ظہر مدینہ میں پڑھ کر روانہ ہوئے اور عصر ذوالحلیفہ میں قصر پڑھی، کیونکہ وہ مدینہ کے حدود سے خارج ہے)

حدیث (۵۵۶) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: نبی ﷺ مدینہ سے مکہ کی طرف (حجۃ الوداع میں) نکلے، اللہ رب العالمین کے علاوہ کسی کا ڈر نہیں تھا، پس آپؐ نے دو رکعتیں پڑھیں یعنی إن خفتم کی قید اتفاقی ہوگئی۔ یہ حدیث بھی اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

بابُ ماجاءَ فی کَمْ تُقْصَرُ الصَّلَاۃُ

کتنے دن قیام کرنے سے نماز پوری پڑھے؟

امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ایک باب ایسا ہی باندھا ہے اور یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ کتنی مسافت پر سفر شرعی متحقق ہوگا۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ کا مقصود یہ مسئلہ بیان کرنا ہے کہ اگر دورانِ سفر مسافر کسی جگہ ٹھہرے تو کتنے دن ٹھہرنے سے نماز پوری پڑھے گا؟

مذاہبِ فقہاء: حنفیہ کے نزدیک مدتِ اقامت پندرہ دن ہے۔ اگر مسافر کسی جگہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ قیام کی نیت کرے تو مقیم ہو جائے گا اور نماز پوری پڑھے گا، اور پندرہ دن سے کم ٹھہرنے کی نیت ہو تو قصر کرے گا، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مدتِ اقامت چار دن ہے، پھر ان کے یہاں تفصیل ہے۔ امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ فرماتے ہیں: یوم دخول اور یوم خروج کو مستثنیٰ کر کے اگر چار دن یا زیادہ کسی جگہ ٹھہرے تو وہ پوری نماز پڑھے۔ اور چار دن سے کم ٹھہرے تو وہ مسافر رہے گا اور قصر پڑھے گا، اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر اکیس نمازوں تک کسی جگہ ٹھہرنے کا ارادہ ہے تو وہ مقیم ہو گیا نماز پوری پڑھے۔ اور اس سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہے تو وہ مسافر ہے، قصر پڑھے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اس مسئلہ میں کوئی مرفوع روایت نہیں ہے نہ احناف کے پاس اور نہ ائمہ ثلاثہ کے پاس۔ باب میں صحابہ اور تابعین کے آثار ہیں۔ حنفیہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر لیا ہے اور ائمہ ثلاثہ نے سعید بن المسیب اور عطاء بن ابی رباح رحمہما اللہ کا اثر لیا ہے۔ اور اس اختلاف میں نقطۂ نظر اثر انداز ہوا ہے، چونکہ احناف نے قصر کو اللہ تعالیٰ کی خیرات مانا ہے اس لئے جو سب سے زیادہ مدت مروی ہے اس کو لیا ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ قصر کو رخصت (سہولت) مانتے ہیں، اور رخصت مجبوری میں لی جاتی ہے اور کم سے کم لی جاتی ہے، اس لئے ائمہ ثلاثہ نے کسی صحابی کی قول کو نہیں لیا بلکہ جو سب سے کم قول تھا وہ سعید بن المسیب اور عطاء بن ابی رباح کا تھا اس کو لیا ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ باب میں دو مرفوع حدیثیں ہیں، اور دونوں اعلی درجہ کی صحیح ہیں، مگر مسئلۂ باب سے بے تعلق ہیں، ان سے مدتِ اقامت طے کرنا مشکل ہے:

پہلی حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ سے مکہ گئے، پس رسول اللہ ﷺ نے دو رکعت پڑھیں یعنی قصر کیا۔ یحییٰ کہتے ہیں: میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا: رسول اللہ ﷺ مکہ میں کتنے دن ٹھہرے تھے؟ انھوں نے فرمایا: دس دن۔

تشریح: یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے۔ نبی ﷺ حج کے لئے پانچ ذی الحجہ کو مکہ پہنچے تھے، اور آٹھ ذی الحجہ کو منیٰ تشریف لے گئے، پھر عرفہ گئے، پھر مزدلفہ میں قیام کر کے منیٰ واپس لوٹے اور تیرہ کو مکہ واپس پہنچے اور اسی دن شام کو

مدینہ واپسی ہوئی۔ اس پوری مدت میں آپؐ نے قصر کیا۔ اس حدیث سے مدتِ اقامت پر استدلال اس لئے نہیں ہوسکتا کہ پورے دس دن آپؐ نے ایک جگہ قیام نہیں فرمایا تھا بلکہ مکہ میں چار دن سے بھی کم قیام رہا تھا اس لئے ائمہ ثلاثہ نے بھی اس حدیث کو نہیں لیا۔

دوسری حدیث: ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں انیس دن قیام فرمایا اور پوری مدت میں نمازیں قصر پڑھیں۔ ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اگر آنحضور ﷺ اس سے زیادہ ٹھہرتے تو نماز پوری پڑھتے۔

اس حدیث کی وجہ سے خود ابن عباسؓ کا مذہب یہ تھا کہ مدتِ اقامت انیس دن ہے، اور اسحاق بن راہویہ رحمہ اللہ نے اسی کو لیا ہے۔ مگر اس حدیث سے بھی مدتِ اقامت پر استدلال واضح نہیں کیونکہ آنحضور ﷺ کا مکہ میں یہ قیام حالات کے تابع تھا، ٹھہرنے کی نیت سے آپؐ نے قیام نہیں فرمایا تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی علاقہ فتح ہوتا تھا تو آنحضور ﷺ وہاں تین دن قیام فرماتے تھے پھر مدینہ واپسی ہوتی تھی، مگر فتح مکہ کے بعد آپؐ کو اطلاعات ملیں کہ ہوازن کے قبائل جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں مدینہ واپسی عقلمندی کی بات نہیں تھی اس لئے آپؐ مکہ میں ٹھہر گئے۔ جب یقینی اطلاعات پہنچیں کہ ہوازن کے قبیلے مکہ پر چڑھائی کے ارادہ سے کوچ کر چکے ہیں تو آپؐ ان کی طرف بڑھے اور غزوۂ حنین پیش آیا۔ غرض آنحضور ﷺ کا مکہ میں قیام ٹھہرنے کی نیت سے نہیں تھا بلکہ حالات کے تابع تھا، اور ایسی صورت میں جبکہ ٹھہرنے کا ارادہ نہ ہو، آج کل کرتے کرتے برسوں گذر جائیں تو بھی مسافر رہے گا۔ علاوہ ازیں اس کی کوئی دلیل نہیں کہ اگر حضور اکرم ﷺ بیسویں دن رکتے تو نماز پوری پڑھتے۔ اس لئے ائمہ نے اس حدیث کو بھی نہیں لیا۔

[۲۷۷] باب ماجاء فی کم تُقْصَرُ الصلاۃُ؟

[۵۵۷-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِیعٍ، نا ھُشَیْمٌ، نا یحیَی بنُ أبی إسحاقَ الحَضْرَمِیُّ، نا أنسُ بنُ مالکٍ، قال: خَرَجْنَا مع النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم مِن المدینۃ إلی مَکَّۃَ، فَصَلّٰی رَکْعَتَیْنِ، قال: قلتُ لِأَنسٍ: کَمْ أَقَامَ رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بِمَکَّۃَ؟ قال عَشْرًا.

وفی الباب: عن ابنِ عباسٍ، وجابرٍ، قال أبو عیسی: حدیثُ أنسٍ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

وقد رُوِیَ عن ابنِ عباسٍ عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم: أنَّہُ أَقَامَ فی بَعْضِ أَسْفَارِہِ تِسْعَ عَشْرَۃَ یُصَلِّی رَکْعَتَیْنِ، قال ابنُ عباسٍ: فَنَحْنُ إِذَا أَقَمْنَا ما بَیْنَنَا وبینَ تِسْعَ عَشْرَۃَ صَلَّیْنَا رکْعَتَیْنِ، وإِنْ زِدْنَا علی ذٰلک أَتْمَمْنَا الصَّلاَۃَ.

وَرُوِیَ عن عليٍّ: أَنَّهُ قال: مَنْ أَقَامَ عَشَرَةَ أيامٍ أَتَمَّ الصَّلَاةَ.

ورُوِيَ عن ابنِ عُمرَ: أَنَّهُ قال: مَنْ أَقَامَ خَمْسَةَ عَشَرَ يومًا أَتَمَّ الصَّلَاةَ، وَرُوِیَ عنهُ ثِنْتَیْ عَشْرَةَ.

ورُوِيَ عن سعيدِ بنِ المسيَّبِ: أَنَّه قال: إذا أَقَامَ أَرْبَعًا صَلَّى أَرْبَعًا؛ وروَی ذٰلِكَ عنه قَتَادَةُ وعطاءٌ الخُرَاسَانِیُّ، وروَی عنه داوُدُ بنُ أبی هِنْدٍ خِلَافَ هٰذا،

واختَلَفَ أهلُ العلمِ بَعْدُ فی ذلك:

فَأَمَّا سُفيانُ الثوریُّ وأهلُ الكوفةِ فَذَهَبُوْا إلی تَوْقِيْتِ خَمْسَ عَشْرَةَ، وقالوا: إِذَا أَجْمَعَ علی إِقَامَةِ خَمْسَ عَشْرَةَ أَتَمَّ الصلاةَ.

وقال الأَوْزَاعِیُّ: إِذَا أَجْمَعَ علی إِقَامَةِ ثِنْتَیْ عَشْرَةَ أَتَمَّ الصَّلَاةَ.

وقال مالكٌ والشافعیُّ وأحمدُ: إذا أَجْمَعَ علی إِقَامَةِ أَرْبَعٍ أَتَمَّ الصَّلَاةَ.

وأما إسحاقُ فَرَأَى أَقْوَی المَذَاهِبِ فيه حديثَ ابنِ عباسٍ، قال: لِأَنَّهُ رَوَی عن النبیِّ صلی الله عليه وسلم، ثُمَّ تَأَوَّلَهُ بعدَ النبیِّ صلی الله عليه وسلم: إذا أَجْمَعَ علی إِقَامَةِ تِسْعَ عَشْرَةَ أَتَمَّ الصلاةَ.

ثم أَجْمَعَ أهلُ العلمِ عَلَی أَنَّ لِلْمُسَافِرِ أَنْ يَقْصُرَ مَالَمْ يُجْمِعْ إِقَامَةً وإِنْ أَتَی عليه سِنُونَ.

[۵۵۸-] حدثنا هنادٌ، نا أبو مُعَاوِيَةَ، عن عاصِمٍ الأَحْوَلِ، عن عِكْرِمة، عن ابنِ عباسٍ، قال: سَافَرَ رسولُ الله صلی الله عليه وسلم سَفَرًا، فَصَلَّی تِسْعَةَ عَشَرَ يَوْمًا ركعتينِ رَكْعَتَيْنِ، قال ابنُ عباسٍ: فَنَحْنُ نُصَلِّیْ فِيْمَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ تِسْعَ عَشْرَةَ رَكْعَتَينِ ركعتينِ فَإِذَا أَقَمْنَا أَكْثَرَ مِن ذلك صَلَّيْنَا أَرْبَعًا.

قال أبو عيسی: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ صحيحٌ.

وضاحت: وقد رُوی عن ابن عباس: یہ روایت آگے امام ترمذی رحمہ اللہ سند کے ساتھ لائیں گے ——— اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو شخص کسی جگہ دس دن ٹھہرے وہ نماز پوری پڑھے (اخرجہ عبدالرزاق) اور ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ جو شخص کسی جگہ پندرہ دن ٹھہرے وہ نماز پوری پڑھے (أخرجه محمد فی الآثار، والطحاوی، وابن أبی شيبة) اور ابن عمرؓ سے بارہ دن بھی مروی ہیں (رواہ مالك فی الموطا) اور سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ اگر کسی جگہ چار دن ٹھہرے تو چار رکعتیں پڑھے۔ یہ قول قتادہ اور عطاء خراسانی نے آپؒ سے روایت کیا ہے (رواہ مالك فی الموطا) اور داؤد بن ابی ہند نے اس کے خلاف روایت کیا ہے (انھوں نے پندرہ دن مدت اقامت کا قول روایت کیا ہے رواہ محمد فی کتاب الحجة، وابن أبی شيبة) ——— اس کے بعد علماء میں اختلاف ہوا یعنی مدت اقامت میں صحابہ وتابعین میں تو اختلاف تھا ہی، جب مجتہدین کا زمانہ آیا تو ان میں بھی اختلاف ہوا۔ سفیان ثوری اور کوفہ والے پندرہ دن کی تعیین کی طرف گئے، اور انھوں نے کہا: جب پندرہ دن ٹھہرنے کا

پختہ ارادہ کرلے تو نماز پوری پڑھے ——— اور امام اوزاعی رحمہ اللہ نے فرمایا: جب بارہ دن ٹھہرنے کا پختہ ارادہ کرے تو نماز پوری پڑھے ——— اور ائمہ ثلاثہ نے فرمایا: جب چار دن ٹھہرنے کا پختہ ارادہ کرے تو نماز پوری پڑھے ——— اور رہے اسحاق تو انھوں نے اس میں قوی ترین مذہب ابن عباس کی حدیث کو سمجھا، فرمایا: اس لئے کہ انھوں نے نبی ﷺ سے روایت کی، پھر اس کو لیا یعنی مذہب بنایا نبی ﷺ کے بعد یعنی دور صحابہ میں (حضرت اسحاق نے فرمایا:) جب کوئی شخص انیس دن ٹھہرنے کا پختہ ارادہ کرے تو نماز پوری پڑھے ——— پھر اہل علم اس پر متفق ہیں کہ مسافر کے لئے جائز ہے کہ وہ قصر کرے جب تک ٹھہرنے کا پختہ ارادہ نہ کرے، اگرچہ اس پر سالوں گذر جائیں (پھر ابن عباسؓ کی مذکورہ حدیث سند کے ساتھ ہے)

بابُ ماجاءَ فی التَّطوُّعِ فی السَّفرِ

سفر میں سنتیں پڑھنے کا بیان

ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں: مسافر کو سنن مؤکدہ پڑھنی چاہئیں۔ اور ائمہ احناف سے اس مسئلہ میں کچھ مروی نہیں، نہ امام اعظم رحمہ اللہ سے کچھ مروی ہے اور نہ صاحبین سے۔ اور متاخرین احناف نے مسئلہ یہ بیان کیا ہے کہ حالتِ قرار میں سنتیں پڑھے، اور حالت فرار میں نہ پڑھے۔ مثلاً ایک شخص دہلی گیا، اور وہاں پہنچ کر ٹھہر گیا اور مطمئن ہوگیا آگے روانگی یا واپسی دو دن کے بعد ہوگی تو یہ حالت قرار ہے، ایسی صورت میں سنتیں پڑھنی چاہئیں، اور اگر سفر جاری ہے گاڑی میں نماز پڑھ رہا ہے، یا اسٹیشن پر نماز پڑھ رہا ہے اور گاڑی آنے والی ہے تو یہ حالت فرار ہے، اس حالتِ میں سنتیں نہ پڑھے۔ اور میں نے تجربہ کی بنیاد پر اس میں یہ اضافہ کیا ہے کہ سفر شروع کرنے سے پہلے اور سفر ختم کرنے کے بعد متصلاً جو حالت ہے وہ بھی حالتِ فرار ہے۔ مثلاً ایک شخص دہلی گیا وہاں جا کر ٹھہر گیا تو یہ حالت قرار ہے مگر وہ تھکا ہوا ہے، نیند کا غلبہ ہے اور نماز بھی پڑھنی ہے تو وہ صرف فرض پڑھ لے، سنتیں نہ پڑھے۔ اسی طرح روانگی کا وقت ہے، سامان تیار کرنا ہے، وقت پر اسٹیشن پہنچنا ہے، ٹکٹ لینا ہے اور نماز کا وقت آگیا تو فرض نماز پڑھ لینا کافی ہے، سنت نہ پڑھے تو کوئی حرج نہیں۔ واللہ اعلم

[۲۷۸] باب ماجاء فی التطوع فی السفر

[۵۵۹-] حدثنا قُتَيْبَةُ، ناالليْثُ بنُ سَعْدٍ، عن صَفْوَانَ بنِ سُلَيْمٍ، عن أبی بُسْرَةَ الْغِفَارِيِّ، عن البَرَاءِ بنِ عَازِبٍ، قال: صَحِبْتُ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم ثَمَانِيَةَ عَشَرَ سَفَرًا، فَمَا رَأَيْتُهُ تَرَكَ الرَّكْعَتَيْنِ إِذَا زَاغَتِ الشَّمْسُ قَبْلَ الظُّهْرِ.

وفي الباب: عن ابنِ عُمرَ، قال أبو عيسى: حديثُ البَرَاءِ حديثٌ غريبٌ، قال: سَألْتُ محمداً عَنْهُ؟ فَلَمْ يَعْرِفْهُ إِلَّا مِنْ حديثِ اللَّيْثِ بنِ سَعْدٍ، ولَمْ يَعْرِفْ اسمَ أبي بُسْرَةَ الغِفَارِيِّ، ورَآهُ حَسَنًا.

ورُوِيَ عن ابنِ عُمر: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كانَ لايَتَطَوَّعُ في السَّفَرِ قَبْلَ الصَّلاةِ ولاَبَعْدَهَا، ورُوِيَ عَنْهُ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَنَّه كَانَ يَتَطَوَّعُ في السَّفَرِ.

ثم اختَلَفَ أهلُ العلمِ بَعدَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: فَرَأَى بعضُ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَنْ يَتَطَوَّعَ الرجُلُ في السَّفَرِ، وبه يقولُ أحمدُ وإسحاقُ، ولَمْ يَرَ طَائِفَةٌ مِنْ أهلِ العِلْمِ أَنْ يُصَلِّيَ قَبْلَهَا وَلاَ بَعْدَهَا.

ومَعْنَى مَنْ لَمْ يَتَطَوَّعْ في السفرِ: قُبولُ الرُّخْصَةِ، ومَنْ تَطَوَّعَ فَلَهُ في ذلك فَضْلٌ كَثِيرٌ، وهو قولُ أكثرِ أهلِ العلمِ يَخْتَارُوْنَ التَّطَوُّعَ في السَّفَرِ.

[٥٦٠-] حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نا حَفْصُ بنُ غِيَاثٍ، عن حجاجٍ، عن عَطِيَّةَ، عن ابنِ عُمَرَ، قال: صَلَّيْتُ مَعَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم الظُّهْرَ في السَّفَرِ رَكعَتَيْنِ وبعدَها ركعَتينِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ، وقد رَوَاهُ ابنُ أبي ليلَى عن عَطِيَّةَ، ونافعٍ عن ابن عمرَ.

[٥٦١-] حدثنا محمدُ بنُ عُبيدِ الْمُحَارِبِيُّ، نا عليُّ بنُ هاشِمٍ، عن ابنِ أبي ليلَى، عن عَطِيَّةَ، ونافِعٍ، عن ابنِ عمرَ، قال: صَلَّيْتُ معَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم في الحَضَرِ والسَفَرِ، فَصَلَّيْتُ مَعَهُ في الحَضَرِ الظُّهْرَ أَرْبَعًا، وبعدَها ركعَتينِ، وصَلَّيْتُ معهُ في السَّفَرِ الظهرَ ركعتين وبعدَهَا ركعَتين، والعصرَ ركعتَينِ ولم يُصلِّ بعدَها شيْئًا، والمغرِبَ في الحَضَرِ والسَّفَرِ سواءً، ثَلاثُ رَكْعَاتٍ، لاَ يَنْقُصُ في حَضَرٍ وَلاَ سَفَرٍ، وهي وِتْرُ النَّهَارِ، وبَعْدَهَا ركعَتينِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ، سمعتُ محمداً يقولُ: ما رَوَى ابنُ أبي لَيلَى حَدِيثًا أَعْجَبَ إِلَيَّ مِنْ هذا.

ترجمہ اور وضاحت: حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں اٹھارہ سفروں میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا ہوں، میں نے آپؐ کو نہیں دیکھا کہ آپؐ نے ظہر سے پہلے جب سورج ڈھلتا ہے دو رکعتیں چھوڑی ہوں، یعنی زوال کے بعد فوراً جو رکعتیں پڑھنے کا آپؐ کا معمول تھا وہ سفر کے دروان بھی جاری رہتا تھا۔ حضرت براءؓ کی یہ حدیث غریب ہے (امام لیث بن سعد سے اوپر یہی ایک سند ہے) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا کہ کیا اس کی کوئی اور سند ہے؟ پس امام بخاریؒ نے اس کو نہیں جانا مگر لیث بن سعد

کی سند سے، یعنی امام بخاری کے علم میں بھی اس کی کوئی اور سند نہیں تھی۔ اور ابو بسرۃ غفاری کا نام بھی انہیں معلوم نہیں تھا اور وہ اس حدیث کو (فی نفسہ) حسن سمجھتے تھے، اور امام بخاری رحمہ اللہ کا حسن دیگر محدثین کے صحیح کے مترادف تھا اس لئے یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی ہے ـــــــ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ سفر میں سنتیں نہیں پڑھتے تھے، نہ نماز سے پہلے نہ نماز کے بعد (یہ حدیث ابھی گذری) اور ابن عمرؓ ہی سے روایت کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ سفر میں سنتیں پڑھتے تھے (یہ روایت اسی باب میں آرہی ہے، اور دونوں روایتیں ضعیف ہیں، پہلی اس لئے کہ وہ یحییٰ بن سُلیم کی عبید اللہ سے روایت ہے۔ اور دوسری عطیۃ العوفی کی وجہ سے ضعیف ہے، مگر نافع ان کے متابع ہیں، اس لئے یہ روایت صحیح ہوجائے گی) پھر رسول اللہ ﷺ کے بعد علماء کے درمیان اختلاف ہوا۔ بعض صحابہ کہتے تھے کہ آدمی سفر میں سنن مؤکدہ پڑھے، احمد و اسحاق رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں (امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے) اور علماء کی ایک جماعت کے نزدیک نماز سے پہلے اور نماز کے بعد سنتیں نہیں ہیں (یہ حنفیہ کا مسلک نہیں ہے) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابن عمرؓ کے قول لم یتطوع فی السفر کا مطلب یہ ہے کہ سفر میں سنتیں نہ پڑھے تو اس کی گنجائش ہے، وہ شریعت کی دی ہوئی سہولت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور جو شخص سنتیں پڑھے تو اس کے لئے اس میں بڑا ثواب ہے یعنی اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سفر میں سنتیں پڑھنا جائز نہیں۔ اور اکثر علماء کا قول ہے وہ سفر میں سنت پڑھنے کو پسند کرتے ہیں، اس کے بعد ابن عمرؓ کی حدیث ہے اس میں حجاج بن ارطاۃ اور عطیۃ عوفی دو ضعیف راوی ہیں مگر دونوں کے متابع موجود ہیں۔ حجاج کے متابع ابن ابی لیلیٰ صغیر ہیں اور عطیۃ عوفی کے متابع نافع ہیں۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں ظہر کی دو رکعتیں پڑھیں اور اس کے بعد دو رکعتیں (سنت مؤکدہ) پڑھیں (معیت تعداد میں ہے جماعت کے ساتھ پڑھنا مراد نہیں) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے، اس کو ابن ابی لیلیٰ صغیر بھی عطیۃ عوفی اور نافع سے روایت کرتے ہیں، اس کے بعد ابن ابی لیلیٰ کی حدیث ہے جس کو وہ عطیۃ عوفی اور نافع سے روایت کرتے ہیں، ابن عمرؓ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضر و سفر میں نماز پڑھی ہے۔ پس میں نے آپؐ کے ساتھ حضر میں ظہر کی چار رکعتیں اور اس کے بعد دو رکعتیں (سنت مؤکدہ) پڑھیں۔ اور میں نے آپؐ کے ساتھ سفر میں ظہر کی دو رکعتیں اور اس کے بعد (سنت مؤکدہ) دو رکعتیں پڑھیں۔ اور عصر کی دو رکعتیں پڑھیں اور اس کے بعد کچھ نہیں پڑھا، اور مغرب سفر و حضر میں یکساں ہیں وہ تین رکعتیں ہیں، نہ حضر میں اس میں کچھ کمی کی جائے گی نہ سفر میں۔ اور وہ دن کا وتر ہے اور اس کے بعد دو رکعتیں (سنت مؤکدہ) ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے۔ میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے سنا، فرماتے تھے: ابن ابی لیلیٰ نے کوئی حدیث روایت نہیں کی جو مجھے اس حدیث سے زیادہ پسند ہو، یعنی ان کی یہی حدیث شاندار ہے، ان کی دوسری روایتیں ٹھیک نہیں۔ اکابر محدثین رواۃ کی حدیثوں میں سے صحیح حدیثوں کو جدا کرتے تھے،

اس کی تفصیل کتاب العلل کی شرح میں گذر چکی ہے کہ بڑے محدث بھی ضعیف راویوں سے روایت کرتے ہیں مگر وہ ان کی وہی حدیثیں بیان کرتے تھے جوان کی نظر میں صحیح ہوتی تھیں۔

فائدہ: مغرب کی نماز کو دو خصوصیتیں حاصل ہیں۔ اول: تمام نمازیں ابتداء میں دو رکعتیں فرض ہوئی تھیں، پھر فجر کو تو اس کی حالت پر چھوڑ دیا گیا اور اس میں قراءت طویل کردی گئی اور باقی نمازوں میں دو دو رکعتوں کا اضافہ کیا گیا۔ مگر مغرب شروع ہی سے تین رکعتیں فرض کی گئی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ دوم: مغرب میں بھی قصر ممکن ہے، تین کے بجائے دو پڑھی جائیں یہ ممکن ہے، مگر اس میں قصر نہیں کیونکہ وہ دن کا وتر ہے اور عشاء کے بعد جو وتر ہیں وہ رات کے وتر ہیں۔ اور جب یہ دونوں نمازیں وتر ہیں تو ایک دوسرے کے شاکلہ اور انداز پر ہونی چاہئیں اور مغرب بالاجماع تین رکعتیں ایک سلام سے ہیں، پس وتر اللیل بھی تین رکعتیں ایک سلام سے ہونگی۔

اور رات دن میں دو وتر اس لئے مشروع کئے گئے ہیں کہ پچاس کی تعداد پوری ہوجائے، اس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے کہ شبِ معراج میں پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں اور نماز درحقیقت ایک رکعت ہے اور جو حکم تخفیفاً منسوخ ہوتا ہے اس کا استحباب باقی رہتا ہے اس لئے آنحضور ﷺ کا معمول رات دن میں پچاس رکعتیں پڑھنے کا تھا اور امت کے بہت سے حضرات یہ تعداد پوری کرتے ہیں، پس اگر وتر ایک ہوتا تو پچاس کی تعداد پوری نہ ہوتی، یا تو انچاس رکعتیں ہوتیں یا اکیاون۔ اس لئے پچاس کی تعداد پوری کرنے کے لئے ایک وتر کا رات میں اضافہ کیا گیا۔

بابُ ماجاءَ فی الْجَمْعِ بَیْنَ الصَّلاتَیْنِ

دونمازوں کو جمع کرنے کا بیان

مذاہبِ فقہاء: یہ معرکۃ الآراء مسئلہ ہے اس لئے کہ اس میں حجازی اور عراقی مکاتب فکر کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اعذار کی صورت میں ظہرین (ظہر وعصر) اور عشائین (مغرب وعشاء) کو جمع کرنا جائز ہے (اور اعذار امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک: سفر، بارش اور مرض ہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک: سفر اور بارش ہیں، مرض عذر نہیں۔ اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک صرف سفر عذر ہے) پھر ان کے درمیان تھوڑی تفصیل ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں: جمع بین الصلاتین مطلقاً جائز ہے تقدیماً وتاخیراً: یعنی جمع تقدیم بھی جائز ہے اور جمع تاخیر بھی۔ ظہر کے وقت میں ظہر اور عصر دونوں کو اور مغرب کے وقت میں مغرب اور عشاء دونوں کو، اسی طرح عصر کے وقت میں ظہر اور عصر دونوں کو اور عشاء کے وقت میں مغرب اور عشاء دونوں کو پڑھ سکتے ہیں۔ اسی طرح سائراً أو نازلاً: سفر جاری ہو یا کسی جگہ قیام ہو ہر صورت میں جمع کرسکتے ہیں، اسی طرح مُجِدًّا وغیرَ مُجِدٍّ:

بھاگتے دوڑتے سفر ہو یا اطمینان کے ساتھ سفر ہو ہر صورت میں جمع بین الصلاتین جائز ہے۔

اور امام مالک رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ جمع تقدیم جائز نہیں، صرف جمع تاخیر جائز ہے۔ اور ان کا مشہور قول یہ ہے کہ جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں جائز ہیں، جبکہ بھاگتے دوڑتے سفر ہو، اگر کسی جگہ قیام ہو یا اطمینان کا سفر ہو تو جمع جائز نہیں۔

اور حنفیہ کے نزدیک مطلقاً جمع جائز نہیں، نہ جمع تقدیم نہ جمع تاخیر۔ البتہ سخت مجبوری میں جمع تاخیر جائز ہے، یعنی پہلی نماز قضاء کر کے دوسرے وقت میں پڑھے، بس اس کی گنجائش ہے۔ اور ان کی دلیل سورۃ النساء (آیت ۱۰۳) میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ الصَّلاَةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَوْقُوْتًا﴾ یعنی مسلمانوں پر نماز فرض کی گئی ہے وقت کی پابندی کے ساتھ، پس ہر نماز اس کے وقت میں پڑھنا ضروری ہے۔

اور جاننا چاہئے کہ حج کے موقعہ پر عرفہ میں اور مزدلفہ میں احناف بھی جمع کے قائل ہیں اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ کیونکہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ سے آج تک پوری امت قرناً بعد قرنٍ ایسا کرتی آرہی ہے۔ پس یہ تواتر کا اعلیٰ درجہ ہے، اور جو چیز تواتر سے ثابت ہو اس کے ذریعہ قرآن پر زیادتی جائز ہے۔ اسی طرح اگر عذر ہو تو حنفیہ کے نزدیک جمع تاخیر جائز ہے۔ ٹرین سے سفر کر رہا ہو، گاڑی میں بے حد بھیڑ ہو، نماز پڑھنا ممکن نہ ہو یا بس سے سفر کر رہا ہو اور بے بس ہو تو نماز کو مؤخر کرنا اور اگلے وقت میں پڑھنا درست ہے، کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں۔ اس صورت میں ایک نماز ادا ہوگی اور ایک قضاء ہوگی۔ پس اس کو جمع کہنا مجازاً ہے، اور جمع تقدیم کی حنفیہ کے نزدیک مطلقاً گنجائش نہیں۔ اگر کوئی جمع تقدیم کرے گا تو ایک نماز ہوگی دوسری نہیں ہوگی۔ اس کے ذمہ فرض باقی رہ جائے گا۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اس مسئلہ میں تین قسم کی حدیثیں ہیں: اول: وہ حدیثیں ہیں جن میں صاف صراحت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سفر میں جمع صوری کرتے تھے، یعنی ایک نماز کو اس کے آخر وقت میں اور دوسری کو اس کے اول وقت میں پڑھتے تھے۔ دونوں نمازیں اپنے اپنے وقتوں میں پڑھی جاتی تھیں مگر صورۃً وہ جمع یعنی ایک ساتھ ہوتی تھیں، اس لئے اس کا نام ''جمع صوری'' ہے۔ اور عذر کی حالت میں ایسا کرنا بالاجماع جائز ہے۔ دوم: وہ حدیثیں ہیں جن میں جمع حقیقی کی صراحت ہے۔ جمع حقیقی کا دوسرا نام ''جمع وقتی'' بھی ہے۔ سوم: زیادہ تر روایتیں مجمل ہیں، انمیں صرف یہ مضمون ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو دو نمازوں کو جمع کرتے تھے، جمع کرنے کی کیا صورت ہوتی تھی؟ اس کی تفصیل مذکور نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی حدیثیں مبحث سے خارج ہیں کیونکہ ائمہ ثلاثہ ان کو جمع حقیقی پر محمول کریں گے اور احناف جمع صوری پر، اسی طرح پہلی قسم کی حدیثیں بھی مبحث سے خارج ہیں اس لئے کہ جمع صوری بالاجماع جائز ہے۔ اور جن حدیثوں میں جمع حقیقی کی صراحت ہے ان میں امثل اور اصح حدیث حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی ہے جس کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے پیش کیا ہے:

حدیث: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب سورج ڈھلنے سے پہلے سفر شروع فرماتے تو ظہر کو مؤخر کرتے یہاں تک کہ اس کو عصر کے ساتھ جمع کرتے، اور دونوں کو (عصر کے وقت میں) ایک ساتھ پڑھتے۔ اور جب سورج ڈھلنے کے بعد سفر شروع کرتے تو عصر کو ظہر کے وقت میں جلدی پڑھ لیتے۔ پھر سفر شروع کرتے، اور جب سورج غروب ہونے سے پہلے سفر شروع کرتے تو مغرب کو مؤخر کرتے یہاں تک کہ اس کو (عشاء کے وقت میں) عشاء کے ساتھ پڑھتے۔ اور جب سورج غروب ہونے کے بعد سفر شروع کرتے تو عشاء میں جلدی کرتے اور عشاء کو (مغرب کے وقت میں) مغرب کے ساتھ پڑھ لیتے۔

تشریح: اس حدیث کو قتیبہ روایت کرتے ہیں: لیث بن سعد سے، وہ یزید بن ابی حبیب سے، وہ ابوالطفیل سے اور وہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے۔ اور شروع سے آخر تک اس کی یہی ایک سند ہے۔ اور قتیبہ، لیث بن سعد اور یزید بن ابی حبیب اعلیٰ درجہ کے ثقہ راوی ہیں، اور ائمہ حدیث میں سے ہیں۔ اور ابوالطفیل اور معاذ بن جبل صحابی ہیں، یعنی اس حدیث کی سند نہایت درجہ قوی ہے۔ مگر امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس سند کو اور متن کو شاذ قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں: محدثین کے نزدیک نہ تو یہ حدیث یزید بن ابی حبیب کی سند سے معروف ہے اور نہ یہ متن معروف ہے، بلکہ یہ حدیث ابوالزبیر، عن ابی الطفیل، عن معاذ کی سند سے معروف ہے۔ اور ابوالزبیر سے روایت کرنے والے قرۃ بن خالد، سفیان ثوری اور امام مالک وغیرہ ائمہ حدیث ہیں۔ اور جو متن معروف ہے وہ یہ ہے: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک میں ظہر اور عصر کے درمیان اور مغرب اور عشاء کے درمیان جمع کیا، یعنی درحقیقت یہ حدیث مجمل ہے اور یزید بن ابی حبیب کی سند سے جو تفصیلی متن آیا ہے وہ محفوظ نہیں، دیگر ائمہ حدیث نے بھی اس حدیث پر عجیب وغریب تبصرے کئے ہیں۔ حاکم ابوعبداللہ (صاحب مستدرک حاکم) نے اس حدیث کو موضوع، امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے منکر، اور ابن حزم ظاہری نے منقطع قرار دیا ہے۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے قتیبہ سے پوچھا کہ جب آپ نے یہ حدیث لیث بن سعد سے پڑھی تھی تو آپ کے پاس کون بیٹھا تھا؟ انھوں نے فرمایا: خالد مدائنی بیٹھا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا: چوری پکڑی گئی، خالد مدائنی اساتذہ کی حدیثوں میں اضافہ کیا کرتا تھا اس حدیث میں جو تفصیل ہے وہ قتیبہ کی نظر بچا کر ان کی کاپی میں خالد مدائنی نے لکھ دی ہے۔ ورنہ درحقیقت یہ حدیث مجمل ہے، اور بعض محدثین نے اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔ ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے، اور دیگر ائمہ حدیث نے بھی اس کو قابل اعتبار سمجھا ہے اسی لئے اس سے استدلال کیا ہے۔

غرض اس حدیث کو صحیح کہنے والے بھی ہیں مگر صحیح بات یہ ہے کہ مذکورہ تفصیل کے ساتھ یہ حدیث غیر محفوظ ہے، درحقیقت یہ حدیث مجمل ہے پس اس سے استدلال ممکن نہیں، اور حدیث مجمل کو ائمہ ثلاثہ جمع حقیقی پر محمول کریں گے

اوراحناف جمع صوری پر (حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مجمل حدیث مسلم میں ہے اور ائمہ کے تبصرے معارف السنن (۴:۴۸۳) میں ہیں)

[۲۷۹] باب ماجاء فی الجمعِ بَیْنَ الصَّلاَتَیْنِ

[۵٦٢-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ بنُ سَعْدٍ، عن يَزِيْدَ بنِ أبی حَبِيبٍ، عن أبی الطُّفَيْلِ، عن مُعَاذِ بنِ جَبَلٍ: أنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم كان فی غَزْوَةِ تَبُوْكَ إِذَا ارْتَحَلَ قَبْلَ زَيْغِ الشَّمْسِ أخَّرَ الظُّهْرَ إلیٰ أنْ يَجْمَعَهَا إِلَی العَصْرِ فَيُصَلِّيْهِمَا جَمِيعاً، وإِذَا ارْتَحَلَ بَعْدَ زَيْغِ الشَّمْسِ عَجَّلَ العَصْرَ إِلَی الظُّهْرِ وَصَلَّی الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ جَمِيْعًا ثم سَارَ، وَكَان إِذَا ارْتَحَلَ قَبْلَ الْمَغْرِبِ أخَّرَ المغربَ حتی يُصَلِّيَهَا مَعَ العِشَاءِ، وَإِذَا ارْتَحَلَ بعدَ المغربِ عَجَّلَ العِشَاءَ فَصَلَّاهَا مَعَ المَغْرِبِ.

وفی الباب: عن علیٍّ وابنِ عُمَرَ، وأنسٍ، وعبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، وعائشةَ، وابنِ عباسٍ، وأُسَامَةَ بنِ زَيْدٍ، وجابرٍ.

قال أبو عيسی: ورَوَی علیُّ بنُ المَدِيْنِیُّ عَنْ أحمدَ بنِ حَنْبَلٍ عن قُتَيْبَةَ هٰذا الحديثَ، وحديثُ معاذٍ حديثٌ حسنٌ غريبٌ تَفَرَّدَ بِهِ قُتَيْبَةُ، لَانَعْرِفُ أحداً رَوَاهُ عَنِ اللَّيْثِ غَيْرُهُ، وحديثُ اللَّيْثِ عن يَزِيْدَ بنِ أبی حَبِيْبٍ عن أبی الطُّفَيْلِ عن مُعاذٍ حديثٌ غريبٌ والمعرُوفُ عِندَ أهلِ العلمِ حديثُ معاذٍ مِنْ حديثِ أبی الزُّبَيْرِ عَنْ أبی الطُّفَيْلِ عن مُعاذٍ: أنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم جَمَعَ فی غَزْوَةِ تَبُوْكَ بَيْنَ الظهرِ والعصرِ،وبين المغربِ والعِشَاءِ. رَوَاهُ قُرَّةُ بنُ خَالِدٍ وسفيانُ الثوریُّ ومالكٌ وغيرُ واحِدٍ عن أبی الزُّبَيْرِ المَكِّیِّ، وبهٰذا الحديثِ يقولُ الشافعیُّ وأحمدُ وإسحاقُ يقولان: لا بَأْسَ أنْ يُجْمَعَ بين الصلاتَيْنِ فی السَّفَرِ فی وقتِ إِحْدَاهُمَا.

[۵٦٣-] حدثنا هَنَّادٌ، نا عَبْدَةُ، عن عُبيدِ اللهِ بنِ عُمَرَ، عن نافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، أنَّهُ اسْتُغِيثَ علی بَعْضِ أهلِهِ، فَجَدَّ بِهِ السَّيْرُ، فَأخَّرَ المغربَ حَتَّی غَابَ الشَّفَقُ، ثُمَّ نَزَلَ فَجَمَعَ بَيْنَهُمَا، ثُمَّ أخْبَرَهُمْ أنَّ رسولَ اللهِ صلی الله علیه وسلم كان يَفْعَلُ ذلكَ إِذَا جَدَّ بِهِ السَّيْرُ.

قال أبو عيسی: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علی بن المدینی نے احمد بن حنبل سے اور انھوں نے قتیبہ سے اس حدیث کو روایت کیا ہے (یعنی قتیبہ سے آخر تک اس کی یہی ایک سند ہے) اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث حسنٌ غریبٌ ہے اس کو تنہا قتیبہ روایت کرتے ہیں، قتیبہ کے علاوہ ہم کسی کو نہیں جانتے جس نے یہ حدیث لیث بن

سعد سے روایت کی ہو۔ اور لیث کی یہ حدیث غریب (شاذ) حدیث ہے۔ اور محدثین کے نزدیک معروف حضرت معاذ کی حدیث ہے جو ابوالزبیر عن ابی الطفیل عن معاذ کی سند سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے غزوۂ تبوک میں جمع کیا ظہر اور عصر کے درمیان اور مغرب اور عشاء کے درمیان (یعنی حدیث مجمل معروف ہے) اس حدیث کو قرۃ بن خالد، سفیان ثوری، امام مالک اور دیگر متعدد محدثین نے ابوالزبیر مکی سے روایت کیا ہے، اور اس حدیث کے موافق امام شافعی، امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا قول ہے۔ دونوں فرماتے ہیں: سفر میں دو نمازوں کے درمیان ان دونوں میں سے کسی ایک کے وقت میں جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں (یعنی جمع تقدیم بھی جائز ہے اور جمع تاخیر بھی۔ خیال رہے کہ تمام نسخوں میں یقولان (تثنیہ) ہے، حالانکہ یقولون (جمع) ہونا چاہئے)

دوسری حدیث: نافع کہتے ہیں: ابن عمر رضی اللہ عنہما ارجنٹ بلائے گئے ان کی کسی بیوی کے معاملہ میں یعنی اطلاع آئی کہ ان کی طبیعت بہت خراب ہے آپ جلدی پہنچیں۔ وہ بیوی صاحبہ سسرال میں رہتی تھیں، مدینہ میں نہیں تھیں، نام صفیہ بنت ابی عبید تھا، بعد میں وہ شفایاب ہوگئیں، اور ابن عمرؓ کے بعد تک زندہ رہیں۔ پس ابن عمر بھاگتے دوڑتے گئے اور مغرب کو مؤخر کیا، یہاں تک کہ شفق (احمر) غائب ہوگئی، پھر اترے اور مغرب وعشاء کے درمیان جمع کیا، پھر تلامذہ کو بتلایا کہ رسول اللہ ﷺ بھی ایسا ہی کرتے تھے جب آپ بھاگتے دوڑتے سفر کرتے تھے یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔

تشریح: اس سفر میں ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جمع صوری کی تھی، جمع حقیقی نہیں کی تھی۔ ابوداؤد (باب الجمع بین الصلاتین) میں حدیث ہے کہ ابن عمرؓ شفق غروب ہونے سے کچھ پہلے اترے تھے، اور مغرب پڑھی تھی، پھر شفق غروب ہونے کے انتظار میں بیٹھے رہے، جب شفق غائب ہوئی تو عشاء پڑھی اور فرمایا: جب رسول اللہ ﷺ کو جلدی ہوتی تو آپؐ ایسا کرتے تھے، جس طرح میں نے کیا[1]۔ پس رفع تعارض کے لئے ترمذی کی روایت کی تاویل ضروری ہے، کیونکہ ابوداؤد کی حدیث میں کوئی تاویل نہیں ہوسکتی، اور وہ تاویل ہے: کاد أن یَغیب یعنی شفق غروب ہونے کے قریب ہوگئی، راوی نے مبالغۃً غابَ الشفقُ کہہ دیا، دوسری تاویل یہ ہے کہ شفق سے شفقِ احمر مراد ہے کیونکہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک مغرب کا وقت شفق ابیض کے غروب تک رہتا ہے۔

فائدہ: اس حدیث سے امام مالک رحمہ اللہ نے استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر بھاگتے دوڑتے سفر ہو تو جمع بین الصلاتین جائز ہے۔ اطمینان کے سفر میں اجازت نہیں۔ اور احناف کے نزدیک یہ حدیث جمع صوری پر محمول ہے۔

(۱) ابوداؤد کی روایت (۱۲۱۲) کے الفاظ یہ ہیں: حتی إذا کان قبل غیوب الشفق نزل، فصلی المغرب، ثم انتظر حتی غابَ الشفق وصلی العشاء (الی آخرہ)

بابُ ماجَاءَ فی صَلاَۃِ الِاسْتِسْقَاءِ

بارش طلبی کی نماز کا بیان

روایات سے بارش طلبی کی تین صورتیں ثابت ہیں: اول: لوگ بستی سے نکل کر کسی جگہ اکٹھے ہوں اور بارش کے لئے دعا کریں، یہ صورت آبی اللحمؓ کی حدیث میں آئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ لوگوں کے ساتھ احجار الزیت نامی جگہ میں تشریف لے گئے اور خوب گڑگڑا کر بارش کے لئے دعا کی، پھر واپس آگئے۔ دوم: جمعہ کے خطبہ میں بارش کے لئے دعا کی جائے، بخاری میں حدیث ہے: آنحضور ﷺ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے اچانک ایک دیہاتی مسجد میں آیا اور اس نے دوران خطبہ عرض کیا: یارسول اللہ! بارش نہ ہونے کی وجہ سے لوگ پریشان ہیں، جانور مر رہے ہیں، قحط کا سامنا ہے، بارش کے لئے دعا فرمائیں، آپؐ نے خطبہ ہی میں دعا فرمائی، دعا کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ لوگ بھیگتے ہوئے گھر لوٹے، اور پورا ہفتہ بارش ہوتی رہی۔ اگلے جمعہ کو وہی شخص یا کوئی اور شخص دوران خطبہ مسجد میں آیا اور عرض کیا: یارسول اللہ! سیلاب کی صورت بن گئی ہے، مکان ڈھنے لگے ہیں، دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ بارش روک دیں، آپؐ نے فرمایا: اللّٰھم حَوَالَیْنَا لا عَلَیْنَا اے اللہ! ہمارے اردگرد برسے ہم پر نہیں! اور سر کے اوپر ہاتھ لے جاکر دائرہ کی شکل میں اشارہ کیا کہ اِدھر اُدھر برسے ہم پر نہیں۔ چنانچہ فوراً بارش رک گئی اور بادل پھٹ گیا۔ چاروں طرف بارش ہوتی رہی اور مدینہ میں دھوپ نکل آئی، اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے مدینہ نے تاج پہن رکھا ہو۔ سوم: باقاعدہ آپ لوگوں کو لے کر عیدگاہ تشریف لے گئے اور وہاں جماعت سے دوگانہ ادا فرمایا، مختصر تقریر کی، اس کے بعد دعا مانگی۔ غرض بارش طلبی کے لئے یہ تینوں صورتیں حدیثوں سے ثابت ہیں۔

اس کے بعد دو باتیں سمجھنی چاہئیں:

پہلی بات: ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک صلاۃ الاستسقاء سنت ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: لاصلاۃ فی الاستسقاء: بارش طلبی کے لئے نماز نہیں۔ عام طور پر امام اعظم رحمہ اللہ کے اس قول کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ آپؒ کے نزدیک صلاۃ الاستسقاء مشروع نہیں، اور فقہ حنفی کی اکثر کتابوں میں یہی بات لکھی ہے۔ مگر یہ مطلب صحیح نہیں، بلکہ اس قول کا مطلب یہ ہے کہ استسقاء کے لئے نماز ضروری نہیں، اس کے بغیر بھی استسقاء ہوسکتا ہے۔ لوگ بارش کی دعا کرنے کے لئے کسی جگہ جمع ہوں اور دعا مانگیں تو بھی استسقاء ہے۔ فرض نمازوں کے بعد یا جمعہ کے بعد یا خطبہ میں بارش کے لئے دعا کریں تو بھی استسقاء ہے۔ اور باقاعدہ عیدگاہ جاکر دوگانہ پڑھیں پھر دعا مانگیں تو بھی استسقاء ہے۔ اور سب صورتیں جائز ہیں۔ صرف نماز پڑھنا ہی استسقاء کا طریقہ نہیں۔ امام اعظم رحمہ اللہ کے قول کا صحیح مطلب یہی ہے۔ استسقاء کے لئے نماز مشروع نہیں یہ امام صاحب کے قول کا صحیح مطلب نہیں۔ جیسے کہا جاتا

ہے: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک عقیقہ سنت ہے اور حنفیہ کے نزدیک عقیقہ نہیں یعنی سنت نہیں، اس سے نیچے کے درجہ کا حکم ہے یعنی مندوب ہے۔

اور اس کی دلیل کہ امام اعظم رحمہ اللہ صلاۃ الاستسقاء کے قائل ہیں یہ ہے کہ ان کے اور صاحبین کے درمیان اختلاف ہے کہ صلاۃ الاستسقاء میں قراءت جہراً ہوگی یا سراً؟ صاحبین جہراً کے قائل ہیں اور امام اعظم سراً کے، اگر امام اعظم رحمہ اللہ صلاۃ الاستسقاء ہی کے قائل نہیں تھے تو اس اختلاف کا کیا مطلب؟

اس کی نظیر: مزارعت کا مسئلہ ہے، کہتے ہیں: مزارعت صاحبین کے نزدیک جائز ہے، اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک جائز نہیں۔ پھر جب تفصیل کا وقت آتا ہے کہ مزارعت کی کیا کیا صورتیں جائز ہیں؟ تو صاحبین اور امام اعظم کے درمیان بعض صورتوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب امام اعظمؒ کے نزدیک سرے سے مزارعت جائز نہیں تو وہ بعض صورتوں کے جواز کے قائل کیسے ہیں؟ لامحالہ یہ بات ماننی ہوگی کہ امام اعظمؒ نے کسی خاص مصلحت سے مزارعت کا انکار کیا ہے، ورنہ مزارعت ان کے نزدیک بھی جائز ہے۔ اس کی تفصیل ابواب البیوع میں آئے گی، اسی طرح یہاں بھی امام صاحبؒ کے بارش طلبی کی نماز کے انکار کا مطلب یہ ہے کہ اس میں انحصار نہیں، استسقاء کی اور بھی صورتیں ہیں۔

دوسری بات: کیا صلاۃ الاستسقاء میں بھی تکبیرات زوائد ہیں؟ امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک تکبیراتِ زوائد نہیں ہیں۔ اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک تکبیراتِ زوائد ہیں، ان کی دلیل ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔ وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے صلاۃ الاستسقاء کی دو رکعتیں پڑھائیں جس طرح عیدین میں پڑھی جاتی ہیں، چھوٹے دو امام فرماتے ہیں: ابن عباسؓ نے صلاۃ الاستسقاء کو عید کے ساتھ تشبیہ دی ہے، پس مشبہ بہ (عید) کے جو احکام ہیں وہی مشبہ (صلاۃ الاستسقاء) کے ہونگے، اور عید میں تکبیراتِ زوائد ہیں پس صلاۃ الاستسقاء میں بھی وہ مشروع ہیں۔ اور بڑے دو امام کہتے ہیں: تشبیہ میں ہر بات میں مماثلت ضروری نہیں، کچھ باتوں میں مماثلت کافی ہے، جیسے کسی بیوقوف کو گدھا کہا جائے تو یہ تشبیہ ہے اور وجہ شبہ صرف حماقت ہے، چار ٹانگیں اور دم ہونا ضروری نہیں، اسی طرح یہاں تشبیہ چند باتوں میں ہے، ہر ہر بات میں نہیں ہے، اور وہ چند امور یہ ہیں: عید میں دوگانہ پڑھا جاتا ہے، اس کے بعد خطبہ ہے، وہ نماز زوال سے پہلے چاشت کے وقت میں پڑھی جاتی ہے اور شہر سے باہر نکل کر پڑھی جاتی ہے، اسی طرح صلاۃ الاستسقاء بھی شہر سے باہر میدان میں اور چاشت کے وقت میں پڑھی جائے گی، اور اس میں بھی دو رکعتیں پڑھی جائیں گی۔ اور اس کے بعد خطبہ بھی دیا جائے گا، صرف اتنی باتوں میں تشبیہ ہے، تکبیرات زوائد میں تشبیہ نہیں، اس لئے صلاۃ الاستسقاء میں تکبیراتِ زوائد مشروع نہیں۔

[٢٨٠] باب ماجاء في صلاة الاستسقاء

[٥٦٤-] حدثنا يَحيىَ بنُ مُوسَى، نا عبدُ الرزاقِ، نا مَعْمَرٌ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عن عَبَّادِ بنِ تَمِيْمٍ، عن عَمِّه: أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم خَرَجَ بالناسِ يَسْتَسْقِيْ، فَصَلَّى بِهِمْ رَكْعَتَيْنِ، جَهَرَ بالْقِرَاءَةِ فِيْهِمَا، وحَوَّلَ رِدَاءَهُ، ورَفَعَ يَدَيْهِ، واسْتَسْقَى، واسْتَقْبَلَ القِبْلَةَ.

وفي الباب: عن ابنِ عباسٍ، وأبي هريرةَ، وأنسٍ، وآبي اللَّحْمِ. قال أبو عيسى: حديثُ عبدِاللّٰهِ بنِ زَيْدٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وعلى هذا العَمَلُ عندَ أهلِ العلمِ، وبهِ يقولُ الشافعيُّ وأحمدُ وإسحاق. واسْمُ عَمِّ عَبَّادِ بنِ تَمِيْمٍ: هو عبدُ اللّٰهِ بنُ زَيْدِ بنِ عَاصِمٍ المَازِنِيُّ.

[٥٦٥-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ، عن خالدِ بنِ يَزِيْدَ، عن سَعيدِ بنِ أبي هِلَالٍ، عن يَزِيْدَ بنِ عبدِ اللّٰهِ، عن عُمَيْرٍ مَوْلَى آبي اللَّحْمِ، عن آبي اللَّحْمِ: أنَّهُ رَأَى رسولَ الله صلى الله عليه وسلم عِنْدَ أحْجَارِ الزَّيْتِ، يَسْتَسْقِيْ، وهُوَ مُقْنِعٌ بِكَفَّيْهِ يَدْعُوْ.

قال أبو عيسى: كَذَا قال قُتَيْبَةُ في هذا الحديثِ: عن آبي اللَّحْمِ، وَلَا نَعْرِفُ لَهُ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم إلَّا هذا الحيثَ الوَاحِدَ.

وعُمَيْرٌ مَوْلَى آبي اللَّحْمِ: رَوَى عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أحاديثَ ولَهُ صُحْبَةٌ.

[٥٦٦-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا حاتِمُ بنُ إسماعيلَ، عن هِشَامِ بنِ إسحاقَ، وهو ابنُ عبدِ اللّٰهِ بنِ كِنَانَةَ، عن أبِيْهِ، قال أرْسَلَنِي الوَلِيْدُ بنُ عُقْبَةَ، وهُو أمِيْرُ المَدِيْنَةِ إلى ابنِ عباسٍ أسْأَلُهُ عَنِ اسْتِسْقَاءِ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم، فَأَتَيْتُهُ فقالَ: إنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم خَرَجَ مُتَبَذِّلاً مُتَوَاضِعًا مُتَضَرِّعًا، حَتَّى أتَى المُصَلَّى، فَلَمْ يَخْطُبْ خُطْبَتَكُمْ هٰذِهِ، ولٰكِنْ لَمْ يَزَلْ في الدُّعَاءِ والتَّضَرُّعِ والتَّكْبِيْرِ، وصَلَّى رَكعَتَيْنِ كَمَا كَانَ يُصَلِّيْ في العِيْدِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[٥٦٧-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، نا وَكِيْعٌ، عن سُفيانَ، عن هِشَامِ بنِ إسحاقَ بنِ عبدِ اللّٰهِ بنِ كِنَانَةَ، عن أبيهِ، فَذَكَرَ نَحْوَهُ، وَزَادَ فِيْهِ: مُتَخَشِّعًا.

قالَ أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وهو قولُ الشافِعِيُّ، قال: يُصَلِّى صلاةَ الإسْتِسْقَاءِ نَحْوَ صَلَاةِ العِيْدَيْنِ: يُكَبِّرُ في الركعةِ الأُوْلَى سَبْعًا، وفي الثَّانِيَةِ خَمْسًا، واحْتَجَّ بحديثِ ابنِ عباسٍ.

قال أبو عيسى: وَرُوِيَ عن مالكِ بنِ أنسٍ أنّه قال: لَايُكَبَّرُ في صلاةِ الاِسْتِسْقَاءِ كَمَا يُكَبَّرُ في صَلاَةِ العِيْدَيْنِ.

ترجمہ اور وضاحت: عباد بن تمیم کے چچا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے ساتھ نکلے تاکہ بارش طلب کریں۔ پس آپؐ نے لوگوں کو دو رکعتیں پڑھائیں۔ ان میں قراءت جہراً کی (امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک صلاۃ الاستسقاء میں سراً قراءت مسنون ہے، وہ فرماتے ہیں: دن کی نمازیں گونگی ہیں، اور ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک قراءت جہری ہے اور یہ حدیث جمہور کی دلیل ہے) اور آپؐ نے اپنی چادر پلٹی (امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک خطبہ کے شروع میں اور دیگر ائمہ کے نزدیک خطبہ کا کچھ حصہ گذر جانے کے بعد چادر پلٹی جائے گی، اور یہ چادر پلٹنا تفاؤلاً (نیک فالی کے طور پر) ہے یعنی بندے زبان حال سے عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہم اپنے حالات پلٹ رہے ہیں آپ بھی اپنا فیصلہ پلٹیں، اور چادر تنہا امام پلٹے گا، اور یہ مسئلہ اجماعی ہے) اور آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور بارش طلب کی (یعنی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی) اور آپؐ نے منہ قبلہ کی طرف کیا، یعنی آپؐ نے خطبہ تو لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر دیا مگر دعا قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر کی) ——— اور اس پر علماء کا عمل ہے اور یہی بات شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کہتے ہیں۔ اور عباد بن تمیم کے چچا کا نام عبداللہ بن زید بن عاصم المازنی ہے (یہ عبداللہ بن زید وضو کی حدیث والے ہیں، کتاب الطہارۃ میں ان کی حدیث گذری ہے، اور ان کے دادا کا نام عاصم ہے، اور صاحب اذان عبداللہ بن زید دوسرے صحابی ہیں ان کے دادا کا نام عبدربہ ہے)

(حدیث ۵۶۵) عُمیر جو حضرت آبی اللحم کے آزاد کردہ ہیں، اپنے مولیٰ سے روایت کرتے ہیں: انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو احجاز الزیت نامی جگہ میں دیکھا درانحالیکہ آپؐ بارش کے لئے دعا مانگ رہے تھے اور آپ دعا مانگتے ہوئے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اٹھائے ہوئے تھے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قتیبہ نے اس حدیث میں اسی طرح کہا ہے یعنی یہ حدیث عمیر اپنے مولیٰ آبی اللحم سے روایت کرتے ہیں۔ آبی اللحم کی رسول اللہ ﷺ سے یہی ایک حدیث ہے۔ اور عمیر جو آبی اللحم کے آزاد کردہ ہیں انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے متعدد حدیثیں روایت کی ہیں اور ان کو صحبت حاصل ہے، یعنی عُمیر بھی صحابی ہیں اور وہ کئی حدیثوں کے راوی ہیں جن کو وہ براہ راست رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔

حدیث (۵۶۶) اسحاق بن عبداللہ کہتے ہیں: مجھے ولید بن عقبہ نے، جبکہ وہ مدینہ کا گورنر تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بھیجا تاکہ میں ان سے رسول اللہ ﷺ کی بارش طلبی کے بارے میں پوچھوں۔ میں ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نکلے کام کاج کے کپڑوں میں (یعنی جو کپڑے پہلے سے پہن رکھے تھے انہی میں عیدگاہ تشریف لے گئے) خاکساری کے طور پر، گڑگڑاتے ہوئے، یہاں تک کہ عیدگاہ پہنچے پھر تمہاری آج کی

تقریر کی طرح تقریر نہیں کی یعنی لمبی تقریر نہیں کی) بلکہ برابر دعا میں گڑگڑانے میں تکبیر میں مشغول رہے اور دو رکعتیں پڑھیں جس طرح عید میں پڑھی جاتی ہیں۔ ابن عباسؓ کی مذکورہ حدیث کو ہشام بن اسحاق سے حاتم بن اسماعیل کے علاوہ سفیان ثوری بھی روایت کرتے ہیں اور دونوں کی حدیثیں یکساں ہیں، البتہ اس سند سے حدیث میں متخشعاً کا اضافہ ہے جس کے معنی خشوع وخضوع ظاہر کرنے کے ہیں اور حدیث اس سند سے بھی حسن صحیح ہے۔

اور وہ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ فرماتے ہیں: استسقاء کی نماز عیدین کی نماز کی طرح پڑھی جائے گی: پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیرین کہے اور انھوں نے ابن عباس کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔ اور امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے، آپؒ نے فرمایا: جس طرح عیدین میں تکبیریں کہی جاتی ہیں اس طرح بارش طلبی کی نماز میں تکبیریں نہیں کی جائیں گی۔

فائدہ: دعاء کی دو قسمیں ہیں: دعائے رغبت اور دعائے رہبت، ہاتھ اٹھا کر ہتھیلیاں چہرے کی طرف کر کے دعا کرنا دعائے رغبت ہے اور ہاتھ الٹے کر کے یعنی ہتھیلیوں کی پشت چہرے کی طرف کر کے دعا کرنا دعائے رہبت ہے۔ علماء فرماتے ہیں: بارش طلبی میں امام اور مقتدی سب کے لئے دعائے رہبت بہتر ہے۔ اور یہ بھی تفاولاً ہے۔

بَابٌ فِی صَلَاۃِ الْکُسُوْفِ

سورج گہن کی نماز کا بیان

کسوف اور خسوف دونوں عام لفظ ہیں۔ سورج گہن اور چاند گہن دونوں پر دونوں کا اطلاق ہوتا ہے۔

مذاہب فقہاء: تمام ائمہ متفق ہیں کہ سورج گہن میں باجماعت نماز سنت ہے اور چاند گہن میں چھوٹے دو اماموں کے نزدیک باجماعت نماز سنت ہے اور بڑے دو اماموں کے نزدیک صرف نماز سنت ہے، جماعت سنت نہیں۔ ان کے قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چاند گہن میں باجماعت نماز جائز نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جماعت مشروع نہیں یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا جائز تو ہے، مگر تنہا پڑھنا سنت ہے۔ اور سورج گہن میں باجماعت نماز پڑھنا سنت ہے اور تنہا پڑھنا جائز ہے یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

قراءت کا مسئلہ: چاند گہن میں اگر جماعت کریں تو قراءت بالاجماع جہراً ہوگی اس لئے کہ وہ رات کی نماز ہے۔ اور سورج گہن میں جماعت کریں تو قراءت جہراً ہوگی یا سراً؟ اس میں اختلاف ہے۔ امام اعظم اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک سراً قراءت ہے کیونکہ وہ دن کی نماز ہے، اور دن کی نمازیں گونگی ہوتی ہیں۔ اور امام مالک، امام احمد اور صاحبین رحمہم اللہ جہر کے قائل ہیں، یہ حضرات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو آئندہ باب میں آرہی ہے۔

مسئلہ: سورج گہن کی کم سے کم دو رکعتیں ہیں، اور زیادہ سے زیادہ چار۔ اگر لوگ لمبی نماز پڑھ سکیں اور کوئی ایسا شخص جو لمبی نماز پڑھا سکے موجود ہو تو سورج گہن کے دوران پورے وقت نماز میں مشغول رہنا بہتر ہے۔ اور اگر لوگ لمبی نماز پڑھنے پر آمادہ نہ ہوں یا ایسا شخص موجود نہ ہو جو لمبی نماز پڑھا سکے تو پھر دو یا چار رکعت پڑھ کر دعا میں مشغول رہیں تا آنکہ سورج گہن ختم ہو جائے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ مسئلہ باب میں چھ قسم کی روایتیں ہیں: (۱) ہر رکعت میں ایک رکوع (یہ ابو بکرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے) (۲) ہر رکعت میں دو رکوع (۳) ہر رکعت میں تین رکوع (۴) ہر رکعت میں چار رکوع (یہ حضرت عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیثیں ہیں) (۵) ہر رکعت میں پانچ رکوع (یہ ابی بن کعب کی حدیث ہے) (۶) اور حضرت قبیصہ ہلالیؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ برابر دو دو، دو دو رکعتیں پڑھتے رہے یہاں تک کہ سورج گہن ختم ہو گیا (حضرت ابو بکرہؓ کا عمل یہی تھا اور ان سے اس سلسلہ میں مرفوع حدیث بھی مروی ہے) ـــــ ان میں سے بعض حدیثیں صحیحین میں، بعض نسائی میں اور بعض ابو داؤد میں ہیں۔ اور سب سنداً قوی ہیں، جبکہ صورت حال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے مکی دور کے احوال تو معلوم نہیں مگر مدنی دور میں صرف ایک مرتبہ ایسا سورج گہن ہوا ہے جس میں سورج آدھے سے زیادہ پکڑا گیا تھا اور وہ گہن صبح کے وقت تقریباً آٹھ نو بجے کے درمیان ہوا تھا اور مغرب سے پہلے جو صورت ہوتی ہے ویسی صورت ہو گئی تھی، اور یہ واقعہ سن ۱۰ ہجری میں پیش آیا تھا، اتفاق سے اس سے ایک دن پہلے آنحضور ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تھا، چنانچہ زمانہ جاہلیت کے تصور کے مطابق لوگوں میں یہ چرچا شروع ہو گیا کہ آج سورج نے بھی سوگ منایا، اس لئے کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو کائنات سوگ مناتی ہے، یہ عربوں کے تصورات تھے۔ چنانچہ حضور اکرم ﷺ نے نماز کے بعد ایک مختصر تقریر فرمائی اور اس میں یہ بات واضح کی کہ سورج اور چاند کسی کی موت یا حیات پر نہیں گہناتے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ مخلوق کو دکھاتے ہیں۔ غرض آنحضور ﷺ کی حیات طیبہ میں صرف ایک مرتبہ سورج گہن ہوا ہے، اور آپؐ نے صرف ایک مرتبہ نماز کسوف پڑھی ہے، پھر بھی روایتوں میں سخت اختلاف ہے۔

اب دو باتیں سمجھنی ہیں: ایک: روایات میں اختلاف کیوں ہے؟ دوسری: کس روایت کو معمول بہ بنایا جائے؟ پہلے دوسری بات پھر پہلی بات بیان کرتا ہوں:

کس روایت کو معمول بہ بنایا جائے؟

ائمہ ثلاثہ نے حضرت عائشہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کو اختیار کیا ہے جس میں ہر رکعت میں دو دو رکوع کا ذکر ہے اور باقی حدیثوں سے صرف نظر کیا ہے۔ ان کے یہاں نماز کسوف پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلی

رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ بقرۃ جتنی قراءت کرے، پھر اسی تناسب سے طویل رکوع کرے، پھر اللہ اکبر کہہ کر کھڑا ہو (سمع اللہ لمن حمدہ نہ کہے) پھر کھڑے ہوکر دوبارہ فاتحہ پڑھے اور سورۂ آل عمران جتنی قراءت کرے، یعنی پہلی قراءت سے تھوڑی کم قراءت کرے پھر رکوع کرے اور قراءت کے تناسب سے لمبا رکوع کرے، یعنی پہلے رکوع سے ذرا کم رکوع کرے پھر تسمیع کے ساتھ کھڑا ہو، پھر دو سجدے کرے اور سجدے بھی قراءت کے تناسب سے طویل کرے، پھر اگلی رکعت اسی طرح پڑھے۔

اور حنفیہ نے ان روایات میں سے کوئی روایت اختیار نہیں کی بلکہ ایک ساتویں روایت لی ہے جو حضرت نعمان بن بشیر اور حضرت قبیصۃ الہلالی سے مروی ہے جو نسائی (۳:۱۴۱ مصری) میں ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازِ کسوف پڑھانے کے بعد ارشاد فرمایا: فإذا رأيتم ذلك فصلُّوا كأحدثِ صلاةٍ صلَّيتُموها مِن المكتوبةِ یعنی اگر آئندہ اس طرح کا واقعہ پیش آئے تو تم نے جو قریب ترین فرض نماز پڑھی ہے اس طرح نماز کسوف پڑھنا۔ قریب ترین جو فرض نماز پڑھی گئی تھی وہ فجر کی نماز تھی اور فجر کی نماز میں ہر رکعت میں ایک رکوع ہوتا ہے اس لئے احناف کے نزدیک نمازِ کسوف عام نمازوں کی طرح ہے، اس میں بھی ہر رکعت میں ایک ہی رکوع ہے۔

روایات میں اختلاف کیوں ہے؟

حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے فرمایا: حضور اکرم ﷺ نے سورج گرہن کی نماز مشاہدہ والی نماز پڑھی تھی۔ ہم جب نماز پڑھتے ہیں تو ہمارے اور غیب کے درمیان پردہ حائل رہتا ہے اور پردے کے پیچھے جو مخلوقات ہیں وہ ہماری نظروں سے غائب ہوتی ہیں، اور آپؐ کی نماز مشاہدہ والی نماز تھی یعنی بیچ سے پردہ ہٹ گیا تھا اور پردہ کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی جو مخلوقات ہیں: جنت وجہنم وغیرہ وہ آپؐ کو نظر آرہی تھیں، بخاری (حدیث ۱۰۵۲) میں ہے: آنحضور ﷺ کبھی نماز میں قبلہ کی طرف بڑھے، اور ہاتھ بڑھایا گویا کچھ لینا چاہتے ہیں اور کبھی پیچھے ہٹ آئے یہاں تک کہ پہلی صف سے مل گئے۔ نماز کے بعد صحابہ نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! یہ کیا کیفیت تھی کہ کبھی آپ آگے بڑھے کبھی پیچھے ہٹ آئے؟ آپؐ نے فرمایا: نماز میں میرے سامنے جنت اور جہنم لائی گئیں۔ جب جنت سامنے آئی تو میں آگے بڑھا تا کہ تمہارے لئے انگور کا ایک خوشہ لے لوں، اگر میں خوشہ لے لیتا تو تم رہتی دنیا تک اس کو کھاتے۔ پھر جب میرے سامنے جہنم لائی گئی تو میں نے سخت حرارت محسوس کی، پس میں پیچھے ہٹ گیا، معلوم ہوا کہ آنحضور ﷺ نے یہ مشاہدہ والی نماز پڑھائی تھی اور ہم جب نماز پڑھیں گے تو یہ کیفیت حاصل نہیں ہوگی، اس لئے آپؐ نے نماز کے بعد یہ ہدایت دی کہ آئندہ اس طرح کا واقعہ پیش آئے تو فجر کی نماز کی طرح نماز پڑھی جائے۔ آنحضور ﷺ کی نماز کی طرح نماز نہ پڑھی جائے۔

بہ الفاظ دیگر: جس طرح سجدے کئی طرح کے ہوتے ہیں، ایک سجدۂ صلاۃ ہے جو نماز میں ہے، ایک سجدۂ تلاوت

ہے جو آیتِ سجدہ پڑھنے کے بعد کیا جاتا ہے۔ ایک سجدۂ تحیۃ (سلامی کا سجدہ) ہے، ایک سجدۂ تعظیم ہے (یہ سجدے گذشتہ امتوں میں جائز تھے) اور ایک سجدۂ آیات ہے جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بڑی نشانیاں سامنے آنے پر کیا جاتا ہے۔ ابوداؤد (۱:۱۱۳۱ مصری) میں روایت ہے: ابن عباسؓ کے پاس ازواج مطہرات میں سے کسی کی وفات کی خبر پہنچی تو آپؓ نے سجدہ کیا پوچھا گیا: یہ کیسا سجدہ ہے؟ ابن عباسؓ نے فرمایا: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب تم اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کوئی بڑی نشانی دیکھو تو سجدہ کرو، اور ازواج مطہرات آنحضور ﷺ کی نشانیاں تھیں، ان کے دنیا سے اٹھ جانے سے بڑی اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی کیا ہوسکتی ہے؟ اس لئے میں نے سجدہ کیا۔

اسی طرح رکوع بھی متعدد ہیں: ایک نماز کا رکوع ہے، ایک رکوع آیات ہے۔ سورہ ص (آیت ۲۴) میں اس کا ذکر ہے، اسی طرح سجدۂ تلاوت میں بھی کبھی رکوع سجدہ کی قائم مقامی کرتا ہے۔

چنانچہ جب نبی ﷺ نے مشاہدہ والی نماز پڑھائی اور اللہ کی عظیم نشانیاں آپؐ کے سامنے آئیں تو آپؐ نے رکوع فرمایا، یہ رکوع سجدۂ آیات کا قائم مقام تھا، نماز کا رکوع نہیں تھا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام روایات متفق ہیں کہ سجدے آپؐ نے ہر رکعت میں دو ہی کئے تھے، صرف رکوع متعدد کئے تھے، معلوم ہوا کہ یہ نماز والے رکوع نہیں تھے نیز ائمہ بھی پہلے رکوع سے تکبیر کے ذریعہ کھڑے ہونے کے قائل ہیں، تسمیع کے ذریعہ نہیں، اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہ نماز کا رکوع نہیں تھا۔

اور صحابہ میں اختلاف اس لئے ہوا کہ پہلے سے اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ آج سورج گہن ہونے والا ہے۔ جب سورج گہن شروع ہوا تو حضور اکرم ﷺ نے اعلان کرایا: الصلاۃُ جامعۃ: یعنی مسجد چلو جماعت ہورہی ہے۔ یہ اعلان سن کر سارا مدینہ مسجد نبوی میں آگیا، مگر سب ایک ساتھ نہیں آئے، آگے پیچھے آئے، پھر جماعت بہت بڑی ہوگئی تھی، کیونکہ پورا مدینہ ایک جگہ اکٹھا ہوگیا تھا اس لئے جو لوگ پہلے آئے ان کو آنحضور ﷺ کے سب رکوع نظر آئے اور جو دور تھے ان کو بعض رکوع نظر نہ آئے، اس لئے ہر راوی نے اس کے علم میں جتنے رکوع آئے تھے وہ روایت کردیئے۔

رہی یہ بات کہ ایک ہی صحابی سے دو دو اور تین تین رکوع کی روایتیں کیوں ہیں جیسا کہ حضرت عائشہ اور ابن عباس سے مروی ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ تو اس وقت بچے تھے، ہوسکتا ہے وہ جماعت میں شریک بھی نہ ہوئے ہوں اور ہوئے ہوں تو بالکل پیچھے رہے ہوں، اور حضرت عائشہؓ بچوں سے بھی پیچھے عورتوں کی صف میں تھیں، پس ان حضرات کے علم کا ماخذ دوسرے صحابہ کی روایات ہیں۔ یہ حضرات جو روایتیں بیان کرتے ہیں وہ دوسرے صحابہ سے سنی ہوئی ہیں۔ اور کسی نے ان سے دو رکوع بیان کئے اور کسی نے تین پس انھوں نے جو سنا وہ بیان کردیا۔ اور چونکہ اس زمانہ میں سند کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا اس لئے مروی عنہ کا نام یاد نہیں رکھا اور اس بات پر طلباء کو حیرت نہ ہو، حضرت عائشہؓ ہجرت سے پہلے کے واقعات بھی بیان کرتی ہیں، بلکہ بالکل ابتدائے نبوت کے احوال

بھی بیان فرماتی ہیں۔ یہ سب رسول اللہ ﷺ سے یا دوسرے صحابہ سے مثلاً ان کے والد وغیرہ سے سنی ہوئی روایات ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے تو باقاعدہ صحابہ کے پاس جا جا کر علم حاصل کیا ہے۔

[۲۸۱] باب ماجاء فی صلاة الكسوف

[٥٦٨-] حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا يحيىَ بنُ سعيدٍ، عن سُفيانَ، عن حَبِيْبِ بنِ أبى ثَابِتٍ، عن طَاوُسٍ، عن ابنِ عباسٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم: أَنَّهُ صَلَّى فى كُسُوْفٍ، فَقَرَأَ ثُمَّ رَكَعَ، ثُمَّ قَرَأَ ثُمَّ رَكَعَ، ثُمَّ قَرَأَ ثُمَّ رَكَعَ، ثم سَجَدَ سَجْدَتَيْنِ، والأُخْرَى مِثْلَهَا.

وفى الباب: عن عليٍّ، وعائشةَ، وعبدِ اللّٰهِ بنِ عَمْرٍو، والنُّعْمَانَ بنِ بَشِيْرٍ، وَالمُغِيْرَةِ بنِ شُعْبَةَ، وأبى مَسْعُوْدٍ، وأبى بَكْرَةَ، وسمرة، وابنِ مَسْعُوْدٍ، وأَسْمَاءَ ابْنَةِ أبى بَكْرٍ، وابنِ عُمَرَ، وقَبِيْصَةَ الهِلَالِيِّ، وجابرِ بنِ عبدِ اللّٰهِ، وأبى موسَى، وعبدِالرحمنِ بنِ سَمُرَةَ، وأُبَيِّ بنِ كَعْبٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عباسٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وقد رُوِيَ عن ابنِ عباسٍ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم: أَنَّهُ صَلَّى فى كُسُوْفٍ أَرْبَعَ رَكْعَاتٍ فى أَرْبَعِ سَجَدَاتٍ، وبه يقولُ الشافعيُّ وأحمدُ وإسحاقُ.

قال: واختَلَفَ أهلُ العلمِ فى القِرَاءَةِ فى صَلَاةِ الكُسُوْفِ، فَرَأَى بَعْضُ أهلِ العلمِ: أَنْ يُسِرَّ بِالقِرَاءَةِ فِيْهَا بِالنَّهَارِ؛ ورَأَى بَعضُهُمْ: أَنْ يَجْهَرَ بالقِرَاءَةِ فِيْهَا كَنَحْوِ صَلَاةِ العِيْدَيْنِ وَالْجُمُعَةِ، وبه يقولُ مالكٌ، وأحمدُ، وإسحاقُ: يَرَوْنَ الجَهْرَ فِيْها؛ قال الشافعيُّ: لَايَجْهَرُ فِيْهَا.

وقد صَحَّ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم كِلْتَا الرِّوَايَتَيْنِ: صَحَّ عنه: أَنَّهُ صَلَّى أَرْبَعَ رَكْعَاتٍ فِيْ أَرْبَعِ سَجَدَاتٍ، وصَحَّ عَنْهُ: أَنَّهُ صَلَّى سِتَّ رَكْعَاتٍ فِيْ أَرْبَعِ سَجَدَاتٍ.

وهذا عند أهلِ العلمِ جائزٌ على قَدْرِ الكُسُوْفِ: إِنْ تَطَاوَلَ الكُسُوْفُ، فَصَلَّى سِتَّ رَكْعَاتٍ فِيْ أَرْبَعِ سَجَدَاتٍ فَهُوَ جَائِزٌ، وإِنْ صَلَّى أَرْبَعَ رَكْعَاتٍ فِيْ أَرْبَعِ سَجَدَاتٍ، وأَطَالَ القِرَاءَةَ، فهو جَائِزٌ.

ويَرَى أَصْحَابُنَا أَنْ يُصَلِّيَ صلاةَ الكُسوفِ فى جَمَاعَةٍ، فى كُسُوْفِ الشَّمْسِ والقَمَرِ.

[٥٦٩-] حدثنا محمدُ بنُ عبدِ الملكِ بنِ أبى الشَّوَارِبِ، نا يزيدُ بنُ زُرَيْعٍ، نا مَعْمَرٌ، عن الزُّهْرِيِّ، عن عُرْوَةَ، عن عائشةَ، أَنَّهَا قالتْ: خَسَفَتِ الشَّمْسُ على عَهْدِ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، فَصَلَّى رسولُ الله صلى الله عليه وسلم بالنَّاسِ، فَأَطَالَ القِرَاءَةَ، ثم رَكَعَ فَأَطَالَ الركوعَ، ثم رَفَعَ رَأْسَه فَأَطَالَ القِرَاءَةَ، وَهِيَ دُوْنَ الأُوْلَى، ثُمَّ رَكَعَ فَأَطَالَ الركوعَ، وَهُوَ دونَ الأَوَّلِ، ثم رَفَعَ

رَأْسَهُ فَسَجَدَ، ثُمَّ فَعَلَ ذٰلكَ فی الرّکعةِ الثَّانِیَةِ.

قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ، وبهذا الحدیثِ یقولُ الشافعیُّ، وأحمدُ، وإسحاقُ: یَرَوْنَ صَلاَةَ الکُسوفِ أَرْبَعَ رَکَعَاتٍ فی أَرْبَعِ سَجَدَاتٍ.

قال الشافعیُّ: یَقْرَأُ فی الرکعةِ الْأُوْلَی بِأُمِّ الْقُرآنِ ونَحْواً مِنْ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ سِرًّا إِنْ کانَ بِالنَّهارِ، ثم رَکَعَ رُکُوْعًا طَوِیْلاً نَحْوًا مِنْ قِرَاءَ تِهِ، ثم رَفَعَ رَأْسَهُ بتکبیرٍ، وَثَبَتَ قَائِمًا کَمَا هُوَ، وَقَرَأَ أَیْضًا بِأُمِّ الْقُرْآنِ ونَحْواً مِن آلِ عمرانَ، ثم رَکَعَ رُکُوْعًا طَوِیْلاً نَحْوًا مِنْ قِرَاءَ تِهِ، ثُم رَفَعَ رَأسَهُ، ثم قال: سمعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، ثُمَّ سَجَدَ سَجْدَتَیْنِ تَامَّتَیْنِ، ویُقِیْمُ فی کُلِّ سَجْدَةٍ نَحْوًا مِمَّا أَقَامَ فِیْ رُکُوْعِهِ، ثُم قَامَ فَقَرَأَ بِأُمِّ الْقُرآنِ، ونحواً مِنْ سُوْرَةِ النِّسَاءِ، ثم رَکَعَ رُکُوْعًا طَوِیْلاً نَحْوًا مِنْ قِرَاءَ تِهِ، ثم رَفَعَ رَأْسَهُ بتَکْبِیرٍ، وثَبَتَ قَائِمًا، ثم قَرَأَ نحواً مِنْ سُوْرَةِ المَائِدَةِ، ثم رَکَعَ رُکُوْعًا طَوِیْلاً نحواً مِنْ قِرَاءَ تِهِ، ثم رَفَعَ فقال: سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، ثم سَجَدَ سَجْدَتَیْنِ، ثم تَشَهَّدَ وسَلَّمَ.

ترجمہ: (حدیث ۵۶۸) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے سورج گہن کی نماز پڑھی، پس قراءت کی پھر رکوع کیا، پھر قراءت کی، پھر رکوع کیا، پھر قراءت کی پھر رکوع کیا، پھر دو سجدے کئے، اور دوسری رکعت پہلی کی طرح بھی یعنی ہر رکعت میں تین رکوع کئے ـــــ اور ابن عباس سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے سورج گہن میں نماز پڑھی: چار رکوع اور چار سجدوں میں یعنی ہر رکعت میں دو رکوع کئے اور اسی کے امام شافعی احمد اور اسحاق قائل ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے فرمایا: علماء نے نماز کسوف میں قراءت میں اختلاف کیا ہے۔ پس بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اس میں قراءت سراً کرے دن میں (چونکہ کسوف کا اطلاق چاند گرہن پر بھی ہوتا ہے اس لئے فرق کرنے کے لئے بالنہار کی قید لگائی) اور بعض کی رائے یہ ہے کہ اس میں جہراً قراءت کرے جیسے عیدین اور جمعہ کی نمازوں میں۔ اور اس کے مالک احمد اور اسحاق قائل ہیں۔ وہ صلاۃ کسوف میں جہر کو دیکھتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا صلاۃ کسوف میں جہر نہ کرے ـــــ اور نبی ﷺ سے دونوں ہی روایتیں ثابت ہیں۔ آپؐ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے چار رکوع، چار سجدوں کے ساتھ کئے، اور یہ بھی ثابت ہے کہ آپؐ نے چھ رکوع چار سجدوں کے ساتھ کئے ـــــ اور یہ اہل علم کے نزدیک جائز ہے، کسوف کی مقدار کے لحاظ سے، اگر کسوف لمبا ہو پس چھ رکوع چار سجدوں کے ساتھ پڑھے تو بھی جائز ہے اور اگر چار رکوع چار سجدوں کے ساتھ پڑھے اور قراءت لمبی کرے تو بھی جائز ہے (یعنی مقصود سورج گہن کے پورے وقت کو نماز میں مشغول رکھنا ہے، خواہ رکوع کی تعداد بڑھا کر نماز لمبی کرے یا قراءت طویل کر کے نماز لمبی کرے، مگر ائمہ ثلاثہ یہ بات نہیں کہتے ان کے نزدیک ہر رکعت میں دو ہی رکوع ہیں) ـــــ اور ہمارے اکابر (حجازی مکتب فکر کے علماء) کہتے ہیں کہ نماز کسوف جماعت کے ساتھ پڑھے، سورج گرہن کی بھی اور

چاندگرہن کی بھی (چاندگرہن کے مسئلہ میں امام مالک: حنفیہ کے ساتھ ہیں)

حدیث (۵۶۹) حضرت عائشہ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں سورج گہن ہوا، پس آپؐ نے لوگوں کو نماز پڑھائی، پس لمبی قراءت کی، پھر رکوع کیا، پس لمبا رکوع کیا۔ پھر اپنا سر اٹھایا، پس لمبی قراءت کی اور وہ پہلی قراءت سے کم تھی، پھر رکوع کیا اور لمبا رکوع کیا، اور وہ پہلے رکوع سے کم تھا۔ پھر اپنا سر اٹھایا، پس سجدہ کیا، پھر دوسری رکعت میں اسی طرح کیا۔ اور اسی کے مطابق شافعی، احمد اور اسحاق کا مذہب ہے۔ وہ کہتے ہیں: صلاۃ کسوف میں چار رکوع، چار سجدوں کے ساتھ ہیں۔ پھر امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ نماز کسوف دو رکوع کے ساتھ کس طرح پڑھیں گے۔ اس کا ترجمہ اوپر آ گیا ہے۔

بابٌ کَیْفَ القِرَاءَ ةُ فی الکُسُوْفِ؟

نماز کسوف میں قراءت جہراً کرے یا سراً؟

گذشتہ باب میں یہ مسئلہ آچکا ہے کہ امام اعظم اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک نماز کسوف میں سری قراءت ہے کیونکہ وہ دن کی نماز ہے اور دن کی نمازیں گونگی ہوتی ہیں۔ حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہمیں رسول اللہ ﷺ نے سورج گرہن کی نماز پڑھائی، ہم نے آپؐ کی آواز نہیں سنی، یعنی آپؐ نے سراً قراءت کی۔ یہ حدیث قائلین سرّ کی دلیل ہے ——— اور امام مالک، امام احمد اور صاحبین رحمہم اللہ کے نزدیک نماز کسوف میں جہری قراءت ہے ان کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسوف کی نماز پڑھائی اور اس میں جہراً قراءت کی۔

قائلین سر کہتے ہیں: اس حدیث سے استدلال صحیح نہیں، کیونکہ یہ سفیان بن حسین کی زہری سے روایت ہے اور سفیان بن حسین اگرچہ ثقہ ہیں، بخاری کے راوی ہیں۔ مگر امام زہری کی حدیثوں میں ضعیف ہیں (تہذیب ۴: ۱۰۸) جاننا چاہئے کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسنٌ صحیحٌ کہا ہے، غالباً یہ بات کہ سفیان بن حسین: زہری کی حدیثوں میں ضعیف ہیں: حضرت کے علم میں نہیں ہوگی اس لئے آپ نے اس حدیث پر صحت کا حکم لگایا ہے۔ واللہ اعلم

[۲۸۲] بابٌ کیف القراء ۃ فی الکسوف؟

[۵۷۰-] حدثنا محمودُ بنُ غَیْلَانَ، نا وَکِیعٌ، نا سُفیانُ، عن الأَسْوَدِ بنِ قَیْسٍ، عن ثَعْلَبَةَ بنِ عَبَّادٍ، عن سَمُرَةَ بنِ جُنْدُبٍ، قال: صَلَّی بِنَا رسولُ اللّٰهِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی کُسُوْفٍ، لاَ نَسْمَعُ لَهُ صَوْتًا.
وفی الباب: عن عائشةَ، قال أبو عیسی: حدیثُ سَمُرَةَ بنِ جُنْدُبٍ، حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ غریبٌ،

وقد ذَهبَ بعضُ أهلِ العلمِ إلى هذا. وهوقَولُ الشافعيُّ.

[٥٧١-] حدثنا أبوبكرٍ محمدُ بنُ أَبَانٍ، نا إبراهيمُ بنُ صَدَقَةَ، عن سُفيانَ بنِ حُسَيْنٍ، عن الزُّهْرِيِّ، عن عُرْوَةَ، عن عائشةَ: أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم صَلَّى صَلَاةَ الكُسُوْفِ، وجَهَرَ بِالْقِرَاءَةِ فِيْهَا.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ. ورَوَى أبو إسحاقَ الفَزَارِيُّ عن سُفيانَ بن حُسَيْنٍ نَحوَهُ. وبهذا الحديثِ يقولُ مالكٌ وأحمدُ وإسحاقُ.

وضاحت: حضرت عائشہ کی حدیث سفیان بن حسین سے ابراہیم بن صدقہ کے علاوہ ابواسحاق فزاری بھی روایت کرتے ہیں (مگر پھر بھی یہ حدیث قابل استدلال نہیں کیونکہ ضعف سفیان بن حسین کے امام زہری سے روایت کرنے میں ہے۔اور سفیان کا کوئی متابع نہیں، ابراہیم بن صدقہ کے متابع سے کام نہیں چل سکتا)

بابُ ماجاء فی صَلَاةِ الخوْفِ

نمازِ خوف کا بیان

پوری امت متفق ہے کہ صلاۃ الخوف آج بھی مشروع ہے اور اُسے پڑھنا جائز ہے، صرف امام ابو یوسف اور امام مزنی (جو امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں) اختلاف کرتے ہیں۔ وہ صلاۃ الخوف کی مشروعیت کو تسلیم نہیں کرتے۔ امام مزنی تو کہتے ہیں اس کی مشروعیت منسوخ ہے مگر نسخ کی کوئی دلیل نہیں۔اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کہتے ہیں: سورۃ النساء کی جس آیت (۱۰۲) میں صلاۃ الخوف کا تذکرہ آیا ہے اس میں یہ قید ہے کہ یہ نماز اس وقت مشروع ہے جب حضور اکرم ﷺ نماز پڑھائیں، جب آپؐ کا وصال ہوگیا تو اب اس کی مشروعیت ختم ہوگئی، کیونکہ شرط باقی نہیں رہی، اس کو نسخ بھی کہہ سکتے ہیں، مگر یہ دلیل اس وجہ سے کمزور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد متعدد جنگوں میں صحابہ نے صلاۃ الخوف پڑھی ہے۔پس سورۃ النساء (آیت ۱۰۲) میں إذا کنتَ فیھم کی قید اتفاقی ہے۔

اور روایات میں صلاۃ الخوف مختلف طرح سے مروی ہے۔امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں آٹھ طریقے، ابن حبان نے صحیح ابن حبان میں نو طریقے، اور ابن حزم ظاہری نے المحلی میں چودہ طریقے ذکر کیے ہیں۔اور ابوالفضل عراقی نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اس میں انھوں نے سترہ طریقے ذکر کیے ہیں، یعنی نبی ﷺ سے سترہ طریقوں سے صلاۃ الخوف پڑھنا مروی ہے۔

اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس باب کی سب روایتیں صحیح ہیں، کوئی روایت ضعیف نہیں۔پس سب طریقوں پر جو حضور اکرم ﷺ سے مروی ہیں صلاۃ الخوف پڑھنا جائز ہے۔اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔البتہ ان میں سے کونسے

طریقہ پر صلاۃ الخوف پڑھنا افضل ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ حنفیہ کے نزدیک جو طریقہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں آیا ہے اس طرح صلاۃ الخوف پڑھنا افضل ہے۔ وہ روایت باب کے شروع میں ہے، اور ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں: جو طریقہ سہل بن ابی حثمہ کی روایت میں ہے اس طرح پر صلاۃ الخوف پڑھنا افضل ہے۔

حنفیہ کا طریقہ: یہ ہے کہ فوج کے دو حصے کئے جائیں، ایک حصہ دشمن کے مقابل کھڑا رہے اور دوسرے حصے کو امام اگر مسافر ہے تو ایک رکعت اور مقیم ہے تو دو رکعتیں پڑھائے۔ پھر یہ جماعت دشمن کے مقابل چلی جائے، اور جو طائفہ دشمن کے مقابل ہے وہ آ کر صف بنائے اور نماز شروع کرے، پھر امام اس طائفہ کو ایک یا دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دے۔ امام کے سلام پھیرنے کے بعد یہ طائفہ سلام پھیرے بغیر دشمن کی طرف چلا جائے۔ اور پہلا طائفہ واپس آئے اور صف بنا کر لاحق کی طرح یعنی قراءت کے بغیر ایک رکعت یا دو رکعت پڑھ کر نماز پوری کرے، پھر وہ دشمن کے مقابل جائے، اور دوسرا طائفہ آئے، اور وہ بھی صف بنا کر مسبوق کی طرح یعنی قراءت کے ساتھ بقیہ نماز پوری کرے۔

ائمہ ثلاثہ کا طریقہ: یہ ہے کہ امام پہلے طائفہ کو ایک رکعت یا دو رکعت پڑھائے، پھر وہ طائفہ باقی نماز اسی وقت لاحق کی طرح پوری کرے پھر دشمن کے مقابل جائے اور امام دوسرے طائفہ کا انتظار کرے، جب دوسرا طائفہ آ کر صف بنا کر نماز شروع کرے تو امام اس کو ایک رکعت یا دو رکعت پڑھائے اور سلام پھیر دے اور وہ لوگ مسبوق کی طرح باقی نماز پوری کریں۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ نے یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس میں نماز کے اندر نقل وحرکت نہیں کرنی پڑتی۔ اور احناف نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کو دو وجہ سے اختیار کیا ہے: ایک: سورۃ النساء کی آیت ۱۰۲ میں صلاۃ الخوف کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے ابن عمرؓ کی حدیث میں مروی طریقہ اس سے اقرب ہے، اور قرآن میں بہتر صورت ہی لی جاتی ہے، اس لئے حنفیہ نے اس طریقہ کو افضل قرار دیا ہے۔ دوم: ابن عمرؓ کی حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں، نہ سند میں نہ متن میں۔ اور سہل بن ابی حثمہ کی روایت میں سند میں بھی اختلاف ہے اور متن میں بھی، سند میں اختلاف یہ ہے کہ یحییٰ بن سعید قطان کے ایک استاذ یحییٰ بن سعید انصاری نے اس حدیث کو موقوف بیان کیا ہے۔ یعنی حضرت سہل کی حدیث میں صلاۃ الخوف کا جو طریقہ مذکور ہے وہ حضرت سہل کا بیان کیا ہوا ہے، نبی ﷺ کا بیان کیا ہوا نہیں ہے، اور یحییٰ قطان کے دوسرے استاذ شعبہ رحمہ اللہ نے اس کو مرفوع بیان کیا ہے —— اور متن میں اختلاف یہ ہے کہ شعبہ والی سند سے جو مرفوع ہے بخاری میں متن کچھ ہے اور نسائی میں کچھ۔ بخاری (حدیث ۴۱۳۱ کتاب المغازی) میں اس سند سے جو متن آیا ہے وہ ائمہ ثلاثہ کے موافق ہے اور نسائی (۳: ۱۷۰ مصری) میں جو متن آیا ہے وہ احناف کے موافق ہے۔ یعنی نسائی میں ابن عمر کی حدیث کے مطابق متن آیا ہے —— غرض ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث باب کی سب سے اعلیٰ روایت ہے، اور اس کی سند میں اور متن میں کوئی اختلاف نہیں۔ نیز اس میں جو طریقہ

ہے وہ نص قرآن سے قریب تر ہے۔اس لئے احناف نے اس کو اختیار کیا ہے،اگر چہ اس طریقہ پر صلاۃ الخوف پڑھنے میں نماز کے اندر نقل وحرکت ہوتی ہے مگر اس میں کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ اس نماز کی شان ہی نرالی ہے۔واللہ اعلم

[۲۸۳] بابُ ماجاء فی صَلاَةِ الخوفِ

[۵۷۲-] حدثنا محمدُ بنُ عبدِ الملكِ بنِ أبی الشَّوَارِبِ، نا يَزِيدُ بنُ زُرَيْعٍ، نا مَعْمَرٌ، عن الزُّهرِیِّ، عن سالمٍ، عن أبيهِ: أَنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم صَلَّی صلاةَ الخوفِ بِإِحْدَی الطَّائِفَتَيْنِ رَكْعَةً، وَالطَّائِفَةُ الْأُخْرَی مُوَاجِهَةَ العَدُوِّ، ثم انْصَرَفُوْا، فَقَامُوْا فِیْ مَقَامِ أُوْلٰئِكَ، وجاءَ أولٰئك فَصَلّٰی بِهِمْ رَكْعةً أُخْرَی، ثم سَلَّمَ عَلَيْهِمْ، فَقَامَ هٰؤُلاَءِ فَقَضَوْا رَكْعَتَهُمْ، وقَامَ هٰؤُلاَءِ فَقَضَوْا رَكْعَتَهُمْ.

وفی الباب: عن جابرٍ، وحُذَيْفَةَ، وزيدِ بنِ ثابتٍ، وابنِ عباسٍ، وأبی هريرةَ، وابنِ مسعودٍ، وسهلِ بنِ أبی حَثْمَةَ، وأبی عَيَّاشٍ الزُّرَقِیِّ، واسمُه زيدُ بنُ صامتٍ، وأبی بَكْرَةَ.

قال أبو عيسی: وقد ذَهَبَ مالكُ بنُ أَنَسٍ فی صلاةِ الخوفِ إلی حَدیثِ سَهْلِ بنِ أبی حَثْمَةَ. وهو قولُ الشافعیِّ.

قال أحمدُ: قد رُوِیَ عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم صَلاةُ الخوفِ علی أَوْجُهٍ، وَمَا أَعْلَمُ فی هٰذا البابِ إِلَّا حديثًا صحيحاً، وأَخْتَارُ حديثَ سَهْلِ بنِ أبی حَثْمَةَ.

وهٰكذا قال إسحاقُ بنُ إبراهيمَ، قال: ثَبَتَتِ الرِّوَايَاتُ عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فی صَلاَةِ الخَوْفِ، ورَأَی أَنَّ كُلَّ مَارُوِیَ عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فی صَلاَةِ الخوفِ فَهُوَ جَائِزٌ، وهٰذَا عَلَی قَدْرِ الخَوْفِ.

قال إسحاقُ: ولَسْنَا نَخْتَارُ حديثَ سَهْلِ بنِ أَبِیْ حَثْمَةَ علی غَيْرِهِ مِنَ الرِّوَايَاتِ.

وحديثُ ابنِ عُمرَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ. وقد رَوَاهُ موسی بنُ عُقبةَ عن نَافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم نحوَه.

[۵۷۳-] حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، عن يحيی بنِ سعيدٍ القَطَّانِ، نا يحيی بنُ سعيدٍ الأَنْصَارِیُّ، عن القاسِمِ بنِ محمدٍ، عن صالحِ بنِ خَوَّاتِ بنِ جُبَيْرٍ، عن سَهْلِ بنِ أبی حَثْمَةَ، أَنَّهُ قال فی صَلاَةِ الخَوْفِ: يَقُوْمُ الإمامُ مُسْتَقْبَلَ القِبْلَةِ، وتَقُوْمُ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ مَعَهُ، وطائِفَةٌ مِنْ قِبَلِ العَدُوِّ، وجُوْهُهُمْ إلی العَدُوِّ، فَيَرْكَعُ بِهِمْ رَكْعَةً، ويَرْكَعُوْنَ لِأَنفسِهِمْ رَكْعَةً، وَيَسْجُدُوْنَ لِأَنفُسِهِمْ سَجْدَتَيْنِ فی مَكَانِهِمْ، ثم يَذْهَبُوْنَ إلی مَقَامِ أُوْلٰئِكَ، ويَجِیْئُ أولٰئك، فَيَرْكَعُ بِهِمْ رَكْعَةً، ويَسْجُدُ بهم سَجْدَتَيْنِ، فَهِیَ لَهُ ثِنْتَانِ ولَهُمْ واحِدَةٌ، ثُمَّ يَرْكَعُوْنَ رَكْعَةً وَيَسْجُدُوْنَ سَجْدَتَيْنِ.

قالَ محمدُ بنُ بَشَّارٍ: سَأَلْتُ يحيىَ بنَ سعيدٍ عن هٰذا الحديثِ، فَحَدَّثَنِي عن شُعْبَةَ، عن عبدِ الرحمنِ بنِ القاسمِ، عن أبيهِ، عن صالحِ بنِ خَوَّاتٍ، عن سهلِ بنِ أبي حَثْمَةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم بمِثْلِ حديثِ يحيىَ بنِ سَعيدٍ الأَنْصارِيِّ، وقال لِيْ: اكْتُبْهُ إلى جَنْبِهِ، ولَسْتُ أَحْفَظُ الحديثَ، ولٰكِنَّهُ مَثْلُ حديثِ يحيىَ بنِ سعيدٍ الأَنْصارِيِّ.

قال أبو عيسى: وهذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، لم يَرْفَعْهُ يحيىَ بنُ سعيدٍ الأنصاريُّ، عن القاسمِ بنِ محمدٍ، وهكذا رواهُ أصحابُ يحيىَ بنِ سعيدٍ الأنصاريِّ موقوفاً، ورَفَعَهُ شُعْبَةُ عن عبدِ الرحمنِ بنِ القاسم بنِ محمدٍ.

ورَوَى مالكُ بنُ أنسٍ عن يَزِيْدَ بنِ رُوْمَانَ، عن صالحِ بنِ خَوَّاتٍ، عن مَّنْ صَلّٰى مَعَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم صَلَاةَ الخوفِ فَذَكَرَ نَحْوَهُ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وبه يقولُ مالكٌ والشافعيُّ واحمدُ وإسحاقُ.

ورُوِيَ عن غَيْرِ واحدٍ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم صَلّٰى بِإِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ رَكْعَةً رَكْعَةً، فكانتْ للنبيِّ صلى الله عليه وسلم رَكْعَتَانِ، ولَهُمْ رَكْعَةٌ ركعةٌ.

ترجمہ: حدیث (۵۷۲) ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو جماعتوں میں سے ایک کو صلاۃ الخوف ایک رکعت پڑھائی۔ اور دوسری جماعت دشمن کے مقابل تھی، پھر یہ لوگ (ایک رکعت پڑھ کر) پلٹے، اور وہ ان لوگوں کی جگہ میں (دشمن کے مقابل) کھڑے ہوئے، اور وہ لوگ یعنی دوسرا طائفہ آیا، پس ان کو دوسری رکعت پڑھائی، پھر ان پر سلام پھیر دیا۔ پس یہ لوگ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنی ایک رکعت پوری کی اور وہ لوگ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنی رکعت پوری کی (یہ حدیث مختصر ہے، تفصیلی حدیث بخاری میں ہے اور اسی کے مطابق اوپر صلاۃ الخوف کا طریقہ بیان کیا گیا ہے) ——— امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام مالک رحمہ اللہ صلاۃ الخوف میں سہل بن ابی حثمہ کی حدیث کی طرف گئے ہیں۔ اور وہ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے (اور امام احمد بھی اسی کے قائل ہیں)

امام احمدؒ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ سے صلاۃ الخوف متعدد طریقوں پر مروی ہے اور میں نہیں جانتا اس باب میں مگر صحیح حدیث کو (یعنی میرے علم میں اس مسئلہ میں جتنی حدیثیں ہیں سب صحیح ہیں) اور میں پسند کرتا ہوں سہل بن ابی حثمہ کی حدیث کو (یعنی جو طریقہ اس میں مروی ہے وہ بہتر ہے) اور ایسا ہی اسحاق بن راہویہ نے کہا۔ وہ فرماتے ہیں: صلاۃ الخوف کے مسئلہ میں متعدد حدیثیں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں۔ اور ان کی رائے یہ ہے کہ ہر وہ طریقہ جو رسول اللہ ﷺ سے صلاۃ الخوف کا روایت کیا گیا ہے پس وہ جائز ہے۔ اور یہ خوف کی مقدار پر ہے یعنی جو حالات کا تقاضہ ہو اس کے مطابق صلاۃ الخوف پڑھی جائے۔ اسحاق بن راہویہ نے فرمایا: اور ہم سہل بن ابی حثمہ کی حدیث کو اس

کے علاوہ روایات پر ترجیح نہیں دیتے، یعنی صلاۃ الخوف کے سب طریقے یکساں ہیں، ہم کسی ایک طریقہ کی افضلیت کے قائل نہیں، جیسا کہ ائمہ ثلاثہ نے سہل بن ابی حثمہ کی روایت میں مذکور طریقہ کو افضل قرار دیا ہے۔

اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث حسنٌ صحیحٌ ہے۔ اور اس کو موسیٰ بن عقبہ نے نافع سے، انھوں نے ابن عمر سے، انھوں نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے۔ یعنی یہ حدیث ابن عمرؓ کے دونوں راوی: سالم اور نافع روایت کرتے ہیں۔

حدیث (۵۷۳) اس حدیث کو محمد بن بشار: یحییٰ بن سعید قطان سے، وہ یحییٰ بن سعید انصاری سے، وہ قاسم بن محمد سے (جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں اور مدینہ کے فقہائے سبعہ میں سے ہیں) وہ صالح بن خوات سے، اور وہ سہل بن ابی حثمہ سے روایت کرتے ہیں: انھوں نے صلاۃ الخوف کے طریقہ کے بارے میں فرمایا: (یہ یحییٰ بن سعید انصاری کی سند ہے اور اس طریقہ سے حدیث موقوف ہے، اور شعبہ کی سند جو کہ مرفوع ہے بعد میں آرہی ہے) امام قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو اور لوگوں میں سے ایک جماعت امام کے ساتھ کھڑی ہو، اور دوسری جماعت دشمن کی طرف رہے، ان کے چہرے دشمن کی طرف ہوں۔ پس امام ان کو ایک رکعت پڑھائے اور وہ اپنے لئے ایک رکوع کرلیں اور اسی جگہ میں اپنے لئے دو سجدے کرلیں۔ یعنی امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر فوراً وہیں کھڑے ہوکر دوسری رکعت پڑھ لیں، پھر ان لوگوں کی طرف جائیں اور وہ لوگ آئیں، پس امام ان کے ساتھ ایک رکوع کرے اور ان کے ساتھ دو سجدے کرے یعنی ان کو ایک رکعت پڑھائے۔ پس یہ امام کی دو رکعت ہوئیں اور لوگوں کی ایک رکعت ہوئی، یعنی امام کے ساتھ پھر وہ ایک رکوع کریں اور دو سجدے کریں یعنی اپنی باقی ایک رکعت پڑھ لیں۔ محمد بن بشار کہتے ہیں: میں نے یحییٰ قطان سے اس حدیث کی مرفوع سند کے بارے میں پوچھا؟ انھوں نے سند بیان کی: مجھ سے شعبہ نے حدیث بیان کی، وہ عبدالرحمٰن بن القاسم سے، وہ اپنے والد قاسم بن محمد سے (یہاں سے یہ سند اور اوپر والی سند ایک ہوگئی) وہ صالح بن خوّات سے، وہ سہل بن ابی حثمہ سے اور وہ نبی ﷺ سے: یحییٰ بن سعید انصاری کی حدیث کے مانند روایت کرتے ہیں۔ اور یحییٰ قطان نے مجھ سے کہا: اس سند کو موقوف سند کے پہلو میں لکھ لو، اور اس سند سے جو متن آیا ہے وہ مجھے یاد نہیں، لیکن (بالاجمال اتنا یاد ہے کہ) وہ یحییٰ بن سعید انصاری کی حدیث کی طرح ہے (اس سند سے حدیث بخاری اور نسائی میں ہے، بخاری میں متن کچھ ہے اور نسائی میں کچھ)

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسنٌ صحیحٌ ہے۔ اس کو یحییٰ بن سعید انصاری نے قاسم بن محمد کی سند سے مرفوع نہیں کیا، اور اس کو یحییٰ بن سعید انصاری کے تلامذہ نے اسی طرح موقوف بیان کیا ہے۔ اور اس حدیث کو شعبہ نے عبدالرحمٰن بن القاسم بن محمد کی سند سے مرفوع کیا ہے۔

اور امام مالک رحمہ اللہ نے یزید بن رومان سے، انھوں نے صالح بن خوات سے، انھوں نے اس شخص سے جس نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صلاۃ الخوف پڑھی ہے روایت کیا ہے، پس اس کے مانند (سہل بن ابی حثمہ کی حدیث

کے مانند) ذکر کیا (یہ حدیث بخاری (۴۱۲۹) میں ہے اور اس میں صحابی کا نام مذکور نہیں، پھر بھی یہ قابل استدلال ہے کیونکہ صحابی کی جہالت مضر نہیں، اس لئے کہ تمام صحابہ نقلِ دین میں قابل اعتبار ہیں) اس کے بعد جو قال أبو عیسی ہے وہ محض تکرار ہے ——— اور متعدد طرق سے روایت کیا گیا کہ نبی ﷺ نے دونوں جماعتوں میں سے ہر ایک کو ایک ایک رکعت پڑھائی۔ پس رسول اللہ ﷺ کے لئے دو رکعتیں تھیں اور لوگوں کے لئے (امام کے ساتھ) ایک ایک رکعت تھی۔

بابُ ماجاءَ فی سُجُوْدِ القُرآنِ

سجودِ تلاوت کا بیان

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک قرآن میں کل گیارہ سجدے ہیں، مفصلات یعنی سورۃ النجم، سورۃ الانشقاق اور سورۃ العلق کے سجدوں کے وہ قائل نہیں۔ وہ فرماتے ہیں: مفصلات میں سجدے مکی دور میں مشروع تھے، بعد میں منسوخ ہوگئے، نبی ﷺ مدنی دور میں مفصلات میں سجدے نہیں کرتے تھے۔ ابن عباس کی حدیث جو ابوداؤد (۲:۵۸ مصری) میں ہے ان کی دلیل ہے، مگر اس میں مطر الورّاق ہے جو کثیر الخطا ہے اور ابو قدامۃ الحارث بن عبید اللہ ضعیف راوی ہے۔

اور امام اعظم اور امام شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک چودہ سجدے ہیں، البتہ امام اعظم رحمہ اللہ سورۂ صٓ میں سجدہ مانتے ہیں اور سورۃ الحج میں صرف پہلا سجدہ مانتے ہیں، دوسرا سجدہ نہیں مانتے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک سورۃ الحج میں دو سجدے ہیں اور سورۂ صٓ میں سجدہ نہیں ہے۔

اور امام احمد رحمہ اللہ سورۃ الحج میں دو سجدے اور سورۂ صٓ اور مفصلات میں سجدے مانتے ہیں، اس لئے ان کے نزدیک پندرہ سجدے ہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ حنفیہ کے نزدیک سجودِ تلاوت واجب ہیں، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک سنت ہیں۔ اور ہمارے اکابر میں سے امام طحاوی رحمہ اللہ نے ائمہ ثلاثہ کے مذہب کو اختیار کیا ہے، اور صحابہ میں سے حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی رائے یہ تھی کہ قرآن کے سب سجدے یکساں نہیں، بلکہ بعض واجب ہیں اور بعض سنت، واجب کے لئے انھوں نے ''عزائم'' کی اصطلاح استعمال کی ہے، عزائم السجود: مرکب اضافی درحقیقت مرکب توصیفی ہے اصل سجود عزیمة ہے یعنی پختہ سجدے، پھر عبارت سبک کرنے کے لئے مرکب اضافی بنائی گئی۔ رہی یہ بات کہ کونسے سجدے واجب ہیں اور کونسے غیر واجب؟ ابن عباسؓ سے تو تفصیل مروی نہیں، بالاجمال اتنی بات معلوم ہے کہ ان کے نزدیک قرآن کے سب سجدے ایک درجہ کے نہیں تھے۔ اور حضرت علیؓ سے دو روایتیں ہیں: ایک میں چار سجدوں کے بارے میں اور دوسری میں مزید دو سجدوں کے بارے میں مروی ہے کہ وہ عزائم السجود ہیں یعنی حضرت علی

رضی اللہ عنہ کے نزدیک چھ سجدے واجب ہیں باقی آٹھ سنت ہیں (تعیین باب ۲۹۰ میں آئے گی)

ائمہ ثلاثہ کی دلیلیں: دو ہیں: ایک: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی حدیث۔ دوسری: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر۔ دونوں دلیلیں اگلے صفحہ پر یعنی ترمذی کے اگلے صفحہ پر آرہی ہیں، وہیں ان کی تفصیل آئے گی۔

اور احناف کی دلیلیں تین ہیں:

پہلی دلیل: خود آیاتِ سجدہ کا مضمون وجوب سجدہ کی دلیل ہے۔ سجدوں کی آیات میں پانچ طرح کے مضامین ہیں:

۱- انسانوں کو ملائکہ کا حال سنایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اطاعت شعار بندے ہیں، بندگی سے منہ نہیں موڑتے، ہر وقت پاکی بیان کرتے ہیں، سجدے کرتے ہیں، پروردگار سے ڈرتے ہیں، اور جو بھی حکم دیا جاتا ہے بجالاتے ہیں (سورۃ الاعراف، سورۃ النحل)

۲- آسمان وزمین کا ذرہ ذرہ خدا کے سامنے سجدہ ریز ہے مگر بہت سے انسان انکاری ہیں اس لئے ان پر عذاب ثابت ہوگیا (سورۃ الرعد، سورۃ الحج)

۳- انبیاء اور مؤمنین خدا کو سجدے کرتے ہیں، روتے ہیں اور اللہ کی آیتیں سن کر ان کا خشوع بڑھ جاتا ہے (بنی اسرائیل، مریم، السجدۃ)

۴- کفار سجدہ کرنے سے انکار کرتے ہیں (الفرقان، الانشقاق)

۵- سجدہ صرف اللہ کو کرو۔ اور سجدہ کر کے اس کی نزدیکی حاصل کرو (النمل، حم السجدۃ، النجم، العلق)

اور سورۂ صٓ میں داؤد علیہ السلام کی آزمائش کا ذکر ہے جب وہ سجدے میں گر پڑے اور رجوع ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی لغزش معاف فرمادی۔ غرض سجود تلاوت میں امتثال امر اور نیک بندوں کی روش اپنانے کا مضمون ہے۔ یہ مضمون خود وجوب سجدہ کی دلیل ہے۔

دوسری دلیل: رسول اللہ ﷺ نے مواظبت تامہ کے ساتھ سجود تلاوت کئے ہیں، ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپؐ نے آیت سجدہ تلاوت کی ہو اور سجدہ نہ کیا ہو۔ پس یہ مواظبت وجوب کی دلیل ہے۔

تیسری دلیل: سجود تلاوت کو نماز میں شامل کرنا وجوب کا قرینہ ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ سجدۂ تلاوت نماز کا جز نہیں، اگر نماز کے اندر دورانِ تلاوت آیت سجدہ پڑھی اور سجدہ کیا تو بھی وہ سجدہ نماز کا جز نہیں، بلکہ وہ مستقل امر ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ جس طرح نماز میں اترتا قرآن پڑھنا واجب ہے، چڑھتا قرآن پڑھنا مثلاً پہلی رکعت میں سورۃ الناس اور دوسری رکعت میں سورۃ الفلق پڑھنا مکروہ ہے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب نماز میں اترتا قرآن پڑھنا واجب ہے تو چڑھتا قرآن پڑھنے کی صورت میں سجدۂ سہو کیوں واجب نہیں؟ واجب چھوٹنے سے تو سجدہ سہو واجب ہوتا ہے؟ تمام علماء اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اترتی سورتیں پڑھنا نماز کا واجب نہیں ہے بلکہ وہ واجباتِ قراءت میں

سے ہے اور مستقل واجب ہے، معلوم ہوا کہ بعض مستقل واجبات کو نماز کے اندر لیا گیا ہے اور ایسی کوئی مثال نہیں کہ مستقل سنت کو نماز کے اندر لیا گیا ہو۔ معلوم ہوا کہ سجود تلاوت واجب ہیں کیونکہ انہیں نماز کے اندر لیا گیا ہے، اگر سجود تلاوت سنت ہوتے تو ان کو نماز کے اندر شامل نہ کیا جاتا کیونکہ مستقل سنت کو نماز کے اندر لینے کی کوئی نظیر نہیں۔

حدیث: حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گیارہ سجدے کئے ہیں ان میں وہ سجدہ بھی ہے جو سورۃ النجم میں ہے۔

تشریح: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرض نمازوں میں قرآن میں سے مختلف جگہ سے تلاوت فرماتے تھے۔ پس وہ سورتیں اور رکوع جن میں آیاتِ سجدہ ہیں ان کو بھی تلاوت فرماتے تھے۔ اور جب آپؐ کسی آیت سجدہ پر سے گذرتے تو نماز ہی میں سجدہ فرماتے تھے۔ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز میں صرف گیارہ سجدہ کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ سب سجدے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، اس زمانہ میں تراویح جماعت کے ساتھ نہیں پڑھی جاتی تھی جو سب سجدے کرنے کا اتفاق ہوتا۔

اور اس حدیث سے امام مالک رحمہ اللہ کا جو گیارہ سجدوں کے قائل ہیں استدلال صحیح نہیں، کیونکہ وہ سورۃ النجم کا سجدہ تسلیم نہیں کرتے جبکہ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے گیارہ میں سورۃ النجم کا سجدہ بھی کیا ہے، بلکہ یہ جمہور کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ مفصلات میں بھی سجدے کرتے تھے۔ مگر اس حدیث میں دو خرابیاں ہیں: ایک: وکیع رحمہ اللہ کے لڑکے سفیان روایتِ حدیث میں غیر معتبر ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سبق میں وہ خود حدیث نہیں لکھتے تھے بلکہ ورّاق (تنخواہ دار ملازم) ان کے لئے حدیثیں لکھتا تھا، اور یہ اس زمانہ کا عام دستور تھا صاحبزادے ایسا کرتے تھے اور ان کا وراق برا آدمی تھا، وہ حدیثوں میں دخل فصل کرتا تھا، لوگوں نے یہ بات سفیان کو بتائی بھی اور ان سے ورّاق بدلنے کے لئے کہا بھی مگر انھوں نے کسی خاص تعلق کی وجہ سے وراق نہیں بدلا۔ پس محدثین نے فیصلہ کیا کہ جس روایت کے ساتھ سفیان بن وکیع متفرد ہوں وہ سب روایتیں غیر معتبر ہیں، دوسری: اس میں عمر الدمشقی مجہول راوی ہے۔ جاننا چاہئے کہ اس حدیث کی ایک دوسری سند بھی ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کو اصح کہا ہے مگر اس میں بھی عمر الدمشقی اور اس کے اور ام الدرداء کے درمیان ایک مجہول واسطہ ہے۔

[۲۸۴] بابُ ماجاء فی سجود القرآن

[۵۷۴-] حدثنا سُفیانُ بنُ وَکِیعٍ، نا عبدُ اللّٰہِ بنُ وَھْبٍ، عن عَمْرِو بنِ الحارثِ، عن سَعِیدِ بنِ أبی ھِلَالٍ، عن عُمَرَ الدِّمَشْقِیِّ، عن أُمِّ الدَّرْدَاءِ، عن أبی الدَّرْدَاءِ، قال: سَجَدْتُ مَعَ رسولِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم إِحْدَی عَشْرَۃَ سَجْدَۃً، مِنْھَا التی فی النَّجْمِ.

وفی الباب: عن عليٍّ، وابنِ عباسٍ، وأبی هريرةَ، وابنِ مسعودٍ، وزيدِ بنِ ثابتٍ، وعَمْرِو بنِ العاصِ.
قال أبو عيسى: حديثُ أبی الدَّرْدَاءِ حديثٌ غريبٌ لاَنَعْرِفُهُ إِلاَّ مِنْ حديثِ سَعِيدِ بنِ أبی هِلاَلٍ، عن عُمَرَالدِّمَشْقِيِّ.
[۵۷۵-] حدثنا عبدُ اللّٰهِ بنُ عبدِ الرحمن، نا عبدُ اللّٰهِ بنُ صالحٍ، نا اللَّيْثُ بنَ سعدٍ، عن خالدِ بنِ يَزِيْدَ، عن سَعيدِ بنِ أبی هِلاَلٍ، عن عُمَرَ، وهو ابنُ حَيَّانَ الدِّمَشْقِيُّ قال: سَمِعْتُ مُخْبِراً يُخْبِرُنِی عن أُمِّ الدَّرْدَاءِ، عن أَبی الدرداءِ، قال: سَجَدْتُ مع رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم إحدَى عَشْرَةَ سَجْدَةً مِنْهَا الَّتِیْ فِی النَّجْمِ.
وهذا أَصَحُّ مِنْ حديثِ سُفيانَ بنِ وكيعٍ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ وَهْبٍ.

وضاحت: ابوالدرداء کی حدیث غریب ہے کیونکہ سعید بن ابی ہلال سے آخر تک اس کی ایک ہی سند ہے، اور حدیث کی دوسری سند (۵۷۵) عبداللہ بن عبدالرحمٰن یعنی امام دارمی کی ہے۔ اس میں عمر دمشقی کہتا ہے: مجھے ایک بتلانے والے نے ام الدرداءؓ سے روایت کرتے ہوئے بتایا وہ ابوالدرداء سے روایت کرتی ہیں۔ یہ بتانے والا مجہول ہے اور حدیث کا مضمون وہی ہے جو حدیث (۵۷۴) کا ہے۔

بابٌ فی خُرُوْجِ النِّسَاءِ إِلَی المَسَاجِدِ

عورتوں کا نمازوں کے لئے مسجد جانا

ابواب العیدین میں عورتوں کے لئے عیدگاہ جانے کا مسئلہ گذر چکا ہے، وہاں تفصیل سے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ عورتوں کا فی نفسہ فرض نمازیں پڑھنے کے لئے مسجد جانا یا عیدین کے لئے عیدگاہ جانا جائز ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عورتیں مسجد نبوی میں آتی تھیں، مگر فی زمانہ ممنوع ہے۔ اور یہ ممانعت لغیرہ ہے، اور غیر سے مراد خوف فتنہ ہے، کیونکہ آج کے بدلے ہوئے حالات میں عورتوں کا مسجد یا عیدگاہ جانا فتنہ کا باعث ہے، اس لئے اب عورتوں کے لئے مسجد اور عیدگاہ جانا ممنوع ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ابواب السجود میں یہ دو باب (یہ باب اور آئندہ باب) غیر متعلق ہیں، بخاری شریف میں جب ایسا ہوتا ہے تو شراح میدان گرم کر دیتے ہیں اور طرح طرح سے مناسبتیں بیان کرتے ہیں، چاہے وہ سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں، مگر ترمذی میں ایسی کوئی بات نہیں۔ درحقیقت یہ دونوں ابواب گذشتہ کسی جگہ کے ابواب ہیں، مگر ایسا ہوا کہ کاتب نے جب ترمذی کا نسخہ لکھا تو یہ باب لکھنے سے رہ گئے پھر جب یاد آیا تو وہ یہاں لکھ دیئے، اور ایسی

صورت میں کاتب حاشیہ پرنشان بنایا کرتا ہے تاکہ قارئین سمجھ جائیں کہ یہ ابواب یہاں کے نہیں ہیں، اور آئندہ جب نیا نسخہ تیار کیا جائے تو وہ اپنی جگہ منتقل کردیئے جائیں مگر کسی وجہ سے وہ نشانی باقی نہیں رہی تو یہ دونوں باب ابواب السجود میں لکھے جاتے رہے، اب ہماری ذمہ داری ہے کہ غور وفکر کر کے ہم ان ابواب کو ان کی اصل جگہ پہنچادیں۔ میں نے اس سلسلہ میں غور کیا تو اس باب کی جگہ باب في خروج النساء في العيدين کے بعد ہے، جب عیدین کے لئے عیدگاہ جانے کی ممانعت کا ذکر آیا تو فرض نمازوں کے لئے مسجد میں جانے کا مسئلہ بھی ذکر کردیا۔ اور آئندہ باب کی جگہ باب ماجاء في النوم في المسجد کے بعد ہے، مسجد میں جس طرح سونا ممنوع ہے تھوکنا بھی ممنوع ہے۔ مگر چونکہ اب زمانہ دراز ہوگیا ہے اس لئے میں بھی ان کو ان کی جگہ میں منتقل کرنے کی ہمت نہیں کررہا۔

حدیث: مجاہد کہتے ہیں: ہم ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس تھے، انھوں نے حدیث سنائی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عورتوں کو رات میں مسجد جانے کی اجازت دو'' (یعنی عورتیں رات کی نمازوں کے لئے مسجد جانا چاہیں تو ان کو منع نہ کرو) یہ حدیث سن کر ان کے ایک بیٹے بولے: بخدا! ہم ان کو اجازت نہ دیں گے یا بخدا! آپ ان کو اجازت نہ دیں، ورنہ وہ اس کو دَغَل فَصَل (بگاڑ) کا سبب بنالیں گی (لا نَأْذَنُ: لا تَأْذَنْ (نہی حاضر) بھی پڑھا گیا ہے یعنی یہ حدیث بیان کر کے آپ عورتوں کے لئے رات میں مسجد جانے کا راستہ نہ کھولیں) بیٹے کی یہ بات سن کر ابن عمرؓ غضبناک ہوگئے، اور اس کو ڈانٹا کہ اللہ تیرے ساتھ ایسا کریں اور ایسا کریں (یہ کنائی جملہ نہیں ہے بلکہ زجر وتوبیخ کے لئے یہی جملہ استعمال کیا جاتا ہے اور یہ درمیانی درجہ کی ڈانٹ ہے) میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث سنا رہا ہوں اور تو کہتا ہے: ہم اجازت نہیں دیں گے یا آپ ان کو اجازت نہ دیں (صاحبزادے کی یہ بات کہ ہم اجازت نہیں دیں گے یا آپ اجازت نہ دیں بظاہر حدیث شریف کا معارضہ ہے، اس لئے ابن عمر سخت غصہ ہوئے، البتہ اگر وہ یہ کہتا کہ بیشک یہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے مگر آج کے بدلے ہوئے حالات میں عورتوں کو مسجد جانے سے روکنا مناسب ہے تو حدیث کا معارضہ نہ ہوتا اور ابن عمر قطعاً غصے نہ ہوتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے (حقیقی ترتیب کے اعتبار سے) اوپر والے باب میں کتنی خوبصورت بات کہی ہے کہ اگر یہ بدلے ہوئے حالات حضور اکرم ﷺ دیکھتے تو آپؐ عورتوں کو مسجد جانے سے روک دیتے۔ سبحان اللہ! کتنا پیارا انداز ہے۔ ان روایات سے عورتوں کے لئے مسجد جانے کا جواز بھی معلوم ہوا اور بدلے ہوئے احوال کا تقاضا بھی سامنے آیا۔ کہتے ہیں: اس واقعہ کے بعد ابن عمرؓ اس لڑکے سے کبھی نہیں بولے، یہ ہے غیرت دینی! اور یہ ہے نَتْرُكُ مَنْ يَفْجُرُكَ پر عمل!

[۲۸۵] بابُ ماجاء في خروج النساء إلى المساجد

[۵۷۶-] حدثنا نَصْرُ بنُ عليٍّ، نا عيسى بنُ يُوْنُسَ، عن الأَعْمَشِ، عن مُجَاهِدٍ، قال: كُنَّا عِنْدَ ابنِ عُمَرَ، فقال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: " ايذَنُوْا لِلنِّسَاءِ بِاللَّيْلِ إِلَى الْمَسَاجِدِ" فقال ابنُهُ:

واللهِ لاَ نَأْذَنُ لَهُنَّ، يَتَّخِذْنَهُ دَغَلاً! فقال: فَعَلَ اللّٰهُ بِكَ وَفَعَلَ! أقولُ: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم، وتقولُ: لاَ نَأْذَنُ!

وفي الباب: عن أبي هريرةَ، وزَيْنَبَ امْرَأَةِ عبدِ اللّٰهِ بنِ مَسْعُوْدٍ، وزيدِ بنِ خالدٍ. قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمَرَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

لغت: الدَّغَل: گھنے درختوں کا جھنڈ جس میں دھوکہ دینے کے لئے آدمی چھپ جائے: دَغَلٌ فَصَلٌ: مکروفریب۔

بابٌ في كَرَاهِيَةِ البُزَاقِ في المَسْجِدِ

مسجد میں تھوکنے کی ممانعت

نماز کے اندر اگر اچانک تھوکنے کی ضرورت پیش آئے، مثلاً: منہ میں مچھر گھس جائے اور تھوکنا ضروری ہو جائے تو بائیں طرف یا بائیں پاؤں کے نیچے تھوکے، سامنے یا دائیں طرف نہ تھوکے، اور اس کی وجہ حدیث میں یہ آئی ہے کہ سامنے اللہ سے مواجہہ ہوتا ہے اور دائیں طرف نیکی لکھنے والا فرشتہ ہے اس کا احترام چاہئے۔

سوال: بائیں طرف بھی تو فرشتہ ہے اس کا بھی تو احترام چاہئے؟!

جواب: بائیں طرف گناہ لکھنے والا فرشتہ ہے اور جب بندہ نماز شروع کرتا ہے تو برائی کا موقع نہیں رہتا اس لئے وہ ہٹ جاتا ہے، جیسے جمعہ کے دن جب خطیب ممبر پر آجاتا ہے تو فرشتے رجسٹر بند کر کے خطبہ سننے چلے جاتے ہیں۔

اور اگر بندہ مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے تو پھر کسی طرف تھوکنا نہیں چاہئے۔ یہ مسجد کے احترام کے خلاف ہے اور اگر مجبوری ہو تو آستین میں، رومال میں، کرتے کے دامن میں، چادر میں یا کسی اور چیز میں تھوکے اور اس کو مل دے پھر بعد میں دھوڈالے، آخر لوگ آستین اور رومال وغیرہ سے ناک کی رینٹ صاف کرتے ہی ہیں۔ اور تھوک رینٹ سے زیادہ غلیظ نہیں، پس اس کو کپڑے میں لیلے، پھر نماز کے بعد دھوڈالے۔

اور اگر بالارادہ یا بے اختیار تھوک نکل کر مسجد میں گر جائے تو یہ غلطی ہے، اور اس کی تلافی یہ ہے کہ نماز کے بعد وہ جگہ صاف کردے، اور اگر مسجد میں بالقصد تھوکا ہے تو یہ ایسی غلطی ہے جس کے لئے توبہ بھی ضروری ہے۔ اب صرف تھوک صاف کرنے سے گناہ معاف نہیں ہوگا۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم نماز میں ہو تو اپنی دائیں طرف نہ تھوکو، بلکہ اپنے پیچھے یا اپنی بائیں طرف یا اپنے بائیں پاؤں کے نیچے تھوکو''

تشریح: یہ حدیث اور کتابوں میں بھی ہے مگر یہ جملہ: ولكن خلفك صرف ترمذی میں ہے۔ اور نماز کے اندر

پیچھے تھوکنے کی کوئی صورت نہیں، کیونکہ چہرہ اور سینہ گھما کر پیچھے تھوکے گا تو نماز فاسد ہوجائے گی، اور منہ اُلار کر تھوکے گا تو تھوک منہ پر گرے گا، اس لئے اللہ بہتر جانتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ جملہ محفوظ ہے یا نہیں ——— (اصل ترتیب کے اعتبار سے) گذشتہ باب میں یہ مسئلہ آیا تھا کہ مسجد میں سونا ممنوع ہے، سوتے ہوئے منہ سے رال بھی ٹپک جاتی ہے، اس باب میں صراحۃً مسجد میں تھوکنے کی ممانعت ہے، پس یہ باب اس باب کے بعد کا ہے۔

[۲۸۶] بابٌ فی کراھیة البُزَاقِ فی المسجد

[۵۷۷-] حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا یحییَ بنُ سَعیدٍ، عن سُفیانَ، عن مَنْصُوْرٍ، عن رِبْعِیِّ بنِ حِرَاشٍ، عن طارقِ بنِ عبدِ اللّٰهِ المُحَارِبِیِّ، قال: قال رسولُ الله صلی الله علیه وسلم: "إِذَا كُنْتَ فی الصَّلَاةِ فَلَا تَبْزُقْ عَنْ يَمِينِكَ، ولكنْ خَلْفَكَ أَوْ تِلْقَاءَ شِمَالِكَ، أَوْ تَحتَ قَدَمِكَ الْيُسْرَى"

وفی الباب: عن أبی سعیدٍ، وابنِ عُمَرَ، وأنسٍ، وأبی هریرةَ. قال أبو عیسی: حدیثُ طارقٍ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ، والعملُ علی هذا عندَ أهلِ العلمِ.

وسَمِعْتُ الجَارُوْدَ یقولُ: سَمِعْتُ وكیعاً یقولُ: لَمْ یَكْذِبْ رِبْعِیُّ بنُ حِرَاشٍ فی الإِسْلَامِ كَذْبَةً.

وقال عبدُ الرحمنِ بنُ مَهْدِیٍّ: أَثْبَتُ أهلِ الكوفةِ منصورُ بنُ المُعْتَمِرِ.

[۵۷۸-] حدثنا قُتَیْبَةُ، نا أبو عَوَانَةَ، عن قَتَادَةَ، عن أنسِ بنِ مالكٍ، قال: قال رسولُ الله صلی الله علیه وسلم: "الْبُزَاقُ فی المَسْجِدِ خَطِیْئَةٌ، وكَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا"

قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

وضاحت: وکیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ربعی بن حراش مسلمان ہونے کے بعد کبھی جھوٹ نہیں بولے (نہ بالقصد نہ بلاقصد) اور عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں: کوفہ والوں میں منصور سب سے مضبوط راوی ہیں ——— حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مسجد میں تھوکنا غلطی ہے اور اس کی تلافی تھوک کو دفن کرنا یعنی صاف کرنا ہے۔

بابٌ فی السجدة فی إذا السماء انشقت واقرأباسم ربك الذی خلق

سورۃ الانشقاق اور سورۃ العلق میں سجدے

ان دوسجدوں کے بارے میں امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ منسوخ ہیں، باقی تینوں ائمہ فرماتے ہیں: یہ مشروع ہیں منسوخ نہیں ——— باب کی حدیث جمہور کی دلیل ہے۔

حدیث: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سورۃ العلق اور سورۃ

الانشقاق میں سجدہ کیا۔

تشریح: ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے ہیں اوران کو یہ سجدے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کرنے کا اتفاق ہوا ہے، یعنی آپؐ نے مختلف وقتوں میں فرض نمازوں میں یہ سورتیں پڑھی ہیں اور سجدہ کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ ان نمازوں میں شریک تھے۔ معلوم ہوا کہ آپؐ مدنی دور میں بھی مفصلات میں سجدے کرتے تھے۔ پس امام مالک رحمہ اللہ کا نسخ کا دعوی صحیح نہیں۔

فائدہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کی ایک دوسری سند بھی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حدیث کے بعدوہ سند بھی لکھی ہے، اس سند میں چار تابعی: یحیٰ بن سعید انصاری، ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم، عمر بن عبدالعزیز اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث: ایک دوسرے سے روایت کرتے ہیں۔

[۲۸۷] بابٌ فی السجدة فی إذا السماء انشقت و اقرأ باسم ربك الذی خلق

[۵۷۹-] حدثنا قُتَيْبَةُ بنُ سَعِيدٍ، نا سُفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ، عن أيوبَ بنِ مُوسى، عن عَطَاءِ بنِ مِينَاءَ، عن أبى هريرةَ، قال: سَجَدْنَا مع رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فى ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ﴾ و﴿إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ﴾

حدثنا قُتَيْبَةُ، نا سفيانُ، عن يَحيى بنِ سعيدٍ، عن أبى بكرِ بنِ محمدِ بنِ عَمْرِو بنِ حَزْمٍ، عن عُمَرَ بنِ عبدِ العزيزِ، عن أبى بكرِ بنِ عبدِ الرحمنِ بنِ الحارثِ بنِ هِشَامٍ، عن أبى هريرةَ، عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم مِثْلَهُ.

وفى الحديث أَرْبَعَةٌ مِنَ التَّابِعِينَ بَعْضُهم عن بعضٍ، قال أبو عيسى: حديثُ أبى هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، والعَمَلُ على هذا عندَ أكثرِ أهلِ العلمِ، يَرَوْنَ السُّجُوْدَ فى إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ واقرأْ باسْمِ رَبِّكَ.

قوله: بعضُهم عن بعض: أى بعضُهم يروى عن بعض۔

بابُ ماجاء فى السَّجْدَةِ فى النَّجمِ

سورۃ النجم میں سجدہ کا بیان

حدیث: ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے سورۃ النجم میں سجدہ کیا اور مسلمانوں اور مشرکین نے اور جن وانس نے سجدہ کیا۔

تشریح: یہ مکی دور کا واقعہ ہے، ایک مجلس میں آنحضور ﷺ نے سورۃ النجم تلاوت فرمائی، اس مجلس میں مسلمانوں کے علاوہ مشرکین اور انسانوں کے علاوہ جنات بھی تھے، جب آپ نے سورت ختم کی تو سجدہ تلاوت کیا پس مجلس میں موجود سبھی لوگوں نے سجدہ کیا مگر امیہ بن خلف نے سجدہ نہ کیا، اس نے زمین سے مٹی لی اور پیشانی سے لگائی اور کہا: میرے لئے یہ کافی ہے۔ اس مجلس میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، وہ فرماتے ہیں: اس موقع پر جس نے بھی سجدہ کیا دیر سویر اس کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی، مگر امیہ بن خلف ایمان کی دولت سے محروم رہا اور جنگ بدر میں مارا گیا۔

اور کفار نے اس موقع پر سجدہ اس لئے کیا تھا کہ سورۃ النجم نہایت فصیح و بلیغ سورت ہے، پھر زبانِ نبوت نے وہ سورت تلاوت کی تھی اس لئے سماں بندھ گیا اور جب حضور اکرم ﷺ نے سجدہ کیا تو بے اختیار کفار بھی سجدہ میں چلے گئے، بعد میں جب ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے خفت مٹانے کے لئے الغرانیق العلی والا قصہ گڑھا، اور کہنا شروع کیا: ہم نے سجدہ اس لئے کیا تھا کہ محمد (ﷺ) نے ہماری مورتیوں کی تعریف کی تھی۔ اس سورت میں تین بتوں کا ذکر آیا ہے، کفار نے کہنا شروع کیا کہ محمد (ﷺ) نے ان بتوں کی تعریف کی اور ان کو طائرانِ لاہوتی (عالم بالا کے پرندے یعنی فرشتے) قرار دیا اور یہ بھی کہا کہ ان کی سفارش ضرور قبول کی جائے گی، اس لئے ہم نے سجدہ کیا —— مگر سوال یہ ہے کہ اگر یہ جملے آپ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوئے تھے تو کس جگہ پڑھے گئے تھے؟ اس کے لئے کوئی موزوں جگہ بتاؤ؟ پوری سورت میں کوئی بھی جگہ ان کلمات کے لئے موزون نہیں، اور صاحب جلالین نے جہاں ان کو فٹ کیا ہے وہ تو بالکل ہی غیر موزون جگہ ہے، بھلا: ایک طرف قرآن ان بتوں کی تردید کرے، پھر وہیں ان کی تعریف بھی کرے اس سے زیادہ بے تکی بات کیا ہوسکتی ہے؟! الغرض الغَرَانِیقُ العُلٰی والا واقعہ محض بے اصل اور من گھڑت ہے۔

فائدہ: یہ حدیث امام مالک رحمہ اللہ کے خلاف پیش نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ مکی دور کا واقعہ ہے اور امام مالک مکی دور میں یہ سجدے مانتے ہیں وہ مدنی دور میں مفصلات کے سجدوں کے نسخ کی بات کہتے ہیں۔

[۲۸۸] باب ماجاء فی السجدة فی النجم

[۵۸۰-] حدثنا هارونُ بنُ عبدِ اللهِ البَزَّازُ، نا عبدُ الصَّمَدِ بنُ عبدِ الوَارِثِ، نا أبی، عن أیوبَ، عن عِکْرَمَةَ، عن ابنِ عباسٍ، قال: سَجَدَ رسولُ اللهِ صلی الله علیه وسلم فِیْهَا - یَعْنِی النَّجْمَ - والْمُسْلِمُوْنَ وَالْمُشْرِکُوْنَ وَالْجِنُّ وَالإِنْسُ.

وفی الباب: عن ابنِ مسعودٍ، وأبی هریرةَ، قال أبو عیسی: حدیثُ ابنِ عباسٍ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ. والعملُ علی هذا عندَ بعضِ أهلِ العلمِ: یَرَوْنَ السُّجُوْدَ فی سُوْرَةِ النَّجْمِ.

وقال بعضُ أهلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم وغیرِهم: لَیْسَ فِیْ المُفَصَّلِ سَجْدَةٌ، وهو قولُ مالكِ بنِ أنسٍ، والقولُ الأولُ أَصَحُّ. وبه یقولُ الثوریُّ. وابنُ المبارکِ، والشافعیُّ، وأحمدُ، وإسحاقُ.

ترجمہ: اس حدیث پر بعض علماء کا عمل ہے، وہ سورۃ النجم میں سجدے کے قائل ہیں۔ اور صحابہ اور ان کے علاوہ بعض علماء کہتے ہیں کہ مفصلات میں کوئی سجدہ نہیں۔ اور یہی امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے (معلوم ہوا کہ یہ اختلاف اوپر سے آیا ہے بعض صحابہ اور تابعین نسخ کے قائل تھے، امام مالکؒ نے ان کا قول لیا ہے) اور پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

بابُ ماجاءَ من لم یَسْجُدْ فِیْهِ

سجود تلاوت واجب ہیں یا سنت؟

حدیث: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سورۃ النجم سنائی (صحابہ سبق یاد کر کے آپؐ کو سناتے تھے) پس آپؐ نے اس میں سجدہ نہیں کیا۔

تشریح: اسی حدیث سے امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مفصلات میں سجدے نہیں۔ کیونکہ حضرت زید: انصاری ہیں۔ انھوں نے بالیقین مدنی زندگی میں یہ سورت آپؐ کو سنائی ہے، اور آپؐ نے سجدہ نہیں کیا، معلوم ہوا کہ ہجرت کے بعد یہ سجدے منسوخ ہو گئے تھے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس باب میں یہ مسئلہ تو چھیڑا نہیں، ایک دوسرا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ سجود تلاوت واجب ہیں یا سنت؟ ائمہ ثلاثہ سنت کہتے ہیں۔ اور احناف واجب مانتے ہیں۔ ائمہ ثلاثہ کی دو دلیلیں ہیں: ایک حضرت زید کی یہ حدیث ہے، دوسری حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت ہے۔ حضرت زید کی حدیث سے اس طرح استدلال کیا ہے کہ جب حضرت زید نے سورۃ النجم آپ کو سنائی تو آپؐ نے سجدہ نہیں کیا، معلوم ہوا کہ سجود تلاوت واجب نہیں سنت ہیں، چاہیں کریں چاہیں نہ کریں۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، خطبہ میں سورۃ النحل کی آیت سجدہ پڑھی پھر ممبر سے اتر کر سجدہ کیا اور لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا۔ پھر ممبر پر جا کر خطبہ آگے دیا، آئندہ ہفتہ بھی یہی آیت خطبہ میں تلاوت فرمائی، لوگ سجدہ کی تیاری کرنے لگے تو آپ نے فرمایا: لوگو! ہم پر یہ سجدے لازم نہیں کیے گئے، ہم چاہیں تو کریں اور چاہیں تو نہ کریں اور خطبہ آگے جاری رکھا، ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ اس پر کسی نے نکیر نہیں کی، پس یہ اجماع سکوتی ہو گیا کہ سجود تلاوت واجب نہیں۔

اور بعض حضرات نے پہلی دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ جب حضرت زید نے سجدہ نہیں کیا تو آپؐ پر بھی سجدہ واجب نہیں ہوا اس لئے آپؐ نے سجدہ نہیں کیا۔ یہ حضرات کہتے ہیں: قاری بمنزلہ امام ہے، وہ سجدہ کرے گا تو سامعین اس کی اقتداء میں سجدہ کریں گے ورنہ نہیں۔ مگر احناف کے نزدیک یہ جواب صحیح نہیں، ان کے نزدیک سامع پر بہر حال سجدہ واجب ہے، خواہ قاری سجدہ کرے یا نہ کرے۔ اس لئے وہ جواب دیتے ہیں کہ سجدۂ تلاوت علی الفور واجب نہیں، بعد میں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اور ممکن ہے جس وقت حضرت زید نے سورۃ النجم سنائی اس وقت آپؐ کی وضو نہ ہو یا سجدہ کا موقع نہ ہو، اس لئے آپؐ نے اس وقت سجدہ نہیں کیا، بعد میں کیا ہوگا۔ اس وقت سجدہ نہ کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپؐ نے بعد میں بھی سجدہ نہیں کیا۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر کے دو جواب دیئے گئے ہیں:

پہلا جواب: یہ دیا گیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ تھا کہ سجدۂ تلاوت میں سجدہ ہی ضروری نہیں، رکوع کرلینا بھی کافی ہے، بلکہ سر جھکا کر اشارہ کرلینا بھی کافی ہے مصنف ابن ابی شیبہ (۲: ۳۸۳ طبع محمد عوامہ) میں باب ہے إذا قرأ الرجلُ السجدةَ وهو يمشي ما يَصنعُ؟ اس میں متعدد روایات ہیں جن سے ابن مسعودؓ کا مذہب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ سجدہ ہی ضروری نہیں۔ اور ابن مسعود کے علوم میں اور حضرت عمرؓ کے علوم اور آراء میں بڑی حد تک ہم آہنگی تھی۔ پس ممکن ہے حضرت عمرؓ کا بھی یہی مذہب ہو —— مگر یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سر جھکانا مروی نہیں بلکہ آپ کا صاف ارشاد ہے کہ یہ سجدے ہم پر لازم نہیں ہم چاہیں تو کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔

اس لئے دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اپنا مذہب ہے کہ سجودِ تلاوت سنت ہیں، دیگر صحابہ کا یہ مذہب نہیں، آئندہ باب میں روایت آرہی ہے کہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بعض سجدوں کو واجب کہتے تھے اور بعض کو سنت۔ اس لئے حنفیہ نے حضرت عمر کی رائے کے بجائے دوسرے صحابہ کی رائے لی ہے، بلکہ حاشیہ میں تو عمدۃ القاری سے منقول ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ حضرت عمرؓ کی ایسی رائے ہے جس کو صحابہ میں سے کسی نے اختیار نہیں کیا۔ اور جب نبی ﷺ سے مواظبت کے ساتھ سجودِ تلاوت کرنا ثابت ہے تو عملِ نبوی کی موجودگی میں کسی بھی صحابی کا قول لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی بات اجماعِ سکوتی کی تو یہ اجماع نہیں ہے بلکہ شخصیت کے احترام میں خاموشی ہے۔ اور دونوں کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں پس ان میں فرق کرنا ضروری ہے۔ اور فرق اس طرح کیا جائے گا کہ اگر اس واقعہ کے بعد صحابہ نے اپنی سابق رائے چھوڑ دی تو یہ اجماع ہے، اور اگر نہیں چھوڑی تو یہ خاموشی شخصیت کے احترام میں ہے۔ اور یہ بات طے ہے کہ دوسرے صحابہ اپنی رائے پر قائم رہے تھے، انھوں نے اپنی رائے نہیں بدلی تھی جیسا حضرت علی اور ابن عباس کے مذہب سے معلوم ہوتا ہے، پس یہ اجماع نہیں ہے۔ واللہ اعلم

[۲۸۹] باب ماجاء من لم يسجد فيه

[۵۸۱-] حدثنا يَحيىَ بنُ موسى، نا وكيعٌ، عن ابنِ أبى ذِئْبٍ، عن يَزِيْدَ بنِ عبدِ اللّهِ بنِ قُسَيْطٍ، عن عَطَاءِ بنِ يَسَارٍ، عن زيدِ بنِ ثابتٍ، قال: قَرَأْتُ على رسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم النَّجْمَ فَلَمْ يَسْجُدْ فِيْهَا.

قال أبو عيسى: حديثُ زيدِ بنِ ثابتٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وتَأَوَّلَ بعضُ أهلِ العلمِ هٰذا الحديثَ، فقال: إِنَّمَا تَرَكَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم السُّجُوْدَ، لِأَنَّ زَيْدَ بنَ ثابتٍ حينَ قَرَأَ فَلَمْ يَسْجُدْ لَمْ يَسْجُدِ النبيُّ صلى الله عليه وسلم؛ وقالوا: السَّجْدَةُ واجبة على مَنْ سَمِعَهَا ولَمْ يُرَخِّصُوْا فِيْ تَرْكِهَا، وقالوا: إِن سَمِعَ الرجُلُ وهو على غَيْرِ وُضُوْءٍ فَإِذا تَوَضَّأَ سَجَدَ، وهُوَ قولُ سفيانَ وأهلِ الكُوْفَةِ، وبه يقولُ إسحاقُ.

وقال بعضُ أهلِ العلمِ إِنَّمَا السَّجْدَةُ على مَنْ أَرَادَ أَنْ يَسْجُدَ فِيْها، وَالْتَمَسَ فَضْلَهَا، وَرَخَّصُوْا فِيْ تَرْكِهَا، قَالُوْا إِنْ أَرَادَ ذٰلِكَ، واحْتَجُّوْا بالحَدِيْثِ الْمَرْفُوْعِ، حديثِ زَيْدِ بنِ ثابتٍ، قال: قَرَأْتُ عَلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم النَّجْمَ فَلَمْ يَسْجُدْ، فقالوا: لَوْ كانتِ السَّجْدَةُ وَاجِبَةً لَمْ يَتْرُكِ النبيُّ صلى الله عليه وسلم زَيْدًا حَتّٰى كانَ يَسْجُدُ، وَيَسْجُدُ النبيُّ صلى الله عليه وسلم.

وَاحْتَجُّوْا بِحديثِ عُمَرَ أَنَّهُ قَرَأَ سَجْدَةً على المِنْبَرِ فَنَزَلَ فَسَجَدَ، ثم قَرَأَهَا فِيْ الْجُمُعَةِ الثَّانِيَةِ فَتَهَيَّأَ النَّاسُ للسُّجُوْدِ، فقال: إِنَّهَا لم تُكْتَبْ عَلَيْنَا إِلاَّ أَنْ نَشَاءَ، فَلَمْ يَسْجُدْ وَلَمْ يَسْجُدُوْا، وَذَهَبَ بعضُ أهلِ العلمِ إِلىٰ هٰذَا، وهُوَ قَوْلُ الشَّافِعِيِّ واحمدَ.

ترجمہ: بعض علماء نے اس حدیث کی تاویل کی ہے پس کہا: نبی ﷺ نے سجدہ اس لئے نہیں کیا کہ حضرت زیدؓ نے جب آیت سجدہ پڑھی تو سجدہ نہیں کیا، اس لئے نبی ﷺ نے بھی سجدہ نہیں کیا (یہ پہلا جواب پورا ہوا) اور انھوں نے کہا: سجدہ اس شخص پر واجب ہے جو آیت سجدہ سنے اور انھوں نے سجدہ ترک کرنے کی اجازت نہیں دی اور انھوں نے کہا: اگر آدمی آیت سجدہ سنے درانحالیکہ وہ بے وضو ہو تو جب وضوء کرے سجدہ کرے (یعنی علی الفور سجدہ ضروری نہیں بعد میں بھی سجدہ کرنا درست ہے۔ یہ دوسرا جواب پورا ہوا) اور یہ سفیان ثوری اور کوفہ والوں کا قول ہے اور اسحاق بن راہویہ اسی کے قائل ہیں۔ (اور میرا خیال یہ ہے کہ وقالوا: السجدة واجبة على من سمعها سے پہلے کچھ عبارت رہ گئی ہے، مگر کسی نسخہ میں ترکہ کا سراغ نہیں ملا، اس لئے میں نے زبردستی مطلب بیان کیا ہے)

اور بعض علماء کہتے ہیں: سجدہ اسی شخص پر ہے جو آیات سجدہ میں سجدہ کرنا چاہے، اور وہ سجدوں کے ثواب کا طالب

ہو، اور اجازت دی انھوں نے سجدہ نہ کرنے کی، کہا انھوں نے: اگر وہ یہ چاہے یعنی سجدہ نہ کرنا چاہے تو اجازت ہے، اور انھوں نے حدیث مرفوع سے استدلال کیا ہے یعنی حضرت زید کی حدیث سے استدلال کیا ہے، انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سورۃ النجم سنائی، تو آپؐ نے سجدہ نہیں کیا۔ پس انھوں نے کہا: اگر سجدہ واجب ہوتا تو رسول اللہ ﷺ زید بن ثابت کو نہ چھوڑتے یہاں تک کہ وہ سجدہ کرتے (یعنی حضرت زیدؓ کو سجدہ کرنے کا حکم دیتے) اور نبی ﷺ بھی سجدہ کرتے (اس استدلال کے دو جواب امام ترمذی پہلے دے چکے ہیں)

اور انھوں نے استدلال کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے کہ انھوں نے ممبر پر آیت سجدہ تلاوت کی، پس اترے اور سجدہ کیا، پھر اسی آیت کو دوسرے جمعہ میں پڑھا، پس لوگوں نے سجدہ کی تیاری کی تو آپؓ نے فرمایا: بیشک سجدے ہم پر فرض نہیں کیے گئے مگر یہ کہ ہم چاہیں، پس آپؓ نے سجدہ نہیں کیا اور لوگوں نے بھی سجدہ نہیں کیا۔ بعض علماء اس کی طرف گئے ہیں اور یہ شافعی اور احمد رحمہما اللہ کا قول ہے (اس کا جواب امام ترمذی رحمہ اللہ نے نہیں دیا، کیونکہ عمل نبوی کی موجودگی میں قولِ صحابی حجت نہیں)

بابُ ماجاءَ فی السَّجْدَةِ فِی صٓ

سورۂ صٓ میں سجدے کا بیان

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سورۂ صٓ میں سجدہ نہیں کیونکہ وہ داؤد علیہ السلام کی توبہ کا تذکرہ ہے جب اللہ تعالیٰ نے ان کی لغزش معاف کی تو انھوں نے سجدہ کیا، ہمیں وہاں سجدہ کرنے کا حکم نہیں۔ باقی تمام فقہاء سورۂ صٓ میں سجدہ مانتے ہیں، کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سورۂ صٓ میں سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ حدیث اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے۔ علاوہ ازیں نسائی شریف میں صحیح سند سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''داؤد علیہ السلام نے توبہ کے طور پر سجدہ کیا اور ہم شکر کے طور پر سجدہ کرتے ہیں'' اس حدیث میں حضرت امام شافعی کے قیاس کا جواب بھی ہے۔

فائدہ: حضرت ابن عباس اور حضرت علی کے نزدیک قرآن کے سب سجدے ایک درجہ کے نہیں تھے، بعض واجب تھے اور بعض غیر واجب، پھر ابن عباسؓ سے تو کوئی تفصیل مروی نہیں، اور حضرت علیؓ نے عزائم السجود یہ بتائے ہیں۔ حم السجدۃ، النجم، العلق، الاعراف، بنی اسرائیل اور الم السجدۃ (معارف السنن ۵:۷۹)

[۲۹۰] باب ماجاء فی السجدة فی صٓ

[۵۸۲-] حدثنا ابنُ أبی عُمَرَ، نا سفیانُ، عن أیوبَ، عن عِکْرِمَةَ، عن ابنِ عباسٍ، قال: رأیتُ

رسولَ الله صلى الله عليه وسلم يَسْجُدُ في صٓ، قال ابنُ عباسٍ: ولَيْسَتْ مِنْ عَزَائِمِ السُّجُوْدِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

واختَلَفَ أهلُ العلمِ من أصحاب النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغَيرِهم في هذا، فَرأى بعضُ أهلِ العلمِ أنْ يُسْجَدَ فِيْهَا، وهو قولُ سفيانَ، وابنِ المباركِ، والشافعيِّ، وأحمدَ، وإسحاقَ. وقال بعضُهم: إنَّهَا تَوْبَةُ نَبِيٍّ، ولَمْ يَرَوْا السُّجُوْدَ فِيْهَا.

وضاحت: امام ترمذیؒ نے امام شافعیؒ کو قائلین سجدۂ ص میں شمار کیا ہے، ممکن ہے یہ بھی آپ کی کوئی روایت ہو، اور امام ترمذی کو وہی پہنچی ہو۔ علاوہ ازیں امام شافعی نماز کے اندر سورۂ ص کے سجدہ کے قائل نہیں، مگر نماز کے باہر وہ یہ سجدہ مانتے ہیں اس لئے ممکن ہے امام ترمذی نے اس اعتبار سے ان کو قائلین سجدہ کی فہرست میں شمار کیا ہو۔

بابٌ في السَّجْدَةِ في الْحَجِّ

سورۃ الحج میں سجدے کا بیان

امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک سورۃ الحج میں صرف ایک سجدہ ہے، اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک دو سجدے ہیں۔ ان کی دلیل دو حدیثیں ہیں: ایک: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی حدیث جو ابو داؤد (حدیث ۱۴۰۱) میں ہے اس کی سند میں عبداللہ بن منین ضعیف راوی ہے۔ دوسری: حضرت عقبۃ بن عامر کی حدیث جو یہاں ہے وہ ابن لہیعہ کی وجہ سے ضعیف ہے، البتہ ابو داؤد (حدیث ۱۴۰۲) میں اس کی صحیح سند ہے مگر یہ حدیث اس بات میں صریح نہیں کہ یہ دونوں سجدے تلاوت کے ہیں، احتمال ہے کہ حضرت عقبہ کی مراد ایک سجدۂ تلاوت ہو اور دوسرا سجدۂ صلاۃ۔

فائدہ: اعلاء السنن اور فتح الملہم میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ نماز سے باہر سورۃ الحج میں دوسرا سجدہ بھی کرنا چاہئے، اور نماز میں اس آیت پر رکوع کرنا چاہئے اور رکوع میں سجدہ کی نیت کرنی چاہئے تاکہ دوسرے ائمہ کے قول کی رعایت ہو جائے۔

[۲۹۱] بابٌ في السجدة في الحج

[۵۸۳-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا ابنُ لَهِيْعَةَ، عن مِشْرَحِ بنِ هَاعَانَ، عن عُقْبَةَ بنِ عَامِرٍ، قال: قلتُ: يارسولَ الله! فُضِّلَتْ سورةُ الحجِّ بِأَنَّ فِيْهَا سَجْدَتَيْنِ! قال: "نَعَمْ! وَمَنْ لَمْ يَسْجُدْهُمَا فَلاَ يَقْرأْهُمَا"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ ليسَ إسنادُهُ بالقَوِيِّ.

واختلَفَ أهلُ العلمِ في هذَا، فَرُوِيَ عن عُمَرَ بنِ الخطابِ، وابنِ عُمَرَ، أنّهُمَا قالا: فُضِّلَتْ سورةُ الحجِّ بِأنَّ فِيهَا سَجْدَتَيْنِ، وبه يقولُ ابنُ المباركِ، والشافعيُّ، وأحمدُ، وإسحاقُ؛ ورَأى بعضُهم فِيهَا سَجْدَةً، وهو قولُ سفيانَ الثوريِّ، ومالِكٍ، وأهلِ الكُوفةِ.

ترجمہ: عقبہ بن عامر کہتے ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! سورۃ الحج کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ اس میں دوسجدے ہیں! آپؐ نے فرمایا: ہاں! اور جوان کو نہ کرے وہ ان کو نہ پڑھے، امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند قوی نہیں۔ اور علماء اس مسئلہ میں مختلف ہیں اور حضرت عمر اور ابن عمر سے مروی ہے کہ ان دونوں نے فرمایا: سورۃ الحج کو فضیلت حاصل ہے کہ اس میں دوسجدے ہیں اور ابن المبارک، شافعی، احمد اور اسحاق کا یہی قول ہے۔ اور بعض علماء کہتے ہیں کہ اس میں ایک سجدہ ہے اور یہ سفیان ثوریؒ، مالکؒ اور کوفہ والوں کا قول ہے۔

بابُ ماجاءَ مايقولُ في سُجُوْدِ القُرْآنِ؟

سجود تلاوت میں کیا ذکر کرے؟

اگر کوئی شخص فرض نماز میں سجدۂ تلاوت کرے تو سجدہ کی تسبیح سبحان ربی الاعلی پڑھے، اور نفل نماز میں یا جماعت سے باہر سجدہ کرے تو چاہے تسبیح پڑھے اور چاہے تو وہ ذکر کرے جو اس روایت میں آیا ہے۔ اور اگر کوئی شخص سجدۂ تلاوت میں کچھ بھی نہ پڑھے، خاموش رہے تو بھی سجدہ صحیح ہے، ہدایہ کی شرح عنایہ میں یہ مسئلہ ہے۔

پہلی حدیث: حسن بن محمد بن عبید اللہ کہتے ہیں: مجھ سے ابن جریج نے کہا: اے حسن! مجھے تیرے دادا عبید اللہ بن ابی یزید نے بتلایا، ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہوئے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ پس اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آج رات میں نے اپنے کو دیکھا درانحالیکہ میں سو رہا ہوں (یعنی خواب دیکھا) کہ ایک درخت کے نیچے نماز پڑھ رہا ہوں (اور سورۂ ص تلاوت کر رہا ہوں، جب آیت سجدہ پر پہنچا) تو میں نے سجدہ کیا تو درخت نے بھی میرے ساتھ سجدہ کیا۔ پس میں نے درخت کو سنا کہ وہ یہ کہہ رہا ہے: ''اے اللہ! آپ میرے لئے اس سجدہ کی وجہ سے اپنے پاس ثواب لکھئے۔ اور آپ اس کی وجہ سے مجھ سے گناہوں کا بوجھ اتار دیجئے اور آپ اس کو اپنے پاس میرے لئے ذخیرہ بنائیے، اور آپ اس کو میری طرف سے قبول فرمائیے۔ جس طرح آپ نے اس کو اپنے بندے داؤد کی طرف سے قبول فرمایا''

حسن کہتے ہیں: مجھ سے ابن جریج نے بیان کیا کہ مجھ سے تیرے دادا نے کہا کہ ابن عباسؓ نے فرمایا: پس نبی ﷺ نے آیت سجدہ پڑھی پھر سجدہ کیا۔ پس ابن عباسؓ نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا اور آپؐ کہہ رہے

تھے اس کے مانند جو آپ کو اس آدمی نے درخت کے قول سے بتایا تھا (یعنی درخت نے جو دعا پڑھی تھی وہی دعاء رسول اللہ ﷺ نے بھی پڑھی)

تشریح: میرک شاہ نے فرمایا: وہ صحابی جنھوں نے مذکور خواب دیکھا تھا حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ تھے اور یہ حدیث غریب ہے، اس لئے کہ حسن بن محمد سے اوپر یہی ایک سند ہے اور حسن بن محمد کی عقیلی نے تضعیف کی ہے اور ابن حبان نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، اور حافظ رحمہ اللہ نے اس راوی کو مقبول بتایا ہے (تقریب)

جاننا چاہئے کہ یہ خواب از قبیل مبشرات ہے اور جو خواب مبشرات کے قبیل سے ہوتے ہیں ان کی تعبیر نہیں ہوتی، دوسری بات یہ ہے کہ خواب میں وہی تصورات آتے ہیں جو خزانہ خیال میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے خیال میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ سورۂ صٓ میں سجدہ ہے۔ چنانچہ جب انھوں نے خواب میں یہ آیت پڑھی تو سجدہ کیا۔ معلوم ہوا کہ اس سورت میں سجدہ پکا ہے، صحابہ کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی بلکہ انسان ہی نہیں نباتات بھی جانتے تھے کہ اس سورت میں سجدہ ہے۔

دوسری حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ جب تہجد میں آیت سجدہ تلاوت کر کے سجدہ کرتے تو یہ دعا پڑھتے: ''اس ذات کے لئے میرے چہرہ نے سجدہ کیا جس نے اس کو پیدا کیا اور جس نے اس میں سماعت وبصارت کو جلوہ گر کیا۔ اپنی قدرت اور طاقت سے'' (یہ ذکر بھی بہت قیمتی ہے، اس کو بھی یاد کریں اور سجدۂ تلاوت میں پڑھیں)

[۲۹۲] باب ماجاء مایقول فی سجود القرآن؟

[۵۸۴-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا محمدُ بنُ يَزِيْدَ بنِ خُنَيْسٍ، نا الحسنُ بنُ محمدِ بنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ بنِ أبى يَزِيْدَ، قال: قال لى ابنُ جُرَيْجٍ: ياحَسَنُ أخبرَنِىْ عُبَيْدُ اللّٰهِ بنُ أبى يَزِيْدَ، عن ابنِ عباسٍ، قال: جاء رَجُلٌ إلى النبىِّ صلى الله عليه وسلم فقال يارسولَ اللّٰهِ! إِنِّىْ رَأَيْتُنِىْ اللَّيْلَةَ وَأَنَا نَائِمٌ كَأَنِّىْ أُصَلِّىْ خَلْفَ شَجَرَةٍ، فسَجدْتُ، فَسَجَدَتِ الشجرةُ لِسُجُوْدِىْ، فَسَمِعْتُهَاوَهِىَ تقولُ: اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لى بها عندَكَ أَجْرًا،وضَعْ عَنِّيْ بِهَا وِزْرًا، واجْعَلْهَا لِىْ عِنْدَكَ ذُخرًا، وتَقَبَّلْهَا مِنِّىْ كما تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عبدِكَ داوٗدَ، قال الحسنُ: قالَ لى ابنُ جُرَيْجٍ: قال لى جدُّكَ: قال ابنُ عباسٍ: فَقَرَأَ النبىُّ صلى الله عليه وسلم سَجْدَةً ثُم سجدَ، فقال ابنُ عباسٍ: سَمِعْتُهُ وهو يقولُ مِثْلَ ما أَخْبَرَهُ الرجلُ عن قَوْلِ الشَّجَرَةِ.

وفى الباب: عن أبى سعيدٍ، قال أبو عيسى: هذا حديثٌ غريبٌ مِن حديثِ ابنِ عباسٍ لَانَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ هٰذا الوَجْهِ.

[۵۸۵-] حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا عبدُ الوَهَّابِ الثقفِيُّ، نا خالِدُ الحَذَّاءُ، عن أبي العالِيَةِ، عن عائشةَ، قالتْ: كانَ رسولُ اللّهِ صلى الله عليه وسلم يقولُ في سُجُوْدِ الْقُرْآنِ بالَّليْلِ: "سَجَدَ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ خَلَقَهُ، وشَقَّ سَمْعَهُ وبَصَرَهُ، بِحَوْلِهِ وَقُوَّتِهِ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

قوله: بالليل: یعنی نمازِ تہجد میں جب سجدہ کرتے تو یہ ذکر کرتے تھے۔

بابُ ماذُكِرَ فِيْمَنْ فَاتَهُ حِزْبُهُ مِنَ اللَّيْلِ فَقَضَاهُ بِالنَّهارِ

رات کا وِرد رہ جائے تو اس کو دن میں قضاء کرے

ابواب السجود مکمل ہوگئے، اب کتاب الصلاۃ کے آخر تک متفرق ابواب ہیں جن کا کسی خاص سلسلۂ بیان سے تعلق نہیں ـــــ جس شخص کا رات میں کوئی معمول ہو، نوافل کا یا کسی اور عمل کا، اور سوتے رہ جانے کی وجہ سے یا کسی اور سبب سے وہ چھوٹ جائے یا اس میں کچھ کمی رہ جائے تو سورج نکلنے کے بعد زوال سے پہلے اپنا ورد مکمل کرلے۔ رات میں عمل کرنے کی جو برکت ہے وہ حاصل ہوجائے گی۔

اب چار باتیں سمجھنی چاہئیں:

۱- انسان کو اوراد کے ساتھ واجب جیسا معاملہ کرنا چاہئے، اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضروری نہیں، مگر وقتِ مقررہ پر پابندی سے عمل کرنے میں جو برکت ہے وہ دوسرے وقت میں عمل کرنے میں نہیں ہے۔ اگرچہ ثواب مل جاتا ہے۔

۲- اوراد و نوافل کی قضاء نہیں۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے جو قضاء کا لفظ استعمال کیا ہے وہ عرف عام کے اعتبار سے کیا ہے، لغت میں اداء اور قضا کے الگ الگ معنی ہیں مگر عرف میں ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ پس یہاں قضاء بمعنی اداء ہے۔

۳- مقررہ وقت میں کسی عمل کو کرنے میں جو بات ہے وہ بدل سے پیدا نہیں ہوسکتی اسی لئے حدیث میں کَأَنَّ: گویا ہے۔

۴- اس حدیث میں حکم ہے کہ اوراد کا بدل ضرور کیا جائے۔ کیونکہ اخبار: انشاء کو متضمن ہوتی ہیں۔

[۲۹۳] باب ماذكر فيمن فاته حِزْبُه من الليل، فقضاه بالنهار

[۵۸۶-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا أبوصَفْوَانَ، عن يونُس، عن ابنِ شهابٍ، أنَّ السَّائِبَ بنَ يَزِيْدَ، وعُبَيْدَ اللّهِ، أخبراه عن عبدِ الرحمنِ بنِ عبد القاريِّ، قال: سَمِعْتُ عُمَرَ بنَ الخطابِ يقولُ: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهِ أَوْ عَنْ شَيْئٍ مِنْهُ فَقَرَأَهُ مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الظُّهْرِ

كُتِبَ له كَأَنَّمَا قَرَأَهُ مِنَ اللَّيْلِ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وأبو صَفْوَانَ: اسمُه عبدُ اللهِ بنُ سَعِيدِ المَكِّيُّ، ورَوَى عنه الْحُمَيْدِيُّ و كِبَارُ النَّاسِ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنے پورے ورد سے یا اس کے کچھ حصہ سے سو گیا، پس اس نے وہ ورد فجر اور ظہر کے درمیان پڑھا تو اس کے لئے لکھا جائے گا: گویا اس نے اس کو رات میں پڑھا'' یعنی رات میں پڑھنے کی برکت حاصل ہوگی۔

تشریح: امام ترمذیؒ کے استاذ الاستاذ ابو صفوان کا نام عبداللہ بن سعید مکی ہے اور ان سے حمیدی اور دیگر ائمہ روایت کرتے ہیں، یعنی وہ ثقہ ہیں، کیونکہ اکابر محدثین کا کسی سے روایت کرنا مروی عنہ کی توثیق ہے۔ اور مذکورہ حدیث کی سند شاندار ہے اس میں کوئی ضعیف راوی نہیں۔ اور ابن شہاب نے یہ حدیث سائب بن یزید اور عبیداللہ دونوں سے روایت کی ہے۔ یہ عبیداللہ حضرت ابن مسعودؓ کے بھتیجے کے لڑکے: عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود ہیں مسلم شریف کی روایت میں اس کی صراحت ہے اور وہ ثقہ ہیں، یہ عبیداللہ عمری نہیں جیسا کہ تحفۃ الاحوذی میں تعیین کی ہے۔ اور عبدالرحمٰن کی نسبت القاری ہے، عرب کا ایک قبیلہ ہے: قارۃ جو تیر اندازی میں مشہور تھا اس کی طرف نسبت ہے۔

بابُ ماجاءَ مِنَ التَّشْدِيْدِ فِى الَّذِىْ يَرْفَعُ رَأْسَهُ قَبْلَ الإِمَامِ

امام سے پہلے سر اٹھانے والے کے لئے وعید

نماز کے کسی بھی رکن میں امام سے پہلے پہنچ جانا یا امام سے پہلے سر اٹھا لینا مکروہ تحریمی ہے، مگر اس کراہت کی وجہ سے نماز کا اعادہ نہیں اس لئے کہ یہ کراہت نماز کے کسی جز کی وجہ سے نہیں بلکہ متابعت کے باب سے ہے، یعنی مقتدی پر امام کی پیروی واجب ہے اس کی وجہ سے یہ کراہت ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ ہے کہ امام سے پہلے کسی رکن میں پہنچ جانے سے یا سر اٹھا لینے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، مگر جمہور کے نزدیک نماز فاسد نہیں ہوتی البتہ یہ مذموم حرکت ہے جس کی وجہ سے نماز مکروہ تحریمی ہوتی ہے۔ حدیث میں ایسے شخص کے لئے وعید آئی ہے:

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا وہ شخص جو اپنا سر امام سے پہلے اٹھاتا ہے اس سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کے سر سے بدل دیں؟!''

تشریح: اس حدیث میں جو مضمون ہے وہ کچھ حضرات کے گلے نہیں اترا۔ ایسی صورت میں لوگ راویوں کو دیکھتے ہیں کہ کس کے سر الزام تھوپیں۔ چنانچہ محمد بن زیاد نیا راوی ہاتھ آگیا، اس کے سر الزام دھر دیا کہ اس نے حدیث میں

گڑبڑ کی ہے، جبکہ یہ راوی ثقہ اور قابل اعتماد ہے، اس لئے امام ترمذیؒ نے سند کے بیچ ہی میں کہا: هو ثقة، اور خود راوی نے جواب دیا کہ یہ حدیث خبر نہیں ہے بلکہ وعید کی حدیث ہے، اور دلیل یہ ہے کہ حدیث کے شروع میں: أمايخشى: ''کیا نہیں ڈرتا'' آیا ہے اور جس حدیث میں کوئی خبر دی گئی ہو اس کے لئے تو ویسا ہی ہونا ضروری ہے مگر وعید کی حدیث میں جو بات بیان کی جاتی ہے اس کا اس دنیا میں پورا ہونا ضروری نہیں، آگے بھی زندگیاں ہیں، برزخ کی زندگی ہے، حشر کی زندگی ہے، وہاں بھی وہ وعید پوری ہوسکتی ہے۔ غرض اس حدیث پر اعتراض لغو ہے، کیونکہ یہ وعید کی حدیث ہے۔

اور حاشیہ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک محدث نے اس حدیث کو آزمایا۔ انھوں نے بالقصد نماز کے کسی رکن میں امام سے پہلے سر اٹھالیا۔ چنانچہ ان کا سر گدھے کا سر ہوگیا، پھر وہ محدث نقاب ڈال کر حدیث پڑھانے آتے تھے۔ یہ بے صفحہ کا قصہ ہے۔ طالب علم سوال کرتا ہے: کیا ایسا نہیں ہوسکتا؟ جواب یہ ہے کہ ایک بار نہیں ہزار بار ہوسکتا ہے مگر ایسا ہوا اس کی کیا دلیل ہے؟ یہ انوکھا اور عجیب وغریب واقعہ اگر ظہور پذیر ہوا ہوتا تو تواتر کے ساتھ منقول ہوتا اور تاریخ کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ہوتا، اسماء الرجال کی کتابوں میں اس کا ذکر آتا، جبکہ کسی کتاب میں اس کا تذکرہ نہیں۔ یہ دلیل ہے کہ یہ بے صفحہ کا قصہ ہے۔

فائدہ: لوگ ایک بڑی غلطی کرتے ہیں: وہ ایسی ویسی کچی باتوں کو اور مہمل حکایات کو کرامت کے نام پر مان لیتے ہیں اور کہتے ہیں: کیا ایسا نہیں ہوسکتا؟ حالانکہ ''ہوسکتا ہے'' اور ہے اور ''ہوا ہے'' اور ہے، سب کچھ ہوسکتا ہے، مگر ہوا ہے اس کی دلیل چاہئے۔ سورۃ الفرقان (آیت ۷۳) میں مؤمن کی شان یہ بیان کی گئی ہے کہ جب اس کے سامنے کوئی بات دین کے عنوان سے آتی ہے تو وہ اس پر بہرہ گونگا ہو کر نہیں گرتا، عقل سے کام لیتا ہے، کھری بات قبول کرتا ہے اور کچی بات رد کردیتا ہے۔ لہٰذا حکایات الاولیاء آنکھ بند کر کے نہیں مان لینی چاہئیں، اس سے گمراہی کا دروازہ کھلتا ہے۔

[۲۹٤] باب ماجاء من التشديد في الذى يَرْفَعُ رَأْسَه قبلَ الإمام

[۵۸۷-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا حمادُ بنُ زيدٍ، عن محمدِ بنِ زيادٍ، وهو أبو الحارثِ البَصْرِيُّ ثِقَةٌ، عن أبي هريرةَ، قال: قال محمدٌ صلى الله عليه وسلم: " أَمَا يَخْشَى الَّذِيْ يَرْفَعُ رَأْسَهُ قَبْلَ الإِمَامِ أَنْ يُحَوِّلَ اللهُ رَأْسَهُ رَأْسَ حِمَارٍ؟!"

قال قُتَيْبَةُ: قال حمادٌ: قال لي محمدُ بنُ زيادٍ: إِنَّمَا قَالَ: " أَمَا يَخْشَى"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، ومحمدُ بنُ زيادٍ: وهو بَصْرِيٌّ ثِقَةٌ يُكْنَى أبا الحَارِثِ.

ترجمہ: محمد بن زیاد نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے أما يخشى: کیا وہ نہیں ڈرتا ہی فرمایا ہے، یعنی یہ اخبار نہیں ہے، بلکہ وعید ہے۔

بابُ ماجاء فی الَّذِیْ یُصَلِّیْ الفَرِیْضَۃَ ثُمَّ یَؤُمُّ النَّاسَ بَعْدَ ذٰلِکَ

فرض پڑھ کر امامت کرنے کا بیان

مذاہب فقہاء: نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی اقتداء، اسی طرح فرض پڑھنے والے کے پیچھے نفل پڑھنے والے کی اقتداء صحیح ہے یا نہیں؟ ربیعۃ الرائے، امام زہری اور امام مالک رحمہم اللہ کی ایک روایت یہ ہے کہ صحیح نہیں۔ نہ مفترض کی نماز متنفل کی اقتداء میں درست ہے اور نہ متنفل کی نماز مفترض کی اقتداء میں درست ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب اور امام احمد رحمہ اللہ کی ایک روایت یہ ہے کہ دونوں صورتیں درست ہیں۔ یعنی فرض پڑھنے والے کے پیچھے نفل پڑھنے والے کی نماز بھی صحیح ہے اور نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی بھی نماز صحیح ہے۔ اور امام اعظمؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی ایک روایت یہ ہے کہ اگر امام اقوی ہے تو اقتداء صحیح ہے اور اگر امام اضعف ہے تو اقتداء صحیح نہیں، پس مفترض کی اقتداء میں متنفل کی نماز تو صحیح ہے کیونکہ امام اقوی ہے مگر متنفل کی اقتداء میں مفترض کی نماز صحیح نہیں، کیونکہ امام اضعف ہے۔

اور اگر قوت میں امام و مقتدی برابر ہوں مگر نمازیں مختلف ہوں، مثلاً امام عصر پڑھ رہا ہو اور مقتدی ظہر کی نیت سے جماعت میں شریک ہو تو احناف کے نزدیک اقتداء صحیح نہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا فتوی نقل کیا ہے کہ امام اور مقتدی کے فرض الگ الگ ہوں تو بھی اقتداء صحیح ہے، مگر محدثین نے اس اثر کو بہت تلاش کیا، کسی کتاب میں یہ روایت نہیں ملی۔

جاننا چاہئے کہ اگر کوئی حدیث کتب فقہ میں یا کتب لغت حدیث میں یا کتب تفسیر میں یا بزرگوں کے ملفوظات میں یا کسی اور جگہ پائی جائے مگر حدیث کی کتابوں میں سند کے ساتھ نہ ہو تو وہ معتبر نہیں۔ حدیث قابل قبول اس وقت ہے جب وہ حدیث کی کسی کتاب میں پائی جائے اور اس کی سند قابل اعتبار ہو۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت ابو الدرداءؓ کا جو فتوی نقل کیا ہے وہ حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ملا اور اس کی سند بھی معلوم نہیں اس لئے وہ قابل استدلال نہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ باب میں ایک واقعہ مذکور ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے قبیلہ کی مسجد میں جاتے تھے اور وہاں امامت کرتے تھے اور طویل قراءت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضور اکرم ﷺ نے عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھائی، اس لئے حضرت معاذؓ بھی اپنے قبیلے کی مسجد میں تاخیر سے پہنچے۔ پھر انھوں نے نماز میں سورۂ بقرہ شروع کر دی، اور اس زمانہ میں قرآن میں رکوع نہیں تھے۔ چنانچہ ایک صحابی جو دن بھر کے تھکے ہوئے تھے، برداشت نہ کر سکے، انھوں نے نماز توڑ دی اور تنہا نماز پڑھ کر جا کر سو گئے، لوگوں نے کہنا شروع کیا: فلاں منافق ہو گیا۔ اگلے دن وہ صحابی آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت

معاذ بھی اتفاق سے وہاں موجود تھے۔ انھوں نے سارا قصہ بیان کیا تو حضور اکرم ﷺ حضرت معاذ پر سخت غضبناک ہوئے اور فرمایا: ''معاذ! کیا تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالدوگے!'' یہاں تک بخاری (حدیث ۷۰۵) میں ہے۔ اور مجمع الزوائد (۲:۷۲) میں ہے: ''آئندہ یا تو میرے ساتھ نماز پڑھو یا ہلکی نماز پڑھاؤ''

اس حدیث سے امام شافعی رحمہ اللہ نے متنفل کی اقتداء میں مفترض کی نماز کے صحیح ہونے پر استدلال کیا ہے۔ کیونکہ جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ عشاء پڑھ چکے ہیں تو وہ نفل کی نیت سے نماز پڑھائیں گے، اور مقتدی فرض پڑھ رہے ہیں، معلوم ہوا کہ متنفل کی اقتداء میں مفترض کی نماز صحیح ہے۔ اور اس کی برعکس صورت میں تو بدرجۂ اولیٰ صحیح ہے۔ علاوہ ازیں پہلے یہ حدیث گذری ہے کہ حضور اکرم ﷺ اور صحابہ مسجد نبوی میں تھے کہ ایک شخص آیا اس نے نماز نہیں پڑھی تھی، آپؐ نے فرمایا: اس کے ساتھ کون تجارت کرے گا؟ چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نفل کی نیت سے شریک ہوئے اور ان صحابی نے امامت کی۔ معلوم ہوا کہ مفترض کے پیچھے متنفل کی نماز بھی صحیح ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ نے اس استدلال کے تین جواب دیئے ہیں:

۱- حضرت معاذ رضی اللہ عنہ آنحضور ﷺ کی اقتداء میں فرض کی نیت سے نماز پڑھتے تھے اس کی کوئی دلیل نہیں، ممکن ہے وہ نفل کی نیت سے شریک ہوتے ہوں، پھر قوم میں جاکر فرض پڑھاتے ہوں اور یہ بات حضرت معاذ ہی بتا سکتے ہیں، دوسرا نہیں بتا سکتا، کیونکہ یہ نیت کا معاملہ ہے، اور اب حضرت معاذ رہے نہیں اس لئے اس حدیث سے استدلال درست نہیں۔

۲- حضرت معاذ کا یہ فعل حضور اکرم ﷺ کے علم میں نہیں تھا۔ جب آپؐ کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے ان کو اس پر برقرار نہیں رکھا بلکہ حکم دیا کہ یا تو میرے ساتھ نماز پڑھو اور امامت چھوڑ دو یا امامت کرو اور نماز ہلکی پڑھاؤ۔ اگر حضور اکرم ﷺ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو ان کے عمل پر برقرار رکھتے تو استدلال صحیح تھا۔ جب آپؐ نے برقرار نہیں رکھا تو استدلال درست نہیں۔

۳- شروع اسلام میں فرض بار بار پڑھنا جائز تھا، یہ واقعہ اسی زمانہ کا ہے پس ممکن ہے حضرت معاذ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ بھی فرض پڑھتے ہوں اور قوم کو بھی فرض کی نیت سے نماز پڑھاتے ہوں، پھر جب فرض کی تکرار کا جواز منسوخ ہوگیا تو یہ حدیث بھی منسوخ ہوگئی۔

مگر اس تیسرے جواب کو ثابت کرنے کے لئے دو باتیں ثابت کرنی ہونگی: ایک: ابتداء اسلام میں فرض بار بار پڑھنا جائز تھا، دوسرے: حضرت معاذ دونوں جگہ فرض کی نیت سے عشاء پڑھتے تھے، اگر پہلی بات ثابت ہو بھی جائے تو بھی دوسری بات ثابت نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ غیب کا معاملہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کے علاوہ صاحب معاملہ ہی جانتا ہے، کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔ اس لئے یہ جواب کمزور ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ امام ترمذیؒ نے جو حدیث بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت معاذ: رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مغرب پڑھتے تھے پھر قوم میں جا کر نماز پڑھاتے تھے۔ اس حدیث سے تو جھگڑا ہی ختم ہوگیا، ظاہر ہے وہ اپنے قبیلہ کی مسجد میں عشاء پڑھائیں گے، مغرب نہیں پڑھائیں گے اس لئے کہ مغرب کے وقت میں اتنی گنجائش نہیں کہ حضرت معاذ پہلے مسجد نبوی میں آپؐ کے ساتھ مغرب پڑھیں پھر قوم میں جا کر سورۂ بقرۃ کے ساتھ مغرب پڑھائیں؟ لامحالہ یہ عشاء پڑھانے کا واقعہ ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس روایت میں مغرب کا لفظ محفوظ نہیں۔ صحیح واقعہ وہ ہے جو اوپر آیا کہ وہ عشاء پڑھ کر جاتے تھے اور عشاء پڑھاتے تھے اور یہاں اس کو مغرب مجازاً کہا گیا ہے۔

[۲۹۵] باب ماجاء فی الذی یصلی الفریضة، ثم یَؤُمُّ الناس بعد ذلك

[۵۸۸-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا حمَّادُ بنُ زَيْدٍ، عن عَمْرِو بنِ دينارٍ، عن جابرِ بنِ عبدِ اللهِ، أَنَّ مُعَاذَ بنَ جَبَلٍ كان يُصَلِّی مع رسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم المغربَ، ثم يَرْجِعُ إلى قَوْمِهِ فيَؤُمُّهُمْ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، والعملُ على هذا عندَ أصحابنا: الشافعيُّ وأحمدَ وإسحاقَ، قالوا: إِذَا أَمَّ الرَّجُلُ القومَ فی المَكْتُوبَةِ، وقد كان صَلَّاهَا قَبْلَ ذلكَ: أَنَّ صَلَاةَ مَنِ ائْتَمَّ به جَائِزَةٌ، واحْتَجُّوْا بحديثِ جابرٍ فِیْ قَصَّةِ مُعَاذٍ، وهو حديثٌ صحيحٌ، وقد رُوِیَ مِنْ غَيْرِ وَجْهٍ عن جابرٍ.

وَرُوِیَ عن أبی الدَّرْدَاءِ أَنَّهُ سُئِلَ عن رَجُلٍ دخلَ المسجدَ والقومُ فی صلاةِ العَصْرِ وَهُوَ يَحْسَبُ أَنَّهَا صلاةُ الظهر فَائْتَمَّ به؟ قال: صلاتُه جَائِزَةٌ.

وقد قال قومٌ مِنْ أهلِ الكُوْفَةِ: إِذَا ائْتَمَّ قومٌ بِإِمَامٍ، وهو يُصَلِّی العصرَ، وهم يَحْسَبُوْنَ أَنَّهَا الظُّهْرُ، فَصَلَّى بِهِمْ وَاقْتَدَوْا به: فَإِنَّ صلاةَ المُقْتَدِیْ فاسدةٌ، إِذَا اخْتَلَفَ نِيَّةُ الإِمَامِ وَالْمَأْمُوْمِ.

ترجمہ: جابرؓ کہتے ہیں: معاذؓ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مغرب پڑھا کرتے تھے پھر اپنی قوم میں واپس لوٹتے تھے اور ان کو امام بن کر نماز پڑھاتے تھے، اس حدیث پر ہمارے اکابر: شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا عمل ہے۔ وہ کہتے ہیں: جب آدمی کسی قوم کو فرض پڑھائے درانحالیکہ وہ اس فرض کو پہلے پڑھ چکا ہے تو ان لوگوں کی نماز صحیح ہے جو اس کی اقتداء کریں۔ اور انھوں نے حضرت جابر کی اس حدیث سے جس میں حضرت معاذ کا واقعہ ہے استدلال کیا ہے۔ اور یہ حدیث صحیح ہے اور حضرت جابر سے متعدد طرق سے مروی ہے۔

اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو مسجد میں آیا درانحالیکہ لوگ عصر کی نماز میں تھے، اور اس نے گمان کیا کہ یہ ظہر کی نماز ہے۔ پس اس نے امام کی اقتداء کی (تو کیا اس شخص کی نماز صحیح ہے؟) ابو الدرداءؓ نے فرمایا: اس کی نماز صحیح ہے۔

اور کوفہ والوں میں سے ایک جماعت نے کہا: جب لوگوں نے کسی امام کی اقتداء کی، درانحالیکہ وہ امام عصر کی نماز پڑھا رہا تھا اور لوگوں کا گمان یہ ہے کہ وہ ظہر پڑھ رہا ہے پس اس امام نے لوگوں کو نماز پڑھائی، اور لوگوں نے اس کی اقتداء کی تو مقتدی کی نماز فاسد ہے جبکہ امام اور مقتدی کی نیت مختلف ہو یعنی ان کی نمازیں علحدہ علحدہ ہوں۔

بابُ ماذُکِرَ مِنَ الرُّخْصَةِ فی السُّجُوْدِ عَلَی الثَّوْبِ فی الْحَرِّ والْبَرْدِ

سردی گرمی میں بدن سے متصل کپڑے پر سجدہ کرنا

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو کپڑا بدن سے متصل ہے مثلاً چادر اوڑھ رکھی ہے، اگر نمازی اس کپڑے کے فاضل حصہ پر سجدہ کرے تو نماز صحیح نہیں۔ اور جمہور کے نزدیک نماز صحیح ہے۔ بدن سے متصل کپڑے پر بھی سجدہ کرنا جائز ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ علامہ بیہقی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کی دلیل میں وہ حدیث ذکر کی ہے جس میں صحابہ کہتے ہیں: ہم سخت گرمیوں میں نماز شروع کرنے سے پہلے ہاتھ میں کنکریاں لے لیتے تھے۔ اور پوری رکعت میں مٹھی بند رکھ کر ان کنکریوں کو ٹھنڈا کرتے تھے۔ پھر ان کو بچھا کر ان پر سجدہ کرتے تھے۔ پھر جب دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو پھر مٹھی بھر لاتے تھے (مشکوۃ حدیث ۱۰۱۱) اس حدیث سے امام شافعی رحمہ اللہ کا استدلال اس طرح ہے کہ جو کپڑا پہن رکھا ہے یا اوڑھ رکھا ہے اگر اس کے فاضل حصہ پر سجدہ جائز ہوتا تو صحابہ کو یہ تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اپنے فاضل کپڑے پر سجدہ کر لیتے، مگر یہ استدلال صحیح نہیں۔ اس لئے کہ دور اول میں ہر شخص کے پاس ایسا کپڑا کہاں تھا کہ اس کے فاضل حصہ پر سجدہ کرتا؟! بعض کے پاس تو ایک ہی کپڑا ہوتا تھا جس کو وہ لنگی کی جگہ باندھ لیتے تھے اور کرتے کی جگہ استعمال کرنے کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا تھا، پس وہ کپڑے پر سجدہ کس طرح کرتے ——— اور جمہور کی دلیل باب کی حدیث ہے۔

حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سخت گرمیوں کی دوپہر میں نماز پڑھتے تھے تو گرمی سے بچنے کے لئے ہم اپنے کپڑوں پر سجدہ کرتے تھے۔

تشریح: یہ حدیث اعلی درجہ کی صحیح ہے اور استدلال بھی واضح ہے کیونکہ جو کپڑے اوڑھ رکھے ہیں یا پہن رکھے ہیں وہ مراد ہیں۔ صحابہ ان پر سجدہ کرتے تھے۔ اور موسم سرما کو گرما پر قیاس کریں گے۔ پس سردی سے بچنے کے لئے بھی بدن سے متصل کپڑے پر سجدہ کرنا جائز ہے۔

[۲۹۶] باب ماذُکر من الرخصة فی السجود علی الثوب فی الحر والبرد

[۵۸۹-] حدثنا أحمدُ بن محمدٍ، نا عبدُ اللهِ بنُ المبارکِ، نا خالدُ بنُ عبدِ الرحمن، قال: حَدَّثَنِیْ

غَالِبٌ القَطَّانُ، عن بَكْرِ بنِ عبدِ اللّٰهِ المُزَنِيِّ، عن أنسِ بنِ مالكٍ، قال: كُنَّا إِذَا صَلَّيْنَا خَلْفَ النبيِّ صلى الله عليه وسلم بالظَّهَائِرِ: سَجَدْنَا على ثِيَابِنَا اتِّقَاءَ الحَرِّ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وفي الباب: عن جابرِ بنِ عبدِ اللّٰهِ، وابنِ عباس. وقد رَوَى هذا الحديثَ وَكِيعٌ عن خالدِ بنِ عبدِ الرحمنِ.

لغت: الظَّهَائِر: الظَّهِيْرة کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں: دوپہر، نصف النہار۔

بابُ ماذُكِرَ مِمَّا يُسْتَحَبُّ مِنَ الجُلُوْسِ في المَسْجِدِ بَعْدَ صَلاَةِ الصُّبْحِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ

فجر کی نماز کے بعد طلوعِ شمس تک مسجد میں ٹھہرنے کا بیان

پہلی حدیث: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ جب فجر پڑھ کر فارغ ہوجاتے تھے تو نماز پڑھنے کی جگہ میں ٹھہرے رہتے تھے تا آنکہ سورج طلوع ہوجاتا تھا، پھر اشراق پڑھ کر گھر تشریف لے جاتے تھے۔

تشریح: یہ فعلی حدیث ہے اور راوی نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آپ کا دائمی معمول تھا، حالانکہ یہ دائمی معمول نہیں تھا، کبھی کبھار کا عمل تھا، اور کتاب الصلاۃ کے شروع میں یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ رُوات: حدیثوں میں دو مجازی تعبیریں اختیار کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپؐ نے کوئی عمل زندگی میں صرف ایک دو بار کیا اس کو بھی راوی ماضی استمراری کے صیغے سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس طرح جواز کے استمرار کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی پھر وہ مسجد میں رکا رہا اور اللہ کا ذکر کرتا رہا یہاں تک کہ سورج نکل آیا پھر دو رکعتیں پڑھیں تو وہ دو رکعتیں اس کے لئے ایک حج اور ایک عمرہ کے ثواب کے مانند ہونگی'' راوی کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا: تامَّةٍ، تامَّةٍ، تامَّةٍ۔ یعنی کامل، کامل، کامل حج وعمرہ کا ثواب ملے گا۔

تشریح: اس حدیث میں ایک راوی ابوظلال ہلال بن ابی ہلال القسملی ہے۔ عام طور پر محدثین نے اس کی تضعیف کی ہے، مگر امام ترمذیؒ کے نزدیک یہ راوی ٹھیک ہے۔ فرماتے ہیں: امام بخاری نے اس کو مقارب الحدیث کہا ہے۔ مگر حافظ رحمہ اللہ نے تہذیب (۱۱:۸۵) میں امام بخاریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس راوی کی حدیثیں منکر ہیں۔

اور اس قولی حدیث کے دو مطلب ہیں:

پہلا مطلب: فجر کی نماز کے بعد طلوعِ شمس تک مسجد میں ٹھہرنے کا پھر اشراق کی دو رکعتیں پڑھنے کا ثواب کامل

ایک حج اور ایک عمرہ کے ثواب کے برابر ہے۔ اس صورت میں حدیث میں داوم اور واظب کی قید ملحوظ ہوگی، یعنی مذکورہ ثواب پوری زندگی پابندی سے یہ عمل کرنے کا ہے۔ ایک دوبار یہ عمل کرنے کا یہ ثواب نہیں ہے۔

دوسرا مطلب: اس حدیث میں نسبت کا بیان ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ حج تو حج اکبر (بڑا حج) ہے اور عمرۃ: حج اصغر (چھوٹا حج) ہے۔ اور دونوں کے ثواب میں جو نسبت ہے وہی نسبت فجر کی دو رکعتوں میں اور اشراق کی دو رکعتوں میں ہے۔ یعنی جس طرح حج کا ثواب زیادہ ہے اور عمرہ کا کم، اسی طرح نماز فجر کا ثواب زیادہ ہے اور اشراق کا کم۔ اس صورت میں حدیث میں داوم کی قید ملحوظ نہیں ہوگی، بلکہ جب بھی عمل کرے گا یہ ثواب ملے گا۔

فائدہ: حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں فرمایا ہے کہ اعتکاف دو ہیں۔ ایک: وہ اعتکاف ہے جو رمضان میں یا رمضان کے آخری عشرہ میں کیا جاتا ہے۔ اور دوسرا یہ اعتکاف ہے جو روزمرہ کا اعتکاف ہے۔ حضور ﷺ نے یہ اعتکاف محسنین اور سالکین کے لئے مشروع کیا ہے۔ وہ روزانہ فجر کی نماز کے بعد سورج طلوع ہونے تک اعتکاف کریں، پھر دو رکعت پڑھ کر مسجد سے نکلیں۔ جیسے قربانیاں بھی دو ہیں۔ ایک: وہ قربانی ہے جو ذی الحجہ کے مہینہ میں کی جاتی ہے۔ دوسری: روزمرہ کی قربانی ہے اور وہ ذبیحہ پر تسمیہ ہے۔ ہم روزانہ کھانے کے لئے جو جانور بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرتے ہیں وہ روزمرہ کی قربانی ہے، اور اسی لئے اس پر تسمیہ شرط ہے اگر کوئی شخص بالقصد ذبیحہ پر تسمیہ نہ پڑھے تو چاہے جانور کا سارا خون نکل جائے جانور حلال نہیں۔ اور یہ روزمرہ کی قربانی اس لئے مشروع کی گئی ہے کہ اللہ کا بول بالا ہو۔ لوگ روزانہ لاکھوں جانور ذبح کرتے ہیں اور ہر ذبیحہ پر بسم اللہ اللہ اکبر کہتے ہیں، یہی ذکر مقصود ہے، اس سے عالم میں نام پاک بلند ہوتا ہے (یہ مضمون تفصیل سے میری تفسیر ہدایت القرآن میں سورۃ الحج کی تفسیر میں ہے)

[۲۹۷] بابُ مَاذُكِرَ مِمَّا يُسْتَحب من الجلوس في المسجد بعد صلاة الصبح حتى تطلع الشمسُ

[۵۹۰-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا أبو الأَحْوَصِ، عن سِمَاكٍ، عن جابرِ بنِ سَمُرَةَ، قال: كان النبيُّ صلى الله عليه وسلم إِذَا صَلَّى الفَجْرَ قَعَدَ فِيْ مُصَلَّاهُ حتى تَطْلُعَ الشمسُ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[۵۹۱-] حدثنا عبدُ اللهِ بنُ معاويةَ الجُمَحِيُّ البَصريُّ، نا عبدُ العزيزِ بنُ مُسْلِمٍ، نا أبو ظِلَالٍ، عن أنسٍ، قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: "مَنْ صَلَّى الفَجْرَ في جَمَاعَةٍ، ثُمَّ قَعَدَ يَذْكُرُ اللهَ حتى تَطْلُعَ الشمسُ، ثُمَّ صَلَّى ركعَتَيْنِ كانتْ له كَأَجْرِ حَجَّةٍ وعُمْرَةٍ" قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: "تَامَّةٍ تَامَّةٍ تامَّةٍ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ، وسألتُ محمدَ بنَ إسماعيلَ عن أبي ظِلَالٍ؟ فقال: هو مُقَارِبُ الحديثِ، قال محمدٌ: واسمُه هِلَالٌ.

باب کا ترجمہ: اس حدیث کا ذکر جس میں فجر کی نماز کے بعد سورج نکلنے تک مسجد میں ٹھہرنے کا استحباب وارد ہوا ہے۔

بابُ ماذُكِرَ في الإلْتِفَاتِ في الصَّلَاةِ

نماز میں اِدھر اُدھر جھانکنے کا بیان

نماز کے دوران مصلی کو سجدہ کی جگہ دیکھنا چاہئے۔ سجدہ کی جگہ سے آگے نظر لے جانا، یا دائیں بائیں دیکھنا التفات (جھانکنا) ہے اور اس کی تین صورتیں ہیں:

۱- چہرہ گھمائے بغیر کنکھیوں سے دائیں بائیں دیکھنا، یا قبلہ کی جانب دور تک دیکھنا: مکروہ ہے مگر ہلکا مکروہ ہے۔ اور اگر ضرورت ہو تو مکروہ نہیں۔

۲- گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھنا مکروہ ہے، اور سخت مکروہ ہے۔ البتہ اگر ضرورت شدیدہ ہو تو مکروہ نہیں، جیسے ابوداؤد میں روایت (نمبر ۹۱۶) ہے کہ ایک غزوہ سے واپسی پر رات میں آنحضور ﷺ نے پڑاؤ کیا وہ جگہ دشمن کے علاقہ سے قریب تھی اور جس جگہ پڑاؤ کیا تھا وہاں چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ تھے، اور ایک دَرّہ (دو پہاڑوں کے درمیان کا راستہ، گھاٹی) تھا۔ آنحضور ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا: گھاٹی کے دَہانے پر رہو، یعنی پہرہ دو۔ جب صبح ہوئی اور فجر کی اذان ہوئی تو بھی وہ صحابی نہیں لوٹے، آپؐ برابر گھاٹی کی طرف دیکھتے رہے۔ کمانڈر کو اپنے فوجی کا بڑا خیال ہوتا ہے، پھر جب آپؐ نے نماز شروع کی تو بھی کئی بار گھاٹی کی طرف دیکھا۔ نماز کے بعد آپؐ نے خوشخبری سنائی کہ سوار آ رہا ہے اس نے آکر دیر کرنے کی وجہ بتائی کہ اذان کے بعد میں نے پہاڑوں کا راؤنڈ لیا اس لئے آنے میں دیر ہوئی۔ غرض کوئی سخت ضرورت ہو تو مصلی گردن گھما کر بھی دیکھ سکتا ہے۔

۳- سینہ گھما کر دیکھنا: اس سے نماز باطل ہو جائے گی کیونکہ نماز میں استقبال قبلہ شرط ہے۔

پہلی حدیث: ابن عباسؓ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نماز میں دائیں بائیں دیکھا کرتے تھے، اور اپنی گردن پیٹھ کے پیچھے نہیں موڑتے تھے۔

تشریح: اس حدیث کا بظاہر مفہوم یہ ہے کہ دورانِ نماز گردن گھما کر دائیں بائیں دیکھنا آنحضور ﷺ کا معمول تھا، حالانکہ ایسا نہیں تھا، بلکہ یہ گاہے ماہے کا عمل تھا اور سخت ضرورت کے وقت تھا اور ماضی استمراری مجازی تعبیر ہے، کیونکہ جب گاہ بہ گاہ دیکھنا ثابت ہوا تو التفات کا جواز ثابت ہو گیا اور یہ جواز مستمر ہے یہی بات بتانے کے لئے راوی نے ماضی استمراری کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس حدیث کی سند میں علتِ خفیہ ہے، فضل بن موسیٰ (یہ بہت

اچھا راوی نہیں) یہ حدیث عبداللہ بن سعید سے روایت کرتا ہے اور مرفوع کرتا ہے، جبکہ امام وکیع رحمہ اللہ بھی یہ حدیث عبداللہ بن سعید سے روایت کرتے ہیں اور مرسل بیان کرتے ہیں یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا تذکرہ نہیں کرتے۔ نیز فضل بن موسیٰ کی روایت میں تعیین ہے کہ عکرمہ سے روایت کرنے والے ثور بن زید ہیں اور امام وکیع رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ عبداللہ بن سعید عکرمہ کے ایک شاگرد سے اور وہ شاگرد عکرمہ سے روایت کرتا ہے، یعنی سند میں ایک مجہول واسطہ ہے۔ اس لئے حدیث قابل استدلال نہیں۔

فائدہ: حضور اکرم ﷺ ضرورتِ شدیدہ کے وقت دائیں بائیں تو دیکھتے تھے مگر پیچھے دیکھنے کے لئے گردن نہیں گھماتے تھے، یہاں یہ سوال نہیں ہونا چاہئے کہ آپؐ کو پیچھے دیکھنے کے لئے گردن گھمانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ تو آگے بھی دیکھتے تھے اور پیچھے بھی دیکھتے تھے (متفق علیہ، مشکوٰۃ ۱۰۸۵) کیونکہ آپؐ کا آگے دیکھنا تو فطری تھا اور پیچھے دیکھنا ایک معجزہ تھا اور معجزے نبی کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ جب اللہ تعالیٰ چاہیں معجزہ ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری حدیث: حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیٹے! نماز میں جھانکنے سے بچ! اس لئے کہ نماز میں جھانکنا بربادی ہے، پس اگر ضروری ہو (یعنی شوق پورا کرنا ہو) تو نفل نماز میں دیکھ لے فرض نماز میں نہیں''

تشریح: حضرت انس رضی اللہ عنہ دس سال کی عمر میں حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں دیئے گئے تھے، اور بچہ: بچہ ہوتا ہے حرکت سے باز نہیں آتا۔ ایک مرتبہ آپؐ نے ان کو تاکتے جھانکتے دیکھ لیا، آپؐ نے ان کو منع کیا اور فرمایا: ''یہ بربادی ہے'' لہٰذا یہ کام نہ کرو اور اگر شوق پورا کرنا ہے تو نفل نماز میں اِدھر اُدھر دیکھ لے۔ مگر فرض میں ایسا بالکل نہ کر!۔

اس حدیث سے دو مسئلے معلوم ہوئے: ایک: بےضرورت نماز میں التفات اگرچہ وہ کنکھیوں سے ہو مکروہ ہے۔ دوسرا: فرض اور نفل نمازوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ فرض نماز اللہ کے دربار کی باقاعدہ حاضری ہے اور اس کے لئے کچھ پابندیاں ہیں اور نفل نماز پرائیویٹ معاملہ ہے اس لئے وہ پابندیاں نہیں۔ یہ مسئلہ پہلے بھی گذر چکا ہے۔

تیسری حدیث: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز میں دیکھنے کا مسئلہ دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: وہ جھپٹنا ہے شیطان آدمی کی نماز میں سے اس کے ذریعہ جھپٹ لیتا ہے (یعنی نماز ناقص کر دیتا ہے) اس حدیث سے التفات فی الصلاۃ کی کراہیت ثابت ہوئی۔

[۲۹۸] بابُ مَاذُکِرَ فی الالتفات فی الصلاۃ

[۵۹۲-] حدثنا محمودُ بنُ غَیْلَانَ، وغیرُ واحِدٍ، قالوا: نا الفَضْلُ بنُ موسیَ، عن عبدِ اللّٰہِ بنِ سعیدِ بنِ أبی هِنْدٍ، عن ثَوْرِ بنِ زَیْدٍ، عن عِکْرِمَۃَ، عن ابنِ عباسٍ: أَنَّ رسولَ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

كان يَلْحَظُ في الصَّلَاةِ يَمِينًا وشِمَالاً، ولا يَلْوِىْ عُنُقَهُ خَلْفَ ظَهْرِهِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ غريبٌ، وقد خَالَفَ وكيعٌ الفَضْلَ بنَ موسَى في رِوَايَتِه، حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، نا وكيعٌ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ سعيدِ بنِ أبى هِنْدٍ، عن بعضِ أصحابِ عِكْرِمَةَ عن عِكْرِمَةَ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كان يَلْحَظُ في الصَّلَاةِ، فَذَكَرَ نَحْوَهُ.

وفي الباب: عن أنسٍ، وعائشةَ.

[۵۹۳-] حدثنا مُسْلِمُ بنُ حاتِمٍ البَصْرِيُّ أبو حَاتِمٍ، نا محمدُ بنُ عبدِ اللّٰهِ الأَنْصَارِيُّ، عن أبيهِ، عن عليِّ بنِ زَيْدٍ، عن سَعِيدِ بنِ المُسَيَّبِ، عن أنسٍ، قال: قال لي رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: "يابُنَيَّ! إِيَّاكَ وَالإِلْتِفَاتَ في الصَّلَاةِ، فَإِنَّ الإِلْتِفَاتَ في الصَّلَاةِ هَلَكَةٌ، فَإِنْ كان لَابُدَّ فَفِي التَّطَوُّعِ، لَا في الفَرِيْضَةِ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ.

[۵۹۴-] حدثنا صالحُ بنُ عبدِ اللّٰهِ، نا أبو الأَحْوَصِ، عن أَشْعَثَ بن أبي الشَّعْثَاءِ، عن أبيهِ، عن مَسْرُوْقٍ، عن عائشةَ، قالتْ: سَأَلْتُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم عن الالْتِفَاتِ في الصَّلَاةِ؟ قال: "هو اخْتِلَاسٌ يَخْتَلِسُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ صَلَاةِ الرجُلِ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ.

لغت: لَحَظَه بالعين: کسی کو کن انکھیوں سے دیکھنا، گوشۂ چشم سے دیکھنا۔ اخْتَلَسَ الشيئَ: دھوکے سے چھین لینا، جھپٹا مار کر چھین لینا، اچک لینا۔

بابُ ما ذُكِرَ في الرَّجُلِ يُدْرِكُ الإِمَامَ سَاجِدًا كَيْفَ يَصْنَعُ؟

جو شخص امام کو سجدہ میں پائے: کیا کرے؟

اگر امام قیام میں یا رکوع میں ہوتا ہے تو لوگ جماعت میں شامل ہوجاتے ہیں، لیکن اگر امام سجدہ میں ہوتا ہے تو بعض لوگ کھڑے رہتے ہیں، جماعت میں شامل نہیں ہوتے، وہ یہ سوچتے ہیں کہ رکعت تو چھوٹ گئی، اب شریک ہونے سے کیا فائدہ؟ جب امام سجدہ کرکے اگلی رکعت کے لئے کھڑا ہوگا تب شامل ہوجائیں گے۔ یہ طریقہ اور یہ خیال غلط ہے، بیشک امام جب سجدہ میں چلا گیا تو رکعت فوت ہوگئی، مگر نمازی کے لئے بہتر یہ ہے کہ امام جس حالت میں ہو اسی حالت میں اس سے مل جائے۔ حضرت ابن المبارک رحمہ اللہ نے کسی کے حوالہ سے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ہوسکتا ہے: سجدہ میں شریک تمام لوگوں کی مغفرت ہوجائے اور یہ شخص انتظار ہی کرتا رہ جائے۔ ابن المبارک رحمہ اللہ

نے جو بات بیان کی ہے وہ ٹھیک ہے، مگر خطابی ہے، برہانی نہیں۔ اور اس سے زیادہ مضبوط بات جس پر کوئی اشکال نہیں ہوسکتا یہ ہے کہ امام جس رکن میں ہے نمازی اسی رکن میں اس سے مل جائے گا تو اسی وقت سے ثواب شروع ہو جائے گا، یہ شرکت رائگاں نہیں جائے گی، اگرچہ رکعت نہیں ملے گی مگر سجدہ میں شرکت کا ثواب ملے گا۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی نماز پڑھنے کے لئے آئے درانحالیکہ امام کسی رکن میں ہو تو چاہئے کہ وہ ویسا ہی کرے جیسا امام کر رہا ہے'' یعنی اسی رکن میں جماعت میں شامل ہو جائے۔

تشریح: اس حدیث کی سند میں تحویل ہے۔ تحویل کبھی مصنف کی جانب سے ہوتی ہے اور اس کی بے شمار مثالیں ہیں، اور کبھی اوپر کسی راوی سے ہوتی ہے، یعنی نیچے سے ایک سند ہوتی ہے اور اوپر جا کر دو سندیں ہو جاتی ہیں۔ یہاں ایسا ہی ہے۔ ابواسحاق سے حدیث کی دو سندیں ہوگئی ہیں، ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ پر پہنچ رہی ہے، دوسری معاذ بن جبلؓ پر، اور دونوں سندوں میں حجاج بن ارطاۃ ضعیف راوی ہے، اور دوسری سند میں انقطاع بھی ہے، کیونکہ ابن ابی لیلیٰ کبیر کی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں۔ حضرت معاذ کا بہت جلدی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں انتقال ہو گیا تھا۔

[۲۹۹] بابُ مَاذُكِرَ فى الرجل يُدرك الإمامَ ساجداً كيف يصنع؟

[۵۹۵-] حدثنا هِشَامُ بنُ يُونُسَ الكُوفِيُّ، نا المُحَارِبِيُّ، عن الحَجَّاجِ بنِ أَرْطَاةَ، عن أبى إسحاق، عن هُبَيْرَةَ، عن عَلِيٍّ، وعن عَمْرِو بنِ مُرَّةَ، عن ابنِ أبى لَيْلَى، عن مُعاذِ بنِ جَبَلٍ، قالا: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: " إِذَا أَتَى أَحَدُكُم الصَّلَاةَ والإمامُ على حَالٍ فَلْيَصْنَعْ كما يَصْنَعُ الإمَامُ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ غريبٌ لا نَعْلَمُ أَحداً أَسْنَدَهُ إِلاَّ مَا رُوِىَ مِنْ هذا الوجهِ. والعَمَلُ على هذا عندَ أهلِ العلمِ، قالوا: إِذا جَاءَ الرجلُ والإِمَامُ سَاجِدٌ فَلْيَسْجُدْ، وَلاَ تُجْزِئُهُ تلكَ الركعةُ إِذَا فاتَهُ الركوعُ معَ الإمامِ.

واختارَ عبدُ اللهِ بنُ المباركِ: أَنْ يَسْجُدَ مَعَ الإِمَامِ، وذَكَرَ عن بَعْضِهِم، فقال: لَعَلَّهُ لاَ يَرْفَعُ رَأْسَهُ مِنْ تلك السَّجْدَةِ حتى يُغْفَرَ لَهُ.

ترجمہ: علماء فرماتے ہیں: جب آدمی آئے درانحالیکہ امام سجدہ میں ہو تو چاہئے کہ وہ سجدہ کرے اور نہیں کافی اس کو وہ رکعت (یعنی وہ رکعت نہیں پائی) جب اس کا رکوع امام کے ساتھ فوت ہو گیا، اور پسند کیا ہے ابن المبارک نے کہ آنے والا سجدہ کرے امام کے ساتھ اور انھوں نے کسی کا قول نقل کیا ہے کہ ہوسکتا ہے وہ اس سجدہ سے سر نہ اٹھائے یہاں تک کہ اس کی بخشش کر دی جائے یعنی اس سجدہ میں اس شرکت کرنے والی کی مغفرت ہو جائے، یہ شرکت کا فائدہ ہے

بابُ كَرَاهِيَةِ أَنْ يَنْتَظِرَ النَّاسُ الإِمَامَ وَهُمْ قِيَامٌ عِنْدَ افْتِتَاحِ الصَّلاَةِ

نماز کے شروع میں کھڑے کھڑے امام کا انتظار کرنا مکروہ ہے

نماز کے لئے کھڑے ہونے کا مستحب وقت یہ ہے کہ جب اقامت شروع ہو تب لوگ کھڑے ہوں۔ امام بھی اور مقتدی بھی، اور کھڑے کھڑے امام کا انتظار کرنا یعنی اقامت شروع ہونے سے پہلے کھڑا ہونا، یا اقامت تو شروع ہوگئی مگر امام ابھی حاضر نہیں، حجرے میں ہے اس وقت کھڑا ہونا بھی مکروہ ہے۔ آج کل لوگ گھڑی دیکھ کر کھڑے ہوجاتے ہیں، یا مؤذن کو اقامت کی تیاری کرتا دیکھتے ہیں تو کھڑے ہوجاتے ہیں یہ غلط طریقہ ہے۔ اقامت شروع ہونے کے بعد ہی لوگوں کو کھڑا ہونا چاہئے۔ حدیث میں پہلے کھڑے ہونے کی ممانعت آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب اقامت کہی جائے تو آپ لوگ اس وقت تک کھڑے نہ ہوں جب تک مجھے حجرے سے نکلتا ہوا نہ دیکھ لیں'' معلوم ہوا کہ اگر امام مسجد میں نہیں ہے اور اقامت شروع ہوجائے تو بھی لوگوں کو کھڑا نہیں ہونا چاہئے، جب لوگ دیکھیں کہ امام آرہا ہے تب کھڑے ہوں۔

اور تکبیر شروع ہونے کے بعد فوراً کھڑا ہونا جائز ہے۔ کیونکہ تکبیر کو عربی میں ''اقامت'' کہتے ہیں۔ اور اقامت کے معنی ہیں کھڑا کرنا۔ جب کھڑا کرنا پایا گیا تو کھڑا ہونا جائز ہے۔ اور فقہ میں جو جزئیہ ہے کہ لوگ حی علی الصلوۃ پر کھڑے ہوں، اس کا مطلب علامہ طحطاوی رحمہ اللہ نے حاشیہ درمختار میں یہ بیان کیا ہے کہ حیعلتین سے قیام کی تاخیر جائز نہیں۔ حیعلتین پر کھڑا ہوجانا ضروری ہے ورنہ اللہ کے داعی کی مخالفت لازم آئے گی۔ اس جزئیہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تقدیم جائز نہیں۔ تقدیم تو جائز ہے اس لئے کہ جب اقامۃ یعنی کھڑا کرنا پایا گیا تو کھڑا ہونا بھی جائز ہے۔ اگر تکبیر شروع ہونے کے بعد بھی کھڑا ہونا جائز نہ ہو تو پھر اقامۃ کے کوئی معنی نہیں۔ تفصیل کتاب الصلاۃ کے شروع میں گذر چکی ہے۔

فائدہ: مستحب کی ضد اس وقت مکروہ ہوتی ہے جب کراہیت کی کوئی دلیل ہو۔ جیسے اقامت شروع ہونے کے بعد اور امام کے حاضر ہونے کے بعد کھڑا ہونا مستحب ہے اور اس سے پہلے کھڑا ہونا مکروہ ہے۔ کیونکہ کراہیت کی دلیل ہے۔ حدیث میں پہلے کھڑے ہونے کی ممانعت آئی ہے، پس اس مستحب کی ضد مکروہ ہے اور اگر کراہیت کی کوئی دلیل نہ ہو تو پھر مستحب کی ضد مباح ہوتی ہے۔

[۳۰۰] بابُ كراهيةِ أن ينتظر الناسُ الإمامَ وهم قيامٌ عند افتتاح الصلاة

[۵۹۶-] حدثنا أحمدُ بنُ محمدٍ، نا عبدُ اللهِ بنُ المباركِ، نا مَعْمَرٌ، عن يحيىَ بنِ أبي كثيرٍ، عن

عبدِ اللّٰهِ بنِ أبی قَتَادَةَ، عن أبيه، قال: قال رسولُ اللّٰهِ صلی الله عليه وسلم: "إِذَا أُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا تَقُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوْنِیْ خَرَجْتُ"

وفی الباب: عن أنسٍ، وحديثُ أنسٍ غيرُ مَحْفُوْظٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ أبی قتادَةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وقد كَرِهَ قَوْمٌ مِن أهلِ العلمِ مِنْ أصحابِ النبیِّ صلی الله عليه وسلم وغيرِهم أنْ يَنْتَظِرَ الناسُ الإمامَ وَهُمْ قِيَامٌ.

وقال بعضُهم: إذا كان الإمامُ فی المَسْجِدِ، وأُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ، فَإِنَّمَا يَقُوْمُوْنَ إِذَا قال المُؤَذِّنُ: قد قامتِ الصَّلَاةُ، وهو قولُ ابنِ المبارَكِ.

وضاحت: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: باب میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے مگر وہ محفوظ نہیں، درحقیقت وہ حضرت ابوقتادہؓ کی حدیث ہے، بعض لوگوں نے اس کی سند حضرت انسؓ تک پہنچادی ہے جوان کا وہم ہے۔ اور صحابہ اور ان کے علاوہ علماء میں سے بعض نے اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ لوگ امام کا کھڑے کھڑے انتظار کریں۔ اور بعض علماء کہتے ہیں: جب امام مسجد میں ہو اور تکبیر کہی جائے تو لوگ اس وقت کھڑے ہوں جب مؤذن قدقامت الصلاۃ کہے، اور یہ ابن المبارک کا قول ہے۔

بابُ ماذُكِرَ فی الثَّنَاءِ عَلَى اللّٰهِ والصَّلَاةِ عَلَى النبیِّ صلی الله عليه وسلم قَبْلَ الدُّعَاءِ

دعا کے آداب میں اللہ کی حمد وثنا اور نبی ﷺ پر درود بھیجنا ہے

دعا کے آداب میں سے یہ بات ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی خوب تعریف کی جائے۔ پھر نبی پاک ﷺ پر درود وسلام بھیجا جائے پھر دعا مانگے اس لئے کہ طالب کو مطلوب کے سامنے ایک دم اپنی حاجت نہیں رکھنی چاہئے۔ یہ بے ادبی ہے، پہلے اس کی تعریف کرکے خوش کرے پھر وسیلہ ڈھونڈھے، نبی ﷺ پر درود بھیجنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ میں آپ کا امتی ہوں اور جو دین آپؐ لے کر آئے ہیں میں اس پر یقین رکھتا ہوں، یہ دو کام کرکے دعا مانگے دعا ضرور قبول ہوگی۔

حدیث: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نماز پڑھ رہا تھا اور نبی ﷺ (مسجد میں) موجود تھے، اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی آپ کے ساتھ تھے، پس جب میں (نماز سے فارغ ہوکر) بیٹھا (اور دعا مانگنی شروع کی) تو میں نے پہلے اللہ کی حمد وثنا کی، پھر آنحضور ﷺ پر درود بھیجا پھر اپنے لئے دعا مانگنی شروع کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مانگو! دیئے جاؤگے! مانگو دیئے جاؤگے!" یعنی آپؓ نے آداب کی رعایت کرکے دعا مانگنی شروع کی ہے پس آپؓ کی دعا ضرور قبول ہوگی۔

فائدہ: دعا مانگنے کا یہ ادب ممکن ہے آنحضور ﷺ نے ابن مسعودؓ کو تعلیم فرمایا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے اپنی صوابدید اور اپنے اجتہاد سے یہ طریقہ معلوم کیا ہو۔

[۳۰۱] بابُ ما ذكر في الثناء على الله، والصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم قبل الدعاء

[۵۹۷-] حدثنا محمودُ بنُ غيلانَ، نا يحيىَ بنُ آدمَ، نا أبوبكرِ بنُ عَيَّاشٍ، عن عاصِمٍ، عَنْ زِرٍّ، عن عبدِاللّٰهِ، قال: كُنْتُ أُصَلِّي والنبيُّ صلى الله عليه وسلم وأبو بكرٍ وعُمرُ مَعَهُ، فَلَمَّا جَلَسْتُ بَدَأْتُ بالثَّناءِ على اللّٰهِ، ثم الصَّلاَةِ على النبيِّ صلى الله عليه وسلم، ثم دَعَوْتُ لِنَفْسِيْ، فقال النبيُّ صلى الله عليه وسلم: "سَلْ تُعْطَهْ، سَلْ تُعْطَهْ"

وفي الباب: عن فَضَالَةَ بنِ عُبَيْدٍ، قال أبو عيسى: حديثُ عبدِ اللّٰهِ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وَرَوَى أحمدُ بنُ حَنْبَلٍ، عن يحيىَ بنِ آدمَ هذا الحديثَ مُخْتَصَرًا.

قوله: والنبي صلى الله عليه وسلم مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے أی موجود۔

بابُ ما ذُكِرَ في تَطْيِيْبِ الْمَسَاجِدِ

مسجدوں کو خوشبودار رکھنے کا بیان

حدیث: عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے محلہ محلہ مسجدیں بنانے کا حکم دیا اور یہ حکم دیا کہ ان کو صاف ستھرا رکھا جائے اور خوشبودار کیا جائے۔

تشریح: یہ مرفوع حدیث عامر بن صالح کی وجہ سے ضعیف ہے۔ یہ راوی متروک ہے اور عبدۃ اور وکیع جو اعلی درجہ کے ثقہ راوی ہیں یہ حدیث ہشام بن عروۃ سے مرسلاً روایت کرتے ہیں، یعنی وہ حضرت عائشہ کا تذکرہ نہیں کرتے، اور سفیان بن عیینہ ان کے متابع ہیں وہ بھی ہشام سے روایت کرتے ہیں اور مرسل بیان کرتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنے مزاج کے مطابق مرسل روایت کو اصح قرار دیا ہے، جبکہ اس کو اصح کہنے کی کوئی وجہ نہیں، اس لئے کہ زائدۃ بن قدامہ جو عبدۃ اور وکیع کے ہم پلہ ہیں وہ بھی یہ حدیث ہشام سے مرفوع روایت کرتے ہیں۔ زائدۃ بن قدامہ کی حدیث ابوداؤد (حدیث ۴۵۵) میں ہے۔ اور مالک بن سعید جو ثقہ ہیں ان کے متابع ہیں، ان کی حدیث ابن ماجہ میں ہے۔ اور ثقہ کی زیادتی معتبر ہے، پس مرسل حدیث کو اصح کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔

اور اس حدیث میں دو حکم ہیں:

پہلا حکم: یہ ہے کہ محلہ محلہ مسجدیں بنائی جائیں، یعنی مسجد اتنی قریب ہونی چاہئے کہ لوگ بسہولت اس تک پہنچ سکیں

اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکیں، بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ایک گاؤں میں ایک ہی مسجد ہونی چاہئے۔ چاہے گاؤں بڑا ہو، اور چاہے مسجد گاؤں کی ایک جانب میں واقع ہو اور لوگوں کو سردی گرمی اور برسات میں پہنچنے میں دقت ہوتی ہو، مگر گاؤں میں مسجد ایک ہی ہونی چاہئے۔ وہ کہتے ہیں: اگر گاؤں میں دو مسجدیں ہونگی تو لوگوں میں اختلاف ہوگا، ان کی یہ بات صحیح نہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے محلے محلے مسجدیں بنانے کا حکم دیا تھا، اگر اختلاف کا احتمال ہوتا تو آپؐ یہ حکم نہ دیتے، مسجد نبوی پر ہی اکتفا کی جاتی۔

سوال: مسجد بنانے میں لاکھوں کا صرفہ ہے محلہ محلہ مسجدیں بنانے کے لئے رقم کہاں سے آئے گی؟

جواب: لاکھوں کی مسجد بنانا ضروری نہیں، جھونپڑا بھی کافی ہے، بستی والوں کے جیسے مکان ہیں اللہ کا گھر اس سے کچھ بہتر ہونا چاہئے، بس اتنی بات کافی ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے جب مسجد نبوی بنائی تھی تو کوئی عالی شان محل نہیں بنایا تھا ایک جھونپڑا بنایا تھا جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک استعمال ہوتا رہا۔ بہر حال حسب گنجائش مسجدیں بنائی جائیں اور محلّہ محلّہ بنائی جائیں۔

دوسرا حکم: یہ ہے کہ مسجدیں صاف ستھری اور معطّر رکھی جائیں، ہم لوگ اللہ کے فضل سے مسجدیں صاف ستھری تو رکھتے ہیں مگر ان کو خوشبودار کرنے کا رواج ہمارے یہاں نہیں، عرب آج بھی مساجد کی صفائی کا بھی اہتمام کرتے ہیں اور ان کو خوشبودار بھی رکھتے ہیں، وہ مسجد میں دھونی دیتے ہیں، ہمیں بھی وقتاً فوقتاً اگربتی جلا کر مسجد کو معطّر رکھنا چاہئے۔

[۳۰۲] بابُ ماذُکر فی تطییب المساجد

[۵۹۸-] حدثنا محمدُ بنُ حاتِمٍ البَغْدَادِیُّ، نا عَامِرُ بنُ صَالِحٍ الزُّبَیْرِیُّ، نا هِشَامُ بنُ عُرْوَةَ، عن أبِیهِ، عن عائشةَ، قالتْ: أمَرَ النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم بِبِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِیْ الدُّوْرِ، وأنْ تُنَظَّفَ وتُطَیَّبَ.

حدثنا هَنَّادٌ، نا عَبْدَةُ ووَکِیْعٌ، عن هِشَامِ بنِ عُرْوَةَ، عن أبیهِ، أنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم أمَرَ، فَذَکَرَ نَحْوَهُ، وهذا أَصَحُّ مِنَ الحدیثِ الأوَّلِ.

حدثنا ابنُ أبی عُمرَ، نا سُفیانُ بنُ عُیَیْنَةَ، عن هِشَامِ بنِ عُرْوَةَ، عن أبیهِ، أنَّ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم أمَرَ، فَذَکَرَ نَحْوَهُ.

قال سُفیانُ: بِبِنَاءِ الْمَسَاجِدِ فِیْ الدُّوْرِ یعنی القَبَائِلَ.

وضاحت: دُوْر: دار کی جمع ہے اس کے ایک معنی ہیں: گھر۔ دوسرے معنی ہیں: قبیلہ۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دُوْر سے قبائل مراد ہیں۔

بابُ ماجاءَ أنَّ صَلاَةَ اللَّيْلِ والنَّهارِ مَثْنَى مَثْنى

رات اوردن کی نفلیں دودو، دودورکعتیں ہیں

یہ حدیث اور یہ مسئلہ پہلے گذر چکے ہیں، وہاں بتایا تھا کہ ابن عمر کی حدیث صلاةُ الليل مثنى مثنى اعلی درجہ کی حدیث ہے، مگرائمہ میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ حکم تشریعی ہے یاارشادی؟ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک تشریعی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: رات اوردن میں ایک سلام سے دونفلیں افضل ہیں۔ اور حنفیہ کے نزدیک یہ حکم ارشادی ہے، یعنی آنحضور ﷺ نے تہجد گذاروں کوان کی بھلائی کی ایک بات بتائی ہے۔ چونکہ تہجد طویل پڑھے جاتے ہیں اس لئے ہر دو رکعت پر سلام پھیرنے میں سہولت ہے، سلام کے بعد کچھ آرام کرکے تازہ دم ہوکر اگلا دوگانہ شروع کرے گا اور چار رکعتیں ایک ساتھ طویل پڑھنے سے تھک جائے گا۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ابن عمرؓ کی مذکورہ حدیث میں والنهار کا اضافہ صحیح ہے یا نہیں؟ بعض محدثین نے اس کو صحیح مانا ہے، کیونکہ سات راوی ابن عمر سے یہ اضافہ روایت کرتے ہیں، اور جمہور محدثین کے نزدیک یہ اضافہ صحیح نہیں، کیونکہ پندرہ ثقہ راوی ابن عمر سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں اور کوئی یہ اضافہ نہیں کرتا اور جو سات راوی اضافہ کرتے ہیں ان میں کچھ نہ کچھ کمزوری ہے، علاوہ ازیں ابن عمرؓ سے صحیح سند سے مروی ہے کہ آپؓ دن میں چار نفلیں ایک سلام سے پڑھتے تھے۔ اگر والنهار کا اضافہ صحیح ہوتا تو ابن عمرؓ کا عمل اس کے خلاف نہ ہوتا۔

[۳۰۳] بابُ ماجاء أن صلاةَ الليل والنهار مثنى مثنى

[۵۹۹-] حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا عبدُ الرحمنِ بنُ مَهْدِيٍّ، نا شُعْبَةُ، عن يَعْلَى بنِ عَطَاءٍ، عن عَلِيٍّ الأَزْدِيِّ، عن ابنِ عُمَرَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: "صَلاَةُ اللَّيْلِ وَالنَّهارِ مَثْنَى مَثْنَى"

قال أبو عيسى: اختلفَ أصحابُ شُعْبَةَ في حديثِ ابنِ عُمَرَ، فَرَفَعَهُ بعضُهُمْ ووقَفَهُ بعضُهُمْ.

وَرُوِيَ عن عبدِ اللهِ العُمَرِيِّ، عن نافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم نحوُ هٰذا، والصحيحُ ما رُوِيَ عن ابنِ عُمَرَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، أَنَّهُ قالَ: "صلاةُ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى" ورَوَى الثِّقَاتُ عن عبدِ اللهِ بنِ عُمَرَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، ولَمْ يَذْكُرُوْا فِيْهِ صَلاَةَ النَّهارِ؛ وقد رُوِيَ عن عُبَيْدِ اللهِ عن نافِعٍ عن ابنِ عُمَرَ أَنَّهُ كان يُصَلِّيْ باللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى، وبِالنَّهارِ أَرْبَعًا.

وقد اخْتَلَفَ أهلُ العلمِ في ذلكَ: فَرَأَى بعضُهُمْ أَنَّ صلاَةَ اللَّيْلِ والنَّهارِ مَثْنَى مَثْنى، وهو قولُ الشافعيِّ وأحمدَ، وقال بعضُهم: صَلاَةُ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنى، وَرَأَوْا صَلاَةَ التطوُّعِ بالنَّهارِ أَرْبَعًا، مِثْلَ أَرْبَعٍ قبلَ الظهرِ وغيرِها من صَلاَةِ التَّطوُّعِ، وهو قولُ سفيانَ الثوريِّ، وابنِ المباركِ، وإسحاقَ.

ترجمہ اور وضاحت: ابن عمرؓ کی یہ حدیث جس میں والنہار کا اضافہ ہے علی بن عبداللہ البارقی الازدی کی روایت ہے وفیہ مَسٌّ مِن الضُّعف: اس راوی میں کچھ کمزوری ہے یعنی وہ اعلی درجہ کا راوی نہیں۔ پھر یہ حدیث مرفوع ہے یا موقوف؟ شعبہ رحمہ اللہ کے تلامذہ میں اختلاف ہے، بعض مرفوع کرتے ہیں اور بعض موقوف، یعنی بعض تلامذہ اس کو ابن عمر کا قول قرار دیتے ہیں اور اسی کے مانند یعنی والنہار کے اضافہ کے ساتھ عبداللہ عمری بھی نافع سے روایت کرتے ہیں، اور عبداللہ عمری میں بھی ضعف ہے، اور صحیح حدیث وہ ہے جو پہلے گذری ہے، اس میں والنہار کا اضافہ نہیں۔ ثقہ روات ابن عمر سے اسی طرح روایت کرتے ہیں۔ اور عبیداللہ عمری (یہ عبداللہ عمری کے بڑے بھائی ہیں اور اعلی درجہ کے ثقہ راوی ہیں) نافع سے وہ ابن عمر سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ رات میں دو دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے، اور دن میں چار رکعتیں ـــــ اور علماء نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا ہے: بعض کہتے ہیں: رات اور دن کی نفلیں دو دو ہیں۔ اور یہ شافعی اور احمد کا قول ہے۔ اور بعض کہتے ہیں: رات کی نفلیں دو دو ہیں اور وہ دن میں چار نوافل کے قائل ہیں، جیسے ظہر وغیرہ سے پہلے کے نوافل۔ اور یہ سفیان ثوری، ابن المبارک اور اسحاق کا قول ہے (صاحبین بھی اسی کے قائل ہیں)

بابٌ کَیْفَ کانَ یَتَطَوَّعُ النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم بالنَّھَارِ؟

نبی ﷺ دن میں کتنی نفلیں پڑھتے تھے؟

یہاں لفظ کیف: کیفیت بیان کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ مقدار بیان کرنے کے لئے ہے، یعنی کیف: کم کے معنی میں ہے۔ اور باب میں حضرت علیؓ کی حدیث ہے جو اتنی جامع اور تفصیلی ہے کہ اس جیسی تفصیلی روایت کوئی نہیں۔

عاصم بن ضمرۃ کہتے ہیں: ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضور اکرم ﷺ کی دن کی نماز کے بارے میں پوچھا یعنی آپؐ دن میں کتنی نفلیں پڑھتے تھے اور کس وقت پڑھتے تھے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا: تم اس پر عمل نہیں کر سکتے (پھر پوچھنے سے کیا فائدہ؟) ـــــ حضرت علیؓ کے جواب سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک: حدیث پڑھنے والے طالب علم کا سب سے پہلا مقصد تأسی ہونا چاہئے، یعنی حضور اکرم ﷺ کی زندگی کو اسوہ بنا کر اپنی زندگی کو اس پر ڈھالنا، اگر طالب علم کے سامنے یہ مقصد نہیں تو اس کا حدیث پڑھنا بے فائدہ ہے۔ دوسری: سبق میں لایعنی سوال نہیں کرنا چاہئے جو بات کام کی نہیں ہے اس کو پوچھنا ذہنی عیاشی ہے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: جب تم اس پر عمل نہیں کر سکتے تو سوال فضول ہے ـــــ طلبہ سمجھ دار تھے۔ انھوں نے عرض کیا: حضرت! آپ بیان فرمائیں ہم میں سے جو طاقت رکھے گا عمل کرے گا اور جو عمل نہیں کر سکے گا وہ حدیث دوسروں تک پہنچائے گا دوسرے اس پر عمل کریں گے ـــــ حضرت علیؓ نے فرمایا: عصر کی نماز جس وقت پڑھی جاتی ہے اس وقت مغربی افق سے سورج جتنا بلند ہوتا ہے: جب سورج نکل کر اتنا بلند ہو جاتا تھا تو آپؐ دو رکعتیں پڑھتے تھے (یہ اشراق کی نماز ہے) اور جس وقت ظہر کی نماز پڑھتے

ہیں اس وقت سورج مغربی افق سے جتنا اونچا ہوتا ہے: جب سورج نکل کر اتنا بلند ہوجاتا تھا تو آپؐ چار رکعتیں پڑھتے تھے (یہ چاشت کی نماز ہے) ـــــــ یہاں سے معلوم ہوا کہ آج کل عربوں کا جو طریقہ ہے کہ وہ پورے سال سردیوں میں بھی اور گرمیوں میں بھی زوال ہوتے ہی اذان دیتے ہیں پھر دس منٹ کے بعد ظہر پڑھ لیتے ہیں یہ طریقہ صحیح نہیں۔ کیونکہ چاشت کی نماز دس ساڑھے دس بجے پڑھی جاتی ہے۔ زوال سے ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے، پس ظہر زوال سے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد پڑھنے کا حضور اکرم ﷺ کا معمول تھا ـــــــ اور ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور ظہر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے تھے، اور عصر سے پہلے چار رکعتیں ایک سلام سے پڑھتے تھے۔ معلوم ہوا: آنحضور ﷺ زوال ہوتے ہی جو چار رکعتیں پڑھتے تھے وہ ظہر کی سنتیں تھیں، صلاۃ الزوال نہیں تھیں، جیسا امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اگر صلاۃ الزوال کوئی مستقل نماز ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔ واللہ اعلم

[۳۰۴] بابٌ کیف کان یَتَطَوَّعُ النبیُّ صلی اللہ علیہ وسلم بالنھار؟

[۶۰۰-] حدثنا محمودُ بنُ غَیْلَانَ، نا وَھْبُ بنُ جَرِیْرٍ، ناشُعْبَةُ، عن أبی إسحاق، عن عاصِمِ بنِ ضَمْرَةَ، قال: سَأَلْنَا عَلِیًّا عن صَلَاةِ رسولِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم مِنَ النَّھَارِ، فقال: إِنَّکُمْ لَاتُطِیْقُوْنَ ذٰلکَ، فَقُلْنَا: مَنْ أَطَاقَ ذٰلکَ مِنَّا فَعَلَ، فقال کان رسولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا کانَتِ الشَّمْسُ مِنْ ھٰھُنَا کَھَیْئَتِھَا مِنْ ھٰھُنَا عندَ العَصْرِ، صَلّٰی رکعتَین، وإذا کانتِ الشمسُ مِنْ ھٰھُنا کَھَیْئَتِھَا مِن ھٰھُنا عندَ الظُّھرِ صَلّٰی أَرْبَعًا، ویُصَلِّیْ قبلَ الظُّھرِ أَرْبَعًا، وبعدَھا رکعتَینِ، وقبلَ العَصْرِ أَرْبَعًا یَفْصِلُ بینَ کُلِّ رکعتَینِ بالتَّسْلِیْمِ عَلَی الْمَلَائِکَةِ الْمُقَرَّبِیْنَ والنَّبِیِّیْنَ والمُرْسَلِیْنَ ومَنْ تَبِعَھُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ.

حدثنا محمدُ بنُ الْمُثَنّٰی، نا محمدُ بنُ جَعْفَرٍ، نا شُعْبَةُ، عن أبی إسحاق، عن عاصِمِ بنِ ضَمْرَةَ، عن علیٍّ، عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم نحوَہ.

قال أبو عیسی: ھذا حدیثٌ حسنٌ، وقال إسحاقُ بنُ إبراھیمَ: أَحْسَنُ شَیْئٍ رُوِیَ فی تَطَوُّعِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم بالنَّھارِ ھٰذَا.

ورُوِیَ عن ابنِ المبارکِ أَنَّہُ کان یُضَعِّفُ ھذا الحدیثَ، وإِنَّمَا ضَعَّفَہُ عِنْدَنَا – واللّٰہُ أعلمُ – لِأَنَّہُ لَا یُرْوَی مِثْلُ ھذا عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم إِلَّا مِنْ ھٰذا الوجہِ، عن عاصِمِ بنِ ضَمْرَةَ، عن علیٍّ، وعاصِمُ بنُ ضَمْرَةَ: ھو ثِقَةٌ عندَ بعضِ أھلِ الحدیثِ، قال علیُّ بنُ الْمَدِیْنِیِّ، قال یحیی بنُ سعیدِ القَطَّانُ. قال سفیانُ: کُنَّا نَعْرِفُ فَضْلَ حدیثِ عاصمِ بنِ ضَمْرَةَ علی حدیثِ الحارِثِ.

ترجمہ: آپؐ عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے تھے، فصل کرتے تھے ان میں مقرب فرشتوں، نبیوں، رسولوں اور

ان کی پیروی کرنے والے مؤمنین و مسلمین پر سلام کے ذریعہ (باب ماجاء فی الأربع قبل العصر میں اس جملہ کا مطلب حضرت اسحاق رحمہ اللہ نے یہ بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ دو رکعتوں پر قعدہ کرتے تھے اور تشہد پڑھتے تھے سلام نہائی کے ذریعہ فصل کرنا مراد نہیں) اس کے بعد امام ترمذی نے اسی حدیث کی دوسری سند جو شعبہ رحمہ اللہ کے دوسرے شاگرد محمد بن جعفر کی ہے: تحریر کی ہے۔ امام اسحاق فرماتے ہیں: یہ سب سے تفصیلی روایت ہے جو رسول اللہ ﷺ کے دن کے نوافل کے بارے میں مروی ہے۔ (احسن بمعنی مفصل اور جامع ہے سند کا اچھا ہونا مراد نہیں) اور ابن المبارک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ آپ اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے تھے اور ان کا اس حدیث کو ضعیف قرار دینا ہمارے خیال میں ــــ اور اللہ زیادہ جانتے ہیں ــــ اس لئے ہے کہ اس کے مانند رسول اللہ ﷺ سے روایت نہیں کی گئی مگر اسی طریق سے جو عاصم بن ضمرۃ سے ہے، اور وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں (جاننا چاہئے کہ متقدمین واللہ اعلم وہاں بڑھاتے تھے جہاں وہ اپنی طرف سے کوئی بات کہتے تھے، اور وہ بات پہلوں سے منقول نہیں ہوتی تھی) اور عاصم بن ضمرۃ بعض محدثین کے نزدیک ثقہ ہیں (پس ان محدثین کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے، اور ابن المبارک کے نزدیک یہ راوی ضعیف ہے اس لئے انھوں نے حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے) علی بن المدینی کہتے ہیں: یحییٰ قطان نے بیان کیا کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا: ہم عاصم کی حدیث کی برتری کو پہچانتے تھے حارث کی حدیث پر (یہ دونوں حضرت علی کے شاگرد ہیں اور حارث اعور ضعیف ہیں اور عاصم ٹھیک ہیں)

بَابٌ فِى كَرَاهِيَةِ الصَّلاَةِ فِى لُحُفِ النِّسَاءِ

عورتوں کے اوڑھنوں میں نماز کی کراہیت

لُحُف: لِحاف کی جمع ہے، اردو میں لحاف: رضائی کو کہتے ہیں۔ اور عربی میں ہر وہ کپڑا جو اوڑھا جاتا ہے، خواہ سوتے وقت اوڑھا جائے یا بیداری میں: لحاف کہلاتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ عورتوں کے اوڑھنوں میں نماز نہیں پڑھتے تھے، اس لئے کہ عورتوں کے ساتھ بچے ہوتے ہیں اور ان کے اور بھی ایسے کام ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ان کے اوڑھنوں میں ناپاکی کا احتمال ہوتا ہے۔ اور یہ حکم قطع وساوس کے لئے ہے ورنہ شریعت کا اصل ضابطہ ہے: الیقینُ لایَزُوْلُ بالشكِّ یعنی احکام میں یقین کا اعتبار ہے وہم کا اعتبار نہیں، مگر چونکہ عقل پر وہم کا قبضہ ہے اس لئے شریعت نے منفی پہلو میں اس کا لحاظ کیا ہے، مثلاً: غسل خانے میں پیشاب نہ کرو، عورت کے غسل کے بچے ہوئے پانی کو استعمال نہ کرو، ان کے اوڑھنوں میں نماز نہ پڑھو وغیرہ۔ یہ سب احکام قطع وساوس کے لئے ہیں اور مثبت پہلو میں وہم کا اعتبار نہیں کیا، چنانچہ جب تک عورتوں کے اوڑھنوں میں ناپاکی کا یقین نہ ہو ان میں نماز پڑھنا جائز ہے۔

سوال: ازواج مطہرات تو صاف ستھری تھیں اور الطیبات للطیبین (سورۃ النور ۲۶) میں اس کی صراحت ہے اور

عام طور پران کے پاس بچے بھی نہیں تھے، پھر آنحضور ﷺ ان کے اوڑھنوں میں نماز کیوں نہیں پڑھتے تھے؟

جواب: امت کے لئے تشریع کے مقصد سے آپؐ ایسا کرتے تھے۔ جیسے فجر کی سنتیں آپ ہلکی پڑھتے تھے (حالانکہ آپؐ تہجد کے وقت بیدار ہوتے تھے) تاکہ آپؐ کا یہ عمل امت کے لئے اسوہ بنے، کیونکہ امت کی بڑی تعداد فجر کے وقت بیدار ہوتی ہے، پس ان کو فجر کی سنتیں ہلکی پڑھنی چاہئیں تاکہ شیطان نے رات میں جو منتر پڑھ کر گرہ لگائی ہے وہ کھل جائے۔ اسی طرح امت کی راہنمائی کے لئے آپؐ نے ازواج مطہرات کے اوڑھنوں میں نماز نہیں پڑھی ورنہ آپؐ کی ازواج پاک صاف تھیں اور خود آپؐ وساوس سے محفوظ تھے۔ واللہ اعلم

[۳۰۵] بابٌ فی کراهیة الصلاة فی لُحُفِ النِّسَاءِ

[۶۰۱-] حدثنا محمدُ بنُ عبدِ الأعلی، نا خالدُ بنُ الحارثِ، عن أشعثَ، وهو ابنُ عبدِ الملكِ، عن محمدِ بنِ سِيْرِيْنَ، عن عبدِ اللهِ بنِ شَقِيْقٍ، عن عائشةَ، قالت: كان رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم لَايُصَلِّيْ فِيْ لُحُفِ نِسَائِهِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وقد رُوِيَ فی ذلك رُخصَةٌ عن النبیِّ صلى الله عليه وسلم.

ترجمہ: اور اس مسئلہ میں نبی ﷺ سے اجازت بھی مروی ہے۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دو حدیثوں کی طرف اشارہ ہے۔ پہلی حدیث: صدیقہ فرماتی ہیں: نبی ﷺ رات میں نماز پڑھتے تھے اور میں آپ کے پہلو میں ہوتی تھی اور میں حائضہ ہوتی تھی اور مجھ پر اونی چادر ہوتی تھی جس کا کچھ حصہ آپؐ پر ہوتا تھا (رواہ مسلم وابوداؤد) دوسری حدیث: صدیقہ فرماتی ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سوتی تھی اور ہم پر ہمارے کپڑے ہوتے تھے اور ہم نے ان پر ایک چادر ڈال رکھی تھی، پس جب آپؐ نے صبح کی تو وہ چادر (جو ہم نے کپڑوں کے اوپر سے اوڑھ رکھی تھی) لی اور تشریف لے گئے، پس فجر کی نماز پڑھی (رواہ ابوداؤد) معلوم ہوا کہ باب کی روایت میں جو ممانعت ہے وہ احتیاطی حکم ہے۔

بابُ مایَجُوْزُ مِنَ المَشْيِ والعَمَلِ فی صَلَاةِ التَّطَوُّعِ

نفل نماز میں کتنا چلنا اور کتنا عمل کرنا جائز ہے؟

نماز میں عمل کثیر مفسد صلاۃ ہے اور چلنا بھی ایک عمل ہے پس نماز میں زیادہ چلنے سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ خواہ فرض نماز ہو یا نفل دونوں کا حکم ایک ہے۔ اور نماز میں عملِ قلیل کی گنجائش ہے اس لئے تھوڑا چلے گا تو نماز فاسد نہیں ہوگی، رہی یہ بات کہ کونسا عمل قلیل ہے اور کونسا کثیر؟ اس میں علماء کے متعدد اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں: مصلی جو کام دونوں ہاتھ سے کرے وہ عمل کثیر ہے اور جو کام ایک ہاتھ سے کرے وہ عمل قلیل ہے۔ اور بعض کی رائے یہ ہے کہ اگر ناظر

(دیکھنے والا) مصلی کے عمل کو زیادہ سمجھے تو وہ عمل کثیر ہے اور قلیل سمجھے تو نماز درست ہے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ خود عمل کرنے والے کی رائے کا اعتبار ہے۔ اگر نمازی اپنے عمل کو تھوڑا سمجھے تو عمل قلیل ہے نماز فاسد نہیں ہوگی اور زیادہ سمجھے تو عمل کثیر ہے نماز فاسد ہو جائے گی۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کا جو اجتہادی مزاج ہے اس سے ہم آہنگ یہ تیسرا قول ہے۔ اور احناف کے یہاں عمل بھی اسی قول پر ہے، چنانچہ بعض لوگ جب رکوع یا سجدہ سے کھڑے ہوتے ہیں تو دونوں ہاتھوں سے کرتا ٹھیک کرتے ہیں، یہ بری عادت ہے، پھر بھی نماز جاری رکھتے ہیں اسی طرح کوئی بھی نمازی کسی بھی ناظر سے نہیں پوچھتا کہ میں نے جو فلاں کام کیا تو وہ آپ کے نزدیک کم تھا یا زیادہ؟ بلکہ ہر شخص اپنی ہی رائے پر عمل کرتا ہے اس لئے میں نے کہا کہ کونسا عمل قلیل ہے اور کونسا کثیر؟ یہ مسئلہ رائے مبتلی بہ پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

مگر نماز میں کتنا چلنا مفسد صلاۃ ہے اور کتنا چلنا مفسد صلاۃ نہیں؟ یہ مسئلہ فقہاء نے طے کر دیا ہے: اگر کوئی شخص پے بہ پے تین قدم یا اس سے زیادہ چلے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ اور تین قدم سے کم چلے یا چار پانچ قدم چلے مگر وقفہ وقفہ سے چلے تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ فرض نماز کے لئے بھی یہی حکم ہے اور نفل نماز کے لئے بھی۔ مگر چونکہ فرض نماز اللہ تعالیٰ کے دربار کی خاص حاضری ہے اس لئے اس میں تھوڑا بھی نہیں چلنا چاہئے اور نفل نماز خصوصی معاملہ ہے اس لئے اس میں تھوڑا چلنے کی گنجائش ہے۔ اسی فرق کا لحاظ کر کے امام ترمذی رحمہ اللہ نے عنوان میں نفل نماز کی قید لگائی ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ ازواج مطہرات کے حجرے ساتھ ساتھ تھے اور حضرت عائشہ کے کمرے سے لگا ہوا کمرہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا تھا۔ اور یہ سب گھر حضور اکرم ﷺ نے بنائے تھے اور آپؐ نے ہر حجرہ میں دو دروازے رکھے تھے ایک مسجد کی جانب کھلتا تھا دوسرا باہر سڑک کی جانب۔ عام استعمال میں وہی دروازہ آتا تھا، مسجد کی طرف کا دروازہ صرف آپؐ کے آنے جانے کے لئے تھا۔ اور تمام حجروں کے درمیان کھڑکی (چھوٹا دروازہ) تھی جس سے ایک کمرہ سے دوسرے کمرہ میں آنا جانا ہوتا تھا۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ سے لگا ہوا ایک طرف حضرت حفصہ کا حجرہ تھا اور دوسری جانب حضرت فاطمہ کا۔ آپؐ نے بعد میں حضرت فاطمہؓ کی طرف جو کھڑکی تھی وہ بند کر دی تھی اور حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کے حجروں کے درمیان جو کھڑکی تھی وہ جانب جنوب تھی یعنی قبلہ کی جانب میں تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ کہیں گئی تھیں، آپؐ گھر میں تنہا تھے اور دروازہ بند کر کے نماز پڑھ رہے تھے جب حضرت عائشہ واپس آئیں تو دروازہ بند پایا انھوں نے خیال کیا کہ آپؐ سو گئے ہیں، دروازہ کھٹکھٹانا مناسب نہیں۔ انھوں نے سوچا کہ حضرت حفصہ کے گھر میں جو کھڑکی ہے اس سے اپنے حجرہ میں چلی جائیں، مگر اتفاق سے وہ بھی بند تھی، جب حضرت عائشہ نے اس کو دھکا دیا تو آپؐ نے قبلہ کی طرف بڑھ کر اس کو کھول دیا، آپؐ قریب ہی نماز پڑھ رہے تھے، پھر واپس اپنی جگہ لوٹ گئے، اور نماز میں مشغول رہے۔ باب میں جو حدیث ہے اس میں یہی واقعہ ہے۔

[۳۰٦] باب مايجوز من المشي والعمل في صلاة التطوع

[٦٠٢-] حدثنا أبو سَلَمَةَ يحيىَ بنُ خَلَفٍ، نا بِشْرُ بنُ المُفَضَّلِ، عن بُرْدِ بنِ سِنَانٍ، عن الزُّهْرِيِّ، عن عُرْوَةَ، عن عائشةَ، قالتْ: جِئْتُ ورسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يُصَلِّى في البيتِ، والبابُ عليهِ مُغْلَقٌ، فَمَشَى حتى فَتَحَ لى، ثُمَّ رَجَعَ إلى مَكَانِهِ، وَوَصَفَتِ البابَ في القِبْلَةِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ.

ترجمہ: حضرت عائشہ آئیں درانحالیکہ رسول اللہ ﷺ گھر میں نماز پڑھ رہے تھے اور دروازہ اندر سے بند تھا (مراد وہ کھڑکی ہے جو ان کے اور حضرت حفصہ کے حجروں کے درمیان تھی) پس آپؐ چلے یہاں تک کہ دروازہ کھول دیا، پھر اپنی جگہ واپس چلے گئے، اور حضرت عائشہ نے دروازہ قبلہ کی جانب میں بیان کیا۔

بابُ ماذُكِرَ فِيْ قِرَاءَةِ سُوْرَتَيْنِ فِيْ رَكْعَةٍ

ایک رکعت میں دو سورتیں ملانے کا بیان

فرض نماز میں بھی اور نفل نماز میں بھی ایک رکعت میں دو یا زیادہ سورتیں جمع کرنا جائز ہے۔ اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ البتہ دو باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ ایک: دونوں سورتوں کے درمیان جہراً بسم اللہ پڑھنی چاہئے، بسم اللہ سورتوں کے درمیان فصل کرنے ہی کے لئے نازل ہوئی ہے اور اسی مقصد سے قرآن میں ہر دو سورتوں کے درمیان لکھی گئی ہے، دوسرے: اترتی ہوئی سورتیں ملانی چاہئیں چڑھتی ہوئی سورتیں جمع نہ کرے، مثلاً پہلے سورۃ الفیل پھر سورۃ الاخلاص پڑھے اس کا برعکس نہ کرے، اس لئے کہ نماز میں اترتی ہوئی سورتیں پڑھنا واجب ہے۔ اور سورتوں کے مضامین میں مناسبت کا خیال رکھے تو نورٌ علی نور۔

باب میں یہ واقعہ ہے کہ کسی طالب علم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ سورۂ محمد (آیت ۱۵) کو مِن ماءٍ غَيْرِ آسن ہمزۃ کے ساتھ پڑھتے ہیں یا ی کے ساتھ من غیر یَاسِنٍ؟ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: کیا تو نے اس کے علاوہ سارا قرآن پڑھ لیا ہے جو اتنی باریک بات پوچھتا ہے؟ ابو وائل نے جواب دیا: جی ہاں! میں سارا قرآن یاد کر چکا ہوں اور اتنا پکا یاد کر لیا ہے کہ ایک رکعت میں تمام مفصلات (سورۂ ق سے آخر تک سوا چار پارے) پڑھتا ہوں، یہ سن کر حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: پڑھتا ہوگا، عورتیں جس طرح چاولوں میں سے کنکر چنتی ہیں یا کھجور کے ڈھیر میں سے جس طرح بوسیدہ کھجوریں چنی جاتی ہیں اس طرح پڑھتا ہوگا؟! پھر فرمایا: رسول اللہ ﷺ تہجد میں ایک رکعت میں دو دو سورتیں ملاتے تھے، اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کونسی سورتیں ملاتے تھے (یعنی تو کہہ رہا ہے کہ میں تمام مفصلات ایک

رکعت میں پڑھتا ہوں، پس تیرا یہ عمل آنحضور ﷺ کے عمل کے خلاف ہے) ابن مسعودؓ چونکہ اس وقت ناراض تھے اس لئے آگے سوال کرنے کی کسی میں ہمت نہ ہوئی، مگر تلامذہ نے علقمہ سے کہا: کوئی مناسب موقع دیکھ کر حضرت سے دریافت کرنا کہ رسول اللہ ﷺ کونسی سورتیں ملاتے تھے؟ جب علقمہ نے دریافت کیا تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ بیس سورتیں ملاتے تھے۔ اور فلاں فلاں سورتیں ایک ایک رکعت میں پڑھتے تھے (ان سورتوں کی تفصیل ابو داؤد (حدیث ۱۳۹۶) باب تحزیب القرآن میں ہے)

[۳۰۷] باب ما ذُكر في قراءة سورتين في ركعة

[۶۰۳-] حدثنا محمودُ بنُ غَيلانَ، نا أبو داوٗد، قال: أنبأنا شُعْبَةُ، عن الأعْمَشِ، قال: سَمِعْتُ أبَا وَائِلٍ، قال: سَأَلَ رَجُلٌ عبدَ اللهِ عن هذا الحَرْفِ: غَيْرِ آسِنٍ أوياسِنٍ؟ قال: كُلَّ القُرْآنِ قَرَأْتَ غَيْرَ هذا؟ قال نعم! قال: إنَّ قَوْمًا يَقْرَأُوْنَهُ يَنْثُرُوْنَهُ نَثْرَ الدَّقَلِ، لايُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ، إنِّيْ لَأَعْرِفُ السُّوَرَ النَّظَائِرَ الَّتِيْ كان رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَقْرِنُ بَيْنَهُنَّ، فَأَمَرْنَا عَلْقَمَةَ، فَسَأَلَهُ فقال: عِشرونَ سُوْرَةً مِنَ المُفَصَّلِ، كانَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم يَقْرِنُ بَيْنَ كلِّ سورَتَيْنِ في كُلِّ رَكْعَةٍ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: ابو وائل کہتے ہیں: ایک شخص (نہیک بن سنان بجلی) نے آیت کریمہ ﴿مِنْ مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ﴾ [محمد ۱۵] کے بارے میں پوچھا کہ آسن ہمزہ کے ساتھ ہے یا یَاسِنٍ: ی کے ساتھ؟ ابن مسعودؓ نے فرمایا: کیا تو نے اس کے علاوہ سارا قرآن پڑھ لیا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! حضرت ابن مسعود نے فرمایا: بیشک کچھ لوگ قرآن پڑھتے ہیں، پھینکتے ہیں اس کو بوسیدہ کھجوروں کے پھینکنے کی طرح، نہیں بڑھتا قرآن ان کی ہنسلیوں سے یعنی دل اثر قبول نہیں کرتا (حدیث میں اختصار ہے تفصیلی واقعہ جو مسلم کی روایت میں آیا ہے اوپر تحریر کیا ہے) بیشک میں جانتا ہوں ان سورتوں کو جو ایک دوسرے کی نظیر ہیں، جن کو رسول اللہ ﷺ ملایا کرتے تھے، پس ہم نے علقمہ کو حکم دیا، پس انھوں نے ابن مسعود سے پوچھا تو آپؓ نے فرمایا: مفصلات میں سے بیس سورتیں ہیں۔ نبی ﷺ دو دو سورتوں کو ملایا کرتے تھے ایک رکعت میں (نظائر: نظیر کی جمع ہے: وہ سورتیں جن کا مضمون ملتا جلتا ہوان کو ایک رکعت میں ملاتے تھے)

بابُ مَاذُكِرَ فِي فَضْلِ المَشْيِ إِلَى المَسْجِدِ، وَمَا يُكْتَبُ لَهُ مِنَ الأَجْرِ فِي خُطَاهُ

مسجد جانے کی فضیلت اور ہر قدم پر ملنے والا اجر وثواب

جب آدمی نماز پڑھنے کے لئے گھر سے نکلتا ہے اور دوسرا کوئی مقصد نہیں ہوتا ہے تو ہر قدم پر جسے وہ اٹھاتا ہے ایک

نیکی لکھی جاتی ہے اور ہر قدم پر جسے وہ رکھتا ہے ایک گناہ معاف ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب بندہ وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے پھر نماز کے لئے نکلتا ہے نہیں نکالتا اس کو یا فرمایا: نہیں کھڑا کرتا اس کو مگر یہی کام (یعنی مسجد جانے ہی کے لئے گھر سے نکلتا ہے دوسرا کوئی مقصد نہیں ہوتا) تو نہیں اٹھاتا وہ کوئی قدم مگر اللہ تعالیٰ اس قدم کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بلند فرماتے ہیں اور اس قدم کی وجہ سے اس کا ایک گناہ معاف فرماتے ہیں''

تشریح: ایک زمانہ تک میرا خیال تھا کہ اس حدیث میں وضو کی قید بمنزلہ شرط ہے، یعنی مذکورہ ثواب اسی صورت میں حاصل ہوگا جبکہ وضو کرکے مسجد جائے، اگر بے وضو گھر سے نکلا ہے، چاہے مسجد میں جانے ہی کے لئے نکلا ہو: مذکورہ ثواب حاصل نہیں ہوگا، چنانچہ طالب علمی کے زمانہ سے میرا معمول یہ ہے کہ میں گھر سے وضو کرکے مسجد جاتا ہوں، طالب علمی کے زمانہ میں بھی کمرہ سے وضو کرکے جاتا تھا۔ پھر میں نے علامہ انور شاہ صاحبؒ کی یہ صراحت پڑھی کہ حدیث میں وضو کی قید عربوں کے عرف کے اعتبار سے ہے۔ چونکہ عربوں کی مسجدوں میں وضو کا انتظام نہیں ہوتا لوگ گھر سے وضو کرکے آتے ہیں اس لئے حدیث میں یہ قید ہے (فیض الباری ۲: ۷۳) اس لئے میرا خیال بدل گیا مگر طالب علمی کے زمانہ سے جو عادت پڑی ہے وہ آج بھی باقی ہے، میں اب بھی گھر سے وضو کرکے مسجد جاتا ہوں۔

[۳۰۸] باب ما ذُكر في فضل المَشْيِ إلى المسجد وما يُكْتَبُ له من الأجر في خُطَاهُ

[٦٠٤-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلاَنَ، نا أبو داوٗد، قال: أَنْبَأَنَا شُعْبَةُ، عن الأَعْمَشِ، سَمِعَ ذَكْوَانَ، عن أبي هريرةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: " إِذَا تَوَضَّأَ الرجلُ فَأَحْسَنَ الوُضُوْءَ، ثم خَرَجَ إلى الصَّلاَةِ لاَ يُخْرِجُهُ أَوْ قَالَ: لاَيُنْهِزُهُ إِلاَّ إِيَّاهَا، لم يَخْطُ خُطْوَةً إِلاَّ رَفَعَهُ اللّٰهُ بِها دَرَجَةً، وحَطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وضاحت: عنوان میں دونوں جملوں کے درمیان واو عطف تفسیری ہے یعنی دونوں جملوں کا ایک ہی مطلب ہے ترجمہ ہے: اس حدیث کا تذکرہ جو مسجد جانے کی فضیلت میں آئی ہے اور اس میں یہ مضمون آیا ہے کہ مسجد جانے والے کے لئے اس کے قدموں پر کیا ثواب لکھا جاتا ہے۔

بابُ ماذُكِرَ في الصَّلاَةِ بَعْدَ المَغْرِبِ في البَيْتِ أَفْضَلُ

مغرب کے بعد کی سنتیں گھر میں پڑھنا افضل ہے

پہلے یہ مسئلہ گذر چکا ہے کہ سنن مؤکدہ اور نوافل گھر میں پڑھنا افضل ہے یا مسجد میں؟ مغرب کی سنتوں کا بھی وہی

حکم ہے، ان کا کوئی علحدہ حکم نہیں، اس لئے یہاں صرف حدیث سمجھ لی جائے۔ آنحضور ﷺ نے ایک مرتبہ قبیلہ بنی عبدالاشہل کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد صحابہ مسجد ہی میں سنتیں پڑھنے لگے، آپؐ نے فرمایا: ''لوگو! یہ نماز گھروں میں پڑھو'' امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ قولی حدیث صحیح نہیں، صحیح حدیث ابن عمرؓ کی ہے جو فعلی ہے اور بخاری میں ہے کہ نبی ﷺ مغرب کے بعد اپنے گھر میں دو سنتیں پڑھتے تھے ــــــ اور مسجد میں بھی سنتیں پڑھنا جائز ہے، حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مغرب پڑھی، پھر مسجد ہی میں آپؐ برابر نماز پڑھتے رہے یہاں تک کہ عشاء کی نماز پڑھی۔ ظاہر ہے آپؐ نے اس دن مغرب کے بعد کی سنتیں بھی مسجد ہی میں پڑھی ہونگی۔ پس مغرب کی سنتیں اور دوسری سنتیں مسجد میں پڑھنا جائز ہے (حضرت حذیفہ کی حدیث مسند احمد میں ہے اور اس کی سند اچھی ہے)

[۳۰۹] باب ما ذُکر فی الصلاۃ بعد المغرب فی البیت أفضل

[۶۰۵-] حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا إبراهیمُ بنُ أبی الوَزِیْرِ، نا محمدُ بنُ موسیَ، عن سَعْدِ بنِ إسحاقَ بنِ کَعْبِ بنِ عُجْرَةَ، عن أبیهِ، عن جَدِّهِ، قال: صَلَّی النبیُّ صلی الله علیه وسلم فِیْ مَسْجِدِ بَنِی عَبدِ الْأَشْهَلِ المَغْرِبَ، فَقَامَ نَاسٌ یَتَنَفَّلُونَ، فقالَ النبیُّ صلی الله علیه وسلم: "عَلَیْکُمْ بِهٰذِهِ الصَّلَاةِ فِی الْبُیُوْتِ"

قال أبو عیسی: هٰذا حَدِیْثٌ غریبٌ لَانَعرِفُهُ إِلَّا مِنْ هٰذا الوَجْهِ، والصحیحُ ما رُوِیَ عن ابنِ عُمَرَ قال: کان النبیُّ صلی الله علیه وسلم یُصَلِّی الرَّکْعَتَیْنِ بَعْدَ المَغْرِبِ فِیْ بَیْتِهِ.

[۶۰۶-] وقد رُوِیَ عن حُذَیْفَةَ: أَنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم صَلَّی المَغْرِبَ، فَمَا زَالَ یُصَلِّی فی المَسْجِدِ حَتّٰی صَلَّی العِشَاءَ الآخِرَةَ، فَفِی هٰذا الحدیثِ دَلَالَةٌ أَنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم صَلَّی الرکعتَینِ بعدَ المغربِ فی المَسْجِدِ.

وضاحت: کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث غریب ہے اس لئے کہ اس کی یہی ایک سند ہے، مگر حدیث فی نفسہ کیسی ہے؟ یہ بات امام ترمذیؒ نے بیان نہیں کی۔ یہ حدیث اعلی درجہ کی صحیح تو نہیں ہے اس لئے کہ اسحاق بن کعب ہلکے درجہ کے راوی ہیں، مگر وہ ضعیف بھی نہیں، پس یہ حدیث امام ترمذی والی حسن ہے۔ واللہ اعلم

بابٌ فی الإغتِسَالِ عند ما یُسْلِمُ الرَّجُلُ

اسلام قبول کرنے کے بعد غسل کرنے کا بیان

امام اعظم اور امام شافعی رحمہما اللہ فرماتے ہیں: اگر نو مسلم نے جنابت کی حالت میں اسلام قبول کیا ہے تو مسلمان

ہونے کے بعد اس پر غسل فرض ہے۔ اور اگر نومسلم اسلام قبول کرتے وقت جنبی نہیں تھا تو غسل کرنا مستحب ہے، اور کپڑے دھونا اور بال کٹوانا بھی مستحب ہے، البتہ ختنہ کرانا واجب ہے۔ اور امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں: نومسلم خواہ جنبی ہو یا پاک اسلام قبول کرنے کے بعد اس پر غسل فرض ہے۔

حدیث: قیس بن عاصم رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے تو نبی ﷺ نے ان کو بیری کے پانی سے غسل کرنے کا حکم دیا۔

تشریح: امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ نے امر کو وجوب کے لئے لیا ہے۔ اور امام اعظم اور امام شافعی فرماتے ہیں: حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد مشرف باسلام ہوئے، آپؐ نے کسی کو غسل کا حکم نہیں دیا، صرف قیس بن عاصم کو یہ حکم دیا۔ اگر نومسلم پر غسل واجب ہوتا تو آپؐ ہر مسلمان ہونے والے کو یہ حکم دیتے، اور اس سلسلہ کی روایات درجۂ تواتر تک پہنچ جاتیں۔ معلوم ہوا کہ حدیث مذکور میں امر استحباب کے لئے ہے وجوب کے لئے نہیں ہے —— اور جاننا چاہئے کہ پرانے زمانہ میں صابن نہیں تھا اور تھا بھی تو ہر کسی کو میسر نہیں تھا۔ لوگ بدن کا میل صاف کرنے کے لئے مختلف چیزیں استعمال کرتے تھے، کوئی اُشنان مٹی بدن پر ملتا تھا، کوئی رِیہ مٹی جن سے دھوبی کپڑے صاف کرتے ہیں استعمال کرتا تھا، کوئی ریٹھے کا پھل پانی میں بھگو کر استعمال کرتا تھا، کوئی شریفے کے بیج کوٹ کر اور پانی میں بھگو کر استعمال کرتا تھا کوئی بیری کے پتے پانی میں ڈال کر خوب پکاتا پھر اس کا زُلال استعمال کرتا۔ اب صابن آگیا ہے اور صابن میل کچیل صاف کرنے میں ان سب سے اچھا ہے اس لئے اب صابن سے نہانا کافی ہے۔ اور یہی مسئلہ میت کو غسل دینے کا بھی ہے۔ میت کو صرف صابن سے نہلانا کافی ہے بلکہ بدرجہ اولیٰ کافی ہے۔

[۳۱۰] باب في الاغتسال عند ما يُسْلِمُ الرجلُ

[۶۰۷-] حدثنا بُنْدَارٌ، نا عبدُ الرحمنِ بنُ مَهْدِيٍّ، نا سُفيانُ، عن الأَغَرِّ بنِ الصَّبَّاحِ، عن خَلِيْفَةَ بنِ حُصَيْنٍ، عن قَيْسِ بنِ عاصِمٍ: أَنَّهُ أَسْلَمَ فَأَمَرَهُ النبيُّ صلى الله عليه وسلم أَنْ يَغتَسِلَ بِمَاءٍ وِسْدرٍ.

وفي الباب: عن أبي هريرةَ، قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ لاَنَعرِفُهُ إِلاَّ مِنْ هٰذا الوَجْهِ.

والعَمَلُ عليهِ عندَ أهلِ العلمِ يَسْتَحِبُّوْنَ لِلرَّجُلِ إِذَا أَسْلَمَ أَنْ يَغْتَسِلَ وَيَغْسِلَ ثِيَابَهُ.

ترجمہ: اہل علم کے نزدیک اس حدیث پر عمل ہے وہ آدمی کے لئے پسند کرتے ہیں جبکہ وہ اسلام قبول کرے کہ وہ نہائے اور اپنے کپڑے دھوئے۔

بابُ مَاذُكِرَ مِنَ التَّسْمِيَةِ فِيْ دُخُوْلِ الخَلاَءِ

بسم اللہ کہہ کر بیت الخلاء جانے کا بیان

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنات کی آنکھوں اور انسان کی شرم گاہ کے درمیان پردہ یہ ہے کہ جب وہ بیت الخلاء جائے تو بسم اللہ کہے''

تشریح: یہ حدیث محمد بن حمید الرازی کی وجہ سے بے حد ضعیف ہے اور یہ حدیث مسند احمد اور ابن ماجہ میں بھی ہے مگر اس کا شاہد موجود ہے وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اور طبرانی کی معجم صغیر میں ہے، اور اس کی سند اچھی ہے اس کے الفاظ بھی تقریباً یہی ہیں —— اور جاننا چاہئے کہ ایک دعا کتاب کے شروع میں گذری ہے: اللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ دونوں دعائیں پڑھ سکتا ہے یعنی صرف بسم اللہ کہنا بھی کافی ہے اور دونوں کو جمع کرے تو اور بھی بہتر ہے۔

[۳۱۱] بابُ ما ذكر من التسمية في دخول الخلاء

[۶۰۸-] حدثنا محمدُ بْنُ حُمَيْدٍ الرَّازِيُّ، نا الحَكَمُ بْنُ بَشِيْرِ بنِ سَلْمَانَ، نا خَلاَّدُ الصَّفَّارُ، عن الحَكَمِ بنِ عبدِ اللّٰهِ النَّصْرِيِّ، عن أبي إسحاق، عن أبي جُحَيْفَةَ، عن عليِّ بنِ أبي طَالِبٍ رضي الله عنه، أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال: ''سَتْرُ مَا بَيْنَ أَعْيُنِ الجِنِّ وَعَوْرَاتِ بَنِيْ آدَمَ إِذَا دَخَلَ أَحَدُهُمُ الخَلاَءَ، أَنْ يَقُوْلَ: بِسمِ اللّٰهِ''

قال أبو عيسى: هٰذا حديثٌ غريبٌ لاَ نَعرِفُهُ إِلاَّ مِنْ هٰذا الوَجْهِ وإِسْنَادُهُ لَيْسَ بِذَاكَ، وقد رُوِيَ عن أنسٍ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم شَيْئٌ في هٰذَا.

نوٹ: ابن ماجہ میں بھی حدیث کی یہی سند ہے (حدیث ۲۹۷)

بابُ ماذُكِرَمِنْ سِيْمَاءِ هٰذِهِ الأُمَّةِ مِنْ آثَارِ السُّجُوْدِ والطُّهُوْرِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

قیامت کے دن سجدوں اور پاکی کے آثار سے اس امت کی علامتِ خاص

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت قیامت کے دن سجدوں (نمازوں) کی وجہ سے روشن چہرہ وضو کی وجہ سے روشن اعضاء ہوگی''

لغات: السِّيْمَا اور السِّيْمَاءُ: دونوں کے معنی ہیں: علامت، خاص نشانی (یونیفارم)............ اور غُرَّۃ کے معنی ہیں

پیشانی کی سفیدی، اور غُرٌّ اور أغرُّ کے معنی ہیں روشن پیشانی، اسی لئے مہینہ کی پہلی تاریخ کو غُرَّۃ الشھر کہتے ہیں، اس لئے کہ نیا چاند مہینہ کی پیشانی کو روشن کرتا ہے، پہلے راتیں تاریک تھیں اب تھوڑی روشنی ہوئی .... اور مُحَجَّلُوْن: تحجیل سے اسم مفعول ہے اس کے معنی ہیں: وہ گھوڑا جس کا رنگ سفیدی کے علاوہ ہو، مگر اس کے چاروں پیر سفید ہوں۔

اور حدیث کا مطلب: یہ ہے کہ قیامت کے دن اس امت کی امتیازی نشانی یہ ہوگی کہ اس کے وہ اعضاء جو سجدے میں استعمال ہوتے ہیں اور اس کے وہ اعضاء جو وضو میں دھوئے جاتے ہیں نماز اور وضو کی وجہ سے خاص طرح سے روشن اور چمکدار ہونگے، اور ہر شخص پہچان لے گا کہ یہ آخری پیغمبر کا امتی ہے۔ اور سابقہ امتوں میں بھی نماز اور وضو رہے ہیں پس ان کو بھی ان دونوں عملوں کا فائدہ پہنچے گا، مگر وہ فائدہ کسی اور شکل میں ان کو حاصل ہوگا، اس حدیث میں جس فائدہ کا بیان ہے وہ اس امت کی خصوصیت ہے۔

اس کے بعد تین باتیں جاننی چاہئیں:

پہلی بات: اس باب میں جو حدیث ہے وہ اعلی درجہ کی صحیح ہے، مگر حضرت عبداللہ بن بسرؓ کی روایت سے غریب (انوکھی) ہے۔ مسلم میں یہ حدیث ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے اور اس میں ایک ہی مضمون ہے۔ بخاری شریف (حدیث ۱۳۶) کے الفاظ ہیں: إن أُمتی یُدعَونَ یوم القیامۃ غُرًّا مُحَجَّلِیْنَ مِنْ آثار الوضوء، فمن استطاع منکم أن یُطیل غرتہ فلیفعل۔ ترجمہ: بیشک میری امت قیامت کے دن بلائی جائے گی درانحالیکہ وہ روشن پیشانی، روشن اعضاء ہوگی وضو کے اثر سے، پس جو شخص تم میں سے طاقت رکھتا ہے کہ اپنی پیشانی کی روشنی کو دراز کرے پس چاہئے کہ وہ کرے، یعنی خوب اہتمام سے وضو کرے، سجدوں کے اثر سے پیشانی کی روشنی کا مضمون اس حدیث میں نہیں ہے۔ یہ مضمون صرف باب کی حدیث میں ہے جو حضرت عبداللہ بن بسرؓ سے مروی ہے اس لئے یہ حدیث لحال الاسناد غریب ہے۔

دوسری بات: اس حدیث میں دونوں مضمونوں میں سے آدھا آدھا مضمون بیان کیا گیا ہے اور باقی آدھا فہم سامع پر اعتماد کر کے چھوڑ دیا گیا ہے۔ فرمایا: میری امت قیامت کے دن سجدوں کی وجہ سے روشن پیشانی ہوگی اور صرف پیشانی ہی نہیں بلکہ دوسرے وہ اعضاء بھی جو سجدے میں استعمال ہوتے ہیں روشن ہونگے، یہ آدھا مضمون چھوڑ دیا گیا ہے، کیونکہ وہ اگلے مضمون کے ساتھ مقابلہ کرنے سے سمجھ میں آجاتا ہے اور ارشاد فرمایا: میری امت وضو کی وجہ سے روشن اعضاء ہوگی۔ یعنی ان کے ہاتھ پاؤں چمکتے ہونگے، اور صرف اعضاء ہی نہیں چہرہ اور سر بھی روشن ہوگا، یہ آدھا مضمون یہاں چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ وہ پہلے مضمون کے ساتھ مقابلہ کرنے سے سمجھ میں آجاتا ہے اور جو اعضاء سجدے میں بھی استعمال ہوتے ہیں اور وضو میں بھی دھوئے جاتے ہیں یعنی چہرہ، کفین اور قدمین ان میں دونوں عبادتوں کی برکتیں ظاہر ہونگی اور ان اعضاء کی چمک دوبالا ہوگی۔

تیسری بات: اس حدیث میں جو دوسرا مضمون ہے یعنی سجدوں کی وجہ سے چہروں کی چمک۔ یہ مضمون قرآن

کریم میں بھی آیا ہے۔ سورۂ فتح (آیت ۲۹) میں ہے: ﴿سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ﴾ یعنی ان کے چہروں میں سجدوں (نمازوں) کے اثر سے امتیازی علامت ہوگی۔ یہ صحابہ کا اور مؤمنین کا تذکرہ ہے اور ان کا یہ حال دنیا میں بھی ہوتا ہے اور قیامت کے دن بھی ہوگا۔ نماز اور سجدے کے مخصوص آثار دنیا میں بھی ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی وہ نمایاں ہونگے۔ البتہ آیتِ پاک میں وہ نشان مراد نہیں جو پیشانی میں پڑجاتا ہے یا ڈال لیا جاتا ہے۔ بلکہ نیک چلنی اور شب بیداری کے انوار و تجلیات مراد ہیں۔ آیتِ پاک میں وجوہ ہے جِبَاہ نہیں ہے۔ سائب بن یزید جو جلیل القدر تابعی ہیں ان کے پاس ایک شخص آیا جس کے ماتھے پر سجدہ کا نشان تھا آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا: بخدا! اس نے اپنا چہرہ بگاڑ لیا۔ سنو! بخدا! قرآن میں جو سیماء ہے اس سے یہ ماتھے کا نشان مراد نہیں اور فرمایا: میں اسی سال سے سجدہ کرتا ہوں مگر میری آنکھوں کے درمیان سجدوں کا کوئی نشان نہیں (الدر المنثور ۸۲:۶) اور یہ بات میں اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ بعض طلبہ کو غلط فہمی ہے وہ ماتھے کے اس نشان کو آیت کا مصداق سمجھتے ہیں پھر بزرگ بننے کے لئے معلوم نہیں گرم پتھر پر ماتھا رگڑتے ہیں یا کیا کرتے ہیں، ہتھیلی بھر کالا کالا داغ پیدا کر لیتے ہیں۔ اس حماقت کی ضرورت نہیں۔ تمام مفسرین متفق ہیں کہ یہ نشانی آیت کا مصداق نہیں۔

[۳۱۲] بابُ ما ذكر من سِيمَاءِ هذه الأمةِ من آثار السجود والطهور يوم القيامة

[۶۰۹-] حدثنا أبو الوليدِ الدِّمَشْقِيُّ، نا الوَلِيْدُ بنُ مُسْلِمٍ قال: قال صَفْوَانُ بنُ عَمْرٍو، أَخْبَرَنِيْ يَزِيْدُ بنُ خُمَيْرٍ، عن عبدِ اللهِ بنِ بُسْرٍ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: " أُمَّتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرٌّ مِنَ السُّجُوْدِ مُحَجَّلُوْنَ مِنَ الْوُضُوْءِ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ غريبٌ من هٰذا الوجهِ مِنْ حَديثِ عبدِ اللهِ بنِ بُسْرٍ.

فائدہ: غُرّ اور محجلون کے درمیان حرف عطف نہیں ہے، کیونکہ دونوں جملوں میں غایت اتحاد ہے۔

بابُ ما يُسْتَحَبُّ مِنَ التَّيَمُّنِ في الطُّهُوْرِ

پاکی میں دائیں طرف سے ابتداء کرنے کا بیان

وضو اور غسل میں جہاں بھی دایاں بایاں ہے وہاں پہلے دایاں دھوئے پھر بایاں۔ اور جہاں دایاں بایاں نہیں جیسے چہرہ وہاں جو چاہے کرے۔

حدیث: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ دائیں طرف سے ابتداء کرنے کو پسند فرماتے تھے، اپنے وضو میں (لفظ طہور اگرچہ عام ہے وضوء و غسل دونوں کو شامل ہے، مگر عام طور پر اس لفظ سے وضو مراد لی جاتی

ہے) جب وضو فرماتے تھے اور تیل کنگھا کرنے میں جب (سر میں یا ڈاڑھی میں) تیل کنگھا کرتے تھے (یعنی پہلے دائیں جانب پھر بائیں جانب کنگھا کرتے تھے) اور چپل پہنے میں جب چپل پہنتے تھے (یہ تین چیزیں بطور مثال ہیں۔ علماء نے اسی سے قاعدہ کلیہ بنایا ہے کہ ہر اچھا کام دائیں طرف سے کرنا چاہئے)

[۳۱۳] بابُ ما یستحب من التیمن فی الطهور

[۶۱۰-] حدثنا هَنَّادٌ، نا أبو الأحوصِ، عن أشعثَ بنِ أبی الشَّعْثَاءِ، عن أبیه، عن مَسْرُوْقٍ، عن عائشةَ، قالتْ: إنَّ رسولَ الله صلی الله علیه وسلم کان یُحِبُّ التَّیَمُّنَ فی طُهُوْرِهِ إذَا تَطَهَّرَ، وفی تَرَجُّلِهِ إذَا تَرَجَّلَ، وفی انْتِعَالِهِ إذَا انْتَعَلَ.

وأبو الشَّعْثَاءِ: اسْمُهُ سُلَیْمُ بنُ أَسْوَدَ الْمُحَارِبِیُّ، قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

لغت: تَرَجَّلَ شَعْرَه: بالوں میں کنگھا کرنا۔

بابُ ذِکْرِ قَدْرِ مَا یُجْزِئُ مِن المَاءِ فی الوُضُوْءِ

وضوء میں کتنا پانی کافی ہے؟

کتاب الطہارۃ میں یہ مسئلہ گذر چکا ہے کہ وضوء و غسل میں پانی کی ایسی کوئی مقدار جس سے کم یا زیادہ جائز نہ ہو شریعت نے متعین نہیں کی۔ حسب ضرورت وضوء و غسل میں پانی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ البتہ دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے: ایک: اسراف (فضول خرچی) نہ کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر جاری نہر پر وضو کرے تو بھی اسراف نہ کرے، دوسری بات: پانی استعمال کرنے میں بہت زیادہ بخیلی بھی نہ کرے۔

باب میں ایک قولی روایت ہے: نبی ﷺ نے فرمایا: ''وضو میں دو رطل پانی کافی ہے'' (ایک رطل ۴۰۷ گرام کا ہوتا ہے) یہ روایت شریک بن عبداللہ نخعی کی ہے جو کثیر الخطاء ہیں۔ اور امام شعبہ کی روایت فعلی ہے کہ نبی ﷺ ایک مکّوک سے وضو اور پانچ مکوک سے غسل فرمایا کرتے تھے۔ مکوک: ایک پیمانہ ہے جس کی مقدار مختلف ملکوں میں مختلف تھی۔ امام نووی اور علامہ طاہر پٹنی رحمہما اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث میں مکوک سے مراد مدّ (دو رطل) ہے۔

[۳۱۴] بابُ ذِکْرِ قدرِ ما یُجْزِئُ من الماء فی الوضوء

[۶۱۱-] حدثنا هَنَّادٌ، نا وکیعٌ، عن شریکٍ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ عیسی، عن ابنِ جَبْرٍ، عن أنسِ بنِ مالکٍ: أنَّ رسولَ الله صلی الله علیه وسلم قال: "یُجْزِیءُ فی الوُضُوْءِ رِطْلَانِ مِنْ مَاءٍ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ غريبٌ لا نَعْرِفُهُ إلاَّ مِنْ حديثِ شَرِيكٍ على هٰذا اللَّفظِ.

ورَوَى شُعْبَةُ عن عبدِ اللّٰهِ بنِ عبدِ اللّٰهِ بنِ جَبْرٍ، عن أنسِ بنِ مالكٍ: أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كان يَتَوَضَّأُ بِالْمَكُّوْكِ، ويَغْتَسِلُ بِخَمْسَةِ مَكَاكِيَّ.

لغت: مكّوك: بروزن تنّور ہے اور مکاکِیّ: دراصل مکاکیك تھا، آخری کاف کو یاء سے بدل کر ی میں ادغام کیا ہے۔

بابُ مَا ذُكِرَ فِيْ نَضْحِ بَوْلِ الغُلاَمِ الرَّضِيْعِ

شیر خوار بچے کے پیشاب پر چھینٹادینے کا بیان

یہ مسئلہ کتاب الطہارۃ میں گذر چکا ہے۔ وہاں حضرت ام قیس کی حدیث ذکر کی تھی اور یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی ہے۔ شاید اس حدیث کے وقف ورفع میں جو اختلاف ہے اس سے طالب علم کو واقف کرنے کے لئے یہ باب دوبارہ قائم کیا ہے۔ واللہ اعلم

[۳۱۵] بابُ ما ذُكِر في نَضْحِ بولِ الغلامِ الرَّضيع

[۶۱۲-] حدثنا بُندارٌ، نا مُعَاذُ بنُ هِشَامٍ، قال: حَدَّثَنِيْ أبي، عن قَتَادَةَ، عن أبي حَرْبِ بنِ أبي الأَسْوَدِ، عن أبيهِ، عن عليِّ بنِ أبي طالبٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قال في بَوْلِ الغُلاَمِ الرَّضِيْعِ: "يُنْضَحُ بَوْلُ الغُلاَمِ، وَيُغْسَلُ بَوْلُ الجَارِيَةِ". قال قَتَادَةُ وَهٰذَا مَالَمْ يَطْعَمَا، فَإِذَا طَعِمَا غُسِلاَ جَمِيْعًا.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ، رَفَعَ هِشَامٌ الدَّسْتَوَائِيُّ هذا الحديثَ عن قَتَادَةَ، وَوَقَفَهُ سَعِيدُ بنُ أبي عَرُوْبَةَ عن قَتَادَةَ، ولَمْ يَرْفَعْهُ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے شیر خوار بچے کے پیشاب کے بارے میں فرمایا: "لڑکے کے پیشاب پر چھینٹا دیا جائے اور لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے" قتادہ کہتے ہیں: یہ فرق اس وقت تک ہے جب تک دونوں باہر کی غذا نہ لیں، پس جب دونوں باہر کی غذا لینے لگیں تو دونوں کے پیشاب کو دھویا جائے۔

یہ حدیث ہشام دستوائی اور سعید بن ابی عروبہ دونوں حضرت قتادہ سے روایت کرتے ہیں۔ اور ہشام حدیث کو مرفوع کرتے ہیں اور سعید موقوف بیان کرتے ہیں، یعنی وہ مذکورہ حدیث کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول قرار دیتے ہیں۔

بابُ مَاذُکِرَ فی الرُّخصَۃِ لِلْجُنُبِ فِی الأَکْلِ وَالنَّوْمِ إِذَا تَوَضَّأَ

جنبی کے لئے وضو کر کے کھانا پینا اور سونا جائز ہے

یہ مسئلہ بھی پہلے گذر چکا ہے کہ جنبی کے لئے افضل یہ ہے کہ وہ سونے اور کھانے پینے سے پہلے غسل کرے اور صرف وضو کرے تو بھی جائز ہے اور یہ افضیلت کا ادنی درجہ ہے۔ اور پانی کو بالکل چھوئے بغیر سونا اور کھانا پینا بھی جائز ہے۔ اور یہ صرف مباح کا درجہ ہے اس میں کوئی فضیلت نہیں۔

[۳۱۶] بابُ ما ذُکر فی الرخصۃ للجنب فی الأکل والنوم إذا توضأ

[۶۱۳-] حدثنا هَنَّادٌ، نا قَبِيْصَةُ، عن حَمَّادِ بنِ سَلَمَةَ، عن عَطَاءٍ الخُرَاسَانِيِّ، عن يَحيَى بنِ يَعْمُرَ، عن عَمَّارٍ، أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم رَخَّصَ لِلْجُنُبِ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَأْكُلَ أَوْ يَشْرَبَ أَوْ يَنَامَ أَنْ يَتَوَضَّأَ وُضُوْءَهُ لِلصَّلَاةِ. قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے جنبی کو اجازت دی: جب وہ کھانا پینا یا سونا چاہے کہ وہ نماز والی وضوء کر لے۔

بابُ ما ذُکِرَ فی فَضْلِ الصَّلَاۃِ

نماز کی فضیلت کا بیان

حدیث: کعب بن عجرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: میں تجھے اللہ کی پناہ میں دیتا ہوں (یعنی اللہ تعالیٰ تیری حفاظت کریں) ایسے امراء سے جو میرے بعد ہونگے، پس جو چھایا (یعنی بغیر بلائے پہنچا) ان کے دروازوں پر پس ان کے جھوٹ (غلط احکام) میں ہاں ملائی اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کی تو وہ میرا نہیں (یعنی میرا اس سے کوئی تعلق نہیں) اور میں اس سے نہیں، اور وہ میرے پاس (میدان حشر میں) حوض کوثر پر نہیں پہنچے گا (اور پہنچنا چاہے گا تو فرشتے دھکا دے کر ہٹا دیں گے) اور جو ان امراء کے دروازں پر چھایا یا نہیں چھایا یعنی خواہ ان کے پاس گیا یا نہیں گیا اور ان کے جھوٹ میں ہاں نہیں ملائی، اور ان کے ظلم میں ان کی مدد نہیں کی تو وہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ اور وہ عنقریب میرے پاس (میدانِ حشر میں) حوض کوثر پر آئے گا۔ اے کعب بن عجرۃ! نماز (ایمان کی) پکّی دلیل ہے، اور روزہ مضبوط ڈھال ہے۔ اور خیرات گناہوں کو بھسم کرتی ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے۔ اے کعب بن عجرۃ! بیشک شان یہ ہے کہ نہیں بڑھتا کوئی گوشت جو اُگا ہو (پیدا ہوا ہو) حرام مال سے (سُحت کے اصل معنی ہیں مونڈنا، چونکہ حرام مال آدمی کے دین کو مونڈ دیتا ہے اس لئے اس کو بھی سحت کہتے ہیں) مگر جہنم کی آگ اس

(گوشت) کی زیادہ حقدار ہے (یعنی جس بدن میں مال حرام پہنچا اس کے لئے جنت میں کوئی جگہ نہیں اس لئے کہ جنت پاک جگہ ہے اور مال حرام سے جو بدن تیار ہوتا ہے وہ ناپاک ہے، پس اس کے لئے زیادہ مناسب جگہ جہنم ہے)

تشریح: اس حدیث میں چار مضمون ہیں:

پہلا مضمون: اس دنیا میں جو معنویات ہیں وہ برزخ میں، میدانِ حشر میں اور جنت وجہنم میں پیکر محسوس اختیار کریں گے، ان کی حقیقت کے مناسب جو صورت ہوگی وہ ان کو ملے گی، جیسے بزدلی خواب میں خرگوش کی شکل میں نظر آتی ہے اس لئے کہ وہی صورت بزدلی کے مناسب ہے۔ اور لالچ خواب میں کتے کی شکل میں نظر آتی ہے کیونکہ یہی صورت حرص کے زیادہ مناسب ہے۔ اسی طرح دنیا میں جو چیزیں معنویات ہیں وہ مناسب صورت میں دوسری دنیا میں ظاہر ہونگی۔ چنانچہ حوضِ کوثر سنت نبوی کا پیکر محسوس ہے۔ اس دنیا میں جو سنتِ نبوی پر عمل پیرا ہوگا وہ حوض کوثر پر وارد ہوگا، اور جو سنت نبوی سے منہ موڑتا ہے وہ حوض کوثر پر نہیں پہنچے گا، اور اگر پہنچنے کا ارادہ کرے گا تو فرشتے دھکا دے کر ہٹا دیں گے، اور پل صراط: جو جہنم کی پیٹھ پر بچھایا جائے گا صراط مستقیم کا پیکر محسوس ہے، جو شخص دنیا میں صراط مستقیم پر گامزن ہے وہ پل صراط پر سے آسانی سے گذر جائے گا، اور جو جتنا مضبوطی سے صراط مستقیم سے چمٹا رہے گا وہ اتنا ہی جلدی صراط سے گذر جائے گا۔ اور جس نے دنیا میں صراط مستقیم اختیار نہیں کی وہ پل صراط پر سے نہیں گذر سکے گا، آنکڑے اس کو پکڑ کر کھینچ لیں گے اور جہنم میں پہنچا دیں گے۔ غرض اس دنیا میں جو معنویات ہیں اگلی دنیا میں وہ پیکر محسوس اختیار کریں گے، اس لئے ظالم حکام کی ہاں میں ہاں ملانا اور ان کی مدد کرنا چونکہ سنتِ نبوی کے خلاف ہے، اس لئے ایسے لوگ حوض کوثر کے آب شیریں سے محروم رہیں گے۔

دوسرا مضمون: امرائے سوء کی ان کے غلط احکام میں اور ان کے ظلم میں مدد (ہموائی) نہیں کرنی ہے، یہ حوض کوثر پر پہنچنے کے لئے مانع ہے، اور اس کا مدار امراء کے پاس جانے نہ جانے پر نہیں ہے بلکہ ظلم میں ان کی مدد کرنے نہ کرنے پر ہے۔

تیسرا مضمون: هو مني و أنا منه: ایک محاورہ ہے۔ حماسة (بہادرانہ کارنامے) عربی ادب کی ایک کتاب ہے جو تکمیل ادب میں پڑھائی جاتی ہے اس میں یہ واقعہ ہے کہ ایک شاعر کا اس کی پہلی بیوی سے ایک لڑکا تھا، دوسری بیوی اس لڑکے کو اچھا نہیں رکھتی تھی، شاعر نے اپنی بیوی کو نصیحت کی اور چند اشعار کہے وہ کہتا ہے:

إِنْ كُنتِ مِنِّي أَوْ تُرِيدِينَ صُحْبَتِيْ ❁ فكوني له كالسَّمْنِ رُبَّتْ لَهُ الأَدَمُ

ترجمہ: اگر تو مجھ سے ہے یعنی میرے ساتھ شیر وشکر ہو کر رہنا چاہتی ہے یا میری رفاقت چاہتی ہے یعنی نباہ کرنا چاہتی ہے تو اس لڑکے کے لئے اس گھی کی طرح ہو جا جس کے لئے کھجور کا شیرہ بھر کر کپی تیار کی گئی ہو ——— چمڑے کی کپی جب نئی ہوتی ہے تو گھی میں بو آتی ہے اس لئے اس میں کھجور کا شیرہ بھرتے ہیں تاکہ بدبو ختم ہو جائے۔ پھر اس میں گھی بھرتے ہیں، اس سے گھی میں نہ صرف یہ کہ بدبو پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ خوشبودار ہو جاتا۔ شاعر کہتا ہے اگر تو کسی بھی

درجہ میں میرے ساتھ نباہ کرنا چاہتی ہے تو تجھے اس لڑکے کے لئے اس گھی کی طرح ہوجانا چاہئے جس میں پہلے کھجور کا شیرہ بھرا گیا ہو۔شاعر نے اس شعر میں یہی محاورہ استعمال کیا ہے کہ اگر تو میرے ہم مزاج ہے اور میرے ساتھ شیر وشکر ہوکر رہنا چاہتی ہے تو جیسا میرا برتاؤ لڑکے کے ساتھ ہے تو بھی ایسا ہی برتاؤ کر، پس حضور اکرم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص امراء کے غلط فیصلوں میں ان کی ہمنوائی کرتا ہے وہ میرا ہم مزاج نہیں، اور میرا اس سے کوئی تعلق نہیں، اور جب اللہ کے رسول کسی شخص سے ایسی بے تعلقی ظاہر کریں تو اس کا ٹھکانہ جہنم کے سوا کہاں ہوسکتا ہے؟!

چوتھا مضمون: نماز برہان (پکی دلیل) ہے کہ نمازی مؤمن ہے، ایمان ایک مخفی چیز ہے اس کو کسی ظاہری علامت ہی سے پہچانا جاسکتا ہے اور وہ علامت نماز ہے۔ پہلے حدیث گذری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: إذا رَأيتُم الرجلَ يُلاَزِمُ المسجدَ فَاشهَدُوْا له بالإيمان: جب تم کسی کو دیکھو کہ وہ پانچوں وقت پابندی سے مسجد میں نماز پڑھتا ہے تو اس کے لئے ایمان کی گواہی دو، یعنی یہ عمل اس کے پکے مؤمن ہونے کی دلیل ہے اور اس کی بنیاد پر اس کے لئے مؤمن ہونے کی گواہی دی جاسکتی ہے —— اور روزہ مضبوط ڈھال ہے، آدمی کے دو دشمن ہیں: شیطان اور نفس۔روزہ دونوں سے حفاظت کرتا ہے۔شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے اور چھوٹا دشمن ہے ﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلإِنسَانِ عَدُوٌّ مُبِينٌ﴾ اور ﴿إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا﴾ اور نفس بڑا دشمن ہے۔حدیث میں ہے: إنَّ أعدیٰ عَدُوِّكَ نفسُكَ التي بين جنبيك: تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دو پہلوؤں کے درمیان ہے۔ان دونوں دشمنوں سے روزہ بچاتا ہے، یعنی نفس کے تقاضوں سے انسان جو گناہ کرتا ہے روزں کی وجہ سے ان گناہوں سے حفاظت ہوجاتی ہے۔سورۃ البقرۃ (آیت ۱۸۳) میں ہے: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ روزوں کی وجہ سے تمہارے اندر تقوی پیدا ہوگا، تم خواہش نفس سے بچ جاؤ گے اور جب بڑا دشمن رام ہوگیا تو چھوٹا دشمن خود بخود ذلیل ہوگا ——

اور خیرات گناہوں کو بھسم کرتی ہے جیسے پانی آگ کو بجھاتا ہے۔اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ تین چیزوں کو یعنی نماز، روزے اور خیرات کو لازم پکڑو، اور خیرات کا اعلی فرد زکوۃ ہے، اور حج کو اس لئے بیان نہیں کیا کہ اس کی استطاعت ہر شخص میں نہیں ہوتی، اس لئے ہر شخص کو اس کا مخاطب نہیں بنایا جاسکتا۔اور اگر کوئی کہے کہ زکوۃ کی استطاعت بھی ہر شخص میں نہیں ہوتی پھر اس کا تذکرہ کیوں کیا؟ تو جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ نے زکوۃ کا نام نہیں لیا۔ صدقہ (خیرات) فرمایا ہے اور یہ لفظ عام ہے اور چھوٹی موٹی خیراتیں ہر شخص کرسکتا ہے۔

[۲۱۷] بابُ ما ذُكر في فضلِ الصلاة

[٦١٤-] حدثنا عبدُ اللهِ بنُ أبي زِيَادٍ، نا عُبيدُ اللهِ بنُ موسى، نا غَالِبٌ أَبُو بِشرٍ، عن أَيُّوبَ بنِ عَائِذٍ الطَّائِيِّ، عن قَيْسِ بنِ مُسْلِمٍ، عن طَارِقِ بنِ شِهَابٍ، عن كَعْبِ بْنِ عُجْرَةَ، قال: قال لي رسولُ اللهِ

صلی اللہ علیہ وسلم: "أُعِيذُكَ بِاللّٰهِ يَا كَعْبَ بنَ عُجْرَةَ! مِنْ أُمَرَاءَ يكونونَ مِنْ بَعْدِي، فَمَنْ غَشِيَ أَبْوَابَهُمْ فَصَدَّقَهُمْ فِي كَذِبِهِمْ، وأَعَانَهُمْ على ظُلْمِهِمْ، فَلَيْسَ مِنِّيْ وَلَسْتُ مِنْهُ، وَلَا يَرِدُ عَلَيَّ الحَوْضَ، ومَنْ غَشِيَ أَبْوَابَهُمْ أَوْ لَمْ يَغْشَ، وَلَمْ يُصَدِّقْهُمْ فِيْ كَذِبِهِمْ، وَلَمْ يُعِنْهُمْ على ظُلْمِهِمْ، فَهُوَ مِنِّيْ وَأَنَا مِنْهُ، وَسَيَرِدُ عَلَيَّ الحَوْضَ، يَا كَعْبَ بنَ عُجْرَةَ! الصَّلَاةُ بُرْهَانٌ، والصَّوْمُ جُنَّةٌ حَصِيْنَةٌ، والصَّدَقَةُ تُطْفِيءُ الخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِيءُ الماءُ النَّارَ. يا كَعْبَ بنَ عُجْرَةَ! إِنَّهُ لَايَرْبُو لَحمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ إِلَّا كانتِ النَّارُ أَوْلٰى بِهِ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ لَانَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ هذا الوجهِ، وسَأَلْتُ محمداً عن هذا الحديثِ فَلَمْ يَعْرِفْهُ إِلَّا مِنْ حديثِ عُبيدِ اللّٰهِ بنِ موسى، واسْتَغْرَبَهُ جِدًّا. وقال محمدٌ: حدثنا ابنُ نُمَيْرٍ، عن عُبيدِ اللّٰهِ بنِ موسى، عن غالبٍ بهذا.

وضاحت: مذکورہ حدیث غریب ہے کیونکہ عبید اللہ بن موسی سے اوپر اس کی یہی ایک سند ہے، اور عبید اللہ کے استاذ غالب ابو بشر پر رافضی ہونے کا الزام تھا اور استاذ الاستاذ ایوب بن عائذ پر مرجیہ ہونے کا الزام تھا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے امام بخاری رحمہ اللہ سے پوچھا: کیا اس حدیث کی کوئی اور بھی سند ہے؟ پس انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور اس حدیث کو نہایت درجہ غریب سمجھا، یعنی اس حدیث کی کوئی دوسری سند ان کے علم میں قطعاً نہیں تھی۔ اور خود امام بخاری نے یہ حدیث ابن نمیر سے روایت کی ہے، ان کی سند بھی عبید اللہ بن موسی ہی کی ہے۔

بابٌ مِنْهُ

نماز کی فضیلت کے سلسلہ میں دوسرا باب

حدیث: حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو حجۃ الوداع کے موقع پر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اس اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے (یعنی اللہ سے اس لئے ڈرنا چاہئے کہ وہ ہمارا رب ہے، ہمیں پالتا پوستا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنا خوف کی وجہ سے نہیں ہے، جیسے سانپ، بچھو اور دشمن سے ڈرتے ہیں، بلکہ محبت کی وجہ سے ڈرنا ہے، جیسے فرمانبردار لڑکا باپ سے ڈرتا ہے۔ اطاعت شعار شاگرد استاذ سے ڈرتا ہے اور عقیدت مند مرید پیر سے ڈرتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ سے بھی ڈرنا ہے اور اللہ سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے احکام کی پیروی کی جائے۔ ان کی خلاف ورزی نہ کی جائے) اور اپنی پانچ نمازیں پڑھو (یعنی پابندی سے تمام نمازیں ادا کرو) اور اپنے مہینہ کے یعنی رمضان کے روزے رکھو، اور اپنے مالوں کی زکوۃ ادا کرو، اور اپنے معاملہ والوں کی یعنی حکام کی جن

کے سپرد تمہارے معاملات ہیں اطاعت کرو: جنت میں چلے جاؤ گے۔ یعنی یہ پانچ اعمال کرو بے خطر جنت میں پہنچ جاؤ گے، نبی ﷺ نے مختصر لفظوں میں جنت میں جانے کا فارمولہ بیان کیا ہے۔ حدیث کے راوی سلیم بن عامر نے خوشی میں حضرت ابوامامہ سے پوچھا: آپ نے یہ حدیث رسول اللہ ﷺ سے کب سنی تھی؟ ابوامامہ نے فرمایا: میں نے یہ حدیث اس وقت سنی تھی جب میری عمر تیس سال تھی ـــــــ چونکہ حضرت ابوامامہ ان کے سامنے تھے اس لئے تلامذہ سمجھ گئے کہ آپؓ نے کتنے سال پہلے یہ حدیث سنی ہے۔ مثلاً جس وقت حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی ہے ان کی عمر ستر سال تھی تو انھوں نے چالیس سال پہلے یہ حدیث سنی ہے۔ مگر ان اللہ کے بندوں نے ہمیں نہیں بتایا کہ اس وقت آپؓ کی کیا عمر تھی۔ حالانکہ انہیں یہ بتانا چاہئے تھا تاکہ ہم بھی جان لیتے کہ کتنے سال پہلے انھوں نے یہ حدیث سنی تھی۔

تشریح: حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ نے حجۃ اللہ میں تحریر فرمایا ہے کہ آخرت میں نجاتِ اوّلی کے لئے ارکانِ اربعہ: نماز، روزہ، زکوۃ اور حج پر مضبوطی سے عمل کرنا اور کبائر سے اجتناب کرنا شرط ہے۔ جو شخص اسلام کے ارکان اربعہ پابندی سے ادا کرے گا اور کبائر سے بچے گا وہ مرتے ہی جنت میں داخل ہوگا، اور نجات ثانوی کے لئے صرف ایمان شرط ہے، اگر آدمی میں کسی بھی درجہ میں ایمان ہے تو وہ دیر سویر جنت میں جائے گا۔

[۳۱۸] بابٌ منه

[۶۱۵-] حدثنا مُوسَى بنُ عبدِ الرحمنِ الكُوفِيُّ، نا زيدُ بنُ الحبابِ، نا مُعَاوِيةُ بنُ صالحٍ، قال: حدَّثَنِيْ سُلَيْمُ بنُ عامرٍ، قال: سمعتُ أبا أُمامةَ يقولُ: سمعتُ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَخطُبُ فى حَجَّةِ الوَداعِ فقال: " اتَّقُوْا اللهَ رَبَّكُمْ، وصَلُّوْا خَمْسَكُمْ، وصُومُوْا شَهْرَكُمْ، وأَدُّوْا زَكَاةَ أَمْوَالِكُمْ، وأَطِيْعُوْا ذَا أَمْرِكُمْ: تَدْخُلُوْا جَنَّةَ رَبِّكُمْ" قال: قلتُ لأبى أُمامةَ: مُنْذُكُمْ سَمعتَ هذا الحديثَ؟ قال: سمعتُ وأنا ابنُ ثلاثينَ سَنَةً. قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

﴿ آخرُ أبوابِ الصّلاةِ ﴾

﴿ الحمدللہ! کتاب الصلاۃ کی تقریر کی ترتیب پوری ہوئی ﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

أبواب الزکوٰۃ

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بابُ ماجاءَ عن رسولِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فی مَنْعِ الزَّکَاۃِ مِنَ التَّشْدِیْدِ

زکات ادانہ کرنے پر وعید

زکوٰۃ اسلام کے ابتدائی دور میں فرض کی گئی تھی۔ سورۃ المزمل جو ابتدائی سورتوں میں سے ہے اس کی آخری آیت میں زکوٰۃ کا ذکر ہے، ارشاد پاک ہے: ﴿وَأَقِیْمُوا الصَّلاَۃَ وَآتُوْا الزَّکَاۃَ﴾[المزمّل ۲۰] مگر مکی دور میں زکوٰۃ کی تفصیلات نازل نہیں ہوئی تھیں۔ صحابہ نے دریافت بھی کیا تھا: ﴿ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ؟ قُلِ: الْعَفْوَ﴾ (سورۃ البقرۃ آیت ۲۱۹) لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں: کیا خرچ کریں؟ جواب دیں: اپنی ضرورت سے زائد کو خرچ کرو، مال کی کوئی مقدار متعین نہیں کی۔ جب ہجرت کے بعد سن دو ہجری میں اسلامی حکومت قائم ہوئی اور اسلامی نظام وجود میں آیا تو زکوٰۃ کی تفصیلات نازل ہوئیں۔

حدیث: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا جبکہ آپؐ کعبہ کے سایے میں بیٹھے ہوئے تھے، جب آپؐ نے مجھے دیکھا تو فرمایا: ''قیامت کے دن وہی لوگ سب سے زیادہ گھاٹے میں رہنے والے ہیں کعبہ کے رب کی قسم!'' (حضرت ابوذرؓ نے گمان کیا شاید میرے بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں۔ انھوں نے دل میں سوچا: میرا کیا حال ہے؟ یعنی مجھ سے کیا کوتاہی ہوئی ہے جو آپؐ میرے بارے میں یہ ارشاد فرما رہے ہیں) شاید میرے بارے میں کوئی وحی نازل ہوئی ہو۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں: میں نے (ڈرتے ڈرتے) پوچھا: کون ہیں وہ جو گھاٹے میں رہنے والے ہیں؟ میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں! (اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ جو مصیبتیں آپؐ پر آنے والی ہیں وہ آپؐ پر نہ آئیں، میرے ماں باپ پر آئیں۔ فداہ نفسی: کا بھی یہی مطلب ہے کہ جو آفتیں آپ پر آنے والی ہیں وہ مجھ پر آئیں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''گھاٹے میں رہنے والے بڑے دولت مند ہیں مگر جو اس طرح اور اس طرح اور اس طرح کریں'' اور آپؐ نے لپ بھر کر اپنے سامنے اپنی دائیں جانب اور اپنی بائیں

جانب ڈالا، یعنی ڈالنے کا اشارہ کیا (یعنی جو مالدار وجوہِ خیر میں دونوں ہاتھوں سے خرچ کریں وہ مستثنیٰ ہیں باقی سب مالدار گھاٹے میں رہنے والے ہیں) پھر فرمایا: ''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! نہیں مرتا کوئی آدمی جس نے اونٹ، گائے اور بھینسیں چھوڑی ہوں اور ان کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہو مگر وہ جانور اس کے پاس قیامت کے دن آئیں گے بڑے سے بڑے ہو کر جو وہ کبھی تھے اور موٹے سے موٹے ہو کر جو وہ کبھی ہوئے تھے (یعنی خوب موٹے تازے اور بڑے ڈیل ڈول کے ہو کر آئیں گے) وہ اس کو اپنے پاؤں سے (باری باری) روندیں گے (خف: اونٹ کے پیر کو کہتے ہیں۔ یہاں مراد عام ہے) اور اس کو اپنے سینگوں سے ماریں گے جب ان کا آخری گذر جائے گا تو اس پر ان کا پہلا لوٹ آئے گا (یعنی جب ایک بار سب جانور روندتے ہوئے اور ٹکر مارتے ہوئے گذر جائیں گے تو دوبارہ اور سہ بارہ اسی طرح گذریں گے اور یہ سزا قیامت کے پورے دن میں جو پچاس ہزار سال کے برابر ہے جاری رہے گی) یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلے کر دیئے جائیں گے (پس اگر اس کی سزا پوری ہو جائے گی تو وہ جنت میں جائے گا ورنہ باقی سزا پانے کے لئے جہنم میں جائے گا)

فائدہ: حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ یمن کے باشندے تھے اور علم وفضل میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ہم پلہ سمجھے جاتے تھے۔ ہجرت سے پہلے مکہ میں آکر مسلمان ہوئے ہیں۔ مسلمان ہونے کے بعد آنحضور ﷺ نے ان کو یمن لوٹ جانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ جب اسلام کا غلبہ ہو جائے تب آنا، چنانچہ وہ یمن لوٹ گئے، اور ہجرت کے بعد جب اسلام کا بول بالا ہوا تو وہ ہجرت کر کے مدینہ آگئے، ان کا مسلک یہ تھا کہ سونا اور چاندی (دراہم ودنانیر) ذخیرہ کرنا جائز نہیں۔ مگر ان کی یہ رائے قبول نہیں کی گئی، کیونکہ زکوٰۃ اس سونے چاندی میں فرض ہے جس پر سال گذر جائے پس اگر ان کا ذخیرہ کرنا جائز نہیں تو ان میں زکوٰۃ کیسے فرض ہو گی؟!

أبواب الزکوٰۃ

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

[۱] باب ماجاء عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی منع الزکوٰۃ من التشدید

[۶۱۶-] حدثنا هَنَّادُ بنُ السَّرِيِّ، نا أبو مُعَاوِيَةَ، عن الأَعْمَشِ، عن مَعْرُوْرِ بنِ سُوَيْدٍ، عن أبي ذَرٍّ، قال: جِئْتُ إلى رسولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَهُوَ جَالِسٌ فِيْ ظِلِّ الْكَعْبَةِ، قال: فَرَآنِيْ مُقْبِلًا، فقال: " هُمُ الْأَخْسَرُوْنَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ!" قال: فَقُلْتُ: مَالِيْ لَعَلَّهُ أُنْزِلَ فِيَّ شَيْءٌ؟! قال: قُلْتُ: مَنْ هُمْ فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ؟ فقال رسولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: " هُمُ الْأَكْثَرُوْنَ، إِلَّا

مَنْ قَالَ هٰكَذَا وهٰكَذَا وَهٰكَذَا، فَحثَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَعَنْ يَمِيْنِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ، ثُمَّ قال:" والَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ لَايَمُوْتُ رَجُلٌ فَيَدَعَ إِبِلاً أَوْ بَقَراً لَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهَا، إِلَّا جَاءَ تْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْظَمَ مَا كَانَتْ وَأَسْمَنَهُ، تَطَؤُهُ بِأَخْفَافِهَا، وَتَنْطِحُهُ بِقُرُوْنِهَا، كُلَّمَا نَفِدَتْ أُخْرَاهَا عَادَتْ عليهِ أُوْلَاهَا، حتى يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ"

وفي الباب: عن أبي هريرة مِثْلَه، وعن عليّ بنِ ابي طَالِبٍ قال:" لُعِنَ مَانِعُ الصَّدَقَةِ" وعَنْ قَبِيْصَةَ بنِ هُلْبٍ، عَنْ أَبِيْهِ، وجابرِ بنِ عبدِ اللّٰهِ، وعبدِ اللّٰهِ بنِ مَسْعُوْدٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ أبي ذَرٍّ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ؛ واسْمُ أبي ذَرٍّ: جُنْدَبُ بنُ السَّكَنِ، ويُقَالُ: ابنُ جُنَادَةَ.

[٦١٧-] حدثنا عبدُ اللّٰهِ بنُ مُنِيْرٍ، عن عُبَيْدِ اللّٰهِ بن موسَى، عن سُفيانَ الثَّوْرِيِّ، عن حَكِيْمِ بنِ الدَّيْلَمِ، عن الضَّحَّاكِ بنِ مُزَاحِمٍ، قال: الأَكْثَرُوْنَ أَصْحَابُ عَشَرَةِ آلَافٍ.

وضاحت: امام ترمذی رحمہ اللہ نے وفی الباب کی فہرست کے دوران ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث کا متن لکھا ہے کہ ’’زکوۃ ادانہ کرنے والا ملعون ہے‘‘ یہ حدیث سنن بیہقی میں ہے اور محمد بن سعید البورقی کی وجہ سے ضعیف ہے، وہ جھوٹا تھا اور حدیثیں گڑھتا تھا، اور حضرت ابوذرؓ کا نام جندُب (ٹڈی) ہے اس کو دال کے پیش اور زبر دونوں کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں اور ان کے والد کے نام میں دو قول ہیں سَکَن اور جُنادۃ متاخرین نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے۔ اس کے بعد مشہور مفسر ضحاک بن مزاحم کا قول نقل کیا ہے کہ جس کے پاس دس ہزار درہم ہوں وہ بڑا دولت مند ہے (کیونکہ دس ہزار درہم ایک نفس کی قیمت ہے، قتل خطاء میں یہی دیت واجب ہوتی ہے، اور ضحاکؒ نے یہ بات ایک دوسری حدیث کی تفسیر میں کہی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو شخص روزانہ قرآن کی ایک ہزار آیتیں پڑھے اس کا شمار بڑے مالداروں میں ہے‘‘ یہ حدیث ابوداؤد میں ہے۔ امام ترمذیؒ نے ھم الأکثرون کی مناسبت سے ضحاک کا یہ قول یہاں ذکر کیا ہے۔ مگر صحیح بات یہ ہے کہ اس کی تفسیر کی ضرورت نہیں، اس کو عرف وعادت پر چھوڑ دینا چاہئے، کیونکہ عرف وعادت کے اختلاف سے اور زمانوں کے اختلاف سے یہ بات مختلف ہوتی ہے۔

بابُ ماجاءَ إِذَا أَدَّيْتَ الزَّكَاةَ فَقَدْ قَضَيْتَ مَا عَلَيْكَ

جس نے زکوۃ ادا کردی اس نے مال کا حق ادا کردیا

پہلی حدیث: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جب آپ اپنے مال کی زکوۃ دیدیں تو آپ نے وہ حق ادا کردیا جو

آپ پر واجب ہے"

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آدمی کے مال میں اللہ کا حق صرف زکوۃ ہے، مگر آئندہ حدیث آرہی ہے کہ مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی اللہ کا حق ہے۔ پس دونوں حدیثوں میں تطبیق یہ ہے کہ مال میں اللہ تعالیٰ کا اصل حق تو صرف زکوۃ ہے۔ البتہ مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی کچھ حقوق ہیں جو ثانوی درجہ کے ہیں۔ جیسے نوائب الحق یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے حوادث میں خرچ کرنا، پڑوسی کو بھوکا نہ چھوڑنا، سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹانا۔ یہ سب بھی مال میں اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں مگر ثانوی درجہ کے ہیں۔

دوسری حدیث: آنحضور ﷺ نے قبیلۂ بنی سعد بن بکر کی طرف چند داعی تبلیغ اسلام کے لئے بھیجے، ان کی محنت سے پورا قبیلہ مسلمان ہونے کے لئے تیار ہوگیا، لیکن انھوں نے پہلے داعی کی باتوں کی تصدیق کرلینی چاہی، چنانچہ قبیلہ والوں نے ایک نفری وفد مدینہ روانہ کیا۔ وہ حضرت ضمّام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ تھے۔ تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کرکے داعی کی باتوں کی تصدیق کرآئیں۔ یہ واقعہ اصح قول کے مطابق سن ۹ ہجری کا ہے یہ وہ دور تھا جب صحابہ سہمے ہوئے تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۰۱ نازل ہوچکی تھی جس میں حکم دیا تھا کہ لوگ نبی ﷺ سے کوئی ایسی بات نہ پوچھیں جس کا جواب انہیں ناگوار ہو۔ اور ظاہر ہے پوچھنے والا تو جانتا نہیں کہ کس بات کا جواب اُسے ناگوار ہوگا۔ اس لئے صحابہ نے چپ سادھ لی تھی، لیکن وہ علم کے رسیا تھے، تمنا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کچھ بیان فرمائیں۔ مگر آپؐ اسی وقت بیان فرمائیں گے جب کوئی کچھ پوچھے گا۔ اس زمانے میں پڑھنے کا یہی طریقہ تھا۔ اس لئے صحابہ چاہتے تھے کہ کوئی بادیہ نشیں (جنگل کا رہنے والا) آئے (خانہ بدوش تہذیب سے نابلد اور آداب سے ناواقف ہوتے ہیں وہ بے دھڑک سوال کرسکتے ہیں) اور وہ عقلمند بھی ہوتا کہ کوئی کام کی بات پوچھے، کیونکہ بہترین سوال آدھا علم ہے[1] پھر رسول اللہ ﷺ جو جواب دیں اس سے صحابہ مستفید ہوں، صحابہ کی یہ حالت ایک وقت تک رہی، پھر رفتہ رفتہ ختم ہوگئی۔

حدیث کا ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ہم آرزو کرتے تھے کہ کوئی عقلمند بادیہ نشیں آئے اور رسول اللہ ﷺ سے سوال کرے، جس وقت ہم آپؐ کے پاس ہوں، پس دریں اثنا کہ ہم اس طرح تھے (یعنی اسی دور کا واقعہ ہے) کہ اچانک ایک اعرابی آیا اور وہ نبی ﷺ کے سامنے اُکڑوں بیٹھ گیا اور بخاری (حدیث ۶۳) میں ہے: اس نے سب سے پہلے یہ بات کہی کہ میں آپؐ سے کچھ سوال کروں گا آپ برا نہ مانیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: جو چاہو

---

(۱) اصح یہ ہے کہ حُسْنُ السؤالِ نصفُ العلم حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے، اس کا حدیث مرفوع ہونا ضعیف ہے (فتح الباری ۱:۱۴۸) اور روایت کے الفاظ السؤال نصف العلم نہیں ہیں، بلکہ حُسن کا لفظ بھی ہے کیونکہ مطلق سوال کرنا آسان ہے ہر شخص کرسکتا ہے، اس کے لئے مسئلہ کا آدھا علم ضروری نہیں۔ ہاں بہترین سوال وہی کرسکتا ہے جو مسئلہ کا فی الجملہ علم رکھتا ہو۔

پوچھو، اس نے کہا: اے محمد[1]! آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہمیں اطلاع دی کہ آپ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: وہ ٹھیک کہتا ہے۔ سائل نے کہا: اس ذات کی قسم دیتا ہوں جس نے آسمان کو بلند کیا، اور زمین کو بچھایا، اور پہاڑوں کو کھڑا کیا، کیا واقعی اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا: ہاں اللہ گواہ ہے! اعرابی نے پوچھا: آپ کے قاصد نے ہمیں بتایا کہ آپ کہتے ہیں: ہم پر رات دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قاصد ٹھیک کہتا ہے۔ دیہاتی نے کہا: اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے: کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ دیہاتی نے کہا: آپ کے رسول نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ آپ کہتے ہیں کہ ہم پر سال میں ایک مہینہ کے روزے فرض ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: قاصد نے سچ کہا۔ دیہاتی نے کہا: اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے! کیا آپ کو اللہ نے اس کا حکم دیا ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ دیہاتی نے کہا: ہمیں آپ کے قصد نے یہ بھی بتایا کہ آپ کہتے ہیں کہ ہم پر ہمارے مالوں میں زکوٰۃ ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: قاصد نے سچ کہا، دیہاتی نے کہا: اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ دیہاتی نے کہا: آپ کے رسول نے ہمیں بتایا کہ آپ کہتے ہیں کہ اس شخص پر بیت اللہ کا حج فرض ہے جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ دیہاتی نے کہا: اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جس نے آپ کو مبعوث کیا ہے کیا آپ کو اللہ نے اس کا حکم دیا ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ اس دیہاتی نے کہا: اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے نہ میں اس میں سے کچھ کم کروں گا اور نہ ان میں اضافہ کروں گا، یعنی بے کم وکاست یہ باتیں قبیلے کو پہنچاؤں گا، پھر وہ کود کر کھڑا ہوا۔ ضمام بن ثعلبہ سیدھے مسجد نبوی میں آئے تھے اور مسجد کے دروازے پر اپنی سواری بٹھائی تھی، چنانچہ وہ قاصد کی باتوں کی تصدیق کر کے فوراً اٹھے اور سوار ہو کر واپس لوٹ گئے۔ مدینہ منورہ میں قیام نہیں کیا۔ ان کے لوٹ جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر اس اعرابی نے سچ کہا (یعنی اگر وہ یہ باتیں بے کم وکاست قبیلے تک پہنچائے گا تو) جنت میں جائے گا۔

فائدہ: حدیث پڑھانے کے دو طریقے ہیں: ایک: استاذ پڑھے اور شاگرد سنے۔ دوسرا: شاگرد پڑھے اور استاذ سنے۔ حدیث پڑھانے کا پہلا طریقہ اصل ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ سے وہی طریقہ چلا آرہا تھا۔ نبی ﷺ حدیث بیان فرماتے اور صحابہ سنتے، پھر صحابہ کے زمانہ میں بھی یہی طریقہ رائج رہا، پھر تابعین کے زمانہ میں جب طلبہ زیادہ ہو گئے تو دوسرا طریقہ شروع ہوا۔ اب شاگرد حدیث پڑھتا تھا اور استاذ سنتا تھا۔ اور اس صورت میں شاگرد سند

(۱) صحابہ آنحضور ﷺ کو نام لے کر مخاطب نہیں کرتے تھے بلکہ یا رسول اللہ کہتے تھے، حتی کہ ازواج مطہرات بھی یا رسول اللہ کہہ کر مخاطب کرتی تھیں، اور مشرکین کنیت سے یعنی ابو القاسم کہہ کر آپ کو بلاتے تھے۔ اور حضرت ضمام بن ثعلبہؓ نے نام اس لئے لیا کہ وہ بدو تھے جنگل کے باشندے بڑوں کو مخاطب کرنے کے طریقوں سے واقف نہیں ہوتے۔

کے شروع میں ہمزۂ استفہام بڑھاتا تھا وہ کہتا: أحدَّثك فلانٌ؟ پھر جب طالب علم حدیث پڑھ کر فارغ ہوتا تو استاذ نعم کہتا۔ اس طریقہ کا نام عرض (محدث کے سامنے حدیث پیش کرنا) تھا جب یہ نیا طریقہ شروع ہوا تو بعض حضرات کو اشکال ہوا پھر رفتہ رفتہ اختلاف ختم ہوگیا اور بات طے ہوگئی کہ دونوں طریقے جائز ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ ابوبکر عبداللہ بن الزبیر حمیدی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث سے اس دوسرے طریقہ کا جواز ثابت کیا ہے۔ دیہاتی کو داعی کے ذریعہ جو باتیں پہنچی تھیں وہ ان کو سن کر اور یاد کر کے آیا تھا اس نے وہ باتیں حضور اکرم ﷺ کے سامنے پیش کیں اور آپؐ نے اس کی تصدیق کی۔ معلوم ہوا کہ حدیث پڑھانے کا یہ دوسرا طریقہ بھی صحیح ہے، اگرچہ اصل طریقہ پہلا ہی ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ کلام کتاب العلل میں بھی گذر چکا ہے۔

[۲] باب ماجاء إذا أَدَّيْتَ الزكاةَ فقد قضيتَ ما عليك

[۶۱۸-] حدثنا عُمَرُ بنُ حَفْصٍ الشَّيْبَانِيُّ، نا عبدُ اللهِ بنُ وَهْبٍ، نا عَمْرُو بنُ الحارثِ، عن دَرَّاجٍ، عن ابنِ حُجَيْرَةَ، عن أبی هريرةَ، أَنَّ النبیَّ صلی الله عليه وسلم قال: " إِذا أَدَّيْتَ زكاةَ مالِكَ فَقَدْ قَضَيْتَ مَا عَلَيْكَ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ، وقد رُوِيَ عن النبیِّ صلی الله عليه وسلم مِنْ غَيْرِ وَجْهٍ: أَنَّهُ ذَكَرَ الزكاةَ، فقالَ رجلٌ: يارسولَ اللهِ! هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا؟ فقال: " لَا، إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ"

وابنُ حُجَيْرَةَ: هو عبدُ الرحمنِ بنُ حُجَيْرَةَ البَصْرِيُّ.

[۶۱۹-] حدثنا محمدُ بنُ إسماعيلَ، حدثنا عليُّ بنُ عبدِ الحميدِ الكُوفِيُّ، نا سُلَيْمَانُ بنُ الْمُغِيْرَةِ، عن ثَابِتٍ، عن أنسٍ، قال: كُنَّا نَتَمَنَّى أَنْ يَبْتَدِیءَ الْأَعْرَابِيُّ العَاقِلُ، فَيَسأَلَ النبیَّ صلی الله عليه وسلم ونَحْنُ عِنْدَهُ، فَبَيْنَا نَحْنُ كَذٰلِكَ إِذْ أَتَاهُ أَعْرَابِيٌّ، فَجَثَا بَيْنَ يَدَيِ النبیِّ صلی الله عليه وسلم، فقال: يا محمدُ إِنَّ رَسُوْلَكَ أَتَانَا فَزَعَمَ لَنَا أَنَّكَ تَزْعَمُ أَنَّ اللهَ أَرْسَلَكَ، فقالَ النبیُّ صلی الله عليه وسلم: " نَعَمْ!" قال: فَبِالَّذِیْ رَفَعَ السَّمَاءَ، وَبَسَطَ الْأَرْضَ، ونَصَبَ الجِبالَ آللهُ أَرْسَلَكَ؟ فقالَ النبیُّ صلی الله عليه وسلم: " نَعَمْ!" قال: فَإِنَّ رَسُوْلَكَ زَعَمَ لَنَا أَنَّكَ تَزْعَمُ أَنَّ عَلَيْنَا خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِی الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ، فقالَ النبیُّ صلی الله عليه وسلم: " نَعَمْ" قال: فَبِالَّذِیْ أَرْسَلَكَ آللهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا؟ قال: "نَعَمْ!" قال: فَإِن رَسُولَكَ زَعَمَ لَنَا أَنَّكَ تَزْعَمُ أَنَّ عَلَيْنَا صَوْمَ شَهْرٍ فی السَّنَةِ، فقال النبیُّ صلی الله عليه وسلم: " صَدَقَ" قال: فَبِالَّذِیْ أَرْسَلَكَ آللهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا؟ فقال النبیُّ صلی الله عليه وسلم: "نَعَمْ" قال: فَإِنَّ رَسُوْلَكَ زَعَمَ لَنَا أَنَّكَ تَزْعَمُ أَنَّ عَلَيْنَا فی أَمْوَالِنَا الزكاةَ، فقالَ النبیُّ صلی الله عليه وسلم:

"صَدَقَ" قال: فَبِالَّذِی أَرْسَلَكَ آللهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا؟ قال النبیُّ صلی الله علیه وسلم: "نَعَمْ" قال: إِنَّ رَسُوْلَكَ زَعَمَ لَنَا أَنَّكَ تَزْعَمُ أَنَّ عَلَيْنَا الحجَّ إلی بَيْتِ اللهِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً، فقالَ النبیُّ صلی الله علیه وسلم: "نَعَمْ" قال: فَبِالَّذِی أَرْسَلَكَ آللهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا؟ قال: "نَعَمْ" فقالَ: وَالَّذِیْ بَعَثَكَ بِالحَقِّ لاَ أَدَعُ مِنْهُنَّ شَيْئًا وَلاَ أُجَاوِزُهُنَّ، ثُمَّ وَثَبَ، فقالَ النبیُّ صلی الله علیه وسلم: "إِنْ صَدَقَ الأَعْرَابِیُّ دَخَلَ الْجَنَّةَ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ مِن هذا الوجهِ، وقد رُوِیَ مِنْ غَيْرِ هذا الوَجْهِ عن أنسٍ، عن النبیِّ صلی الله علیه وسلم.

سَمِعْتُ محمدَ بنَ إسماعيلَ يقولُ: قالَ بعضُ أهلِ الحديثِ: فِقْهُ هٰذا الحديثِ: إِنَّ القِرَاءَةَ علی العَالِمِ والعَرْضَ عَلَيْهِ جَائِزٌ مِثْلَ السَّمَاعِ، واحتَجَّ بِأَنَّ الأَعْرَابِیَّ عَرَضَ علی النبیِّ صلی الله علیه وسلم، فَأَقَرَّ بِهِ النبیُّ صلی الله علیه وسلم.

وضاحت: پہلی حدیث میں ایک راوی درّاج ہے اس لفظ کے معنی ہیں: تیتر۔ اس راوی کا نام عبدالرحمٰن بن سمعان ہے، درّاج ان کا لقب تھا۔ ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے اور دارقطنی نے تضعیف کی ہے۔ اور ان کے استاذ کا نام بھی عبدالرحمٰن ہے اور وہ حُجیرۃ کے لڑکے ہیں اور بصرہ کے رہنے والے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ سے متعدد طرق سے مروی ہے کہ جب آپؐ نے زکوٰۃ کے فرض ہونے کی بات بتائی تو سائل نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا مجھ پر زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ ہے؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں، مگر یہ کہ آپ نفلی خیرات کریں۔ یہ طلحہ بن عبیداللہ کی حدیث ہے اور متفق علیہ ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۶) —— پھر امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ کی سند سے مذکورہ حدیث روایت کی ہے اور اس کو حسن غریب قرار دیا ہے، اور فرمایا ہے کہ حضرت انس کی یہ حدیث دوسرے طریق سے بھی مروی ہے۔ دوسری سند بخاری (حدیث ۶۳) میں ہے (امام ترمذیؒ کہتے ہیں) میں نے امام بخاریؒ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ بعض محدثین فرماتے ہیں: اس حدیث سے مستنبط ہونے والا حکم یہ ہے کہ عالم کے سامنے حدیث پڑھنا اور اس پر حدیث پیش کرنا جائز ہے اور وہ استاذ سے حدیث سننے کی طرح ہے۔ اور انھوں نے استدلال کیا کہ دیہاتی نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے حدیث پیش کی اور نبی ﷺ نے اس کا اقرار کیا (یہی عرض یعنی پیش کرنا ہے)

بابُ ماجاءَ فی زَکٰوةِ الذَّهَبِ والوَرِقِ

سونے چاندی کی زکوٰۃ کا بیان

ورِق (بکسر الراء) کے معنی ہیں: چاندی، جس کا سکہ ڈھالا نہ گیا ہو۔ اور یہاں مراد عام ہے۔ خواہ چاندی مضروبۃ

(ڈھالی ہوئی) ہو یا غیر مضروبہ سب کا ایک حکم ہے۔ اور وَرِق (بفتح الراء) کے معنی ہیں: درخت کا پتہ۔ کتاب کا ورق اسی سے ہے۔ اس باب میں مسئلہ یہ ہے کہ سونے چاندی میں زکوٰۃ واجب ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ البتہ باب کی حدیث میں صرف چاندی کے نصاب کا اور حساب کا تذکرہ ہے۔ سونے کا اس میں کوئی تذکرہ نہیں، اس کا بیان آگے آئے گا مگر چونکہ سونا اور چاندی دونوں خلقی ثمن ہیں، اور حدیث باب میں چاندی میں زکوٰۃ واجب ہونے کا تذکرہ ہے اس لئے سونے میں بدرجۂ اولی زکوٰۃ واجب ہوگی، ثمن خلقی ہونے میں سونا: چاندی سے ابلغ ہے۔ اسی لئے امام ترمذی رحمہ اللہ نے باب میں سونے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے گھوڑوں اور غلام باندیوں کی زکوٰۃ معاف کردی (یعنی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے غلاموں اور گھوڑوں میں زکوٰۃ نہ ہونے کا اعلان کرتا ہوں) پس تم چاندی کی زکوٰۃ لاؤ، ہر چالیس درہم میں سے ایک درہم (یہ حساب کا بیان ہے، نصاب کا بیان نہیں، یعنی سونے اور چاندی میں چالیسواں حصہ واجب ہے۔ بالفاظ دیگر: ڈھائی فیصد واجب ہے) اور میرے لئے نہیں ہے (مصری نسخہ میں لِیْ نہیں ہے اور اگر اس کو باقی رکھا جائے تو تاویل یہ ہے کہ بیت المال کے لئے نہیں ہے) ایک سونوے میں کچھ (عرب کسور (اکائیوں) کو چھوڑ دیا کرتے تھے صرف دہائیوں کو گنتے تھے، پیسے پیسے کا حساب کرنا ان کا مزاج نہیں تھا۔ غرض یہاں ایک سونوے سے ایک سوننانوے درہم مراد ہیں) پس جب دوسو پورے ہوجائیں تو ان میں پانچ درہم ہیں (یہ نصاب کا بیان ہے۔ یعنی چاندی کا نصاب دوسو درہم ہے۔ دوسو میں ایک پائی بھی کم ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں۔ اور حولانِ حول بھی شرط ہے۔ اس کا تذکرہ آگے دوسری حدیث میں آرہا ہے۔ اور دوسو درہم میں چالیسویں کے حساب سے پانچ درہم واجب ہیں)

تشریح: چاندی کا نصاب پانچ اوقیہ یعنی دوسو درہم ہیں۔ اس سے کم میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ اور سونا: چاندی پر محمول ہے یعنی چھ سو بارہ گرام چاندی کی قیمت کے بقدر سونا ہو تو اس پر بھی زکات واجب ہے اور دور نبوی میں ایک دینار کا چینج دس درہم سے ہوتا تھا۔ پس دوسو درہم کے بیس مثقال ہوئے۔ اس لئے اس کو (ساڑھے ستاسی گرام) سونے کو نصاب مقرر کیا گیا، اور دونوں میں زکوٰۃ چالیسواں حصہ یعنی ڈھائی فی صد ہے۔ اور یہ مقدار زکوٰۃ کی تمام مقداروں سے کم ہے۔ کیونکہ سونا چاندی قابل رغبت اموال ہیں۔ اور وہ لوگوں کے نزدیک نفیس ترین اموال شمار ہوتے ہیں اس لئے اگر لوگوں کو ان میں سے بہت مقدار خرچ کرنے کے لئے کہا جائے گا تو ان پر بوجھ پڑے، اس لئے ان کی زکوٰۃ تمام زکاتوں سے کم رکھی گئی ہے۔

پھر بعد کے زمانہ میں سونے چاندی کی قیمتوں میں تفاوت ہوگیا تو یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ سونے کا نصاب مستقل ہے یا چاندی کے نصاب سے اس کا موازنہ کیا جائے گا۔ جمہور کے نزدیک سونے کا نصاب: مستقل نصاب ہے۔ اس میں

قیمت کا اعتبار نہیں۔ البتہ کچھ حضرات سونے کو چاندی کے نصاب پر محمول کرتے ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک سونے کا نصاب: کوئی مستقل نصاب نہیں۔ جتنا بھی سونا چھ سو بارہ گرام چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے اس میں زکوۃ واجب ہے۔

جمہور کی دلیل تین روایتیں ہیں، مگر ان میں سے ایک بھی اعلیٰ درجہ کی صحیح نہیں۔ وہ تین روایتیں یہ ہیں:

پہلی روایت: حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے کہ سونے میں کچھ واجب نہیں، تا آنکہ وہ بیس دینار ہو جائے، پھر اگر کسی کے پاس بیس دینار ہوں اور ان پر سال گذر جائے تو ان میں آدھا دینار ہے۔ اس روایت کو ابن وہب مصری نے مرفوع کیا ہے اور شعبہ اور ثوری وغیرہ نے موقوف بیان کیا ہے۔ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول قرار دیا ہے۔ امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے اس پر سکوت اختیار کیا ہے یعنی کوئی جرح نہیں کی۔ اور امام نووی رحمہ اللہ نے حسن یا صحیح کہا ہے۔ اور زیلعی رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے (ابوداؤد حدیث ۱۵۷۳ باب زکاۃ السائمۃ، نصب الرایہ ۲: ۳۲۸)

دوسری روایت: حضرت عائشہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی ﷺ ہر بیس دینار یا زیادہ میں سے آدھا دینار لیتے تھے۔ اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن اسماعیل بن مُجمِّع انصاری ہے جو ضعیف ہے۔ مگر بہت ضعیف نہیں ہے۔ بخاری میں اس کی روایت تعلیقاً ہے (ابن ماجہ حدیث ۱۷۹۱ باب زکاۃ الوَرِقِ والذہب)

تیسری روایت: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو سو درہم سے کم میں کچھ نہیں۔ اور سونے کے بیس مثقال سے کم میں کچھ نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے درایہ میں اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔

یہ حدیث ابوعبید اور ابن زنجویہ نے کتاب الاموال میں روایت کی ہے (نصب الرایہ ۲: ۳۶۹ مغنی ابن قدامہ ۲: ۵۹۹)

مذکورہ روایات اگرچہ الگ الگ ضعیف ہیں مگر ضعف شدید نہیں۔ پھر مل کر ایک قوت حاصل کر لیتی ہیں اس لئے قابل استدلال ہیں۔ چنانچہ فتوی جمہور کے قول پر ہے کہ سونے کا نصاب مستقل ہے، چاندی کے نصاب پر محمول نہیں، مگر یہ فتوی صرف اس صورت میں ہے جبکہ کسی کے پاس صرف سونا ہو، اور اگر سونے کے ساتھ چاندی یا روپے بھی ہوں تو پھر سونے کی قیمت لگا کر روپیوں کے ساتھ ملا کر ۶۱۲ گرام چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو زکوۃ واجب ہوگی، اس صورت میں سونے کو مستقل جنس شمار نہیں کرتے۔

غلام باندی کا مسئلہ:

غلام باندی دو مقصد سے رکھے جاتے ہیں: ایک: خدمت کے لئے، دوسرا: تجارت کے لئے۔ تمام ائمہ متفق ہیں کہ جو غلام باندی خدمت کے لئے ہیں ان میں زکوۃ نہیں۔ البتہ آقا پر ان کا صدقہ فطر واجب ہے۔ پھر حنفیہ کے نزدیک غلام باندی خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم: صدقہ فطر واجب ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک صرف مسلمان غلام باندی کا صدقہ واجب ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔ اسی طرح سب ائمہ متفق ہیں کہ جو غلام باندی تجارت کے لئے ہیں

ان میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اوران کی قیمت کا چالیسواں حصہ ان کی زکوٰۃ ہے۔

گھوڑوں کا مسئلہ:

گھوڑے تین مقاصد سے پالے جاتے ہیں: ایک: سواری اور بار برداری وغیرہ کے لئے، دوسرے: تجارت کے لئے، تیسرے: تناسل یعنی نسل حاصل کرنے کے لئے۔ دودھ کے لئے گھوڑیاں پالنے کا رواج نہیں (گھوڑی کے دودھ کا مسئلہ گوشت پر متفرع ہے، جن ائمہ کے نزدیک گھوڑے کا گوشت حلال ہے دودھ بھی حلال اور پاک ہے اور وہ استعمال کرتے ہیں۔ اور جن ائمہ کے نزدیک گوشت مکروہ ہے دودھ بھی مکروہ ہے)

جو گھوڑے استعمال کے لئے یعنی بار برداری کے لئے ہیں ان میں زکوٰۃ بالاجماع واجب نہیں۔ اسی طرح سب متفق ہیں کہ تجارت کے گھوڑوں میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اور جو گھوڑے نسل کے لئے ہیں ان میں اختلاف ہے، ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک ان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک واجب ہے۔ پھر آپؒ کے قول کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس گھوڑے اور گھوڑیاں دونوں ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اور اگر صرف گھوڑیاں ہوں تو دو قول ہیں: وجوب کا بھی اور عدم وجوب کا بھی۔ اور راجح قول وجوب کا ہے اس لئے کہ دوسرے سے گھوڑا عاریت پر لے کر نسل حاصل کرنا ممکن ہے۔ اور اگر صرف گھوڑے ہوں تو بھی دو قول ہیں اور راجح عدم وجوب ہے، اس لئے کہ صرف گھوڑوں سے نسل حاصل نہیں کی جاسکتی۔

اور جمہور کا استدلال باب کی حدیث سے ہے اور ان کا استدلال واضح ہے کہ نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گھوڑوں اور بردوں (غلام باندی) کی زکوٰۃ کی معافی کا اعلان کیا ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک باب کی حدیث خاص ہے اس میں صرف ان بردوں اور گھوڑوں کا ذکر ہے جو سواری، بار برداری یا خدمت کے لئے ہیں، ہر قسم کے غلام باندی اور گھوڑوں کا مسئلہ اس حدیث میں نہیں ہے۔ چنانچہ جمہور بھی تجارت کے گھوڑوں اور بردوں میں زکوٰۃ کے قائل ہیں۔ اور امام اعظم کی دلیل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ فیصلہ ہے جو انھوں نے صحابہ سے مشورہ کر کے کیا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ عرب صرف سواری، بار برداری یا تجارت کے لئے گھوڑے پالتے تھے۔ نسل حاصل کرنے کے لئے گھوڑے پالنے کا عرب میں رواج نہیں تھا۔ مگر جب دور فاروقی میں فتوحات ہوئیں اور ایران، عراق اور شام وغیرہ ممالک اسلامی حکومت میں شامل ہوئے تو وہاں تناسل کے لئے گھوڑے پالنے کا رواج تھا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مسئلہ دریافت کیا گیا۔ آپؓ نے صحابہ سے مشورہ کر کے جواب دیا کہ ان میں زکوٰۃ واجب ہے۔ ہر گھوڑے میں سے ایک دینار (دس درہم) لئے جائیں یا قیمت کا چالیسواں حصہ لیا جائے (تفصیل نصب الرایہ ۲:۳۵۸و۳۵۹ میں ہے)

[۳] باب ماجاء فی زکاۃ الذھب والورِق

[۶۲۰-] حدثنا محمدُ بنُ عبدِ الملكِ بنِ أبی الشَّوَارِبِ، نا أبو عَوَانَةَ، عن أبی إسحاق، عن عَاصِمِ بنِ ضَمْرَةَ، عن علیٍّ، قال: قالَ رسولُ الله صلی الله علیه وسلم: " قَدْ عَفَوْتُ عَنْ صَدَقَةِ الخَيْلِ والرَّقِيْقِ، فَهَاتُوْا صَدَقَةَ الرِّقَّةِ: مِنْ كُلِّ أَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا دِرْهَمٌ، وَلَيْسَ لِیْ فِیْ تِسْعِيْنَ وَمِائَةٍ شَيْئٌ، فَإِذَا بَلَغَتْ مِائَتَيْنِ فَفِيْهَا خَمْسَةُ دَرَاهِمَ"

وفی الباب: عن أبی بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ، وعَمْرِو بنِ حَزْمٍ.

قال أبو عيسیٰ: رَوَی هذا الحديثَ الأعْمَشُ وَأَبو عَوَانَةَ وَغَيْرُهُمَا عن أبی إسحاق، عن عَاصِمِ بنِ ضَمْرَةَ، عن علیٍّ، ورَوَی سُفيانُ الثَّوْرِیُّ، وابنُ عُيَيْنَةَ، وغَيْرُ وَاحِدٍ عن أبی إسحاق، عن الحَارِثِ، عن علیٍّ.

قال: وسَأَلْتُ محمدَ بنَ إسماعيلَ عن هذا الحَدِيثِ؟ فقالَ: كِلَاهُمَا عِنْدِیْ صَحِيْحٌ عن أبی إسحاق، يَحْتَمِلُ أَنْ يَكُوْنَ عَنْهُمَا جَمِيْعًا.

وضاحت: یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کے دو شاگرد عاصم اور حارث روایت کرتے ہیں اور دونوں سے ابو اسحاق روایت کرتے ہیں۔ پھر ابو اسحاق کے تلامذہ میں سے ابوعوانہ اور اعمش وغیرہ عاصم کی سند سے روایت کرتے ہیں اور ثوری اور ابن عیینہ وغیرہ حارث کی سند سے روایت کرتے ہیں۔ اور امام بخاریؒ نے دونوں سندوں کو صحیح قرار دیا ہے۔ انھوں نے فرمایا: ہوسکتا ہے ابو اسحاق دونوں ہی سے روایت کرتے ہوں۔ (امام بخاریؒ کے قول میں صحیح سے: حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ مراد نہیں بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ یہ حدیث ابو اسحاق: عاصم اور حارث دونوں سے روایت کرتے ہیں، کیونکہ عاصم اور حارث دونوں اعلی درجہ کے راوی نہیں اور ان کی حدیث کو کسی نے صحیح نہیں قرار دیا)

بابُ ماجاء فی زَکَاۃِ الإِبِلِ والغَنَمِ

اونٹوں اور بھیڑ بکریوں کی زکوۃ کا بیان

اب جانوروں کی زکوۃ کا بیان شروع کرتے ہیں۔ سب سے پہلے چار باتیں ذہن نشین کرلی جائیں:

پہلی بات: قابلِ زکوۃ اموال میں زکوۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب نصاب پورا ہو، اور حولانِ حول بھی ہوجائے یعنی اس مال پر ایک سال گذر جائے۔

دوسری بات: قابلِ زکوۃ اموال کی پانچ اجناس ہیں: (۱) اونٹ (۲) بھیڑ بکری (دونوں ایک جنس ہیں)

(۳) گائے بھینس (دونوں ایک جنس ہیں) (۴) سونا، چاندی، اموالِ تجارت اور کرنسی وغیرہ سب ایک جنس ہیں[1] (۵) زمین کی پیداوار[2] ان میں سے ایک نصاب کا دوسرے نصاب کے ساتھ انضمام نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا اگر کسی کے پاس چار اونٹ، انتیس گائے بھینس اور انتالیس بکریاں ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں، اس لئے کہ کوئی بھی نصاب مکمل نہیں۔ اگرچہ ان کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت سے زیادہ ہو۔ اور اگر کسی کے پاس بیس گائیں اور دس بھینس ہوں یا تیس بھیڑ اور دس بکریاں ہوں تو زکوٰۃ واجب ہے، کیونکہ گائے بھینس ایک جنس ہیں۔ اسی طرح بھیڑ بکریاں ایک جنس ہیں، پس ان کو ملایا جائے گا۔ اور اگر کسی کے پاس دو تولہ سونا، دس تولہ چاندی، اور کچھ تجارت کا مال اور کچھ روپے ہوں اور مجموعہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کے برابر یا زیادہ ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہے اس لئے کہ یہ سب ایک جنس ہیں پس ان کو ملایا جائے گا۔

تیسری بات: جانوروں میں راس (سر) گنے جائیں گے ان کی عمروں کا اعتبار نہیں جو بچہ ایک دن کا ہے وہ بھی شمار ہوگا۔ البتہ اگر کسی کے پاس بچے ہی بچے ہوں جیسے کسی کے پاس اونٹ کے پندرہ بچے ہوں (جانور جب تک ماں کا دودھ پیتا ہے بچہ ہے) تو ان میں زکوۃ واجب نہیں۔ اگر ساتھ میں ایک بھی بڑا ہے تو زکاۃ واجب ہے۔

چوتھی بات: زکوٰۃ صرف سائمہ جانوروں میں ہے یعنی جو جانور سال کا بیشتر حصہ جنگل کی مباح گھاس پر گذارہ کرتے ہوں صرف ان میں زکوٰۃ ہے اور جن جانوروں کو خرید کر یا اگا کر چارہ دیا جاتا ہو وہ علوفہ کہلاتے ہیں ان میں زکوٰۃ نہیں۔ نیز یہ بھی شرط ہے کہ وہ جانور تناسل، زوائد اور فوائد کے لئے ہوں۔ سواری، بار برداری یا ہل میں جوتنے وغیرہ کے لئے نہ ہوں۔ ان مقاصد سے جو جانور ہوتے ہیں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں، وہ عوامل کہلاتے ہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ نے اموالِ زکوٰۃ اور ان کے نصاب کے سلسلہ میں ایک تحریر لکھوائی تھی تاکہ عاملین (سفراء) کو اس کی نقلیں دی جائیں اور وہ اس کے حساب سے زکوۃ وصول کریں۔ وہ تحریر آنحضور ﷺ کی تلوار کی مٹھ میں رکھی ہوئی تھی، اس زمانہ میں دستاویزات تلوار کی مٹھ میں رکھے جاتے تھے۔ ابھی کسی کو اس کی نقل نہیں دی گئی تھی کہ آپؐ کا وصال ہوگیا۔ پھر وہ تحریر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس رہی اس لئے کہ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ تھے۔ آپؓ نے اس کی نقلیں سفراء کو دیں، پھر آپؓ کے وصال کے بعد وہ تحریر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہی۔

(۱) جمہور کے نزدیک سونے کا مستقل نصاب بھی ہے اور بعض مسائل میں وہ سونے کو چاندی پر محمول بھی کرتے ہیں، اول کے اعتبار سے سونا مستقل جنس ہونا چاہئے اور ثانی کے اعتبار سے چاندی کا ہم جنس ہوگا، جیسے کرنسی: چاندی کی ہم جنس ہے۔ غرض سونے میں دو جہتوں کا اعتبار کیا گیا ہے، جیسے کرنسی (بنک نوٹ) میں بعض مسائل میں "زر" کا اعتبار کیا ہے، چنانچہ ایک ملک کی کرنسی میں کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ حرام ہے اور دو ملکوں کی کرنسی میں عرض (سامان) کا اعتبار کیا گیا ہے اور حوالہ میں ایک عوض کا ادھار جائز ہے۔

(۲) زمین کی پیداوار میں عشر کو مجازاً زکوٰۃ کہا جاتا ہے، اس لئے قابل زکوٰۃ اموال کی اجناس میں اس کا شمار بھی مجازاً ہے ۱۲

اس باب میں جو حدیث ہے وہ بہت طویل ہے اور اس میں پانچ مسئلے ہیں اور سب اہم ہیں، اس لئے ہم ان کو علحدہ علحدہ بیان کریں گے تاکہ طلباء پر بوجھ نہ پڑے اور وہ حدیث کو آسانی سے سمجھ لیں:

پہلا مسئلہ: اونٹوں کا نصاب اور ان کی زکوۃ:

پانچ اونٹوں سے کم میں زکوۃ نہیں۔ اور پانچ میں ایک ایسی بکری ہے جس کی قربانی جائز ہو یعنی اس کی عمر ایک سال ہو اور اس میں قربانی کے لئے مانع کوئی عیب نہ ہو، پھر چار وَقْص (فریضتین کا مابین) ہیں یعنی نو تک یہی فریضہ ہے پھر دس میں دو بکریاں ہیں (ایک نصاب سے دوسرا نصاب عقدین کہلاتا ہے اور ان کا درمیان وَقْص کہلاتا ہے)

اور پندرہ میں تین بکریاں اور بیس میں چار بکریاں واجب ہیں۔ اور پچیس میں ایک بنت مخاض واجب ہے یعنی ایک سالہ مادہ بچہ واجب ہے۔ پھر یہی فریضہ پینتیس تک باقی رہتا ہے، اور چھتیس میں ایک بنت لبون یعنی دو سالہ مادہ بچہ واجب ہے۔ اور یہ فریضہ پینتالیس تک رہتا ہے۔ اور چھیالیس میں حِقّہ یعنی تین سالہ مادہ بچہ واجب ہے، ساٹھ تک۔ پھر اکسٹھ میں جذعہ یعنی چار سالہ مادہ بچہ واجب ہے پچھتر تک (بس زکوۃ میں چار سال سے زیادہ عمر کا اونٹ نہیں لیا جاتا اس کے بعد پیچھے لوٹیں گے) اور چھہتّر میں دو بنت لبون واجب ہیں کیونکہ یہ چھتیس کا ڈبل ہے، صرف چند زیادہ ہیں۔ اور یہ فریضہ پینتالیس کے ڈبل تک باقی رہتا ہے پھر اکیانوے میں دو حقّے واجب ہیں اور یہ فریضہ ساٹھ کے ڈبل تک یعنی ایک سو بیس تک باقی رہتا ہے۔

پھر یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ "ہر چالیس میں بنت لبون اور ہر پچاس میں حقہ واجب ہے" اور اس قاعدہ کی تطبیق میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ ائمہ ثلاثہ نے ایک سو بیس کے بعد مسئلہ کا مدار اربعینات اور خمسینات یعنی چالیسویں اور پچاسویں پر رکھا ہے، پھر امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک سو بیس سے اگر ایک اونٹ بھی زیادہ ہو جائے تو فریضہ بدل جائے گا اور نیا حساب اربعینات اور خمسینات والا شروع ہو جائے گا۔ جتنے چالیسے نکلیں گے اتنے بنت لبون اور جتنے پچاسے نکلیں گے اتنے حقّے واجب ہونگے۔ چنانچہ ایک سو اکیس میں تین بنت لبون واجب ہونگے، کیونکہ اس میں تین چالیسے ہیں، پھر ایک سو تیس میں فریضہ بدلے گا، ان میں دو بنت لبون اور ایک حقہ واجب ہوگا کیونکہ اس میں دو چالیسے اور ایک پچاسہ ہے۔ اور ایک سو چالیس میں دو حقّے اور ایک بنت لبون واجب ہوگی اور ایک سو پچاس میں تین حقّے واجب ہونگے۔ غرض ہر دس پر فریضہ بدلے گا۔ درمیان کے نو وقص ہونگے اور یہ حساب اسی طرح چلتا رہے گا۔

اور امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک ایک سو اکیس پر فریضہ نہیں بدلے گا بلکہ ایک سو انتیس تک دو حقّے ہی واجب رہیں گے ایک سو تیس پر فریضہ بدلے گا اور حساب اربعینات اور خمسینات پر دائر ہوگا جس کی تفصیل امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کے بیان میں گذر چکی۔

ائمہ ثلاثہ کی دلیل باب کی حدیث ہے اس میں ہے: ''جب اونٹ ۱۲۰ سے زیادہ ہوں تو ہر پچاس میں حقہ اور ہر چالیس میں بنت لبون ہے''

اور حنفیہ نے حساب کا مدار پچاس پر رکھا ہے، ان کے نزدیک ہر پچاس میں حقہ واجب ہے اور چالیس کا اعتبار نہیں احناف ایک سو بیس میں دو حقے واجب کر کے از سر نو حساب شروع کرتے ہیں۔ اور ۲۰ تک چار بکریاں اور ۲۵ میں بنت مخاض واجب کر کے اس کو ۱۲۰ کے ساتھ ملاتے ہیں۔ پس مجموعہ میں یعنی ۱۴۵ میں دو حقے اور ایک بنت مخاض واجب کرتے ہیں۔ یہی فریضہ ۱۴۹ تک باقی رہتا ہے، پھر ۱۵۰ میں تین حقے واجب کرتے ہیں۔ اور یہ استیناف ناقص ہے، اس لئے کہ اس میں بنت لبون نہیں آئی،، پھر ۱۵۰ کے بعد دوبارہ حساب شروع ہوگا، اور ہر پانچ میں ایک بکری واجب ہوگی۔ اور ۲۵ میں ایک بنت مخاض پھر ۳۶ میں ایک بنت لبون واجب کر کے اس کو سابق سے ملائیں گے، اور مجموعہ ۱۸۶ میں تین حقے اور ایک بنت لبون واجب ہوگی، یہی فریضہ ۱۹۹ تک باقی رہے گا۔ پھر ۲۰۰ میں چار حقے واجب ہونگے، یہ استیناف کامل ہے پھر آخر تک اسی طرح استیناف کامل کیا جائے گا۔ یعنی ہر پچاس کے بعد حساب از سر نو شروع کیا جائے گا اور بنت لبون واجب کر کے اس کو سابق سے ملائیں گے، پھر پچاسہ پورا ہونے پر نیا حقہ واجب کریں گے۔

اور حنفیہ کا مستدل حضرت عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کی تحریر ہے جو آنحضور ﷺ نے ان کو لکھ کر دی تھی، اس میں ہے: **فإذا كانت أكثرَ من ذلك ففي كل خمسين حقة، فما فَضُلَ فإنه يُعَادُ إلى أول فريضة الأبل، فما كانت أقل من خمس وعشرين ففيه الغنم في كل خمس ذَوْدٍ شاة،** اس میں صراحت ہے کہ ۱۲۰ کے بعد فریضہ از سر نو شروع کیا جائے گا، اور بکریوں سے شروع کیا جائے گا۔ یہ حدیث سنن نسائی (۲:۲۱۸ ذکر حدیث عمرو بن حزم في العقول) میں ہے اس حدیث پر خصیب بن ناصح کے ضعف کا اعتراض کیا جاتا ہے مگر طحاوی (۲:۲۱۸ کتاب الزیادات، باب الزکاۃ في الإبل) میں ابو عمر الضریر عن حماد کے طریق سے دوسری سند ہے اور وہ اسناد صحیح ہے۔

علاوہ ازیں حضرت علی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے آثار (جو بالترتیب ابو داؤد حدیث ۱۵۷۲ باب زکاۃ السائمۃ اور امام محمد کی کتاب الآثار حدیث ۳۱۷ باب زکوۃ الإبل میں) ہیں ان میں اونٹوں کے نصاب کی تفصیل مسلک احناف کے مطابق ہے، پھر خاص طور سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر اس لئے اہمیت رکھتا ہے کہ صحیحین کی روایت کے مطابق ان کے پاس بھی ایک صحیفہ تھا جس میں آنحضور ﷺ نے دوسرے امور کے علاوہ اسنان الابل بھی لکھوائے تھے (بخاری کتاب الاعتصام باب مایکرہ من التعمق إلخ. مسلم کتاب الحج باب فضل المدینۃ) پس ظاہر یہ ہے کہ آپؓ کی بیان کردہ تفصیلات اس صحیفہ کے مطابق ہونگی۔

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ حدیث جو ائمہ ثلاثہ کا مستدل ہے وہ سفیان بن حسین کی زہری سے روایت ہے اور سفیان اگرچہ ثقہ ہیں مگر زہری کی روایتوں میں بالاتفاق ضعیف ہیں (تقریب ۲۴۴) اور ان کے متابع

سلیمان بن کثیر ہیں وہ بھی اگرچہ ثقہ ہیں مگر زہری کی روایتوں میں وہ بھی ضعیف ہیں (تقریب ۲۵۴) اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی جو حدیث بخاری (حدیث ۱۴۵۴) میں ہے وہ اس حدیث کی شاہد ہے، مگر اس میں انقطاع ہے (نصب الرایہ ۲:۳۳۸) علاوہ ازیں باب کی حدیث مجمل ہے اور عمرو بن حزم کی حدیث مفصل ہے پس مجمل کو مفصل کی طرف لوٹایا جائے گا۔

اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ فی کل خمسین حقۃ حنفیہ کی بیان کردہ تفصیل کے مطابق بھی صادق آتا ہے اور فی کل أربعین بنت لبون میں ۳۶ سے لے کر ۴۹ تک کے اعداد مراد ہیں۔ اہل عرب کے کلام میں اس قسم کا توسع پایا جاتا ہے وہ کسور کو چھوڑ دیتے ہیں، صرف عقود کو لیتے ہیں، اور حنفیہ کے نزدیک ۳۶ سے ۴۹ تک میں بنت لبون واجب ہوتی ہے۔ پس ان کے مذہب پر بھی اس روایت پر عمل ہوجاتا ہے اور جمع بین الروایات کے لئے یہ تاویل کرنی ضروری ہے۔

فائدہ (۱): بنت مخاض: اونٹنی کا ایک سالہ مادہ بچہ، مخاض: دردِ زہ، سال بھر کے بعد اونٹنی گابھن ہوجاتی ہے اس لئے یہ نام دیا گیا ہے، بنت لبون: دو سالہ مادہ بچہ، لبون دودھ والی، دو سال میں اونٹنی دوسرا بچہ جنتی ہے اور دودھ دیتی ہے، اس لئے یہ نام دیا گیا ہے۔ حِقّہ: تین سالہ مادہ بچہ، یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اب وہ بار برداری کے قابل ہوجاتا ہے، جَذَعہ: چار سالہ مادہ بچہ۔ جَذَع: جوان، پانچویں سال میں اونٹنی کا مادہ بچہ جوان ہوجاتا ہے اور گابھن ہونے کے قابل ہوجاتا ہے۔ اس لئے یہ نام دیا گیا ہے، اسی طرح دس سال کی عمر تک اونٹوں کے لئے عربی میں الگ الگ الفاظ ہیں۔

فائدہ (۲): اونٹوں کی زکوٰۃ خواہ ائمہ ثلاثہ کے قول کے مطابق وصول کریں خواہ حنفیہ کے قول کے مطابق مالیت میں کچھ فرق نہ پڑے گا۔ دونوں صورتوں میں تقریباً برابر مالیت وصول ہوگی، اسی لئے ابن جریر طبری کا تخییر کا قول ہے کہ جس طرح چاہو زکات وصول کرو۔

اور دونوں حساب نہایت آسان ہیں، کلکیولیٹر کی مطلق ضرورت نہیں، کوئی بھی عدد بولو میں ایک سیکنڈ میں اس کا جواب بتادونگا، اور اگر کچھ دشواری ہے تو ائمہ ثلاثہ کے حساب میں ہے، حنفیہ کے حساب میں تو نام کو بھی دشواری نہیں۔ مثلاً کوئی کہے کہ ۷۳۵ اونٹوں کی زکات کیا ہے؟ جواب: چودہ حقے اور ایک بنت مخاض (عند الحنفیہ) ۷۳۸ کی زکات کیا ہے؟ جواب ۱۴ حقے ایک بنت لبون، ۹۱۰ کی زکات کیا ہے؟ جواب ۱۸ حقے اور دو بکریاں۔ اسی طرح کوئی عدد بولو فوراً جواب دیا جائے گا۔

[٤] باب ماجاء فی زکاۃ الإبل والغنم

[٦٢١-] حدثنا زِيَادُ بنُ أيُّوبَ البَغْدَادِيُّ، وإبراهيمُ بنُ عبدِ اللّٰهِ الهَرَوِيُّ، ومحمدُ بنُ كامِلٍ المَرْوَزِيُّ - المَعنَى وَاحِدٌ - قالوا: نا عَبَّادُ بنُ العَوَّامِ عن سُفيانَ بنِ حُسَيْنٍ، عَنِ الزُّهْرِيِّ، عن سالِمٍ،

عن أبيه، أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم كَتَبَ كِتابَ الصَّدَقَةِ، فَلَمْ يُخرِجْهُ إِلَى عُمَّالِهِ حتى قُبِضَ، فَقَرَنَهُ بِسَيْفِهِ، فلما قُبِضَ عمل به أبوبكر حتى قُبِضَ، وعُمَرُ حتى قُبِضَ، وكانَ فيه في خَمْسٍ مِنَ الإِبِلِ شاةٌ، وفي عَشْرٍ شَاتَانِ، وفي خَمْسَ عَشْرَةَ ثلاثُ شِيَاهٍ، وفي عِشرين أَرْبَعُ شِيَاهٍ، وفي خَمْسٍ وعشرين بنتُ مَخَاضٍ إلى خَمْسٍ وثلاثين، فإذا زَادَتْ فَفِيْهَا بِنْتُ لَبُوْنٍ إلى خَمْسٍ وَأَرْبَعِيْنَ، فإذا زَادَتْ فَفِيْهَا حِقَّةٌ إلى سِتِّيْنَ، فإذا زَادَتْ فَفِيْهَا جَذَعَةٌ إلى خَمْسٍ وَسَبْعِيْنَ، فإذا زَادَتْ فَفِيْهَا ابْنَتَا لَبُوْنٍ إلى تِسْعِيْنَ، فإذا زَادَتْ فَفِيْهَا حِقَّتَانِ إلى عِشْرِيْنَ ومائةٍ، فإذا زَادَتْ على عِشْرِيْنَ ومِائَةٍ فَفِي كُلِّ خَمْسِيْنَ حِقَّةٌ، وفي كُلِّ أَرْبَعِيْنَ ابْنَةُ لَبُوْنٍ.

ترجمہ وو ضاحت: امام ترمذی رحمہ اللہ کے تین اساتذہ ہیں جن سے وہ اس حدیث کو روایت کرتے ہیں اور سب کا مضمون ایک ہے جو آئندہ آرہا ہے ——— ابن عمرؓ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے زکوۃ کے سلسلہ میں ایک تحریر لکھوائی، پس اس کو عاملین کی طرف نہیں نکالا (یعنی ابھی کسی کو اس کی نقل نہیں دی) یہاں تک کہ آپؐ کی وفات ہوگئی۔ پس اس تحریر کو اپنی تلوار (کی مٹھ) میں رکھا (یہاں ف صرف عطف کے لئے ہے تعقیب مع الوصل مراد نہیں، کیونکہ تحریر کو تلوار میں رکھنا مقدم ہے اور وفات مؤخر ہے) پس جب آپؐ کا وصال ہوگیا تو اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمل کیا۔ یعنی انھوں نے اس کی نقلیں سفراء کو دیں یہاں تک کہ ان کا وصال ہوگیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (نقلیں دیں) تا آنکہ ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور اس میں تھا: پانچ اونٹ میں ایک بکری، اور دس میں دو بکریاں، اور پندرہ میں تین بکریاں، اور بیس میں چار بکریاں، اور پچیس میں بنت مخاض، پینتیس تک، پس جب اضافہ ہو اس میں تو بنت لبون ہے پینتالیس تک، پس جب اضافہ ہو اس میں تو حقہ ہے ساٹھ تک، پس جب اضافہ ہو اس میں تو جذعہ ہے پچھتر تک، پس جب اضافہ ہو اس میں تو دو بنت لبون ہیں نوے تک۔ پس جب اضافہ ہو اس میں تو دو حقے ہیں ایک سو بیس تک، پس جب ایک سو بیس پر اضافہ ہو تو ہر پچاس میں حقہ ہے اور ہر چالیس میں بنت لبون ہے۔

دوسرا مسئلہ: بکریوں کا نصاب اور ان کی زکوۃ:

بھیڑ بکریوں کا چھوٹا ریوڑ چالیس کا تجویز کیا گیا ہے۔ اور اس میں ایک بکری واجب کی ہے، اور بڑا ریوڑ تین چالیسوں سے زیادہ کا تجویز کیا ہے۔ چنانچہ ۱۲۱ میں دو بکریاں واجب ہیں، اور یہی فریضہ ۲۰۰ تک باقی رہتا ہے۔ اور ۲۰۱ میں تین بکریاں واجب ہیں۔ پھر قاعدہ کلیہ ہے: ”ہر سیکڑہ میں ایک بکری“ اور اس قاعدہ کی تطبیق میں بھی اختلاف ہوا ہے: ائمہ اربعہ کے نزدیک اب سیکڑہ پورا ہونے پر فریضہ بدلے گا۔ چنانچہ ان کے نزدیک ۲۰۱ سے ۲۹۹ تک وقص ہے اس لئے کہ سیکڑہ ۳۰۱ پر پورا ہوگا۔ پورے ۳۰۰ پر پورا نہیں ہوگا، پھر قاعدہ کلیہ جاری ہوگا تو ۴۰۰ میں چار بکریاں ہونگی اور

۵۰۰ میں پانچ اور ۶۰۰ میں چھ اسی طرح حساب چلے گا۔ اور حسن بن حیؒ کہتے ہیں: جب سیکڑہ شروع ہوگا اسی وقت فریضہ بدل جائے گا۔ چنانچہ ان کے یہاں ۲۰۱ کے بعد ۳۰۱ پر فریضہ بدلے گا اور چار بکریاں واجب ہونگی۔ پھر ۴۰۱ میں پانچ اور ۵۰۱ میں چھ وقس علی ہذا۔ یعنی ہر سیکڑہ کے شروع میں اس سیکڑہ کی بکری واجب ہوگی اور سیکڑہ پورا ہونے تک وہ فریضہ باقی رہے گا۔ حدیث سے جمہور کا مسلک ثابت ہوتا ہے۔ حسن بن حی کے قول کی کوئی دلیل نہیں صرف قیاس (عقلی دلیل) ہے، جو کافی نہیں۔

> وفي الشَّاءِ في كُلِّ أَرْبَعِيْنَ شَاةً شَاةٌ إلى عِشْرِيْنَ ومِائَةٍ، فإذَا زَادَتْ فَشَاتَانِ إلى مِائَتَيْنِ، فإذا زَادَتْ فَثَلَاثُ شِيَاهٍ إلى ثَلَاثِمِائَةِ شَاةٍ فإذا زادتْ على ثَلَاثِ مِائَةِ شَاةٍ فَفِي كُلِّ مِائَةِ شَاةٍ شَاةٌ، ثم لَيْسَ فِيْهَا شَيْئٌ حتى تَبْلُغَ أَرْبَعَمِائَةٍ.

ترجمہ: اور بکریوں میں: ہر چالیس بکریوں میں ایک بکری ہے، ایک سوبیس تک۔ پس جب بڑھ جائیں (۱۲۱ ہو جائیں) تو دو بکریاں ہیں دوسو تک۔ پس جب بڑھ جائیں (۲۰۱ ہو جائیں) تو تین بکریاں ہیں تین سو تک۔ پس جب بڑھ جائیں تین سو بکریوں پر تو ہر سو بکری میں ایک بکری ہے۔ پھر ان میں کچھ نہیں یہاں تک کہ چار سو کو پہنچ جائیں۔

تیسرا مسئلہ: خُلطہ کا اعتبار ہے یا نہیں؟

خلطہ (بالضم) کے معنی ہیں: شرکت، خاص طور پر مواشی میں شرکت۔ پھر خُلطہ کی دو قسمیں ہیں:

ایک: خلطۃ الشُّیوع، جس کو خلطۃ الاعیان اور خلطۃ الاشتراک بھی کہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ میراث میں ملنے کی وجہ سے یا بخشش میں ملنے کی وجہ سے، یا مشترک رقم سے خریدنے کی وجہ سے مواشی دو شخصوں میں مشترک (غیر منقسم) ہوں۔ مثلاً ایک شخص کا انتقال ہوا اس نے ایک سوبیس بکریاں چھوڑیں اور وارث ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے تو بھائی بہن اَثلاثاً ان بکریوں کے مالک ہونگے، اور جب تک وہ بکریاں تقسیم نہیں ہونگی ان میں خلطۃ الشیوع ہوگا۔

دوسری قسم: خلطۃ الجوار، جس کو خلطۃ الاوصاف بھی کہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ دو شخصوں کے جانور ملکیت میں متمائز (جدا جدا) ہوں، مگر دس باتوں میں (عند الشافعی) اور چھ باتوں میں (عند مالک واحمد) مشترک ہوں[1]

(۱) امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک خلطۃ الجوار میں جن چھ باتوں میں اشتراک ضروری ہے وہ یہ ہیں: (۱) چراگاہ (۲) باڑا (مویشیوں کے رہنے کی جگہ) (۳) چرواہا (۴) دودھ دوہنے کا برتن (۵) بجار (وہ نر جو نسل کشی کے لئے ریوڑ میں رکھا جاتا ہے) (۶) پانی پینے کی جگہ مثلاً حوض نہر وغیرہ۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک مزید چار چیزیں ضروری ہیں: (۱) کتا (جو ریوڑ کی حفاظت کے لئے رکھا جاتا ہے) (۲) چراگاہ جانے اور لوٹنے کا راستہ (۳) دودھ دوہنے والا (۴) خلطۃ الجوار کی نیت۔ اگر اتفاقاً اشتراک ہوگیا ہو تو وہ خلطہ نہیں۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: دونوں خلطوں سے دو یا چند مالکوں کے مواشی کمالِ رجلٍ واحدٍ (ایک شخص کے مال کی طرح) ہو جاتے ہیں اور خلطہ وجوب زکوٰۃ اور تقلیل وتکثیر زکوٰۃ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک وجوبِ زکوٰۃ کے لئے شرط یہ ہے کہ ہر مالک کی ملکیت بقدر نصاب ہو۔

نفس وجوب کی مثال: دو شخصوں کی چالیس بکریاں ہوں اور کوئی بھی خلطہ ہو تو عند الشافعی واحمد: ایک بکری واجب ہوگی۔ اور امام مالکؒ کے نزدیک کچھ واجب نہیں۔ کیونکہ ہر مالک کی ملکیت نصاب سے کم ہے۔

تکثیر کی مثال: دو شخصوں کی انصافاً ۲۰۲ بکریاں ہوں اور کوئی بھی خلطہ ہو تو تین بکریاں واجب ہونگی، اور اگر خلطہ نہ ہو تو ہر ایک پر ایک بکری واجب ہوگی، پس خلطہ کی وجہ سے زکوٰۃ زیادہ ہوگئی۔

تقلیل کی مثال: تین شخصوں کی ایک سو بیس بکریاں ہوں اور کوئی بھی خلطہ ہو تو ایک بکری واجب ہوگی، اور خلطہ نہ ہو تو تین بکریاں واجب ہونگی، پس خلطہ کی وجہ سے زکوٰۃ کم ہوگئی۔

اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک خلطہ کا مطلق اعتبار نہیں (یعنی خلطہ کرنا تو جائز ہے مگر بابِ زکوٰۃ میں اس کا اعتبار نہیں) نہ وجوب میں، نہ تقلیل میں اور نہ تکثیر میں۔ حنفیہ کے نزدیک اعتبار ملکیت کا ہے۔ چنانچہ پہلی صورت میں کچھ واجب نہیں ہوگا کیونکہ ہر ایک کی ملکیت نصاب سے کم ہے۔ اور دوسری صورت میں دو بکریاں واجب ہونگی کیونکہ ہر ایک: ایک سو ایک کا مالک ہے۔ اور تیسری صورت میں تین بکریاں واجب ہونگی، کیونکہ ہر ایک کی ملک میں چالیس بکریاں ہیں۔

اور جمع وتفریق ملکیت میں مراد ہے، مکان میں بالاتفاق مراد نہیں، کیونکہ مکان میں بالاجماع: جمع وتفریق کی جائے گی، مثلاً ایک شخص کی چالیس بکریاں ایک چراگاہ میں ہوں اور دوسری چالیس دوسری چراگاہ میں تو دونوں کو جمع کر کے اسّی میں سے ایک بکری لی جائے گی۔

اور حدیث: لَا یُجْمَعُ بین متفرِّقٍ، و لا یُفَرَّق بین مجتمعٍ مخافة الصدقة: جدا کو اکٹھا نہ کیا جائے اور اکٹھا کو جدا نہ کیا جائے، زکوٰۃ کے ڈر سے۔ اس میں مالکانِ مویشی سے بھی خطاب ہے اور ساعی (زکوٰۃ وصول کرنے والے) سے بھی۔ مالکانِ مواشی سے یہ کہا گیا ہے کہ جو مویشی جدا ہیں ان کو زیادہ زکوٰۃ واجب ہونے کے اندیشہ سے جمع نہ کیا جائے، مثلاً دو شخصوں کی چالیس چالیس بکریاں ہیں، ان میں دو بکریاں واجب ہونگی لیکن اگر وہ جمع کر کے ایک شخص کی بکریاں بتائیں تو ایک بکری واجب ہوگی، ایسی حیلہ بازی نہ کی جائے۔ اسی طرح جو مویشی جمع ہیں ان کو وجوبِ زکوٰۃ کے اندیشہ سے جدا نہ کیا جائے، مثلاً ایک شخص کی چالیس بکریاں ہیں اور دوسرے کی بیس، اول پر ایک بکری واجب ہے اور دوسرے پر کچھ نہیں۔ اب اگر پہلا شخص اپنی چند بکریاں دوسرے کے ریوڑ میں ملا دے تو دونوں پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ حدیث میں ایسا فریب کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اور ساعی سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ زیادہ زکوٰۃ وصول کرنے کی غرض سے جمع وتفریق نہ کرے۔ مثلاً دو بھائیوں کے پاس انصافاً دوسو دو بکریاں ہیں اور متفرق ہیں۔ پس ہر ایک پر ایک بکری واجب ہے، ساعی ان کو جمع کرائے اور دوسو دو میں سے تین بکریاں لے ایسا نہ کرے، بلکہ ملکیت کا اعتبار کرکے زکوٰۃ لے یا دو بھائیوں کی ملی ہوئی اسّی بکریاں ہیں، ساعی دو بکریاں لینے کے لئے ان کو جدا کرائے اس سے منع کیا ہے کیونکہ جب ملکیت کا اعتبار کیا جائے گا تو ملی ہوئی میں بھی دو بکریاں واجب ہونگی۔ اور حدیث کا یہ مطلب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر ہے، احناف کے نزدیک لایُجمع اور لا یُفرّق فعل مضارع منفی ہیں، فعل نہی نہیں ہیں۔ پس یہ ارشاد انشاء نہیں بلکہ اخبار ہے یعنی جمع وتفریق کے بارے میں خبر دی گئی ہے کہ یہ لغو عمل ہے، زکوٰۃ پر اس کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، کیونکہ زکوٰۃ کا مدار ملکیت پر ہے۔ جس کی جتنی ملکیت ہوگی اس کے اعتبار سے زکوٰۃ لی جائے گی، خواہ جانور جمع ہوں یا متفرق۔

اور ائمہ ثلاثہ: لایُجمع اور لایُفرّق کو نہی مانتے ہیں، کیونکہ اَخبار انشاء کو متضمن ہوتے ہیں۔ پھر وہ نہی کا تعلق صرف ساعی سے جوڑتے ہیں، کیونکہ مالکان کو جمع وتفریق کا ہر وقت اختیار ہے۔ خواہ ان کی نیت کچھ ہو، اور ان کے نزدیک حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر جانور متفرق ہوں اور زکوٰۃ واجب نہ ہوتی ہو یا کم واجب ہوتی ہو تو ساعی زکوٰۃ کی خاطر ان کو جمع نہ کرے، اور مختلط ہوں تو جدا نہ کرے بلکہ جس حال میں ہوں اس کا اعتبار کرکے زکوٰۃ وصول کرے۔

چوتھا مسئلہ: وما کان من خَلِیطَیْنِ فإنھما یَتَراجَعانِ بالسَّوِیَّۃِ: یعنی جو جانور زکوٰۃ میں دو شریکوں سے لیا گیا ہے وہ آپس میں ٹھیک ٹھیک لین دین کرلیں گے ـــــ اس جملہ میں بھی اختلاف ہے۔ اور وہ پہلے جملہ میں اختلاف پر مبنی ہے۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: اس جملہ کا تعلق دونوں خلطوں سے ہے، مگر خلطۃ الشیوع میں کچھ لین دین نہیں ہوگا صرف خلطۃ الجوار میں لین دین ہوگا، مثلاً زید کی چالیس بکریاں ہیں اور خالد کی بھی چالیس بکریاں ہیں اور انھوں نے خلطۃ الجوار کر رکھا ہے تو اسّی میں سے ساعی ایک بکری لے گا، پھر وہ جس کی بکریوں میں سے لے گا وہ اس کی آدھی قیمت دوسرے سے لیلے گا، کیونکہ دونوں پر آدھی آدھی بکری واجب ہوئی ہے اور بکری ایک کے جانوروں میں سے لی گئی ہے، پس اس کا مالک بکری کی آدھی قیمت اپنے ساتھی سے لے لیگا۔

اور احناف کے نزدیک: اس جملہ کا تعلق صرف خلطۃ الشیوع سے ہے، پس اگر اسّی بکریاں انصافاً ہوں تو دو بکریاں واجب ہونگی، اور کوئی لین دین نہ ہوگا ـــــ اور اَثلاثاً ہوں تو دو ثلث والے پر ایک بکری واجب ہے اور ایک ثلث والے پر کچھ واجب نہیں، کیونکہ نصاب مکمل نہیں، پس جو ایک بکری زکوٰۃ میں لی گئی ہے اس کا تہائی: دو ثلث والا ایک ثلث والے کو دے گا ـــــ اور ایک سو بیس بکریاں اثلاثاً ہوں تو دو بکریاں واجب ہونگی، پس دو ثلث والا: ایک ثلث والے سے ایک بکری کا ثلث لے گا، کیونکہ اس کا ایک ثلث زائد گیا ہے۔ اور اکسٹھ اونٹ ہوں ایک کے پچیس اور دوسرے کے چھتیس اور خلطۃ الشیوع ہو یعنی املاک متمائزہ نہ ہوں تو ایک بنت مخاض اور ایک بنت لبون

واجب ہوگی۔ پھر ۳۶ والا بنت لبون کے اکسٹھ حصوں میں سے پچیس حصے ۲۵ والے کو دے گا، اور پچیس والا بنت مخاض کے اکسٹھ حصوں میں سے چھتیس حصے: چھتیس والے کو دے گا (یہ دونوں طرف سے لین دین ہوا)

پانچواں مسئلہ: زکوٰۃ میں بوڑھا جانور اور ایسا عیب دار جانور جس کی وجہ سے اس کی قربانی درست نہ ہو نہیں لیا جائے گا۔ زکوٰۃ میں درمیانی جانور لیا جائے گا، شاندار جانور بھی نہیں لیا جائے گا تا کہ مالک پر بار نہ پڑے۔ اور نکما بھی نہیں لیا جائے گا تا کہ غرباء کا نقصان نہ ہو۔

ولاَ يُجْمَعُ بَيْنَ مُتَفَرِّقٍ، ولاَ يُفَرَّقُ بَيْنَ مُجْتَمِعٍ: مَخافَةَ الصَّدَقَةِ، ومَاكَانَ مِنْ خَلِيْطَيْنِ فَإِنَّهُمَا يَتَرَاجَعَانِ بالسَّوِيَّةِ، ولاَ يُؤْخَذُ فی الصَّدَقَةِ هَرِمَةٌ وَلاَ ذَاتُ عَيْبٍ.

وقال الزُّهْرِیُّ: إِذَا جَاءَ الْمُصَدِّقُ قَسَّمَ الشَّاءَ أَثْلاَثًا: ثُلُثٌ خِيَارٌ، وثُلُثٌ أَوْسَاطٌ، وثُلُثٌ شِرَارٌ. وأَخَذَ الْمُصَدِّقُ مِنَ الْوَسَطِ، وَلَمْ يَذْكُرِ الزُّهْرِیُّ الْبَقَرَ.

وفی الباب: عن أبی بَكْرٍ الصِّدِّيقِ، وبَهْزِ بنِ حَكِيْمٍ، عن أبيه، عن جَدِّهِ، وأبی ذَرٍّ، وأنسٍ.

قال أبو عيسى: حديث ابنِ عُمَرَ حديثٌ حسنٌ، والعَمَلُ على هذا الحديثِ عند عَامَّةِ الفُقَهَاءِ، وقد رَوَى يونُسُ بنُ يَزِيْدَ وغيرُ وَاحِدٍ عن الزُّهْرِیِّ، عن سَالِمٍ هذا الحديثَ، ولم يَرْفَعُوهُ، وإِنَّمَا رَفَعَهُ سُفيانُ بنُ حُسَيْنٍ.

ترجمہ: اور متفرق جانوروں کو جمع نہیں کیا جائے گا اور مختلط جانوروں کو جدا نہیں کیا جائے گا زکوٰۃ کے اندیشہ سے (مخافة الصدقة: دونوں فعلوں کا مفعول لہ ہے اور اس میں تنازع فعلان ہے۔ پس ایک فعل کا ایسا ہی معمول محذوف مانا جائے گا) اور وہ جانور جو دو شریکوں سے لیا گیا ہے (من خليطين کا تعلق ماخوذاً محذوف سے ہے) پس وہ باہم ٹھیک ٹھیک لین دین کرلیں گے اور زکوٰۃ میں بوڑھا جانور اور عیب دار جانور نہیں لیا جائے گا۔

امام ابن شہاب زہری فرماتے ہیں: جب عامل (زکوٰۃ وصول کرنے والا) آئے تو وہ بکریوں کو (اسی طرح دیگر مواشی کو) تین حصوں میں بانٹے۔ ایک قسم اچھے جانوروں کی، دوسری قسم درمیانی جانوروں کی اور تیسری قسم نکمے جانوروں کی۔ اور عامل درمیانی جانور میں سے لے (وَسَط (بالفتح) کے معنی ہیں: معتدل، درمیانی۔ اور وسْط (بالسکون) کے معنی ہیں: درمیان۔ اور دونوں کے درمیان فرق اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ اگر اس کی جگہ بَيْنَ رکھیں اور معنی درست ہوں تو وہ بالسکون ہے اور بین رکھنے کی صورت میں معنی درست نہ ہوں تو وہ بالفتح ہے) اور امام زہری نے (اس حدیث میں) گایوں اور بھینسوں (کی زکوٰۃ) کا ذکر نہیں کیا۔

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے (مگر پہلے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ یہ سفیان بن حسین کی

امام زہری سے روایت ہے، اور وہ امام زہری کی روایتوں میں ضعیف قرار دیئے گئے ہیں، اور ان کے متابع سلیمان بن کثیر کا بھی یہی حال ہے، وہ بھی امام زہری کی روایتوں میں ضعیف ہیں۔ اور یہی دونوں اس حدیث کو مرفوع کرتے ہیں، اور ان کے علاوہ امام زہری کے دوسرے تلامذہ مثلاً یونس بن یزید اور دیگر متعدد حضرات اس حدیث کو امام زہری سے اسی سند سے روایت کرتے ہیں، مگر وہ حدیث کو مرفوع نہیں کرتے (بلکہ اس کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول قرار دیتے ہیں) نیز امام ترمذی نے اس مسئلہ میں اجماع کا دعوی کیا ہے (مگر معلوم نہیں کونسا مسئلہ مراد ہے۔ حدیث میں تو پانچ مسئلے ہیں، امام ترمذی نے مسئلہ کی تعیین کئے بغیر یہ بات کہی ہے)

بابُ ماجاء فی زَکَاۃِ البَقَرِ

گایوں بھینسوں کی زکوۃ کا بیان

جس طرح لفظ غَنَمْ اسم جنس ہے اور اس کی دو نوعیں ہیں: مَعْز (بکرا) اور ضانٌ (بھیڑ) اسی طرح بَقَر بھی اسم جنس ہے اور اس کی بھی دو نوعیں ہیں: جاموس (بھینس) اور ثَورٌ (بیل) اور عرب میں صرف گائے ہوتی ہے۔ بھینس نہیں ہوتی، پس غیر مقلدین کا یہ کہنا کہ بھینس کی قربانی ثابت نہیں بے معنی سی بات ہے، جب عرب میں بھینس ہوتی ہی نہیں تو اس کی قربانی کہاں سے ثابت ہوگی؟ دیکھنا صرف یہ ہوگا کہ بقر کا اطلاق بھینس پر ہوتا ہے یا نہیں؟ تو جاننا چاہئے کہ بقر کا اطلاق بھینس پر بھی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی قربانی بھی درست ہے۔

نصاب: گایوں بھینسوں کا چھوٹا ریوڑ ۳۰ کا بنایا ہے، اس سے کم میں زکوۃ واجب نہیں اور تیس میں تبیع یا تبیعۃ (ایک سالہ مذکر یا مؤنث بچہ) واجب ہوتا ہے۔ پھر ۹ وقص ہیں اور ۴۰ میں مُسِنّ یا مُسِنَّۃ (دو سالہ مذکر یا مؤنث بچہ) واجب ہوتا ہے۔ پھر قاعدہ کلیہ ہے: ''ہر تیس میں ایک تبیعہ اور ہر چالیس میں ایک مسنہ واجب ہے'' اور اس قاعدہ کو جاری کرنے میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک چالیس کے بعد انیس وقص ہیں، ساٹھ میں فریضہ بدلے گا کیونکہ پچاس میں کوئی حساب نہیں بیٹھتا۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ کے تین قول ہیں: اول: صاحبین کے قول کے موافق۔ دوم: چالیس کے بعد مطلق وقص نہیں، ایک بھی بڑھے گا تو اس میں زکوۃ واجب ہے۔ اور زکوۃ مسنہ کی قیمت کے حساب سے لی جائے گی۔ مثلاً مسنہ کی قیمت اسی روپے ہے تو ۴۱ میں ایک مسنہ اور دو روپے لیں گے، اور ۴۲ میں ایک مسنہ اور چار روپے لیں گے وعلی ہذا۔ سوم: چالیس کے بعد نو وقص ہیں اور ۵۰ میں مسنہ کی قیمت کا چوتھائی واجب ہوگا۔ مسنہ کی قیمت اسی روپے فرض کی تھی پس پچاس میں ایک مسنہ اور بیس روپے واجب ہونگے۔ اور ساٹھ میں بالاجماع دو تبیعے واجب ہیں کیونکہ اس میں سے دو تیس نکلتے ہیں، اور ستر میں ایک تبیعہ اور ایک مسنہ ہوگا، کیونکہ اس میں سے ایک تیس اور ایک چالیس نکلتا

ہے اور اسّی میں دو مُسنّے اور نوے میں تین تبیعے واجب ہونگے وقس علی ہذا۔

فائدہ: تبیع اور تبیعہ: ایک سالہ مذکر یا مؤنث بچہ کو کہتے ہیں۔ یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ ایک سال تک جب ماں چرنے چگنے کے لئے جاتی ہے تو اس کا بچہ بھی پیچھے پیچھے جاتا ہے، اور مُسن یا مُسنۃ: دو سالہ مذکر یا مؤنث بچہ کو کہتے ہیں چونکہ دو سال کے بعد بچہ کے دودھ کے دانت گرتے ہیں اس لئے یہ نام دیا گیا ہے، اور جاننا چاہئے کہ اونٹ کا مادہ بچہ زیادہ قیمتی ہوتا ہے اس لئے وہاں زکوۃ میں مؤنث بچہ ہی لیا جاتا ہے اور گائے بھینس کے مذکر و مؤنث بچوں کی قیمت یکساں ہوتی ہے اس لئے یہاں مذکر بچہ بھی لے سکتے ہیں اور مؤنث بھی۔

حدیث (۱): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تیس گایوں بھینسوں میں ایک: ایک سالہ مذکر یا مؤنث بچہ ہے۔ اور ہر چالیس میں ایک دو سالہ مذکر یا مؤنث بچہ ہے۔

تشریح: خصیف کے شاگرد عبد السلام بن حرب جو ثقہ اور احفظ ہیں: ابو عبیدۃ اور حضرت ابن مسعودؓ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں بڑھاتے۔ اور دوسرے شاگرد قاضی شریک جو کثیر الخطاء ہیں عن أبیہ بڑھاتے ہیں اور یہ ان کا وہم ہے اس لئے کہ ابو عبیدۃ کے والد خود ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس لئے یہ اضافہ بے معنی ہے۔ اور اس حدیث میں انقطاع ہے کیونکہ ابو عبیدۃ کا اپنے والد سے سماع نہیں، وہ بچے تھے اور حضرت ابن مسعودؓ کا انتقال ہو گیا تھا۔

حدیث (۲): حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: مجھے رسول اللہ ﷺ نے یمن کا گورنر بنا کر بھیجا اور حکم دیا کہ میں ہر تیس گایوں بھینسوں میں سے ایک: ایک سالہ بچہ نر یا مادہ لوں۔ اور ہر چالیس میں سے ایک دو سالہ بچہ نر یا مادہ لوں۔ اور ہر بالغ سے (سالانہ) ایک دینار یا ایک دینار کی قیمت کا مُعافری کپڑا (جو یمن میں بنتا تھا) لوں۔

تشریح: یہ حدیث بھی منقطع ہے اس لئے کہ مسروق رحمہ اللہ کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے لقاء و سماع نہیں۔ اور سفیان ثوری کے بعض تلامذہ اس حدیث کو مرسل روایت کرتے ہیں، یعنی مسروق حضرت معاذ کا واقعہ بیان کرتے ہیں، ان سے روایت نہیں کرتے اور مرسل روایت اصح ہے۔

جاننا چاہئے کہ یمن میں عیسائی بکثرت تھے۔ وہاں کے پادریوں کا ایک وفد مدینہ آیا تھا اور رسول اللہ ﷺ سے بحث و مباحثہ کیا تھا، اس موقع پر سورۂ آل عمران کی شروع کی ۹۰ آیتیں نازل ہوئی تھیں، اور ان کو مباہلہ کی دعوت دی گئی تھی، مگر انھوں نے باہمی مشورہ کر کے مباہلہ سے انکار کیا تھا اور اسلامی حکومت کی ماتحتی قبول کر لی تھی۔ اور فی نفر سالانہ ایک دینار اسلامی گورنمنٹ کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس مصالحت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یمن کے دو مخلاف (پرگنے) بنائے تھے، اور ایک پرگنہ کا گورنر حضرت ابو موسیٰ اشعری کو اور دوسرے کا گورنر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو بنایا تھا۔ باب میں مذکور حدیث اسی موقعہ کی ہے جب آنحضور ﷺ نے ان کو گورنر بنا کر روانہ کیا تو مختلف ہدایات دیں ان میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ وہ غیر مسلموں سے فی نفر سالانہ ایک دینار وصول کریں۔ اور اگر کسی کے پاس دینار نہ ہو تو معافری

کپڑا جو وہاں گھر گھر بنتا تھا اور جس کو ہر شخص آسانی سے دے سکتا تھا ایک دینار کی قیمت کا کپڑا وصول کریں اور عورتوں اور بچوں پر جزیہ نہیں۔ اور جزیہ کیوں لیا جاتا ہے؟ اور فی نفر جزیہ کتنا واجب ہے؟ یہ باتیں آئندہ آئیں گی۔

[۵] باب ماجاء فی زكاة البقر

[٦٢٢-] حدثنا محمدُ بنُ عُبَيْدٍ المُحَارِبِيُّ، وأبو سعيدٍ الأشَجُّ، قالا: نا عبدُ السَّلَامِ بنُ حَرْبٍ، عن خُصَيْفٍ، عن أبی عُبَيْدَةَ عن عبدِ اللّٰهِ بنِ مسعودٍ، عن النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم، قال:" فِیْ ثَلَاثِيْنَ مِنَ الْبَقَرِ تَبِيْعٌ او تَبِيْعَةٌ، وفی كُلِّ أَرْبَعِيْنَ مُسِنَّةٌ"

وفی الباب: عن مُعَاذِ بنِ جَبَلٍ. قال أبو عيسى: هٰكَذَا رَوَى عبدُالسَّلَامِ بنُ حَرْبٍ، عن خُصَيْفٍ، وعبدُ السَّلَامِ ثِقَةٌ حَافِظٌ؛ ورَوَى شَرِيْكٌ هذا الحديثَ عن خُصَيْفٍ، عن أبی عُبَيْدَةَ، عن أبيهِ، عن عبدِاللّٰهِ، وأبو عُبَيْدَةَ بنُ عبدِ اللّٰهِ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ أَبِيْهِ.

[٦٢٣-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، نا عبدُ الرَّزَّاقِ، ناسفيانُ، عن الأَعْمَشِ، عن أبی وائلٍ، عن مَسْرُوْقٍ، عن مُعَاذِ بنِ جَبَلٍ، قال: بَعَثَنِیْ النبیُّ صلی اللہ علیه وسلم إِلَى اليَمَنِ، فَأَمَرَنِیْ أَنْ آخُذَ مِنْ كُلِّ ثَلَاثِيْنَ بَقَرَةً تَبِيْعًا أَوْ تَبِيْعَةً، ومِنْ كُلِّ أَرْبَعِيْنَ مُسِنَّةً، ومَنْ كُلِّ حَالِمٍ دِيْنَاراً أَوْ عَدْلَهُ مُعَافِرَ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ، ورَوَى بعضُهم هذا الحديثَ عن سُفيان، عن الأَعْمَشِ، عن أبی وائلٍ، عن مَسْرُوْقٍ: أَنَّ النبیَّ صلی اللہ علیه وسلم بَعَثَ مُعَاذًا إِلَى اليَمَنِ فَأَمَرَهُ أَنْ يَأْخُذَ، وهٰذا أَصَحُّ.

حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا محمدُ بنُ جَعْفَرٍ، نا شُعْبَةُ، عن عَمْرِو بنِ مُرَّةَ، قال: سَأَلْتُ أَبا عُبَيْدَةَ هَلْ تَذْكُرُ مِنْ عبدِ اللّٰهِ شَيْئًا؟ قال: لا.

وضاحت: امام ترمذی نے آخر میں سند کے ساتھ یہ بات بیان کی ہے کہ ابوعبیدۃ کا ان کے ابا ابن مسعود سے سماع نہیں، یہ بات پہلے بھی گذر چکی ہے۔

بابُ ماجاءَ فی كَرَاهِيَةِ أَخْذِ خِيَارِ المالِ فی الصَّدَقَةِ

زکوۃ میں بہترین مال لینا ممنوع ہے

یہ مسئلہ پہلے گذر چکا ہے کہ زکوۃ میں نکما جانور یعنی بوڑھا اور عیب والا جانور نہیں لیا جائے گا اور اعلی قسم کا جانور بھی نہیں لیا جائے گا، بلکہ درمیانی قسم کا جانور لیں گے، تاکہ نہ مالک پر بوجھ ہو نہ غریبوں کا نقصان ہو۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جب گورنر بنا کر یمن بھیجا تو آنحضور ﷺ نے ان کو چند ہدایات دی تھیں۔ان میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ یمن میں اہل کتاب (نصاریٰ) ہیں ان کو اسلام کی دعوت دینا۔معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ سے پہلے جو ادیان تھے وہ آپ کی بعثت سے منسوخ ہوگئے،حتی کہ نبی ﷺ سے قریب ترین پیغمبر حضرت عیسی علیہ السلام کا دین بھی منسوخ ہوگیا۔اب نجات صرف نبی ﷺ کے دین کو قبول کرنے میں ہے۔دین عیسوی، یا دین موسوی یا کسی اور نبی کی شریعت پر عمل کرنے سے نجات حاصل نہیں ہوگی۔

دوسری ہدایت یہ دی تھی کہ احکام اسلامیہ بتدریج ان کے سامنے پیش کئے جائیں۔سب احکام ایک ساتھ پیش نہ کئے جائیں،اگر ایک ساتھ تمام احکام پیش کئے جائیں گے تو ممکن ہے ان کے ذہن پر بوجھ پڑے،اور وہ گھبرا جائیں اور پیچھے ہٹ جائیں،اس لئے الأھم فالأھم کے قاعدہ سے جو حکم سب سے زیادہ اہم ہے وہ پہلے پیش کیا جائے پھر جب لوگ اُسے قبول کرلیں تو ان کو دیگر احکام بتدریج بتائے جائیں۔اور بنیادی حکم توحید ورسالت محمدی ہے، یہود ونصاریٰ توحید کے تو قائل ہیں،مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائل نہیں،پس ان کو توحید کے ساتھ رسالت محمدی (ﷺ) کی بھی دعوت دی جائے۔جب وہ نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا فرستادہ تسلیم کرلیں تو وہ خود سمجھ جائیں گے کہ ہر فرستادہ کوئی پیغام ضرور لاتا ہے،وہ خالی ہاتھ نہیں آتا،اس لئے اب ان کو عملی احکام میں سے جو سب سے اہم حکم ہے یعنی نماز کی دعوت دی جائے۔

نماز کے دو پہلو ہیں: ایک پہلو سے وہ آسان ہے اور دوسرے پہلو سے ذرا بھاری ہے۔آسان پہلو یہ ہے کہ نماز پڑھنے میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔اور بھاری پہلو یہ ہے کہ روزانہ پانچ بار نماز پڑھنا مشکل امر ہے۔جب آسان پہلو سے دعوت دیں گے تو اس کی کوئی مصلحت بتانے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں اور ہمارے ذمے ان کی بندگی (عبادت) ہے۔پھر جب وہ یہ حکم قبول کرلیں تو دوسرے اہم حکم زکوٰۃ کی دعوت دی جائے،اور زکوٰۃ کے بھی دو پہلو ہیں: ایک آسان دوسرا بھاری۔اس اعتبار سے کہ زکوٰۃ میں مال نکالنا پڑتا ہے بھاری حکم ہے،آدمی چمڑی دے سکتا ہے مگر دمڑی دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا،آدمی جان تو دے سکتا ہے مگر مال دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔اور یہ حکم اس اعتبار سے آسان ہے کہ وہ سال میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے،دل پر جبر کرکے ایک مرتبہ زکوٰۃ نکالدی جائے تو سال بھر کی چھٹی ہوجاتی ہے۔نماز کی طرح بار بار فرض نہیں۔پس اگر زکوٰۃ کا جو بھاری پہلو ہے اس کے لحاظ سے دعوت دی جائے گی تو اس کی مصلحت بھی بتانی ہوگی۔علاوہ ازیں زمانۂ جاہلیت میں قبیلہ کا سردار ہر شخص کی آمدنی کا چوتھائی لیا کرتا تھا تاکہ وہ اس آمدنی سے ٹھاٹھ کرے۔اب اسلام بھی زکوٰۃ کا مطالبہ کررہا ہے اس لئے یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ زکوٰۃ نبی ﷺ کے ٹھاٹھ کے لئے لی جارہی ہے،اس لئے بھی مصلحت بتانی ضروری ہے کہ زکوٰۃ نبی ﷺ کے لئے نہیں ہے،ان پر اور ان کے خاندان پر حتی کہ ان کے موالی پر بھی زکوٰۃ حرام ہے، بلکہ یہ

بتایا جائے کہ زکوۃ اس لئے لی جارہی ہے کہ تمہارے قبیلوں میں تمہارے پڑوس میں جو غریب ہیں ان پر یہ مال خرچ کیا جائے، اور غرباء کی مدد اور رفاہی کاموں میں خرچ کرنا سبھی پسند کرتے ہیں اور ضرورت مندوں پر خرچ کرنے کا جذبہ ہر انسان میں ہوتا ہے، اس لئے جب ان کے سامنے یہ مصلحت آئے گی تو غلط فہمی دور ہوگی اور ان کے لئے زکوۃ نکالنا آسان ہوگا، اس لئے ان کو زکوۃ کے حکم کے ساتھ اس کی یہ مصلحت بھی ضرور بتائی جائے۔

اور تیسری ہدایت یہ دی کہ زکوۃ میں بہترین اموال نہ لئے جائیں، یہ ظلم ہے اور مظلوم کے دل سے جو آہ نکلتی ہے وہ اللہ سے ورے نہیں رکتی، سیدھی اللہ تک پہنچتی ہے۔ پس کہیں مظلوم کی آہ حکومت کی تباہی کا باعث نہ بن جائے اس کا خیال رکھا جائے۔

[٦] باب ماجاء في كراهية أخذ خِيَارِ المال في الصدقة

[٦٢٤-] حدثنا أبو كُرَيْبٍ، نا وكيعٌ، نا زَكَرِيَا بنُ إسحاق المَكِّيُّ، نا يَحيَى بنُ عبدِ اللهِ بنِ صَيفِيٍّ، عن أبي مَعْبَدٍ، عن ابنِ عباسٍ، أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم بَعَثَ مُعاذًا إلَى اليَمَنِ، فقال: " إِنَّكَ تَأْتِيْ قَوْمًا أَهْلَ كِتَابٍ، فَادْعُهُمْ إِلَى شَهَادَةِ أَنْ لاَ إِلهَ إِلاَّ اللهُ، وأنِّي رَسُوْلُ اللهِ، فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوْا لِذَلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي اليَوْمِ وَاللَّيْلَةِ، فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوْا لِذَلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةَ أَمْوَالِهِمْ تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ، وتُرَدُّ على فُقَرَائِهِمْ، فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوْا لِذَلِكَ فَإِيَّاكَ وَكَرَائِمَ أَمْوَالِهِمْ، واتَّقِ دَعْوَةَ المَظْلُوْمِ فَإِنَّهَا لَيْسَ بَيْنَهَا وبَيْنَ اللهِ حِجَابٌ"

وفي الباب: عن الصُّنَابِحِيِّ، قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عباسٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وأبو مَعْبَدٍ مَوْلَى ابنِ عباسٍ: اسْمُهُ نَافِذٌ.

ترجمہ: ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف بھیجا، پس فرمایا: بیشک تم ایسے لوگوں کے پاس پہنچو گے جو کتاب والے ہیں۔ پس ان کو اس عقیدہ کی دعوت دو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور بیشک میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، پس اگر وہ یہ بات قبول کرلیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر رات دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ پس اگر وہ یہ بات قبول کرلیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ان کے مالوں میں زکوۃ فرض کی ہے، جو مالداروں سے لی جائے گی اور غریبوں پر خرچ کی جائے گی، پس اگر وہ یہ حکم قبول کرلیں تو ان کے بہتر مالوں سے بچو! (کرائم أموالهم درحقیقت مرکب توصیفی ہے ای أموالٌ کریمةٌ) اور مظلوم کی بددعا سے بچو کیونکہ مظلوم کی بددعا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی پردہ نہیں یعنی مظلوم کی آہ سیدھی اللہ تک پہنچتی ہے۔

بابُ ماجاء فی صَدَقَةِ الزَّرْعِ والثَّمَرِ والحُبُوْبِ

کھیتی، پھلوں اور غلوں کی زکوٰۃ کا بیان

زَرْعٌ: کھیتی، مراد غلے ہیں۔ اور ثمر: کے معنی ہیں پھل، خاص طور پر کھجور مراد ہے۔ اور حبوب: حَبٌّ کی جمع ہے، دانہ یعنی غلہ۔ زرعٌ اور حَبٌّ ایک ہیں۔

باغات اور کھیتوں میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس میں بھی زکوٰۃ ہے اور اس زکوٰۃ کے لئے مخصوص لفظ عُشر ہے۔ زرعی پیداوار میں سے دسواں حصہ لیا جائے یا بیسواں حصہ دونوں کے لئے لفظ عشر (دسواں) مستعمل ہے اور اموال کی زکوٰۃ کے جو احکام اور ان کے جو مصارف ہیں وہی احکام اور مصارف عشر کے بھی ہیں۔ اور بعض زمینوں کی پیداوار میں سے خراج لیا جاتا ہے اس کے احکام مختلف ہیں۔

حدیث باب میں تین حکم ہیں:

پہلا حکم: پانچ اونٹ سے کم میں زکوٰۃ نہیں، یعنی اونٹوں کا چھوٹا ریوڑ جس میں زکوٰۃ واجب ہے پانچ کا ہے۔ اس سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔ یہ مسئلہ اجماعی ہے اور پہلے تفصیل سے گذر چکا ہے ——— ذَوْد کے لغوی معنی ہیں: دفع کرنا۔ جو شخص پانچ اونٹوں کا مالک ہوتا ہے وہ پچاس ہزار کا مالک ہوتا ہے۔ پس غریبی دور ہوگئی اور یہ لفظ تین اونٹوں سے دس تک بولا جاتا ہے۔

دوسرا حکم: پانچ اوقیوں سے کم چاندی میں زکوٰۃ نہیں۔ اوقیہ: مفرد ہے اور یہ چاندی کا وزن ہے اور ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے پس پانچ اوقیہ دوسو درہم ہوئے، یہ چاندی کا نصاب ہے اور یہ مسئلہ بھی اجماعی ہے اور پہلے گذر چکا ہے۔

تیسرا حکم: پانچ وَسَق سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔ وسق: غلوں اور پھلوں کا پیمانہ ہے، ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے، پس پانچ وسق: ۳۰۰ صاع ہوئے، اور صاع: چار مد کا، اور مد: احناف کے نزدیک دو رطل کا اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ایک رطل اور تہائی رطل کا ہوتا ہے۔ اور رطل عراقی چار سو سات گرام کا ہوتا ہے پس ایک صاع احناف کے نزدیک تین کلو دوسو اکسٹھ گرام ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک دو کلو ایک سو تہتر گرام ہے۔ اور ایک وسق احناف کے نزدیک ایک سو پچانوے کلو تین سو ساٹھ گرام ہے اور پانچ وسق: نو سو چھیتّر کلو آٹھ سو گرام ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک: چھ سو اکیاون کلو نوے گرام ہیں (۱)

(۱) جاننا چاہئے کہ آج کل مارکیٹ میں جو تولہ رائج ہے وہ دس گرام کا ہے، اور شرعی تولہ گیارہ گرام اور چھیاسٹھ پوئنٹ کا ہے، باب زکوٰۃ میں اور دیگر مسائل میں شرعی تولہ ہی مراد ہوتا ہے، اس کے حساب سے نصف صاع صدقۃ الفطر ایک کلو پانچ سو تہتر گرام ←

اور مذکورہ حدیث میں ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک عشر کا بیان ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: پیداوار میں عشر (دسواں حصہ) یا نصف عشر (بیسواں حصہ) اس وقت واجب ہوتا ہے جب پیداوار کم سے کم پانچ وسق ہو۔ اس سے کم پیداوار میں عشر واجب نہیں۔ اور یہ بھی شرط ہے کہ پیداوار ذخیرہ کر کے رکھی جاسکتی ہو، جو چیزیں جلدی خراب ہوجاتی ہیں، جیسے ٹماٹر، لوکی، بینگن، پالک وغیرہ ان میں عشر واجب نہیں۔ اس کے لئے تعبیر ہے: مالہ ثمرۃٌ باقِیَۃٌ۔ غرض جمہور کے نزدیک پیداوار میں عشر یا نصف عشر واجب ہونے کے لئے دو شرطیں ہیں: ایک: پیداوار سال بھر ذخیرہ کر کے رکھی جاسکے، دوسری: پیداوار پانچ وسق یا اس سے زائد ہو۔ یہ دونوں شرطیں جمع ہونگی تب زکوۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک زمین میں پیدا ہونے والی ہر چیز میں عشر یا نصف عشر واجب ہے، خواہ وہ تھوڑی ہو یا زیادہ اور سال بھر باقی رہنے والی ہو یا جلدی خراب ہونے والی ہو۔ اور مذکورہ حدیث کی تین توجیہیں کی گئی ہیں:

پہلی توجیہ: یہ حدیث غلہ کے تاجر کی زکوۃ کا نصاب ہے۔ زمین کی پیداوار کا نصاب نہیں ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تاجروں کی سہولت کے لئے ایک لَمْسَم حساب بتلایا ہے کہ جس تاجر کے پاس پانچ وسق (۹۷۶ کلو آٹھ سو گرام) غلہ ہو اس پر زکوۃ فرض ہے، کیونکہ غلہ کی یہ مقدار پانچ اوقیہ چاندی کی قیمت کے برابر ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ عید الفطر میں مفتی اور قاضی کی طرف سے صدقۃ الفطر کی رقم کا اعلان ہوتا ہے کہ نصف صاع گیہوں کی یہ قیمت ہے۔ یہ لوگوں کی سہولت کے لئے ہے، کیونکہ نصف صاع کتنا وزن ہے؟ پھر عام دوکانوں پر ایک ریٹ ہوتا ہے اور راشن کی دوکان پر دوسرا ریٹ ہوتا ہے اس لئے ہر شخص کے لئے رقم کی تعیین دشوار ہوتی ہے، اس لئے مفتی ایک رقم کا اعلان کرتا ہے۔ یا جیسے امام محمد رحمہ اللہ نے رَیّ کے کنوؤں کے پانی کا اندازہ کیا اور فرمایا: دوسو سے تین سو ڈول نکال دو کنواں پاک ہوجائے گا۔ یہ بھی ایک لمسم اندازہ ہے۔ اسی طرح یہاں بھی رسول اللہ ﷺ نے غلہ کے تاجر کا موٹا حساب بتلایا کہ پانچ وسق غلہ یا پھل پانچ اوقیہ چاندی کی قیمت کے برابر ہیں پس جس تاجر کے پاس پانچ وسق غلہ ہے اس پر زکوۃ فرض ہے۔ غرض باب عشر سے اس حدیث کا کوئی تعلق نہیں (یہ توجیہ کنز الدقائق کی شرح البحر الرائق (۲۳۸:۲) میں ہے)

دوسری توجیہ: اس حدیث میں عَرِیَّہ (عطیہ) کا بیان ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یہ طریقہ تھا کہ باغ یا کھیت کا مالک چند درخت یا چند کیاریاں کسی رشتہ دار کو یا دوست کو دیدیتا تھا تا کہ ان درختوں پر جو پھل آئیں یا ان کیاریوں میں جو پیداوار ہو اس کو وہ استعمال کرے۔ شریعت نے پانچ وسق سے کم میں عریہ کی اجازت دی۔ یعنی جب

← غلہ ہوتا ہے۔ اور پانچ اوقیہ یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی: چھ سو بارہ گرام ہوتی ہے۔ اور بیس مثقال یعنی ساڑھے سات تولہ سونا: ساڑھے ستاسی گرام ہوتا ہے۔ اور مہر فاطمی یعنی ایک سو اکیس تولے تین ماشے: پندرہ سو تیس گرام چاندی بنتی ہے۔ چاندی کی یہی مقدار یا جس دن مہر ادا کیا جائے اس دن اتنی چاندی کی جو قیمت ہے وہ مہر فاطمی ہے۔

ساعی زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے آئے گا اور مالک اُسے بتائے گا کہ میں نے یہ درخت یا یہ کیاریاں عریہ دی ہیں تو وہ پانچ وسق سے کم میں اس کی بات مان لے گا۔ اور ان درختوں اور کیاریوں کا عشر نہیں لے گا۔ اور اگر عریہ پانچ وسق سے زیادہ ہو تو مالک کی بات قبول نہیں کی جائے گی، مُصَدِّق ان کا عشر وصول کرے گا (یہ توجیہ معارف السنن (۵:۲۰۸) میں ہے)

تیسری توجیہ: اس حدیث کا مدعیٰ یہ ہے کہ پانچ وسق اور زیادہ غلے کا عشر بیت المال میں پہنچانا ضروری ہے اور اس سے کم کی زکوٰۃ مالکان خود تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے جو شخص عشر وصول کرنے کے لئے آتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کھیت کھیت جا کر زکوٰۃ وصول کرے، کسی ایک جگہ بیٹھ کر، لوگوں کو قابلِ زکوٰۃ اموال وہاں لانے کا مکلف بنانا اور وہیں بیٹھے ہوئے زکوٰۃ وصول کرنا جائز نہیں۔ حدیث میں ہے: لا جَلَبَ ولا جَنَبَ (ابوداؤد ا:۲۲۵) یعنی نہ تو لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ مصدِّق کو پریشان کرنے کے لئے اموالِ زکوٰۃ (مویشی) لے کر دور چلے جائیں، اور نہ ساعی کے لئے جائز ہے کہ وہ لوگوں کو کسی ایک جگہ قابل زکوٰۃ اموال لانے کا مکلف کرے۔ بلکہ اسے گھر گھر اور کھیت کھیت جا کر زکوٰۃ وصول کرنی ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ عامل دھڑی دو دھڑی اناج کے لئے ایک کھیت سے دوسرے کھیت نہیں جا سکتا، اس کا وقت ضائع ہوگا۔ عامل کے لئے بھی دشواری ہے اور بیت المال کا بھی نقصان ہے، حکومت کا ٹرک کہاں کہاں گھومے گا؟ بلکہ ساعی صرف وہاں جائے گا جہاں کم از کم دس بوریاں پیداوار ہوئی ہو تا کہ عشر میں کم از کم ایک بوری ملے، اس سے کم پیداوار کا عشر مالکان خود غریبوں کو دیں گے۔ اگر مصدِّق وہاں پہنچے اور مالک زکوٰۃ ادا کرنے کا دعوی کرے تو پانچ وسق سے کم میں دعوی قبول کیا جائے گا، زیادہ میں دعوی قبول نہیں کیا جائے گا، کیونکہ پانچ وسق اور زیادہ کی زکوٰۃ بیت المال کو ادا کرنا ضروری ہے (معارف السنن ۵:۲۱۲)

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مستدلات:

امام اعظمؒ کی دلیل قرآن وحدیث کے عمومات ہیں۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۲۶۷) میں ہے: ﴿يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ﴾ یعنی اے ایمان والو! خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے جو ہم نے پیدا کی ہے تمہارے لئے زمین سے۔ اور سورۃ الانعام (آیت ۱۴۱) میں ہے: ﴿كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ یعنی کھاؤ ان کے پھلوں میں سے جس وقت وہ پھل دیں، اور ادا کرو اللہ کا حق جس دن اس کو کاٹو۔ اور سورۃ التوبۃ (آیت ۱۰۲) میں ہے: ﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾ یعنی ان کے مال میں سے زکوٰۃ لیجئے ـــــ اسی طرح آئندہ حدیث آرہی ہے کہ جس باغ اور جس کھیت کی سینچائی بارش اور

چشموں کے پانی سے ہوئی ہے اس میں عشر (دسواں حصہ) حصہ واجب ہے اور جس کی سینچائی رہٹ کے ذریعہ کی گئی ہے اس میں نصف عشر (بیسواں حصہ) واجب ہے۔ ان آیات اور احادیث میں زرعی پیداوار میں جس حق کا ذکر ہے وہ مطلق ہے اس میں قلیل وکثیر کی تفریق نہیں یہی عمومات امام اعظم کی دلیل ہیں۔

عقلی دلیل: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی عقلی دلیل یہ ہے کہ غریبوں پر خرچ کرنے کا جو جذبہ لوگوں میں ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مقید نہیں۔ ہر حال میں انسان خرچ کرنا چاہتا ہے اس لئے تھوڑے اور زیادہ کی تفریق نہیں کرنی چاہئے۔

سوال: پھر اموال میں نصاب کیوں شرط ہے؟

جواب: شریعت نے رأس المال کو باقی رکھ کر زکوۃ فرض کی ہے۔ کیونکہ اگر رأس المال ہی نہیں رہے گا تو آدمی تنگ ہوجائے گا۔ چنانچہ زکوۃ اموال نامیہ (بڑھنے والے مال) میں اور منافع میں واجب کی ہے، غیر نامی مال میں جو حقیقۃً یا حکماً بڑھتا نہیں اس میں زکوۃ واجب نہیں۔ پس اموال میں نصاب اس لئے شرط ہے کہ رأس المال باقی رہے اور منافع میں سے زکوۃ ادا کی جائے۔ اور کھیتوں اور باغوں میں رأس المال خود زمین ہے اور اس کی پیداوار نفع ہے پس اگر سب پیداوار بھی خرچ کردے گا تو رأس المال باقی رہے گا۔ اس لئے زرعی پیداوار میں قلیل وکثیر کی تفریق کے بغیر عشر واجب ہے۔

فائدہ (۱): اگر کھیت اور باغ کی سینچائی پر خرچ نہ ہوا ہو، نہ محنت کرنی پڑی ہو، بارش کے پانی سے یا قریب سے جو نہر گذر رہی ہے اس کے پانی سے باغ کی سینچائی ہوئی ہو تو پیداوار میں عشر (دسواں حصہ) واجب ہے۔ اور اگر سینچائی پر خرچ کیا گیا ہو، موٹر سے پانی نکال کر سینچائی کی ہے یا محنت کی ہے یعنی کنویں سے پانی کھینچ کر سینچائی کی ہے تو نصف عشر (بیسواں حصہ) واجب ہے۔

فائدہ (۲): عشر کے مسئلہ میں جو اختلاف ہوا ہے اس پر مجھے بہت حیرت ہے۔ اس لئے کہ آنحضور ﷺ کے زمانہ سے لے کر ائمہ مجتہدین کے زمانہ تک جو دو سو سال کا عرصہ ہے اس وقت تک مضبوط اسلامی حکومت قائم تھی، اس وقت حکومت کا کیا طریقہ تھا؟ لوگ زرعی پیداوار میں سے بلا شرط عشر نکالتے تھے یا اس کا کوئی نصاب تھا؟ یہ باتیں تواتر سے مروی ہونی چاہئے تھیں۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بیس رکعت تراویح شروع ہوئی اس وقت سے لوگ مسلسل شرقاً غرباً بیس رکعتیں پڑھتے آرہے ہیں۔ چنانچہ بیس رکعت تراویح پر اجماع ہے، کسی اہل حق کا اس میں اختلاف نہیں، اس لئے روایتوں کی ضرورت باقی نہیں رہی، لوگوں کا تعامل ہی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اسی طرح اس مسئلہ میں بھی اسلامی نظام کیا تھا؟ اور لوگوں کا عمل کیا تھا؟ تواتر سے ثابت ہونا چاہئے تھا، اور وہ تعامل ہی سب سے بڑی دلیل ہوتا، مگر عجیب بات ہے کہ نہ تو حکومت کا طریقہ مروی ہے نہ لوگوں کا طرز عمل منقول ہے۔ صرف یہی ایک حدیث ہے اس پر مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ آخر اتنی موٹی بات پردۂ خفا میں کیوں رہ گئی؟

[۷] باب ماجاء فی صدقة الزَّرْعِ والثَّمرِ والحُبُوْبِ

[۶۲۵-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا عبدُ العزيزِ بنُ محمدٍ، عن عَمْرِو بنِ يَحيىَ المازِنيِّ، عن أبيه، عن أبی سعيدٍ الخُدْرِیِّ، قال: إنَّ النبیَّ صلی الله علیه وسلم قال: "لَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ صَدَقَةٌ، ولَيْسَ فِی مَا دُوْنَ خَمْسِ أوَاقٍ صَدَقَةٌ، ولَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ أوْسُقٍ صَدَقَةٌ"

وفی الباب: عن أبی هريرة، وابنِ عُمَر، وجابرٍ، وعبدِ الله بنِ عَمْرٍو.

حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا عبدُ الرحمنِ بنُ مَهْدِیٍّ، نا سُفيانُ، وشُعْبَةُ، ومالكُ بنُ أنسٍ، عَنْ عَمْرِو بنِ يحيىَ، عن أبيهِ، عن أبی سَعيدٍ الخُدْرِیِّ، عن النبیِّ صلی الله علیه وسلم نحو حَديثِ عبدِ العزيزِ، عن عَمْرِو بنِ يَحيىَ.

قال أبو عيسى: حديثُ أبی سَعِيدٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وقد رُوِیَ مِنْ غَيْرِ وَجْهٍ عَنْهُ.

والعَمَلُ على هٰذا عِنْدَ أهلِ العلمِ: أنْ لَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ أوْسُقٍ صَدَقَةٌ، والوَسْقُ سِتُّوْنَ صَاعًا، وخَمْسَةُ أوْسُقٍ ثَلاثُمِائَةِ صَاعٍ.

وصَاعُ النبیِّ صلی الله علیه وسلم خَمْسَةُ أرْطَالٍ وَثُلُثٌ، وصَاعُ أهْلِ الكُوْفَةِ ثَمَانِيَةُ أرْطَالٍ.

ولَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسَةِ أوَاقٍ صَدَقَةٌ، وَالوُقِيَّةُ: أرْبَعُوْنَ دِرْهَمًا، وخَمْسُ أوَاقٍ مِائَتَا دِرْهَمٍ.

ولَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسِ ذَوْدٍ، يَعْنِی لَيْسَ فِيْمَا دُوْنَ خَمْسٍ مِنَ الإبِلِ صَدَقَةٌ، فإذَا بَلَغَتْ خَمْسًا وعِشْرِيْنَ مِنَ الإبِلِ فَفِيْهَا ابْنَةُ مَخَاضٍ، وفِيْمَا دُوْنَ خَمْسٍ وعِشْرِيْنَ مِنَ الإبِلِ فی كُلِّ خَمْسٍ مِنَ الإبِلِ شَاةٌ.

ترجمہ: باب کے شروع میں مذکور حدیث کو سفیان ثوری، شعبہ اور امام مالک رحمہم اللہ بھی عمرو بن یحییٰ سے عبد العزیز بن محمد کی حدیث کے مانند روایت کرتے ہیں، اور یہ حدیث حسن صحیح ہے اور متعدد طرق سے مروی ہے۔

اور اس پر اہل علم کا عمل ہے کہ پانچ وسق سے کم میں زکوۃ نہیں، اور ایک وسق: ساٹھ صاع ہیں۔ اور پانچ وسق تین سو صاع ہیں۔ اور نبی ﷺ کا صاع پانچ رطل اور تہائی رطل کا ہے اور کوفہ والوں کا صاع آٹھ رطل کا ہے۔ اور پانچ اوقیوں سے کم میں زکوۃ نہیں، اور ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہے اور پانچ اوقیے دو سو درہم ہیں۔ اور پانچ ذود سے کم میں زکوۃ نہیں، یعنی پانچ اونٹوں سے کم میں زکات نہیں (ذود کے معنی ہیں اونٹوں کا ریوڑ) —— پس جب اونٹ پچیس ہو جائیں تو ان میں بنت مخاض ہے اور پچیس سے کم میں ہر پانچ میں ایک بکری ہے۔

تشریح: صاع: ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کے نزدیک پانچ رطل اور تہائی رطل کا ہوتا ہے اور طرفین کے

نزدیک آٹھ رطل کا۔ اور مد: بالاجماع دو رطل کا ہوتا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے صاع النبی ﷺ کے مقابلہ میں صاع اہل کوفہ کو رکھا ہے یعنی نبی ﷺ کا صاع پانچ رطل اور تہائی رطل کا تھا اور کوفہ والوں کا صاع آٹھ رطل کا، مگر یہ انداز ٹھیک نہیں، کیونکہ جب صاع النبی ﷺ کے مقابل صاع اہل کوفہ کو رکھیں گے تو ہر شخص بدک جائے گا کہ کوفہ والے کون ہوتے ہیں؟ بلکہ کہنا یہ چاہئے تھا کہ نبی ﷺ کا صاع پانچ رطل اور تہائی رطل کا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا صاع آٹھ رطل کا تھا، جب مقابلہ میں صاعِ عمر کو رکھا جائے گا تو لحۂ فکریہ پیدا ہوگا کہ آخر حضرت عمرؓ کا صاع نبی ﷺ کے صاع سے مختلف کیوں تھا؟ کوفہ والے تو بدنام ہیں وہ تو حدیث ترک کر سکتے ہیں مگر حضرت عمرؓ حدیث کو کیسے ترک کر دیں گے؟ یہ ناممکن بات ہے اس لئے آدمی غور وفکر کرنے پر مجبور ہوگا۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ جس طرح حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں جزیرۃ العرب میں درہم نہیں ڈھلتے تھے، بلکہ روم اور ایران سے ڈھل کر آتے تھے اور وہ تین قسم کے تھے: دس قیراط کا، بارہ قیراط کا اور بیس قیراط کا۔ اور نبی ﷺ نے دوسو درہم چاندی کی زکوٰۃ کا نصاب مقرر کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ چھوٹے درہم کا اعتبار کیا جائے یا بڑے کا یا درمیانی کا؟ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب اپنے دورِ خلافت میں درہم ڈھالنے کا ارادہ کیا تو تینوں درہموں کو پگھلا کر مساوی حصوں میں تقسیم کیا تو ایک حصہ چودہ قیراط کا بنا (دس، بارہ اور بیس کا مجموعہ ۴۲ ہے اور اس کا ایک تہائی چودہ ہے) پس آپؓ نے چودہ قیراط کا سکہ ڈھال دیا ـــــ اب چاروں فقہاء احکام شرعیہ میں اسی چودہ قیراط والے درہم کا اعتبار کرتے ہیں۔ اب دس، بارہ اور بیس قیراط والے درہموں کا اعتبار نہیں۔ اور ہدایہ میں ہے کہ دراہم میں معتبر وزنِ سبعہ ہے یعنی جو دس درہم سات دینار کے ہم وزن ہو جائیں ان کا اعتبار ہے۔ اور وہ چودہ قیراط والا درہم ہے۔ چاروں فقہاء کے نزدیک یہی درہم معتبر ہے۔

اسی طرح مدینہ منورہ میں جو مد استعمال ہوتا تھا وہ دو رطل کا تھا، اور صاع: پانچ رطل اور تہائی رطل کا تھا، اور جزیرۃ العرب میں مد تو وہی تھا جو مدینہ میں استعمال ہوتا تھا، مگر صاع آٹھ رطل کا تھا۔ اس سے مدینہ کے تاجروں کو پریشانی تھی، اس لئے کہ وہ تھوک میں صاع کے حساب سے خریدتے تھے اور خُردے میں مُد کے حساب سے بیچتے تھے یعنی چھوٹے پیمانے سے لیتے تھے اور بڑے پیمانے سے دیتے تھے اس لئے گھاٹا ہوتا تھا، چنانچہ صحابہ نے آنحضور ﷺ سے صاع بڑا کرنے کی درخواست کی تھی مگر آپؐ نے ایسا نہیں کیا، صرف دعا فرمائی کہ اے اللہ! ہمارے مُد میں بھی برکت فرما اور ہمارے صاع میں بھی برکت فرما۔ اور ہمارے تھوڑے میں بھی برکت فرما اور ہمارے زیادہ میں بھی برکت فرما۔ آپؐ کے زمانہ تک تو یہ بات نبھ گئی کیونکہ اس وقت اسلامی حکومت مختصر تھی مگر فاروق اعظمؓ کے دورِ خلافت میں جب اسلامی حکومت پھیل گئی اور روم، شام، ایران، مصر وغیرہ اسلامی حکومت میں شامل ہوئے تو اب یہ بات چلنے والی نہ تھی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو مُد چھوٹا کر دیا جائے مگر اس میں خلفشار ہوتا یا صاع بڑا کر دیا جائے اور اس میں کوئی خاص پریشانی

نہیں تھی، اس لئے کہ مدینہ کے علاوہ سارے جزیرۃ العرب میں آٹھ رطل کا صاع مستعمل تھا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آٹھ رطل کا صاع کر دیا۔ اور لوگ نئے صاع سے کاروبار کرنے لگے، اور پرانا صاع یکبارگی موقوف ہو گیا۔

ایک واقعہ سے استدلال: ایک مرتبہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ مدینہ گئے، ان کی امام مالک رحمہ اللہ سے ملاقات ہوئی، دونوں کے درمیان یہ مسئلہ چھڑا کہ صاع کتنے وزن کا ہوتا ہے؟ چونکہ امام ابو یوسفؒ عراق کے باشندے تھے اور وہاں صاع آٹھ رطل کا تھا اس لئے وہ اس کے قائل تھے۔ اور امام مالکؒ پانچ رطل اور تہائی رطل کے قائل تھے۔ امام ابو یوسفؒ کو ان کی بات تسلیم کرنے میں تردد ہوا تو امام مالک نے تلامذہ سے کہا: اپنے گھر جاؤ اور جس کے گھر میں بھی نبی ﷺ کے زمانہ کا صاع ہے اسے لے آؤ۔ کہتے ہیں: مجلس میں ستر صاع جمع ہو گئے، اور ہر ایک نے سند بیان کی یہ صاع میرے والد کو میراث میں ملا ہے اور میرے دادا صحابی تھے۔ جب امام ابو یوسف نے ان کو ناپا تو وہ سب پانچ رطل اور تہائی رطل کے تھے۔ کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اپنی رائے بدل لی۔

اس واقعہ میں ہمارے غور کرنے کی بات یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے گھروں سے صاع کیوں منگوائے؟ وہ طالب علموں سے کہتے: ان مولانا صاحب کو بازار لے جاؤ۔ اور ایک ایک دوکان پر لے جا کر صاع بتاؤ اور ناپ کر دکھاؤ کہ وہ کتنے وزن کا ہے؟ مگر امام مالک رحمہ اللہ نے ایسا نہیں کیا۔ اس لئے کہ بازار میں دوکانوں پر جو صاع تھا وہ آٹھ رطل کا تھا۔ یعنی یہ بات تسلیم ہے کہ نبی ﷺ کے زمانہ کا صاع پانچ رطل اور تہائی رطل کا تھا مگر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی تعدیل کی اور آٹھ رطل کا صاع جاری کیا تو پرانا صاع بازار سے اٹھ گیا اور لوگوں نے اس پرانے صاع کو باپ دادا کی نشانی سمجھ کر اور حضور ﷺ کے زمانہ کا صاع ہونے کی وجہ سے گھروں میں محفوظ رکھا۔

پس جس طرح حضرت عمرؓ کے زمانہ میں درہموں کی تعدیل کی گئی اور تمام فقہاء نے اس تعدیل کو قبول کیا۔ اور احکام شرع میں اس کا اعتبار کیا اسی طرح چاہئے تھا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں صاع میں جو تعدیل ہوئی اسے بھی قبول کرتے، مگر عجیب بات ہے: ائمہ ثلاثہ نے دراہم کی تعدیل تو قبول کی مگر صاع کی تعدیل قبول نہ کی، اور احناف نے دونوں تبدیلیاں قبول کیں۔

بابُ ماجاء لَيْسَ فى الخَيْلِ و الرَّقِيْقِ صَدَقَةٌ

گھوڑوں اور غلاموں میں زکات نہیں

یہ مسئلہ پہلے گذر چکا ہے کہ غلام باندی دو مقصد سے ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی تیسرا مقصد نہیں ہوتا۔ وہ یا تو تجارت کے لئے ہوتے ہیں یا خدمت کے لئے۔ اگر پہلے مقصد سے ہیں تو بالاجماع ان میں زکوۃ واجب ہے۔ اور اگر خدمت کے لئے ہیں تو بالاجماع ان میں زکوۃ واجب نہیں۔ اور گھوڑے بھی حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں دو ہی مقصد سے

ہوتے تھے یا تو سواری اور بار برداری کے لئے ہوتے تھے، یا تجارت کے لئے، تناسل کے لئے، گھوڑے پالنے کا رواج عرب میں نہیں تھا اور سواری اور بار برداری کے گھوڑوں میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ اور تجارت کے گھوڑوں میں واجب ہے۔ اور یہ دونوں مسئلے اجماعی ہیں، پھر جب عراق اور شام فتح ہوئے تو وہاں نسل حاصل کرنے کے لئے گھوڑے پالنے کا رواج تھا، اس نئی صورت میں بھی ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں، ان کی دلیل باب کی حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کے گھوڑے اور اس کے غلام میں زکوٰۃ نہیں'' یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ حدیث عام ہے، تناسل کے لئے پالے گئے گھوڑوں کو بھی شامل ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث ہر قسم کے گھوڑوں کو عام نہیں۔ چنانچہ تجارت کے گھوڑوں میں بالاتفاق زکوٰۃ واجب ہے۔ اور تناسل کے گھوڑوں کا اس حدیث میں ذکر نہیں، اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں تناسل کے لئے گھوڑے پالنے کا عرب میں رواج نہیں تھا، عرب کی سرزمین بنجر ہے، ان کے پاس جانوروں کو کھلانے کے لئے گھاس نہیں، اور شام اور عراق کا علاقہ سرسبز وشاداب ہے، وہاں تناسل کے لئے گھوڑے پالے جاتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر سے مسئلہ دریافت کیا گیا اور آپؓ نے صحابہ سے مشورہ کے بعد لکھا کہ فی گھوڑا ایک دینار لیا جائے، اس سلسلہ کے دو واقعے نصب الرایہ میں مذکور ہیں وہ امام اعظم رحمہ اللہ کی دلیل ہیں۔

[۸] باب ماجاء لیس فی الخیل و الرّقیق صدقة

[۶۲۶-] حدثنا محمدُ بنُ العَلاءِ ابو کُرَیْبٍ، ومحمودُ بنُ غیلانَ، قالا: نا وَکِیعٌ، عن سُفیانَ، وشُعْبَةُ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ دینارٍ، عن سُلَیْمَانَ بنِ یَسَارٍ، عن عِرَاكِ بنِ مالِكٍ، عن ابی هریرةَ، قال: قال رسولُ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: '' لَیْسَ عَلَی الْمُسْلِمِ فِیْ فَرَسِهِ وَلَا فی عَبْدِهِ صَدَقَةٌ''

وفی الباب: عن عبدِ اللّٰهِ بنِ عَمْرٍو، وعَلِیٍّ، قال أبو عیسی: حدیثُ أبی هریرةَ حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

والعَمَلُ علیهِ عِندَ اهلِ العلمِ أنَّهُ لَیْسَ فی الخَیْلِ السَّائِمَةِ صَدَقَةٌ، ولا فِی الرَّقِیْقِ إِذَا کَانُوا لِلْخِدْمَةِ صَدَقَةٌ، إِلَّا أَنْ یَکُوْنُوا للتِّجارَةِ، فإِذَا کَانُوْا لِلتِّجَارَةِ فَفِیْ أَثْمَانِهِمُ الزَّکَاةُ إِذَا حَالَ عَلَیْهَا الحَوْلُ.

ترجمہ: اس پر علماء کا عمل ہے کہ سائمۃ (جنگل کی مباح گھاس چرنے والے) گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں۔ اور نہ غلام باندیوں میں زکوٰۃ ہے، جبکہ وہ خدمت کے لئے ہوں۔ مگر یہ کہ وہ تجارت کے لئے ہوں۔ پس اگر وہ تجارت کے لئے ہوں تو ان کی قیمت میں (ڈھائی فیصد) زکوٰۃ ہے جبکہ ان پر سال گذر جائے۔

بابُ ماجاء فی زَکَاۃِ العَسَلِ

شہد میں عشر کا بیان

امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک شہد میں عشر واجب نہیں۔ اور امام اعظم اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک شہد میں عشر واجب ہے۔ اور یہ اختلاف اس شہد میں ہے جو فارم (کھیت) سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اور اگر شہد کی تجارت ہے تو اس میں بالاجماع زکوۃ واجب ہے۔

اور اس مسئلہ میں پہلے دواماموں کی دلیل عدم دلیل ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس باب میں ایسی کوئی صحیح قابل استدلال حدیث نہیں جس سے شہد میں عشر واجب ہوتا ہو، اس لئے شہد میں زکوۃ واجب نہیں۔ اور قائلینِ وجوب کا استدلال یہ ہے کہ باب میں متعدد حدیثیں ہیں اگرچہ وہ ضعیف ہیں مگر مجموعہ حسن لغیرہ اور قابل استدلال ہے، اس لئے شہد میں عشر واجب ہے۔ اور اس مسئلہ میں سب سے بہتر حضرت ابوسیّارۃ مُتعیؓ کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے شہد کی کھیاں پال رکھی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اس کا عشر ادا کرو۔ یہ حدیث ابن ماجہ (ص:۱۳۱) میں ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: شہد کے دس مشکیزوں میں ایک مشکیزہ ہے"

تشریح: امام احمدؒ کے نزدیک اس حدیث میں نصاب کا بیان ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: دس مشکیزوں سے کم شہد میں زکوۃ واجب نہیں، اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک اس حدیث میں حساب کا بیان ہے۔ یعنی شہد میں عشر (دسواں حصہ) واجب ہے اس میں نصف عِشر (بیسواں حصہ) واجب نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں محنت نہیں ہے پس قلیل وکثیر کی تفریق کے بغیر زکوۃ واجب ہے۔

[۹] باب ماجاء فی زکاۃ العسل

[۶۲۷-] حدثنا محمدُ بنُ یَحْیَی النَّیسَابُوْرِیُّ، نا عَمْرُو بنُ أبی سَلَمَۃَ التِّنِّیسِیُّ، عن صَدَقَۃَ بنِ عبدِ اللّٰہِ، عن مُوسَی بن یَسَارٍ، عن نَافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، قال: قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: "فی العَسَلِ فی کُلِّ عَشَرَۃِ أزُقٍ، زِقٌّ"

وفی الباب: عن أبی ھریرۃَ، وأبی سَیَّارَۃَ المُتَعِیِّ، وعبدِ اللّٰہِ بنِ عَمْرٍو.

قال أبو عیسی: حدیثُ ابنِ عُمَرَ فی إسنادِہِ مَقَالٌ، ولا یَصِحُّ عَنِ النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فی ھذا البابِ کَبِیْرُ شَیْئٍ، والعملُ علی ھذا عِنْدَ أکْثَرِ أھلِ العلمِ، وبہ یَقُوْلُ أحمدُ، وإسحاقُ، وقالَ بعضُ أھلِ العلمِ لَیْسَ فی العَسَلِ شَیْئٌ.

ملحوظہ: حضرت ابن عمرؓ کی یہ حدیث صدقۃ بن عبداللہ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ اور باب میں کوئی حدیث (اعلی درجہ کی) صحیح نہیں۔

بابُ ماجاء لازکوٰۃَ عَلَی المَالِ المُسْتَفَادِ حَتّٰی یَحُوْلَ عَلَیْہِ الحَوْلُ

حاصل شدہ مال پر سال پورا ہونے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے

مالِ مستفاد یعنی نیا حاصل شدہ مال اور اس کی چار صورتیں ہیں: تین اتفاقی ہیں اور ایک اختلافی:

پہلی صورت: جو شخص نصاب کا مالک ہو اور اُسے سال کے درمیان میں نصاب کی جنس سے نفع حاصل ہو تو اس مال مستفاد کو اصل کے ساتھ ملایا جائے گا اور کل مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً ایک شخص کے پاس نو اونٹ تھے، سال کے بیچ میں دو بچے پیدا ہوئے اور گیارہ ہو گئے، یا پندرہ ہزار کا تجارت کا مال تھا، اس میں نفع ہوا اور وہ بیس ہزار کا ہو گیا تو سال پورا ہونے پر گیارہ اونٹوں کی زکات دو بکریاں واجب ہونگی۔ اور کل مال کی یعنی بیس ہزار کی زکوٰۃ واجب ہوگی اس صورت میں مالِ مستفاد پر الگ سے حولانِ حول ضروری نہیں اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

دوسری صورت: ایک شخص تہی دست تھا سال کے درمیان — گورنمنٹ کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے والا سال بہ سال آتا ہے مثلاً رمضان میں آتا ہے تو اس کا درمیان مراد ہے — صاحبِ نصاب بنا، مثلاً وارثت میں اس کو پانچ اونٹ ملے، یا کسی نے ہدیہ دیئے تو جب رمضان میں ساعی آئے گا اس وقت اس پر زکوٰۃ فرض نہیں، بلکہ جب سال پورا ہوگا اس وقت زکوٰۃ فرض ہوگی۔ اور یہ مسئلہ بھی اجماعی ہے۔

تیسری صورت: صاحبِ نصاب کو سال کے بیچ میں نصاب کی جنس کے علاوہ مال ملا تو بھی مال مستفاد پر زکوٰۃ نہیں۔ قابلِ زکوٰۃ اموال کی اجناس چار ہیں (تفصیل گذر چکی ہے) مثلاً ایک شخص کے پاس دس اونٹ ہیں، سال کے درمیان اسے میراث میں چالیس بکریاں مل گئیں تو تمام ائمہ متفق ہیں کہ اس مالِ مستفاد پر الگ سے حولانِ حول ضروری ہے، اصل نصاب کے ساتھ اس کو ملایا نہیں جائے گا۔

چوتھی صورت: صاحبِ نصاب کو سال کے درمیان میں نصاب کی جنس سے میراث میں یا ہبہ میں مال ملا، مثلاً دس اونٹ تھے سال کے درمیان میں میراث میں پانچ اونٹ اور ملے۔ یا پندرہ ہزار روپے تھے سال کے بیچ میں کسی نے اور پندرہ ہزار روپے ہدیہ دیئے تو یہ مالِ مستفاد اصل کے ساتھ ملایا جائے گا یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ حنفیہ کے نزدیک ملایا جائے گا کیونکہ مالِ مستفاد اصل نصاب کی جنس سے ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک نہیں ملایا جائے گا، ان کے نزدیک اس مالِ مستفاد پر الگ سے حولانِ حول ضروری ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کو (سال کے درمیان) مال حاصل ہوا اس پر زکوٰۃ نہیں، یہاں

تک کہ اس پر سال گذر جائے"

تشریح: اس حدیث کی دو سندیں ہیں: ایک میں عبدالرحمٰن بن زید ہے جو ضعیف ہے اور وہی اس حدیث کو مرفوع کرتا ہے، اور دوسری سند صحیح ہے مگر اس سند سے حدیث موقوف ہے، یعنی یہ ابن عمرؓ کا قول ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں۔ پھر اس حدیث کا مصداق کونسی صورت ہے؟ اس میں اختلاف ہے، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک چوتھی صورت مصداق ہے اور حنفیہ کے نزدیک دوسری صورت مصداق ہے، یعنی جو شخص پہلے سے صاحب نصاب نہیں تھا، پھر سال کے درمیان میں صاحب نصاب ہوا تو اس پر حولانِ حول ضروری ہے۔ غرض اس حدیث کی سند میں بھی اختلاف ہے اور مصداق میں بھی اختلاف ہے۔

[۱۰] باب ماجاء لازکوة على المال المُسْتَفَادِ حتى يَحُوْلَ عليه الحولُ

[۶۲۸-] حدثنا يحيى بنُ مُوسَى، نا هارُوْنُ بنُ صَالِحٍ الطَّلْحِيُّ، نا عبدُ الرحمنِ بنُ زَيْدِ بنِ أَسْلَمَ، عن أَبِيْهِ، عن ابنِ عُمَرَ، قال: قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: " مَنِ اسْتَفَادَ مَالاً فَلاَ زَكَاةَ عَلَيْهِ حَتَّى يَحُوْلَ عَلَيْهِ الحَوْلُ"

وفي الباب: عن سَرَّى بِنْتِ نَبْهَانَ.

حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا عبدُالوَهَّابِ الثقفِيُّ، نا أَيُّوْبُ، عن نَافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، قال: مَنِ اسْتَفَادَ مَالاً فَلاَ زَكَاةَ فِيْهِ حَتَّى يَحُوْلَ عَلَيْهِ الحَوْلُ عِنْدَ رَبِّهِ، وَهٰذا أَصَحُّ مِنْ حَدِيثِ عبدِ الرحمنِ بنِ زَيْدِ بنِ أَسْلَمَ.

قال أبو عيسى: وَرَوَاهُ أَيُّوبُ، وعُبَيْدُ اللّٰهِ، وغَيْرُ وَاحِدٍ، عَن نَافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، مَوْقُوْفًا؛ وعبدُ الرحمنِ بنُ زَيْدِ بنِ أَسْلَمَ: ضَعِيفٌ في الحَدِيثِ، ضَعَّفَهُ أَحْمَدُ بنُ حَنْبَلٍ، وعَلِيُّ بنُ المَدِيْنِيِّ، وغَيْرُهُمَا مِنْ أَهْلِ الحَدِيثِ، وهو كَثِيرُ الغَلَطِ.

وقَدْ رُوِيَ عن غَيْرِ واحِدٍ مِنْ أَصْحَابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَنْ لاَزَكَاةَ في المالِ المُسْتَفَادِ حَتَّى يَحُوْلَ عَلَيْهِ الحَوْلُ، وبه يقولُ مالكُ بنُ أَنَسٍ، والشافعيُّ، وأحمدُ بنُ حَنْبَلٍ، وإسحاقُ.

وقال بعضُ أهلِ العلمِ: إذا كانَ عندَهُ مالٌ تَجِبُ فِيْهِ الزكاةُ، فَفِيْهِ الزَّكَاةُ، وإن لَمْ يَكُنْ عِنْدَهُ سِوَى المَالِ المُسْتَفَادِ مَالٌ تَجِبُ فِيْهِ الزَّكَاةُ: لَمْ تَجِبْ عَلَيْهِ في المالِ المُسْتَفَادِ زَكَاةٌ، حَتَّى يَحُوْلَ عَلَيْهِ الحَوْلُ، فَإِنْ اسْتَفَادَ مَالاً قَبْلَ أَنْ يَحُوْلَ عليهِ الحَوْلُ، فَإِنَّهُ يُزَكِّي المالَ المُسْتَفَادَ مَعَ مَالِهِ الَّذِي وَجَبَتْ فِيهِ الزكاةُ، وبه يقولُ سفيانُ الثَّوْرِيُّ، وأهلُ الكوفَةِ.

ترجمہ اور وضاحت: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کی پہلی سند زید بن اسلم کی ہے جس کو ان کے لڑکے عبدالرحمٰن روایت کرتے ہیں اور مرفوع کرتے ہیں۔ اور دوسری سند نافع کی ہے، ان سے ایوب سختیانی روایت کرتے ہیں اور موقوف بیان کرتے ہیں اور عبیداللہ وغیرہ ان کے متابع ہیں، وہ بھی موقوف کرتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے موقوف سند کو اصح قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ عبدالرحمٰن ضعیف ہیں۔ امام احمد اور ابن المدینی وغیرہ محدثین نے ان کی تضعیف کی ہے اور وہ حدیث میں بہت غلطیاں کرتے ہیں۔

اور متعدد صحابہ سے مروی ہے کہ مالِ مستفاد میں زکوٰۃ نہیں، یہاں تک کہ اس پر سال گذر جائے۔ اور اسی کے مالک، شافعی، احمد اور اسحاق قائل ہیں (مالِ مستفاد کی کونسی صورت میں زکوٰۃ نہیں اس کی امام ترمذی نے تعیین نہیں کی، اور اختلاف بیان کر دیا)

اور بعض علماء کہتے ہیں: جب کسی کے پاس ایسا مال ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہے تو اس (مالِ مستفاد) میں زکوٰۃ ہے اور اگر اس کے پاس اس مالِ مستفاد کے علاوہ کوئی ایسا مال نہ ہو جس میں زکوٰۃ واجب ہے تو اس مالِ مستفاد پر زکوٰۃ واجب نہیں، یہاں تک کہ اس پر سال گذر جائے (یعنی حنفیہ کے نزدیک مالِ مستفاد پر بھی اصل کے ساتھ ملا کر زکوٰۃ واجب ہے اس پر الگ سے حولانِ حول ضروری نہیں) پس اگر اس نے کوئی نیا مال حاصل کیا نصاب پر سال گذرنے سے پہلے تو وہ مالِ مستفاد کی بھی زکوٰۃ دے اپنے اس مال کے ساتھ جس میں زکوٰۃ واجب ہوئی ہے یعنی اصل نصاب کے ساتھ (یہ تکرار ہے، پہلی والی بات ہی دوبارہ بیان کی ہے) اور سفیان ثوری اور کوفہ والے اسی کے قائل ہیں۔

بابُ ماجاءَ لَيسَ عَلَى المُسْلِمِينَ جِزْيَةٌ

مسلمانوں پر جزیہ نہیں

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک سرزمین میں دو قبلے مناسب نہیں اور مسلمان پر جزیہ نہیں''

تشریح: اس حدیث کا ایک راوی قابوس بن ابی ظبیان ہے۔ وفيه لِينٌ: یعنی وہ معمولی درجہ کا راوی ہے اور یہ حدیث مسند بھی مروی ہے اور مرسل بھی۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اس حدیث میں دو مسئلے ہیں:

پہلا مسئلہ: ایک سرزمین میں دو قبلے مناسب نہیں۔ یہ حکم اگرچہ عام ہے مگر درحقیقت صرف جزیرۃ العرب کے لئے ہے۔ بعض حدیثیں اگرچہ عام ہوتی ہیں مگر ان کا مورد خاص ہوتا ہے، یعنی اس حدیث میں جو حکم ہے وہ صرف جزیرۃ العرب کے لئے ہے۔

نص کبھی عام ہوتی ہے اور مورد خاص ہوتا ہے پس حکم شانِ ورود کے ساتھ خاص نہیں رہتا بلکہ الفاظ میں جس قدر عموم

ہوتا ہے وہاں تک مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کی بہت مثالیں ہیں اور پہلے گذر بھی چکی ہیں، اور کبھی نص عام ہوتی ہے مگر حکم عام نہیں ہوتا، شانِ ورود کے ساتھ خاص رہتا ہے اس کی مثالیں کم ہیں۔ ایک مثال ہے: الأئمة من قریش اس حدیث کے الفاظ اگرچہ عام ہیں مگر مورد خاص ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے بعد خلافت کے مسئلہ میں جو اختلاف ہونے والا تھا اس سے اس کا تعلق ہے اور بس یعنی یہ آپؐ کی ایک پیشین گوئی ہے کہ میرے بعد جو امیر ہوگا وہ مہاجرین میں سے ہوگا اور قریش میں سے ہوگا وہی ایک امیر ہوگا، چنانچہ آپؐ کے وصال کے بعد سقیفۂ بنی ساعدہ میں امارت کے مسئلہ میں اختلاف ہوا۔ انصار نے کہا: ہم میں سے ایک امیر ہو اور آپ لوگوں (مہاجرین) میں سے ایک امیر ہو۔ مگر جب یہ حدیث سامنے آئی تو اختلاف ختم ہوگیا اور سب نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ یہ حدیث عام نہیں ہے یعنی دنیا کے سب مسلمانوں پر ہر مکان میں اور ہر زمان میں قریشی امیر مقرر کرنا ضروری نہیں۔ اسی طرح یہاں بھی اگرچہ حکم عام ہے مگر مورد خاص ہے۔ اور یہ عام حکم مورد خاص کے لئے ہی ہے اور حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلم نہیں رہ سکتے، اگر ایسا ہوتا تو جزیہ کا حکم بے معنی ہوتا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جزیرۃ العرب میں صرف مسلمان رہیں گے، کسی دوسری ملت والوں کو یعنی یہود و نصاریٰ اور مشرکین و مجوس وغیرہ کو جزیرۃ العرب میں نہیں رکھا جائے گا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں: غیر مسلموں سے جزیرۃ العرب کا تخلیہ تین وجوہ سے ضروری ہے:

پہلی وجہ: آنحضرت ﷺ یہ بات جانتے تھے کہ زمانہ ہمیشہ ایک حالت پر نہیں رہتا، کبھی اسلام کمزور بھی پڑ سکتا ہے اور اس کی جمعیت پراگندہ بھی ہوسکتی ہے ایسے وقت میں اگر اسلام کے مرکز اور جڑ میں غیر مسلم ہونگے تو حرمات دین کی پردہ دری ہوگی اور اس کی سخت بے حرمتی ہوگی۔ اس لئے آپؐ نے دار العلم (مدینہ منورہ) کے اردگرد سے اور بیت اللہ کے مقام (مکہ مکرمہ) سے غیر مسلموں کو نکال باہر کرنے کا حکم دیا۔

دوسری وجہ: غیر مسلموں کے ساتھ اختلاط لوگوں کے دین کے فساد کا سبب ہے، اور وہ لوگوں کے مزاجوں میں تبدیلی کردیتا ہے، پس اگر مسلمانوں کے لئے دیگر ممالک میں اختلاط ناگزیر ہے تو کم از کم حرمین شریفین کو ان سے پاک رکھنا ضروری ہے۔

تیسری وجہ: نبی ﷺ پر وہ بات منکشف ہوئی جو آخر زمانہ میں پیش آنے والی ہے، چنانچہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''بیشک ایمان مدینہ کی طرف سکڑ جائے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف سکڑ جاتا ہے'' (متفق علیہ، مشکوٰۃ حدیث ۱۶۰ باب الاعتصام) یعنی خالص دین مدینہ منورہ ہی میں باقی رہے گا اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب وہاں دیگر مذاہب کا کوئی شخص موجود نہ ہو (رحمۃ اللہ الواسعہ ۵: ۴۲۸)

فائدہ (۱): آنحضور ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں غیر مسلموں کو جزیرۃ العرب سے باہر نہیں نکالا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت تک اسلامی حکومت جزیرۃ العرب سے باہر قائم نہیں ہوئی تھی۔ اور حکومت کسی ملکی یا مذہبی مصلحت سے غیر

مسلموں کو ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں بسا سکتی ہے مگر مملکت سے باہر نکالنا ظلم ہے۔ اس لئے آپؐ نے غیر مسلموں کو حدودِ مملکت سے باہر نہیں نکالا، ان کو وقتی طور پر جزیرۃ العرب میں باقی رکھا، مگر آخر حیات میں فرمایا: ''اگر میں زندہ رہا تو ان شاء اللہ یہود ونصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے باہر کروں گا'' (ابوداؤد ۲: ۴۲۹ کتاب الخراج) اور آپؐ نے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو وصیت کی کہ مشرکین کو جزیرۃ العرب سے باہر کیا جائے (ابوداؤد ۲: ۴۲۹) چنانچہ دورِ فاروقی میں جب اسلامی حکومت پھیل گئی، روم وایران اور عراق ومصر اور شام اس کے زیر نگیں آئے تو آپؓ نے اس وصیت پر عمل کیا اور تمام غیر مسلموں کو جزیرۃ العرب سے باہر کر دیا اور ان کو سوادِ عراق (عراق کے گاؤں) میں اور شام میں آباد کیا۔

فائدہ (۲): تمام ائمہ متفق ہیں کہ جزیرۃ العرب میں غیر مسلموں کو آباد ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی مگر کیا عرب کے مشرکوں سے جزیہ لیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ بالفاظ دیگر: مشرکین عرب کو شرک پر برقرار رکھا جاسکتا ہے یا نہیں؟ یعنی وہ بحالت شرک سرزمین عرب میں رہ سکتے ہیں یا نہیں؟ ائمہ ثلاثہ جواز کے قائل ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عرب کے مشرکوں سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ اس لئے کہ ان کا کفر سخت ہے۔ نبی ﷺ انہی کے درمیان مبعوث ہوئے، اور آپؐ ان کی قوم کے ایک فرد تھے۔ وہی آپؐ کے اولین مخاطب تھے، اور قرآن کریم انہی کی زبان میں اترا ہے، ان امور کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے ایمان لائیں مگر انھوں نے ہٹ دھری سے کام لیا اور ایمان نہیں لائے اس لئے ان کے لئے دو ہی صورتیں ہیں یا تو مسلمان ہوں یا جنگ کے لئے آمادہ ہوں، وہ اپنے کفر وشرک پر برقرار نہیں رکھے جاسکتے۔

دوسرا مسئلہ: اہل جزیہ میں سے جو مسلمان ہو جائے اس سے آئندہ جزیہ ساقط ہو جائے گا یہ اجماعی مسئلہ ہے، البتہ اگر کسی غیر مسلم پر جزیہ واجب ہو چکا ہے پھر وہ مسلمان ہو جائے تو سابقہ واجب جزیہ ساقط ہوگا یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے: امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے واجب جزیہ وصول کیا جائے گا۔ اور دیگر ائمہ کے نزدیک وہ بھی ساقط ہو جائے گا۔ اب وہ جزیہ اس سے نہیں لیا جائے گا۔ اور باب کی حدیث جمہور کی دلیل ہے۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان پر ابتداءً جزیہ نہیں لگایا جاسکتا، بقاءً رہ سکتا ہے۔ اور جمہور کہتے ہیں: مسلمان پر ابتداءً جزیہ عائد نہ ہونا بدیہیات میں سے ہے اُسے بتانے کی ضرورت نہیں۔ جمہور کے نزدیک حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد اس پر جزیہ باقی نہیں رہ سکتا۔ پس سابقہ جزیہ بھی اس سے وصول نہیں کیا جائے گا۔

فائدہ (۱): اسلامی حکومت میں دو فنڈ ہوتے ہیں: ایک: ویلفیر فنڈ، دوسرا: محاصل کا فنڈ۔ ویلفیر فنڈ میں زکوۃ، صدقۃ الفطر اور عشر اکٹھا ہوتا ہے، اور وہ صرف مسلمان غرباء پر خرچ ہوتا ہے۔ سلطنت کی ضروریات میں اس میں سے خرچ نہیں کیا جاتا ـــــــ یہاں یہ مسئلہ جان لینا چاہئے کہ غیر مسلم کو خواہ وہ ذمی ہو یا حربی، زکوۃ اور عشر دینا جائز نہیں۔ البتہ ذمی کو یعنی دار الاسلام میں آباد غیر مسلم کو صدقۃ الفطر دینا جائز ہے اور حربی غیر مسلم کو صدقۃ الفطر بھی نہیں

دے سکتے ——— اور محاصل کے فنڈ میں زمین کا بیگہ (خراج) اور دیگر آمدنیاں (ٹیکس) جمع ہوتا ہے۔ اسی فنڈ کو بیت المال کہتے ہیں۔ اور بیت المال کے دو مصرف ہیں: ایک: حکومت کی ضروریات یعنی فوجیوں کو اور حکومت کے دیگر ملازمین کو اسی فنڈ سے تنخواہ دی جاتی ہے۔ دوسرا مصرف: ملک کی ترقی کے کام۔ مثلاً سڑک بنانا، پل تعمیر کرنا، بجلی بنانا، کارخانے قائم کرنا وغیرہ ان امور میں اسی فنڈ سے خرچ کیا جائے گا۔

اور جو غیر مسلم دارالاسلام میں آباد ہیں ان کو بھی ملکی ضروریات میں اور ملک کی ترقی میں حصہ لینا ہوگا اس لئے کہ ملک کی حفاظت کے لئے فوجیوں کی اور ملک چلانے کے لئے ملازمین کی جس طرح مسلمانوں کو ضرورت ہے غیر مسلموں کو بھی ضرورت ہے۔ اور جب ملک ترقی کرے گا تو اس کا فائدہ ہر شہری کو پہنچے گا مسلمان کو بھی اور غیر مسلم کو بھی۔ علاوہ ازیں غیر مسلموں میں جو غریب محتاج ہیں ان کی دستگیری بھی حکومت کی ذمہ داری ہے اور ویلفیر فنڈ میں سے ان پر خرچ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ زکوۃ اور عشر کی رقوم غیر مسلموں پر خرچ نہیں کی جاسکتیں۔ اور صدقۃ الفطر سے اگرچہ مدد کی جاسکتی ہے مگر وہ رقم تھوڑی ہوتی ہے اس لئے فنڈنگ میں غیر مسلموں کی شرکت کی صورت یہ تجویز کی گئی کہ زکوۃ کے بالمقابل ان کے تاجروں سے عشور (چنگی) لی جائے، اور صدقۃ الفطر کے مقابلہ میں ان کے ہر فرد سے سالانہ جزیہ لیا جائے، اور ان دونوں رقموں سے جو فنڈ اکٹھا ہو وہ تین حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ ایک حصہ: ملک چلانے میں۔ دوسرا حصہ: ملک کی ترقی میں اور تیسرا حصہ: ان کے غرباء اور محتاجوں کی مدد میں استعمال کیا جائے۔

فائدہ (۲): جزیہ کی کوئی خاص مقدار شرعاً متعین نہیں، اس کی مقدار حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مالدار پر سالانہ اڑتالیس درہم اور متوسط حال پر چوبیس درہم، اور کامدار غریب پر بارہ درہم مقرر کئے تھے (ازالۃ الخفاء ۲: ۶۹ بحوالہ امام ابو یوسف) اور عورتیں، بچے محتاج، بوڑھے، مذہبی لوگ اور جن کے پاس کام نہیں جزیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

فائدہ (۳): جزیہ شاندار لفظ ہے اس کے معنی ہیں: بدلہ۔ یعنی حکومت اسلامیہ نے شہریوں کی حفاظت کی جو ذمہ داری لی ہے اور فوج اور پولیس کے ذریعہ ان کی حفاظت کر رہی ہے یہ اس کا بدلہ ہے مگر یہ لفظ استعمال ہوتے ہوتے خراب ہوگیا۔ اب غیر مسلم اس کو گالی سمجھنے لگے ہیں، جیسے پاخانہ اور پیشاب کنائی الفاظ تھے اور شاندار تھے مگر کثرتِ استعمال سے خراب ہوگئے اب کسی مہذب مجلس میں ان کو بولتے ہوئے بھی تکلف ہوتا ہے۔ یہی حال لفظ جزیہ کا ہوگیا ہے پس اگر غیر مسلم اس لفظ کو پسند نہ کریں اور وہ کسی اور نام سے جزیہ دیں تو اس لفظ کے استعمال پر اصرار نہیں ہونا چاہئے۔ وہ جو نام پسند کریں اسی نام سے جزیہ لیا جائے، مقصود فنڈنگ ہے، لفظ نہیں۔ بنوتغلب نے لفظ جزیہ کو ناپسند کیا تھا اور انھوں نے جزیہ دینے سے انکار کیا تھا مگر زکوۃ کے نام پر وہ دوگنا دینے پر راضی تھے۔ چنانچہ گورنر نے امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے استصواب کیا آپؓ نے فرمایا: هذه جزية سَمُّوْها ما شئتم (فتح القدیر ۵: ۳۰۵)

یعنی یہ جزیہ ہے، تم اس کا جو چاہو نام رکھو، معلوم ہوا کہ لفظ مقصود نہیں ہے، کام مقصود ہے۔

[۱۱] باب ماجاء ليس على المسلمين جزية

[۶۲۹-] حدثنا يَحيىَ بن أَكْثَمَ، نا جَرِيرٌ، عن قَابُوْسَ بنِ أبي ظَبْيَانَ، عن أبيهِ، عن ابنِ عباسٍ، قال: قال رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: " لَايَصْلُحُ قِبْلَتَانِ فِيْ أَرْضٍ وَاحِدَةٍ، ولَيْسَ على المُسْلِمِيْنَ جِزْيَةٌ"

حدثنا أبو كُرَيْبٍ، نا جَرِيرٌ، عن قَابُوْسَ، بهذا الإِسْنَادِ نَحْوَهُ.

وفي الباب: عن سعيدِ بنِ زَيْدٍ، وجَدِّ حَرْبِ بنِ عُبَيْدِ اللهِ الثَّقَفِيِّ.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عباسٍ قد رُوِيَ عن قَابُوْسَ بنِ أبي ظَبْيَانَ، عن أبيهِ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم مُرْسَلاً.

والعملُ على هٰذَا عِنْدَ عَامَّةِ أهلِ العلمِ أَنَّ النَّصْرَانِيَّ إِذَا أَسْلَمَ وُضِعَتْ عَنْهُ جِزْيَةُ رَقَبَتِهِ.

وقولُ النبيِّ صلى الله عليه وسلم: " لَيْسَ على المُسْلِمِيْنَ جِزْيَةٌ عُشُوْرٌ" إِنَّمَا يَعْنِيْ به جِزْيَةَ الرَّقَبَةِ، وفي الحديثِ مَا يُفَسِّرُ هٰذا، حَيْثُ قال: " إِنَّمَا العُشُوْرُ على اليَهُوْدِ والنَّصَارَى، ولَيْسَ عَلَى المُسْلِمِيْنَ عُشُوْرٌ"

ترجمہ اور وضاحت: باب کی حدیث قابوس بن ابی ظبیان کی ہے، ان سے جریر نے روایت کی ہے۔ جریر اس کو مسند بیان کرتے ہیں، یعنی آخر میں حضرت ابن عباس کا تذکرہ کرتے ہیں اور بعض دوسرے تلامذہ نے اس کو مرسل روایت کیا ہے یعنی آخر میں حضرت ابن عباسؓ کا تذکرہ نہیں کیا۔ اور اس پر اکثر علماء کا عمل ہے کہ نصرانی (یا کوئی بھی غیر مسلم) جب اسلام قبول کرلے تو اس سے گردن کا جزیہ (اضافت بیانیہ ہے) ساقط کر دیا جائے گا۔ اور نبی ﷺ کے ارشاد: ليس على المسلمين جزيةٌ عُشُوْرٌ یعنی مسلمانوں پر جزیہ عشور نہیں۔ اس حدیث میں بھی گردن کا جزیہ مراد ہے، اور ایک دوسری حدیث میں اس کی وضاحت ہے، فرمایا: "عشور صرف یہود ونصاری پر ہے، مسلمانوں پر عشور نہیں" معلوم ہوا کہ عشور سے جزیہ مراد ہے، وہی مسلمانوں پر نہیں۔

تشریح: جاننا چاہئے کہ حرب بن عبید اللہ کے دادا کی حدیث جس کا وفی الباب میں حوالہ ہے یہ حدیث ابوداؤد (۲:۴۳۲ کتاب الخراج) میں ہے اور اس میں لفظ عشور آیا ہے۔ اور حدیث کے الفاظ وہی ہیں جو امام ترمذی رحمہ اللہ نے باب کے آخر میں لکھے ہیں اور امام ترمذی کا خیال یہ ہے کہ جزیہ اور عشور ایک ہیں، مگر صحیح بات یہ ہے کہ یہ دو مستقل لفظ ہیں اور عشور کے معنی چنگی کے ہیں۔ ذمی تاجروں سے زکوۃ کے مقابلہ میں جو چنگی لی جاتی ہے وہ عشور ہے اور ذمیوں

سے جو صدقۃ الفطر کے مقابلہ میں سالانہ رقم لی جاتی ہے وہ جزیہ ہے۔ پس امام ترمذی رحمہ اللہ کی تفسیر صحیح نہیں اور لیس علی المسلمین جزیۃ عشورٌ کے لفظ سے کوئی حدیث نہیں۔ اوپر امام ترمذیؒ کی روایت میں صرف لفظ جزیۃ ہے، عشور نہیں ہے۔

بابُ ماجاءَ فی زَکَاۃِ الحُلِیِّ

زیورات کی زکوٰۃ کا بیان

مذاہب فقہاء: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ان زیورات میں جو عورت کی ملک ہوں اور جن کو عورت پہنتی ہو زکوٰۃ واجب نہیں۔ ان کے نزدیک یہ مالِ نامی نہیں، استعمال کی چیز ہے، اور زکوٰۃ مالِ نامی میں واجب ہوتی ہے، اور سونے چاندی کے جو زیورات مرد کی ملک ہوں یا عورت کی ملک ہوں مگر وہ ان کو پہنتی نہ ہو تو ان میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اور حنفیہ کے نزدیک سونے چاندی کے ہر زیور میں زکوٰۃ واجب ہے خواہ وہ خالص سونے کا ہو یا سونا چاندی غالب ہو۔ اور خواہ وہ عورت کی ملک ہو یا مرد کی، اور خواہ عورت ان کو استعمال کرتی ہو یا نہ کرتی ہو ہر صورت میں زکوٰۃ واجب ہے۔

ائمہ ثلاثہ کی دلیل عدمِ دلیل ہے، وہ کہتے ہیں: زیورات میں زکوٰۃ کے وجوب کی کوئی صحیح صریح حدیث موجود نہیں، جبکہ وجوب کے لئے صحیح حدیث ہونا ضروری ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ باب میں دو حدیثیں ہیں۔ پہلی حدیث صحیح ہے مگر صریح نہیں۔ اور دوسری حدیث صریح ہے اور اس کی دو سندیں ہیں اور دونوں کمزور ہیں۔ ایک میں ابن لہیعہ ہیں اور دوسری میں مثنی بن الصباح ہیں۔ اور یہ دونوں ضعیف راوی ہیں، مگر اس کی ایک تیسری سند بھی ہے جو صحیح ہے مگر وہ امام ترمذی کے پیشِ نظر نہیں۔

حدیث (۱): حضرت ابن مسعود کی اہلیہ زینب رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں میں تقریر کی اور فرمایا: ''اے عورتو! خیرات کرو۔ خواہ تمہارے زیورات میں سے ہو۔ اس لئے کہ قیامت کے دن جہنم میں عورتیں زیادہ ہونگی'' (پس جہنم سے بچنے کا سامان کرو، اور خیرات کرنا جہنم سے بچنے کا سامان ہے)

تشریح: یہ حدیث صحیح ہے مگر زیورات میں زکوٰۃ کے وجوب کی صریح دلیل نہیں کیونکہ اس سے نفلی صدقہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔

اس حدیث کو اعمش رحمہ اللہ سے شعبہ اور ابو معاویہ روایت کرتے ہیں ابو معاویہ اپنی سند میں عمرو بن الحارث بن المصطلق کے بعد عن بڑھاتے ہیں مگر یہ اضافہ صحیح نہیں کیونکہ یہی عمرو بن الحارث حضرت زینب کے بھتیجے ہیں، صحیح سند شعبہ رحمہ اللہ کی ہے۔

حدیث (۲): رسول اللہ ﷺ کے پاس دو عورتیں آئیں (یہ نزولِ حجاب سے پہلے کا واقعہ ہے) دونوں کے

ہاتھوں میں سونے کے کنگن (چوڑیاں) تھے، آپؐ نے ان سے پوچھا: ''کیا تم ان زیورات کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟'' دونوں نے کہا: نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ان سونے کی چوڑیوں کے بدلے میں جہنم کے کنگن پہنائیں؟'' دونوں نے کہا: نہیں، آپؐ نے فرمایا: ''تو ان کی زکوٰۃ ادا کرو''

تشریح: زیورات میں زکوٰۃ کے وجوب کے سلسلہ میں یہ حدیث صریح ہے اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس کی دو سندیں پیش کی ہیں وہ دونوں ضعیف ہیں۔ پہلی سند ابن لہیعہ کی وجہ سے ضعیف ہے اور دوسری سند مثنی بن الصباح کی وجہ سے ضعیف ہے۔ مگر اس حدیث کی ایک تیسری سند بھی ابوداؤد (۲: ۲۱۸) میں ہے خالد بن الحارث (جو ثقہ اور ثبت ہیں) حسین معلم سے اور وہ عمرو بن شعیب سے روایت کرتے ہیں۔ یہ سند صحیح ہے، البانی نے جو غیر مقلد ہیں مشکوٰۃ (حدیث ۱۸۰۹) کے حاشیہ میں اس تیسری سند کو حسن قرار دیا ہے، ابوداؤد کی اس حدیث کے آخر میں یہ اضافہ بھی ہے کہ یہ وعید سن کر دونوں عورتوں نے اپنے کنگن خیرات کر دیئے۔ یہاں سے یہ مسئلہ بھی نکلا کہ اگر آدمی زکوٰۃ فرض ہونے کے بعد قابلِ زکوٰۃ مال سارا خیرات کر دے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

اور حنفیہ کی ایک دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث بھی ہے وہ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے میرے ہاتھ میں فَتَخات (ایک خاص زیور) دیکھے۔ آپؐ نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ زیور میں نے اس لئے بنوایا ہے کہ اس کو پہن کر میں آپ کیلئے مزین بنوں۔ آپؐ نے پوچھا: کیا تم اس کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ میں نے نفی میں جواب دیا تو آپؐ نے فرمایا: هو حسبُكِ مِن النار: تمہارے جہنم میں جانے کے لئے یہ زیور کافی ہے! یعنی اگر تم ان زیورات کی زکوٰۃ نہیں دوگی تو جہنم کا عذاب ثابت ہو جائے گا۔ یہ حدیث ابوداؤد (حدیث ۱۵۶۵) اور دیگر کتب حدیث میں ہے۔ حاکم نے اس کو علی شرط الشیخین قرار دیا ہے۔ اور ابن دقیق العید نے علی شرط المسلم کہا ہے (معارف السنن ۵: ۲۳۰) یہ حدیث اور عمرو بن شعیب کی حدیث حنفیہ کی دلیل ہے۔

[۱۲] باب ماجاء في زكاة الْحُلِيِّ

[۶۳۰-] حدثنا هَنَّادٌ، نا أبو مُعَاوِيَةَ، عن الأَعْمَشِ، عن أبي وَائِلٍ، عن عَمْرِو بنِ الحَارِثِ بنِ المُصْطَلِقِ، عن ابنِ أَخِيْ زَيْنَبَ امْرَأَةِ عبدِ اللّٰهِ، عن زَيْنَبَ امْرَأَةِ عبدِ اللّٰهِ، قالتْ: خَطَبَنَا رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فقال: "يا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ، ولَوْ مِنْ حُلِيِّكُنَّ، فإنَّكُنَّ أَكْثَرُ أَهْلِ جَهَنَّمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"

حدثنا محمودُ بنُ غَيْلاَنَ، نا أبو داودَ، عن شُعْبَةَ، عن الأعْمَشِ، قالَ: سَمِعْتُ أَبَا وَائِلٍ، يُحَدِّثُ عن عَمْرِو بنِ الحَارِثِ ابنِ أَخِيْ زَيْنَبَ امْرَأَةِ عبدِ اللّٰهِ، عن زَيْنَبَ امْرَأَةِ عبدِ اللّٰهِ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم نَحْوَهُ، وهٰذَا أَصَحُّ مِنْ حَدِيْثِ أبي مُعَاوِيَةَ.

وأبو مُعَاوِيَةَ وَهِمَ في حدِيثِهِ فقالَ: عَنْ عَمْرِو بنِ الحَارِثِ عن ابنِ أَخِيْ زَيْنَبَ، والصَّحِيْحُ إِنَّمَا هُوَ:عن عمرِو بنِ الحارثِ ابنِ أخي زينب.

وقد رُوِيَ عن عَمْرِو بنِ شُعَيْبٍ، عن أبيهِ، عن جَدِّهِ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَنَّهُ رَأَى في الحُلِيِّ زَكَاةً، وفي إِسْنَادِهِ مَقَالٌ.

واختَلَفَ أهلُ العِلْمِ في ذٰلِكَ: فَرَأَى بَعْضُ أهلِ العلمِ مِنْ أَصْحَابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم والتابِعِيْنَ في الحُلِيِّ زَكَاةً، مَاكَانَ مِنْهُ: ذَهَبٌ وفِضَّةٌ، وبه يقولُ سفيانُ الثوريُّ،وعبدُ اللّٰهِ بنُ المباركِ.

وقالَ بعضُ أصحابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم، مِنْهُمْ ابنُ عُمَرَ، وعائشةُ، وجابرُ بنُ عبدِ اللهِ، وأنسُ بنُ مالكٍ: لَيْسَ في الحُلِيِّ زكاةٌ، وهكذا رُوِيَ عن بعضِ فُقَهَاءِ التَّابِعِيْنَ، وبه يقولُ مالكُ بنُ أنسٍ، والشافعيُّ، وأحمدُ، وإسحاقُ.

[۶۳۱-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا ابنُ لَهِيْعَةَ، عن عَمْرِو بنِ شُعَيْبٍ، عن أبيهِ، عن جَدِّهِ، أَنَّ امْرَأَتَيْنِ أَتَتَا رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، وفي أَيْدِيْهِمَا سِوَارَانِ مِنْ ذَهَبٍ، فقالَ لَهُمَا:" أَتُؤَدِّيَانِ زَكَاتَهُ؟" فَقَالَتَا: لا: فقالَ لَهُمَارسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم:" أَتُحِبَّانِ أَنْ يُسَوِّرَكُمَا اللّٰهُ بِسِوَارَيْنِ مِنْ نَارٍ؟" قَالَتَا: لا، قال:" فَأَدِّيَا زَكَاتَهُ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ قَدْ رَوَاهُ المُثَنّٰى بنُ الصبَّاحِ عن عَمْرِو بن شُعَيْبٍ، نَحْوَ هٰذَا. والمُثَنّٰى بنُ الصَبَّاحِ وابنُ لَهِيْعَةَ: يُضَعَّفَانِ في الحديثِ ولاَ يَصِحُّ في هٰذا عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم شَيْئٌ.

ترجمہ اوروضاحت: امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابومعاویہ نے عمرو بن الحارث بن المصطلق کے بعد جوعن بڑھایا ہے وہ ان کا وہم ہے اس لئے کہ حضرت زینب کے بھتیجے یہی عمرو بن الحارث ہیں، چنانچہ شعبہ نے بھی یہ حدیث اعمش سے روایت کی ہے ان کی سند میں عن نہیں ہے۔ اور عمرو بن شعیب عن أبیه، عن جده کی سند سے حدیث آگے آرہی ہے، اوراس کی سند میں کلام ہے۔ اور علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ بعض صحابہ اور تابعین زیورات میں زکوۃ کے قائل ہیں، جو بھی زیور ہو (یہ ماکان منه کا ترجمہ ہے) سونے کا ہو یا چاندی کا۔ سفیان ثوری اور ابن المبارک اسی کے قائل ہیں۔ اور بعض صحابہ جن میں ابن عمر، عائشہ، جابر بن عبداللہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم شامل ہیں فرماتے ہیں: زیورات میں زکوۃ نہیں (حضرت عائشہؓ کی طرف اس قول کی نسبت شاید صحیح نہ ہو، کیونکہ وہ وجوبِ زکوۃ کی حدیث روایت کرتی ہیں اور راوی اپنی روایت کے خلاف فتوی نہیں دے سکتا ورنہ اس کی عدالت ساقط ہوجائے گی) اوراسی طرح بعض فقہائے تابعین سے مروی ہے اور مالک، شافعی، احمد اور اسحاق اسی کے قائل ہیں اس کے بعد عمرو بن شعیب کی حدیث ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: اس حدیث کو عمرو بن شعیب سے مثنی بن الصباح نے

بھی اسی طرح روایت کیا ہے، اورمثنی اور ابن لہیعہ دونوں حدیث میں ضعیف قرار دیئے گئے ہیں۔ اور اس باب میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی صحیح حدیث مروی نہیں (امام ترمذی نے یہ بات اپنے علم کے اعتبار سے کہی ہے حقیقت میں اس باب میں صحیح روایتیں ہیں جیسا کہ گذرا)

فائدہ: امام ترمذی رحمہ اللہ کبھی کبیر شیئ کی نفی کرتے ہیں اور کبھی شیئ کی۔ پہلی صورت میں مراد یہ ہوتی ہے کہ باب کی بیشتر حدیثیں ضعیف ہیں، بس ایک آدھ صحیح ہے۔ اور جب شیئ کی نفی کریں تو مراد یہ ہوتی ہے کہ باب کی کوئی حدیث صحیح نہیں۔

بَابُ ماجاء فی زَكَاةِ الخَضْرَاوَاتِ

سبزی ترکاری کی زکوۃ کا بیان

پہلے یہ مسئلہ آچکا ہے کہ ائمہ ثلاثہ اور صاحبین کے نزدیک صرف اس زرعی پیداوار میں زکوۃ واجب ہے جو ذخیرہ کی جاسکتی ہے اور وہ پانچ وسق سے زیادہ ہو۔ پس سبزیاں جو اسٹور کر کے نہیں رکھی جاسکتیں ان میں زکوۃ یعنی عشر واجب نہیں۔ اگرچہ وہ پانچ وسق سے زیادہ ہوں۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک نہ قابل ذخیرہ ہونا شرط ہے نہ نصاب شرط ہے۔ پس ان کے نزدیک سبزیوں ترکاریوں میں دسواں یا بیسواں حصہ واجب ہے۔ البتہ امام اعظمؒ فرماتے ہیں: سبزیوں اور ترکاریوں کی زکوۃ گورنمنٹ وصول نہیں کرے گی۔ کیونکہ جب تک ساعی عشر وصول کرے گا اور غریبوں میں تقسیم کرے گا وہ خراب ہو جائیں گی، بلکہ مالکان خود غرباء تک پہنچائیں گے۔

حدیث: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے یمن سے خط لکھ کر رسول اللہ ﷺ سے معلوم کیا کہ سبزیوں میں زکوۃ ہے یا نہیں؟ آپؐ نے جواب دیا: ''سبزیوں میں زکوۃ نہیں''

تشریح: یہ حدیث ضعیف ہے، حسن بن عمارۃ نہایت درجے کا ضعیف راوی ہے اور عیسیٰ بن طلحہ بھی اچھا راوی نہیں۔ اور یہی عیسیٰ اس حدیث کو مرفوع کرتا ہے، اور اس کا بھائی موسیٰ جو اس کی بنسبت اچھا راوی ہے حدیث کو مرسل کرتا ہے۔ یعنی حضرت معاذ کا تذکرہ نہیں کرتا، صرف واقعہ بیان کرتا ہے۔ پھر اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سبزیوں میں سے عشر حکومت وصول نہیں کرے گی۔ کیونکہ یہ مسئلہ گورنر نے پوچھا ہے پس سائل کے لحاظ سے جواب دیا گیا ہے۔ رہی یہ بات کہ سبزیوں میں فی نفسہ زکوۃ ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں یہ حدیث خاموش ہے۔

اور جاننا چاہئے کہ مسئلہ باب میں کوئی بھی صحیح حدیث نہیں، نہ وجوب عشر کی اور نہ عدم وجوب کی۔ اور قرآن وحدیث کے عمومات کی دلالت اس پر ہے کہ ہر زرعی پیداوار میں زکوۃ ہو۔ پس سبزی ترکاری میں بھی زکوۃ ہونی چاہئے۔ واللہ اعلم

[۱۳] باب ماجاء فى زكاة الخَضْرَاوَاتِ

[۶۳۲-] حدثنا عليُّ بنُ خَشْرَمٍ، نا عيسى بنُ يُوْنُسَ، عن الحَسَنِ، عن محمدِ بنِ عبدِ الرحمنِ بنِ عُبَيْدٍ، عن عيسى بنِ طَلْحَةَ، عن مُعَاذٍ، أَنَّهُ كَتَبَ إلى النبيِّ صلى الله عليه وسلم، يَسْأَلُهُ عن الخَضْرَاوَاتِ: وهِيَ البُقُوْلُ؟ فقال: "لَيْسَ فِيْها شَيْئٌ"

قال أبو عيسى: إسنادُ هذا الحديثِ لَيْسَ بصَحِيْحٍ، ولَيْسَ يَصِحُّ فى هذا البابِ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم شَيْئٌ، وإِنَّمَا يُرْوَى هذا عن موسى بنِ طَلْحَةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم مُرْسَلاً، والعَمَلُ على هذا عِنْدَ أهلِ العلمِ: أَنَّهُ لَيْسَ فِى الخَضْرَاوَاتِ صَدَقَةٌ.

قال أبو عيسى: والحَسَنُ هو ابنُ عُمَارَةَ، وهوضَعيفٌ عندَ أهلِ الحديثِ، ضَعَّفَهُ شُعْبَةُ وغَيْرُهُ، وتَرَكَهُ عبدُ اللّٰهِ بنُ المبارَكِ.

ترجمہ: امام ترمذیؒ کہتے ہیں: اس حدیث کی سند صحیح نہیں اور اس باب میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی حدیث ثابت نہیں اور یہ حدیث موسیٰ بن طلحہ سے (بھی) روایت کی گئی ہے، وہ نبی ﷺ سے مرسلا روایت کرتے ہیں (موسیٰ کی روایت سنن دار قطنی میں ہے) اور اس حدیث پر علماء کا عمل ہے کہ سبزیوں میں زکوٰۃ نہیں۔ امام ترمذیؒ کہتے ہیں: سند کا راوی حسن: حسن بن عمارۃ ہے اور وہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ شعبہ رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کی تضعیف کی ہے۔ اور ابن المبارک نے اس کو چھوڑ دیا ہے، یعنی ابن المبارک سبق میں اور اپنی تصنیفات میں اس کی روایتیں بیان نہیں کرتے تھے۔

بابُ ماجاءَ فى الصَّدَقَةِ فِيْمَا يُسْقَى بِالأَنْهَارِ وَغَيْرِهَا

جوزمین نہر وغیرہ سے سینچی جائے اس کے عشر کا بیان

زمین کی پیداوار میں دو فریضے ہیں، دسواں حصہ اور بیسواں حصہ۔ اگر زمین کی سینچائی پر خرچ کیا ہے مثلاً موٹر کے ذریعہ سینچائی کی ہے یا سینچائی پر محنت کی ہے یعنی رہٹ کوس وغیرہ سے سینچائی کی ہے تو پیداوار میں نصف عشر (بیسواں حصہ) واجب ہے۔ اور اگر نہ تو خرچہ کیا ہے نہ محنت کی ہے، نہر، چشمہ یا بارش سے سینچائی ہوئی ہے تو عشر (دسواں حصہ) واجب ہے۔ اور عرف میں دونوں کو عشر کہتے ہیں اور یہ مسئلہ اجماعی ہے۔

حدیث (۱): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اُس پیداوار میں جس کو بارش یا چشموں نے سینچا ہے دسواں حصہ ہے اور اس پیداوار میں جو پانی بردار اونٹنی کے ذریعہ سینچی گئی ہے بیسواں حصہ ہے"

تشریح: اس حدیث کو حارث بن عبدالرحمٰن نے سلیمان بن یسار اور بُسر بن سعید سے مرفوعاً روایت کیا ہے اور بکیر بن عبداللہ نے مرسل روایت کیا ہے۔ یعنی وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں کرتے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنے مزاج کے مطابق مرسل حدیث کو اصح قرار دیا ہے، وہ جدھر نشیب ہوتا ہے پانی بہادیتے ہیں۔

حدیث (۲): ابن عمرؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے طریقہ رائج کیا کہ دسواں حصہ لیا جائے اس پیداوار میں سے جس کو بارش یا چشموں نے سینچا ہے، یا وہ عَثَری زمین ہے اور اس پیداوار میں سے جس کو پانی بردار اونٹنی کے ذریعہ سینچا گیا ہے نصف عشر لیا جائے۔

تشریح: عَثَری: کھجور وغیرہ کے اس باغ کو کہتے ہیں جس کے درمیان سے یا پاس سے نہر گذر رہی ہے اور درختوں کو نیچے سے تری مل رہی ہے، اس پیداوار میں عشر واجب ہے، کیونکہ سینچائی پر نہ تو خرچ کیا گیا ہے اور نہ محنت کی گئی ہے۔ اور العشور کے اصلی معنی ہیں: چُنگی اور مجازی معنی ہیں: عشر، یہاں مجازی معنی مراد ہیں۔

[۱٤] باب ماجاء في الصدقة فيما يُسْقٰى بالأنهار وغيرها

[٦٣٣-] حدثنا أبو موسى الأَنْصَارِيُّ، نا عَاصِمُ بنُ عبدِ العزيزِ المَدِيْنِيُّ، نا الحَارِثُ بنُ عبدِ الرحمنِ بنِ أبي ذُبَابٍ، عن سُلَيْمَانَ بنِ يَسَارٍ، وبُسْرِ بنِ سَعِيدٍ، عن أبي هريرةَ، قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: " فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ والعُيُوْنُ العُشْرُ، وفِيْمَا سُقِيَ بالنَّضْحِ نصفُ العُشْرِ"

وفي الباب: عن أنسِ بنِ مالكٍ، وابنِ عُمَرَ، وجابرٍ.

قال أبو عيسى: وقد رُوِيَ هذا الحديثُ عن بُكَيْرِ بنِ عبدِ اللهِ بنِ الأَشَجِّ، عن سُلَيْمَانَ بنِ يَسَارٍ، وبُسْرِ بنِ سَعِيدٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم مُرْسَلاً، وكأنَّ هذا الحديثُ أَصَحُّ، وقد صَحَّ حديثُ ابنِ عُمَرَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم في هذا البابِ، وعليهِ العملُ عندَ عامَّةِ الفُقَهَاءِ.

[٦٣٤-] حدثنا أحمدُ بنُ الحَسَنِ، نا سَعِيدُ بنُ أبي مَرْيَمَ، نا ابنُ وَهْبٍ، قال: حَدَّثَنِي يُوْنُسُ، عن ابنِ شهابٍ، عن سالِمٍ، عن أبيهِ، عن رسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم: أَنَّهُ سَنَّ فِيْمَاسَقَتِ السَّمَاءُ وَالعُيُوْنُ أَوْ كَانَ عَثَرِيًّا العُشُوْرَ، وفِيْمَا سُقِيَ بالنَّضْحِ نصفَ العُشْرِ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وضاحت: حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کو امام ترمذی نے مرسل کردیا ہے، مگر فرماتے ہیں کہ ابن عمر کی مرفوع حدیث ثابت ہے اسی کو آگے (نمبر ۶۳۴) پر لائیں گے اور اسی حدیث پر علماء کا عمل ہے اور یہ مسئلہ اجماعی ہے۔

فائدہ: مدینی: مدینۃ السلام کی طرف نسبت ہے۔ یہ بغداد کا پرانا نام ہے، بغداد کی اصل بَغ داد ہے۔ بَغ: ایک

بت کا نام ہے یعنی یُغ کا عطیہ، چونکہ اس نام میں شرک کی بوتھی اس لئے مسلمانوں نے اس کا نام بدل دیا، مگر وہ چلا نہیں ،اب بھی پرانا نام ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ غرض اس شہر کی طرف نسبت ''مدینی'' ہے اور مدینۃ الرسول کی طرف نسبت ''مدنی'' ہے، دونوں نسبتوں میں فرق کرنے کے لئے ی باقی رکھی گئی ہے۔

بابُ ماجاءَ فی زکَاۃِ مَالِ الیَتِیمِ

نابالغ کے مال میں زکوۃ کا حکم

یتیم: اس بچہ کو کہتے ہیں جس کا باپ فوت ہو گیا ہو، مگر کبھی ہر نابالغ کو یتیم کہہ دیتے ہیں خواہ اس کا باپ فوت ہو چکا ہو یا زندہ ہو، یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

مذاہبِ فقہاء: احناف کے نزدیک اس نابالغ پر جو مالدار ہے زکوۃ واجب نہیں۔ اس لئے کہ حدیث میں ہے: تین شخصوں سے قلم اٹھا دیا گیا ہے یعنی وہ احکام شرعیہ کے مکلف نہیں۔ ان میں سے ایک نابالغ بھی ہے (یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے اور ابواب الحدود میں آئے گی) البتہ حنفیہ کے نزدیک اگر نابالغ مالدار ہے تو اس کا صدقۃ الفطر اس کے مال میں واجب ہے اس کے باپ پر واجب نہیں۔ البتہ اگر باپ بچہ کا صدقہ ادا کر دے تو جائز ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مالدار نابالغ بچے پر زکوۃ بھی واجب ہے اور صدقۃ الفطر بھی واجب ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اس مسئلہ میں کسی کے پاس ایسی مرفوع حدیث جو صحیح اور صریح ہو موجود نہیں، دونوں فریقوں کے پاس آثار صحابہ اور اجتہاد ہے، حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جب نابالغ پر نماز، روزہ، حج وغیرہ کوئی بھی عبادت فرض نہیں تو زکوۃ بھی فرض نہیں۔ اور ائمہ ثلاثہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زکوۃ مال میں واجب ہوتی ہے ذمہ پر نہیں، اور بچہ کا ذمہ تو قابل فریضہ نہیں مگر اس کے مال میں وجوب ہو سکتا ہے، چنانچہ حنفیہ بھی بچہ کے مال میں صدقۃ الفطر واجب کرتے ہیں۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے تقریر میں فرمایا: ''سنو! جو شخص کسی ایسے یتیم کا سرپرست بنے جس کے پاس مال ہے تو چاہئے کہ وہ اس مال کو تجارت میں لگائے، اور مال کو یوں ہی چھوڑے نہ رہے تا آنکہ اس کو صدقہ کھالے''

تشریح: کرنسی کی قیمت دن بہ دن گھٹتی ہے۔ پندرہ سال پہلے کے پانچ سو روپے میں اور آج کے پانچ سو روپے میں فرق ہے، وہ آج کے پانچ ہزار کے برابر تھے، اس لئے اگر یتیم کے مال کو یوں ہی چھوڑے رکھا جائے گا تو اس کے بالغ ہونے تک وہ مال بے حیثیت ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں اس مال میں سے بچہ پر خرچ ہوگا اس لئے مال رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا، اور اس کو تجارت میں لگائے گا تو مال خرچ بھی ہوگا اور بڑھے گا بھی۔ اس لئے نبی ﷺ نے سرپرستوں کو ہدایت دی کہ وہ بچہ کے مال کو یوں ہی نہ چھوڑے رکھیں بلکہ اس کو کسی کاروبار میں لگائیں۔

اس حدیث میں صدقہ کا کیا مفہوم ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک: وہ صرفہ مراد ہے جو سرپرست

بچہ پر کرتا ہے۔ظاہر ہے جب مال خرچ ہوگا اور آمدنی نہ ہوگی تو رفتہ رفتہ مال ختم ہو جائے گا، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک صدقہ سے زکوٰۃ مراد ہے۔وہ کہتے ہیں: مال ختم ہونے کی وجہ سال بہ سال اس میں زکوٰۃ واجب ہونا ہے۔احناف کہتے ہیں: زکوٰۃ سے کل مال ختم نہیں ہوسکتا، کیونکہ جب زکوٰۃ ادا کرتے کرتے نصاب گھٹ جائے گا تو وجوب ختم ہو جائے گا۔سارا مال صرف اس صورت میں ختم ہوسکتا ہے جبکہ اس میں سے بچہ پر خرچ کرنا مراد لیا جائے۔

غرض اس حدیث کی وجوب زکوٰۃ پر دلالت قطعی نہیں اور حدیث صحیح بھی نہیں، کیونکہ یہ مثنیٰ بن الصباح کی روایت ہے اور وہ ضعیف راوی ہے۔علاوہ ازیں یہ حدیث موقوف بھی مروی ہے اور اس کی سند حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر پہنچتی ہے یعنی عمرو بن شعیب کا بیان ہے کہ مذکورہ تقریر حضرت عمرؓ نے کی ہے۔پس بات کچھ سے کچھ ہوگئی۔

[۱۵] باب ماجاء فی زكاة مال اليتيم

[۶۳۵-] حدثنا محمدُ بنُ إسماعيلَ، نا إبراهيمُ بنُ موسى، نا الوليدُ بنُ مُسْلِمٍ، عن المُثَنَّى بنِ الصَّبَّاحِ، عن عَمْرِو بنِ شُعَيْبٍ، عن أبيهِ، عن جَدِّهِ: أنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم خَطَبَ النَّاسَ فَقَالَ: " أَلَا مَنْ وَلِيَ يَتِيمًا لَهُ مَالٌ فَلْيَتَّجِرْ فيهِ، وَلَا يتركْه حَتّى تَأْكُلَهُ الصَّدَقَةُ"

قال أبو عيسى: وإنما رُوِيَ هذا الحديثُ مِنْ هذا الوَجْهِ، وفي إِسْنَادِهِ مَقَالٌ،لِأَنَّ المُثَنَّى بنَ الصَّبَّاحِ يُضَعَّفُ في الحديثِ، وَرَوَى بَعْضُهُمْ هذا الحديثَ عَنْ عَمْرِو بنِ شُعَيْبٍ: أَنَّ عُمَرَ بنَ الخطَّابِ فَذَكَرَ هذا الحديثَ.

وقد اختَلَفَ أهلُ العلمِ في هذا البابِ،فَرَأى غَيْرُ وَاحِدٍ مِنْ أَصْحَابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم في مالِ اليَتِيمِ زَكَاةً، مِنْهُمْ عُمَرُ، وَعَلِيٌّ، وعائشةُ،وابنُ عُمَرَ، وبه يقولُ مَالِكٌ، والشافِعِيُّ، وأحمدُ وإسحاقُ.

وقالتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ العلمِ: لَيْسَ في مَالِ اليَتِيمِ زَكَاةٌ، وبِهِ يَقُولُ سفيانُ الثوريُّ، وعبدُ اللهِ بنِ المباركِ.

وعَمْرُو بنُ شُعَيْبٍ: هو ابنُ محمدِ بنِ عبدِ اللهِ بنِ عَمْرِو بنِ العاصِ، وشُعَيْبٌ قَدْ سَمِعَ مِنْ جَدِّهِ عبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو،وقد تكَلَّمَ يَحْيَى بنُ سَعِيدٍ في حديثِ عَمْرِو بنِ شُعَيْبٍ، وقالَ: هُوَ عِنْدَنَاوَاهٍ،ومَنْ ضَعَّفَهُ فَإِنَّمَاضَعَّفَهُ مِنْ قِبَلِ أَنَّهُ يُحَدِّثُ مِنْ صَحِيفَةِ جَدِّهِ عبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو.

وأَمَّا أَكْثَرُ أهلِ الحديثِ فَيَحْتَجُّونَ بِحَدِيثِ عَمْرِو بنِ شُعَيْبٍ، ويُثْبِتُونَهُ، مِنْهُمْ أحمدُ،وإسحاقُ، وغَيْرُهُمَا.

ترجمہ: امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ حدیث صرف اسی سند سے مروی ہے اور اس کی سند میں کلام ہے، اس

لئے کہ مثنی بن الصباح حدیث میں ضعیف قرار دیئے گئے ہیں۔اور بعض نے یہ حدیث عمرو بن شعیب سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ تقریر کی پس اس حدیث کو ذکر کیا (یہ موقوف حدیث دار قطنی (۲:۱۱۰) میں ہے اور اس کو حسین معلم: مکحول سے، وہ عمرو بن شعیب سے، وہ سعید بن المسیب سے اور وہ حضرت عمرؓ سے روایت کرتے ہیں۔ اور سفیان بن عیینہ نے یہ حدیث عمرو بن دینار سے، انھوں نے عمرو بن شعیب سے، انھوں نے حضرت عمرؓ سے روایت کی ہے۔یعنی وہ سعید بن المسیب کا تذکرہ نہیں کرتے۔اور دار قطنی نے کتاب العلل میں سفیان کی حدیث کو اصح قرار دیا ہے) (دار قطنی درحاشیہ ۲:۱۱۱) اور علماء کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے، متعدد صحابہ یتیم کے مال میں زکوۃ کے قائل ہیں۔ان میں سے حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عائشہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم ہیں، اور یہی بات مالک، شافعی احمد اور اسحاق کہتے ہیں۔اور علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یتیم کے مال میں زکوۃ نہیں، اور اس کے ثوری اور ابن المبارک قائل ہیں (ابن مسعود کا بھی یہی مذہب ہے، معارف السنن) اس کے بعد عمرو بن شعیب کی سند پر کلام ہے اور اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ شعیب کا اپنے دادا عبداللہ بن عمرو بن العاص سے سماع ہے یا نہیں؟ جو حضرات سماع نہیں مانتے ان کے نزدیک اس سند سے آنے والی تمام روایات منقطع ہیں۔چنانچہ یحیٰ قطان نے یہ سند بودی قرار دی ہے (واہِ کے یہی معنی ہیں) اور جمہور اور اکابر محدثین کے نزدیک سماع ثابت ہے پس اس سند سے آنے والی روایات معتبر ہیں۔تفصیل کتاب الصلاۃ باب ۱۲۶ میں گذر چکی ہے۔

بابُ ماجاءَ أنَّ العَجْمَاءَ جُرْجُهَا جُبارٌ وفى الرِّكَازِ الخُمْسُ

چوپایہ جانی یا مالی نقصان کرے تو ضمان نہیں اور خزانے میں خمس ہے

العَجْمَاء: کے معنی ہیں: حیوان۔جُرْح اور جَرْح کے معنی ہیں: زخم اور زخمی کرنا۔ایک مصدر ہے ایک حاصل مصدر۔جُبَارٌ کے معنی ہیں: رائگاں، هَدَر: الذی لاضمان فیه اور رِکاز: رَکَزَ الأرض سے ہے، اس کے معنی ہیں: زمین میں گاڑنا اور مراد ہے خزانہ، خزانے دو قسم کے ہیں: ایک: وہ جو انسانوں نے زمین میں گاڑے ہیں انکو دفینہ کہتے ہیں، دوسرے وہ جو قدرت نے زمین میں پیدا کئے ہیں، جیسے سونا، چاندی، لوہا، کوئلہ وغیرہ کی کھانیں، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک رکاز صرف دفینے ہیں قدرتی کھانیں رکاز نہیں ہیں۔اور احناف کے نزدیک دونوں رکاز ہیں۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "چوپائے کا زخم رائگان ہے۔اور کھان رائگاں ہے، اور کنواں رائگاں ہے، اور رکاز میں خمس واجب ہے"

اس حدیث میں چار مسئلے ہیں:

پہلا مسئلہ: مواشی کا زخم رائگاں ہے، یعنی اگر جانور مالک کے ہاتھ سے چھوٹ جائے، یا کھونٹے سے کھل جائے اور

کسی کو زخمی کر دے یا ہلاک کر دے یا کوئی مالی نقصان کر دے تو یہ خون اور نقصان رائگاں ہے، مالک پر اس کا تاوان نہیں۔ اس لئے کہ بچنے بچانے کی ذمہ داری دوطرفہ ہے مگر جب جانور تنہا ہو گیا تو اب صرف لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اور اپنے مال کی حفاظت کریں، اب جانور کوئی نقصان کرتا ہے تو مالک پر کوئی تاوان نہیں، کیونکہ وہ جانور کے ساتھ نہیں۔

اسی طرح اگر جانور کسی کھیت میں گھس جائیں اور فصل برباد کر دیں تو دن میں مالک پر ضمان نہیں، کیونکہ دن میں کھیت کی حفاظت کی ذمہ داری کھیت والوں کی ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ البتہ اگر جانور رات میں کسی کا کھیت چر جائیں تو ضمان واجب ہوگا یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ضمان واجب ہے اس لئے کہ رات میں مالکان مواشی پر جانوروں کی حفاظت ضروری ہے۔ ائمہ ثلاثہ کی دلیل ابوداؤد کی حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے دن میں کھیت والوں پر ذمہ داری عائد کی ہے اور رات میں مالکانِ مواشی پر (ابوداؤد ۲:۵۰۲ آخر کتاب البیوع) اور حنفیہ کے نزدیک رات اور دن کا حکم یکساں ہے۔ اور وہ باب کی حدیث کے عموم سے استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جانور کا نقصان بہر حال رائگاں ہے یعنی اس کا ضمان نہیں۔

دوسرا مسئلہ: مَعدِن (بکسر الدال) رائگاں ہے۔ معدِن: کھان۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو قدرتی خزانہ ملے تو وہ رائگاں ہے، یعنی اس میں حکومت کا حصہ نہیں، یعنی گورنمنٹ اس میں سے خمس (پانچواں حصہ) نہیں لے گی، سارا خزانہ پانے والے کا ہے۔ اور اس میں زکوٰۃ واجب ہے یعنی اگر سونے یا چاندی کی کھان ملی ہے تو زکوٰۃ واجب ہے اور کوئلہ، تانبا، پیتل یا لوہے وغیرہ کی کھان ملی ہے تو اس میں زکوٰۃ بھی نہیں۔ جب تک وہ فروخت نہ ہو۔ اور حنفیہ کے نزدیک قدرتی خزانوں میں بھی خمس واجب ہے ان کے نزدیک یہ چیزیں بھی رکاز میں داخل ہیں۔ اور ان کے نزدیک حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کھان میں کوئی حادثہ پیش آئے اور کسی کا جانی نقصان ہو جائے تو کھان کے مالک پر اس کا کوئی ضمان نہیں۔

تیسرا مسئلہ: کنواں رائگاں ہے، اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ کنواں کھودتے وقت اگر کوئی مزدور گر کر ہلاک ہو جائے تو مالک پر اس کی دیت نہیں وہ خون رائگاں ہے، البتہ مالک کو برضاء ورغبت ہلاک ہونے والے کے پسماندگان کی اعانت کرنی چاہئے۔

چوتھا مسئلہ: رکاز میں خمس ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک رکاز: صرف دفینے ہیں، لہٰذا اگر کسی شخص کے ہاتھ دفینہ لگے تو وہ بحکم لقطہ ہے، اس پر مالک کو تلاش کرنا ضروری ہے۔ مالک نہ ملے تو پانچواں حصہ حکومت لے گی اور چار حصے پانے والے کے ہیں۔ اور حنفیہ کے نزدیک رکاز کا اطلاق قدرتی خزانوں پر بھی ہوتا ہے پس کھانوں میں بھی حکومت پانچواں حصہ لے گی۔ اور چار حصے پانے والے کے ہیں۔ پھر وہ خزانہ اگر زکوٰۃ کی جنس سے ہے تو زکوٰۃ بھی واجب ہے اور اگر زکوٰۃ کی جنس سے نہیں ہے تو جب تک وہ فروخت نہ ہو کچھ واجب نہیں۔

[۱۶] باب ماجاء أن العَجْمَاءَ جُرْحُهَا جُبَارٌ، وفی الرِّکاز الخُمس

[۶۳۶-] حدثنا قُتَیْبَةُ، نا اللَّیْثُ بنُ سَعْدٍ، عن ابنِ شهابٍ، عن سَعیدِ بنِ المُسَیَّبِ، وأبی سَلَمَةَ، عن أبی هریرةَ، عن رسولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم، قال: "العَجْمَاءُ جُرْحُهَا جُبَارٌ، والمَعْدِنُ جُبَارٌ، والْبِئْرُ جُبَارٌ، وفی الرِّکَازِ الخُمُسُ"

وفی الباب: عن أنسِ بنِ مالكٍ، وعبدِ اللّٰهِ بنِ عَمْرٍو، وعُبَادَةَ بنِ الصَّامِتِ، وعَمْرِو بنِ عَوْفٍ المُزَنِیِّ، وجابرٍ. قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ.

بابُ ماجاءَ فی الخَرْصِ

پیداوار کا تخمینہ لگانے کا بیان

خرص کے معنی ہیں: کھیتی اور پھلوں کا اندازہ لگانا۔ جب کھیتی اور پھل آفات سے محفوظ ہوجائیں اور ابھی کھانے کے قابل نہ ہوں اس وقت حکومت کے کارندے پیداوار کا تخمینہ لگائیں گے اور پوری تفصیل رجسٹر میں درج کرلیں گے کہ فلاں کھیت میں اتنا اناج پیدا ہوگا اور فلاں باغ میں اتنا پھل تیار ہوگا، اور اس میں اتنا عشر یا نصف عشر واجب ہوگا۔ اس کا نام خرص (تخمینہ لگانا) ہے۔ پھر جب غلہ سوکھ کر تیار ہوجائے، کھجوریں چوہارے بن جائیں، اور انگور کشمش منقی بن جائیں تو ساعی رجسٹر کے حساب سے زکوۃ وصول کرے گا۔ اور پوری پیداوار کا عشر لے گا۔ کارندوں کو اس میں سے کم کرنے کا اختیار نہیں، اس لئے کہ یہ غریبوں کا حق ہے۔ اور یہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کا قول جدید ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک رجسٹر میں جو اندراج ہے اس میں سے تہائی یا کم از کم چوتھائی کم کرکے باقی کا عشر لیا جائے گا۔ کیونکہ اندازہ غلط بھی ہوسکتا ہے اور چرندو پرند اور چور چکار نقصان بھی کرتے ہیں۔ اس لئے کچھ کم کرکے زکوۃ لینا قرین انصاف ہے (اور اس مسئلہ میں متعدد جزئیات میں اختلاف ہے، تفصیل کے لئے عمدہ، فتح اور معارف السنن دیکھیں)

اور تخمینہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ارباب زراعت آزاد ہوجائیں جس طرح چاہیں کھائیں کھلائیں اور زکوۃ وصول کرنے والے بھی بے فکر ہوجائیں۔ اب ان کو پیداوار کی نگرانی نہیں کرنی پڑے گی، اور یہ اندیشہ بھی نہیں رہے گا کہ کھیت والے یا باغ والے پیداوار میں سے کچھ چھپالیں گے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کے بارے میں غلط فہمی ہے۔ مشہور یہ ہے کہ احناف کے نزدیک خرص کا اعتبار نہیں، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک اعتبار ہے۔ پھر اعتراض ہوتا ہے کہ جب خرص کے سلسلہ میں صحیح حدیث موجود ہے تو احناف اس کا اعتبار کیوں نہیں کرتے؟ درحقیقت احناف کے قول کو سمجھنے میں غلط فہمی

ہوئی ہے۔ احناف جو کہتے ہیں کہ خرص کا اعتبار نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر زمین کا مالک تخمینہ اور اندراج کے غلط ہونے کی بات کہے اور رجسٹر میں جو درج ہے اتنی پیداوار نہ ہونے کا دعوی کرے تو خرص کا اعتبار نہیں۔ اس لئے کہ تخمینہ اور اندراج دونوں میں غلطی کا احتمال ہے اور اس صورت میں مقدمہ کورٹ میں جائے گا اور قاضی گواہ طلب کرے گا، یا منکر سے قسم لے گا، یا کمیشن بھیج کر انکوائری کرائے گا، پھر شہادت سے یا کمیشن کی رپورٹ سے جو پیداوار ثابت ہوگی اس کی زکوۃ لی جائے گی۔ خرص کا اعتبار نہیں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حکومت کارندے بھیج کر اندازہ نہیں کروائے گی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خرص لازم نہیں، اور خرص کرنا ضروری بھی نہیں، حکومت کی صوابدید پر موقوف ہے اس لئے احناف کی کتابوں میں یہ مسئلہ نہیں لیا گیا اور اس سے غلطی فہمی کو بڑھاوا ملا۔

پھر جمہور کے نزدیک پوری پیداوار کی زکوۃ لی جائے گی، تہائی یا چوتھائی وضع نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ وہ غریبوں کا حق ہے۔ اور حضرت سہل بن ابی حثمہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو تہائی یا چوتھائی کم کرنے کی بات آئی ہے وہ زکوۃ سے متعلق نہیں، بلکہ خیبر کے یہود کے ساتھ جو مزارعت اور مساقات کا معاملہ تھا اس سے متعلق ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ فتح خیبر کے بعد صحابہ نے اپنی زمینیں یہود کو بٹائی پر دیدی تھیں، نبی ﷺ ان کا بھی تخمینہ کرواتے تھے، اور اندازہ سے تہائی یا چوتھائی کم کر کے لینے کا حکم تھا، کیونکہ وہ مالکان کا حق تھا۔ عشر کے مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اور قابل زکوۃ غلوں اور پھلوں کے خرص کا مسئلہ حضرت عتاب بن اَسید کی حدیث میں ہے اس میں کم کر کے زکوۃ لینے کا ذکر نہیں ہے۔

حدیث (۱): عبدالرحمن بن مسعود کہتے ہیں: سہل بن ابی حثمہؓ ہماری مجلس میں آئے، اور بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ہدایت دی ہے کہ جب تم اندازہ کرو تو (جو اندازہ ہو اس کے مطابق) لو اور تہائی چھوڑ دو، اور اگر تہائی نہ چھوڑو تو چوتھائی چھوڑو۔

تشریح: امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حدیث عشر کے مسئلہ سے بھی متعلق ہے۔ وہ فرماتے ہیں: جو تخمینہ لگایا گیا ہے اس میں سے تہائی یا چوتھائی کم کر کے باقی کا عشر لیا جائے گا۔ اور جمہور کے نزدیک یہ حدیث غیر مسلموں کے ساتھ مزارعت اور مساقات کے سلسلہ میں ہے۔ اور حدیث کے الفاظ إذا خَرَصْتُمْ سے اس کی تائید ہوتی ہے یعنی یہ حدیث اس صورت کے لئے ہے جب مالکان اندازہ کریں۔ اور قابلِ زکوۃ غلوں اور پھلوں کا اندازہ لوگ نہیں کرتے بلکہ حکومت کرتی ہے، لوگ تو صرف اپنی ان زمینوں کا اندازہ کرتے ہیں جو انھوں نے بٹائی پر دے رکھی ہے، اس میں سے تہائی اور چوتھائی کم کرنے کی ہدایت ہے۔

حدیث (۲): حضرت عتاب بن اَسید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے پاس ایسا آدمی بھیجتے تھے جو ان کے انگوروں اور ان کی کھجوروں کا اندازہ کرے (کروم: انگور کی بیلوں کو کہتے ہیں اور ثمار ہر قسم کا پھل ہے یہاں

مراد کھجور ہے)

تشریح: فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مکہ اور طائف کا گورنر حضرت عتاب بن اسید کو بنایا تھا اس وقت ان کی عمر اکیس سال تھی، اور آپ مدینہ سے خارص (تاڑے والا) بھیجا کرتے تھے، اور وہ جو اندازہ ٹھہراتا اس کے مطابق زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی (باب عشر سے یہی حدیث متعلق ہے اور اس میں کم کرنے کا ذکر نہیں)

[۱۷] باب ماجاء فی الخَرْصِ

[۶۳۷-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلاَنَ، نا أبو داودَ الطَّيَالِسِيُّ، نا شُعْبَةُ، قال: أَخْبَرَنِي خُبَيْبُ بنُ عبدِ الرحمنِ، قال: سَمِعْتُ عبدَ الرحمنِ بنَ مَسْعُوْدِ بنِ نِيَارٍ، يقولُ: جاءَ سَهْلُ بنُ أبي حَثْمَةَ إلى مَجْلِسِنَا، فَحَدَّثَ أَنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم كان يقولُ:" إِذَا خَرَصْتُمْ فَخُذُوْا، وَدَعُوْا الثُّلُثَ، فَإِنْ لَمْ تَدَعُوْا الثُّلُثَ فَدَعُوا الرُّبُعَ"

وفي الباب: عن عائشةَ، وعَتَّابِ بنِ أَسِيْدٍ، وابنِ عباسٍ.

قال أبو عيسى: والعَمَلُ على حديثِ سَهْلِ بنِ أبي حَثْمَةَ عندَ أكثرِ أهلِ العلمِ في الخَرْصِ، وبِحَدِيْثِ سَهْلِ بنِ أبي حَثْمَةَ يقولُ إسحاقُ وأحمدُ.

والخَرْصُ: إِذَا أَدْرَكَتِ الثِّمَارُ مِنَ الرُّطَبِ والعِنَبِ، مِمَّا فِيْهِ الزكاةُ، بَعَثَ السُّلْطَانُ خَارِصًا فَخَرَصَ عليهِمْ.

والخَرْصُ: أَنْ يَنْظُرَ مَنْ يُبْصِرُ ذلكَ، فيقولُ: يَخْرُجُ مِنْ هذا مِنَ الزَّبِيْبِ كذا، ومِنَ التَّمْرِ كَذَا وكَذَا، فَيُحْصِيْ عَلَيْهِمْ، ويَنْظُرُ مَبْلَغَ العُشْرِ مِنْ ذَلِكَ، فَيُثْبِتُ عَلَيْهِمْ، ثم يُخَلِّى بَيْنَهُمْ وبَيْنَ الثِّمَارِ، فَيَصْنَعُوْنَ مَا أَحَبُّوْا، وإِذَا أَدْرَكَتِ الثِّمَارُ أُخِذَ مِنْهُمُ العُشْرُ، هكذا فَسَّرَهُ بعضُ أهلِ العلمِ، وبهذا يقولُ مالكٌ، والشافعيُّ، وأحمدُ، وإسحاقُ.

[۶۳۸-] حدثنا أبو عَمْرٍو مُسْلِمُ بنُ عَمْرٍو الحَذَّاءُ المَدِينِيُّ، نا عبدُ اللهِ بنُ نافعٍ، عن محمدِ بنِ صالحٍ التَّمَّارِ، عن ابنِ شهابٍ، عن سعيدِ بنِ المُسَيَّبِ، عن عَتَّابِ بنِ أسيد: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم كان يَبْعَثُ على النَّاسِ مَنْ يَخْرُصُ عليهم كُرُوْمَهُمْ وثِمَارَهُمْ.

[۶۳۹-] وبهذا الإسناد أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال في زكاةِ الكُرُوْمِ:" إِنَّهَا تُخْرَصُ كَمَا يُخْرَصُ النَّخْلُ، ثم تُؤَدَّى زكاتُهُ زَبِيْبًا، كَمَا تُؤَدَّى زكاةُ النَّخْلِ تَمْرًا"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ غريبٌ، وقد رَوَى ابنُ جُرَيْجٍ هذا الحديثَ عن ابنِ شِهَابٍ،

عن عُرْوَةَ، عن عائشة، وسألْتُ محمداً عن هذه؟ فقال: حديثُ ابنِ جُرَيْجٍ غَيْرُ مُحْفُوْظٍ، وحديثُ سعيدِ بنِ المُسَيَّبِ عن عَتَّابِ بنِ أَسِيْدٍ أَصَحُّ.

ترجمہ: امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں: خرص کے مسئلہ میں اکثر علماء کا حضرت سہل بن ابی حثمہ کی حدیث پر عمل ہے اور سہل بن ابی حثمہ کی حدیث کے اسحاق اور احمد قائل ہیں۔ اور خرص یہ ہے کہ جب پھل پک جائیں کھجوروں اور انگوروں میں سے، ان پھلوں میں سے جن میں زکوٰۃ ہے تو بادشاہ کوئی تاڑنے والا بھیجے پس وہ لوگوں کے پھلوں اور غلوں کا اندازہ کرے، اور خرص (کا طریقہ) یہ ہے کہ غور کرے وہ جو اس کا ماہر ہے۔ پس کہے: اس باغ میں سے کشمش اتنی اور چھوہارے اتنے اور اتنے تیار ہونگے۔ پس ان کو ریکارڈ کرلے اور دیکھے اس میں سے عشر کی مقدار پس اس کو بھی لکھ لے، پھر لوگوں کو اور پھلوں کو چھوڑ دے (نگرانی کی ضرورت نہیں) پس مالکان جو چاہیں کریں۔ یعنی کھائیں، کھلائیں کیونکہ ساعی لکھے ہوئے کے مطابق عشر لے گا۔ اور جب پھل پک جائیں تو ان میں سے عشر لیا جائے۔ اسی طرح بعض علماء نے خرص کی تفسیر کی ہے، اور اسی کے امام مالک، شافعی، احمد اور اسحاق قائل ہیں۔

(حدیث ۶۳۸) عتاب بن اسید کہتے ہیں: نبی ﷺ لوگوں کے پاس بھیجتے تھے اس شخص کو جو ان کے انگوروں اور کھجوروں کا اندازہ کرے (حدیث ۶۳۹) اور اسی سند سے یہ بھی مروی ہے کہ نبی ﷺ نے انگوروں کی زکوٰۃ کے بارے میں فرمایا: بیشک انگوروں کی بیلوں کا اندازہ ٹھہرایا جائے جس طرح کھجور کا اندازہ ٹھہرایا جاتا ہے۔ پھر اس کی زکوٰۃ کشمش کی شکل میں وصول کی جائے۔ جس طرح کھجور کی زکوٰۃ چھوہاروں کی شکل میں وصول کی جاتی ہے، یعنی جب انگور اور کھجور سوکھ جائیں تب ساعی زکوٰۃ لے۔ ان کو سوکھانے کی ذمہ داری مالک کی ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو ابن جریج نے بھی ابن شہاب زہری سے روایت کیا ہے مگر وہ سند حضرت عائشہ پر پہنچاتے ہیں۔ امام بخاری نے اس کو غلط قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت عائشہ کی حدیث نہیں بلکہ عتاب بن اسید کی حدیث ہے۔

بابُ ماجاءَ في العَامِلِ عَلَى الصَّدَقَةِ بِالْحَقِّ

صحیح وصولی کرنے والے کی فضیلت

اگر عامل ٹھیک ٹھیک کام کرے یعنی شریعت کی ہدایات کے مطابق زکوٰۃ وصول کرے تو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جنگ کرنے والے کے برابر اس کو ثواب ملتا ہے۔ اور یہ ثواب بایں وجہ ہے کہ زکوتیں وصول کرنے میں بہت دشواری ہے۔ عاملین کو گاؤں گاؤں اور کھیت کھیت جانا پڑتا ہے، پھر وصول شدہ مال کے ساتھ لوٹتے وقت خطرہ بھی رہتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مالیات کا مسئلہ بڑا نازک ہوتا ہے اس لئے کام کی دشواری اور نزاکت کے لحاظ سے ثواب بھی زیادہ ہے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ٹھیک ٹھیک زکوٰۃ وصول کرنے والا اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جنگ کرنے والے کی طرح ہے، یہاں تک کہ وہ گھر لوٹے'' یعنی مجاہد کی طرح اس کو بھی پورے سفر میں ثواب ملتا رہتا ہے۔

وضاحت: اس حدیث کی دو سندیں ہیں۔ پہلی سند میں یزید بن عیاض ضعیف راوی ہے۔ اور دوسری سند میں محمد بن اسحاق مدلّس ہیں اور وہ عن سے روایت کرتے ہیں، مگر یہ بڑی خرابی نہیں، اس لئے امام ترمذی رحمہ اللہ نے محمد بن اسحاق کی سند کو اصح قرار دیا ہے۔

[۱۸] باب ماجاء في العامل على الصدقة بالحق

[٦٤٠-] حدثنا أحمدُ بنُ مَنِيْعٍ، نا يزيدُ بنُ هَارُوْنَ، نا يزيدُ بنُ عِيَاضٍ، عن عَاصِمِ بنِ عُمَرَ بنِ قَتَادَةَ ح: وحدثنا محمدُ بنُ إسماعيلَ، نا أحمدُ بنُ خَالِدٍ، عن محمدِ بنِ إسحاقَ، عن عَاصِمِ بنِ عُمَرَ بنِ قَتَادَةَ، عن محمودِ بنِ لَبِيْدٍ، عن رَافِعِ بنِ خَدِيْجٍ، قال: سَمِعْتُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يقول: " العَامِلُ على الصَّدَقَةِ بِالْحَقِّ كالغَازِيْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حتى يَرْجِعَ إلى بَيْتِهِ"

قال أبو عيسى: حديثُ رَافِعِ بنِ خَدِيْجٍ حديثٌ حسنٌ، ويَزِيْدُ بنُ عِيَاضٍ ضعيفٌ عندَ أهلِ الحديثِ، وحديثُ محمَّدِ بنِ إسحاقَ أَصَحُّ.

باب ماجاء في المُعْتَدِيْ في الصَّدَقَةِ

وصولی میں زیادتی کرنے والے کے لئے وعید

یہ اوپر والے باب کا مقابل باب ہے۔ معتدی کے معنی ہیں: حد سے تجاوز کرنے والا۔ جو عامل ٹھیک ٹھیک زکوٰۃ وصول نہ کرے، حد سے تجاوز کرے یعنی وجوب سے زیادہ کا مطالبہ کرے، شاندار جانور لے اس کے لئے زکوٰۃ روکنے والے کے برابر گناہ ہے، اس لئے کہ جب عامل تعدی کرے گا تو لوگ قابلِ زکوٰۃ اموال چھپائیں گے اور زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے، اور اس کا سبب عامل بنے گا اور جس طرح اچھے کام کا سبب بننے والے کو اچھائی کرنے والے کے برابر ثواب ملتا ہے برائی کا سبب بننے والے کو بھی برائی کرنے والے کے برابر گناہ ہوتا ہے۔

[۱۹] باب ماجاء في المعتدي في الصدقة

[٦٤١-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ، عن يَزِيْدَ بنِ أبي حَبِيْبٍ، عن سَعْدِ بنِ سِنَانٍ، عن أنسِ بنِ مالكٍ، قال: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: " المُعْتَدِيْ في الصَّدَقَةِ كَمَانِعِهَا"

قال: وفي الباب: عن ابنِ عُمَرَ، وأُمِّ سَلَمَةَ، وأبي هريرةَ، قال أبو عيسى: حديثُ أنسٍ حديثٌ

غريبٌ مِن هذا الوجهِ، وقد تكلّمَ أحمدُ بنُ حَنبلٍ فِيْ سَعْدِ بنِ سِنَانٍ.
وهٰكذا يقولُ اللَّيْثُ بنُ سَعْدٍ، عن يَزِيْدَ بنِ أبي حَبِيْبٍ، عن سَعْدِ بنِ سِنَانٍ، عن أنسِ بنِ مالكٍ،
قال أبو عيسى: سَمِعْتُ محمداً يقولُ: والصَّحِيْحُ: سِنَانُ بنُ سَعْدٍ.
وقَوْلُهُ:"المُعْتَدِيْ فِي الصَّدَقَةِ كَمَا نِعِهَا" يقول: عَلَى المُعْتَدِيْ مِنَ الإِثْمِ كَمَا عَلَى الْمَانِعِ إِذَا مَنَعَ.

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''صدقہ وصول کرنے میں حد سے تجاوز کرنے والا زکوٰۃ کو روکنے والے کی طرح ہے'' یہ حدیث غریب ہے۔ اس کی یہی ایک سند ہے، اور وہ ضعیف بھی ہے اس لئے کہ سعد بن سنان کی امام احمد رحمہ اللہ نے تضعیف کی ہے۔ اور امام لیث بن سعد نے اس راوی کا نام سعد بن سنان لیا ہے مگر امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحیح نام سِنان بن سعد ہے۔ اور حضور ﷺ کے ارشاد: المعتدی فی الصدقة کمانعها کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے میں حد سے تجاوز کرنے والے پر اتنا ہی گناہ ہے جتنا زکوٰۃ روکنے والے پر ہے جب کہ وہ زکوٰۃ ادا نہ کرے۔

بابُ ماجاءَ فی رِضَی الْمُصَدِّقِ

وصولی کرنے والے کو خوش کر کے لوٹانا

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تمہارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے والا آئے تو وہ تم سے ہرگز جدا نہ ہو مگر راضی ہو کر'' یعنی مصدق کو خوش کر کے واپس بھیجو۔

تشریح: پہلے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جب کوئی مسئلہ دو فریقوں سے متعلق ہوتا ہے تو شریعت ہر فریق سے اس طرح خطاب کرتی ہے جیسے ساری ذمہ داری اسی کی ہے اور دوسرا فریق آزاد ہے (دیکھئے کتاب الصلاۃ باب ۲۲) یہ بھی اس کی ایک مثال ہے۔ جب شریعت نے عاملین سے خطاب کیا تو کہا: ٹھیک ٹھیک زکوٰۃ وصول کرو، اگر تعدی کرو گے اور لوگ قابل زکوٰۃ اموال چھپائیں گے اور زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے تو سارا گناہ تمہارے سر ہوگا، گویا جو مال چھپاتے ہیں اور زکوٰۃ ادا نہیں کرتے وہ آزاد ہیں ان کو ایسا کرنے کا حق ہے۔ اور جب مالکان سے خطاب کیا تو کہا: عاملین کو راضی کر کے واپس کرو۔ حق ناحق جو مانگیں دو، اس لئے کہ ان کی رضامندی پر تمہاری زکوٰۃ کی قبولیت موقوف ہے جب تک عاملین راضی نہیں ہونگے تمہاری زکوٰۃ اللہ کے یہاں قبول نہیں ہوگی۔ اسی طرح معاملات میں اعتدال پیدا ہوتا ہے۔

[۲۰] باب ماجاء فی رِضَی المصدّق

[۶۴۲-] حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نا محمدُ بنُ يَزِيْدَ، عن مُجَالِدٍ، عن الشَّعْبِيِّ، عن جَرِيْرٍ، قال: قالَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم: " إِذَا أَتَاكُمُ الْمُصَدِّقُ فَلَا يُفَارِقَنَّكُمْ إِلَّا عَنْ رِضىً "

حدثنا أبو عمَّارٍ، ثنا سُفيانُ، عن داودَ، عن الشَّعْبِيِّ، عن جريرٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم بنَحْوِهِ.
قال أبو عيسى: حديثُ داودَ عن الشَّعْبِيِّ أَصَحُّ مِنْ حديثِ مُجَالِدٍ، وقد ضَعَّفَ مُجَالِداً بعضُ أهلِ العلمِ، وهو كثيرُ الغَلَطِ.

ملحوظہ: حدیث کی دوسندیں ہیں، ایک مجالد کی ہے دوسری داؤد بن ابی ہند کی، اور دوسری سند اصح ہے اس لئے کہ مجالد ضعیف راوی ہے، وہ احادیث میں بہت غلطیاں کرتا ہے (حضرت جریر بن عبداللہ کی یہ حدیث مسلم شریف میں بھی ہے)

بابُ ماجاء أَنَّ الصَّدَقَةَ تُؤْخَذُ مِنَ الْأَغْنِيَاءِ فَتُرَدُّ عَلَى الْفُقَرَاءِ

زکوۃ مالداروں سے لی جائے اور غریبوں میں تقسیم کی جائے

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں اکثر ایسا ہوتا تھا کہ عامل زکوۃ وصول کرنے کے بعد وہیں غریبوں میں تقسیم بھی کردیا کرتا تھا۔ خالی ہاتھ جاتا تھا اور خالی ہاتھ لوٹ آتا تھا۔ اور اگر زکوۃ کا مال زیادہ ہوتا اور غریب کم ہوتے اور تقسیم سے مال بچ جاتا تو وہ مدینہ منورہ لے آتا۔ غرض دور اول میں وصولی کا محکمہ اور تقسیم کا محکمہ ایک ساتھ تھا۔ بعد میں یہ دونوں محکمے الگ الگ ہوگئے۔ اب وصولی کرنے والے صرف وصولی کریں گے اور تقسیم کرنے والے تقسیم کریں گے۔ ان کے پاس ملک کے غرباء کی فہرست ہوگی اور وہ ہر ایک کا حصہ اس کے گھر پہنچائیں گے۔ اور یہ دونوں: وصولی کرنے والے اور تقسیم کرنے والے العاملین علیھا ہیں۔

حدیث: أبو جُحیفة رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہمارے قبیلے میں نبی ﷺ کی طرف سے زکات وصول کرنے والا آیا اس نے مالداروں سے زکوۃ وصول کی اور غریبوں میں تقسیم کردی، اس وقت میں یتیم لڑکا تھا، چنانچہ مجھے زکوۃ کے مال سے ایک جوان اونٹنی دی۔

[٢١] باب ماجاء أن الصدقة تُؤْخَذُ من الأغنياء، فَتُرَدُّ على الفقراء

[٦٤٣-] حدثنا عليُّ بنُ سَعيدٍ الكِنْدِيُّ، نا حَفْصُ بنُ غِيَاثٍ، عن أَشْعَثَ، عن عَوْنِ بنِ أبي جُحَيْفَةَ، عن أبيهِ، قال: قَدِمَ عَلَيْنَا مُصَدِّقُ النبيِّ صلى الله عليه وسلم فَأَخَذَ الصَّدَقَةَ مِنْ أَغْنِيَائِنَا، فَجَعَلَهَا في فُقَرَائِنَا، وكُنْتُ غُلَامًا يَتِيمًا فَأَعْطَانِيْ مِنها قَلُوْصًا.
وفي الباب: عن ابنِ عباسٍ، قال أبو عيسى: حديثُ أبي جُحَيْفَةَ حديثٌ حسنٌ غريبٌ.

لغت: قَلُوص: گٹھے ہوئے جسم کی جوان اونٹنی (نویں سال کی عمر تک قلوص اس کے بعد ناقة کہلاتی ہے)

بابُ مَنْ تَحِلُّ لَهُ الزَّكَاةُ؟

زکوۃ کس کے لئے حلال ہے؟

نصاب دو ہیں: ایک: نصاب نامی (بڑھنے والا نصاب) ہے اس میں صرف قابل زکوۃ اموال کی چار اجناس (زرعی پیداوار کے علاوہ) شمار ہیں اور یہ بڑا نصاب ہے (تفصیل باب زکاۃ الإبل میں گذر چکی ہے) دوسرا: نصابِ غیر نامی (نہ بڑھنے والا نصاب) ہے قابل زکوۃ اموال کے علاوہ جو بھی مال ہو وہ اس میں شمار ہوگا، یہ مال خواہ کتنا ہی زیادہ ہو اس میں زکوۃ نہیں۔ البتہ اگر وہ حاجت اصلیہ سے زیادہ ہو اور چھ سو بارہ گرام چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو وہ شخص چھوٹے نصاب کا مالک ہے اور اس پر پانچ احکام لازم ہیں: (۱) اس پر صدقۃ الفطر واجب ہے (۲) اس پر قربانی واجب ہے (۳) ددھیالی اور ننھیالی رشتہ داروں کا نفقہ واجب ہے جو ذی رحم محرم ہوں، نادار ہوں اور معذور ہوں، کما نہ سکتے ہوں تو ان کا نفقہ ایسے مالدار پر واجب ہے (۴) اس پر حج فرض ہے، زائد زمین اور زائد مکان بیچ کر حج کرنا ضروری ہے (۵) اس کے لئے زکوۃ حرام ہے۔ اور اگر کوئی اس کو زکوۃ دے تو زکوۃ ادا نہ ہوگی ـــــ اور نصاب نامی کے مالک پر چھ فریضے ہیں پانچ یہی اور چھٹا: اس پر ہر سال زکوۃ نکالنا فرض ہے (درمختار ۲: ۳۱۳ باب صدقۃ الفطر)

اور تیسرا شخص وہ ہے جس کے پاس کوئی نصاب نہیں، نہ نامی نہ غیر نامی۔ مگر اس کے پاس چوبیس گھنٹے کا گذارہ ہے اس کو زکوۃ دینا جائز ہے اور اس کے لئے لینا بھی جائز ہے، مگر اس کے لئے زکوۃ کا سوال کرنا حرام ہے، باب کی حدیث اسی سے متعلق ہے۔

اور چوتھا شخص وہ ہے جس کے پاس چوبیس گھنٹے کا گذارہ بھی نہیں، یہ شخص زکوۃ کا سوال کر سکتا ہے اور اس کو زکوۃ دینا بھی جائز ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ حدیث میں مایُغنیہ کی مقدار پچاس درہم یا اس کی قیمت کے بقدر سونا بیان کی گئی ہے۔ امام شعبہ رحمہ اللہ جو ائمہ حدیث میں سے ہیں، مگر مجتہد نہیں ان کا خیال یہ ہے کہ یہ بہت بڑی رقم ہے، سوال سے مانع تو اس سے کم رقم بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے انھوں نے راویوں کا جائزہ لیا اور حکیم بن جبیر پر تنقید کی کہ اس حدیث میں حکیم نے گڑبڑ کی ہے۔ لیکن شعبہ کی تنقید کو علماء نے نہیں لیا۔ اس لئے کہ حالات اور زمان و مکان کے اختلاف سے یہ رقم بڑی نہیں ۔ اور حکیم ثقہ اور قابل اعتبار راوی ہیں۔ چنانچہ امام شعبہ کے ساتھی حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ جو حدیث میں امیر المؤمنین ہیں اور فقہ میں مجتہد ہیں اس حدیث کا اعتبار کرتے ہیں اور اُسے سبق میں بیان کرتے تھے۔ علاوہ ازیں، زُبید یامی: حکیم کے متابع موجود ہیں اس لئے یہ حدیث معتبر ہے۔

فائدہ: ٹیلیفون، موبائل، ریڈیو، وغیرہ کا شمار حاجات اصلیہ میں ہوتا ہے یا نہیں؟ یعنی نصاب غیر نامی میں ان کو

شمار کیا جائے گا یا نہیں؟ دار الافتاء ان کو حاجت اصلیہ میں شمار نہیں کرتا۔ مگر میں اس مسئلہ میں توسع سے کام لیتا ہوں۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس میں ابتلائے عام ہے وہ حاجاتِ اصلیہ میں شمار ہے، جیسے کئی کئی جوڑے کپڑے، سات جوڑوں تک میں حاجتِ اصلیہ میں شمار کرتا ہوں، اسی طرح ٹیلیفون وغیرہ کو بھی حاجاتِ اصلیہ میں شمار کرتا ہوں اور ان کا استثناء کرتا ہوں۔ واللہ اعلم

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگوں سے سوال کرتا ہے درانحالیکہ اس کے پاس اتنا ہے جو اس کو بے نیاز کرتا ہے تو وہ سوال قیامت کے دن اس کے چہرے پر خراشیں ہوگا'' کسی نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! وہ مقدار کتنی ہے جو آدمی کو سوال سے بے نیاز کرتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''پچاس درہم یا اس کی قیمت کے بقدر سونا''

تشریح:

۱۔ خُموش، خُدوش اور کُدُوح مترادف الفاظ ہیں۔ اور أو شک راوی کا ہے۔ یعنی حضور اکرم ﷺ نے ان میں سے کوئی ایک لفظ فرمایا جو راوی کو یاد نہیں رہا۔ اور أو تنویع کا بھی ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں خموش: ہلکی خراشیں ہیں، اور خدوش: زخم ہے اور کدوح: گہرا زخم کاٹنے کے مانند ہے۔ اور تفاوت سوال کی نوعیت کے اعتبار سے ہوگا، اگر مانگنا کم ہے تو وہ بشکل خموش ظاہر ہوگا، زیادہ ہے تو بہ شکل خدوش، اور بہت زیادہ ہے تو کدوح کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ یا مانگنا بغیر اصرار کے ہے یا اصرار کے ساتھ ہے یا تنگ کرنے کے درجہ میں ہے تو جزاء میں بھی تفاوت ہوگا۔

۲۔ حدیث کا مطلب امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس پچاس درہم یا اس کی قیمت کے بقدر سونا یا کوئی اور مال موجود ہو تو اس کے لئے نہ زکوٰۃ کا سوال کرنا جائز ہے اور نہ اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ اور حنفیہ اور شافعیہ کے نزدیک ایسے شخص کے لئے زکوٰۃ کا سوال کرنا تو حرام ہے لیکن اگر اس کو زکوٰۃ دی جائے تو جائز ہے یعنی زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، البتہ اس کے لئے زکوٰۃ لینا ٹھیک نہیں۔ پس اختلاف اس میں ہے کہ آئندہ حدیث (۶۴۶) میں جو لا تحل آرہا ہے اس سے شرعی حلّت مراد ہے یا باب مروّت کی عدم حلّت مراد ہے۔ پہلے دو اماموں کی رائے میں عدم جواز شرعی مراد ہے اور دوسرے دو اماموں کی رائے میں انسانیت کے باب کا عدم جواز مراد ہے۔

سوال: جس کے پاس ما یُغنیہ ہو اس کو زکوٰۃ دینی چاہئے یا نہیں؟

جواب: اگر احتمال ہو کہ اُسے مفت خوری کی عادت پڑ جائے گی تو نہیں دینی چاہئے۔ اور اگر کامدار آدمی ہے مگر ضرورت مند اور عیالدار ہے اور مفت خوری کی عادت پڑنے کا احتمال نہیں تو زکوٰۃ سے اس کی مدد کرنی چاہئے۔

[۲۲] بابُ مَنْ تَحِلُّ له الزكاةُ؟

[۶۴۴-] حدثنا قُتَيْبَةُ، وعليُّ بنُ حُجْرٍ، قال قُتَيْبَةُ: حدثنا شَرِيكٌ، وقال عليٌّ: أنا شَرِيكٌ — المَعْنَى

واحِدٌ ـ عن حَكيمِ بنِ جُبَيْرٍ، عن محمدِ بنِ عبدِالرحمنِ بنِ يَزِيْدَ، عن أبيهِ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ مسعودٍ، قال: قالَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: " مَنْ سَأَلَ النَّاسَ، ولَهُ مَايُغْنِيْهِ: جاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ومَسْأَلَتُهُ في وَجْهِهِ خُمُوْشٌ أو خُدُوْشٌ أو كُدُوْحٌ" قيل: يارسولَ الله! ومَايُغْنِيْهِ؟ قال:" خَمْسُوْنَ دِرْهَمًا أَوْ قِيْمَتُهَا مِنَ الذَّهَبِ"

وفي الباب: عن عبدِ اللّٰهِ بنِ عَمْرٍو، قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ مَسْعُوْدٍ حديثٌ حسنٌ، وقد تَكَلَّمَ شُعْبَةُ في حَكِيْمِ بنِ جُبَيْرٍ مِنْ أَجْلِ هذا الحديثِ.

[٦٤٥-] حدثنا محمودُ بنُ غَيْلَانَ، نا يَحيىَ بنُ آدَمَ، نا سفيانُ، عن حكيمِ بنِ جُبَيْرٍ بِهذا الحديثِ، فقالَ له عبد الله بنُ عثمان صاحبُ شعبة: لو غيرُ حكيمٍ حَدَّثَ بهذا! فقال له سفيانُ: ومَالحكيمِ؟ لَايُحَدِّثُ عنهُ شُعْبَةُ؟ قال: نَعَمْ، قال سُفيانُ: سمعتُ زُبَيْداً يُحَدِّثُ بهذا عن محمدِ بنِ عبدِ الرحمنِ بنِ يَزِيْدَ.

والعملُ على هذا عندَ بعضِ أصْحَابِنَا، وبه يقولُ الثَّوْرِيُّ، وعبدُ اللّٰهِ بنُ المبارَكِ، وأحمدُ، وإسحاقُ، قالوا: إذا كانَ عندَ الرَّجُلِ خمسونَ دِرْهَمًا لَمْ تَحِلَّ لَهُ الصَّدَقَةُ.

ولَمْ يَذْهَبْ بعضُ أهلِ العلمِ إلى حَديثِ حَكِيْمِ بنِ جُبَيْرٍ، وَوَسَّعُوْا في هذا، وقالوا: إذا كانَ عِنْدَهُ خَمْسُوْنَ دِرْهَمًا أو أَكْثَرُ، وهو مُحْتَاجٌ، لَهُ أَنْ يَأْخُذَ مِنَ الزكاةِ. وهو قولُ الشافعيِّ وغَيْرِهِ مِنْ أَهْلِ الفِقْهِ والعلمِ.

وضاحت: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث اعلی درجہ کی صحیح ہے مگر شعبہ رحمہ اللہ نے حکیم بن جبیرؒ پر تنقید کی ہے اس لئے امام ترمذی ڈر گئے اور صرف حسن کہا۔ اور شعبہ نے حکیم پر اسی حدیث کی وجہ سے جرح کی ہے (یہاں سے معلوم ہوا کہ محدثین جس طرح راویوں کے احوال سے حدیث پر حکم لگاتے ہیں اسی طرح متن سے بھی روایوں پر کلام کرتے ہیں، یعنی ائمہ جرح وتعدیل پر روات کے بارے میں کوئی وحی نہیں آتی بلکہ وہ استدلال لمّی یا اِنّی کے ذریعہ حکم لگاتے ہیں، حدیث کے متابعات وشواہد کی تائید یا عدم تائید سے ثقہ یا ضعیف قرار دیتے ہیں، کبھی حدیث کے مضمون کا شریعت کے قواعد معلومہ سے موازنہ کرتے ہیں اور حکم لگاتے ہیں۔ پہلی صورت میں تو حکم مطرد ہوتا ہے مگر دوسری صورت میں کبھی اختلاف ہوجاتا ہے۔ یہاں ایسا ہی ہوا ہے)

ایک مرتبہ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے حکیم بن جبیر کی سند سے صدقہ والی حدیث بیان کی تو امام شعبہ رحمہ اللہ کے خاص شاگرد عبداللہ بن عثمان نے سفیان ثوری سے کہا: کاش حکیم کے علاوہ کوئی اور اس حدیث کو بیان کرتا! سفیان ثوریؒ نے پوچھا: حکیم میں کیا بات ہے؟ یعنی ان میں کیا کیڑے پڑ گئے؟ کیا ان سے شعبہ روایت نہیں کرتے؟ عبداللہ بن عثمان نے کہا: جی! یعنی میرے استاذ شعبہ ان سے روایت نہیں کرتے پس سفیان ثوری نے فرمایا: میں نے زُبید

یامی کو محمد بن عبدالرحمٰن بن یزید سے یہ حدیث روایت کرتے ہوئے سنا ہے۔ یعنی حکیم کے علاوہ زبید بھی جو ثقہ ہیں اس حدیث کو روایت کرتے ہیں۔

اس حدیث پر ہمارے بعض اکابر کا عمل ہے۔ اور اسی کے سفیان ثوری، ابن المبارک، احمد اور اسحاق قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں: جب آدمی کے پاس پچاس درہم ہوں تو اس کے لئے زکوٰۃ حلال نہیں۔ اور بعض علماء حکیم کی حدیث کی طرف نہیں گئے، اور انھوں نے اس مسئلہ میں توسع سے کام لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: جب آدمی کے پاس پچاس درہم یا زیادہ ہوں اور وہ ضرورت مند ہو تو اس کے لئے زکوٰۃ لینا جائز ہے۔ اور یہ امام شافعی اور ان کے علاوہ علماء (حنفیہ) کا قول ہے۔

بابُ ماجاءَ مَنْ لاتَحِلُّ لَهُ الصَّدَقَةُ؟

زکوٰۃ کس کے لئے حلال نہیں؟

جو شخص نصاب نامی یا غیر نامی کا مالک ہے وہ غنی ہے۔ اور غنی کے لئے نہ تو زکوٰۃ کا سوال کرنا جائز ہے اور نہ زکوٰۃ لینا جائز ہے۔ اور غنی کو زکوٰۃ دینے سے زکوٰۃ اداء بھی نہیں ہوتی۔ اور باب میں ضمناً چوتھے شخص کا بھی ذکر آیا ہے، جس کے لئے زکوٰۃ کا سوال کرنا اور لینا جائز ہے۔ اور تیسرا شخص جس کے لئے زکوٰۃ لینا تو جائز ہے مگر سوال کرنا حرام ہے اس کا تذکرہ اوپر آچکا۔

حدیث (۱): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''زکوٰۃ مالدار کے لئے اور توانا تندرست کے لئے حلال نہیں'' ـــــــ

مِرَّۃٌ کے معنی ہیں: مضبوط بٹی ہوئی رسّی۔ ذُو مِرَّۃٍ: توانا، طاقت ور۔ اور سَوِیٌّ کے معنی ہیں: تندرست، ٹھیک بدن والا، یعنی جو لنگڑا لولا اندھا وغیرہ نہ ہو۔

تشریح: پہلے یہ قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک ہی سلسلۂ بیان میں مختلف المدارج احکام اکٹھا ہوتے ہیں، یہاں بھی لاتَحِلُّ کے ذیل میں دو حکم ہیں اور دونوں کے درجے مختلف ہیں۔ غنی کے لئے حلال نہ ہونا مسائل کے باب کا حلال نہ ہونا ہے، یعنی غنی کے لئے زکوٰۃ کا سوال کرنا اور زکوٰۃ لینا حرام ہے۔ اور توانا تندرست کے لئے حلال نہ ہونا اخلاقیات کے باب کا حلال نہ ہونا ہے۔ یعنی اس کے لئے زکوٰۃ کا سوال کرنا اور زکوٰۃ لینا جائز تو ہے مگر مناسب نہیں، اس لئے کہ جو صحیح الاعضاء ہے اور کما سکتا ہے اُسے زکوٰۃ کے ٹکڑوں پر گذارہ نہیں کرنا چاہئے۔

حدیث (۲): حُبْشِی بن جُنادۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے حجۃ الوداع کے موقع پر سنا جبکہ آپؐ وقوفِ عرفہ کئے ہوئے تھے۔ آپؐ کے پاس ایک بدو آیا۔ اس نے آپؐ کی چادر کا کنارہ پکڑا اور آپ سے سوال کیا۔ آپؐ نے اس کو دیا (یعنی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دینے کا حکم دیا) جب وہ چلا گیا تو مانگنا حرام ہوا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک مانگنا جائز نہیں مالدار کے لئے اور نہ طاقت ور تندرست کے لئے مگر ایسی ضرورت

کی وجہ سے جو خاک نشیں کرنے والی ہو، اور گھبرا دینے والے تاوان کی وجہ سے، اور جس نے لوگوں سے سوال کیا تاکہ اس کے ذریعہ مال زیادہ کرے تو وہ مانگنا قیامت کے دن اس کے چہرے پر خراشیں ہوگا، یا جہنم کا گرم پتھر ہوگا جسے وہ کھائے گا۔ پس جو چاہے مانگنا کم کرے اور جو چاہے زیادہ کرے"

تشریح:

۱- مذکورہ حدیث میں صحابی نے حدیث: لاتحل الصدقة کا جو شان ورود بیان کیا ہے وہ بر بنائے عادت ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آج ہی امت کے سامنے پہلی مرتبہ یہ مسئلہ آیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے الفوز الکبیر (الفصل الثالث فی معرفة أسباب النزول) میں تحریر فرمایا ہے کہ صحابہ اور تابعین نص کا جو بھی مصداق ہوسکتا تھا اس کے لئے نزلت فی کذا کا محاورہ استعمال کرتے تھے، غرض مذکورہ واقعہ کے لئے حدیث کا حقیقی شان ورود ہونا ضروری نہیں۔

۲- دو آدمیوں کے لئے چندہ کرنا (زکوۃ مانگنا) جائز ہے، ایک: ایسا غریب جو خاک نشیں ہو، یعنی جس کے پاس بچھانے کے لئے بھی کچھ نہ ہو، دوسرا: وہ جس پر بھاری ذمہ داری آن پڑی ہو، مثلاً دیت واجب ہوئی ہو، یا اصلاحِ ذات البین کے لئے اس نے کوئی بڑی رقم سرلی ہو، یا تعلیمی ادارہ وغیرہ قائم کیا ہو تو اس کو چلانے کے لئے زکوۃ کا چندہ کرسکتا ہے، بشرطیکہ اس ادارہ میں زکوۃ کا مصرف بھی ہو۔

۳- دولت کی ہوس میں دستِ سوال دراز کرنا برا ہے۔ حدیث میں اس کے لئے دو تشبیہیں آئی ہیں۔ ایک: یہ مانگنا قیامت کے دن سائل کے چہرے پر خراشوں اور زخموں کی شکل میں نمودار ہوگا۔ اس کا بیان گذر چکا۔ دوسری تشبیہ یہ ہے کہ دولت کی حرص میں مانگنا رَضف یعنی گرم پتھر کو جو جہنم کی آگ میں گرم کیا گیا ہو کھانا ہے۔ رَضف ایک خاص قسم کا پتھر ہے جو بہت جلد گرم ہوجاتا ہے اور اس پر کباب تیار کئے جاتے ہیں جو بہت لذیذ ہوتے ہیں، دولت کا حریص کباب نہیں کھاتا بلکہ رضف ہی کھاتا ہے جو نہایت گرم ہوتا ہے، یہ دونوں تشبیہیں تنفیر کے لئے ہیں۔

[۲۳] بابُ ماجاء من لا تحل له الصدقة؟

[۶۴۶-] حدثنا محمدُ بنُ بَشَّارٍ، نا أبو داودَ الطَّيَالِسِيُّ، نا سُفيانُ ح: وحدثنا محمودُ بنُ غَيْلاَنَ، نا عبدُ الرَّزَّاقِ، نا سُفيانُ، عن سَعْدِ بنِ إبراهيمَ، عن رَيْحَانَ بنِ يَزِيْدَ، عن عبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم قال: " لاَتَحِلُّ الصَّدَقَةُ لِغَنِيٍّ وَلاَ لِذِي مِرَّةٍ سَوِيٍّ"

وفي الباب: عن أبي هريرةَ، وحُبْشِيِّ بنِ جُنَادَةَ، وقَبِيْصَةَ بنِ المُخَارِقِ.

قال أبو عيسى: حديثُ عبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو حديثٌ حسنٌ، وقد رَوَى شُعْبَةُ عن سَعْدِ بنِ إبراهيمَ

هذا الحديثَ بِهٰذا الإسنادِ، ولَمْ يَرْفَعْهُ.

وقد رُوِىَ فى غَيْرِ هذا الحديثِ عن النبىِّ صلى الله عليه وسلم: " لَاتَحِلُّ الْمَسْأَلَةُ لِغَنِىٍّ وَلَا لِذِى مِرَّةٍ سَوِىٍّ"

وإذا كان الرجلُ قَوِيًّا مُحْتَاجًا، ولَمْ يَكُنْ عِنْدَهُ شيئٌ، فَتُصَدِّقَ عَلَيْهِ أَجْزَأَ عَنِ الْمُتَصَدِّقِ عندَ أهلِ العلمِ، وَوَجْهُ هذا الحديثِ عِنْدَ بعضِ أهلِ العلمِ على الْمَسْأَلَةِ.

[٦٤٧-] حدثنا علىُّ بنُ سَعِيدٍ الكِنْدِىُّ، نا عبدُ الرَّحيمِ بنُ سُلَيْمَانَ، عن مُجَالِدٍ، عن عَامِرٍ، عن حُبْشِىِّ بنِ جُنَادَةَ السَّلُوْلِىِّ، قال: سمعتُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم فى حَجَّةِ الوَدَاعِ، وَهُوَ وَاقِفٌ بِعَرَفَةَ، أَتَاهُ أَعْرَابِىٌّ، فَأَخَذَ بِطَرْفِ رِدَائِهِ، فَسَأَلَهُ إِيَّاهُ، فَأَعْطَاهُ وَذَهَبَ، فَعِنْدَ ذلك حَرُمَتِ الْمَسْأَلَةُ، فقالَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: " إِنَّ الْمَسْأَلَةَ لا تَحِلُّ لِغَنِىٍّ وَلَا لِذِى مِرَّةٍ سَوِىٍّ إِلَّا لِذِىْ فَقْرٍ مُدْقِعٍ، أَوْ غُرْمٍ مُفْظِعٍ، ومَنْ سَأَلَ النَّاسَ لِيُثْرِىَ بِهِ مَالَهُ كان خُمُوْشًا فى وَجْهِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، ورِضْفًا يَأْكُلُهُ مِنْ جَهَنَّمَ، فَمَنْ شَاءَ فَلْيُقِلَّ ومَنْ شَاءَ فَلْيُكْثِرْ"

حدثنا محمودُ بنُ غيلانَ، نا يحيىَ بنُ آدَمَ، عن عبدِ الرحيمِ بنِ سُلَيْمَانَ، نَحْوَهُ، قال أبو عيسى: هذا حديثٌ غريبٌ مِنْ هٰذا الوَجْهِ.

وضاحت: عبداللہ بن عمرو کی حدیث (۶۴۶) کوسفیان ثوری مرفوع کرتے ہیں اور شعبہ موقوف۔ بایں وجہ امام ترمذیؒ نے ذکر حدیث کوصرف حسن کہا ہے۔ حالانکہ وہ حسن صحیح ہے اور موقوف کومسند کرنا زیادتی ہے اور ثقہ کی زیادتی بالاجماع معتبر ہے۔ اور یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے ـــــ جب آدمی طاقت ور غریب ہو اور اس کے پاس کچھ نہ ہو پس اس کو زکوۃ دی گئی تو علماء کے نزدیک زکوۃ دینے والے کی زکوۃ اداء ہوجائے گی۔ اور یہ حدیث بعض علماء کے نزدیک مانگنے پر محمول ہے، یعنی توانا تندرست کے لئے مانگنا جائز نہیں (یہ حدیث اگلے نمبر پر آرہی ہے)

(حدیث ۶۴۷) حضرت حُبشی کی حدیث مجالد بن سعید کی وجہ سے ضعیف ہے۔ اور عبدالرحیم بن سلیمان سے اوپر اس کی یہی ایک سند ہے۔ پس وہ غریب ہے۔ اور اس حدیث کوعبدالرحیم سے یحییٰ بن سعید کندی کے علاوہ یحییٰ بن آدم بھی روایت کرتے ہیں (حدیث کا ترجمہ اوپر آگیا)

بابُ مَنْ تَحِلُّ لَهُ الصَّدَقَةُ مِنَ الغَارِمِيْنَ وَغَيْرِهِمْ

مدیون وغیرہ جن کے لئے زکوۃ حلال ہے

پہلے یہ مسئلہ آچکا ہے کہ غنی کے لئے زکوۃ کا سوال کرنا اور زکوۃ لینا حرام ہے۔ لیکن غارم کے لئے زکوۃ حلال ہے اور

وہ زکوٰۃ کا سوال بھی کرسکتا ہے۔ سورۂ توبہ (آیت ۶۰) میں زکوٰۃ کے جو آٹھ مصارف بیان کئے ہیں ان میں غارم بھی ہے۔

غارم کے معنی: امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک غارم سے مدیون مراد ہے یعنی وہ شخص جس کے پاس مال ہے لیکن اس کا سارا مال یا بعض مال قرض میں گھرا ہوا ہے اور قرض ادا کرنے کے بعد بقدر نصاب باقی نہیں رہتا۔ یہ شخص اگرچہ بظاہر غنی ہے مگر حقیقت میں فقیر ہے اس لئے اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے اور اس کے لئے لینا بھی جائز ہے۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: غارم وہ شخص ہے جس نے اصلاح ذات البین کے لئے کسی مقتول کی دیت یا کوئی اور بڑی رقم اپنے سر لی ہو: وہ شخص چندہ کر کے اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوسکتا ہے، خود استعمال نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ مالدار ہے۔

یہ دونوں تفسیریں صحیح ہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا متدل گذشتہ حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے دو شخصوں کو مانگنے کی اجازت دی ہے ان میں سے ایک ذُو غُرمٍ مُفظع ہے یعنی جس پر گھبرا دینے والا تاوان آپڑا ہو۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ کی دلیل باب کی حدیث ہے۔

حدیث: ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص پر آفت آپڑی (یعنی مقروض ہوگیا) ایسے پھلوں میں جن کو اس نے خریدا تھا (کہتے ہیں وہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ تھے) ان پر بھاری قرضہ ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان کو صدقہ دو (صدقہ کا اولین مصداق زکوٰۃ ہے) پس لوگوں نے ان کو خیرات دی، مگر وہ خیرات ان کے قرضہ کی بھرپائی کو نہیں پہنچی (یعنی چندہ کم ہوا قرض زیادہ تھا) تو رسول اللہ ﷺ نے قرض خواہوں سے فرمایا: ''جو موجود ہے لے لو، تمہارے لئے بس یہی ہے''

تشریح: اس حدیث سے حنفیہ نے اس طرح استدلال کیا ہے کہ حضرت معاذ مقروض تھے، اور ان کے لئے چندہ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ غارم مدیون ہے۔ اور اس کے لئے زکوٰۃ حلال ہے۔ اور نبی ﷺ کا ارشاد کہ ''تمہارے لئے بس یہی ہے'' کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں: ایک: آپؐ نے آسانی ہونے تک انتظار کرنے کا حکم دیا یعنی ابھی جو موجود ہے وہ لے لو پھر جب گنجائش ہوگی تو باقی ملے گا، دوسرا مطلب: آپؐ نے جتنا چندہ ہوا تھا اس پر مصالحت کرادی اور معاملہ نمٹادیا۔

فائدہ: مدیون کے پاس اگر رقم ہے اور وہ ٹال مٹول کر رہا ہے تو قاضی زبردستی قرض خواہوں کو دلوائے گا۔ اور رقم نہ ہو تو اس کی ضرورت کی چیزیں چھوڑ کر باقی چیزیں بیچ دے گا اور قرضہ چکائے گا، ورنہ قرض خواہوں کو آسانی ہونے تک انتظار کرنے کا حکم دے گا (سورۃ البقرہ آیت ۲۸۰ میں یہ حکم ہے)

[۲۴] بابُ من تَحِلُّ له الصدقةُ من الغارمين وغيرهم

[۶۴۸-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ، عن بُكَيْرِ بنِ عبدِ اللهِ بنِ الأَشَجِّ، عن عِيَاضِ بنِ عبدِ اللهِ، عن

أبى سعيدٍ الخُدْرِيِّ، قال: أُصِيبَ رَجُلٌ فى عَهْدِ رسولِ الله صلى الله عليه وسلم فِيْ ثِمَارٍ ابْتَاعَهَا، فَكَثُرَ دِيْنُهُ، فقالَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: " تَصَدَّقُوْا عليهِ" فَتصدَّقَ الناسُ عليهِ، فَلَمْ يَبْلُغْ ذٰلِكَ وَفَاءَ دَيْنِهِ، فقالَ رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم لِغُرَمَائِهِ: " خُذُوْا مَا وَجَدْتُمْ وَلَيْسَ لَكُمْ إِلاَّ ذلكَ"

وفى الباب: عن عائشةَ، وجُوَيْرِيَةَ، وأنسٍ، قال أبو عيسى: حديثُ أبى سعيدٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

قوله: فی ثمار یعنی انھوں نے کھجور کا باغ خریدا تھا، جس کی آمدنی کم ہوئی اس لئے قرضہ ہوگیا۔

بابُ ماجاءَ فى كَرَاهِيَةِ الصَّدَقَةِ لِلنَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم وأهلِ بَيْتِهِ وَمَوَالِيْهِ

نبی ﷺ کے لئے، آپؐ کے خاندان کے لئے اور آپؐ کے آزادکردہ لوگوں کے لئے زکوٰۃ کی حرمت

اس باب میں چار باتیں سمجھنی چاہئیں:

پہلی بات: نبی ﷺ پر، آپؐ کے خاندان پر اور آپؐ نے اور آپؐ کے خاندان نے جن غلاموں کو آزاد کیا ہے ان پر زکوٰۃ حرام ہے۔ اور یہ مسئلہ حدیثوں میں ہے، قرآن میں نہیں ہے، صراحتاً بھی نہیں ہے اور اشارۃً بھی نہیں ہے۔

جاننا چاہئے کہ مسائل تین قسم کے ہیں۔ اول: وہ مسائل ہیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں صراحتاً آیا ہے جیسے دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت اور بڑے شہر میں جمعہ کی فرضیت دوم: وہ مسائل ہیں جو صرف حدیث میں ہیں مگر وہ قرآن سے مستنبط کئے جاسکتے ہیں، بعد میں قرآن میں ان کا ذکر آگیا ہے، جیسے خالہ بھانجی کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت آیت پاک: ﴿أَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ﴾ سے مستنبط کی جاسکتی ہے۔ یا جیسے اذان کی مشروعیت حدیث سے ہوئی ہے لیکن بعد میں قرآن میں اس کا تذکرہ آگیا ہے ارشاد پاک ہے: ﴿إِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلاَةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ﴾ [الجمعة ۹] اور ﴿إِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلاَةِ﴾ [المائدة ۵۸] سوم: وہ مسائل ہیں جو صرف حدیثوں میں ہیں وہ نہ تو قرآن سے مستنبط ہوسکتے ہیں اور نہ بعد میں قرآن میں ان کا ذکر آیا، جیسے شاربِ خمر کی حد کا مسئلہ۔ قرآن کی کسی آیت سے مستنبط نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح خاندانِ نبوت پر اور ان کے موالی پر زکوٰۃ حرام ہے یہ مسئلہ بھی صرف حدیثوں میں ہے، قرآن میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔

دوسری بات: نبی ﷺ اور آپؐ کے خاندان کے لئے زکوٰۃ کی حرمت تین وجوہ سے ہے:

پہلی وجہ: مسلم شریف میں حدیث ہے کہ صدقات لوگوں کا میل ہیں (مشکوۃ حدیث ۱۸۲۳) پس وہ آپؐ کے اور آپؐ کے خاندان کے لائق نہیں۔ اور وہ میل اس طرح ہیں کہ ان سے صدقہ کرنے والوں کے گناہ معاف ہوتے ہیں ان کے ذریعہ بلائیں دفع ہوتی ہیں۔ اور وہ لوگوں کی بلاؤں کا فدیہ (عوض) بن جاتے ہیں۔ اس لئے وہ ملأ اعلی کو بلائیں محسوس ہوتے ہیں جیسے آگ کا ایک وجود خارجی ہے جو وجود حقیقی ہے اس لئے وہ جلاتی ہے اور جب ہم آگ کا تصور کرتے ہیں تو ذہن میں بھی وہی خارج میں پائی جانے والی آگ آتی ہے۔ اسی طرح جب ہم منہ سے لفظ آگ بولتے ہیں یا کاغذ پر لفظ آگ لکھتے ہیں تو بھی اس آگ کا تصور آتا ہے یہ اس آگ کا وجود شبہی (مثل اور مانند وجود) ہے اس لئے آثار نہیں پائے جاتے۔ ذہن زبان اور کاغذ جل نہیں جاتے۔ اسی طرح ملأ اعلی کے احساسات میں صدقات بلائیں نظر آتے ہیں۔ یہ صدقات کا وجود شبہی ہے۔ چنانچہ ملأ اعلی زکاتوں میں تاریکی کا ادراک کرتے ہیں پھر یہ علم ملأ سافل پر اترتا ہے اور انسانوں میں جو صاحب کشف ہیں وہ بھی اس ظلمت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور نبی ﷺ چونکہ ارباب مکاشفہ کے سردار ہیں اس لئے آپ پر ان اموال کی ظلمت منکشف ہوئی۔ اس لئے آپؐ نے صدقات کو اپنے لئے اور اپنے خاندان کے لئے حرام کردیا، پس دوسرے باہمت لوگوں کو بھی حتی الامکان زکوۃ سے پرہیز کرنا چاہئے۔

دوسری وجہ: جو مال کسی چیز کے عوض میں لیا جاتا ہے یعنی خرید وفروخت کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے یا کسی منفعت کے عوض میں ملتا ہے یعنی ملازمت یا اجارہ کے طور پر حاصل ہوتا ہے، اس میں تو کوئی خبث نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ہماری چیز یا ہمارے نفع کا عوض ہے، پس کمائی کرنے کے بہترین ذرائع یہی ہیں اسی طرح جو ہدیہ ملتا ہے وہ بھی طیب ہے کیونکہ اس میں مودت ومحبت اور عزت واحترام کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، مگر ان کے علاوہ جو مال حاصل ہوتا ہے یعنی خیرات کے طور پر ملتا ہے اس کے لینے میں ذلت واہانت ہے۔ اور دینے والے کی لینے والے پر برتری اور احسان کا پہلو بھی ہے۔ حدیث میں ہے کہ: ''اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۴۲) اس حدیث میں اسی برتری اور احسان کے پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ اس لئے مال حاصل کرنے کا یہ طریقہ بدترین ذریعۂ معاش ہے۔ یہ پیشہ نہایت پاکیزہ لوگوں کے لائق نہیں۔ نہ ان لوگوں کے شایانِ شان ہے جن کو ملت میں نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ یعنی یہ مال خاندانِ نبوت کے لئے سزاوار نہیں۔

تیسری وجہ: اگر آپؐ اپنی ذات کے لئے زکوۃ لیتے یا اپنے خاندان کے لئے جائز قرار دیتے جن کا فائدہ آپؐ ہی کا فائدہ ہے تو اندیشہ تھا کہ بدگمانی کرنے والے آپؐ کی شان میں نازیبا بات کہتے، وہ طعن کرتے کہ اپنی عیش کوشی کے لئے لوگوں پر ٹیکس لگایا ہے اس لئے آپؐ نے اس دروازہ کو بالکلیہ بند کردیا۔ اور صاف اعلان کردیا کہ زکوۃ کی منفعت لوگوں ہی کی طرف لوٹنے والی ہے۔ فرمایا: تُؤْخَذُ مِنْ أغنيائهم وترد على فقرائهم۔ یعنی زکوۃ ان کے

مالداروں سے لی جائے گی اوران کے فقیروں کولوٹادی جائے گی، یعنی زکوۃ کا یہ نظام فقراء پرمہربانی، مساکین پرنوازش، حاجت مندوں کی خوش حالی، اوران کوفلاکت سے بچانے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس میں آپؐ کا اور آپ کے خاندان کا کچھ حصہ نہیں (ملخص رحمۃ اللہ الواسعہ ۴: ۷۷)

تیسری بات: نبی ﷺ کے خاندان کے غریبوں کے لئے شریعت نے متبادل یہ تجویز کیا ہے کہ غنیمت کے خمس (پانچویں حصہ) میں ذوی القربی کا حصہ رکھا ہے۔ لیکن اب جبکہ غنیمتیں نہیں رہیں تو کیا آپؐ کے خاندان کے غریبوں کوزکوۃ دی جاسکتی ہے؟ قدیم سے یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ میرے استاذ اور دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی سید مہدی حسن صاحب شاہ جہانپوری قدس سرہ سادات میں سے تھے، ان کے پاس لکھا ہوا نسب نامہ موجود تھا اور آپ کا سلسلۂ نسب پیرانِ پیر حضرت شاہ عبدالقادر صاحب جیلانی قدس سرہٗ تک پہنچتا تھا، یعنی وہ قادری سادات میں سے تھے۔ حضرت مفتی صاحب یہ فتوی دیا کرتے تھے کہ فی زمانہ سادات کوزکوۃ دینا جائز ہے کیونکہ شریعت نے جومتبادل تجویز کیا تھا وہ باقی نہیں رہا۔ مگر عام طور پر مفتیانِ کرام یہ فتوی دینے کی ہمت نہیں کرتے، کہتے ہیں: مفتی صاحب قدس سرہ تو سادات میں سے تھے وہ اپنے لوگوں کے بارے میں جوچاہیں فتوی دیں ان کوحق تھا، ہمیں یہ حق نہیں۔ پس سادات بھی اپنی زکوۃ سادات کونہیں دے سکتے، دوسروں کودیں۔ درمختار میں ہے: **والهاشمي يجوز له دفع زكاته لمثله صوابه: لايجوز (بحر)**

سوال: جب شریعت نے جومتبادل تجویز کیا تھا وہ باقی نہیں رہا اور جواز کا فتوی دینے کی مفتیانِ کرام میں ہمت نہیں تو سادات کا کیا ہوگا؟ ان میں جوغریب ہیں ان کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟

جواب: سادات دوقسم کے ہیں۔ ایک: وہ جن کے پاس کوئی نسب نامہ نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ وہ سید کہلاتے ہیں اور نوے فیصد سادات ایسے ہی ہیں یہ اصلی سادات نہیں۔ ان کوزکوۃ دے سکتے ہیں۔ رہ گئے اصلی سادات یعنی جن کے پاس صحیح نسب نامہ موجود ہے ان کوزکوۃ نہیں دینی چاہئے، مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے خالص مال سے ان کی مدد کریں، نبی ﷺ کا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم آپؐ کے خاندان کی خبرگیری کریں لیکن اگران کوزکوۃ دی جائے توزکوۃ ادا ہوجائے گی اوران کے لئے لینا بھی جائز ہے، کیونکہ اب لوگ زکوۃ نکال دیں یہی غنیمت ہے، دوسرا مال خرچ کرنے والے بہت کم ہیں۔

چوتھی بات: نبی ﷺ کے چوتھے والد عبدمناف ہیں۔ ان کے چارلڑکے تھے: ہاشم، مطلب، نوفل اور عبدشمس۔ پھر ہاشم کے چارلڑکے تھے۔ ان میں سے سوائے عبدالمطلب کے سب کا سلسلہ نسب منقطع ہوگیا۔ اور عبدالمطلب کے بارہ لڑکے تھے۔ ان کی اولاد میں سے سب کوزکوۃ دی جاسکتی ہے اگروہ غریب ہوں، صرف پانچ خاندانوں کے لئے زکوۃ حلال نہیں: (۱) حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد کے لئے (۲) حارث بن عبدالمطلب کی تمام اولاد کے

لئے۔ اور ابو طالب کی اولاد میں سے تین خاندانوں کے لئے: (۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد کے لئے (۴) حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد کے لئے (۵) حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد کے لئے۔

اور نبی ﷺ کی نرینہ اولاد سن بلوغ کو نہیں پہنچی اس لئے خود آپ ﷺ کی اولاد اور اولاد در اولاد کا سلسلہ تو نہیں ہے۔ البتہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی اولاد آپ کی اولاد ہے اور یہی آلِ رسول اور خاندانِ رسول کہلاتا ہے۔ اور لوگ صرف انہی حضرات کے لئے زکوۃ کی حرمت جانتے ہیں۔ حالانکہ آج بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری اولاد اور حضرت عباس کی بے شمار اولاد موجود ہے۔ ان سب پر زکوۃ حرام تھی، مگر اب ان کی پہچان ہی باقی نہیں رہی، پس یہ بھی ایک وجہ ہے جواز کی کہ سادات کو اب زکوۃ دینا جائز ہے۔

حدیث (۱): بہز بن حکیم کے دادا کہتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی چیز لائی جاتی تو آپ (لانے والے سے) پوچھتے: یہ صدقہ ہے یا ہدیہ؟ اگر وہ کہتا کہ صدقہ ہے تو آپ اس کو نہیں کھاتے تھے (اصحابِ صفہ کے پاس بھیج دیتے تھے) اور اگر وہ کہتا کہ ہدیہ ہے تو (اصحابِ صفہ کو بلا لیتے اور ان کے ساتھ خود بھی) کھاتے۔

تشریح: متفق علیہ حدیث ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ کسی جگہ سے گذر رہے تھے آپ نے راستہ میں ایک کھجور پڑی دیکھی آپ نے فرمایا: ''اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ وہ صدقہ کی کھجور ہوگی تو میں اس کو کھا لیتا'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۲۱) یعنی راستہ میں کھانے کی کوئی چیز پڑی ملے تو اٹھا کر کھا لینا چاہئے ورنہ ضائع ہو جائے گی۔ اسی طرح متفق علیہ حدیث میں ہے کہ مسجد نبوی میں صدقہ کی کھجوریں رکھی ہوئیں تھیں۔ حضرت حسن آئے اور انھوں نے ایک کھجور منہ میں رکھ لی آپ نے فرمایا: کَخْ کَخْ تھوتھو، پھر فرمایا: ''جان لو کہ آلِ رسول کے لئے صدقہ حرام ہے'' (مشکوۃ حدیث ۱۸۲۲)

حدیث (۲): رسول اللہ ﷺ نے بنو مخزوم کی طرف ایک آدمی صدقہ وصول کرنے کے لئے بھیجا اس نے ابو رافع رضی اللہ عنہ (آنحضور ﷺ کے آزاد کردہ) سے کہا: آپ بھی میرے ساتھ چلیں جو ملے گا بانٹ لیں گے۔ ابو رافع نے کہا: جب تک میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھ نہ لوں نہیں چل سکتا۔ وہ نبی ﷺ کے پاس گئے اور آپ سے معلوم کیا آپ نے فرمایا: ''ہمارے خاندان کے لئے صدقہ حرام ہے، اور آزاد کردہ: خاندان میں شمار ہوتا ہے''

تشریح: عاملین کو یعنی زکوۃ وصول کرنے والوں کو اور زکوۃ تقسیم کرنے والوں کو تنخواہ زکوۃ کے مال میں سے دی جاتی ہے اور ان کے لئے لینا بھی جائز ہے، اگر چہ وہ مالدار ہوں، مگر آنحضور ﷺ نے اپنے خاندان کے لئے اس کی بھی گنجائش نہیں چھوڑی۔

[۲۵] بابُ ماجاء في كراهية الصدقة للنبي صلى الله عليه وسلم، وأهل بيته، ومواليه

[۶۴۹-] حدثنا بُنْدَارٌ، نا مَكِّيُّ بنُ إبراهيمَ، ويُوسُفُ بنُ يَعْقُوبَ الضُّبَعِيُّ، قالا: نا بَهْزُ بنُ حكيمٍ،

عن أبيهِ، عن جدِّه، قال: كانَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم إذا أُتِيَ بِشَيْءٍ سَأَلَ أَصَدَقَةٌ هِيَ أَمْ هَدِيَّةٌ؟ فإن قالُوْا: صَدَقَةٌ لَمْ يَأْكُلْ، وإِنْ قالُوْا: هَدِيَّةٌ أَكَلَ.

وفي الباب: عن سَلْمَانَ، وأبي هريرةَ، وأنسٍ، والحَسَنِ بنِ عليٍّ، وأبي عَمِيْرَةَ جَدِّ مُعَرِّفِ بنِ وَاصِلٍ واسْمُهُ رُشَيْدُ بنُ مَالِكٍ، ومَيْمُوْنَ بنِ مِهْرَانَ، وابنِ عباسٍ، وعبدِ اللّٰهِ بنِ عَمْرٍو، وأبي رَافِعٍ، وعبدِ الرحمنِ بنِ عَلْقَمَةَ، وقد رُوِيَ هذا الحديثُ أيضاً عن عبدِ الرحمنِ بنِ عَلْقَمَةَ، عن عبدِ الرحمنِ بنِ أبي عَقِيْلٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم.

وَجَدُّ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ: اسْمُهُ مُعَاوِيَةُ بنُ حَيْدَةَ القُشَيْرِيُّ، قال أبو عيسى: حديثُ بَهْزِبنِ حكيمٍ حديثٌ حسنٌ غريبٌ.

[۶۵۰-] حدثنا محمدُ بنُ المُثنّٰى، نا محمدُ بنُ جَعْفرٍ، نا شُعْبَةُ، عن الحَكَمِ، عن ابنِ أبي رَافِعٍ، عن أبي رَافِعٍ: أَنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم بَعَثَ رَجُلاً مِنْ بَنِيْ مَخْزُوْمٍ على الصَّدَقَةِ، فقالَ لِأَبِي رَافِعٍ: اصْحَبْنِيْ كَيْمَا تُصِيبُ مِنْهَا، فقال: لا حَتّٰى آتِيَ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم فَأَسْأَلَهُ، وانْطَلَقَ إلى النبيِّ صلى الله عليه وسلم فَسَأَلَهُ فقال:" إِنَّ الصَّدَقَةَ لاَتَحِلُّ لَنَا، وإِنَّ مَوَالِيَ القَوْمِ مِنْ أَنْفُسِهِمْ"

قال: وهذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وأبو رافعٍ مَوْلَى النبيِّ صلى الله عليه وسلم: اسْمُهُ أَسْلَمُ، وابنُ أبي رَافِعٍ: هُوَ عُبَيْدُ اللّٰهِ بنُ أبي رَافِعٍ كَاتِبُ عليِّ بنِ أبي طَالِبٍ.

وضاحت:بُنْدار: محمد بن بشار کالقب ہے............بہز بن حکیم کے دادا کا نام حضرت معاویۃ بن حَیدہ قشیریؓ ہے ....قولہ: اصحبنی إلخ ترجمہ: ساتھ چلیں آپ میرے تاکہ پہنچیں آپ صدقہ میں سے یعنی جو عُمالہ ملے گا اس میں سے آپ کو بھی دونگا............ حضرت ابورافع کا نام اسلم ہے اور ان کے صاحبزادے کا نام عبید اللہ ہے اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سکریٹری تھے۔

بابُ ماجاءَ فِي الصَّدَقَةِ عَلَى ذِي الْقَرَابَةِ

رشتہ داروں کو خیرات دینے کا بیان

دو قسم کے رشتہ داروں کو زکوۃ دینا جائز نہیں۔ایک: وہ جن کے ساتھ ولادت کا تعلق ہے۔یعنی اصول: باپ دادا، دادی اوپر تک، اسی طرح ماں، نانا، نانی اوپر تک اور فروع یعنی بیٹا، بیٹی، پوتا، پوتی، نواسہ، نواسی، نیچے تک۔دوسرے:

وہ جن سے نکاح کا تعلق ہے یعنی میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوۃ نہیں دے سکتے۔ان دورشتوں کے علاوہ تمام رشتہ داروں کو اگر وہ غریب ہوں زکوۃ دینا جائز ہے۔لہٰذا بھائی بہن کو ان کی اولاد کو، چچا، پھوپی، ماموں، خالہ وغیرہ سب کو زکوۃ دینا جائز ہے۔اور نہ صرف جائز ہے بلکہ اس میں دوگنا ثواب ہے۔ایک زکوۃ دینے کا دوسرا: صلہ رحمی کا، یعنی خاندان کو جوڑنے کا اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا۔مگر عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اپنے لوگوں کو دینے میں کیا ثواب؟ اس لئے وہ دور کی جگہوں میں اور اجنبیوں پر شوق سے خرچ کرتے ہیں۔غیر علاقہ کی مسجد یا مدرسہ ہو تو شوق سے چندہ دیں گے، اجنبی کی بلاتکلف مدد کریں گے، مگر اپنے گاؤں کی مسجد اور مدرسہ کو چندہ دینے میں اور رشتہ داروں کی مدد کرنے میں ان پر بوجھ پڑتا ہے۔یہ مزاج ٹھیک نہیں۔رشتہ داروں کا اور گاؤں کی مسجد و مدرسہ کا حق مقدم ہے۔پس چندہ دینے میں اور مدد کرنے میں ان کو مقدم رکھنا چاہئے۔

حدیث: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی روزہ کھولے تو چاہئے کہ کھجور سے روزہ کھولے، اس لئے کہ اس میں برکت ہے اور اگر کھجور میسر نہ ہو تو پانی سے روزہ کھولے، پس پانی صفائی کا آلہ ہے'' اور فرمایا: ''مسکین پر خیرات: صدقہ ہے (یعنی اس کا ایک ثواب ہے) اور رشتہ دار پر خرچ کرنے میں دو ثواب ہیں: صدقہ کا اور صلہ رحمی کا''

تشریح: بھوکے پیٹ میٹھی چیز کھانا معدہ کو تقویت پہنچاتا ہے اور عرب میں چونکہ کھجور أیسر الموجودات تھی پھر کھجور کے فوائد بھی بہت ہیں اس لئے حدیث میں کھجور سے روزہ کھولنے کا حکم ہے۔اور خالی پیٹ پانی پینا قبض کو توڑتا ہے جو قبض کا دائمی مریض ہے اگر وہ روزانہ صبح نہار منہ پیٹ بھر کر پانی پیئے تو قبض ٹوٹ جائے گا۔اور حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ کھانے سے پہلے ٹھنڈا پانی پینا بھوک کو بڑھاتا ہے (حدیث کا دوسرا ٹکڑا باب سے متعلق ہے اس کی وضاحت پہلے آچکی ہے)

مذکورہ حدیث محمد بن سیرین کی بہن حفصہ بنت سیرین: رَباب سے جن کی کنیتیں: ام الرائح اور ابنۃ صُلیع ہیں روایت کرتی ہیں۔چنانچہ ابن عیینہ، ثوری، ابن عون اور ہشام بن حسان نے اپنی سندوں میں رباب کا ذکر کیا ہے۔مگر شعبہ رباب کا ذکر نہیں کرتے۔امام ترمذی رحمہ اللہ نے جمہور کی حدیث کو جس میں رباب کا ذکر ہے اصح قرار دیا ہے اور حضرت کا یہ فیصلہ صحیح ہے۔انھوں نے اپنے مزاج کے مطابق فیصلہ کیا ہے، یعنی سند کے نازل ہونے کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا ہے مگر اتفاق سے یہی فیصلہ صحیح ہے۔

[۲۶] بابُ ماجاء فی الصدقة علی ذی القرابة

[۶۵۱-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا سُفيانُ بنُ عُيَيْنَةَ، عن عَاصِمٍ، عَن حَفصَةَ بِنْتِ سِيرِيْنَ، عن الرَّبَابِ، عن

عمِّهَا سَلْمَانَ بنِ عَامِرٍ، يَبْلُغُ بِهِ النبيَّ صلى الله عليه وسلم قال: "إذَا أفْطَرَ أحَدُكُمْ فَلْيُفطِرْ على تَمْرٍ، فَإنَّهُ بَرَكَةٌ، فَإنْ لَمْ يَجِدْ تَمرًا فَالْمَاءُ فَإنَّهُ طَهُوْرٌ" وقال: "الصَّدَقَةُ على المِسْكِيْنِ صَدَقَةٌ، وهِيَ على ذِيْ الرَّحِمِ، ثِنْتَانِ: صَدَقَةٌ وصِلَةٌ"

وفي الباب: عن زَيْنَبَ امْرَأةِ عبدِ اللهِ بنِ مَسْعُوْدٍ، وجابرٍ، وأبي هريرةَ.

قال أبو عيسى: حديثُ سَلْمَانَ بنِ عَامِرٍ حديثٌ حسنٌ. والرَّبَابُ: هِيَ أُمُّ الرَّائِحِ ابنَةُ صُلَيْعٍ. وهكَذَا رَوَى سُفيانُ الثوريُّ عن عَاصِمٍ، عن حَفْصَةَ بنتِ سِيْرِيْنَ، عن الرَّبَابِ، عن عَمِّهَا سَلْمَانَ بنِ عَامِرٍ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم نَحْوَ هذا الحديثِ.

ورَوَى شُعْبَةُ، عن عَاصِمٍ، عن حَفْصَةَ بِنْتِ سِيْرِيْنَ، عن سَلْمَانَ بنِ عَامِرٍ، وَلَمْ يَذْكُرْ فِيْهِ عَنِ الرَّبَابِ.

وحديثُ سُفيانَ الثَّوْرِيِّ وابنِ عُيَيْنَةَ أصَحُّ، وهكَذَا رَوَى ابنُ عَوْنٍ، وهِشَامُ بنُ حَسَّانَ، عن حَفْصَةَ بنتِ سِيْرِيْنَ، عن الرَّبَابِ، عن سَلْمَانَ بنِ عَامِرٍ.

نوٹ: یہ حدیث اور سند کی بحث آگے کتاب الصوم میں بھی آئے گی۔

بابُ ماجاءَ أنَّ في المالِ حقًّا سِوَى الزَّكَاةِ

مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کا حق ہے

پہلے یہ باب آیا ہے کہ مال میں اللہ تعالیٰ کا حق صرف زکوۃ ہے، اور اس باب میں اس کے خلاف حدیث ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: "مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کا حق ہے" پھر آپؐ نے سورۃ البقرۃ کی (آیت ۱۷۷) پڑھی: ﴿وآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّائِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ، وَأقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ﴾ ترجمہ: اور مال دیا اس کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو، اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور مانگنے والوں کو، اور گردنیں چھڑانے میں اور اہتمام کیا اس نے نماز کا اور دی اس نے زکوۃ۔ اس آیت سے نبی ﷺ نے یہ مسئلہ اس طرح مستنبط کیا ہے کہ رشتہ داروں اور مسکینوں وغیرہ پر خرچ کرنے کا جو حکم ہے وہ زکوۃ کے علاوہ ہے، کیونکہ زکوۃ کا تذکرہ بعد میں آرہا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔

اور علماء نے فرمایا ہے کہ مال میں زکوۃ کے علاوہ جو اللہ کا حق ہے، شریعت نے اس کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ یہ مسئلہ لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے، لوگ خود سوچیں کہ کن موقعوں پر خرچ کرنا چاہئے۔ البتہ نبی ﷺ نے بطور مثال چند اشارے کئے ہیں، مثلاً فرمایا: "اگر پڑوسی بھوکا سوئے تو تم مسلمان نہیں" یا فرمایا: "سائل کو خالی ہاتھ نہ

لوٹاؤ" اور اس قسم کے ارشادات میں غور کرنے سے راہیں کھولیں گی، جیسے: ملت کے کاموں میں خرچ کرنا۔ اگر مسلمان ملت کے کاموں میں خرچ نہیں کریں گے تو دین کی گاڑی کیسے چلے گی؟ تمام غیر اسلامی حکومتوں میں مسلمان آباد ہیں ان کے لئے مدرسے مسجدیں، مکتب ناگزیر ہیں، اگر وہ وہاں مدرسے اور مسجدیں نہیں بنائیں گے تو ان کے اور ان کی نسل کے دین کا کیا ہوگا؟ اور یہ کام مسلمانوں کو از خود کرنا ہے۔ حکومتوں سے امید رکھنا فضول ہے۔ جو اسلامی حکومتیں ہیں وہ بھی مدرسوں اور مکتبوں پر خرچ نہیں کرتیں پھر غیر مسلم حکومتیں مدرسے اور مسجدیں بنا کر کیسے دیں گی؟ یہ کام مسلمانوں کو اپنی پونجی سے کرنا ہے، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے قومی کام ہیں، جن میں خرچ کرنا ضروری ہے۔ غرض مال میں ایک تو فریضہ ہے اور وہ زکوۃ ہے، اور اس کے علاوہ مال میں جو اللہ تعالیٰ کا حق ہے وہ ثانوی درجہ کا حق ہے۔ مگر وہ نرا نفلی حکم بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ نفلی احکام میں اس قسم کی وعید نہیں سنائی جاتی کہ پڑوسی بھوکا سوئے تو آدمی مسلمان نہیں۔ معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کے علاوہ جو حقوق ہیں وہ فرض اور نفل کے درمیان ہیں، اور اس کے لئے کوئی اصول اور ضابطہ نہیں، لوگوں کو خود ہی مصارف تلاش کرنے ہیں اور ان میں خرچ کرنا ہے۔

[۲۷] بابُ ماجاء أن فی المال حَقًّا سوی الزکاۃ

[۶۵۲-] حدثنا محمدُ بنُ مَدُّوْيَةَ، نا الأسْوَدُ بنُ عَامِرٍ، عن شَرِيكٍ، عن أبی حَمْزَةَ، عن الشَّعْبِیِّ، عن فَاطِمَةَ ابْنَةِ قَيْسٍ، قالتْ: سَأَلْتُ أَوْ: سُئِلَ النبیُّ صلی الله علیه وسلم عَنِ الزَّكَاةِ، فقال: "إِنَّ فی المالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّكَاةِ" ثُمَّ تَلَا هَذِهِ الآيَةَ الَّتِی فی البَقَرَةِ: ﴿لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ﴾ الآيَةَ.

[۶۵۳-] حدثنا عبدُ اللّٰهِ بنُ عبدِ الرحمنِ، نا محمدُ بنُ الطُّفَيْلِ، عن شَرِيكٍ، عن أبی حَمْزَةَ، عن عَامِرٍ، عن فَاطِمَةَ بِنْتِ قَيْسٍ، عن النبیِّ صلی الله علیه وسلم قال: "إِنَّ فی المالِ حَقًّا سِوَی الزَّكَاةِ"

قال أبو عيسی: هذا حديثٌ إِسْنَادُهُ لَيْسَ بِذَاكَ، وأبو حَمْزَةَ مَيْمُوْنُ الأعْوَرُ يُضَعَّفُ، وَرَوَی بَيَانٌ، وإسماعيلُ بنُ سَالِمٍ عن الشَّعْبِیِّ هذا الحديثَ قَوْلَهُ وَهٰذَا أَصَحُّ.

وضاحت: الآیة: کی تقدیر ہے: اقرأ الآیةَ بتمامها یعنی پوری آیت پڑھو، جہاں بھی الآیة لکھا ہو وہاں پوری آیت پڑھنی چاہئے، لیکن لوگ الآیة ہی پڑھتے ہیں۔ اور یہ حدیث نہایت ضعیف ہے۔ یہ شریک کی روایت ہے جو کثیر الخطاء ہیں، اور ان کے استاذ ابوحمزۃ میمون الاعور اچھے راوی نہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث مرفوع نہیں۔ عامر شعبی کا قول ہے۔ چنانچہ بیان بن بشر اور اسماعیل بن سالم نے اس کو شعبی رحمہ اللہ کا قول روایت کیا ہے (مگر یہ مضمون ایسا نہیں کہ کوئی تابعی اپنے اجتہاد سے بیان کرے لامحالہ اس کو حدیثِ مرفوع تسلیم کرنا پڑے گا اگرچہ ضعیف سہی!)

بابُ ماجاءَ فِیْ فَضْلِ الصَّدَقَةِ

خیرات کا ثواب

حدیث (۱): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی ستھرے مال میں سے جو بھی خیرات کرتا ہے — اور اللہ تعالیٰ ستھرا مال ہی قبول فرماتے ہیں (یہ جملہ معترضہ ہے) — مگر اس خیرات کو مہربان اللہ اپنے دائیں ہاتھ میں لیتے ہیں، پھر اگر وہ خیرات ایک چھوہارا ہوتی ہے تو وہ مہربان اللہ کی ہتھیلی میں (تدریجاً) بڑھتی ہے، یہاں تک کہ وہ پہاڑ سے بڑی ہوجاتی ہے، جس طرح تم میں سے ایک اپنے گھوڑے یا اونٹ کے بچہ کی پرورش کرتا ہے (اور اس کو بڑا کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ خیرات کو بڑا کرتے ہیں)

تشریح:

۱- صدقہ کا طیب ہونا ضروری ہے، حسّاً بھی اور معناً بھی۔ حسّاً طیب ہونا یہ ہے کہ وہ چیز کسی لائق ہو۔ سالن سڑ گیا اس لئے غریب کو دیدیا یہ ٹھیک نہیں، کیونکہ جو چیز ہم نہیں کھاسکتے دوسرا اُسے کیسے کھائے گا؟ اور معنوی طیب ہونا یہ ہے کہ صدقہ حلال مال سے ہو حرام مال سے نہ ہو۔ اور قبول کے کتاب کے شروع میں دو معنی گذرے ہیں: ایک: قبول بمعنی صحت، دوسرے: قبول بمعنی رضا (پسندیدگی) یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔ اس لئے کہ اگر کسی کے پاس حرام مال ہے تو اس سے پیچھا چھڑانا ضروری ہے، اور پیچھا چھڑانے کی صورت یہ ہے کہ ثواب کی نیت کے بغیر وہ مال غریب کو دیدیا جائے۔ معلوم ہوا کہ حرام مال کا بھی صدقہ ہوتا ہے مگر اس میں ثواب کی نیت جائز نہیں، اور نہ اس صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔ اور یہاں چونکہ ثواب مذکور ہے اس لئے یہ قبول بمعنی رضا ہے۔

۲- اور دائیں ہاتھ میں لینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خیرات کو خوشی سے قبول کرتے ہیں، اور صفت رحمٰن میں اس طرف اشارہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ بندوں پر مہربان ہیں اس لئے ان کی خیرات کو رائگاں نہیں جانے دیتے بلکہ قبولیت سے نوازتے ہیں۔

اور جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں کوئی بایاں نہیں، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے دونوں ہاتھوں میں قوت ہے انسان کے دائیں ہاتھ میں قوت اور بائیں ہاتھ میں ضعف ہوتا ہے، اللہ میں ایسا نہیں اس لئے کہ وہ عیوب سے پاک ہیں۔

۳- اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں صدقہ تدریجاً بڑھتا ہے، یک بیک پہاڑ سے بڑا نہیں ہوجاتا۔ یہ بات نبی ﷺ نے ایک مثال سے سمجھائی ہے: جس طرح آدمی گھوڑی اور اونٹنی کے بچہ کی پرورش کرتا ہے، اور مسلسل اس کی نگہبانی کرتا ہے،

حوادثات سے بچاتا ہے تا آنکہ وہ رفتہ رفتہ گھوڑا اور اونٹ بن جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بندوں کی خیرات کی حفاظت کرتے ہیں اور ایک چھوہارا بھی تدریجاً پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے، اور انسان گھوڑی اور اونٹنی کے بچوں کو اپنے فائدے کے لئے پالتا ہے، تاکہ وہ بار برداری اور سواری کے قابل ہو جائیں یا اچھی قیمت سے فروخت ہوں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بندوں کے فائدے کے لئے صدقہ کو اپنی ہتھیلی میں بڑا کرتے ہیں پس قربان جایئے ان کی مہربانی کے!

سوال: جب صدقات رحمٰن کے ہاتھ میں تدریجاً بڑھتے ہیں تو آدم علیہ السلام کی امت نے جو خیراتیں کی ہیں ان میں اور نبی ﷺ کی امت کے آخری افراد جو خیراتیں کریں گے ان میں بڑا تفاوت ہوگا؟ اور یہ آخری امت گھاٹے میں رہے گی؟

جواب: کبھی کھاد اور بیج کی تاثیر سے بعد میں بوئی ہوئی کھیتی جلدی تیار ہو جاتی ہے اور وہ پہلے بوئی ہوئی کھیتی کے ساتھ کاٹنے کے قابل ہو جاتی ہے، یہاں بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئے ان شاء اللہ یہ امت گھاٹے میں نہیں رہے گی، سرخ رو ہوگی۔

نوٹ: گھوڑی کے بچہ کے لئے دو لفظ ہیں: (۱) فَلُوٌّ: اس کی جمع أفلاء ہے جیسے عَدُوٌّ کی جمع أعداء (۲) مُهْرٌ: اس کی جمع أمهار وغیرہ آتی ہے۔

حدیث (۲): رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: رمضان کے بعد کونسے مہینے کے روزے زیادہ فضیلت والے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''شعبان کے روزے جو رمضان کی تعظیم (تیاری) کے لئے رکھے جائیں'' سائل نے پوچھا: پس کونسی خیرات افضل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''رمضان میں صدقہ کرنا''

تشریح: مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ رمضان کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والے روزے محرم کے ہیں (مشکوٰۃ حدیث ۲۰۳۹) اور اس حدیث میں شعبان کے روزوں کو افضل قرار دیا ہے۔ اس تعارض کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب: یہ حدیث صدقۃ بن موسیٰ کی وجہ سے ضعیف ہے اور محرم کے روزوں کی فضیلت والی حدیث حسن صحیح ہے۔ پس تعارض کے وقت اصح مافی الباب کو لیا جائے گا۔

دوسرا جواب: محرم کے روزوں کی فضیلت مطلقاً ہے اور شعبان کے روزوں کی فضیلت تعظیم رمضان کی قید کے ساتھ ہے۔ یعنی شعبان کے انہی روزوں کے لئے فضیلت ہے جو رمضان کی تیاری کے لئے رکھے جائیں۔ اور محرم کے روزوں کے لئے کوئی قید نہیں، وہ مطلقاً افضل ہیں۔

اور رمضان کی تعظیم (تیاری) کے لئے شعبان میں روزے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی کوئی عبادت شروع کی جاتی ہے تو وہ شروع میں بس یونہی سا عمل ہوتا ہے، پھر تھوڑی عبادت ہو جانے کے بعد انوار محسوس ہونے لگتے ہیں اور عبادت میں مزہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ رمضان میں ہر شخص کو اس کا تجربہ ہوگا۔ شروع میں روزے بس رکھے

جاتے ہیں، پھر ہفتہ کے بعد مزہ آنے لگتا ہے اور رمضان کے آخر میں تو یہ حال ہو جاتا ہے کہ آدمی چاہتا ہے کہ روزے ختم ہی نہ ہوں، اسی لئے یکم شوال (عید الفطر) کا روزہ حرام کیا گیا تاکہ فرض روزوں میں لوگ اضافہ نہ کریں۔ پس اگر شعبان میں کچھ روزے رکھ لئے جائیں تو رمضان کے روزے شروع ہی سے پُر لطف ہو جائیں گے، یہی مطلب ہے تعظیم (تیاری) کا۔

حدیث (۳): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''صدقہ اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بری موت کو دفع کرتا ہے''

تشریح: اس حدیث میں صدقہ کی دو خاصیتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک: یہ کہ اگر بندے کی کسی لغزش یا معصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا غضب اس کی طرف متوجہ ہو تو صدقہ اس غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے اور بندہ بجائے اللہ کے غضب اور ناراضگی کے اس کی رضا اور رحمت کا مستحق بن جاتا ہے۔ اور دوسری خاصیت یہ ہے کہ صدقہ آدمی کو بُری موت سے بچاتا ہے یعنی صدقہ کی برکت سے اس کا خاتمہ اچھا ہوتا ہے اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ صدقہ اس طرح کی موت سے بچاتا ہے جس کو دنیا میں بری موت سمجھا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد ہر آدمی اس پر پھٹکار بھیجے۔ لوگ سخی داتا کو روتے ہیں اور عرصہ تک یاد رکھتے ہیں، اس کا ذکر خیر کرتے ہیں اور دعائیں دیتے ہیں یہ اچھی موت ہے۔

حدیث (۴): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک اللہ تعالیٰ صدقے کو قبول کرتے ہیں اور اس کو اپنے دائیں ہاتھ میں لیتے ہیں، پس تم میں سے ہر ایک کے لئے اس صدقہ کو بڑھاتے ہیں جس طرح تم میں سے ہر ایک اپنی گھوڑی کے بچہ کی پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ ایک لقمہ اُحد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ اور قرآن کی یہ آیات اس کی تصدیق کرتی ہیں: ''اللہ وہ ہیں جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتے ہیں اور صدقات کو لیتے ہیں'' [التوبة ۱۰۴] اور ''اللہ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کی پرورش کرتے ہیں'' [البقرة ۲۷۶] پہلی آیت سے رحمٰن کا صدقہ کو دائیں ہاتھ میں لینا ثابت ہوا اور دوسری آیت سے اس کی پرورش کرنا معلوم ہوا۔

نوٹ: پہلی آیت پاک ترمذی میں غلط چھپی ہوئی ہے اس میں واو اور الذی نہیں ہے۔

[۲۸] بابُ ماجاء في فضل الصدقة

[۶۵۴-] حدثنا قُتَيْبَةُ، نا اللَّيْثُ بنُ سَعْدٍ، عن سَعِيْدِ المَقْبُرِيِّ، عن سَعِيدِ بنِ يَسَارٍ، أَنَّهُ سَمِعَ أبا هريرةَ، يقولُ: قال رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: " مَا تَصَدَّقَ أَحَدٌ بِصَدَقَةٍ مِنْ طَيِّبٍ – ولَايَقْبَلُ اللّٰهُ إِلَّا الطَّيِّبَ – إلا أَخَذَهَا الرَّحْمٰنُ بِيَمِيْنِهِ، وإِنْ كَانَتْ تَمْرَةً تَرْبُوْ في كَفِّ الرحمنِ حتّٰى تَكُوْنَ أَعْظَمَ مِنَ الجَبَلِ، كَمَا يُرَبِّيْ أَحَدُكُم فَلُوَّهُ أَوْ فَصِيْلَهُ"

وفي الباب: عن عائشةَ، وعَدِيِّ بنِ حاتِمٍ، وأنسٍ، وعبدِ اللّٰهِ بنِ أبي أَوْفَى، وحَارِثَةَ،

وَوَهْبٍ، وعبدِ الرحمنِ بنِ عَوْفٍ، وبُرَيْدَةَ. قال أبو عيسى: حديثُ أبي هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

[٦٥٥-] حدثنا محمدُ بنُ إسماعيلَ، نا موسىَ بنُ إسماعيلَ، نا صَدَقَةُ بنُ موسى، عن ثَابِتٍ، عن أنسٍ، قال: سُئِلَ النبيُّ صلى الله عليه وسلم: أَيُّ الصَّوْمِ أَفْضَلُ بَعْدَ رَمَضَانَ؟ قال:" شَعْبَانُ لِتَعْظِيمِ رَمَضَانَ" قال: فَأَيُّ الصَّدَقَةِ أَفْضَلُ؟ قال:" الصَّدَقَةُ فِي رَمَضَانَ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ غريبٌ، وصَدَقَةُ بنُ موسىَ لَيْسَ عِندَهم بذاكَ القَوِيِّ.

[٦٥٦-] حدثنا عُقْبَةُ بنُ مُكْرَمٍ البَصْرِيُّ، نا عبدُ اللّٰهِ بنُ عيسىَ الخَزّازُ، عن يُونُسَ بن عُبَيْدٍ، عن الحَسَنِ، عن أنسِ بنِ مالكٍ، قال: قال رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم:" إِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِيءُ غَضَبَ الرَّبِّ، وتَدْفَعُ مِيتَةَ السُّوْءِ"

قال: هذا حديثٌ غريبٌ مِن هذا الوجْهِ.

[٦٥٧-] حدثنا أبو كُرَيْبٍ محمدُ بنُ العَلَاءِ، نا وَكِيعٌ، نا عَبَّادُ بنُ مَنْصُوْرٍ، نا القاسِمُ بنُ محمدٍ، قال: سمعتُ أبا هريرةَ، يقولُ: قال: رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم:" إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ الصَّدَقَةَ وَيَأْخُذُهَا بِيَمِيْنِهِ، فَيُرَبِّيْهَا لِأَحَدِكُمْ كَمَا يُرَبِّىْ أَحَدُكُمْ مُهْرَهُ، حتَّى إِنَّ اللُّقْمَةَ لَتَصِيْرُ مِثْلَ أُحُدٍ، وتَصْدِيْقُ ذٰلِكَ فِي كِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ:﴿ أَلَمْ يَعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ﴾ و﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾

قال هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وقد رُوِيَ عن عائشةَ عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم نحوُ هذا.

وضاحت: حدیث (۶۵۶) غریب بمعنی ضعیف ہے، کیونکہ سند کا ایک راوی عبد اللہ بن عیسیٰ خزّاز ابو خلف ضعیف ہے۔ اور یہ حدیث ابن حبان نے بھی اپنی صحیح (۵: ۱۳۱) میں اسی سند سے روایت کی ہے .... اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی حدیث (۶۵۷) کی طرح مروی ہے جس کی تخریج طبرانی ابن حبان وغیرہ نے کی ہے (درمنثور ۱: ۳۶۵)

صفاتِ متشابہات کی بحث

جاننا چاہئے کہ قرآن میں دو قسم کی آیات ہیں: محکم اور متشابہ۔ محکم: وہ آیات ہیں جن کی مراد اس شخص پر واضح ہے جو عربی زبان اچھی طرح جانتا ہے۔ اور متشابہ: وہ آیات ہیں جن کی مراد ایسے شخص پر واضح نہیں۔ پہلی قسم کی آیات کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران (آیت ۷) میں ام الکتاب کہا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیماتِ اسلامیہ کا اصل سرچشمہ

یہی آیات ہیں۔ کیونکہ ان کے معانی اور مفاہیم اشتباہ والتباس سے پاک ہیں، اور متشابہات کی مراد صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ اپنی رائے سے کھینچ تان کر کے ان کے کوئی معنی متعین کرنا صحیح نہیں۔ ارشاد پاک ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ تا أُولُوْا الأَلْبَابِ﴾ ترجمہ: اللہ تعالیٰ ایسے ہیں جنھوں نے تم پر کتاب نازل کی جس کا ایک حصہ وہ آیات ہیں جو اشتباہِ مراد سے پاک ہیں اور وہی آیتیں اس کتاب کا مدار علیہ ہیں اور دوسری آیتیں وہ ہیں جو مشتبہ المراد ہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کے اسی حصہ کے پیچھے پڑتے ہیں جو مشتبہ المراد ہے، شورش ڈھونڈھنے کی غرض سے اور اس کا مطلب ڈھونڈھنے کی غرض سے، حالانکہ ان کی صحیح مراد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں: ہم اس پر یقین رکھتے ہیں، یہ سب آیتیں ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقلمند ہیں۔ اس آیت میں خاص مضمون یہ ہے کہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ محکم آیات سے آنکھیں بند کر کے متشابہات کی کھود کرید میں لگے رہتے ہیں، اور ان سے اپنی خواہش کے مطابق معانی گھڑ کر لوگوں کو مغالطے میں ڈالتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن وحدیث میں سخت وعید آئی ہے۔ صدیقہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو متشابہات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں تو تم ان سے دور رہو، کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے (قرآن میں) کیا ہے (بخاری حدیث ۴۵۴۷) اور جو لوگ سلیم الفطرت ہیں وہ متشابہات کے بارے میں زیادہ تفتیش نہیں کرتے، بلکہ اجمالاً ان پر ایمان لاتے ہیں کہ یہ بھی اللہ ہی کا برحق کلام ہے۔

اور راسخین فی العلم کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں۔ راجح قول یہ ہے کہ ان سے مراد اہل السنۃ والجماعۃ ہیں، وہ قرآنی تعلیمات کی محور اور مرکزی آیات کو یعنی محکمات کو مانتے ہیں، اور متشابہات کو جن کے معانی ان کے فہم وادراک سے باہر ہیں ان پر اپنی کوتاہ نظری اور قصور علمی کا اعتراف کرتے ہوئے ایمان لاتے ہیں اور حقیقی مراد کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات از قبیل متشابہات ہیں، اور ان کے تعلق سے چند باتیں عرض ہیں:

پہلی بات: صفاتِ متشابہات کے بارے میں سلف کا مذہب تنزیہ مع التفویض ہے یعنی باری تعالیٰ کے لئے صفات کو اتباعاً للنصوص ثابت مانا جائے، لیکن اس کے معنی مرادی اور اس کی کیفیت کے بارے میں توقف وسکوت کیا جائے۔ ان میں غور وخوض نہ کیا جائے، اور خلف کا مذہب تنزیہ مع التاویل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ الفاظ کا ظاہری مفہوم مراد نہیں کیونکہ وہ تشبیہ (مخلوق کے مانند ہونے) کو مستلزم ہے، اور درجہ احتمال میں ان کے ایسے معنی بیان کئے جائیں جو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہیں، اور خلف نے تنزیہ مع التاویل کی راہ اس لئے اختیار کی ہے کہ بیمار ذہن کو مطمئن کیا جائے اور فلسفیانہ اذہان کو قابو میں لایا جائے، ورنہ وہ اللہ کی صفات کے بارے میں گمراہی میں مبتلا

ہوجائیں گے۔

سلف وخلف میں امتیاز: جب سے علم کلام کی تدوین ہوئی اور اشعری اور ماتریدی مکاتب فکر وجود میں آئے اس وقت سے خلف کا دور شروع ہوتا ہے اور اس سے پہلے سلف کا زمانہ تھا۔ جب یونان کا فلسفہ عربی میں منتقل ہوا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کے عقائد میں تزلزل آیا تو ان کی تردید کے لئے یہ دو مکاتب فکر وجود میں آئے۔ اشعری مکتب فکر کے روح رواں حضرت ابوالحسن علی بن اسماعیل ہیں۔ ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۳۲۴ھ میں وفات پائی۔ آپ ابوموسیٰ اشعریؓ کی اولاد میں سے ہیں، اس لئے اشعری کہلاتے ہیں۔ اور ماتریدی مکتب فکر کے سرخیل ابومنصور محمد بن محمد بن محمود ماتریدی (متوفی ۳۳۳ھ) ہیں، ماترید: سمرقند کا ایک محلہ ہے۔

دوسری بات: شیخ ابومنصور ماتریدیؒ فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے اور شیخ ابوالحسن اشعری شافعی تھے۔ چنانچہ علم کلام میں شوافع زیادہ تر اشعری ہیں اور احناف عموماً ماتریدی ہیں (بعض اشعری بھی ہیں جیسے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہٗ حنفی تھے، مگر علم کلام میں اشعری ہیں) اور مالکیہ میں کچھ اشعری اور کچھ ماتریدی ہیں۔ اور امام احمد رحمہ اللہ سے فقہ میں تو حنبلیت چلی ہے اور علم کلام میں سلفیت۔ ابتداء میں دونوں مسلکوں کو حنبلی کہتے تھے پھر بعد میں فرق کرنے کے لئے فقہ میں امام احمدؒ کے مقلدین کو حنبلی اور علم کلام میں آپ کے مقلدین کو ''سلفی'' کہنے لگے۔

پھر جب علماء دیوبند کا دور آیا تو انھوں نے سلف وخلف اور اشاعرہ وماتریدیہ کا جھگڑا ختم کردیا۔ انھوں نے نصاب میں دو کتابیں شامل کیں: ایک: عقیدۃ الطحاوی۔ یہ کتاب سلف کے مسلک کی ترجمانی کرتی ہے، دوسری: شرح عقائد نسفی۔ اس کا متن: **العقائد النسفیۃ**: نجم الدین ابوحفص عمر بن محمد النسفی (۴۶۱-۵۳۷ھ) کا ہے جو ماتریدی تھے اور شارح علامہ سعد الدین تفتازانی (۷۲۲یا۷۱۲-۷۹۱یا۷۹۲یا۷۹۳ھ) ہیں جو اشعری تھے۔ غرض دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں جامعیت ہے اور اکابرین دیوبند کے نزدیک اصل مذہب سلف کا ہے اور بیمار اذہان کو گمراہی سے بچانے کے لئے اور بے پینڈے کے لوٹوں کو ٹھہرانے کے لئے صفات کی ایسی تاویل جائز ہے جو اللہ کے شایانِ شان ہو۔

جاننا چاہئے کہ ہندوستان اور عرب کے سب غیر مقلدین علم کلام میں اشعری تھے، اور علم فقہ میں ظاہری (یہ ایک مستقل فقہ ہے جیسے جعفری اور زیدی فقہ) لیکن اب انھوں نے فقہ ظاہری پر سلفیت کا لیبل چسپاں کرکے لوگوں کو دھوکے میں ڈالنا شروع کیا ہے۔ حالانکہ سلفیت امام احمدؒ سے چلنے والا علم کلام کا ایک مسلک ہے، اس کا ظاہریت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

جاننا چاہئے کہ فقہ میں چار ہی مکاتب فکر برحق ہیں۔ حنفیت، شافعیت، مالکیت اور حنبلیت یہی اہل السنہ والجماعۃ کے فقہی مکاتب فکر ہیں۔ ان کے علاوہ ظاہریت، جعفریت اور زیدیت وغیرہ تمام فقہی مکاتب فکر گمراہی ہیں۔ کیونکہ وہ

گمراہ فرقوں کی فقہیں ہیں اور علم کلام میں تین ہی مکاتب فکر برحق ہیں: سلفیت، اشعریت اور ماتریدیت، کیونکہ یہی تین اہل السنہ والجماعۃ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیگر بہتّر فرقے گمراہ ہیں۔ پھر جب دونوں لائنوں سے آدمی حق پر ہو تو وہ برحق ہے۔ فقہ میں چار میں سے کسی ایک کی پیروی کرے اور علم کلام میں تین میں سے کسی ایک کی تو وہ حق پر ہے اور دونوں لائنوں سے ہٹا ہوا ہو جیسے معتزلہ اور خوارج اور شیعہ وغیرہ تو وہ قطعاً گمراہ ہیں۔ اور ایک لائن سے ہٹا ہوا ہو جیسے فقہ میں حنفی ہو مگر علم کلام میں معتزلی ہو جیسے جار اللہ زمخشری: وہ کریلا نیم چڑھا ہے۔ غیر مقلدین اگر علم کلام میں سلفی ہوں تو بھی گمراہ ہیں کیونکہ فقہ میں وہ ظاہری ہیں۔ مگر وہ دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں اور اپنے اوپر سلفیت کا لیبل لگا کر اپنا اہل حق میں شامل ہونا باور کراتے ہیں پس لوگوں کو ان کے دھوکہ سے ہوشیار رہنا چاہئے۔

تیسری بات: اب سلفی بھی حد سے گذر گئے ہیں اور خلفی بھی اپنی ڈگر پر نہیں رہے، اور حق درمیان میں ہے۔ سلفی اللہ تعالیٰ کے لئے مخلوق جیسی صفات ماننے لگے ہیں اور تنزیہ کا پہلو ان کے ذہنوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے (۱:۵۷) میں یہ قصہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وہ دمشق کی جامع مسجد میں جمعہ پڑھنے کے لئے گئے، نماز کے بعد ایک صاحب نے وعظ کہنا شروع کیا۔ دورانِ وعظ انھوں نے یہ حدیث بیان کی کہ اللہ تعالیٰ رات کے آخری پہر میں سمائے دنیا پر نزول فرماتے ہیں۔ کسی نے پوچھا: اللہ تعالیٰ کیسے نزول فرماتے ہیں؟ وہ صاحب ممبر سے نیچے اترے اور کہا: ینزل کنزولی هذا یعنی باری تعالیٰ میرے اس اترنے کی طرح اترتے ہیں لوگوں نے اس کی خوب پٹائی کی، ابن بطوطہ کہتا ہے میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ ابن تیمیہ ہے۔ محققین نے اس واقعہ کو تاریخی اعتبار سے غلط قرار دیا ہے، کیونکہ اسی جلد کے ص ۵۰ پر تصریح ہے کہ ابن بطوطہ ۹ رمضان ۷۲۶ھ میں دمشق پہنچا تھا اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ شعبان ۷۲۶ھ کے اوائل ہی میں دمشق کے قلعے میں قید کر دیئے گئے تھے، اور اسی قید کی حالت میں ۲۰ ذی قعدہ ۷۲۸ھ میں ان کی وفات ہو گئی تھی مگر اس اعتراض کا یہ جواب ہو سکتا ہے کہ وہ اگر حقیقی ابن تیمیہ نہیں تو ان کے نظریات کا حامل کوئی ہے، اس لئے اس کو ابن تیمیہ کہہ دیا گیا ہے، جیسے جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والا ہر شخص مودودی کہلاتا ہے، کیونکہ وہ مودودی کے نظریات کا حامل ہے۔ یہ ابن تیمیہ بھی اسی طرح کا ہو سکتا ہے یعنی وہ ابن تیمی ہے اگرچہ ابن تیمیہ نہیں اور حضرت الاستاذ علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی قدس سرہٗ سے میں نے سر میں تیل ڈالتے ہوئے پوچھا تھا کہ ابن تیمیہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ حضرتؒ نے فرمایا: مولوی صاحب! وہ حدیث میں تو ہے کھلاڑی اور علم کلام میں ہے اناڑی! غرض سلفیوں نے صفاتِ خداوندی کی ایسی وضاحتیں کی ہیں کہ تنزیہ کا پہلو بالکل ختم ہو گیا ہے، حالانکہ سلف کا مذہب تنزیہ مع التفویض ہے۔

دوسری طرف خلف کا کیا حال ہے وہ بھی سن لیں۔ ایک بڑے عالم نے یہ واقعہ سنایا کہ وہ ایک مرتبہ حج کے لئے گئے، امام حرم سے ملاقات ہوئی، رسمی تعارف کے بعد امام حرم نے پوچھا: أین اللہ؟ اللہ کہاں ہیں؟ وہ عالم خاموش

رہے، کوئی جواب نہ دیا، میں نے ان سے کہا: آپ نے فی السماء کیوں نہ کہا؟ نبی ﷺ نے ایک باندی سے یہی سوال کیا تھا تو اس نے فی السماء کہا تھا۔ اور سورۃ الملک میں دو جگہ آیا ہے: ﴿ءَ أَمِنْتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ﴾ یعنی کیا تم اس ہستی سے بے خوف ہوگئے جو آسمان میں ہے مجھے اس واقعہ سے یہ بتانا ہے کہ سلفیوں کو أین اللہ؟ کا جواب فی السماء ہی چاہئے کوئی دوسرا جواب وہ تسلیم نہیں کریں گے، کیونکہ وہ اس حدیث سے اللہ کے لئے تقریباً مکانیت ثابت کرتے ہیں جبکہ حدیث میں صفت علو کا بیان ہے، اور کون ہے جو اللہ کے لئے صفت علو (بلندی) ثابت نہیں کرتا؟ قرآن میں ہے: ﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ﴾ اور خلف تاویل کرتے ہوئے اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ گویا تاویل ہی اصل ہے، حالانکہ صحیح بات بیچ میں ہے۔ اصل مذہب تنزیہ مع التفویض ہے اور بیمار ذہنوں کے لئے تاویل بھی جائز ہے مگر مبدأ کا ثبوت ماننا ضروری ہے اگر صفات سمع و بصر و نزول وغیرہ کے مبدأ کو مانے بغیر تاویل کی جائے تو وہ بھی گمراہی ہے (یہ مضمون تفصیل سے حجۃ اللہ البالغہ میں صفات پر ایمان لانے کے بیان میں ہے)

امام ترمذی کا تسامح: اس کے بعد جاننا چاہئے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ سے یہاں تسامح ہوا ہے، انھوں نے اہل السنہ والجماعۃ میں سے خلف کا جو مذہب ہے یعنی تنزیہ مع التاویل اس کو فرقۂ جہمیہ کی طرف منسوب کیا ہے —— فرقۂ جہمیہ کا بانی جہم بن صفوان ترمذی ہے جو امام ترمذی کا ہم وطن تھا۔ مگر وہ امام ترمذی سے بہت مقدم ہے۔ سن ۱۲۸ھ میں ایک جنگ میں مارا گیا ہے —— جہمیہ اور معتزلہ دونوں صفات باری کے منکر ہیں مگر وہ راست انکار نہیں کرتے اگر وہ ایسا کریں تو مسلمان ان کے منہ پر تھوکیں، اس لئے کہ اللہ کی صفات قرآن میں آئی ہیں ان کا کوئی انکار کیسے کرسکتا ہے؟ بلکہ وہ کہتے ہیں: صفات عینِ ذات ہیں، یعنی صفات بذاتِ خود کچھ نہیں، اس کی نظیر: غیر مقلدین اجماع کا انکار کرتے ہیں اور ناچنا نہیں آنگن ٹیڑھا کے طور پر کہتے ہیں: ہم قطعی اجماع کو مانتے ہیں، ظنی اجماع کو حجت نہیں مانتے۔ تو کیا اجماع کا تذکرہ قرآن میں ہوگا؟ اس کے قطعی ہونے کی اور کیا صورت ہے؟ اور جب اخبار آحاد جو ظنی ہیں حجت ہیں تو اجماع ظنی کیوں حجت نہیں؟ غرض جہمیہ اور معتزلہ صفات کو عین ذات کہہ کر ان کا انکار کرتے ہیں، اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر اللہ کی صفات ہونگی تو تعدد آلہہ لازم آئے گا کیونکہ جس طرح اللہ خدا ہیں، ان کی صفات بھی خدا ہونگی، پس چند خدا ہوئے جو باطل ہے۔ علاوہ ازیں اللہ کا مخلوق کے مشابہ ہونا لازم آئے گا، کیونکہ ان کا سننا، دیکھنا ہمارے سننے دیکھنے ہی کی طرح ہوگا درانحالیکہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہیں۔ ان کے ان خیالات کے جوابات علم الکلام کی کتابوں میں موجود ہیں، اور حضرت اسحاق رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اگر یوں کہا جائے کہ لَهُ يدٌ مثلُ يدِيا له يدٌ كَيَدِ تو تشبیہ ہے لیکن اگر کہا جائے: له يدٌ اور له سمعٌ تو یہ تشبیہ نہیں صرف صفات کا اثبات ہے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ سورۃ شوریٰ (آیت ۱۱) میں ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ اس آیت میں پہلے یہ قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے مانند کوئی چیز نہیں، پھر صفات سمع و بصر کو

ثابت کیا ہے۔ پس اگر اب بھی کوئی گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی طرح سمیع وبصیر ہیں تو وہ پاگل ہے اور یہی بات اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات کے تعلق سے ہے۔

آخری بات: جس طرح اللہ کی ذات کی معرفت ضروری ہے ان کی صفات کی معرفت بھی ضروری ہے۔ صفات کی معرفت کے بغیر بندوں کا کام چلنے والا نہیں۔ مثلاً اگر بندہ یہ نہ جانتا ہو کہ رزاق صرف اللہ تعالیٰ ہیں تو وہ ہر اس کو جس سے اس کی حاجت پوری ہوگی رزاق سمجھے گا، بندہ صرف اللہ کا اسی وقت ہو کر رہ سکتا ہے جب اُسے اللہ کی صفتِ رزاقیت کی معرفت ہو، اور یہی حال تمام صفات کا ہے اس لئے نبی ﷺ نے اللہ کی صفات میں سے اہم ترین ننانوے صفات امت کو تعلیم فرمائیں اور حکم دیا کہ ان کا احصاء (احاطہ) کیا جائے، ان کو یاد کیا جائے، اور ان کی حقیقتیں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، مثلاً جب بندے کو اللہ کی صفتِ رحمٰن ورحیم کی معرفت ہوگی تو وہ خود بھی مہربانی کرے گا۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ اللہ عَفُوٌّ غفورٌ ہیں تو وہ خود بھی درگذر کرے گا۔ غرض بندوں کی تربیت اور ان کے قوی ادراکیہ (دل ودماغ) پر اللہ کا پوری طرح تسلط اور غلبہ اسی وقت ہوگا جب ان کو صفاتِ الٰہیہ کی معرفت حاصل ہوگی، اس کے بغیر یہ دولت حاصل ہونا ممکن نہیں، اس لئے قرآن وحدیث نے صفاتِ الٰہیہ کے بیان کا خاص اہتمام کیا ہے اور مخلوق کے ساتھ مشابہت پیدا نہ ہو اس کے لئے قاعدہ سمجھایا ہے کہ لیس کمثله شیئ: اس کے مانند کوئی چیز نہیں یعنی ان کی صفات ان کے شایانِ شان ہیں مخلوق کی صفات جیسی نہیں۔

فائدہ: بندوں کی صفات کے لئے جو الفاظ ہیں انہی الفاظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات بیان فرمائی ہیں۔ اور ایسا بندوں کی مصلحت کے لئے کیا ہے، اس لئے کہ اگر صفاتِ خداوندی بیان کرنے کے لئے نئے الفاظ استعمال کئے جاتے تو وہ بندوں کی گرفت سے باہر رہ جاتے۔ اور صفات کا بیان ضروری تھا۔ اس لئے بندوں کی صفات کے لئے جو الفاظ تھے وہ مستعار لئے ہیں اور چونکہ ان الفاظ کا موضوع لہ بندوں کی صفات ہیں اس لئے ان لفظوں سے اللہ کی صفات کی تمام حقیقت سمجھنا ممکن نہیں۔

وقد قالَ غَيْرُ وَاحِدٍ مِنْ أَهْلِ العلمِ فى هذا الحديثِ، وما يُشْبِهُ هذا مِنَ الرِّوَايَاتِ مِنَ الصِّفَاتِ ونُزُوْلِ الرَّبِّ تبَارَكَ وتعالَى كُلَّ لَيْلَةٍ إِلى السَّمَاءِ الدُّنْيَا، قالُوْا: قَدْ ثَبَتَتِ الرِّوَايَاتُ فِىْ هٰذا، ويُؤْمَنُ بِهَا، وَلاَ يُتَوَهَّمُ وَلاَ يُقَالُ: كَيْفَ؟

هٰكَذَا رُوِيَ عن مالكِ بنِ انسٍ، وسُفيانَ بنِ عُيَيْنَةَ، وعبدِ اللّٰهِ بنِ المباركِ، أَنَّهُمْ قَالُوْا فى هذه الأحاديثِ: "أَمِرُّوْهَا بِلاَ كَيْفٍ" وهٰكَذَا قَوْلُ اهلِ العلمِ مِن اهلِ السُّنَّةِ والْجَمَاعَةِ.

وأما الجَهْمِيَّةُ فَأَنْكَرَتْ هذهِ الرِّوَايَاتِ، وقالوا: هذا تَشْبِيْهٌ، وقَدْ ذَكَرَ اللّٰهُ تبَارَكَ وتَعَالٰى فى غَيْرِ

مَوْضِعٍ مِنْ كِتَابِه الْيَدَ والسَّمْعَ وَالْبَصَرَ، فَتَأَوَّلَتِ الْجَهمِيَّةُ هذِه الآياتِ، وفَسَّرُوْهَا على غَيْرِ مَا فَسَّرَ أهلُ العلمِ، وَقَالُوْا: إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَخْلُقْ آدَمَ بِيَدِهِ، وقالوا: إِنَّمَا مَعْنَى الْيَدِ الْقُوَّةُ.

وقال إسحاقُ بنُ إبراهيمَ: إِنَّمَا يَكُوْنُ التَّشْبِيْهُ إذا قال: يَدٌ كَيَدٍ أو مِثْلُ يَدٍ، أو سَمْعٌ كَسَمْعٍ أَوْ مِثْلُ سَمْعٍ، فإذا قالَ سَمْعٌ كَسَمْعٍ أَوْ مِثْلُ سَمْعٍ، فهذا تَشْبِيهٌ، وأما إذا قال كما قالَ اللّٰهُ: يَدٌ وسَمْعٌ وبَصَرٌ، ولا يقولُ: كَيْفَ؟ ولايَقُوْلُ: مِثْلُ سَمْعٍ، ولا كَسَمْعٍ، فهذا لايَكُوْنُ تشبِيْهًا، وهُوَ كَمَا قالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وتعالى في كتابِهِ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْئٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾

ترجمہ: اور متعدد علماء نے اس حدیث کے بارے میں اور اس سے ملتی جلتی حدیثوں کے بارے میں جن میں صفات کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ کا ہر رات سمائے دنیا پر اترنا مذکور ہے، ان کے بارے میں کہا ہے کہ یہ حدیثیں ثابت ہیں (مصری نسخہ میں ثبتت ہے اور وہ زیادہ اچھا اور واضح ہے) ان پر ایمان لایا جائے، اور وہم نہ کیا جائے اور کیف سے سوال نہ کیا جائے (یعنی ان صفات کی ماہیت دریافت نہ کی جائے سلف کا یہی مذہب ہے) اسی طرح مالک وسفیان بن عیینہ اور ابن المبارک سے مروی ہے۔ وہ سب کہتے ہیں: ان احادیث کو چلاؤ کیف کے بغیر اور یہی اہل السنہ والجمعۃ کے علماء کا قول ہے ——— رہے جہمیہ تو انھوں نے ان روایتوں کا انکار کیا وہ کہتے ہیں: یہ تشبیہ ہے (یعنی اللہ کا بندوں کے مشابہ ہونا لازم آتا ہے) حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں متعدد جگہ ہاتھ، سمع اور بصر کا تذکرہ کیا ہے، پس جہمیہ نے ان آیات کی تاویل کی، اور ان کی تفسیر کی اس کے علاوہ جو علماء نے کی ہے، اور کہا: اللہ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا، اور انھوں نے کہا: ہاتھ کے معنی قوت ہی کے ہیں۔

اور اسحاق بن راہویہ نے فرمایا: تشبیہ اسی وقت ہوگی جب کہا جائے: یدٌ کَیَدٍ یا یدٌ مثلُ یدٍ (ہاتھ جیسا ہاتھ) یاسمعٌ کسمعٍ یامثل سمع (سننے جیسا سننا) پس اگر اللہ فرماتے: سمعٌ کسمعٍ یاسمعٌ مثلُ سمعٍ تو یہ تشبیہ ہوتی، مگر جب کوئی کہے جیسا اللہ نے فرمایا ہے: یدٌ، سمعٌ، بصرٌ (یعنی اللہ کے لئے یہ صفات ثابت کرے) اور نہ کہے: کیسی؟ اور نہ کہے: مثل سمع اور نہ کسمع تو یہ تشبیہ نہیں۔ اور وہ ایسا ہے جیسا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اللہ کے مانند کوئی چیز نہیں۔ اور وہ سمیع وبصیر ہیں''

بابُ ماجاءَ فی حَقِّ السَّائِلِ

سائل کے حق کا بیان

حدیث: اُمِّ بُجَیْد نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: میرے دروازے پر مسکین کھڑا ہوتا ہے اور میں اس کو دینے کے لئے اپنے پاس کچھ نہیں پاتی، یعنی ایسی صورت میں کیا حکم ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''اگر دینے کے لئے کچھ بھی نہ ہو

سوائے سینکے ہوئے کھر کے تو وہی اس کے ہاتھ میں دو"

تشریح: بکری وغیرہ کے پائے گرم پانی میں ابال کر یا آگ میں سینک کر اس کے کھر اور بال نکال دیتے ہیں پھر رکھ لیتے ہیں اور دس پندرہ دن کے بعد جب گوشت ختم ہو جاتا ہے تو ان کو کھاتے ہیں۔ یہ سینکے ہوئے کھر نہایت معمولی چیز ہیں۔ اگر سائل کو دینے کے لئے اور کچھ نہ ہو تو وہی کھر اُسے دیئے جائیں مگر خالی ہاتھ نہ لوٹایا جائے۔ مگر اس حکم سے پیشہ ور گداگر مستثنیٰ ہیں، اس کی نظیر: سلام کا جواب دینا واجب ہے، مگر فقہ میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ سائل کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں اس لئے کہ اس کا سلام بھی سوال ہے، مگر پیشہ ور فقیر کو بھی جھڑکنا نہیں چاہئے۔ دینا نہ ہو تو خوبصورت طریقہ سے ٹال دے۔ ارشاد پاک: ﴿أَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ میں وہ بھی شامل ہے۔

اور حدیث میں دوسرا حکم یہ ہے کہ خیرات احترام کے ساتھ فقیر کے ہاتھ میں دی جائے، بیٹھے ہوئے روپیہ دھیلا پھینکنا کہ لے! یہ بری بات ہے، آدمی کو سوچنا چاہئے کہ اس کا برعکس معاملہ بھی ہو سکتا ہے، سائل دوکان پر بیٹھا ہو اور آپ جھولا لئے کھڑے ہوں ایسا بھی ہو سکتا ہے، پھر جب وہ آنے دو آنے آپ کی طرف پھینکے گا تو تو آپ پر کیا گذرے گی؟!

[۲۹] بابُ ماجاء فی حق السائل

[۶۵۸-] حدثنا قُتَيبَةُ، نا اللَّيثُ، عن سعيدِ بنِ ابى سَعِيْدٍ، عن عبدِ الرحمنِ بنِ بُجَيْدٍ، عن جَدَّتِهِ أُمِّ بُجَيْدٍ، وكانتْ مِمَّنْ بَايَعَ النبيَّ صلى الله عليه وسلم، أنّها قالتْ لِرسولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم: إنَّ المِسْكِيْنَ لَيَقُوْمُ على بَابِي، فَمَا أَجِدُ لَهُ شَيْئًا أُعْطِيْهِ إِيَّاهُ، فقالَ لَهَا رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم: " إِنْ لَمْ تَجِدِيْ لَهُ شَيْئًا تُعْطِيْهِ إِيَّاهُ، إِلاَّ ظِلْفًا مُحْرَقًا، فادْفَعِيْهِ إليه فى يَدِهِ"

وفى الباب: عن عليٍّ، وحُسَيْنِ بنِ عليٍّ، وابى هريرةَ، وابى أُمَامَةَ. قال ابو عيسى: حديثُ أُمِّ بُجَيْدٍ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وضاحت: حضرت ام بجید رضی اللہ عنہا کا نام حواء اور ان کے والد کا نام زید تھا۔ وہ انصاری خاتون ہیں۔ ان کا شمار بڑے درجہ کی صحابیات میں ہے۔ کیونکہ انھوں نے نبی ﷺ کے دست مبارک پر بیعت سلوک کر رکھی تھی۔

بابُ ماجاء فی إِعْطَاءِ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ

مؤلفۃ القلوب کو زکوۃ دینے کا بیان

سورۃ التوبہ (آیت ۶۰) میں زکوۃ کے آٹھ مصارف بیان کئے گئے ہیں ان میں سے ایک مصرف مؤلفۃ القلوب

بھی ہیں۔ مُؤَلَّفة: اسم مفعول ہے اور قلوبُھم اس کا نائب فاعل ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کے دل جوڑنے گئے ہیں یہ مجاز ہے یعنی وہ لوگ جن کے دلوں کو ملی مفاد کے لئے مسلمانوں کے ساتھ جوڑنا مقصود ہے اس مقصد کی تحصیل کے لئے زکوۃ کی مد سے ان پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔

مؤلفۃ القلوب کی چھ قسمیں ہیں: دو غیر مسلموں میں سے اور چار مسلمانوں میں سے، غیر مسلموں کی دو قسمیں یہ ہیں: (۱) وہ کفار جن سے کسی خیر کی امید ہو (۲) وہ کفار جن کے شر کا اندیشہ ہو۔ کفار کی ان دونوں قسموں کو زکوۃ کی مد میں سے دینا جائز تھا۔ اور مسلمانوں کی چار قسمیں یہ ہیں: (۱) کسی مسلمان قبیلے کے سردار کو مال دینے سے اس کے نظراء کے اسلام کی طرف مائل ہونے کی امید ہو تو اس سردار کو زکوۃ سے دینا جائز تھا تاکہ اس سے متاثر ہو کر کافر قبیلوں کے سردار بھی اپنے قبیلوں کے ساتھ اسلام قبول کریں (۲) وہ نومسلم جو اسلام میں مذبذب ہے اس کو بھی زکوۃ میں سے دے سکتے ہیں تاکہ وہ اسلام میں مضبوط ہو جائے وہ اگرچہ مالدار ہو، زکوۃ میں سے اس کو دے سکتے ہیں۔ اور اگر نو مسلم غریب ہو تب تو وہ فقراء اور مساکین میں شامل ہے اور اس کو زکوۃ دینا غربت کی بنیاد پر جائز ہے (۳) اسلامی ملک کی سرحد پر رہنے والے مسلمان ان کو زکوۃ میں سے دیا جائے تاکہ وہ کفار کے ساتھ جنگ کریں (۴) قبائل اور علاقوں کے بااثر لوگوں کو بھی زکوۃ میں سے دینا جائز ہے تاکہ وہ اس طرف کی زکوتیں وصول کر کے بھیجیں یا فوج کی مدد کے لئے آدمی فراہم کریں۔

مذاہب فقہاء: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ موقوف کر دیا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو شوکت اور غلبہ عطا فرمایا ہے اس لئے اب کفار کی دلجوئی کی ضرورت نہیں۔ اب وہ خود اسلام کے محتاج ہیں ـــــــ اب امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک مؤلفۃ القلوب کی چھوں قسموں کو زکوۃ دینا جائز نہیں۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک آخری دو قسموں کو زکوۃ دینا جائز ہے اور باقی چار قسموں کے بارے میں ان کے یہاں دو قول ہیں: دینے کا بھی اور نہ دینے کا بھی۔ پھر جن دو قسموں کا تعلق کفار سے ہے ان میں دینے کا قول راجح ہے اور مسلمانوں کی دو قسموں میں نہ دینے کا قول راجح ہے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب امام ترمذی رحمہ اللہ نے وہی بیان کیا ہے جو بڑے دو اماموں کا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ وہ امام احمد کی ایک روایت ہے اور ان کا راجح قول یہ ہے کہ چھوں قسموں کو زکوۃ دینا جائز ہے۔

اور جن ائمہ کے نزدیک مؤلفۃ القلوب کا حصہ موقوف ہو گیا ہے اصح قول کے مطابق ان کے نزدیک یہ مصرف منسوخ نہیں ہوا بلکہ وہ معلول بعلت ہے، کیونکہ نبی ﷺ کے بعد نسخ نہیں ہوسکتا۔ اور علت چونکہ ضعفِ اسلام تھی اس لئے جب یہ علت ختم ہوگئی تو مصرف بھی ختم ہو گیا، لیکن اگر قیامت سے پہلے کبھی علت لوٹ آئے جیسا کہ حدیث میں ہے: بَدَأَ الإسلامُ غریبا وسیَعود کما بَدَأَ یعنی اسلام کس مپرسی کی حالت میں شروع ہوا ہے اور آئندہ اس کا

وہی حال ہوجائے گا جوشروع میں تھا۔ پس اگر اسلام دور اول کی طرح کفار کی دلجوئی کا محتاج ہوجائے تو مؤلفۃ القلوب کا حصہ دوبارہ شروع ہوجائے گا۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ نبی ﷺ نے اپنی حیات میں زکوٰۃ کی مد سے مؤلفۃ القلوب کو دیا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں کوئی روایت میرے علم میں نہیں۔ اور درحقیقت کسی روایت کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ جب یہ مصرف قرآن میں ہے تو اب کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں۔ اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے جو روایت پیش کی ہے وہ مال غنیمت کے خمس میں سے دینے کی ہے، زکوٰۃ میں سے دینے کی نہیں ہے —— جب رسول اللہ ﷺ نے حنین کی غنیمتیں جِعْرَانَة میں تقسیم کیں تو مکہ کے ان سرداروں کو جو نئے مسلمان ہوئے تھے ان کو اسلام پر جمانے کے لئے اور جو مسلمان نہیں ہوئے تھے ان کو اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے، ان کو مال کی بڑی مقدار دی، صفوان بن امیہ بھی مکہ کے انہی سرداروں میں سے تھے اور ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، آپؐ نے ان کو وقفہ وقفہ سے تین سو اونٹ دیئے چنانچہ وہ کہتے ہیں: میرے نزدیک حضور ﷺ کی ذات سے کوئی مبغوض ذات نہیں تھی لیکن جب آپؐ کی عنایات بار بار مجھ پر مبذول ہوئیں تو میرے نزدیک حضور ﷺ سے زیادہ محبوب کوئی ذات نہیں رہی۔ پس باب کی حدیث زکوٰۃ کی نظیر ہے اس طرح کہ جب غنیمت کے خمس سے مؤلفۃ القلوب کو دیا گیا تو زکوٰۃ میں سے بھی دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ دونوں کا مقصد کفار کی دلجوئی اور ملکی اور ملی مفاد ہے۔

[۳۰] بابُ ماجاء فی إعطاء المؤلّفةِ قلوبُهم

[۶۵۹-] حدثنا الحسنُ بنُ عليٍّ الخَلّالُ، نا يَحيىَ بنُ آدمَ، عنِ ابن المباركِ، عَنْ يُوْنُسَ، عن الزُّهْرِيِّ، عن سَعِيْدِ بنِ المُسَيَّبِ، عن صَفْوَانَ بنِ أُمَيَّةَ، قال: أَعْطَانِيْ رسولُ اللّه صلى الله عيه وسلم يَوْمَ حُنَيْنٍ، وإِنَّهُ لَأبْغَضُ الخَلْقِ إِلَيَّ، فَمَا زَالَ يُعْطِيْنِيْ حَتّٰى إِنَّهُ لَأَحَبُّ الخَلْقِ إِلَيَّ.

قال ابو عيسى: حدثني الحسنُ بنُ عليٍّ بهذا او شِبْهِهِ، وفي الباب: عن أبي سعيدٍ.

قال أبو عيسى: حديثُ صَفْوَانَ رَوَاهُ مَعْمَرٌ وغَيْرُهُ عن الزُّهْرِيِّ، عن سَعِيدِ بنِ المُسَيَّبِ، أَنَّ صَفْوَانَ بنَ أُمَيَّةَ قال: أَعْطَانِيْ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، وكَأَنَّ هذا الحديثَ أَصَحُّ وَأَشْبَهُ، إِنَّمَا هُوَ سَعِيْدُ بنُ المُسَيَّبِ: أَنَّ صَفْوَانَ بنَ أُمَيةَ.

وقد اخْتَلَفَ أهلُ العلمِ فى إِعْطَاءِ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ، فَرَأَى أكثرُ أهلِ العلمِ أَنْ لَا يُعْطَوْا، وقالوا: إِنَّمَا كَانوا قَوْمًا على عَهْدِ رسولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم، كان يَتَأَلَّفُهُمْ على الإِسْلَامِ حَتّٰى أَسْلَمُوْا، وَلَمْ يَرَوْا أَنْ يُعْطَوُا الْيَوْمَ مِنَ الزَّكَاةِ على مِثْلِ هذا المَعْنَى، وهو قولُ سفيانَ الثَّوْرِيِّ وأهلِ

الْکُوْفَۃِ وغَیْرِھِمْ، وبہ یقولُ أحمدُ وإسحاقُ.
وقال بَعْضُھُمْ: مَنْ کَانَ الیَوْمَ علی مِثْلِ حالِ ھٰؤُلاَءِ، ورَأی الإِمَامُ أَنْ یَتَأَلَّفَھُمْ علی الإسلامِ، فَأَعْطَاھُمْ جَازَ ذلک، وھو قَوْلُ الشَّافعیِّ.

ترجمہ اور وضاحت: صفوان بن امیہ کہتے ہیں: مجھے رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ حنین کے موقع پر دیا درانحالیکہ آپ میرے نزدیک مخلوق میں سب سے زیادہ مبغوض تھے، پس آپ برابر مجھے دیتے رہے یہاں تک کہ آپ مخلوق میں سب سے زیادہ مجھے محبوب ہوگئے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: میرے استاذ حسن بن علی خلال نے یہی یا اس کے مانند حدیث بیان کی (مصری نسخہ میں شبہہ کے بعد فی المذاکرۃ بھی ہے۔ یعنی استاذ نے یہ حدیث سبق میں بیان نہیں کی، بلکہ باہمی گفتگو میں بیان کی۔ سبق میں جو حدیث بیان کی جاتی ہے طلبہ اس کو لکھ لیتے ہیں، اور مذاکرہ میں جو بیان کی جاتی ہے وہ لکھی نہیں جاتی۔ اس لئے أو شبہہ بڑھایا)

حضرت صفوان رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کی دو سندیں ہیں۔ پہلی سند میں سعید بن المسیب حضرت صفوان سے روایت کرتے ہیں، یہ یونس بن یزید کی ابن شہاب سے روایت ہے، اور یہ اسناد صحیح نہیں۔ اور دوسری سند میں سعید بن المسیب حضرت صفوان کا واقعہ بیان کرتے ہیں ان سے روایت نہیں کرتے یہ معمر وغیرہ کی ابن شہاب سے روایت ہے اور یہ اسناد صحیح ہے یعنی حدیث مرسل ہے اس لئے کہ سعید بن المسیب کا حضرت صفوانؓ سے لقاوسماع نہیں۔

اور علماء کا مؤلفۃ القلوب کو دینے میں اختلاف ہے۔ اکثر علماء کہتے ہیں: ان کو نہیں دیا جائے گا۔ اور وہ کہتے ہیں: مؤلفۃ القلوب نبی ﷺ کے زمانہ میں ایسے لوگ تھے جن کی نبی ﷺ اسلام کے لئے تالیف قلب کیا کرتے تھے یہاں تک کہ وہ مسلمان ہوگئے اور وہ علماء آج اس علت کی وجہ سے مؤلفۃ القلوب کو دینا جائز نہیں سمجھتے۔ اور یہ سفیان ثوری اور کوفہ والوں کا قول ہے۔ اور احمد واسحاق اسی کے قائل ہیں (یہ ایک روایت ہے ان کا مذہب نہیں) اور بعض علماء کہتے ہیں: اگر آج کے احوال دور اول کے احوال کے مانند ہوں اور امام ان کے دلوں کو اسلام کے ساتھ جوڑنے میں مصلحت سمجھے اور ان کو دے تو جائز ہے اور یہ امام شافعی کا قول ہے۔

بابُ ماجاءَ فی المُتَصَدِّقِ یَرِثُ صَدَقَتَہٗ

خیرات میراث میں ملے تو لینا جائز ہے

اگر کوئی شخص کسی رشتہ دار کو زکوۃ یا نفلی خیرات دے پھر اس کا انتقال ہوجائے اور وہ چیز جو صدقہ میں دی تھی بشکل میراث واپس ملے تو اُسے لینا جائز ہے۔ اور اس کا صدقہ کا ثواب باطل نہیں ہوگا۔ اور وجہ جواز یہ ہے کہ ملکیت کے

بدلنے سے احکام بدلتے ہیں، اور یہ قاعدہ حضرت بریرۃ کی حدیث سے جو متفق علیہ ہے بنایا گیا ہے۔ ان کو صدقہ میں گوشت ملا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر بریرۃؓ اس میں سے ہمیں دے گی تو وہ ہمارے لئے ہدیہ ہوگا (مشکوۃ حدیث ۱۸۵۲) اور اس مسئلہ پر ائمہ اربعہ کا اجماع ہے۔ اور بعض غیر مقلدین عدم جواز کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں: اگر صدقہ کیا ہوا مال وارثت میں واپس ملے تو وہ مال کسی دوسرے غریب کو دینا ضروری ہے، مگر اس کی کوئی دلیل نہیں اور باب کی حدیث جمہور کی دلیل ہے۔

حدیث: حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھا کہ ایک عورت آئی، اس نے مسئلہ پوچھا: اے اللہ کے رسول! میں نے اپنی ماں کو ایک باندی خیرات دی تھی (بظاہر یہ نفلی صدقہ تھا) اب ماں کا انتقال ہوگیا (اور وارثت میں وہ باندی مجھے واپس مل رہی ہے تو کیا میں اس کو لے سکتی ہوں؟) آپؐ نے فرمایا: ''تیرا ثواب ثابت ہو چکا (یعنی صدقہ باطل نہیں ہوا) اور تجھ پر میراث نے باندی کو لوٹا دیا'' (یعنی اس کو لینا جائز ہے کیونکہ ملک بدل گئی) اس نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میری ماں پر ایک مہینے کے روزے تھے، تو کیا میں اپنی ماں کی طرف سے روزے رکھ سکتی ہوں؟ (بخاری حدیث ۱۹۵۳ میں ہے کہ وہ نذر کے روزے تھے) آپؐ نے فرمایا: ''تم اپنی ماں کی طرف سے روزے رکھو'' پھر اس نے پوچھا: یارسول اللہ! میری ماں نے حج نہیں کیا تھا تو کیا میں ان کی طرف سے حج کرسکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: ''تم اس کی طرف سے حج کرو''

تشریح: اس حدیث میں زیر بحث مسئلے کے علاوہ دو مسئلے اور بھی ہیں۔ ایک نیابت فی العبادت کا مسئلہ دوسرا: ایصال ثواب کا مسئلہ، ان کو سمجھنے کے لئے پہلے دو باتیں جاننی چاہئیں:

پہلی بات: عبادات کی تین قسمیں ہیں: بدنی محضہ جیسے نماز اور روزہ، مالی محضہ: جیسے زکوۃ، اور دونوں سے مرکب جیسے حج۔ تمام ائمہ متفق ہیں کہ عبادت بدنی میں نیابت جائز نہیں، یعنی کسی کا دوسرے کی طرف سے عبادتیں کرنا جائز نہیں، نہ حالت اختیار (زندگی) میں اور نہ حالت اضطرار (مرنے کے بعد) میں، ہر شخص کو عبادت بدنیہ خود کرنی ہے، اس لئے کہ اس میں مقصود اتعابِ نفس (اپنے آپ کو تھکانا) ہے، جو دوسرے کے عبادت کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور عبادات مالیہ میں نیابت جائز ہے، زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔ کیونکہ اس میں مقصود غریب تک مال پہنچانا ہے۔ خواہ آدمی خود پہنچائے یا نائب کے ذریعہ پہنچائے دونوں یکساں ہیں، اور جو عبادت بدن اور مال سے مرکب ہے اور ایسی عبادت صرف حج ہے، اس میں حالتِ اضطرار میں نیابت جائز ہے اور حالتِ اختیار میں جائز نہیں، یعنی اگر آدمی خود حج کرسکتا ہے تو حج بدل نہیں کراسکتا، اور بڑھاپے کی وجہ سے یا لنگڑا، لولا، اندھا اور اپاہج ہونے کی وجہ سے خود حج نہیں کرسکتا یا وہ مرگیا ہے تو اس کا حج بدل کرنا جائز ہے۔

دوسری بات: اگر میت پر حج فرض تھا اور اس نے حج بدل کی وصیت کی ہے اور تہائی ترکہ سے حج بدل کیا جاسکتا

ہے یا سب ورثاء عاقل بالغ ہیں اور وہ برضاء ورغبت تہائی ترکہ سے زیادہ سے حج بدل کرنے کی اجازت دیتے ہیں تو زیادہ سے بھی کیا جاسکتا ہے اور یہ حج بدل میت کے حساب میں لے لیا جائے گا گویا اس نے خود حج کیا۔ اور اگر میت نے وصیت نہیں کی یا تہائی ترکہ حج بدل کے لئے کافی نہیں اور ورثاء تہائی سے زیادہ سے حج بدل کرنے کی اجازت نہیں دیتے اور کوئی اس کی طرف سے اپنے پیسے سے حج بدل کرے تو اللہ کے فضل سے امید باندھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو میت کے حساب میں لے لیں گے مگر یقین سے یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ وہ حج میت کے حساب میں شمار کرلیا جائیگا۔ اور یہی مسئلہ دیگر عبادات کے لئے بھی ہے خواہ وہ بدنی عبادت ہو یا مالی۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ اس باب میں جو دو مسئلے اور آئے ہیں ان میں سے دوسرے مسئلہ میں یعنی حج بدل کے مسئلہ میں اجماع ہے کہ حج بدل کرنا جائز ہے۔ اور اس کو نیابت فی العبادت کا مسئلہ بھی کہہ سکتے ہیں اور ایصالِ ثواب کا مسئلہ بھی۔ سائلہ کی ماں پر اگر حج فرض تھا اور اس نے حج بدل کی وصیت کی تھی تو وہ نیابت کا مسئلہ ہے، اور اگر حج فرض نہیں تھا یا اس نے وصیت نہیں کی تھی تو وہ ایصالِ ثواب کا مسئلہ ہے۔

اور ایصالِ ثواب کے فی الجملہ سب ائمہ قائل ہیں، پھر اس کی تفصیل میں اختلاف ہے۔ حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک ہر عبادت کا ایصالِ ثواب جائز ہے چاہے وہ عبادت بدنیہ ہو یا مالیہ یا دونوں سے مرکب۔ اور شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک عباداتِ مالیہ اور عباداتِ مرکبہ یعنی حج کا ایصالِ ثواب تو جائز ہے مگر عبادت بدنیہ کا ایصالِ ثواب جائز نہیں، اور غیر مقلدین بھی اسی کے قائل ہیں۔ مگر اب شوافع اور مالکیہ عبادت بدنیہ کے ایصالِ ثواب کے جواز کا فتوی دیتے ہیں اور میت کے لئے قرآن خوانی وغیرہ کرتے ہیں۔ پس مسئلہ باب میں اب صرف غیر مقلدین کا اختلاف رہ گیا۔

اور پہلے مسئلے میں یعنی فرض روزوں میں نیابت کے عدم جواز پر اجماع ہے مگر نذر کے روزوں میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نذر کے روزوں میں نیابت جائز ہے۔ اور ان کی دلیل باب کی حدیث ہے۔ بخاری (حدیث ۱۹۵۳) میں صراحت ہے کہ سائلہ نے نذر کے روزوں کا مسئلہ پوچھا تھا، اور دیگر ائمہ کے نزدیک نذر کے روزوں میں بھی نیابت جائز نہیں۔ اور ان کے نزدیک حدیث باب میں ایصالِ ثواب کے مسئلہ سے تمسک ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے سائلہ کو ایصالِ ثواب کے مسئلہ کا سہارا لینے کا امر فرمایا ہے یعنی تیری ماں پر جتنے روزے ہیں اتنے نفل روزے رکھ کر ایصالِ ثواب کر اور اللہ تعالیٰ سے امید باندھ کہ وہ ان روزوں کو میت کے حساب میں لے لیں، جس طرح میت پر حج فرض ہوتا ہے اور اس نے وصیت نہیں کی اور کوئی اس کی طرف سے حج کرلے تو امید باندھی جاتی ہے کہ وہ حج اس کے حساب میں لے لیا جائے گا۔

اور جمہور کی دلیل تین حدیثیں ہیں:

پہلی حدیث: ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: لایُصَلِّیْ احدٌ عن احدٍ، ولا یَصوم احدٌ عن احدٍ،

ولکن یُطْعِمُ عنه مکانَ کلِّ یومٍ مداً من حنطة (کوئی کسی کی طرف سے نماز نہ پڑھے اور کوئی کسی کی طرف سے روزے نہ رکھے، بلکہ اس کی طرف سے ہر دن کے بدلے گیہوں کا ایک مد خیرات کرے) اس میں صراحت ہے کہ نماز اور روزوں میں نیابت جائز نہیں۔ البتہ روزوں اور نماز کا فدیہ ادا کرسکتا ہے۔ یہ حدیث نسائی کی سنن کبری میں ہے اور علی شرط الشیخین ہے (نصب الرایہ۲: ۴۶۳)

دوسری حدیث: عمرۃ بنت عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ میری ماں کی وفات ہوگئی ہے اور رمضان کے روزے ان کے ذمہ باقی ہیں، کیا میں ان کی طرف سے وہ روزے رکھ سکتی ہوں؟ حضرت عائشہ نے نفی میں جواب دیا اور فدیہ دینے کا حکم دیا۔ یہ حدیث طحاوی کی مشکل الآثار میں ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ علامہ عینی نے عمدۃ القاری باب من مات وعلیه صومٌ میں یہ حدیث نقل کی ہے۔

تیسری حدیث: ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جس شخص کا انتقال ہوگیا درانحالیکہ اس پر روزے باقی ہیں تو ہر روزے کے بدلے میں ایک مسکین کو کھانا کھلائے، اس حدیث کے مرفوع اور موقوف ہونے میں اختلاف ہے اور یہ آگے باب ماجاء فی الکفارۃ میں آرہی ہے ـــــ یہ سب روایات اگرچہ موقوف ہیں لیکن غیر مدرک بالعقل ہیں اس لئے حکماً مرفوع ہیں۔

[۳۱] بابُ ماجاء فی المتصدِّقِ یَرِثُ صَدَقَتَه

[۶۶۰-] حدثنا عليُّ بنُ حُجْرٍ، نا عليُّ بنُ مُسْهِرٍ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ عَطَاءٍ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ بُرَیْدَةَ، عن أبیه، قال: کُنْتُ جَالِسًا عند النبیِّ صلی الله علیه وسلم إذ أَتَتْهُ امْرَأَۃٌ، فقالتْ: یارسولَ اللّٰهِ! إِنِّیْ کُنْتُ تَصَدَّقْتُ علی أُمِّی بِجَارِیَةٍ وإِنَّهَامَاتَتْ قال: "وَجَبَ أَجْرُكِ، وَرَدَّهَا عَلَیْكِ المِیراثُ" قالتْ: یارسولَ اللّٰهِ! کانَ عَلَیْهَا صَوْمُ شَهْرٍ أَفَأَصُوْمُ عَنْهَا؟ قال: "صُوْمِیْ عَنْهَا" قالت: یارسولَ اللّٰهِ! إِنَّهَا لَمْ تَحُجَّ قَطُّ أَفَأَحُجُّ عَنْهَا؟ قال: "نَعَمْ حُجِّیْ عَنْهَا"

قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ، لَا یُعْرَفُ مِن حدیثِ بُرَیْدَةَ إِلَّا مِنْ هٰذا الوَجْهِ، وعبدُ اللّٰهِ بنُ عَطَاءٍ ثِقَةٌ عِنْدَ أهلِ الحدیثِ.

والعَمَلُ علی هذا عِنْدَ أکثرِ أهلِ العلمِ: أَنَّ الرَّجُلَ إِذَا تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ ثم وَرِثَهَا حَلَّتْ لَهُ.

وقال بعضُهم: إِنَّمَا الصَّدَقَةُ شَیْئٌ جَعَلَهَا لِلّٰهِ، فَإِذَا وَرِثَهَا فَیَجِبُ أَنْ یَصْرِفَهَا فی مِثْلِهِ.

وَرَوَی سُفیانُ الثَّوْرِیُّ، وزُهَیْرُ بنُ مُعَاوِیَةَ هذا الحدیثَ عن عبدِ اللّٰهِ بنِ عَطَاءٍ.

ترجمہ: اس حدیث پر اکثر علماء کا عمل ہے کہ جب آدمی کوئی خیرات کرے پھر وہ اس کا وارث بنے تو وہ مال اس

کے لئے حلال ہے اور بعض علماء کہتے ہیں: صدقہ ایک ایسی چیز ہے جس کو آدمی نے اللہ کے لئے کر دیا ہے پس جب وہ اس کا وارث بنے تو اس پر اس کے مانند جگہ میں خرچ کرنا واجب ہے (یعنی کسی دوسرے مستحق کو دینا ضروری ہے خود رکھنا جائز نہیں) اور مذکورہ حدیث کو علی بن مُسہر کے علاوہ سفیان ثوری اور زہیر بن معاویہ بھی عبداللہ بن عطاء سے روایت کرتے ہیں اور ان سے اوپر بھی ایک سند ہے، مگر روایت اعلی درجہ کی ہے، کیونکہ عبداللہ بن عطاء ثقہ ہیں اور باقی راوی بھی معروف ہیں۔

بابُ ماجاءَ في كَرَاهِيَةِ العَوْدِ في الصَّدَقَةِ

صدقہ کر کے واپس لینا جائز نہیں

آگے کتاب الہبۃ میں یہ بات آئے گی کہ اگر سات موانع میں سے کوئی مانع ہو تو ہبہ کی ہوئی چیز واپس نہیں لے سکتے۔ ان میں سے ایک مانع یہ ہے کہ ہبہ کا عوض لے لیا جائے مثلاً کتاب ہدیہ دی اور قلم عوض میں لے لیا تو اب رجوع نہیں ہوسکتا اور صدقہ بھی ہبہ ہے، جب اس کا تحقق ہو گیا تو عوض یعنی ثواب مل گیا، پس صدقہ میں رجوع نہیں ہوسکتا۔

حدیث: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک صحابی کو ایک گھوڑا صدقہ یا ہبہ دیا تا کہ وہ اس پر سوار ہو کر اللہ کے راستہ میں جہاد کرے، اس صحابی کو ضرورت پیش آئی اور وہ اس گھوڑے کو فروخت کرنے کے لئے بازار میں لائے، جب حضرت عمرؓ نے اپنا گھوڑا بکتا دیکھا تو چونکہ وہ گھوڑا ان کو بہت پسند تھا اس لئے اُسے خریدنے کا ارادہ کیا، مگر خیال آیا کہ پہلے رسول اللہ ﷺ سے معلوم کرلوں کہ میرے لئے خریدنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ انھوں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اپنے صدقہ کو واپس مت لو''

تشریح: یہاں اگر کوئی سوال کرے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ واپس کہاں لینا چاہتے تھے وہ تو خریدنا چاہتے تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر حضرت عمرؓ خریدیں گے تو وہ صحابی محابات (بہت زیادہ رعایت) کریں گے۔ یہ محابات ایک طرح سے صدقہ کے کچھ حصہ میں رجوع ہے اگرچہ حقیقتاً رجوع نہیں۔ نبی ﷺ نے اس کو بھی پسند نہیں کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی چیز خیرات کی جائے تو اپنا دل اس سے ہٹا لیا جائے۔ اگر صدقہ کے بعد بھی استشراف نفس باقی رہے تو صدقہ کامل نہیں۔

مسئلہ: ہدیہ یا صدقہ دی ہوئی چیز کو دوسرا شخص جو قیمت دے رہا ہے اس قیمت پر خریدنا جائز ہے اور اگر بیع میں محابات ہو تو مکروہ ہے۔

[۳۲] بابُ ماجاء فی کراهیة العَوْدِ فی الصدقة

[٦٦١-] حدثنا هارونُ بنُ إسحاق الهَمْدَانِیُّ، نا عبدُ الرزَّاقِ، عن مَعْمَرٍ، عن الزُّهْرِیِّ، عن سَالِمٍ، عن ابنِ عُمَرَ، عن عُمَرَ: أَنَّهُ حَمَلَ علی فَرَسٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، ثم رَآهَا تُبَاعُ، فَأَرَادَ أَنْ یَشْتَرِیَهَا، فقال النبیُّ صلی اللّٰه عیه وسلم: " لاتَعُدْ فی صَدَقَتِكَ"

قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ صحیحٌ، والعملُ علی هذا عندَ أکثرِ أهلِ العلمِ.

فائدہ: اگر صدقہ یا ہدیہ کسی شرط کے ساتھ مقید ہو تو وہ شرط کالعدم ہے۔ حضرت عمرؓ نے اگرچہ اپنے صدقہ میں جہاد فی سبیل اللہ کی شرط لگائی تھی مگر چونکہ وہ شرط غیر معتبر تھی اس لئے اس صحابی کے لئے گھوڑا فروخت کرنا جائز تھا۔

بابُ ماجاء فی الصَّدَقَةِ عن المَیِّتِ

میت کی طرف سے صدقہ کرنے کا بیان

تمام علماء متفق ہیں کہ عبادتِ مالیہ کا ثواب میت کو بخشنا جائز ہے۔ اور عبادتِ بدنیہ کے ایصالِ ثواب میں اختلاف ہے۔ حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک جائز ہے اور مالکیہ اور شافعیہ اور اصحاب ظواہر کے نزدیک جائز نہیں۔ تفصیل گذشتہ سے پیوستہ باب میں گذر چکی ہے۔ اور عبادتِ مالیہ کے ایصالِ ثواب میں اتفاق اس لئے ہے کہ صحیح روایت موجود ہے، غزوۂ تبوک کے موقع پر قبیلۂ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہ کی والدہ کا ان کی عدم موجودگی میں انتقال ہوا ان کو اپنی والدہ سے بہت محبت تھی۔ ان کی دلجوئی کے لئے نبی ﷺ نے ایک مہینہ کے بعد ان کی والدہ کی قبر پر نماز جنازہ پڑھی ہے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اگر میری والدہ کو موت کا پہلے سے احساس ہوتا تو وہ ضرور اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرتیں، مگر ان کا اچانک انتقال ہوگیا پس کیا میں ان کی طرف سے صدقہ کرسکتا ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: "ہاں، تمہاری خیرات کا ثواب تمہاری والدہ کو پہنچے گا" چنانچہ انھوں نے سو غلام آزاد کئے اور ایک باغ اللہ کے راستہ میں دیا۔

حنفیہ اور حنابلہ نے اس حدیث سے قاعدہ کلیہ بنایا کہ ہر وہ عمل جس کا ثواب ملے عامل اس ثواب کو خود بھی رکھ سکتا ہے اور کسی زندہ یا مردہ کو بخش بھی سکتا ہے۔ اس قاعدے کے عموم میں عباداتِ بدنیہ بھی داخل ہیں، اس لئے عباداتِ بدنیہ کا ایصالِ ثواب بھی درست ہے۔ اور امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ نے اگرچہ اس حدیث کو جزئی واقعہ قرار دیا ہے اور عباداتِ بدنیہ کو اس پر قیاس نہیں کیا مگر ان کے متبعین نے حکم عام کردیا ہے۔ وہ عباداتِ مالیہ اور عباداتِ بدنیہ ہر ایک کے ایصالِ ثواب کے قائل ہیں۔ رہ گئے اصحاب ظواہر (غیر مقلدین) تو انھوں نے حدیث کو

جزئی ہی باقی رکھا ہے۔ ان کے نزدیک عبادات بدنیہ کا ایصال ثواب جائز نہیں، اور ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر عبادات بدنیہ کا ایصال ثواب بھی جائز ہوتا تو نبی ﷺ اُسے ضرور بیان فرماتے۔ مگر ان کی یہ بات صحیح نہیں، کیونکہ اگر نبی ﷺ نے ابتداءً مسئلہ بیان کیا ہوتا تو ان کی بات صحیح تھی جبکہ صورت حال یہ ہے کہ آپؐ نے ابتداءً یہ مسئلہ بیان نہیں کیا بلکہ سائل کے سوال کا جواب دیا ہے، اگر وہی سائل یا کوئی دوسرا شخص عبادات بدنیہ کے بارے میں پوچھتا تو آپؐ اس کے بارے میں بھی مسئلہ بتاتے مگر جب کسی نے پوچھا نہیں تو آپؐ کیوں بیان فرماتے؟! جو پوچھا اس کا جواب دیا۔ اب یہ فقہاء کی ذمہ داری ہے کہ وہ غور کریں کہ آپ کا یہ ارشاد جو عبادت مالیہ کے تعلق سے ہے کلی ہے یا جزئی؟ اور اس پر عبادات بدنیہ کو قیاس کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ چنانچہ حنفیہ اور حنابلہ نے اس پر عبادات بدنیہ کو قیاس کیا، اور امام شافعی اور امام مالک نے قیاس نہیں کیا۔ مگر ان کے مقلدین نے حدیث کو کلی بنایا۔ اور حدیث کو کلی بنانا ہی قرین صواب ہے اس لئے کہ اگر عبادات بدنیہ کو اس پر قیاس نہیں کریں گے تو دونوں کے درمیان فرق بیان کرنا مشکل ہوگا۔ سوال ہوگا کہ جب عبادات مالیہ اور بدنیہ دونوں میں ثواب ملتا ہے تو پھر صرف عبادت مالیہ ہی کا ایصال ثواب کیوں درست ہے اور عبادت بدنیہ کا ایصال ثواب کیوں درست نہیں؟ اس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اور نیابت کے مسئلہ میں جو فرق ہے اس کا معقول جواب ہے کہ عبادات بدنیہ میں اتعاب نفس مقصود ہے پس وہاں نیابت جائز نہیں، اور عبادات مالیہ میں غریب تک پاس مال پہنچانا مقصود ہے خواہ مالک خود پہنچائے یا کوئی دوسرا پہنچائے اس لئے نیابت جائز ہے۔

[۳۳] بابُ ماجاء فی الصدقة عن المیّت

[۶۶۲-] حدثنا احمدُ بنُ مَنِیعٍ، نا رَوْحُ بنُ عُبَادَةَ، نا زَکَرِیَّا بنُ إسحاق، قال: حدثنی عَمْرُو بنُ دِینَارٍ، عن عِکْرِمَةَ، عن ابنِ عباسٍ: أَنَّ رَجُلاً قال: یارسولَ اللّٰهِ! إِنَّ أُمِّیْ تُوُفِّیَتْ، أَفَیَنْفَعُهَا إِنْ تَصَدَّقْتُ عنها؟ قال: "نَعَمْ" قال: فإنَّ لی مَخرَفًا، فَأُشْهِدُكَ أَنِّیْ قد تَصَدَّقْتُ بِهِ عَنْهَا.

قال أبو عیسی: هذا حدیثٌ حسنٌ، وبه یقولُ أهلُ العلمِ، یَقُوْلُوْنَ: لَیْسَ شیئٌ یَصِلُ إلی المَیِّتِ إلَّا الصَّدَقَةَ وَالدُّعَاءَ.

وقد رَوَی بَعْضُهُمْ هذا الحدیثَ عن عَمْرِو بنِ دِینَارٍ، عن عِکْرِمَةَ، عن النبیِّ صلی اللہ علیه وسلم مُرْسَلاً، ومَعْنَی قَوْلِهِ: إنَّ لِیْ مَخرَفًا یعنی بُسْتَانًا.

ترجمہ: ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے (سعد بن عبادۃ نے) کہا: اے اللہ کے رسول! بیشک میری امی کا انتقال ہوگیا تو کیا ان کو فائدہ پہنچے گا اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں'' پس اس آدمی

نے کہا: بیشک میرے پاس ایک باغ ہے میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے وہ باغ اپنی ماں کی طرف سے صدقہ کیا۔
یہ حدیث حسن ہے اور علماء اس کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں: کوئی چیز نہیں ہے جس کا ثواب میت کو پہنچتا ہو علاوہ صدقہ اور دعا کے (ان دو کے ایصالِ ثواب میں اتفاق ہے) عمرو بن دینار کے بعض تلامذہ اس حدیث کو مرسل روایت کرتے ہیں یعنی وہ آخر میں ابن عباس کا ذکر نہیں کرتے، اور مخرف کے معنی باغ کے ہیں۔

فائدہ: صدقہ کے بارے میں تو یہی حدیث ہے اور دعا کے نافع ہونے کے سلسلہ میں مشہور حدیث ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہوجاتے ہیں، مگر تین عملوں کا ثواب جاری رہتا ہے۔ ان میں سے ایک نیک اولاد کی دعائیں ہیں۔ اس روایت سے بھی استدلال کیا گیا ہے کہ عبادت بدنیہ کا ــــ دعا کے علاوہ ــــ ثواب نہیں پہنچتا، مگر اول تو یہ مفہوم مخالف سے استدلال ہے جو حجت نہیں، ثانیاً: اس روایت میں ہے: انقطع عنه عمله یعنی میت کے اعمال علاوہ تین کے منقطع ہوجاتے ہیں اور ایصالِ ثواب کا عمل میت کا نہیں ہے، بلکہ وہ دوسرے کا عمل ہے، پس اس حدیث کا ایصالِ ثواب کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔

بابُ ماجاء فی نَفَقَةِ الْمَرْأَةِ مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا

شوہر کے گھر سے خرچ کرنے کا بیان

وہ چیزیں جن کو خرچ کرنے کی صراحۃً یا دلالۃً یا عرفاً اجازت ہے، عورت شوہر کے مال میں سے ان چیزوں کو خرچ کرسکتی ہے اور جن چیزوں کو خرچ کرنے کی اجازت نہیں ان کو خرچ کرنا جائز نہیں۔ دروازہ پر سائل کھڑا ہے اس کو روپیہ دو روپیہ دینا یا تھوڑا آٹا دینا لوگوں کا عرف ہے یا عورت نے شوہر کی موجودگی میں سائل کو دو چار روپے دیئے وہ دیکھ رہا ہے اور کچھ بولا نہیں تو یہ دلالۃً اجازت ہے۔ اور اگر خود شوہر سائل کو دینے کے لئے کہے تو یہ صراحۃً اجازت ہے، البتہ مدرسہ اور مسجد کے چندے میں پچاس روپے دینا جائز نہیں کیونکہ اس کا عرف نہیں۔ البتہ اگر کسی خاص گھر میں شوہر نے صراحۃً اجازت دے رکھی ہو تو جائز ہے۔ اور یہی حکم خازن (منیجر، سکریڑی) کا ہے۔

اس کے بعد جاننا چاہئے کہ جب عورت شوہر کے مال میں سے خرچ کرے گی تو ثواب اس کو بھی ملے گا۔ بلکہ خازن کو بھی اگر صراحۃً یا دلالۃً یا عرفاً اجازت ہو اور وہ خرچ کرے تو اس کو بھی ثواب ملے گا۔ البتہ سب کا ثواب برابر ہونا ضروری نہیں، ثواب میں کمی بیشی ہوسکتی ہے، ثواب کا مدار نیت پر ہے جس کی جیسی نیت ویسا ثواب!

حدیث (۱): حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ نے فرمایا: ''کوئی عورت اپنے شوہر کے مال میں سے کچھ خرچ نہ کرے مگر شوہر کی اجازت سے'' پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! عورت کھانا (غلہ) بھی شوہر کی اجازت کے بغیر خرچ نہیں کرسکتی؟ آپ نے فرمایا: ''وہ تو ہمارے گھروں کے اصل اموال ہیں'' یعنی گھروں میں عام طور پر کھانے پینے کی

چیزیں ہی ہوتی ہیں، روپیہ پیسہ گھروں میں کہاں ہوتا ہے؟ یعنی کھانا بھی اجازت کے بغیر نہیں دے سکتی۔ البتہ اجازت کبھی صراحۃً ہوتی ہے کبھی دلالۃً اور کبھی عرفاً۔ اگر کسی بھی طرح اجازت ہو تو خرچ کر سکتی ہے ورنہ نہیں۔

حدیث (۲): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب عورت نے شوہر کے مال میں سے صدقہ کیا تو عورت کے لئے بھی خرچ کرنے کا ثواب ہے اور شوہر کے لئے بھی اس کے مانند ہے (مثل کے مفہوم میں ثواب کا برابر ہونا داخل نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح عورت کو ثواب ملے گا کیونکہ اس نے خرچ کیا اسی طرح شوہر کو بھی ثواب ملے گا کیونکہ وہ اس کا مال ہے) اور خازن کے لئے بھی اس کے مانند ہے یعنی سیٹھ کو جس طرح ثواب ملتا ہے منیجر کو بھی ملتا ہے۔ اور اس میں کوئی اپنے ساتھی کے ثواب میں سے کچھ کم نہیں کرتا (یعنی کسی کے ثواب میں سے کٹوتی کر کے دوسرے کو نہیں دیا جاتا، بلکہ ہر ایک کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ثواب عنایت فرماتے ہیں)

تشریح: عورت اور خازن اگر چاہیں تو ہزار بہانے کر کے سائل کو ٹلا سکتے ہیں، مگر انھوں نے سائل کو ٹلانے کے بجائے ان پر خرچ کیا اس لئے وہ بھی ثواب کے مستحق ہونگے۔ مگر ان کو ثواب اس وقت ملتا ہے جب وہ خوش دلی سے خرچ کریں۔ قصہ مشہور ہے کہ ابن المبارک رحمہ اللہ کا بہت بڑا کاروبار تھا اور وہ بڑے فیاض تھے، جب ان کے پاس کوئی ضرورت مند آتا تو وہ منیجر کو لکھ دیتے کہ اس کو اتنا دیدو۔ ایک مرتبہ حضرت نے کسی کے لئے بہت بڑی رقم لکھ دی، منیجر نے بذریعہ تحریر حضرت سے عرض کیا کہ اگر آپ اس طرح مال لٹاتے رہیں گے تو میں کاروبار کیسے چلاؤں گا؟ حضرت نے اس تحریر کے نیچے لکھا: دوکان میری ہے یا آپ کی؟ منیجر نے مجبوراً وہ رقم دی، یہاں چونکہ خازن نے مجبوراً دی اس لئے اس کا ثواب گیا، منیجر کو ثواب اسی صورت میں ملتا ہے جب وہ برضاء ورغبت دے۔

حدیث (۳): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب عورت نے اپنے شوہر کے گھر سے خوش دلی کے ساتھ خرچ کیا درانحالیکہ وہ شوہر کے گھر کو بگاڑنے والی نہ ہو تو عورت کے لئے بھی شوہر کی طرح ثواب ہے، اس کے حُسن نیت کی وجہ سے، اور خازن کے لئے بھی سیٹھ کی طرح ثواب ہے“

وضاحت: اس حدیث کو ابو وائل سے عمرو بن مرّۃ بھی روایت کرتے ہیں مگر وہ ان کے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان مسروق کا واسطہ ذکر نہیں کرتے، اور منصور: مسروق کا واسطہ ذکر کرتے ہیں۔ پس یہ سند نازل ہوگئی اس لئے کہ اس میں ایک واسطہ بڑھ گیا اس لئے امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسی کو اصح قرار دیا۔

[۳۴] بابُ ماجاء فی نفقة المرأةِ من بيت زوجها

[۶۶۳-] حدثنا هَنَّادٌ، نا إسماعيلُ بنُ عَيَّاشٍ، نَا شُرَحْبِيلُ بنُ مُسْلِمٍ الخَوْلَانِيُّ، عن أبي أُمَامَةَ البَاهِلِيِّ، قال: سَمِعْتُ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم يقولُ في خُطْبَتِهِ عَامَ حَجَّةِ الوَدَاعِ: "لَا

تُنْفِقِ امْرَأَةٌ شَيْئًا مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا إِلاَّ بِإِذْنِ زَوْجِهَا" قيل: يارسولَ اللهِ! وَلاَ الطَّعَامَ؟ قال:" ذلكَ أَفْضَلُ أَمْوَالِنَا"

وفى الباب: عن سَعْدِ بنِ أبى وقاصٍ، وأَسْمَاءَ ابْنَةِ أبى بَكْرٍ، وأبى هريرةَ وعبدِ اللهِ بنِ عَمْرٍو، وعائشةَ. قال أبو عيسى: حديثُ أبى أُمَامَةَ حديثٌ حسنٌ.

[٦٦٤-]حدثنا محمدُ بنُ المُثَنّى، نامحمدُ بنُ جَعْفَرٍ، نا شُعْبَةُ، عن عَمْرِو بنِ مُرَّةَ، قال: سَمِعْتُ أَبَا وَائِلٍ، يُحَدِّثُ عن عَائِشَةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم أَنَّهُ قال:" إِذَا تَصَدَّقَتِ المَرْأَةُ مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا كانَ لَهَا بِهِ أَجْرٌ، وللزوجِ مِثْلُ ذلكَ، وللخازِنِ مَثْلُ ذلكَ، وَلاَ يَنْقُصُ كُلُّ واحِدٍ مِنْهُمْ مِنْ أَجْرِ صَاحِبِهِ شَيْئًا، لَهُ بما كَسَبَ، ولَهَا بِمَا أَنْفَقَتْ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ.

[٦٦٥-]حدثنا محمودُ بن غيلانَ، نا المُؤَمَّلُ، عن سُفيانَ، عن مَنْصُورٍ، عن أبى وائلٍ، عن مَسْرُوْقٍ، عن عائشةَ، قالتْ: قال رسولُ اللهِ صلى الله عليه وسلم:" إِذَا أَعْطَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ بَيْتِ زَوْجِهَا بِطِيْبِ نَفْسٍ غَيْرَ مُفْسِدَةٍ، فَإِنَّ لَهَا مِثْلُ أَجْرِهِ، لَهَا مَا نَوَتْ حَسَنًا، وللخازِنِ مِثْلُ ذلكَ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وهو أصحُّ مِنْ حديثِ عَمْرِو بنِ مُرَّةَ، عن أبى وَائِلٍ، وعَمْرُو بنُ مُرَّةَ لاَ يَذْكُرُ فِي حديثِهِ عن مَسْرُوْقٍ.

نوٹ: حدیث (٦٦٤) اور حدیث (٦٦٥) ایک ہیں۔

بابُ ماجاءَ فی صَدَقَةِ الفِطْرِ

صدقہ فطر کا بیان

اس باب میں پانچ مسئلے سمجھنے چاہئیں:

پہلا مسئلہ: حنفیہ کے نزدیک صدقۂ فطر واجب ہے، اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک فرض ہے۔ فرض اور واجب میں عمل کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ عقیدہ کے اعتبار سے فرق ہے۔ فرض کا اعتقاد ضروری ہے، اگر کوئی اس کا انکار کرے تو وہ کافر ہے اور واجب پر عمل تو فرض ہی کی طرح ضروری ہے، مگر اعتقاد ضروری نہیں کوئی اس کے وجوب کا انکار کرے تو وہ گمراہ ہے کافر نہیں۔

اور یہ اختلاف اصولی ہے چونکہ ائمہ ثلاثہ اعلیٰ درجہ کی خبر واحد سے فرضیت ثابت کرتے ہیں اور باب میں حسنٌ

صحیح روایات موجود ہیں اس لئے وہ صدقۃ الفطر کی فرضیت کے قائل ہیں، اور حنفیہ کے نزدیک خبر واحد سے اگرچہ وہ اعلی درجہ کی صحیح ہو فرضیت ثابت نہیں ہوسکتی، زیادہ سے زیادہ وجوب ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ اخبارِ آحاد مفید ظن ہیں اس لئے انھوں نے صدقۃ الفطر کے وجوب کا قول کیا ہے، غرض یہ اصول کا اختلاف ہے دلائل کا اختلاف نہیں۔

دوسرا مسئلہ: ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ہر غلہ کا خواہ وہ منصوص ہو یا غیر منصوص یعنی حدیثوں میں اس کا ذکر آیا ہو یا نہ آیا ہو: صدقۃ الفطر ایک صاع ہے اور احناف کے نزدیک گیہوں اور کشمش میں راجح قول کے مطابق نصف صاع ہے اور باقی غلوں میں ایک صاع ہے اور کشمش میں احناف کا دوسرا قول ایک صاع کا بھی ہے مگر وہ قول شاذ ہے۔ اور غیر منصوص غلوں میں جیسے چاول، چنے وغیرہ میں نصف صاع گیہوں کی قیمت یا دوسرے غلوں کے ایک صاع کی قیمت کے برابر واجب ہے، اور یہ دلائل کا اختلاف ہے۔ تفصیل حدیث کے بعد آئے گی۔

تیسرا مسئلہ: احناف کے نزدیک یکم شوال کی صبح صادق کے وقت صدقۃ الفطر واجب ہوتا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک رمضان کی آخری تاریخ کے سورج غروب ہونے کے وقت واجب ہوتا ہے۔ اور ثمرۂ اختلاف دو صورتوں میں ظاہر ہوگا۔ ایک: جو بچہ عید کی رات میں پیدا ہوا امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا فطرہ واجب نہیں، کیونکہ وجوب اداء یعنی غروب شمس کے وقت وہ دنیا میں نہیں تھا۔ اور احناف کے نزدیک وجوب ادا کا وقت صبح صادق ہے پس اس کا فطرۃ واجب ہے۔ دوسری صورت: جو شخص عید کی رات میں مرگیا امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس کا فطرہ واجب ہے کیونکہ وجوب ادا کے وقت وہ موجود تھا۔ اور حنفیہ کے نزدیک واجب نہیں۔ کیونکہ وہ وقت وجوب سے پہلے مرگیا۔ اور اگر بچہ رات میں پیدا ہوا اور رات ہی میں مرگیا تو کسی کے نزدیک اس کا فطرہ واجب نہیں۔ اور یہ اختلاف لفظ ''فطر'' کے معنی کی تعیین کی وجہ سے ہوا ہے یعنی یہ نص فہمی کا اختلاف ہے۔

صدقۃ الفطر: میں مسبب کی سبب کی طرف اضافت ہے، یعنی یہ صدقہ: فطر کی وجہ سے واجب ہوتا ہے۔ اس ''فطر'' کے کیا معنی ہیں؟ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس فطر کے بھی وہی معنی ہیں جو ہر دن فطر کے ہیں یعنی روزہ کھولنا یعنی رمضان کی آخری تاریخ کا روزہ کھولنا۔ پس جب سورج غروب ہوگا تو فطرہ واجب ہوگا کیونکہ آخری روزہ اسی وقت کھلتا ہے۔ اور امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس طرح روزہ تو رمضان کے ہر دن میں کھلتا ہے پس ہر دن فطرہ واجب ہونا چاہئے بلکہ یہاں ''فطر'' کے دوسرے معنی ہیں یعنی روزہ نہ ہونا۔ عید الفطر کے دن روزہ حرام ہے یہ فطر مراد ہے اور اسی کی خوشی میں فطرہ واجب ہے۔

چوتھا مسئلہ: احناف کے نزدیک صدقۂ فطر واجب ہونے کے لئے نصاب نامی یا نصاب غیر نامی شرط ہے جو شخص دونوں نصابوں میں سے کسی بھی نصاب کا مالک نہیں اس پر فطرہ واجب نہیں۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک وجوب فطرہ کے لئے کوئی نصاب شرط نہیں۔ ان کے نزدیک ہر اس شخص پر جس کے پاس عید کی رات کا اور عید کے دن کا خرچہ ہے

اس کا بھی اور اس کی فیملی کا بھی اور اس کے علاوہ اتنا مال ہے کہ صدقہ فطر ادا کر سکتا ہے تو اس پر فطرہ فرض ہے اور یہ مسئلہ اجتہادی ہے۔ دونوں فریقوں کے پاس کوئی نص نہیں۔ حنفیہ نے مشہور حدیث خیر الصدقة ماکان عن ظهر غنیً سے استدلال کیا ہے (مشکوٰۃ حدیث ۱۹۲۹) یعنی بہترین خیرات وہ ہے جو مالداری کی پیٹھ سے ہو، یعنی خیرات کرنے کے بعد بھی خیرات کرنے والا مالدار رہے، مگر یہ ایک عام روایت ہے اس سے اس خاص مسئلہ پر استدلال کچھ زیادہ قرین صواب نہیں۔ اور ائمہ ثلاثہ کا استدلال یہ ہے کہ جب شریعت نے صدقۃ الفطر کے لئے نصاب مقرر نہیں کیا تو نصاب شرط نہیں یعنی عدم دلیل ان کی دلیل ہے۔

پانچواں مسئلہ: صاحب نصاب پر اس کا اور اس کے نابالغ بچوں کا اور اس کے غلام باندیوں کا صدقہ واجب ہے اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ البتہ آقا پر صرف مسلمان غلام باندیوں کا صدقہ واجب ہے یا ہر غلام باندی کا؟ اس میں اختلاف ہے۔ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک صرف مسلمان بردوں کا صدقہ واجب ہے اور احناف کے نزدیک ہر غلام باندی کا خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر صدقہ واجب ہے اور یہ مسئلہ اب غیر اہم ہے کیونکہ اب غلام باندی نہیں رہے۔ مگر حدیث فہمی کے لئے اہم ہے۔ تفصیل حدیث کے بعد آئے گی۔

حدیث (۱): ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم صدقۃ الفطر نکالا کرتے تھے جب رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان موجود تھے، طعام (کھانے) میں سے ایک صاع، یا جو میں سے ایک صاع یا کھجور میں سے ایک صاع یا کشمش میں سے ایک صاع، یا سوکھائے ہوئے دودھ میں سے ایک صاع (أَقِط کے معنی کے لئے تحفۃ الالمعی ۱:۲۲۷ کا حاشیہ دیکھیں) پس ہم برابر اس کو نکالتے رہے یہاں تک کہ حضرت معاویہ مدینہ آئے پس انھوں نے تقریر کی، اور انھوں نے لوگوں سے جو باتیں کیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ میرے خیال میں شام کے گیہوں میں سے دو مد (نصف صاع) کھجور کے ایک صاع کے برابر ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: لوگوں نے اس کو لے لیا (یعنی وہ گندم کا نصف صاع نکالنے لگے) مگر میں تو برابر اتنا ہی صدقہ نکالتا ہوں جتنا میں (نبی ﷺ کے زمانہ میں) نکالتا تھا، یعنی میں گندم کا بھی ایک صاع ہی نکالتا ہوں۔

تشریح: اس حدیث میں جو لفظ طعام آیا ہے ائمہ ثلاثہ نے اس سے گندم مراد لیا ہے۔ اور احناف کے نزدیک طعام سے مکئی مراد ہے۔ اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر علاقہ کا طعام (کھانا، بھات) وہ ہوتا ہے جو وہاں عام طور پر کھایا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عام طور پر مکئی کھائی جاتی تھی اور جو کا دوسرا نمبر تھا، پس آپؐ کے زمانہ کا ''طعام'' مکئی ہے، گندم: دور اول میں گراں اور کم یاب تھا۔ امراء ہی اس کو کھاتے تھے، مساکین کو وہ نصیب نہیں ہوتا تھا، خاندانِ بنواُبیرق کے بشیر نامی منافق نے جو چوری کی تھی اس واقعہ میں حضرت قتادۃ بن النعمان رضی اللہ عنہ نے یہ بات بیان کی ہے کہ جب شام سے کوئی تاجر میدہ لاتا تھا تو متمول آدمی اس کو خرید لیتا۔ اور اپنے لئے خاص کر لیتا، اور

بال بچے کھجور اور جو کھاتے تھے (ترمذی ۲: ۱۲۸ کتاب التفسیر، سورۃ النساء) پھر جب عراق اور شام فتح ہوئے تو عرب میں گندم بکثرت آنے لگا، اور وہ سستا بھی ہوگیا اس لئے لوگ اس کو عام طور پر استعمال کرنے لگے تو طعام کا مصداق بدل گیا۔ ائمہ اربعہ کے زمانہ میں طعام سے گیہوں مراد لیا جاتا تھا پس ائمہ ثلاثہ نے حدیث میں بھی طعام سے گیہوں مراد لے لیا۔ حالانکہ یہ زمانہ کی تبدیلی کا اثر ہے۔ جیسے حدیث: تحریمها التكبير میں تکبیر کے معنی ہیں: اللہ کی بڑائی بیان کرنا۔ پھر اللہ اکبر کہنے پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔ تو ائمہ ثلاثہ نے حدیث میں بھی اللہ اکبر کہنے کے معنی لے لئے، حالانکہ یہ عرف حادث تھا۔ اسی طرح طعام کے معنی گندم عرف حادث ہے، نصوص میں وہ معنی مراد نہیں لئے جائیں گے نصوص میں اس کا مصداق مکئی ہے۔

اور احناف کی دلیلیں یہ ہیں:

۱- رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں منادی کرائی کہ ہر مسلمان پر صدقہ واجب ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، بڑا ہو یا چھوٹا، گندم کے دو مُد (نصف صاع) یا دیگر غلّے میں سے ایک صاع —— اس حدیث میں صراحت ہے کہ گندم میں سے نصف صاع واجب ہے اور دیگر غلوں میں سے ایک صاع، اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حدیثوں میں گندم پر بغیر قید کے طعام کا اطلاق نہیں ہوتا (یہ حدیث باب میں ہے)

۲- طحاوی میں ثعلبة بن أبي صُعير عن أبيه کی سند سے مرفوعاً روایت ہے کہ کھجور اور جو میں سے ایک صاع اور گندم میں سے نصف صاع ادا کرو۔

۳- اسماء بنت ابی بکرؓ کہتی ہیں: ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں گندم میں سے دو مد نکالا کرتے تھے (طحاوی)

۴- سعید بن المسیب کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے گندم میں سے نصف صاع صدقہ مقرر کیا —— یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے لیکن سعید بن المسیب کے مراسیل ائمہ ثلاثہ کے نزدیک بھی حجت ہیں (یہ تینوں روایتیں طحاوی جلد اول باب مقدار صدقة الفطر میں ہیں)

رہی یہ بات کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ گندم کا بھی ایک صاع نکالتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی بات کو ان کی رائے سمجھا تھا حالانکہ خود آنحضور ﷺ نے گندم میں نصف صاع مقرر کیا ہے۔ یہ بات حضرت ابوسعید کے علم میں نہیں تھی، اور صحابی کا فہم نص کی موجودگی میں حجت نہیں یا ان کے نزدیک بھی نصف صاع کافی تھا مگر چونکہ گندم سستا ہوگیا تھا اس لئے وہ گندم کا بھی ایک صاع نکالتے تھے، آج بھی گندم چھوہاروں سے ارزاں ہے۔ لہٰذا صدقۃ الفطر ایک صاع گندم نکالنا چاہئے۔

فائدہ: اس اختلاف پر اس کا بھی اثر پڑا ہے کہ ائمہ ثلاثہ کا صاع چھوٹا (پانچ رطل اور تہائی رطل) ہے اور احناف کا صاع بڑا (آٹھ رطل) ہے۔ اب اگر ائمہ ثلاثہ نصف صاع گندم واجب کریں تو غریب کو مٹھی بھر غلہ ملے گا، اور احناف

کا نصف صاع بھی خاصی مقدار ہے، اس لئے انھوں نے گیہوں میں سے نصف صاع واجب کیا۔

حدیث (۲): عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مکہ کی گلیوں میں منادی کرائی کہ سنو! ہر مسلمان پر صدقہ واجب ہے خواہ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام، چھوٹا ہو یا بڑا، گندم میں سے دو مد اور گندم کے علاوہ طعام میں سے ایک صاع۔

تشریح: اس حدیث کی وضاحت اوپر آگئی اور جاننا چاہئے کہ باپ پر صرف نابالغ بچوں کا صدقہ واجب ہے، بالغ بچوں کا صدقہ واجب نہیں۔ اور اگر نابالغ بچے کے پاس مال ہو تو اس کا صدقہ اس کے مال میں واجب ہوگا۔ باپ پر واجب نہیں اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔ اور غلام باندیوں کا صدقہ آقا پر واجب ہے اور شوہر پر بیوی کا صدقہ واجب نہیں اگر بیوی صاحب نصاب ہے تو اس کا صدقہ اسی پر واجب ہے۔ البتہ اگر باپ بالغ بچوں کا اور شوہر بیوی کا صدقہ نکالے تو جائز ہے مگر ان کے حکم یا علم واطلاع سے ہونا ضروری ہے۔ یہی حکم زکات کا بھی ہے۔ اس میں بھی امر یا علم واطلاع ضروری ہے۔

حدیث (۳): ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مرد وزن، آزاد وغلام پر کھجور یا جو میں سے ایک صاع صدقۃ الفطر مقرر کیا۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں: پس لوگوں نے نصف صاع گندم کو کھجور اور جو کے ایک صاع کے برابر کردیا۔

تشریح: اس حدیث میں اور اوپر والی حدیث میں جو فرض اور واجب کے الفاظ آئے ہیں ان سے فقہاء والے واجب اور فرض مراد نہیں، کیونکہ یہ بعد کی اصطلاحیں ہیں، جو نصوص میں مراد نہیں لی جاسکتیں، بلکہ مراد لغوی معنی ہیں یعنی ضروری ہے اور ضروری ہونا فقہاء کے فرض وواجب دونوں پر صادق آتا ہے۔

اور اس حدیث کو نافع سے ایوب سختیانی اور عبید اللہ عمری اور ان کے علاوہ متعدد بڑے حضرات روایت کرتے ہیں وہ سب اس حدیث میں من المسلمین نہیں بڑھاتے۔ صرف امام مالک رحمہ اللہ حدیث میں یہ اضافہ کرتے ہیں، اور ائمہ ثلاثہ نے اس اضافہ کو لیا ہے، کیونکہ ثقہ کی زیادتی معتبر ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک مولیٰ پر صرف مسلمان غلام باندیوں کا صدقہ فرض ہے اور ان کی عقلی دلیل یہ ہے کہ کافر احکام شرع کا مکلف نہیں پس اس پر صدقہ واجب نہیں۔ اور احناف کے نزدیک ہر غلام باندی کا خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر آقا پر صدقہ واجب ہے، اور یہ تعبیر کہ احناف من المسلمین کی زیادتی نہیں لیتے: ٹھیک نہیں احناف نے بھی اس زیادتی کو لیا ہے چنانچہ ان کے نزدیک آقا پر مسلمان بردوں کا صدقہ واجب ہے۔ البتہ احناف نصوص میں مفہوم مخالف کے قائل نہیں، اور یہ مسئلہ کہ غیر مسلم بردوں کا صدقہ واجب نہیں یہ نص کا مفہوم مخالف ہے جو احناف کے نزدیک معتبر نہیں۔ اس لئے کہ حدیث کے راوی حضرت ابن عمرؓ اپنے غیر مسلم غلاموں کا بھی صدقہ نکالا کرتے تھے (فتح الباری ۳: ۳۷۱) اور یہ کہنا کہ نفلی طور پر نکالتے ہونگے خواہ مخواہ کا

احتمال ہے۔ اور ائمہ ثلاثہ کی عقلی دلیل کا جواب یہ ہے کہ صدقہ کا فر غلام باندی پر واجب نہیں بلکہ اس کے آقا پر واجب ہے جو مسلمان ہے اور مکلف ہے۔

[۳۵] بابُ ماجاء في صدقة الفطر

[٦٦٦-] حدثنا محمودُ بنُ غيلانَ، نا وكيعٌ، عن سُفيانَ، عن زَيْدِ بنِ أَسْلَمَ، عن عِيَاضِ بنِ عبدِ اللّٰهِ، عن أبي سعيدٍ الخُدريِّ، قال: كُنَّا نُخرِجُ زَكَاةَ الفِطْرِ إذْ كانَ فِيْنَا رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم صَاعًا مِنْ طَعَامٍ، أَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ، او صَاعًا مِنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعًا مِنْ زَبِيْبٍ، أَوْ صَاعًا مِنْ أَقِطٍ، فَلَمْ نَزَلْ نُخرِجُهُ حَتَّى قَدِمَ مُعَاوِيَةُ المَدِيْنَةَ، فَتَكَلَّمَ فَكَانَ فِيْمَا كَلَّمَ بِهِ النَّاسَ: إِنِّيْ لَأَرَى مُدَّيْنِ مِنْ سَمْرَاءِ الشَّامِ تَعْدِلُ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ، قال: فَأَخَذَ النَّاسُ بذلكَ، قال أبو سعيدٍ: فَلَا أَزَالُ أُخْرِجُهُ كَمَا كُنْتُ أُخرِجُهُ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، والعملُ على هذا عندَ بَعْضِ أهلِ العلمِ يَرَوْنَ مِنْ كُلِّ شَيْئٍ صَاعًا، وهو قَوْلُ الشافعيِّ وأحمدَ وإسحاقَ.

وقال بَعْضُ أهلِ العلمِ مِنْ أَصْحَابِ النبيِّ صلى الله عليه وسلم وغَيْرِهِمْ مِنْ كُلِّ شَيْئٍ صاعٌ إِلَّا مِنَ البُرِّ، فَإِنَّهُ يُجزِئُ نَصْفُ صَاعٍ، وهو قولُ سُفيانَ الثوريِّ، وابنِ المباركِ، وأهلِ الكُوْفَةِ: يَرَوْنَ نَصْفَ صَاعٍ مِنْ بُرٍّ.

[٦٦٧-] حدثنا عُقْبَةُ بنُ مُكْرَمٍ البَصْرِيُّ، نا سَالِمُ بنُ نُوحٍ، عن ابنِ جُرَيْجٍ، عن عَمْرِو بنِ شُعَيْبٍ، عن أبيهِ، عن جَدِّهِ: أَنَّ النبيَّ صلى الله عليه وسلم بَعَثَ مُنَادِيًا فِيْ فِجَاجِ مَكَّةَ: "أَلَا إِنَّ صَدَقَةَ الفِطْرِ وَاجِبَةٌ على كُلِّ مُسْلِمٍ: ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَى، حُرٌّ أَوْ عَبْدٍ، صَغِيْرٍ أَوْ كَبِيْرٍ: مُدَّانِ مِنْ قَمْحٍ، أَوْ سِوَاهُ صَاعٌ مِنْ طَعَامٍ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ غريبٌ حسنٌ.

[٦٦٨-] حدثنا قتيبةُ، نا حَمَّادُ بنُ زَيْدٍ، عن أيوبَ، عن نَافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، قال: فَرَضَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم صَدَقَةَ الفِطْرِ على الذَّكَرِ وَالأُنْثَى، والحُرِّ وَالمَمْلُوْكِ: صَاعًا مِنْ تَمْرٍ، أَوْ صَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ، قال: فَعَدَلَ النَّاسُ إلى نِصْفِ صَاعٍ مِنْ بُرٍّ.

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وفي الباب: عن أبي سعيدٍ، وابنِ عباسٍ، وجَدِّ الحارثِ بنِ عبدِ الرحمنِ بنِ ذُبَابٍ، وثَعْلَبَةَ بنِ

ابى صُعَيرٍ، وعبدِ اللّٰهِ بنِ عَمرٍو.

[٦٦٩-]حدثنا إسحاقُ بنُ موسى الأنصارِيُّ، نا مَعْنٌ، نا مالكٌ، عن نَافِعٍ، عن عبدِ اللّٰهِ بنِ عُمَرَ: أنَّ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم فَرَضَ زكاةَ الفِطْرِ مِنْ رَمَضَانَ صَاعًا مِنْ تَمْرٍ، أوْ صَاعًا مِنْ شَعِيْرٍ: على كُلِّ حُرٍّ او عَبْدٍ، ذَكَرٍ أوْ أُنثى: مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ.

قال أبو عيسى: حديثُ ابنِ عُمرَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، رَوَاهُ مَالِكٌ، عن نَافِعٍ، عن ابنِ عُمَرَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم نحوَ حديثِ أيوبَ، وزَادَ فِيْهِ: "مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ" وَرَوَاهُ غَيْرُ وَاحِدٍ عَنْ نَافِعٍ، ولَمْ يَذْكُرُوْا فيهِ: "مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ"

واختَلَفَ أهلُ العلمِ في هذا، فقالَ بَعْضُهُمْ: إذَا كانَ للرَّجُلِ عَبِيْدٌ غَيْرُ مُسْلِمِيْنَ لَمْ يُؤَدِّ عَنْهُمْ صَدَقَةَ الفِطْرِ، وهو قَوْلُ مَالِكٍ، والشافعيِّ، وأحمدَ. وقال بعضُهم يُؤَدِّيْ عَنْهُمْ وإن كانُوا غَيْرَ مُسْلِمِيْنَ، وهوقولُ الثَّوْرِيِّ، وابنِ المباركِ، وإسحاقَ.

ترجمہ:اس پر بعض علماء کا عمل ہے، وہ ہر طعام میں سے ایک صاع کے قائل ہیں اور یہ شافعی، احمد اور اسحاق کا قول ہے۔اور صحابہ اور ان کے علاوہ بعض علماء کہتے ہیں: ہر طعام میں سے ایک صاع واجب ہے بجز گندم کے، اس میں نصف صاع کافی ہے۔اور یہ سفیان ثوری، ابن المبارک اور کوفہ والوں کا قول ہے۔وہ گندم میں نصف صاع کے قائل ہیں ـــــ اور علماء کا غلام باندیوں کے مسئلہ میں اختلاف ہے۔بعض کہتے ہیں: جب آدمی کے پاس غیر مسلم غلام ہوں تو اس پر صدقہ واجب نہیں۔اور یہ ائمہ ثلاثہ کا قول ہے۔اور بعض کہتے ہیں: بردوں کی طرف سے صدقہ ادا کیا جائے اگرچہ وہ کافر ہوں۔اور یہ سفیان ثوری، ابن المبارک اور اسحاق کا قول ہے۔

بابُ ماجاءَ في تَقْدِيمِهَا قَبْلَ الصَّلَاةِ

عید سے پہلے صدقہ ادا کرنے کا بیان

مذاہب فقہاء: احناف کے نزدیک عید سے جتنا بھی چاہیں مقدم صدقۃ الفطر ادا کرنا جائز ہے۔اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک رمضان سے پہلے ادا کرنا جائز نہیں۔البتہ رمضان شروع ہونے کے بعد کسی بھی وقت ادا کر سکتے ہیں۔اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک عید سے ایک یا دو دن مقدم کر سکتے ہیں۔اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک مطلقاً تقدیم جائز نہیں، عید کا دن آنے کے بعد ہی صدقہ دے تو جائز ہوگا ورنہ نہیں۔اور اگر کوئی عید کے بعد صدقہ دے تو شوافع اور مالکیہ کے یہاں اس کے لئے قضاء کی تعبیر ہے، اور ہمارے یہاں اس صورت میں بھی ادا ہی کی تعبیر ہے۔

اور اس اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ صدقۃ الفطر میں نفس وجوب اور وجوب اداء ساتھ ساتھ ہیں یا الگ الگ؟ اس میں اختلاف کی وجہ سے مسئلہ مختلف فیہ ہوگیا ہے۔ زکوۃ میں بالاجماع دونوں الگ الگ ہیں، وہاں نفس وجوب کا سبب نصاب کا مالک ہونا ہے اور وجوب اداء کا سبب حولانِ حول ہے۔ چنانچہ سب متفق ہیں کہ جس شخص کے پاس نصاب ہے وہ حولانِ حول سے پہلے زکوۃ دے سکتا ہے کیونکہ وجوب متحقق ہوگیا۔ مگر صدقہ فطر میں اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک یہاں بھی نفس وجوب اور وجوب اداء الگ الگ ہیں ان کے نزدیک وجوبِ اداء کا سبب عید الفطر کا دن ہے۔ اور نفس وجوب کا سبب: رأسٌ یَمُونُه ویَلِیْ علیه ہے یعنی ایسی ذات جس کا وہ خرچ برداشت کرتا ہے اور وہ ذات اس کی سرپرستی میں ہے ـــــ آدمی اپنا بھی خرچ برداشت کرتا ہے اور اپنی بھی سرپرستی کرتا ہے، اور نابالغ اولاد کا بھی خرچ برداشت کرتا ہے اور ان کی بھی سرپرستی کرتا ہے۔ ان کے بُرے بھلے کا ذمہ دار ہوتا ہے، اور بالغ اولاد کا خرچ باپ پر واجب نہیں۔ اور نہ وہ باپ کی سرپرستی میں ہیں، باپ اخلاقاً ان کی سرپرستی کرتا ہے اور ان پر خرچ بھی کرتا ہے، مگر اس کا خرچ باپ پر واجب نہیں اس لئے ان کا صدقہ فطر بھی باپ پر واجب نہیں۔ اسی طرح غلام باندیوں کا خرچ آقا پر ہے اور وہ مولیٰ کی سرپرستی میں ہیں، ان کے برے بھلے کا آقا ذمہ دار ہے اور اس بات میں سب غلام باندی یکساں ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر۔ پس ہر غلام باندی کا صدقہ آقا پر واجب ہے، مسلم اور غیر مسلم میں تفریق درست نہیں۔

غرض احناف کے نزدیک چونکہ صدقۃ الفطر کے نفس وجوب کا سبب ذات ہے اور وہ ذات پہلے سے موجود ہے اس لئے نفس وجوب کا سبب متحقق ہے۔ اس لئے صدقہ کو عید سے پہلے مقدم کرنا جائز ہے، جیسا کہ زکوۃ کو مقدم کرنا جائز ہے۔

اور یہ بات فی الجملہ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ بھی تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک بھی تقدیم جائز ہے۔ البتہ امام مالکؒ کے نزدیک دونوں ساتھ ساتھ ہیں، جیسے نماز کا نفسِ وجوب اور وجوبِ ادا ساتھ ساتھ ہیں پس وقت ہونے سے پہلے نماز پڑھنی جائز نہیں، اسی طرح عید الفطر سے پہلے صدقہ ادا کرنا صحیح نہیں۔

فائدہ: صدقۃ الفطر اگرچہ عید سے پہلے دینا جائز ہے مگر بہتر عید الفطر کے دن عیدگاہ جانے سے پہلے ادا کرنا ہے تاکہ جن لوگوں کا گذارہ دہاڑی پر ہے جو روز کماتے اور کھاتے ہیں جب ان کو صبح سویرے دن بھر کا خرچ مل جائے گا تو وہ فکر معاش سے فارغ ہو کر عید پڑھنے جائیں گے اور دس پندرہ دن پہلے صدقہ دیدیا جائے گا تو عید آتے آتے وہ ختم ہوجائے گا اور عید کی نماز کے بعد دیں گے تو عید کے دن فکر معاش پیچھا کئے رہے گی۔ اس لئے عید کے دن عیدگاہ جانے سے پہلے صدقہ دینا افضل ہے۔

[۳۶] بابُ ماجاء فی تقدیمها قبل الصلوٰة

[۶۷۰-] حدثنا مُسْلِمُ بنُ عَمْرِو بنِ مُسْلِمٍ أبو عَمْرٍو الحَذّاءُ المَدِینیُّ، قال: حدَّثَنِیْ عبدُ اللهِ بنُ

نَافِعٍ، عن ابنِ أبي الزِّنَادِ، عن موسى بنِ عُقْبَةَ، عن نَافِعٍ، عن ابنِ عمر: أَنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم كان يَأْمُرُ بِإِخْرَاجِ الزَّكَاةِ قَبْلَ الغُدُوِّ لِلصلاةِ يَوْمَ الفِطْرِ.

قال أبو عيسى: هذا: حديثٌ حسنٌ صحيحٌ، وهو الذى يَسْتَحِبُّهُ أهلُ العلمِ أَنْ يُخْرِجَ الرَّجُلُ صَدَقَةَ الفِطْرِ قَبْلَ الغُدُوِّ إلى الصَّلَاةِ.

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ صدقۂ فطر عید کے دن نماز سے پہلے ادا کرنے کا حکم دیتے تھے۔ اور علماء نے اس کو پسند کیا ہے کہ آدمی صدقۂ فطر عید کے لئے جانے سے پہلے ادا کرے۔

بابُ ماجاء في تَعْجِيْلِ الزَّكٰوةِ

سال پورا ہونے سے پہلے زکوۃ دینے کا بیان

صاحب نصاب کے لئے سال دو سال یا اس سے بھی زیادہ پیشگی زکوۃ ادا کرنا جائز ہے۔ اور یہ اجماعی مسئلہ ہے۔

اور اس باب میں دو حدیثیں ہیں:

پہلی حدیث: رسول اللہ ﷺ کے پاس اطراف سے جو لوگ مسلمان ہونے کے لئے یا بیعت ہونے کے لئے یا دین سیکھنے کے لئے آتے تھے اور وہ غریب ہوتے تھے: آپ زکوۃ کے مال سے ان کی مدد کرتے تھے، مگر کبھی بیت المال خالی ہوتا تھا اور کوئی ایسا نادار آجاتا تھا جس کی مدد ناگزیر ہوتی تھی تو آپ قرض لے کر اس کی مدد فرماتے تھے۔ پھر جب زکوۃ وصول ہوتی تو قرض واپس کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے قرض مانگا وہ جانتے تھے کہ آپ اپنے لئے قرض نہیں لے رہے چنانچہ انھوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھ پر سال پورا ہونے پر جو زکوۃ واجب ہوگی وہ زکوۃ اگر میں ابھی دیدوں تو کیا یہ جائز ہے؟ آپ نے فرمایا: جائز ہے۔ چنانچہ حضرت عباسؓ نے پیشگی زکوۃ دیدی۔

دوسری حدیث: رسول اللہ ﷺ نے مدینہ اور قرب وجوار کی زکوتیں وصول کرنے کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ کام مکمل کر کے انھوں نے رپورٹ دی کہ سب زکوتیں وصول ہوگئیں مگر حضرت عباس اور حضرت خالد اور ابن جمیل نے نہیں دی، آپ نے فرمایا: عباسؓ سے میں دو سال کی پیشگی زکوۃ وصول کر چکا ہوں، اس لئے وہ میرے ذمے ہے۔ اور خالدؓ نے اپنی زکوۃ سے زرہیں (فولاد کے کرتے جو لڑائی میں پہنے جاتے ہیں) اور دیگر سامانِ جنگ خرید کر رکھ لیا ہے تاکہ مجاہدین کو جب وہ جنگ کے لئے جائیں یہ چیزیں دیں، اور ابن جمیل کو تو بس یہ بات ناپسند ہے کہ وہ کنگال تھا اس نے مجھ سے دعا کرائی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کو نوازدیا، اب اس کو اللہ کا حق

دینا بھی بھاری معلوم ہوتا ہے۔ غرض نبی ﷺ نے حضرت عباس اور حضرت خالد رضی اللہ عنہما کی طرف سے صفائی دی اور ابن جمیل سے ناراضگی ظاہر فرمائی۔

تشریح: پہلی حدیث (نمبر ۶۷۱) اسماعیل بن زکریا کی ہے۔ اور دوسری حدیث (نمبر ۶۷۲) اسرائیل کی ہے۔ دونوں کی سندیں مختلف ہیں اور دونوں کا مضمون بھی مختلف ہے، مگر امام ترمذی رحمہ اللہ کے نزدیک دونوں ایک ہیں۔ اور اسماعیل کی حدیث اصح ہے اور وہ منقطع بھی مروی ہے، یعنی حکم بن عتیبہ سے اوپر سند نہیں ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ ترجیح قائم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ دونوں حدیثیں علحدہ علحدہ ہیں۔ واللہ اعلم

[۳۷] بابُ ماجاء فی تعجیل الزکاۃ

[۶۷۱-] حدثنا عبدُ اللهِ بنُ عبدِ الرحمنِ، نا سعيدُ بنُ مَنْصُوْرٍ، نا إسماعيلُ بنُ زَكَرِيَّا، عن الحَجَّاجِ بنِ دِيْنَارٍ، عن الحَكَمِ بنِ عُتَيْبَةَ، عن حُجَيَّةَ بنِ عَدِيٍّ، عن عليٍّ: أنَّ العَبَّاسَ سَأَلَ رسولَ اللهِ صلى الله عليه وسلم فِي تَعْجِيْلِ صَدَقَتِهِ قَبْلَ أَنْ تَحِلَّ، فَرَخَّصَ له فی ذٰلِكَ.

[۶۷۲-] حدثنا القاسمُ بنُ دِيْنَارٍ الكُوْفِيُّ، نا إسحاقُ بنُ مَنْصُوْرٍ، عن إسرائيلَ، عن الحَجَّاجِ بنِ دِيْنَارٍ، عن الحَكَمِ بنِ جَحْلٍ، عن حُجْرٍ العَدَوِيِّ، عن عليٍّ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم، قال لِعُمَرَ: "إِنَّا قَدْ أَخَذْنَا زَكَاةَ العَبَّاسِ عَامَ الأَوَّلِ لِلْعَامِ"

وفی الباب: عن ابنِ عباسٍ.

[قال:] لا أَعْرِفُ حديثَ تَعْجِيلِ الزكاةِ مِنْ حديثِ إسرائيلَ، عن الحَجَّاجِ بنِ دِيْنَارٍ، إلاَّ مِنْ هٰذا الوَجْهِ. وحديثُ إسماعيلَ بنِ زكريَّا، عن الحجَّاجِ عِنْدِیْ أَصَحُّ مِنْ حديثِ إسرائيلَ، عن الحجَّاجِ بنِ دِيْنَارٍ. وقد رُوِيَ هذا الحديثُ عن الحَكَمِ بنِ عُتَيْبَةَ، عن النبيِّ صلى الله عليه وسلم مُرْسَلٌ.

وقد اختلَفَ أهلُ العلمِ فِيْ تَعْجِيْلِ الزكاةِ قَبْلَ مَحِلِّهَا، فَرَأَى طَائِفَةٌ مِنْ أهلِ العلمِ أَنْ لاَ يُعَجِّلَهَا، وبه يقولُ سُفيانُ الثَّوْرِيُّ، قال: أَحَبُّ إِلَيَّ أَنْ لاَ يُعَجِّلَهَا، وقال أكثرُ أهلِ العلمِ: إِنْ عَجَّلَهَا قَبْلَ مَحِلِّهَا أَجْزَأَتْ عَنْهُ، وبه يقولُ الشافعيُّ، وأحمدُ، وإسحاقُ.

ترجمہ: حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عباسؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سال پورا ہونے سے پہلے زکوۃ ادا کرنے کے بارے میں معلوم کیا تو آپؐ نے ان کو اس کی اجازت دی۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "ہم عباسؓ سے اس سال کی زکوۃ شروع سال میں لے

چکے ہیں'' (عامَ الأول کی تقدیر ہے: أولَ العام۔ اور للعام: أی للعام الحاضر: موجودہ سال کی) (امام ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں:) میں اسرائیل کی حجاج بن دینار سے پیشگی زکوٰۃ ادا کرنے کے سلسلہ کی حدیث صرف اسی طریق سے جانتا ہوں، اور اسماعیل بن زکریا کی حجاج سے جو روایت ہے وہ میرے نزدیک اسرائیل کی اس حدیث سے جو حجاج بن دینار سے ہے اصح ہے۔ اور یہ حدیث حکم بن عتیبہ سے وہ نبی ﷺ سے مرسل (منقطع) بھی روایت کی گئی ہے۔ اور علماء کا سال پورا ہونے سے پہلے پیشگی زکوٰۃ ادا کرنے میں اختلاف ہے، علماء کی ایک جماعت کہتی ہے: پیشگی زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ اور سفیان ثوری اسی کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں: مجھے یہ پسند ہے کہ پیشگی زکوٰۃ نہ دی جائے۔ اور اکثر علماء کہتے ہیں: اگر سال پورا ہونے سے پہلے زکوٰۃ دیدی تو اس کی طرف سے کافی ہے۔ اور شافعی، احمد اور اسحاق اسی کے قائل ہیں۔

بابُ ماجاءَ فی النَّهْیِ عن المَسْئَلَةِ

سوال کرنے کی ممانعت

حدیث (۱): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''البتہ یہ بات کہ تم میں سے ایک شخص صبح سویرے جائے (یہ قید اتفاقی ہے، لکڑہارے عام طور پر صبح سویرے جنگل جاتے ہیں) پس وہ اپنی پیٹھ پر سوختہ لاد کر لائے (اور اس کو بیچ کر جو رقم حاصل ہو) اس میں سے خیرات کرے اور مانگنے سے بے نیاز ہوجائے یہ اس کے لئے اس سے بہتر ہے کہ کسی آدمی سے مانگے وہ اس کو دے یا دینے سے انکار کردے، پس بیشک اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے، اور شروع کروان لوگوں سے جن کا تم خرچ برداشت کرتے ہو''

تشریح: اس حدیث کا سبق یہ ہے کہ جب تک بازو میں طاقت ہو کما کر کھانا چاہئے۔ پرائے ٹکڑوں پر پلنا ٹھیک نہیں۔ اور ''اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے'' کی سات تفسیریں کی گئی ہیں راجح یہ ہے کہ اوپر کا ہاتھ خرچ کرنے والا ہاتھ ہے اور نیچے کا ہاتھ لینے والا ہاتھ ہے۔ نیز اس حدیث میں نبی ﷺ نے خرچ کرنے کے تعلق سے یہ ہدایت دی ہے کہ خرچ کرنے کے زیادہ حقدار قریبی رشتہ دار ہیں، سب سے پہلے اپنے اوپر اور بیوی بچوں پر خرچ کیا جائے پھر جو نادار رشتہ دار ہیں ان پر خرچ کیا جائے، اور ان سے بچے تو غیروں پر خرچ کیا جائے۔ مگر لوگ عام طور پر دور کی جگہوں میں خرچ کرتے ہیں اور رشتہ داروں کو بھول جاتے ہیں یہ غلط ذہن ہے۔

حدیث (۲): رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بیشک مانگنا ایک سخت محنت ہے جس کے ذریعہ آدمی اپنے چہرے کو تھکاتا ہے (یعنی بے آبرو ہوتا ہے) مگر یہ کہ آدمی بادشاہ سے مانگے یا ایسی ضرورت میں مانگے جس میں مانگنا ناگزیر ہے (تو مانگنے کی وجہ سے بے آبرو نہیں ہوگا)

تشریح: جس طرح آدمی کام کرنے سے تھکتا ہے مانگنے سے بھی تھکتا ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ کام کرنے والے کا بدن تھکتا ہے اور مانگنے والے کا چہرہ تھکتا ہے، یعنی مانگنے والے کو بے آبرو ہونا پڑتا ہے۔ البتہ دو صورتوں میں مانگنے کی اجازت ہے۔ ایک: آدمی اپنی اتھارٹی سے مانگے جبکہ وہ مستحق بھی ہو، جیسے طلبہ کی اتھارٹی اہتمام ہے پس طالب علم استحقاق کی بنیاد پر مہتمم صاحب سے یا ناظم صاحب سے مانگ سکتا ہے اس کی وجہ سے وہ بے آبرو نہیں ہوگا۔ دوم: کسی کام کے لئے مانگنا ناگزیر ہو تو بھی بے آبرو نہیں ہوگا مثلاً: گاؤں میں مسجد بن رہی ہے یا مکتب یا مدرسہ چلانا ہے تو چندہ کئے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ پس مانگنا بے آبرو ہونا نہیں ہے اور کہاں تک مانگنا بے آبرو ہونا نہیں ہے؟ جہاں تک لوگ مسجد کو جانتے ہیں، یا جہاں تک لوگ مدرسہ کو جانتے ہیں اور جہاں تک اس کا فیض پہنچ رہا ہے وہاں تک چندہ کرنے سے بے عزت نہیں ہوگا۔ مگر آج کل کی صورت حال یہ ہے کہ کسی چھوٹے سے گاؤں میں مسجد بن رہی ہے اور دنیا بھر میں چندہ ہورہا ہے، اسی طرح ایک گاؤں کا مدرسہ ہے اور بمبئی میں چندہ ہورہا ہے۔ ایسے مدرسوں کے سفراء کو لوگ جوتوں سے تولتے ہیں۔ جب بمبئی میں کوئی اس مدرسہ کو جانتا ہی نہیں نہ وہاں تک مدرسہ کا فیض پہنچ رہا ہے تو وہاں چندہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اور ایسے غیر معروف یا بوگس چندہ کرنے والوں کی وجہ سے صحیح لوگ بھی بے آبرو ہوتے ہیں:

چوں ز قومے یکے بے دانشی کرد ❁ نہ کِہ را منزلت ماند نہ مِہ را

(جب قوم کا ایک فرد بے عقلی کا کام کرتا ہے÷ تو نہ چھوٹے کا مرتبہ رہتا ہے نہ بڑے کا)

بلکہ لوگ قرب وجوار میں چندہ کرنے کے بجائے دور جا کر چندہ کرتے ہیں تا کہ کوئی حقیقت حال سے واقف نہ ہو اور زکوۃ کی رقمیں سمیٹ کر اناپ شناپ اڑائیں۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی کھڑا ہونا ہے جو عالم الغیب والشہادۃ ہے، اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، دنیا کے حقیر مزہ کی خاطر آخرت کی لازوال دولت کھودینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو نیک سمجھ عطا فرمائیں تا کہ وہ ملت کی رسوائی کا سبب نہ بنیں (آمین)

[۳۸] بابُ ماجاء فی النهی عن المَسألة

[۶۷۳-]حدثنا هَنَّادٌ، نا أبو الأحْوَصِ، عن بَيَانِ بنِ بِشْرٍ، عن قَيْسِ بنِ أبی حَازِمٍ، عن أبی هریرةَ، قال: سمعتُ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم یقولُ:" لَأَنْ يَغْدُوَ أَحَدُكُمْ، فَيَحْتَطِبَ علی ظَهْرِهِ، فَيَتَصَدَّقَ مِنْهُ، وَيَسْتَغْنِيَ بِهِ عن النَّاسِ، خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَسْأَلَ رَجُلاً: أَعْطَاهُ أَوْ مَنَعَهُ ذٰلِكَ، فَإِنَّ اليَدَ العُلْيَا خَيْرٌ مِنَ اليَدِ السُّفْلٰى، وابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ"

وفي الباب: عن حَكيمِ بنِ حِزَامٍ، وأبي سعيدٍ الخُدْرِيِّ، والزُّبَيْرِ بنِ العَوَّامِ، وعَطِيَّةَ السَّعْدِيِّ، وعبدِ اللّٰهِ بنِ مَسْعُوْدٍ، ومَسْعُوْدِ بنِ عَمْرٍو، وابنِ عباسٍ، وثَوْبَانَ، وزيادِ بنِ الحَارِثِ الصُّدَائِيِّ، وأنسٍ، وحُبْشِيِّ بنِ جُنَادَةَ، وقَبِيْصَةَ بنِ مُخَارِقٍ، وسَمُرَةَ، وابنِ عُمَرَ.

قال أبو عيسى: حديثُ أبي هريرةَ حديثٌ حسنٌ صحيحٌ غريبٌ، يُسْتَغْرَبُ مِنْ حديثِ بَيَانٍ، عن قَيْسٍ.

[٦٧٤-]حدثنا محمودُ بنُ غيلانَ، ناوَكيعٌ، نا سُفيانُ، عن عبدِ الملكِ بنِ عُمَيْرٍ، عن زَيْدِ بنِ عُقْبَةَ، عن سُمُرَةَ بنِ جُنْدُبٍ، قال: قالَ رسولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم:" إِنَّ الْمَسْأَلَةَ كَدٌّيَكُدُّ بِها الرَّجُلُ وَجْهَهُ، إِلاَّ أَنْ يَسْأَلَ الرجُلُ سُلْطَانًا، أَوْفِيْ أَمْرٍ لاَبُدَّ مِنْهُ"

قال أبو عيسى: هذا حديثٌ حسنٌ صحيحٌ.

وضاحت: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث غریب اس لئے ہے کہ بیان بن بشر سے اوپر یہی ایک سند ہے............اور کَدّ اور کَدْح کے معنی ہیں: سخت محنت۔

الحمدللہ کتاب الزکاۃ کی تقریر کی ترتیب پوری ہوئی

الحمدللہ! تحفۃ الألمعی شرح سنن الترمذی جلد دوم مکمل ہوئی
تیسری جلد أبواب الصوم سے شروع ہوگی

تحفۃ الالمعی کی خصوصیات

(جناب مولانا ثناء اللہ صاحب رسولپوری (پالن پوری) محدث دارالعلوم چھاپی (گجرات) نے تحفۃ الالمعی جلد اول کا مطالعہ کرنے کے بعد حضرت والد ماجد مدظلہ کے نام ایک تحریر ارسال کی ہے اور ساتھ خط بھی لکھا ہے، وہ خط میں لکھتے ہیں: ''ماشاء اللہ یہ شرح اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کی وجہ سے بے نظیر و بے بہا ہے۔ بندہ نے اپنے درسی مطالعہ کے دوران جن چند چیزوں کو نوٹ کیا وہ اس عریضہ کے ہمراہ ارسالِ خدمت ہیں۔ بیشک اس کی خوبیاں اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ حضرت والا کی للّٰہیت، عشقِ نبوی، اور زندگی بھر کی علمی و عملی کوششوں اور وسیع تر مطالعہ کا ثمرہ ہے جو مختلف تصنیفات کی شکل میں آج امت کے سامنے تحریری شکل میں رہتی دنیا تک کے لئے آرہا ہے۔ خاص طور پر حجۃ اللہ البالغہ کی شرح شریعت فہمی میں، اور تفسیر ہدایت القرآن قرآن فہمی میں اور تحفۃ الالمعی حدیث فہمی میں، امت کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ عوام و خواص اس خوانِ یغما سے ہمیشہ متمتع ہوتے رہیں گے ان شاء اللہ'' .... جلد دوم کے آخر میں دو صفحے خالی تھے، میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ وہ تحریر یہاں درج کردی جائے، اس سے قارئین کو کتاب کی خصوصیات سمجھنے میں مدد ملے گی، حسین احمد عفی عنہ)

''تحفۃ الالمعی شرح سنن الترمذی کی جلد اول منظرِ عام پر آگئی۔ ماشاء اللہ یہ شرح اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں سے آراستہ ہونے کے ساتھ بے مثال بھی ہے۔ احقر کی ناقص نظر میں اُس کی جو خوبیاں آئیں وہ درج ذیل ہیں:

(۱) شرح کا مقدمہ بڑی قیمتی اور نایاب معلومات و تحقیقات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں مذکور باتیں بصیرت پیدا کرنے والی ہیں۔ یہ مقدمہ ہر حدیث پڑھنے پڑھانے والے کے لئے بلکہ فقہ کے مدرسین و طلبہ کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ اس مقدمہ میں حجازی و عراقی مکتبِ فکر کی تاریخ، جمع حدیث و جمع قرآن کی تاریخ اور وجوہات بڑے اچھے پیرایے میں بیان فرمائے ہیں...... (۲) مقدمہ میں ایک جگہ درسِ حدیث میں علماءِ دیوبند کے طرز کی اور اُس میں فقہاء کے اقوال کو زیر بحث لانے کی وجہ: حدیث فہمی کو بتایا گیا ہے نہ کہ حنفیت کی ترجیح کو۔ یہ بہت ہی عمدہ توضیح ہے۔ نیز حدیث پڑھنے کا مقصد نصوص سے نئے مسائل اور احکام نکالنے کا سلیقہ پیدا کرنا بھی بتلایا گیا ہے......... (۳) اجماع اور قیاسِ شرعی کی واقعی حیثیت شارحِ محترم نے عجیب انداز میں بیان فرمائی ہے کہ یہ ذی حکمی ہیں اور اس کو مدلل بھی فرمایا ہے۔ الغرض مقدمہ کا ہر ہر حرف قیمتی اور ضروری باتوں پر مشتمل ہے...... (۴) کتاب العلل کو ابتداء میں لاکر حضرت شارح نے سنن ترمذی پڑھنے اور پڑھانے والوں کو ایک بہترین سوغات سے نوازا ہے۔ عام طور پر کتاب العلل سال کے اخیر میں بچے کھچے دنوں میں پڑھائی جاتی ہے بعض جگہوں پر صرف عبارت خوانی ہوتی ہے۔ حضرت والا نے اُس کی ایسی تشریح فرمائی ہے کہ کتاب العلل واقعی دلچسپ بن گئی ہے۔ عبارت اور اس کے مشمولات کو علحدہ علحدہ سولہ عنوانوں میں ذکر کرنے سے اس کا لطف دوبالا ہو گیا ہے...... (۵) شرح کی خصوصیات کا ذکر مرتب محترم بھائی مولوی حسین احمد زید مجدہ نے اپنے قلم سے فرمایا ہے اس کے علاوہ بندہ کو کچھ روز کے مطالعہ سے جو چند خصوصیات اور خوبیاں نظر آئیں وہ یہ ہیں:

ہر باب کے عنوان کے ساتھ ہی مسئلہ متعلقہ مافی الباب پر دل نشین انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، درحقیقت یہ حضرت الاستاذ

کے درس کا انداز ہے۔ شرح میں اُسی کو ملحوظ رکھنے سے نہ صرف ترمذی بلکہ حدیث شریف کی کسی بھی کتاب کا درس دینے کا طرز معلوم ہوسکتا ہے۔ اس طرز سے باب سے مکمل مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ نیز یہ پیشگی مطلب اس انداز سے بیان فرمایا گیا ہے کہ باب کی عبارت اور حدیث پاک کے ترجمہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

(٦) ترمذی شریف کی عبارت کی تصحیح اور اُس کو علحدہ علحدہ لکھنے سے طلبہ کے لئے بھی عبارت خوانی کی تیاری بہت آسان ہوگئی ہے...... (٧) کسی حدیث کا مضمون اگر ترمذی کی روایت میں مکمل نہیں ہے تو اُس کو مکمل کیا گیا ہے۔ نیز امام ترمذی رحمہ اللہ وہ وُہ کہہ کر جن روایتوں کو بلا اسناد ذکر فرماتے ہیں اُن کے حوالے اور ان کی سند کی حالت بیان کردی گئی ہے...... (٨) فقہاء کے اقوال اس طرح ذکر فرمائے ہیں کہ ان کو یاد رکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور صرف محقق اقوال پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جس سے خواہ مخواہ تطویل لازم نہیں آتی...... (٩) نیز فقہاءِ کے اقوال کچھ اس انداز سے بیان فرمائے ہیں کہ جس سے وجہِ اختلاف اور وجہِ استدلال دونوں واضح ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اختلاف کی بنیاد کیا ہے؟ اس کی اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے...... (١٠) حدیثوں کے ترجمے بلکہ امام ترمذیؒ کی عبارت کا ترجمہ بھی اتنا معنی خیز اور دل نشین ہے کہ اس سے دل جھوم جاتا ہے اور ایک گونہ لطف محسوس ہوتا ہے، مزید برآں ترجمہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہم اُس واقعہ کو بچشم خود مشاہدہ کررہے ہیں۔ نیز ترجمہ کے دوران بین القوسین بڑھاتے ہوئے الفاظ اتنے مختصر مگر اہم ترین ہیں کہ لمبی بحث کے قائم مقام بن کر کسی شبہ کا جواب بھی بن جاتے ہیں۔ ان ترجموں میں بعض جگہ پر محاورات کا لحاظ کرنے سے انوکھا پن پیدا ہوگیا ہے۔ مثلاً تعجیل عصر کے باب میں یجلس یرقب الشمس کا ترجمہ (یا گھڑی دیکھتا رہے)

غرض دورِ حاضر میں عصری تعلیم، استشراق اور مادہ پرستی کے زہر سے بے شمار مسلمان شریعت کے احکام کے بارے میں ایک طرح سے تذبذب کا شکار ہیں۔ یہ "روشن خیال" شریعت کے احکام کو موجودہ زمانہ سے ہم آہنگ نہیں سمجھتے یا سنن، آداب، واجبات اور فرائض تک کو غیر اہم بلکہ العیاذ باللہ فرسودہ گمان کرتے ہیں۔ بعض لوگ ہر حکم شرعی میں لِم کے متلاشی ہوتے ہیں۔ ایسے زمانے میں شریعت کی ایسی توضیح وتشریح کہ ہر حکم کا عقل کے مطابق ہونا معلوم ہو جائے۔ نیز ان کی حکمتیں بھی واضح ہو جائیں اور اُن کی لِم بھی سمجھ میں آجائے یہ نہایت ضروری ہے۔ بحمد اللہ "تحفۃ الالمعی" میں یہ ساری باتیں بخوبی موجود ہیں۔ حضرت شارح مدظلہ نے تمہیدات اور مطالب کو اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ درایت وروایت کے ساتھ اسرارِ شریعت اچھی طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ اس طرح روایت ودرایت کے ساتھ اسرار وحکم کی وضاحت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ اور کیوں نہ ہو! حضرت شارح: اللہ کی حجۃ بالغہ کے رمز شناس اور پروردگار کے بحر رحمت کے غواص ہیں۔

یہ کارنامہ حضرت ہی کا حصہ ہے۔ ہم جیسے ناچیز غلاموں کی بس یہی آرزو اور حضرت حق سے دعا ہے کہ وہ حضرت الاستاذ کو بسلامت وبعافیت رکھے اور آپ کی عمر شریف میں برکت عطا فرمائے تاکہ آپ کے خلوص وللّٰہیت سے بھرپور افادات سے امت دیر تک متمتع ہوتی رہے۔ اور تشنگانِ علوم نبوت کو سیرابی ملتی رہے۔ اللہ تعالیٰ اس شرح کو نیز حضرت کے دیگر تصنیفی سلسلوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ ایں دعا از من وجملہ جہاں آمین باد"

(آپ کا: ثناء اللہ رسولپوری، دارالعلوم چھاپی ١٥ر صفر ١٤٢٨ھ)